PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

WWW.PAKSOCIETY.COM

نومبر 2014ء کا چمکتا دمکتا پاکیزہ حاضر ہے

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

ترکِ وفا کا قسط وار

نایاب جیلانی

نگہت سیما کے قلم سے

رفاقت جاوید کے ناول **رنگِ خلش** کا ایک نیا رنگ

زاہدہ پروین کے روایتی انداز میں داستانی ناول **جنگل کا پھول**

ناہید سلطانہ اختر ایک لڑکی کی کہانی کے ہمراہ

اس کے علاوہ

ناہید فاطمہ حسنین اور سیما یاسمین مجتبیٰ کی خوبصورت تحریروں
کے ساتھ ساتھ **حیا بخاری، فرحین اظفر، فرح طاہر، شاہدہ ملک،**
روشانے عبدالقیوم اور دیگر مصنفات کی دلچسپ کہانیاں

شائستہ زرین ایک خصوصی مضمون کے ساتھ

پروفیسر سیما سراج

اس کے ساتھ ساتھ مستقل متنوع سلسلوں کا گلدستہ اور خوب صورت امتزاج آپ جیسے خوش ذوق قارئین کے لیے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

15 — عالمِ اردو ادب — ادارہ
ایک صفحے میں مکمل ایک نادرِ روزگار کا تعارف خاص

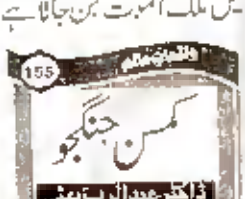

16 — شہرِ خیال — محمد عزیز [illegible]
آپ کی باتیں آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

24 — مقتولِ آزادی — ڈاکٹر ساجد امجد
نوبیل انعام یافتہ مسلمان صدرِ مملکت کی زندگی نامہ

47 — باکمال بہنیں — سہیل صدیقی
ادب کی دنیا میں ہلچل مچا دینے والی بہنوں کا تذکرہ

60 — نوبیل انعام یافتہ — [illegible] عباس جعفری
دنیا بھر میں نوبیل ایوارڈ حاصل کرنے والے مسلمانوں کا ذکر خاص

70 — تلاش — شیراز خان
ایک انسانی عجوبے شخص کی داستان [illegible]

85 — جہنمی آگ — ابن کبیر
امریکی تاریخ کی سب سے بھیانک آتش زدگی

101 — فلمی الف لیلہ — علی سفیان آفاقی
فلم و صحافت کی کئی ان کہی کہانیاں، معروف قلمکار کے حقیقی شب و روز

120 — تباہ کن — مرزا [illegible]
اس ذرے کا جائزہ جو ایک پل میں ملک الموت بن جاتا ہے

133 — الوداع — حسن رزاقی
پی آئی اے کے ایک ریٹائرڈ افسر کی خودنوشت

151 — بلگرام — محمد ایاز راہی
پاکستان کی ایک خوب صورت وادی کا ذکر

155 — کمسن جنگجو — ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
بچوں کو میدانِ جنگ میں جھونکنے کی ابتدا اور [illegible] کی

قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہٰذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

153 معلومات

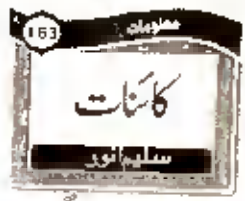

کائنات

سلیم انور

کائنات ایک لاینحل گتھی ہے جس کے سرے کی تلاش ہے

167 تحریر خاص

نومبر

منظر امام

عیسوی سن کے گیارہویں مہینے کا تذکرہ خاص

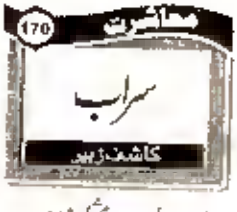

170 معاشرت

سراب

کاشف زبیر

بلند حوصلوں اور عشق و ولولوں سے گندھی سنسنی خیز اور تہلکہ انگیز داستان

216 پہلی سچ بیانی

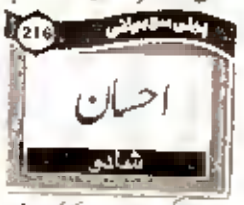

احسان

شازی

کیا کسی طوائف کو باعزت زندگی گزارنے کا حق نہیں ہے!

233 دوسری سچ بیانی

بیٹی

عظمیٰ خورشید

بیٹی ماں باپ کے لیے رحمت ہے پھر بھی اگر......

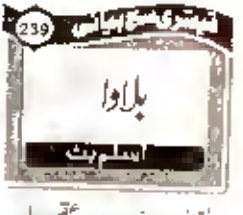

239 تیسری سچ بیانی

بلاوا

اسلم بٹ

بعض واقعات عقل سے ماورائی ہوتے ہیں

244 چوتھی سچ بیانی

چڑیل

احمد حسن

رات کے اندھیرے میں چھت پر ملنے والی کا قصہ

251 پانچویں سچ بیانی

جھوٹی

محمد سلیم اختر

محبت کرنے والے جب اپنی زندگی قربان کر دیتے ہیں

256 چھٹی سچ بیانی

رئیس

فیض الدین انصاری

سرکاری ہسپتال میں چلنے والی سیاست کا ایک رخ

271 ساتویں سچ بیانی

سوال یہ ہے

احمد جہانگیر

انسانی رشتوں کی عجیب سی سچ بیانی

275 آٹھویں سچ بیانی

جذبہ

محمد حنیف قادری

حب الوطنی کے جذبے سے سرشار روداد

283 نویں سچ بیانی

سمجھوتا

عمران قریشی

وہ محبت کی وجہ سے بنا کو اپنانے پر مجبور ہے

ادارہ سرگزشت میں شائع ہونے والی ہر تحریر کے جملہ حقوق طبع و نقل بحق ادارہ محفوظ ہیں۔ کسی بھی فرد یا ادارے کے لیے اس کے کسی بھی حصے کی اشاعت یا کسی بھی طرح کے استعمال سے پہلے تحریری اجازت لینا ضروری ہے۔ بصورت دیگر ادارہ قانونی چارہ جوئی کا حق رکھتا ہے۔

● تمام اشتہارات نیک نیتی کی بنیاد پر شائع کیے جاتے ہیں۔ ادارہ اس معاملے میں کسی بھی طرح ذمہ دار نہ ہوگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

کہیں کوئی حادثہ ہو جائے یا قدرتی آفات کا سامنا ہو۔ ایسے وقت میں ہم آپ تو صرف افسوس کا اظہار کرتے رہ جاتے ہیں مگر اسی شہر کراچی کا رہنے والا وہ بوڑھا شخص آرام و سکون کو تج کر جوانوں کے ایسے حوصلے کے ساتھ کمر کس کر امدادی مہم شروع کرا دیتا ہے۔ اس کی ایمبولینسیں 24 گھنٹے انسانی زندگی کو بچانے کے لیے سڑکوں پر دوڑتی رہتی ہیں۔ اسی لیے وہ شخص پوری دنیا میں دکھی دلوں کا مسیحا کے نام سے مشہور ہے مگر افسوس صد افسوس لوگ کس قدر بے حس ہو چکے ہیں کہ اس جیسے مسیحا کو بھی نہیں بخشا۔ عبدالستار ایدھی جیسے فقیر منش شخص کو لوٹ لیا۔ اخباری اطلاعات کے مطابق 8 افراد ان کے دفتر میں داخل ہوئے۔ دفتر میں موجود تمام کارکنان بشمول عبدالستار ایدھی کو یرغمال بنایا اور یتیم بچیوں کی شادیوں میں دینے کے لیے رکھے ہوئے زیورات، امانتاً رکھوائے گئے زیورات، چندے کی پیٹیوں میں موجود رقم اور اخراجات کی بابت رکھی گئی رقم جو بہت بڑی ہے سب کچھ لوٹ کر لے گئے۔ ان لوٹنے والوں میں یقیناً ایسے افراد بھی ہوں گے جنہوں نے خود یا ان کے خاندان کے افراد نے کبھی نہ کبھی ایدھی صاحب سے استفادہ ضرور کیا ہوگا۔ اس واقعے کی جتنی مذمت کی جائے کم ہے۔

معراج رسول

جلد 24 ❖ شمارہ 12 ❖ نومبر 2014ء

ماہنامہ ... کراچی

مدیر اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

[illegible] 0333-2256789

[illegible] 0333-2168391

[illegible] 0323-2885528

[illegible] 0300-4214400

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرسالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقام اشاعت: C-63 فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone [illegible] Fax [illegible]

E-mail [illegible]

MEMBER APNS CPNE

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

عالم اردو ادب

سرگزشت

گو کہ دہلی کا حسن اجڑ چکا تھا کیوں کہ مغلیہ سلطنت لال قلعہ تک محدود ہو گئی تھی۔ سرکار بہادر شاہ ظفر تخت معلیٰ کے گلیاروں میں ایک طرح سے مقید ہو رہے تھے۔ فرنگیوں نے جگہ جگہ چھاؤنیاں بنالی تھیں اور نوابوں کے ساتھ مل کر حکومت سے دور رہتے ہوئے بھی حکومت کر رہے تھے۔ سرکردہ ہندوؤں نے در پردہ فرنگیوں سے ساز باز کر رکھا تھا۔ ایسے وقت میں مولوی محمد باقر کی ذات بھی جو قلم سے جہاد میں مصروف تھی۔ وہ برصغیر کا پہلا اردو اخبار نکال رہے تھے۔ اپنے اخبار کے ذریعے لوگوں میں بیداری پیدا کر رہے تھے۔ اس وقت تک صحافت کی یہ شکل ابھری نہ تھی۔ یعنی آزادی سے اپنی بات کہی جا سکے، اس لیے وہ کہانی قصوں کے ذریعے پیغام کی ترسیل کر رہے تھے۔ انہی مولوی محمد باقر کے ہاں 1832ء میں اس بچے نے جنم لیا تھا۔ بچے کی پیدائش کے چار سال بعد 1836ء میں انہوں نے اس اخبار کی ابتدا کی تھی اور اب یہ اخبار عروج پر پہنچ رہا تھا کہ یکایک میرٹھ چھاؤنی میں بلوہ ہو گیا۔ منگل پانڈے نامی سپاہی نے انگریز فوجیوں کا حکم ماننے سے انکار کر دیا اور یہ انکار بغاوت کی چنگاری بن گئی۔ اس کی حمایت میں بہت بڑی تعداد میں انگریزی فوج میں ملازم ہندو اور مسلمان فوجیوں نے مورچہ سنبھال لیا۔ اپنے افسران کو قتل کر کے وہ دہلی کے لیے نکل کھڑے ہوئے تھے کہ مغل فرمانروا بہادر شاہ ظفر کو اپنا سربراہ بنا کر ہند کو فرنگیوں کے تسلط سے آزاد کرا لیا جائے۔ منگل پانڈے کی آواز کے ساتھ پورے برصغیر میں ہلچل سی مچ گئی۔ دوسری طرف سے بخت خان بھی اپنے توپ خانے کے ساتھ دہلی کی جانب چل پڑا۔ دونوں نے ہند کی آزادی کے خواب کو تعبیر دینے کی ٹھان لی تھی۔ دونوں کے سپاہیوں سے دہلی بھر گیا۔ چند دیگر علاقوں سے بھی انگریزی فوج کے سپاہی بھاگ کر آ گئے۔ گویا بغاوت کا بگل بھرپور انداز میں بج اٹھا مگر اس بغاوت کو کامیاب کرانے کی بجائے خود اپنوں نے آزادی کے متوالوں کی حوصلہ شکنی شروع کر دی اور یہ بغاوت ناکام ہو گئی۔ بخت خان اپنے توپ خانے کے ساتھ نیپال کی ترائی میں جا کر روپوش ہو گیا۔ زیادہ تر آزادی کے متوالے قتل ہو گئے۔ مغل شہنشاہ بہادر شاہ ظفر گرفتار کر لیے گئے۔ دہلی میں انگریز سپاہیوں نے قتل عام کیا۔ بے شمار ذی حیثیت افراد کو موت کی سزا دے دی گئی۔ موت کی سزا پانے والوں میں مولوی محمد باقر بھی شامل تھے۔ ان کو سزا ہوئی تو گھر والے اس ڈر سے کہ کہیں خاندان کے دیگر افراد بھی گرفتار نہ ہو جائیں ان لوگوں نے ترک وطن کی ٹھان لی۔ محمد باقر کے بیٹے کو ساتھ لے کر ماں لکھنؤ چلی آئی۔ لکھنؤ بھی اجڑا پڑا تھا کیونکہ اودھ کے تاجدار نواب واجد علی شاہ کو پہلے ہی گرفتار کر کے مٹیا برج کلکتہ بھیجا جا چکا تھا۔ بیگم حضرت محل نے انگریز فوج پر حملہ کر کے انہیں خاصا نقصان پہنچایا تھا لیکن یہ فتح غداروں نے شکست میں بدل دیا تھا۔ اس شکست کا نوحہ لکھنؤ کی سڑکوں پر صاف نظر آ رہا تھا۔ محمد باقر کا بیٹا خود بھی لائق فائق تھا۔ شیخ ابراہیم ذوق کا شاگرد تھا اور اوائل عمر سے ہی شعر گوئی میں طاق تھا مگر اب جب جان کے لالے پڑے اور بھوک مقدر ٹھہری تو وہ صرف اور صرف دو روٹی کمانے کی فکر میں رہنے لگے۔ 1864ء میں وہ لکھنؤ سے مشرقی پنجاب کے قصبے جگراؤں آ گیا۔ مولوی رجب علی کی کوششوں سے اسے پنجاب کے محکمہ تعلیمات میں ایک معمولی سی ملازمت مل گئی۔ تنخواہ پندرہ روپے مقرر ہوئی اس کے ساتھ ماسٹر پیارے لال کی کوشش سے اخبار ''انجمن'' میں سب ایڈیٹر بھی مقرر ہو گئے۔ 1865ء میں ایک سرکاری وفد کے ساتھ سفارت کاری کے لیے کابل بھیجے گئے جو ایک اعزاز تھا۔ اس سفر نے فارسی میں دسترس حاصل کرنے میں اہم کردار ادا کیا۔ اس نے گہری نگاہ سے فارسی ادب کا مطالعہ بھرپور انداز میں کیا تھا اور واپسی کے ساتھ اس نے ان معلومات کو ''سخندان فارس'' میں یکجا کر کے شائع کیا۔ اس کے علاوہ درسیات فارسی پر بھی کئی کتب تصنیف کر لیں۔ 1883ء میں اس نے ایک معرکۃ الآرا کتاب لکھی جسے آج بھی پذیرائی حاصل ہے۔ اس کتاب کا نام ''آب حیات'' ہے۔ 1887ء میں ملکہ وکٹوریہ کی پچاس سالہ تقریبات کے موقع پر شمس العلما کا خطاب ملا۔ 1889ء میں اختلال دماغ کے مرض نے حملہ کیا۔ 20 سال تک وہ اس مرض میں مبتلا رہے اور 22 جنوری 1910ء میں انتقال کر گئے۔ اس جید عالم اردو ادب کو لوگ شمس العلما محمد حسین آزاد کے نام سے یاد کرتے ہیں۔

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

شہرِ خیال

☆ اعجاز حسین سحاب کا نور پور تھل سے تحریری تحفہ۔ ”کبھی کبھی ایسی تحریر سامنے آتی ہے کہ ذہن کئی سال پیچھے چلا جاتا ہے۔ کئی مناظر آنکھوں کے سامنے آجاتے ہیں اور بندہ اردگرد کے ماحول سے کٹ جاتا ہے۔ کچھ ایسا ہی ”گل نادری“ پڑھ کر ہوا۔ جنگ خندق کے آثار آہستہ آہستہ مٹتے جا رہے ہیں البتہ مسجد سلیمان فارسیؓ جو محض ایک کمرے کی مسجد ہے آج بھی پرانی حالت میں موجود ہے۔ آپ سے منسوب کھجوروں کا باغ بھی زائرین کی آنکھوں کو تراوت دے رہا ہے اور میرے لیے یہ اعزاز ہے کہ مدائین میں حضرت سلیمان فارسیؓ کے مزار پر فاتحہ خوانی کر چکا ہوں۔ ”ورد کرتا ہوں“ مختصر ہونے کی وجہ سے مضمون دلچسپ لگا۔ ”قصص الف لیلہ“ میں نامور ناول نگاروں کے نام آتے ہیں۔ پرانے وقتوں میں ان کی تحریریں کورس کی کتابوں میں پڑھیں لیکن مکمل ناول یا افسانہ نہیں پڑھ سکے۔ احمد ندیم قاسمی ہمارے ضلع کے ہیں لیکن باوجود کوشش کے ان کی کوئی کتاب ہاتھ نہ آسکی (حیرت ہے)۔ بھرتان مسیح کو ہم شوق سے سنتے تھے ان کے انداز میں ٹھہراؤ تھا۔ سنتے آئے ہیں کہ خان صاحب کا ننھیال ہمارے قریبی گاؤں بھائی بلوچاں میں ہے۔ ان کے ماموں نوید حیدر خان فٹ بال فیڈریشن کے صدر رہے ہیں۔ ان کی مقبولیت اور کامیابی کا پڑھ کر انتہائی خوشی ہوئی۔ سچ بیانیوں میں ”آئینہ“ میں گھریلو معاملات اور حالات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ ہر کردار چھا گیا۔ دوسرے کی ذومعنی کرنے کی کھیل سے باہر کرنے کے چکر میں نظر آیا۔ حقوق اور مفادات سے ہٹ کر سب غرض کے قیدی بنے رہے۔ خونی رشتوں کے درمیان جب ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو نہ چاہتے ہوئے بھی فاصلے پیدا ہو جاتے ہیں۔ دوسروں کو مطمئن رکھنے کے لیے ایثار ضروری ہے ورنہ ایسی باغیانہ سوچیں پیدا ہوتی رہیں گی۔ ”شناخت“ کے وزن کے اندیشے لتا بھی ہو سکتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ناجائز اولاد ہو۔ کچھ والدین غربت، دشمنوں کے خوف اور کسی دوسری مجبوری میں بھی اولاد کو پھینک دیتے ہیں اس لیے دل کو مطمئن رکھیں۔ ”گرامنے کے لوگ“ معاشرتی رویوں پر طنزیہ تحریر ہے (مگر سچ ہے)۔ ”ماحول“ سبق آموز کہانی ہے۔ والدین اپنے بچوں کا کم عمری میں انگریزی میں ڈانس دکھانے اور انگریزی بولنے پر فخر محسوس کرتے ہیں اور خاص طور پر بچیوں کو انتہائی واہیات کپڑے پہناتے ہیں کہ ہم فخر محسوس کرتے ہیں لیکن نوجوان نسل کے چند خطروں سے ناواقف رہتے ہیں اور کئی بار ایسے حالات میں ناخوشگوار واقعات بھی پیش آجاتے ہیں جو شخص جلدی سنبھل گیا وہ کئی صدمات اور سانحات سے بچ جائے گا۔ ”خفا کاڑ“ کے وجاہت شعبازی اور خود پرستی میں پھنسے ہوئے ہیں جب معذوری کے دن آئے تو ہر شے اصلی حالت میں دکھائی دی تو اپنی ناانصافی کا احساس ہوا۔ میں تو نور کو بدقسمت کہوں گا جو اس ستمگار شخص سے آنکلتی ہے۔ وجاہت کی فطرت کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کے سدھرنے کی امید کم نظر آتی ہے۔ شاید کوئی ٹھوکر اسے سیدھی راہ دکھا دے۔ ”قورد“ میں کیسی افسوس ناک صورت حال سامنے آئی ہے۔ ہمارے بزرگ کتنی بے بسی محسوس کرتے ہیں اور توجہ حاصل کرنے کے لیے کیسے پاپڑ بیلتے ہیں۔ کریا ہم دوزخ کا سامان کر رہے ہیں۔ سبق آموز ہونے کے ساتھ کہانی دلچسپ بھی ہے۔ ”احسان“ میں گلن خان کا رویہ اپنی جگہ۔ یہ اپنے اپنے مزاج اور فطرت کی بات ہے لیکن مجھے نوید کا رویہ انتہائی نامناسب لگا ہے۔ الجھنے کی بجائے پیار اور اخلاق سے بھی بات سمجھائی جا سکتی ہے۔ جیسے آپ گلن خان سے پیش آئے ہیں تو ایسے آدمیوں سے بچنے کی دعا مانگی جا رہی ہے اب اپنا کوئی مشورہ دینے سے پہلے وہ بھی سو بار سوچیں گے۔ ”محترم“ کوئی خاص تاثر نہیں چھوڑ سکی۔ ”ذکر“ دلچسپ حقیقت ہے۔ واقعات میں تجسس کے ساتھ روانی بھی ہے۔ سلیم شاہد حسن ذہانت اور ہوشیاری سے فائدہ اٹھا رہا ہے یہ دھوکا دہی کے زمرے میں آتا ہے جو قابل گرفت ہے اس لیے وہ کبھی ایسا پھنسے گا کہ پچھلی ساری کمائی سے ہاتھ دھونے پڑیں گے اور اس کی چیخیں نکل جائیں گی۔ جو مہربان میرے تبصروں کو سراہتے ہیں میں ہمیشہ ان کا شکر گزار رہتا ہوں۔ کبھی ڈاک دیر سے پہنچتی ہے۔ تو یہ آدھی ملاقات بھی نہیں ہو پاتی اور افسوس سے ہم خاموش بیٹھ جاتے ہیں۔“

☆ بشریٰ افضل کا بہاولپور سے خلوص نامہ۔ ”معلوماتی مضامین میں اضافہ ہوا۔ اپنی محفل میں داخل ہوئے۔ شاہد جہانگیر شاہد کا تبصرہ کافی جامع اور تفصیلی تھا۔ کرسی صدارت کے حقدار ٹھہرے۔ مبارک ہو۔ ظاہر الدین بیگ یہ کیا؟ کرسی صدارت پچھلے ماہ لیا اور اس ماہ ویٹنگ لسٹ میں! یہاں بھی پہلے نمبر پر آگئے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے اعجاز احمد سحاب تھا آپ کو محنت کا صلہ عطا فرمائے۔ انگلش ڈاک بھی تک کے بغیر محفل میں پھیکا پن محسوس ہوتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کیوں؟ تمام ساتھی میری رائے سے متفق ہیں جو کہ جھوٹ کی اجازت دی جائے۔ سلیم خورشید میں آپ کی بات سے متفق ہوں اپنا تبصرہ دیکھ کر میرا ایک سیر خون بڑھ گیا۔ بیت بازی میں ابرار احمد کا شعر پسند آیا انگل میں نے کہانی ارسال کی تھی (کہانی پر بہت زیادہ کام کرنا پڑے گا)۔ سچ بیانوں میں ''آئینہ'' دل کو لگی۔ واقعی ہر گھر کے حالات ایسے ہی ہوتے ہیں لیکن حالات و واقعات مختلف نوعیت کے ہوتے ہیں۔ بعض حالات تو مرد خود ہی پیدا کر دیتے ہیں۔ بچوں کو ان کی ماں کے خلاف کر کے ارحیہ نے روایات کو بدل کر اپنی زندگی سنوار لی۔ ''کرائے کے لوگ'' یہ کہانی کا نام نہیں ہونا چاہیے اس کا نام کرائے کے آنسو ہونا چاہیے تھا۔ آج کے دور میں کچھ بھی ممکن ہے۔ لوگوں کے خون سفید ہو گئے ہیں۔ واقعی ''ماحول'' کا اثر اولاد پر ضرور پڑتا ہے۔ لڑکیوں کو اتنی آزادی نہیں دینی چاہیے۔ فاطمہ کے سمجھانے میں کہ ماحول کو درست کرو۔ جاوا کردار ادا کیا ہے۔ ''قدر'' میں باپ کے زمانے نے بیٹے اور بہو کی آنکھیں کھول دیں۔ ''احسان'' میں گلن خان نے نوید پر بغیر پیسوں کے ہی مدد کر دی اس کی زندگی بچالی۔ آج کے دور میں ایسا بھی ہوتا ہے۔ ''محترم'' مزاح کا انداز لیے ہوئے تھی۔ مسکراتے ہم پڑھ کر۔ ''الفی الف لیلہ'' میں تصاویر کا سلسلہ اچھا لگا۔ اداکاروں کے حالات و واقعات کے بارے میں معلومات ملتی ہیں۔ ''خطاکار'' میں وجاہت کو خدا نے سبق دیا۔ ایک موقع دیا کہ سنبھل جا مگر انسان نہیں سمجھتا۔ بے چاری نور ماں باپ کو تنگ کیا تھا اس کی سزا تو اللہ نے دی تھی۔ ''کم سن قتل'' بنیادی طور پر والدین کو اسے جنگجو بننے سے روکنا چاہیے تھا۔ 15 سال کی عمر میں اتنا بڑا کارنامہ انجام دینا آسان نہ تھا۔''

☆ ڈاکٹر قرۃ العین کی آمد اسلام آباد سے۔ ''سب ساتھی خیریت سے ہوں گے۔ پچھلے چند ماہ سے خط نہیں لکھ سکی۔ دراصل پیشہ وارانہ مصروفیت بڑھتی جا رہی ہے۔ ساتھ ہی ساتھ گھریلو ذمہ داریاں بھی۔ سب ساتھیوں کا شکریہ کہ وہ یاد رکھتے ہیں۔ قیصر عباس خان! مکمل باتوں پر عمل کے تبصرہ اس لیے ممکن نہیں کہ ہماری حساس قسم کی نوکری ہے۔ 8 سے 5 بجے تک کے تحقیقی کام والی نوکری کے بعد ہماری تفریح کا واحد ذریعہ سرگزشت ہے جس کا ہر شمارہ شاندار اور معلومات سے بھرپور ہے۔ سرگزشت کے قارئین یہ معلوماتی مضامین پڑھ پڑھ کر انسائیکلوپیڈیا بنتے جا رہے ہیں۔ انٹرنیٹ، کمپیوٹر اور Cable کے متعلق اب تک بہت ساری سچی بیانیاں شائع ہوتی ہیں جو اخلاقی سبق آموز ہیں۔ ہم نے جناب اس سے یہ سبق لیا ہے کہ Cable کا داخلہ گھر میں ممنوع قرار دیا ہے۔ دفتری انٹرنیٹ پر گزارہ کرتے ہیں اور گھر پر انٹرنیٹ کا کنٹرول اپنے قبضے میں رکھا ہے۔ گھر کے ماحول کو پاکیزہ رکھنے کے لیے یہ بہت ضروری ہے۔ موبائل دور رکھا ہے جس پر صرف کال آتی ہے اور جاتی ہے۔ باقی سہولیات نہیں ہیں۔ طاہرہ گلزار صاحبہ! آپ کے متعلق پڑھ کر اچھا لگا۔ ہماری دعا ہے کہ آپ کی جلد سے جلد 17 گریڈ میں ترقی ہو جائے۔ ویسے لیب اسٹنٹ کی جاب خاصی پُرسکون جاب ہے۔ رانا شاہد صاحب! بیٹے کی پیدائش بہت مبارک ہو۔ خطوط میں یہ چھوٹی چھوٹی ذاتی باتیں ہمیں اچھی لگتی ہیں کیوں کہ اس سے اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ بشریٰ افضل! آپ اپنا آپ بیتی ضرور لکھیں۔ جاوید جو لوگ آپ پر کرتے رہے ہیں ان کے متعلق لکھیں تاکہ ہمیں بھی پتا چلے کہ لوگ کیا کچھ کرتے رہتے ہیں۔ ڈاکٹر روبینہ اللہ تعالیٰ آپ کی پریشانیاں دور کرے اور نفیس صاحب کو صحت عطا کرے۔ علی شکور! شہر خیال میں خوش آمدید۔ آپ کی کہانی کا انتظار رہے گا۔''

☆ سید محمد عظیم شاہ بخاری کا تحفہ خان پور کورہ سے۔ ''اکتوبر کا شمارہ لاجواب تھا۔ اس کی ہر تحریر پر تو آٹھ صفحات کے تبصرے کیے جا سکتے ہیں لیکن میں باتوں کا حق نہیں مار دوں گا۔ شروع کرتے ہیں شہر خیال سے۔ سب سے پہلے محترمہ طاہرہ گلزار، انور عباس، رانا شاہد اور عمران جونانی کا میرا تبصرہ پسند کرنے کے لیے شکریہ۔ لیکن طاہرہ گلزار ہم سب درد اور تجش اور فخر کرنے والے پاکستانیوں کے خیالات ایک جیسے ہیں بس الفاظ کا چناؤ مختلف ہوتا ہے۔ عمران جونانی واقعی ہر بار آپ کی تحریر بہت جیتی ہوتی ہے۔ آپ کی طرح میں بھی ہمایوں اور دین پوری صاحب کو بہت Miss کرتا ہوں۔ مضامین میں ''لائف'' سب سے اچھا رہا۔ اگر ہم مغربی جریدوں کا اپنے ملک کے جرائد سے مقابلہ کریں۔ Life کی طرز کا کوئی رسالہ ہمارے ہاں نہیں۔ یہ مغربی اقوام ہی ہیں جو تحقیقی صحافت، عالمی اسیرو تو کرانی و دیگر کیلنڈرز کو Cover کرتی ہیں۔ ورنہ ہمارے ہفت روزہ میگزینز کو انڈین اداکاراؤں کی شادیوں، بالی ووڈ اداکاراؤں کے اسکینڈلز اور پاکستانی اداکاراؤں کے جھگڑوں کی چٹ پٹی خبریں بنانے سے فرصت ہی کہاں جو وہ کوئی کام کی خبر پر تحقیق کریں۔ یہ ادارے ملک میں نایاب ہوتا جا رہا ہے۔ آپ سب کی معلومات کے لیے بتانا چاہوں گا کہ InTrend (Lahore Institute L.I.F.E of Fertility Endocrindogy) کا ایک اچھل بھی لاہور میں ہے جس سے منسلک ڈاکٹرز کو پاکستان میں پہلا ٹیسٹ ٹیوب بے بی پیدا کرنے کا اعزاز حاصل ہے۔ ''تلاش'' بھی بہت اچھی رہی مگر ابھی ادھوری ہے۔ ''الفی الف لیلہ'' بھی اچھی رہی۔ ہمارے ملک میں اب ہر شعبہ میں پرانی تکنیکیں اور ہم ختم کرنے کا رواج چل پڑا ہے۔ اللہ ہی خیر کرے۔ ''خطائے ہوا باز'' بھی اپنی طرز کی منفرد تحریر تھی۔ ہمارے ملک میں تو بڑے سے بڑے حادثے کی تحقیق کو بھی منطقی انجام تک نہیں پہنچایا جاتا۔ بس مرنے والوں کے لواحقین کو امداد دے کر خاموش کر دیا جاتا ہے۔ اب ذرا ذکر ہو جائے سچ بیانوں کا۔ ''آئینہ'' حقیقت میں ہمارے معاشرے کا آئینہ ثابت ہوئی۔ اسلام میں بھی لڑکی اور لڑکے کی شادی جلد کرنے کا حکم ہے تاکہ وہ پراگندہ خیالات اور حرکات سے بچے رہیں۔ شناخت کا موضوع واقعی غور طلب ہے۔ مجھے یاد ہے کہ عبدالستار ایدھی صاحب نے ایسے ناجائز بچوں کے لیے ہر شہر میں ''پالنے'' رکھوائے تھے اور ان میں کئی بچے رکھے گئے جن کی ذمہ داری ایدھی ہوم نے لے لی۔ بجائے اس چیز کو سراہنے کے ہمارے معاشرے کے کئی ''شرفا'' نے اس پر بے جا تنقید کی۔ ہم ان لوگوں پر تو بڑے شوق سے کیچڑ اچھالتے ہیں جو ناجائز بچوں کی پرورش کریں اور انہیں پڑھائیں لکھائیں لیکن ہم انہیں کیوں نہیں کچھ کہتے کہ جن کی وجہ سے معاشرہ اس راہ پر چل نکلا ہے۔ ''ماحول'' وہ کہانی ہے کہ اگر اسے ہر دوسرے پاکستانی گھرانے کی کہانی کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ میں سرگزشت کے توسط سے پہلے بھی یہ بات کر چکا ہوں اور اب تمام پڑھنے والے قارئین سے پھر گزارش کروں گا کہ خدارا اپنے بچوں اور بچیوں کو انڈین کلچر سے بچائیں۔ بچے ہماری ڈراموں کے اداکاروں کو اپنا آئیڈیل سمجھتے ہیں اور انہی کی طرح چلتے بولتے ہیں۔ میں نے کئی لوگوں کے منہ سے بھگوان تک سنتے ہیں (نعوذ باللہ)۔ ہمارا معاشرہ فحاشی، عریانی اور اخلاقی پستی کی طرف جا رہا ہے۔ خدارا اے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جا ئیں گے۔ "خطا کار" پڑھ کر تو میں نے شکر ادا کیا کہ میں ایک عام انسان ہوں۔ شہرت اپنے ساتھ بہت سی برائیاں بھی لاتی ہے۔ انسان اور خصوصاً اگر وہ کوئی سپر اسٹار ہو اپنے لیے نہیں بلکہ لوگوں کے لیے اور ان کے بنائے گئے پیمانوں پر جیتا ہے پھر انسان کا اپنا کچھ نہیں رہتا اور اب آخر میں ذکر کروں گا اداریے کا۔ جو بہت اچھا اور بہت پُراثر تھا۔ وی آئی پی کلچر تو جیسے ہمارے حکمران طبقے کی رگوں میں بس چکا ہے۔ عام سے عام ایم پی اے کو بھی خصوصی پروٹوکول دیا جاتا ہے۔ عوام کی تو کوئی وقعت ہی نہیں رہی۔"

☆ عظمیٰ شکور میرکو دعا سے لکھتی ہیں۔ "سب سے پہلے روشن جہانگیر کی لکھی ہوئی تحریر "شناخت" پڑھی۔ آنسو آنکھوں سے محو سفر ہوئے۔ وہ تو شکر ہے محمد وسیم خان نے غم زدہ موسم کو دور کیا۔ اتنی خوب صورت تحریر "کرائے کے لوگ"۔ اف توبہ! کتنی ہنسی آئی تھی میں ایسے میں بہت کم خوش ہوتی ہوں۔ بھئی واہ خوب لکھا۔ مزہ آ گیا۔ ویسے ایک بات کہوں سارا سال ہی حسین ہے اکتوبر کے موسم کی طرح۔"

☆ سید انور عباس شاہ کا دریا خان بھکر سے تحفہ۔ "واقعی ہمارے پیارے ملک پاکستان میں وی آئی پی کلچر دن بدن فروغ پاتا جا رہا ہے۔ چاہے ہم جتنا بھی رو لیں چیخیں احتجاج کریں یہ سلسلہ ہمیشہ چلتا رہے گا۔ "شہر خیال" میں شاہد جہانگیر شاہد کو کرسی صدارت پر بیٹھے دیکھ کر اتنی خوشی نہیں ہوئی جتنی خوشی ان کے محفل میں شامل ہونے کی ہوئی۔ یہ ہستی ہی ایسی ہیں کہ اگر یہ شہر خیال میں شامل ہو جائیں تو ہماری طرف سے صدارت کے حق دار یہی ہیں۔ اس بار بھی انہوں نے خوب سے خوب تر لکھا۔ امتیاز حسین عزت افزائی کا بے حد شکریہ۔ طاہر گلزار صاحب ان دنوں محکمہ ڈاک کی نظروں سے بچ کر شہر خیال پر چھا گئے۔ تبصرہ بھی شاندار تھا۔ عظمیٰ شکور آپ کو بہت بہت مبارک ہو کہ آپ کی لکھی ہوئی کہانی معراج انکل نے Ok کر کے ویٹنگ لسٹ میں لگا دی ہے۔ اب یہ کب چھپے گی اس کا کسی کو شدت سے انتظار رہے گا۔ ویسے میری مانیں تو جب تک کوئی اور کہانی تخلیق کر لیں۔ اس کے علاوہ بھی بھائیوں میں آفتاب احمد نصیر اشرفی، مسعود بالر ٹاکوری، سلیم خورشید، عمران جونانی، اویس شیخ، وحید ریاست بھٹی، رانا محمد شاہد، قیصر عباس خان اور بشریٰ افضل کے خطوط شاندار اور خاصے جاندار تھے۔ ان سب کو میری طرف سے بہت بہت مبارک قبول ہو۔ پچھلے دنوں معروف گلوکار حبیب ولی محمد اور پیٹ ٹھا اداکار مقصود حسن انتقال کر گئے ان پر بھی کچھ لکھا جائے تو نوازش ہوگی۔ "تلاش" واقعی عجیب و غریب اور پُراسرار تحریر تھی۔ میں ایسے واقعات بہت شوق سے پڑھتا ہوں۔ آپ بھی اگر وقتاً فوقتاً اسی قسم کے سچے واقعات سرگزشت کے صفحات پر بکھیرتے رہا کریں تو میرے جیسے پُراسرار کہانیوں سے دلچسپی رکھنے والے کئی حسن بھائیوں کی تشنگی دور ہوتی رہے گی۔ "شکار" بھی ایک دلچسپ تحریر تھی۔ دنیا میں کیسے کیسے فرازیوں نے ڈیرے ڈالے ہوئے ہیں۔ خدا انہیں ان کے شر سے محفوظ رکھے۔ شکار کتھا میں "انسانی گارا" ایک دل دہلا دینے والی تحریر تھی۔ گارے کے طور پر انسانی وجود کو استعمال میں لانا اس سے بڑی قیامت اور کیا ہوگی۔ اس قدر درندگی اور جاہلیت کا مظاہرہ۔ اف! ہم سوچ بھی نہیں سکتے۔ اس کہانی کے اہم کردار تھامس کو اپنے کیے کی سزا مل گئی اور وہ جہنم واصل ہوا۔ خس کم جہاں پاک۔ "زیر کر دیتا ہوں" ایک پُرکشش اور پڑھنے کے لائق تحریر تھی۔ منیر نیازی کے بارے میں معلومات خوب سے خوب تر تھیں۔ ان کے لکھے ہوئے گانے جس نے میرے دل کو زیادہ متاثر کیا وہ مہدی حسن نے اپنی سحر انگیز آواز میں خوب ڈوب کر گایا تھا جس کی وجہ سے یہ گانا امر ہو گیا۔ ان کی ایک اور غزل اس بے وفا کا شہر ہے اور ہم ہیں دوستو نسیم بیگم کی دلکش آواز میں تھی اور اسی غزل کے پہلے بول تو ظلمی الف لیلہ کے پہلے صفحے پر ہمیشہ سے چھپتے چلے آ رہے ہیں۔"

☆ محمد عامر ساحل نے ڈیرہ اسماعیل خان سے لکھا ہے۔ "دوستوں کے خوب صورت تبصرے نظر سے گزرے جن میں شاہد جہانگیر شاہد، وحید ریاست بھٹی، محمد سلیم قیصر، سلیم خورشید، اویس شیخ، محمد کفیل حیدر اور قیصر عباس کے تبصرے زبردست تھے۔ آج میں تقریباً چھ ماہ کے بعد شہر خیال میں حاضر ہوا ہوں۔ دوستوں کی پُرخلوص محبت کھینچ لائی ہے۔ میں تہہ دل سے قیصر عباس کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جنہوں نے ہر ماہ میری کمی کو محسوس کیا اور ہر ماہ اپنے خط میں برابر میرا حال دریافت کیا۔ میں اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم سے بالکل ٹھیک ہوں۔ پچھلے ماہ خطا نمبر پڑھ کر معلومات میں کافی حد تک اضافہ ہوا ہے۔ وہ اپنی طرز کا ایک مکمل خاص شمارہ تھا۔ دوسرے دوستوں کی خاطر میری بھی تمنا ہے کہ سال بھر کا ایک خاص شمارہ نکلے اس شمارے کے صفحات اور قیمت بڑھا دیں جس کے پڑھنے میں زیادہ سے زیادہ لطف ملے۔ اب آتا ہوں کہانیوں کی طرف۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی گل فارس میں پیارے صحابی حضرت سلمان فارسیؓ کے بارے میں تفصیل کے ساتھ پڑھ کر بہت مزہ آیا اور ان کا مذہب اسلام اور نبی پاک کی محبت کی خاطر قربانیاں دینا ہم سب کے لیے ایک مثال ہے۔ اس کے بعد شکار کہانی میں "انسانی گارا" پڑھی یہ اپنی نوعیت کی ایک الگ شکار کتھا تھی۔ اس کے بعد "خلائے بے پایاں" پڑھی بہت اچھی لگی۔ اس کے بعد "تلاش" پڑھی جسے پڑھتے پڑھتے دن میں بھی رونگٹے کھڑے ہو گئے جب اختتام پر لکھا تو "جاری ہے" دیکھ کر تجسس باقی رہ گیا کہ نہ جانے اس کے ساتھ کیا کچھ ہونے والا ہے۔ بہت ہی لاجواب داستان ہے۔ اس کے بعد "واقعی" پڑھی جس میں ایک بادشاہ نے نہایت ہی عقلمندانہ اور انوکھا طریقہ ڈھونڈا مجرم کو پکڑنے کا۔ اگر اس کی جگہ کوئی کم عقل بے وقوف ہوتا تو کسی کو بھی رسوا کروا دیتا اور ساری زندگی بیٹھا روتا رہتا۔ کیونکہ جو کچھ ہو گیا سو ہو گیا اسے واپس تو نہیں لایا جا سکتا پر اپنی عقل سے آگے کے حالات کو قابو کیا جا سکتا ہے۔ اس کے بعد سچ بیانوں میں "آئینہ اور شناخت" پڑھ کر مزہ آیا۔ "کرائے کے لوگ" واقعی حیرت ہوئی کہ کیا انسان جو دوسروں پر رونے کی صلاحیت رکھتا تھا پھر اسی ہی صلاحیت کو اپنا پیشہ بنا کر ہزاروں لاکھوں کما رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی اس عجیب دنیا میں ہر موڑ پر ایک عجیب و غریب انسان دکھائی دیتا ہے۔ یہ سب میرے اللہ تعالیٰ کا کرم ہے۔ سبحان اللہ۔"

☆ اویس شیخ کی خیال آرائی ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ "سرورق پر منیر نیازی کا فوٹو اچھا لگا مگر شمارہ پڑھنے کا موقع نہ مل سکا۔ کاروباری مصروفیات ایسی تھیں کہ اداریے سے آگے بڑھ نہ پائے۔ اب عید کے بعد ہی پڑھ سکوں گا۔ تو آج شہر خیال میں صرف اداریے پر تبصرہ کرنا پسند کروں گا۔ انکل معراج!

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

وی آئی پی کلچر تب ہی ختم ہوگا جب ملک عزیز میں انصاف کی فراہمی یقینی ہوگی اور یہ چیز ڈھونڈنے پر بھی نہیں مل رہی مگر افسوس انصاف ہمیں ان کو فرقوں میں نظر آتا ہے جو اسلام کو جانتے اور نہ اسلامی تعلیمات کی باتوں سے واقف ہیں۔ امریکی صدر جب بارک اوباما نے اسرائیل سے مل کر فلسطین تباہ و برباد کر دیا۔ لیکن اسے اپنے ملک کی ریاست کے کسی کونے میں بھی الف کلب میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ملی۔ کیوں؟ کیونکہ ہر کلب کے منتظم نے تمیز کو جواب دیا ''آپ صرف چوتھی جماعت پہلے صدر کی خواہش سے مطلع کر رہے ہیں اور ملکی اندرونی مسائل کی وجہ سے اتنے کم وقت میں ان کے لیے انتظامات کرنا ممکن نہیں ہو گا۔''

☆ طاہرہ گلزار کی آمد پشاور سے۔ ''تمام دوستوں کو پہلے عید قربان کی مبارک باد۔ انکل! میں نے اپنے والد صاحب کی زندگی اور تعلیم حاصل کرنے کے لیے جو محنت کی ہے اس پر کچھ قلم اٹھایا ہے اور دو کہانیاں جاسوسی کے لیے لکھی ہیں۔ میں بھجواؤں گی۔ پڑھ کے اگر پسند آئے تو شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کریں۔ جزاک اللہ۔ اس بار یک گئی میں ''مبلغ'' پڑھ کر جو روحانی خوشی ہوئی پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ دل و دماغ پر ایک پرسکون سا پردہ آیا جب محمد مارما ڈیوک پکتھال کے بارے میں پڑھا کہ انہوں نے اسلام کے لیے کتنی بڑی قربانی دی۔ اللہ نے انہیں جنت فردوس میں حضور پاک کے پاس پہنچایا ہوگا۔ اس بار بھی عمران جونانی نے یہ خبر دی کہ اس بار آپ کا خط شائع ہوا ہے۔ سن کر خوشی ہوئی اور جب شہر خیال میں اپنے شہر کے شاہد جہانگیر شاہد کا خط دیکھا تو خوشی دوبالا ہوگئی۔ ویلڈن شاہد صاحب۔ آپ کے خط کے ایک ایک لفظ نے خون کے آنسو رلا دیا۔ کوئی کیسے کوئی محمد بن قاسم، صلاح الدین ایوبی اور قائداعظم جیسا رہنما مل جائے لیکن ہم محسن کش لوگ ہیں۔ اپنے محسن کا خون اپنے ہاتھوں کرتے ہیں۔ 4 اپریل 1979ء کو گزرے اتنا زیادہ عرصہ تو نہیں ہوا ہم اسی عاشق رسولؐ کے خون کی سزا ابھی تو کاٹ رہے ہیں۔ اس وقت میں 13 سال کی تھی جب یہ واقعہ ہوا تھا۔ اس وقت مجھے یوں محسوس ہوا تھا کہ آج تمام پاکستانی یتیم ہو گئے ہیں۔ شکریہ کہ آپ نے یاد رکھا۔ آپ میرے کان لگے تو آتے نہیں۔ امتیاز حسین! انکل تو تین یا زیادہ سے زیادہ پانچ تاریخ تک خط رجسٹری کروا دیتی ہوں۔ پشاور میں مشکل سے دو تاریخ تک سوہنی سرگزشت آتا ہے۔ محمد سلیم قیصر آپ نے مجھے یاد نہیں کیا پھر بھی وعلیکم السلام۔ میری دعا ہے اللہ آپ کی تکالیف ختم کرے۔ آمین۔ ویلڈن آفتاب احمد نصیر اشرفی آپ کے خط کے ایک ایک لفظ نے دل کو چھو لیا۔ ہم کتنا بھی دل جلائیں ان ظالم اور بے حس حکمرانوں پر اثر ہونے والا نہیں۔ اللہ ہم سب پر اپنے کرم کی بارش کرے آمین۔ سعدیہ بالو! اسد آپ نے بالکل صحیح کہا ہے۔ واقعی عشق کا کوئی نمبر اور پہلا اسرار قیصر کی طرح خط نمبر بھی زبردست رہا۔ اگلا نمبر تو یہ نام ہونا چاہیے جس میں کسی چھوٹی سی بات نے زندگی بدل دی ہو۔ واقعی سعدیہ بی آج سے 20 سے 30 سال پہلے کی زندگی کافی پرسکون اور اچھی تھی۔ سلیم خورشید ٹیلی ویژن کے ڈراموں کا تو ذکر ہی نہ کریں۔ ایسا ڈراما نہیں دکھانا چاہیے جس میں میاں بیوی کے پیار محبت کو دکھایا جائے۔ شکریہ سید انور عباس شاہ کیا کریں ڈاک خانے والوں کے ساتھ ان کا کچھ نہیں ہو سکتا۔ قیصر عباس! آپ کے الفاظ نے دل خوش کر دیا۔ اتنا پیارا پیغام بھائی سے، شکریہ دیکھو لوگ آپ کے حاضر ہوں۔ مصروفیت تو گئی اب میں سرگزشت اور جاسوسی کو خط وقت پر رجسٹری کرتی ہوں۔ ہاں میں نے ضد میں آ کر سسپنس میں خط لکھنا چھوڑ دیا ہے کیوں کہ سسپنس والوں نے کچھ لوگوں کی وجہ سے میرا خط شائع کرنا چھوڑ دیا۔ بشریٰ افضل جی اللہ آپ کو ہمیشہ خوش و خرم رکھے۔ تمام دوستوں کے خطوط بہت شاندار تھے۔ جاوید مہرکانی، تنویر عباس اور فرح انجم کی کمی بہت محسوس ہوئی۔ اب کہانیوں پر تبصرہ۔ حسب عادت پہلے سراب پڑھی جو آہستہ آہستہ منزل کی طرف گامزن ہے۔ بیٹے کے بغیر ایسا لگ رہا ہے کہ بغیر نمک کے سالن کھا رہے ہیں۔ فاطمی ایک بار پھر ہاتھوں سے نکل گیا۔ ساوی حویلی بروقت پہنچائی گئی آخر میں بھر عبداللہ، صغیر اور شہباز ذہوا شاہ کے ہاتھوں اغوا، ایکشن سے بھرپور قسط۔ سراب کے بعد حسب عادت سچی کہانیوں پر تبصرہ حاضر ہے۔ پہلی کہانی ''آئینہ'' رضیہ مہدی کی زبانی جگہ یہ اس کی کہانی نہیں 80 فیصد ہمارے معاشرے کی کہانی ہے۔ میں فخر سے کہہ سکتی ہوں کہ ہمارے پٹھان گھروں میں ایسا نہیں ہے اگر ہے بھی تو 20 فیصد ساس بہو کی لڑائی ہوتی ہے۔ میری اپنی زندگی تو شوہر کے ہاتھوں کب کی تباہ ہوگئی ہے لیکن اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے میری تین بھابیاں ہیں ایک کی شادی کو آٹھ سال ہو گئے ہیں لیکن ہمارے گھر میں بہت شانتی ہے۔ میرے والد صاحب کہتے ہیں میری چھوٹیاں ہیں کیوں کہ ہم سمجھتی ہیں ہم نے کہاں واقعی انشاءاللہ جلد وہ اور بھابیاں آ جائیں گی۔ میں اگر ایک ہفتہ بھی گھر نہ جاؤں تو میری تینوں بھابیاں فون کرتی ہیں کہ باجی خیریت تو ہے آپ کیوں نہیں آئیں۔ میری دعا ہے کہ اللہ ان کو بہت خوشیاں دے۔ رضیہ بہن آپ نے اس منافقت زدہ معاشرے میں بالکل صحیح اور جائز قدم اٹھایا ہے۔ ''شناخت'' بھی ہمارے اس ظالم اور بے حس معاشرے کی کہانی ہے جہاں لاکھوں روشن جہانگیر ہوں گے جو ایماندار، نیک اور باصلاحیت بھی ہوتے ہیں اور معاشرے کے لیے کارآمد ہو سکتے ہیں۔ تیسری کہانی ''کرائے کے لوگ'' ہم صاحب آپ نے بالکل سچ کہا ایسے نایاب لوگ آٹے میں نمک کے برابر ہوتے ہیں۔ میں خود بہت حساس ہوں لیکن مجھے غصہ بھی بہت آتا ہے جب لوگ جھوٹ، بے ایمانی اور بے حسی کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ عارف خان نے اس کو بزنس بنا لیا اور وہ کیا حاصل پاتی ہے۔ چوتھی کہانی ''ماحول'' ایک حساس موضوع لیے ہوئے تھی۔ آج کل میڈیا، مختلف چینلز اور موبائل انٹرنیٹ نے بچے بچیوں کو بہت خراب کیا ہے۔ ہم نام کے مسلمان رہ گئے ہیں۔ ماموں، خالو، پھوپھا اور چچا کا بیٹا یہ نہیں سوچتا کہ یہ میری عزت ہے میں اپنی عزت خود خراب کر رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں ایسی کسی کی گندگی سے۔''

☆ رعنا محمد سجاد کی آمد مظفر گڑھ سے۔ ''خط نمبر خوب صورت شمارہ رہا۔ عمران جونانی، قیصر عباس نے ہماری غیر حاضری کو محسوس کیا یہ ان کی محبت تھی۔ حکمرانوں کی خطا، خطا نظریہ، جنگی خطائیں، خطا در خطا، کہرے کا تبصرہ خوب صورت تحریر یا تھیں۔ مسلمانوں کی خطا پر افسوس ہوتا رہا اور غلطیوں کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ اب اکتوبر کے شمارے پر بات کرتے ہیں۔ ملکی سیاست ان دنوں بھونچال کی زد میں ہے۔ تبدیلی اور انقلاب کا علم اٹھائے ہوئے دستور کی شاہراہ پر براجمان ہیں۔ معراج رسول صاحب کا اظہار خیال بالکل درست ہے۔ یک تین سرگزشت میں ابتدا میں پڑھ کر اندازہ ہو گیا تھا کہ کچھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جانی پہچانی شخصیت ہے لیکن نام ذہن میں نہیں آرہا تھا۔ شہر خیال میں شاہد جہانگیر صدارت پر فائز تھے۔ صدارت مبارک ہو۔ خوب صورت تبصرہ تھا۔ محمد سلیم قیصر اللہ آپ کو جلد رہائی عطا فرمائے، آمین۔ آفتاب احمد قیصر کا تبصرہ جامع تھا بہت پسند آیا۔ طاہرہ گلزار بھی حاضر تھیں۔ لگتا ہے شاید آپ نے جلدی خط لکھنے کا ارادہ کر لیا تھا۔ شبیر شیخ سے سعدیہ بانو، گوری صاحبہ تشریف لائیں۔ خدا کراچی کی بہاریں پھر سے لوٹا دے، آمین۔ سلیم خورشید، احمد خان آفریدی، سید انور عباس، وحید ریاست بھی خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر تھے۔ شہر خیال کی ایک دم ینہ قاری بشریٰ افضل بھی حاضر تھیں۔ بہت خوشی ہوئی۔ رابعہ تحسین تابش، قیصر حاضر ہیں؟ انور اعجاز، وجاہت، ابن متبول جاوید صدیقی اور بہت سے دوسرے لوگ کہاں ہیں؟ جلدی تشریف لائیں۔ بصورت دیگر ہم مرنے کی دھمکی دیں گے۔ لائف اخبار کی کہانی پڑھی۔ اس کے ارتقاء کی تفصیل شکیل صدیقی کی اچھی کاوش تھی۔ عنوان پر صدر کینیڈی کی تصویر تھی نا؟ (جی ہاں)۔ ''الوداع'' مملکت سعودیہ کی ان دنوں کی احوال زیست بیان کرتے ہوئے نظر آئے۔ افسوس بھی ہوا کہ سعودی باشندے اس وقت بلکہ اب بھی کتنے عیش پرست ہیں۔ مرشد حسین صاحب جیسے لوگ ہی تو اس نظام کی جڑوں میں بیٹھے ہیں۔ زبیر کا سفر سیدہ و تا کی کاوشوں کی داد دی جانی چاہیے۔ کاش ہمارے ملک میں بھی اس قسم کا کوئی آپریشن ہو۔ ''انسانی بھوا'' مغربی افراد کی سفاکی کی داستان تھی۔ تقاس کے ساتھ بالکل ٹھیک ہوا۔ اس کے ساتھ ویسا ہی ہونا چاہیے تھا۔ انور فرہادکی ''دیر کر رہا ہوں'' ایک اچھی تحریر تھی۔''

☆ روزینہ حنیف کراچی سے لکھتی ہیں۔ ''ایک کہانی ''زہر عشق'' بھیج رہی ہوں۔ سرگزشت ایک مدت سے پڑھ رہی ہوں۔ خواتین کے لیے نکلنے والے ڈائجسٹوں میں طویل عرصے سے کہانیاں لکھ رہی ہوں۔ معاوضہ بھی ملتا ہے۔ یہ پہلا موقع ہے جب ایک ایسے ڈائجسٹ میں کہانی بھیج رہی ہوں جو خواتین کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ امید ہے کہانی آپ کو پسند آئے گی۔ کچھ عرصے سے براہ راست کمپیوٹر سے ان پیج پر لکھنے لگی ہوں پر نٹر نہیں ہے میرے پاس پرنٹ نکلوانے بھیجنا پڑتا ہے اگر آپ کی مرضی ہو تو میں کہانی آئندہ سے Mail کر دیا کروں؟ (جی ہاں! میل کر دیا کریں، حنیف صاحبہ کا نمبر بند جا رہا ہے ورنہ اطلاع کر دیتا کہ یہ کہانی سرگزشت کے مزاج کی نہیں ہے)''

☆ قیصر خان کا اظہار یہ بھکر سے۔ ''اداریے میں بہت ہی اچھے خیالات تھے۔ لیکن میرا اشتیاق ہے۔ مسافروں کا دریہ جار جانہیں تھا۔ تین گھنٹے کا انتظار بندے کا پارہ چڑھا دیتا ہے۔ یہ ردعمل ہونا تھا۔ اس وی آئی پی کلچر نے پوری قوم کو تباہ کر دیا ہے۔ پولیس کی بے شمار تعداد کو پروٹوکول پر معمور ہونے کی وجہ سے پیشہ ورانہ ذمہ داریاں بہت مشکل سے پوری ہوتی ہے۔ پہلے ہی تعداد کم تھی کہ اب یہ نیا فریضہ۔ یہ وی آئی پی اغیر پولیس کے باہر نہیں نکلتے ہیں۔ اکتوبر کے شمارے میں شاہد صاحب اچھوتے انداز سے جلوہ افروز تھے۔ ہر پہچ کی تعریف کے ساتھ پاکستان کے مسائل پر بات کی۔ بہت مبارک باد میری طرف سے۔ اکتوبر میں میرے سارے پسندیدہ تبصرہ نولیس شامل تھے جو کہ میری عید کی خوشی کو دوبالا کر گئے۔ آپا طاہرہ گلزار، B.Jist والی حاضر تھیں اور بہت اچھے انداز سے اپنی تمام رام کہانی بیان کی۔ جلد ہی ان کی کرتے اب ہونے کی خوش خبری سننے کو ملے گی۔ آپا جی مرد جذباتی فیصلے نہیں کرتے کیوں کہ اگر مرد جذبات سے فیصلے کرتے تو دنیا آج کچھ اور منظر پیش کرتی۔ یہ عالیہ کا جذباتی اور غلط فیصلہ تھا۔ جب کہ فرحان کہتا رہا یہ غلط ہے۔ اللہ سے دعا ہے عالیہ کے لیے، آمین۔ سعدیہ، گوری کراچی کے ماضی کا حال بتا کر ہمیں آگاہ کر رہی تھیں۔ کاش ایسا آج ہو جائے، آمین۔ بشریٰ افضل ہم سب دعا گو ہیں کہ اللہ کسی انسان پر مصیبت یا دکھ درد نہ دے (آمین)۔ ہم دعا گو ہیں گے کیوں کہ شہر خیال کے دوستوں کو صرف دعا کی ضرورت ہے باقی ہم ایک دوسرے کے کچھ خاص کام نہیں آسکتے۔ ہم سب اس دکھ کی گھڑی میں آپ کے ساتھ ہیں اور عظمیٰ شکور سے انتظار اور میری اپیل کے ساتھ دعا گو ہیں۔ جلد ان کی لکھی کہانی پڑھنے کو ملے گی۔ طاہر بیگ کا افسوس ہوا۔ تبصرے میں نام تھا۔ ڈاکٹر قرۃ العین اور ڈاکٹر نفیس دونوں غیر حاضر تھیں۔ اب نفیس صاحب کی صحت کا کیا حال ہے؟ اللہ تعالیٰ کرم کرے اور ڈاکٹر قرۃ العین کا جلد از جلد تبصرہ پڑھنے کو ملے، آمین اور خیریت سے ہوں۔ امتیاز صاحب آپ سے عرض ہے کہ آپ وقت نکال کر لکھا کریں اور انگلش سے عقیدت ہماری بھی آپ کی طرح ہے۔ محمد سلیم قیصر وعلیکم السلام! اللہ آپ کی مشکل آسان کرے، آمین۔ سلیم خورشید جدید ٹیکنالوجی کے تقدم استعمال پر ملال ہیں مجھے ہم خود بہت نالاں ہیں۔ آفریدی صاحب نیکٹ کی تباہی پر افسوس کر رہے تھے جو کہ ہونا ہے درد دل رکھنے والے ہر سچے پاکستانی کو۔ بھکر سے شاہ جی نے اور خطا کار کی کہانی پر شکوک ظاہر کیا۔ شاہ جی بھولنے والے نہیں ہیں جن کہانیاں ایسی ہوتی ہیں۔ عمران جونانی جی نے خط نمبر پر رائے پیش کی۔ سب کی طرح پسندیدگی کا اظہار کیا۔''

☆ سعدیہ بانو گوری، وشیر شاہ کراچی سے رقم طراز ہے۔ ''انکل معراج نے اداریے میں جس خبر کا ذکر کیا اس خبر کو ہم نے بھی پڑھا۔ وی آئی پی شخصیات کو اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ ان کی وجہ سے لوگوں کو کتنی ذہنی اذیت کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ایسے میں اگر دو وی آئی پی کو جہاز سے زبردستی اتار دیا گیا تو کچھ غلط تو نہیں ہوا۔ آخر کبھی نہ کبھی تو عوام کے صبر کا پیمانہ لبریز ہونا تھا۔ میڈیا نے ایک جانب سے اس واقعے کو خصوصی کوریج دی تو دوسری طرف اعلیٰ حکام کی طرف سے اس اقدام کو غلط قرار دیا گیا۔ ایسے میں ہماری سمجھ میں تو نہیں آیا کہ کس کے کیے پر افسوس کریں اور کس کی حرکت پر ماتم اور ایک خبر یہ بھی پڑھنے کو ملی کہ جس شہری نے وی آئی پی کلچر کے خلاف آواز بلند کی تھی اسے اس کی کمپنی نے نوکری سے ہی فارغ کر دیا۔ اس واقعے کا انجام جو ہے کہ گو بھی ہو لیکن ہم یہ شکوہ تو کر سکتے ہیں کہ ''ہم آہ بھی کرتے ہیں تو ہو جاتے ہیں بدنام۔ وہ قتل بھی کرتے ہیں تو چرچا نہیں ہوتا''۔ شہر خیال کی محفل میں تمام دوستوں کی خیال آرائی اچھی لگی۔ شاہد جہانگیر شاہد نے چیدہ چیدہ مضامین پر جو کہ بڑا عمدہ اور تفصیلی تبصرہ کیا۔ طاہرہ گلزار اب تو اپنی ناراضگی ختم کر دیجیے آپ تو سب کی باجی ہیں اور باجیاں تو ہمیشہ ہنستی مسکراتی اچھی لگتی ہیں۔ امتیاز حسین دعاؤں کا شکریہ۔ سلیم قیصر وعلیکم السلام! خدا پاک آپ کی مشکلات آسان کرے۔ آپ کے خط کو پڑھ کر افسوس ہوا کہ آپ کو وہاں نہیں جانا چاہیے تھا جہاں آپ ہیں۔ رانا شاہد کا تبصرہ اچھا لگا۔ محترم آپ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے مشورے پر عمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ انکل قیصر عباس خان کا شوق نامہ بڑے شوق سے پڑھا جن صاحبان نے ہمارا تبصرہ پسند کیا ان کا شکریہ۔ میں دیر کر رہا ہوں۔ انور فرہاد کی اچھی کاوش رہی۔ اپنے نام کی طرح بے نیازی دکھانے والا اور بے پروا سے منیر نیازی کا تذکرہ اچھا لگا لیکن افسوس کہ ہر کام میں دیر کر دینے والے نے دنیا سے جانے میں بڑی جلدی کی۔ ابن کبیر کا انتخاب ہمیشہ کی طرح منفرد رہا۔ ”خلائی ہوا باز“ پڑھ کر قدرت کی ستم ظریفی پر حیران رہ گئے کہ ایک جہاز کو تباہ کرنے کی غلطی بھی ایک انسان سے ہوئی اور ایک انسان نے ہی اپنا دن رات ایک کر کے اس جہاز کی تباہی کا راز حرف بہ حرف جان لیا۔ خوب صورت انداز تحریر ابن کبیر کو ہماری طرف سے ریڈ لائن۔ منظر امام کا معلوماتی سلسلہ اختتام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اکتوبر کے حوالے سے معلومات دلچسپ رہیں۔ ”قصص الف لیلہ“ کے صفحات پر ماضی کی نادر شخصیات چھائی رہیں۔ شیاما کے ماضی کی خوب صورت تصویر حال کی تصویر کے بالکل برعکس تھی۔ اس خوب صورت اور خوددار اداکارہ کا ماضی دیکھ کر دل دکھ سے بھر گیا جو روشن اور چمکدار کیوں نہ ہوا اندھیرے کی تاریکی کی اس پر غالب آنے سے کوئی نہیں روک سکا۔ عدنان مسیح کو شکریہ کہ دوبارہ ادائی کا ساتھ رواں آ گیا۔ بیت بازی میں منشی محمد عزیز کا شعر بازی لے گیا۔ سچ بیانیوں میں ”آئینہ“ اچھی لگی۔ آئینے میں ہمیشہ وہی شبیہ ابھرتی ہے جس کا عکس ہم دیکھنا چاہتے ہیں۔ دونوں عورتوں نے اپنی اپنی فطرت کے باعث جو شبیہ تراشنی چاہی اس کا عکس بھی دیکھ لیا۔ یعنی برائی کے بدلے دکھ اور اچھائی کے بدلے سکھ۔ ماحول میں خورشید اختر نے اہم مسئلے کی طرف توجہ دلائی۔ بیٹیاں تو کانچ کی طرح نازک ہوتی ہیں ایک بار اگر ٹوٹ جائیں تو ساری عمر بھی اپنی ذات کی ٹوٹی بکھری کرچیوں کو سنبھال نہیں پاتیں اور بیٹیاں تو ماؤں کا عکس ہوتی ہیں اس لیے ان تمام ماؤں کو چاہیے کہ وہ اپنے عکس کو صاف شفاف اور لوگوں کی ہوس زدہ نظروں سے محفوظ رکھیں۔ احسان اور محترم دونوں آستی سکرانی تحریروں کو پڑھ کر مزہ آ گیا۔ غالب السوتی کی قدر کا انجام اچھا رہا۔“

☆ منشی محمد عزیز سمیجے کی لندن سے آمد۔ ”اس بار کا شمارہ 29 ستمبر کو مل گیا تھا۔ ایک مزے کی بات آپ کو بتاؤں میں سمجھا تھا کہ نومبر کا شمارہ سلور جوبلی نمبر ہوگا اور اسی وجہ سے میں نے سرگزشت کا پچیس سالہ ریکارڈ بھیجنے میں جلدی کی تھی۔ بہرحال ایک التجا کہ سلور جوبلی نمبر کے کم از کم چار سو صفحات ہونے چاہئیں۔ قیمت بھی اسی حساب سے بڑھا لیجیے گا۔ محترم معراج رسول صاحب کے اداریے کے بعد سیلف تک جا پہنچے۔ شہر خیال کی صدارت ایک بار پھر محترم شاہد جہانگیر شاہد کے حصے میں آئی۔ ڈاکٹر زوبیدہ تبسم بہنا اور وکیل صاحب! آپ کہاں رہ گئیں۔ اللہ تبسم بھائی کو تندرستی اور صحت کاملہ عطا فرمائے۔ اپنی خیریت کی اطلاع دے دیں۔ محمد عامر ساحل، ایم اے خالق بھٹی اور عبدالرؤف عدم صاحبان! آپ لوگ کہاں رہ گئے۔ امتیاز حسین بھرگڑی صاحب! اب تو آپ کا نشر ٹوٹ گیا ہو گا ناں؟ محمد سلیم قیصر وعلیکم السلام! اللہ آپ کو ہر قسم کی پریشانیوں سے نجات دلائے، آمین۔ عظمیٰ شکور! لیڈوانس میں مبارک باد قبول فرمائیں اور مٹھائی کی دعوت مت دینا ورنہ میں سرگودھا بھی پہنچ سکتا ہوں۔ جن دوستوں نے خط کی پسندیدگی کا اظہار کیا ان کا شکریہ۔ کل نورس پڑھ کر ایمان تازہ ہو گیا۔ سبحان اللہ! کیا شان ہے حضرت سلمان فارسی کی۔ اور کیا انعام دیا ہے اللہ نے ان کی محبت کا۔ کاش اس کا عشر عشیر ہمیں بھی نصیب ہو جائے! شکیل صدیقی لائف کے عنوان سے انٹر پیٹنی جرید سے کی کارکردگی بیان کر رہے تھے۔ ”الوداع“ میں رفیعہ سے گفتگو رہا اچھا لگا۔ ”انسانی کارا“ کے آخر میں میرے خیال میں تو دماغ پر زور دیے بغیر بھی بات کا پتا چل جاتا ہے کہ شکاری نصیر احمد نے جان بوجھ کر کیوں تماسی کو ہلاک کیا تھا کیوں کہ آخر کو انسانیت بھی کوئی چیز ہے اور تماسی نے تو کوکی اور لنگو کی جانوں کی بھی ذرا برابر پروا نہیں کی تھی۔ اچھا ہی ہوا جو نصیر نے اسے اگلے جہان پہنچا دیا ورنہ جانے وہ اور کتنے لوگوں پر مظالم ڈھاتا۔ انور فرہاد نے منیر نیازی کی بے نیازی کا مختصر مگر خوب بار یکی سے جائزہ پیش کیا۔ ”قصص الف لیلہ“ کو کیا کہوں۔ تجمد روح ایک بہترین اور مستقل مزاج مہم جو کی داستان تھی۔ ”خلائی ہوا باز“ پڑھتے ہوئے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ کہانی جتنا خاص نمبر کے لائق تھی لیکن رہ گئی۔ بہرحال سولا کی نے جس محنت اور جانفشانی کے ساتھ اس مسئلے کا حل تلاش کیا اور جس طرح سے دوبارہ وہی خطا دہرانے کا حل کیا وہ نہایت ہی قابل تعریف ہے۔ شیراز خان کی تلاش میری نظر میں اس ماہ کی دوسری بہترین کہانی ہے جس کے آخر میں ”جاری ہے“ کا پڑھ کر تشنگی بڑھ گئی۔ ”کم سن قتل“ میں شدید حیرت ہوئی یہ پڑھ کر کہ ایک چودہ سالہ لڑکے نے کیا کمال کر دیا کہ امریکی صدر کو بھی پریشان کر کے رکھ دیا۔ ”اکتوبر“ نے جنرل نالج میں کافی اضافہ کیا۔ ”آئینہ“ اور ”ماحول“ دونوں کہانیاں گھریلو حالات سے متعلق تھیں اور یہ دونوں ہی مجھے بہت... اچھی لگی ہیں۔ شاید وجہ آپ سمجھ ہی جائیں گے کہ میں بھی چھ بیٹیوں کا باپ ہوں اور جیسا ماحول کہانی میں بیان کیا گیا ہے خدانخواستہ ایسا ہونے سے ڈرتا ہوں۔ ”آئینہ“ میں بیان ہونے والے حقیقت کا شکار خود میں ہوں۔ میری والدہ اور بہنیں بھی مجھے ”زن مرید“ کے طعنے دیتی ہیں اور میں خاموشی سے سننے پر مجبور ہوں۔ سچ پوچھیں تو ایسے دو تین قسم کے اعتقاد دواجوں سے مجھے شدید نفرت ہے لیکن میں اکیلا کچھ کر نہیں سکتا۔“

☆ محمد عمران جونانی کراچی سے لکھتے ہیں۔ ”اداریہ میں آپ فرماتے ہیں کہ ”VIP کلچر میں اضافہ ہو رہا ہے“ میں اس سے متفق نہیں۔ ہماری قوم پر نئے دنیا کی غلامی کی زنجیریں تو ٹوٹی جا رہی ہے اپنی بات آگے پہنچانے کا شعور آ تا جا رہا ہے اب مکمل کرانا جاج دیکھنے کو ملتا ہے۔ محمد ماریا کی یک شتی کی داستان نے ایمان تازہ کر دیا۔ اللہ ہمیں اسلام کی سچی قدر دانی نصیب کرے۔ یقین کریں مجھ میں اس عظیم نعمت کا ادراک ہی نہیں تھا۔ شاہد جہانگیر کی صدارت پر ہیں آپ کے فکر انگیز خط میں نقل کیا ہوا منیر نیازی کا خوب صورت شعر بہت پسند آیا۔ امتیاز حسین کا عمران رنگ میں ڈوبا ہوا رسیلا انداز پسند آیا۔ محمد سلیم قیصر وعلیکم السلام بھائی ہم تمہارے لیے دعا کرتے ہیں یا اسلام کا کثرت سے ورد کیا کرو۔ طاہرہ گلزار! یہ تو آپ کی بات چیت اور تحریر سے صاف ظاہر ہے کہ آپ پڑھی لکھی ہیں۔ عہدہ شایان شان نہ ہو تو تحریر ہے بھر ضائع نہیں جاتا۔ سدرہ بانو نے بہت ہی تحریروں کا خوب صورتی سے احاطہ کیا۔ ادلیس شیخ نے تمام توجہ سچ بیانیوں پر خرچ کی۔ بھائی یہ امرائیل اور فلسطین کی لڑائی صرف فلسطین کی کشاکش نہیں اس مسئلے کی جڑیں بہت گہری ہیں۔ وحید

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ریاست! آپ نے جو سیاست پر تبصرہ کیا وہ ہر بندے کے دل کی آواز ہے۔ ساحر لدھیانوی کے اشعار پسند آئے۔ شکیل حیدر کی خاص نمبر والی تجویز قابلِ غور ہے۔ رانا محمد شاہد! آپ کی تحریر نکھرتی جارہی ہے۔ نہایت رواں انداز ہے۔ عظمیٰ شکور کی کہانی کا مجھے بھی انتظار رہے گا۔ اس کے علاوہ سلیم خورشید احمد خان توحیدی، سید انور عباس، قیصر عباس اور بشریٰ افضل کے تبصرے پسند آئے۔ حضرت سلمان فارسی کی زندگی اسلام کی حقانیت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ آپ نے تلاشِ حق میں طویل صعوبتیں برداشت کیں اور سوچ سمجھ کر اسلام قبول کیا۔ Life کے بارے میں شکیل صدیقی کی معلومات صحافت سے دلچسپی رکھنے والے مجھ جیسے لوگوں کے لیے اہم تحفہ ہے۔ اخبار کے دفتر کا ماحول مجھے اپنی طرف بلاتا محسوس ہوتا ہے۔ اس مضمون نے مغرب کے صحافتی ماحول کے کچھ حصوں کی جھلک دکھائی۔ حسن رزاقی کی تحریر ایک ماہ کے وقفے کے بعد شمارے کا حصہ بنی۔ ان کی زندگی پر رشک آتا ہے۔ کس طرح انتھک محنت کرتے ہوئے آگے بڑھتے دنیا دیکھنے کا موقع ملا۔ مختلف شعبوں میں کام کیا ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ زندگی کو خوب اچھی طرح استعمال کیا۔ اچھے سفرنامہ نگار کی صورت گھر بیٹھے دنیا دکھا رہے ہیں۔“

☆ رانا محمد شاہد بورے والا سے لکھتے ہیں۔ ”اکتوبر کا سرگزشت خلافِ توقع 26 کو ہی مل گیا۔ شاید عیدالاضحیٰ کی وجہ سے جلدی آیا ہے۔ اداریے میں معراج رسول صاحب ہمارے معاشرے و ملکی سیاست کے ایک دردناک پہلو یعنی وی آئی پی کلچر کو موضوع بنا رہے تھے۔ وی آئی پی کلچر نے طبقاتی تقسیم کی ہے کہ آج امیر کے لیے الگ اور غریب کے لیے یکسر الگ قانون ہے۔ بلکہ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو قانون ہے ہی غریب اور عام آدمی کے لیے۔ کسی نے بڑی خوب صورت بات کہی تھی۔ ”قانون تو مکڑی کا جالا ہے جسے امیر پھاڑ دیتا ہے جب کہ غریب اس میں پھنس جاتا ہے۔“ لیکن پھر بھی ہم کہہ سکتے ہیں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ عوام میں شعور اور اپنے حق کے لیے آواز بلند کرنے کی آگہی آئی ہے ورنہ وی آئی پی موومنٹ کے دوران ایک غریب عورت اگر رکشے میں بچہ پیدا کر رہی ہے تو حکومتی ایوانوں کے لیے یہ معمولی خبر ہے۔ شاید اس لیے کہ ان وی آئی پی لوگوں کی ماں، بہن، بیٹی یا بیوی کے ساتھ ایسی صورت حال پیش نہیں آتی۔ دینِ حق کے ایک عظیم مبلغ محمد مارما ڈیوک پکتھال کی سرگزشت دلچسپ اور ایمان کو تازہ کرنے والی تھی۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی اسلام کو سمجھ کر اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ شہرِ خیال میں شاہد جہانگیر کا تبصرہ اچھا تھا۔ البتہ ان کی آخری بات سے اختلاف ہے۔ ضروری نہیں کہ آپ پشاور میں بیٹھے ہوں تو ہی خط لیٹ کر ڈ میں آئے۔ کراچی والوں کے ساتھ بھی ایسا ہوتا ہے۔ یہ تو پوسٹ آفس والوں کی مہربانیاں ہیں۔ کوئی عرصہ پہلے ہمدرد کا کراچی سے پوسٹ کیا ہوا خط ڈاک خانے کی مہر کے مطابق 186 دن بعد مجھے ملا تھا۔ راولپنڈی، اسلام آباد کے لوگوں کو محمد سلیم قیصر کا موقف سننے کے بعد ان کی مدد ضرور کرنی چاہیے۔ آفتاب احمد نصیر! آپ مشکر زدہ فوڈ ریڈر کے دو بچے کی بات کر رہے ہیں آپ ذرا سوشل میڈیا دیکھیں تو آپ کو ان مشکرز کی حقیقت کا پتا چل جائے گا۔ طاہرہ گلزار مبارک باد و دعا کی پسندیدگی کا شکریہ۔ مسعودہ بانو! آپ اپنے خط میں کراچی کے خوب صورت بجتی رواداری و وضع داری والے دور کا ذکر کر رہی تھیں۔ آپ نے صحیح لکھا کہ آج وہ دور یاد کریں تو خواب سا لگتا ہے۔ بے لوث محبت خلوص اور وضع داری جیسے جذبے تو جیسے ناپید ہوتے جا رہے ہیں۔ سید انور عباس بیٹے کی مبارک باد اور خط کی پسندیدگی کا شکریہ۔ اولیس شیخ آپ نے اپنے خط میں اختر عباس کے کالم سے دو چار لائنیں دیں۔ اختر عباس صاحب سے میں متعدد بار مل چکا ہوں۔ ان کا شمار صاحبِ طرز ادیبوں میں ہوتا ہے۔ وحید ریاست بھٹی کی یک حکمتی سرگزشت کو کتابی شکل میں لانے والی تجویز نہایت معقول ہے۔ یوں ایک دستاویز بن جائے گی اور محفوظ بھی ہو جائے گی۔ سیاحتناموں کی سرگزشت والی تجویز بھی اچھی ہے۔ قیصر عباس خان! واقعی تو ہم پہلے بھی نکتہ لے رہے ہیں۔ ابھی تفصیل سے ساری تحریریں نہیں پڑھیں لیکن یقیناً سرگزشت کی روایات کی امین ہوں گی۔“

☆ حاجی عبدالرحمٰن نے فیصل آباد سے لکھا ہے۔ ”آپ کے موقر جریدہ کا ایک باقاعدہ قاری ہوں۔ میں اپنے بزرگ دوست کی سچ بیانی آپ کی خدمت میں بھیج رہا ہوں اس نے یہ کہانی سچ کی مہر کے دوران مختلف اوقات میں مجھے سنائی تھی جس اس کو کمپوز میں نے کیا ہے۔ یہ کہانی مجھے پسند آئی۔ میرا دوست اور اس کی دوسری بیوی فوت ہو چکے ہیں۔ میں نے اس کہانی میں کرداروں کے نام اور دیگر کوائف بھی تبدیل کر دیے۔ کیونکہ ماں باپ کے علاوہ وہ سب کردار زندہ ہیں۔ یہ کہانی ایک سبق آموز اور معاشرتی حقائق پر مبنی ہے۔ ممکن ہے کہ پڑھنے والوں کو اس سے فائدہ ہو۔ اگر کوئی املا کی غلطی نظر آئے تو درست فرمالیں۔“ (نمبر آنے پر ہی پڑھ کر فیصلہ سنا دیا جائے گا)۔

☆ خالد محمود ملتان سے رقم طراز ہیں۔ ”میں تقریباً 20 سال سے سرگزشت پڑھ رہا ہوں۔ آپ کا صفحہ عام طور پر وقت کی ضرورت ہوتا ہے۔ یہاں پر قانون اور آئین توڑنا ہی بہادری سمجھا جاتا ہے۔ یہی لوگ دوسرے ملکوں میں تیسرے درجے کے شہری بن کر جوتے بھی کھاتے ہیں اور آئین کی پاسداری بھی شوق سے کرتے ہیں۔ ”سیلاب“ (یک گلی) قابلِ ستائش اور منفرد ہے اور آپ کو بتا دے۔ کل فارس چند ماہ پہلے کسی رسالے میں حرف بہ حرف پڑھ چکا ہوں۔ ایک مطبوعہ مضمون کو دوبارہ چھاپنا لاعلمی یا صحافتی جرم کہا جاتا ہے۔ (لیکن یہ ایک وائی تاریخی واقعات ہیں اس لیے قابلِ معافی ہے کہ بیان کردہ واقعات میں تبدیلی نہیں کی جاسکتی ہے) لالہ رسالہ اپنے وقت میں پڑھے سے زیادہ امیر لوگوں کا فیشن تھا جس کا بند ہونا قدرتی امر ہے۔ ”الوداع“ تاریخ کے طالب علم کے لیے اچھا جا رہا ہے۔ ”زہر کا سفر“ ایک بے کار ترجمہ ہے۔ میرے خیال میں تراجم پر انحصار کم کریں۔ (جبکہ سرگزشت میں ابتدا سے تراجم ابتدائی حصے کا جزو رہے ہیں) منیر نیازی صاحب کے بارے میں مختصر مضمون چھاپ کر ان کی شان میں گستاخی کی گئی ہے۔ (منیر نیازی پر مفصل مضامین چھپ چکے ہیں اس لیے ایک دو واقعات لیے گئے) آفاقی صاحب غالباً مجھ سے بڑے ہیں کیونکہ میں پاکستان سے 9 سال بڑا ہوں جو ان کو یاد آتا ہے لکھ دیتے ہیں اور بڑی عجیب سی بناوٹ لفظی جملوں میں ہو جاتی ہے۔ مولانا ظفر علی خان پر لاہور منٹو صاحب اور محمد شفیع (جزاہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

داستان کی وجہ سے اس سلسلے کا نام الف لیلہ رکھا گیا کہ اس میں ہر قسم کی کہانیاں ہوں گی) مجموعہ روح افزا ہے جو ابواب بے معنی تراشے کر کے اوراق کالے کیے گئے ہیں۔ "تلاش" کو کافی دلچسپ بنایا گیا ہے۔ شاید یہ بھی ترجمہ نکلے۔ "کم سن قتل" میرے جیسے بوڑھوں کی سمجھ سے بالاتر ہے۔ (جب کہ اس واقعے نے پوری دنیا میں ہلچل مچادی ہے)۔ "راہی" پسند آئی۔ شاید یہ بھی ترجمہ ہی ہو۔ شکایات آج کل کے ماحول میں کم ہی سمجھ آتا شاید ایک ہزار قارئین میں چار لوگ نکل آئیں (سرگزشت میں ہر ایک کی پسند کا خیال رکھا جاتا ہے۔ کسی پلیٹ کہہ لیں)۔ منظر امام صاحب کو روداد اور یادداشت کر کے پڑھے گا۔ میرے خیال میں سرگزشت کا نام ہی ترجمہ سرگزشت رکھ دیں کیوں کہ سرگزشت کا مطلب ماضی میں ہوتا ہے لیکن کتابی ترجمہ کی نسبت ذاتی ترجمانی زیادہ بہتر ہے جو کہ رسالے کے آخری حصے میں شامل ہے۔ (لیکن ابتداء سے سرگزشت اسی طرح دو حصوں پر مشتمل لکھا آیا ہے جسے قارئین کی تائید حاصل ہے) "سراب" جو کہ سرگزشت کی جان ہوا کرتا تھا اور ہم سب سے پہلے اسی کو پڑھتے تھے اب بے جان ہوتا جارہا ہے۔ بہتر ہے کہ زیادہ بوڑھے ہونے سے پہلے سویرا سے شادی کروہی جائے۔ "آئینہ" پڑھا مگر معلوم ہوتا ہے کہ کسی خواتین ڈائجسٹ وغیرہ کی طرز کے رسالوں کے لیے لکھا ہوگا جو غلطی سے سرگزشت میں ایک معتبر کہانی بنا کر چھاپا گیا ہے۔ بے حد لمبا اور بورنگ۔ "شناخت" رسالے کی جان لگتا ہے۔ یہ بہت بڑا المیہ ہے اس کو حل کرنا ضروری ہے۔ لگتا ہے محترم عبدالستار ایدھی صاحب نے اس کا کوئی بہتر اور قابل عمل حل نکالا ہو۔ بے حد پسند آیا۔ "کرائے کے لوگ" کا پلاٹ حقیقی طور پر غیر حقیقی ہے اس میں غلطی کوئی شک نہیں ہے۔ (آپ OLX پر اشتہارات ملاحظہ کریں کہ کس کس قسم کا کاروبار ہمارے شہر کراچی میں ہو رہا ہے۔ حلالہ کرانے اور طلاق کے جواز پیدا کرانے والے دفاتر کے اشتہار بھی آپ کو نظر آئیں گے)۔ "ماحول" ایک نہایت کامیاب معاشرتی کوشش ہے۔ اللہ تعالیٰ خورشید اختر صاحب کو ایسے مزید موضوعات پر لکھنے کی توفیق عطا فرمائے اور ہمیں اصلی اور حقیقی زندگی کی طرف لے جائے۔ "خطاکار" ایک اچھوتی کہانی ہے جو کہ جہالت دور کرنے اور جعلی زندگی گزارنے سے روک سکتی ہے۔ قدر ایک پرانا قصہ ہے جس پر مضامین دوبارہ لکھے گئے۔ ویسے آپ کی اور غالب الموالی صاحب کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ویلتھ ٹیکس تقریباً 16 سال سے پاکستان میں بند ہے۔ مشرف صاحب کے دور میں وزیراعظم اور وزیر خزانہ شوکت صاحب کی وجہ سے اس کو بند کیا گیا تھا تا کہ امیر لوگوں اور ڈیفنس سوسائٹیوں کے پلاٹوں پر ٹیکس نہ لگے اور صرف غریبوں پر سیلز ٹیکس لگا کر ان کا خون چوسا جائے۔ (کہانی کا پس منظر پرانا ہے)۔ "محترم" اور "تنکا" بے حد خوب صورت سبق آموز کہانیاں ہیں۔ میرے خیال میں ان کو اول اور دوم نمبر پر ہونا چاہیے تھا۔ ندرۃ خرشی۔"

☆ شاہد جہانگیر شاہد کا خلوص بھرا پشاور سے۔ "ادارتی نوٹ میں اس بار وی آئی پی کلچر کو موضوع بنایا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اس VIP کلچر نے عرصہ دراز سے پاکستانی عوام کو ایک عذاب سے دوچار کر رکھا ہے۔ طبقاتی کشمکش ہی اس برائی کا اصل سبب ہے۔ خدا کرے کہ پاکستان اس لعنت سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے پاک ہو جائے۔ یک علمی سرگزشت میں اس بار عالم اسلام کے مشہور مصلح محمد مارما ڈیوک پکتھال کے حالات زندگی اور کارناموں کا نہایت خوب صورتی سے احاطہ کیا گیا ہے لیکن ان کا سب سے بڑا کارنامہ قرآن مجید فرقان حمید کا رواں انگریزی زبان میں ترجمہ ہے جو کہ ساری دنیا میں بے حد مقبول ہے اور آج بھی معمولی ترمیم کے ساتھ بعض متروک الفاظ کو تبدیل کر کے اسی ترجمے سے استفادہ کیا جارہا ہے اور اسی رواں ترجمے کو پیش نظر رکھتے ہوئے حضرت مولانا شیخ محمد جالندھری مرحوم نے اردو زبان میں پہلی بار رواں اردو ترجمہ کیا ورنہ اس سے قبل لفظ بہ لفظ عربی زبان سے تراجم کیے جاتے تھے جو کہ عربی دانوں کے لیے سمجھنا تو آسان تھا لیکن بدقسمتی سے ہم جیسے عربی زبان سے نابلد افراد کے لیے قرآنی آیات کا ترتیب وار رواں ترجمہ بے حد مشکل تھا۔ پکتھال صاحب اور مولانا صاحب نے ہماری یہ مشکل بہت خوب صورتی سے حل کر دی۔ "گل فارس" صحابی رسول حضرت سلمانؓ فارسی کے حالات زندگی اس ماہ کا خاص مضمون ہے۔ بہت عقیدت سے پڑھا۔ آنکھوں سے چوما اور آنسوؤں سے نذرانہ عقیدت پیش کیا۔ ڈاکٹر ساجد امجد نے خون جگر میں قلم ڈبو کر یہ مضمون لکھا ہے۔ منظر امام صاحب کا معلوماتی مضمون "اکتوبر" اس ماہ بھرپور رہا۔ دعا ہے کہ یہ کارواں دسمبر کے بعد بھی نہ رکے اور پھر سے نئے سفر کا آغاز کرے کیوں کہ ابھی بہت سے واقعات تحریر ہونے سے رہ گئے ہیں اور ابھی 2014ء کے اہم واقعات کو بھی تاریخ کا حصہ بنانا ہے۔ محترم قدرت اللہ شہاب کی مشہور تصنیف "شہاب نامہ" پر زویا اعجاز صاحبہ نے خوب صورت تبصرہ کیا ہے۔ یہ کتاب میں نے کئی بار پڑھی ہے اور ہر بار پہلے سے زیادہ دل پر اثر پذیر ہوئی ہے۔ اردو ادب اور تاریخ پاکستان سے دلچسپی رکھنے والے قارئین جنہوں نے یہ کتاب نہیں پڑھی وہ اس کتاب سے ضرور استفادہ کریں۔ قدرت اللہ شہاب وہ شخصیت تھے جن سے تصوف کا سلسلہ شہابیہ جاری ہوا۔ ان کے عقیدت مندوں میں اشفاق احمد، بانو قدسیہ اور ممتاز مفتی جیسے اعلیٰ پائے کے ادیب اور دانشور شامل ہیں۔ شہر خیال کے عادم سید انور عباس شاہ! میں تو اپنی بساط کے مطابق ہر ماہ تبصرہ جلدی لکھنے کی کوشش کرتا ہوں اور بروقت پوسٹ بھی کر دیتا ہوں لیکن کیا کروں کہ محکمہ ڈاک ہی ہمارے خطوط کو مہمان بنا لیتا ہے اور اس وقت پہنچاتا ہے جب پرچہ پریس جا چکا ہوتا ہے۔ یہی شکوہ محترمہ طاہرہ گلزار اور دیگر قارئین سرگزشت کو بھی ہے۔ برادرم وحید ریاست بھٹی نے بہت اچھی تجویز پیش کی ہے کہ اب تک کی تمام یک علمی سرگزشت اگر کتابی شکل میں شائع کر دی جائے تو ایک بہت بڑا علمی، ادبی اور تاریخی خزانہ میسر آجائے گا۔ دیگر تبصروں میں رانا محمد شاہد، طاہرہ گلزار، انور عباس شاہ، صدف ربانی، قیصر عباس خان، سلیم خورشید اور وحید ریاست بھٹی کے تبصرے بھی پسند آئے۔ ڈاکٹر رومینہ تبسم انصاری کے شوہر کو اللہ صحت عطا فرمائے۔ رانا شاہد کو بیٹے کی پیدائش مبارک ہو۔"

تاخیر سے موصول ہونے والے خطوط:

احمد اطہر، کراچی۔ عثمان نازش، لاہور۔ سہیل آفندی، نگار جبیں، ملتان۔ صاحب جان، سرگودھا۔ اسماعیل بٹ، شیخوپورہ۔ نزہت، چیچہ وطنی۔ سعید احمد حامد، کراچی۔ محمد ضیاء الاسلام، راولپنڈی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مقتول آزادی

ڈاکٹر ساجد امجد

آزادیٔ وطن کا خواب ایسے ہی پورا نہیں ہوجاتا۔ قابض حکمران آزادی خوان میں سجا کر پیش نہیں کرتے ہیں۔ اسے بزورِ بازو اور فہم و فراست سے حاصل کیا جاتا ہے۔ اس نے بھی اپنے وطن کی آزادی کی خاطر طویل جدوجہد کی راہِ پرخار کو عبور کیا۔ پابندِ سلاسل رہا۔ مفلسی بنتِ زمین، پھٹے پرانے کپڑوں میں ننگے فرش پر راتیں گزاریں مگر دل میں انگریزوں کے خلاف سلگتی آگ کو روشن رکھا، مسلسل کوشاں رہا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ دورِ غلامی کا اندھیرا چھٹ گیا اور جب آزادی کا مہرِ منور طلوع ہوا تو وہ قوم کا ہیرو کہلایا مگر اس نے اقتدار میں حصہ لینے سے انکار کردیا۔ قوم سمجھ رہی تھی۔ اپنے محسن کا احسان جان رہی تھی اسی لیے اسے زبردستی صدارت کا عہدہ قبول کرنے پر تیار کیا گیا۔

عالم اسلام میں قاتل کا نشانہ بننے والے صدور میں سے ایک صدر کا زندگی نامہ

مصر کے اس چھوٹے سے گاؤں مت ابوالکوم میں عموماً چاندنی راتیں کھیل کا میدان بنا کرتی تھیں۔ بچے ٹولیوں کی شکل میں گھر سے نکلا کرتے تھے پھر وہاں بچوں کی آوازوں کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔

یہ دن کا وقت تھا۔ چاند کی چاندنی کے نام پر دھوپ کی شدت نے دور تک پاؤں پھیلائے ہوئے تھے۔ وہ کسی کام سے دروازے تک آیا تھا کہ الٹے پاؤں لوٹنے پر مجبور ہوگیا۔ گلی میں شور مچا ہوا تھا۔

"شیرا پہنچ گیا ہے۔" اسے معلوم تھا کہ اب کیا کرنا ہے۔ وہ دوڑتا ہوا دادی کے پاس پہنچا۔

"دادی، شیرا آگیا ہے۔ آپ لینے چلتے ہیں۔"

"مرتبان میں بہت سا شیرا پہلے ہی موجود ہے اور لے کر کیا کریں گے۔"

"میں دیکھ چکا ہوں بہت تھوڑا سا ہے۔ وہ تو میں آج ہی چٹ کر جاؤں گا۔"

"تیری بھوک نہیں مٹنے والی۔ چل اور شیرا لے کر آتے ہیں۔"

دادی اٹھ کر کھڑی ہوگئیں۔ اپنی بہو کو تنور کے سامنے بیٹھا چھوڑ کر صحن پار کر گئیں۔ وہ بھی ان کے ساتھ ساتھ ہولیا۔ سیاہ رنگ، ننگے پاؤں اور لمبا عربی لباس پہنے جس کے نیچے سفید چھینٹ کی قمیص تھی۔ اس کا نام انور السادات تھا۔ وہی انور السادات جسے مستقبل میں مصر کا صدر بننا تھا۔

وہ دونوں تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے نہر کی طرف جا رہے تھے جہاں قریبی گاؤں زرتان سے جہاز آیا تھا جس پر شیرے کے مرتبان لدے ہوئے تھے۔

گاؤں بھر میں اس کی دادی کا بڑا احترام تھا۔ سب لوگ انہیں آفندی کی ماں کہہ کر پکارا کرتے تھے۔ یہ لفظ اعلیٰ سرکاری عہدے دار یا معزز شخصیت کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ اس وقت بھی اس کی دادی کو دیکھ کر لوگ احتراماً کھڑے ہوگئے تھے۔

شیرا لینے والوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی لیکن اس کی دادی کو دیکھ کر لوگوں نے جگہ بنا دی۔ انہوں نے شیرے کا ایک بڑا مرتبان خریدا۔ انور نے اسے اٹھانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ اس کی عمر کے مقابلے میں بہت بھاری تھا لہٰذا دادی کو ہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اٹھانا پڑا۔

''تم مرجان اٹھا تو سکتے نہیں اور خریدنے کا شوق ہے۔''

''جتنا میں کھاتا ہوں اتنا اٹھا بھی سکتا ہوں۔ باقی تو دوسرے لوگ کھاتے ہیں۔ اسی لیے یہ اتنا بھاری ہے۔''

''ساوات، کیسی خود غرضی کی بات کرتے ہو۔ انسان کو سب کا بوجھ اٹھانا چاہیے۔''

''جب میں بڑا ہو جاؤں گا تو پورے مصر کا بوجھ اٹھا لوں گا۔ ابھی تو میں بہت چھوٹا ہوں۔''

''بڑے ہونے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے تعلیم حاصل کرو اور تم ابھی تک اسکول جانے کا نام نہیں لے رہے ہو۔ اپنے باپ کو دیکھو وہ اس گاؤں کے واحد پڑھے لکھے آدمی ہیں اسی لیے فوج میں بھرتی ہو گئے ہیں۔''

''اگر آپ یہ وعدہ کریں کہ مجھے بھی فوج میں بھیج دیں گی تو میں پڑھنے کو تیار ہوں۔''

''تمہارا فوج میں جانا ہی ٹھیک ہوگا کیونکہ برطانیہ نے ہمارے ملک پر قبضہ کیا ہوا ہے۔ ہمارے ایک ایک بچے کو فوج میں جانا چاہیے تاکہ ہم اپنے ملک کو آزاد کرا سکیں۔''

''اچھا، اب سمجھ میں آیا۔ ابا جان اسی لیے فوج میں گئے ہیں۔''

''اچھا اب باتیں ختم کرو۔ گھر نزدیک آ گیا ہے۔''

دادی تو کوٹھری میں چلی گئیں تاکہ ٹوکرے کو حفاظت سے رکھ سکیں اور وہ ماں کے پاس تنور کے قریب جا کر بیٹھ گیا جہاں اس کے دوسرے بہن بھائی بیٹھے تھے۔

اس کی ماں کا پورا دن تنور کے سامنے ہی گزر جاتا تھا۔ اس لیے بچوں کی دوسری ضروریات اس کی دادی نے اپنے ذمے لے لی تھیں۔ اس کے والد سوڈان میں تعینات تھے۔ ان کی اخلاقی اور کردار سازی کی نگرانی بھی دادی ہی کی ذمے داری تھی۔

☆☆☆

اس گاؤں میں تعلیم کا زیادہ سے زیادہ عروج یہ تھا کہ کوئی جامعۃ الازہر میں داخلہ لے اور کسی مسجد کا امام ہو جائے۔ اس کے دادا نے اپنے بیٹے کے لیے یعنی انور کے والد کے لیے غیر مذہبی نظامِ تعلیم کا انتخاب کیا اور انہی کی خواہش اور کوشش کی بدولت انہوں نے جنرل سرٹیفکیٹ آف برائمری ایجوکیشن حاصل کیا۔ وہ اس گاؤں میں یہ سرٹیفکیٹ لینے والے پہلے آدمی تھے۔ مصر میں برطانوی راج آ چکا تھا لہٰذا تمام مضامین انگریزی زبان میں پڑھائے جاتے تھے اور یہاں کے لوگ انگریزی پڑھنے سے بھاگتے تھے۔ کیونکہ وہ انگریزوں سے نفرت کرتے تھے۔ ان کی نفرت انہیں اس مضمون سے دور رکھ رہی تھی لیکن انور کی دادی بہت سمجھ دار عورت تھیں۔ انہوں نے بھی انور کی بہتری اسی میں سمجھی کہ اسے وہی تعلیم دلائی جائے جو اس کے والد نے حاصل کی ہے۔ یہ بھی ضروری تھا کہ اسے پہلے قرآن کی تعلیم دلائی جائے۔ لہٰذا اسے گاؤں کے ایک اسکول میں بھیجنا شروع کر دیا گیا۔ انگریزی تعلیم کے لیے ایک مسیحی اسکول میں بھیجنا پڑا کیونکہ یہاں یہی ایک اسکول تھا جو ایک پادری کی نگرانی میں چل رہا تھا۔

دن اسکول میں اور رات دادی کے پہلو میں لیٹ کر کہانیاں سنتے ہوئے گزرتی جب تک کہ نیند بہلا کر اسے اپنے ساتھ نہیں لے جاتی۔

یہ کہانیاں مذہبی، روایتی، پیار محبت یا جنگ و جدل اور جنوں پریوں کی نہیں ہوا کرتی تھیں بلکہ وہ واقعات تھے جو اس کی دادی کی بوڑھی آنکھوں نے دیکھے تھے۔ انگریزوں کے اس ظلم و جبر کی داستانیں تھیں جو وہ مصریوں پر کر رہے تھے۔ برطانوی سامراج نے شاہانِ مصر کو بے بس کر کے اقتدار پر قبضہ جما لیا تھا۔ دکھاوے کے لیے شاہانِ مصر موجود تھے لیکن حکم برطانیہ کا چلتا تھا۔ برطانوی راج کو سوتے کی نیند سلانے کے لیے اندر ہی اندر کوششیں ہو رہی تھیں۔ انقلاب کے لیے کوششیں کی جا رہی تھیں۔ چنگاریاں اندر ہی اندر سلگ رہی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی چنگاری شعلہ بن کر بھڑک اٹھتی تھی لیکن جلد ہی بجھا دی جاتی تھی۔ ان میں سے ایک کہانی اس نوجوان سیاسی رہنما کی بھی تھی جس کا نام مصطفیٰ کمال تھا۔ وہ انگریزوں کا مصر سے قبضہ ختم کرنے کا خواہاں تھا۔ اسے انگریزوں نے زہر دے کر ہلاک کر دیا تھا۔ اس کی یہ موت ہر گھر میں کہانی بن کر دہرائی جا رہی تھی۔ انور کی دادی نے بھی یہ کہانی ایک نہیں کئی بار اسے سنائی۔ انور نے بچپن ہی میں یہ جان لیا تھا کہ برطانوی تو میں جو ہم پر اقتدار حاصل کر چکی ہیں اپنے مخالفین، آزادی کے متوالوں کو زہر دے کر ہلاک کر دیتی ہیں۔

اس کی دادی اسے انقلابی شاعروں کی رزمیہ نظمیں بھی سناتی تھیں۔ یہ نظمیں وطن کی شان میں ہوتی تھیں یا ان مجاہدوں کی شان میں جنہوں نے انگریزوں کے ہاتھوں جام

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

شہادت نوش فرمایا تھا۔ ایک رزمیہ نظم زنشو کے ہیرو ظہران کے بارے میں تھی۔ ننھے انور کو یہ نظم اتنی پسند آئی تھی کہ بار بار سنتا تھا۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ زنشو کا قصبہ اس کے گاؤں سے صرف تین میل دور تھا۔ اسے لگتا تھا جیسے یہ واقعہ اسی کے گاؤں میں پیش آیا ہو۔

انگریز سپاہی زنشو کے علاقے میں کبوتر کا شکار کر رہے تھے۔ ایک گولی غلطی سے گندم کے ذخیرے میں لگی جس سے آگ لگ گئی۔ دیہاتی اکٹھے ہو گئے۔ مجمع دیکھ کر ایک انگریز سپاہی نے گولی چلادی اور بھاگ گیا۔ دیہاتیوں نے اس کا تعاقب کیا اور اسے ہلاک کر دیا۔ اس واقعے کے بعد بہت سے لوگ گرفتار کر لیے گئے۔ موقع پر ہی انہیں سزائیں سنائی گئیں۔ بہت سوں کو کوڑے مارے گئے۔ بہت سوں کو پھانسی پر چڑھا دیا گیا۔ ایک سپاہی کے بدلے میں جبکہ غلطی بھی اسی کی تھی اتنے لوگوں کو سزا دینا ظلم ہی تو تھا۔

ظہران برطانویوں کے خلاف جنگ کا ہیرو تھا۔ اسے سب سے پہلے پھانسی دی گئی۔ رزمیہ نظم میں اسی ظہران کی دلیری کا ذکر تھا کہ کس طرح وہ سولی کی طرف سر بلند رہا۔

انور السادات یہ کہانیاں سنتا رہا تھا۔ وطن پرستی کے جذبات چپکے چپکے اس کے دل میں گھر بناتے جا رہے تھے۔ وہ سوچتا تھا جب یہ گاؤں میرا ہے۔ یہ مصر میرا ہے تو یہاں دوسروں کا حکم کیوں چلتا ہے۔ یہاں کا شاہی خاندان کیوں دوسروں کا حکم مانتا ہے۔ مصطفیٰ کمال کو انگریزوں نے کیوں مار دیا۔ انہیں کیا حق پہنچتا ہے۔ اسے اپنے بادشاہ پر بھی غصہ آتا تھا اور انگریزوں پر بھی جو نہ تو اس کے ملک سے تعلق رکھتے تھے نہ اس کے مذہب سے پھر وہ یہ سوچنے بیٹھ جاتا تھا کہ وہ ان لوگوں کو کیوں مار دیتے ہیں جو ان کے خلاف آواز اٹھاتے ہیں کیا صرف اس لیے کہ وہ اپنے وطن کی آزادی کی جنگ لڑ رہے ہیں۔ جو آزادی کی بات کرتا ہے وہ مار دیا جاتا ہے؟ میں بھی بڑا ہو کر آزادی کی بات کروں گا۔ وہ اگر مجھے مارتے ہیں تو مار دیں۔ یہ تو اچھا ہی ہوگا۔ میری کہانیاں بنائی جائیں گی، مجھ پر شاعر نظمیں لکھیں گے۔

وہ ابھی یہیں تک سوچ پایا تھا۔ کوئی قدم اٹھانے کی عمر ہی نہیں تھی کہ اس کا گاؤں اس سے چھوٹ گیا۔ ہوا یہ کہ ایک برطانوی فوجی کمانڈر کو انقلابیوں نے ہلاک کر دیا۔ برطانیہ نے مصری حکومت کے خلاف بڑا انتقامی کارروائیاں کیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ سوڈان میں جو مصری فوجیں تعینات تھیں انہیں سوڈان سے نکال دیا۔ انور السادات کے والد بھی سوڈان سے مصر آ گئے اور قاہرہ کے قریب ایک قصبے کیبری القبہ میں رہائش اختیار کر لی۔ اسے بھی اسکول چھوڑ کر اسی قصبے میں آنا پڑا۔

اس نے اسکول چھوڑا تھا تعلیم نہیں چھوڑی تھی۔ اس کے والد نے اس کے لیے ایک پرائیویٹ اسکول کا انتخاب کیا تھا مگر کچھ عرصے بعد اسے یہ اسکول بھی چھوڑنا پڑا کیونکہ اس اسکول کی فیس بہت زیادہ تھی لہٰذا اسے اسلامی فلاحی انجمن کے اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔

یہ اسکول گھر کے قریب زیتون کے مقام پر تھا۔ یہاں تک اسے پہنچنے کے لیے ''لقبہ محل'' سے گزرنا ہوتا تھا۔ کئی دن بعد اسے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ شاہ فواد کا محل ہے۔ اسے یہاں سے گزرتے ہوئے انقلابیوں کی وہ کہانیاں اور نظمیں یاد آ جاتی تھیں جو وہ اپنی دادی سے سنتا رہا تھا۔

وہ اس وقت یہ کیسے سوچ سکتا تھا کہ وہ اس ملک کی تاریخ کو بدلنے کے لیے تیار ہو رہا ہے اور ایک دن وہ بھی اس کرسی پر بیٹھے گا جس پر شاہ فواد اور شاہ فاروق متمکن ہوتے تھے۔

بہار کا موسم تھا۔ لقبہ محل کے باغ میں خوبانیاں لگ گئی تھیں۔ کچھ درخت دیوار کے قریب تھے۔ شاخوں میں لدی خوبانیاں دیوار پر جھول رہی تھیں۔ وہ اور اس کے دوست اسکول جاتے ہوئے وہاں سے گزرتے تو خوبانیاں دیکھ کر سب کے منہ میں پانی آ گیا۔

''یار کسی طرح محل میں گھس کر خوبانیاں توڑی جائیں۔''

''کسی نے دیکھ لیا تو شامت آ جائے گی۔''

''کون دیکھے گا۔ یہاں کوئی رہتا تھوڑی ہے۔''

''چوکیدار تو ہوگا۔''

سب آپس میں یہ باتیں کر رہے تھے کہ ایک لڑکا بول پڑا۔ ''تم لوگ یہ کیوں نہیں سوچتے کہ یہ چوری ہے۔''

اب انور بولے بغیر نہ رہ سکا۔ ''ان حکمرانوں کی کمزوری نے ہی انگریزوں کو ہم پر مسلط کیا ہے۔ ان کی ساری خوبانیاں توڑ لو۔ ان کا یہی حشر ہونا چاہیے۔''

''پھر تم ہی کوئی ترکیب نکالو کہ چوکیدار کی نظر ہم پر نہ پڑے۔''

''ہمارے ملک میں جو انقلابی ہیں وہ چھپ کر لڑ رہے ہیں۔ دشمن طاقتور ہے اس لیے سامنے آ کر لڑنا ٹھیک نہیں۔ اس محل کے دو چوکیدار ہیں وہ بھی طاقتور ہیں اس لیے ہمیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

محل کی پچھلی جانب سے جانا چاہیے۔"

انور تمام لڑکوں کو پچھلی طرف لے گیا۔ یہاں لوگوں کی آمد ورفت بھی کم تھی اور دیواریں بھی نیچی تھیں لیکن اس کے باوجود ان پر نہیں چڑھا جا سکتا تھا پھر یہ طے ہوا کہ سامنے کے گیٹ ہی سے اندر جایا جائے۔ ایک لڑکا گیٹ پر بیٹھا رہے تاکہ اگر چوکیدار آئے تو وہ خبردار کر سکے۔ چند لڑکے گیٹ سے اندر کود ے۔ ان میں انور بھی تھا۔ ان سب نے جی بھر کر انتقام لیا اور خوب خوبانیاں توڑیں۔

اس اسکول سے ابتدائی مرحلے کا امتحان پاس کرنے کے بعد وہ سلطان حسین اسکول میں منتقل ہو گیا۔ یہاں سے اس نے پرائمری ایجوکیشن کا جنرل سرٹیفکیٹ حاصل کیا۔

سیکنڈری اسکول میں اس نے اور اس کے بھائی طلعت دونوں نے ایک ساتھ داخلہ لیا۔ اس رات گھر میں بڑی دیر تک بحث ہوتی رہی تھی۔ دونوں بھائیوں کی فیس اتنی زیادہ تھی کہ اس کے والد اتنی بھاری فیس یک مشت ادا نہیں کر سکتے تھے۔

"اگر آپ پوری تنخواہ فیس میں دے دیں گے تو گھر کا خرچ کہاں سے چلے گا؟" انور کی والدہ نے کہا تھا۔

"بچوں کی تعلیم بھی تو ضروری ہے۔"

"میں بچوں کی تعلیم کے خلاف نہیں ہوں لیکن ان بچوں کو کھانے کے لیے بھی تو کچھ چاہیے۔"

"میں نے اس کا بندوبست کر لیا ہے۔ میں اسکول انتظامیہ سے کہوں گا کہ دونوں بچوں کی فیسیں قسطوں میں وصول کرے۔ ایک ماہ ایک بچے کی فیس لے لے دوسرے ماہ دوسرے بچے کی فیس لے لے۔ گاؤں کی زمین سے بھی کچھ نہ کچھ آجاتا ہے۔ کچھ نہ کچھ ہو ہی جائے گا۔ اللہ مالک ہے۔"

"سارا خرچ آپ کے ہاتھ میں ہے، اب آپ جانیں۔"

اس کے والد بھی کچھ سوچ رہے تھے اور قدرت بھی کسی راستے کی تلاش میں تھی۔

فیس کی پہلی قسط سولہ پاؤنڈ تھی۔ انور یہ قسط لے کر خود اسکول گیا اور فیس ادا کر دی۔ دوسری قسط بھی سولہ پاؤنڈ، جو اس کے بھائی طلعت کو ادا کرنی تھی۔ اس کا بھائی یہ رقم لے کر گھر سے بھاگ گیا۔ رقم سے زیادہ گھر والوں کو خود اس کی فکر تھی کہ وہ کہاں گیا۔

کئی دن بعد جب وہ گھر پہنچا تو سب لوگ پیسوں کو بھول کر اس کی دیکھ بھال میں لگ گئے۔ سب باتوں کا خلاصہ یہ نکلا کہ اس نے تعلیم جاری رکھنے سے انکار کر دیا۔ والد پہلے ہی دونوں کی فیس ادا کرنے سے قاصر نظر آ رہے تھے۔ انہیں اپنا بوجھ ہلکا ہوتا نظر آیا۔

"جب طلعت پڑھنا ہی نہیں چاہتا تو اس پر رقم کیوں خرچ کی جائے۔ انور کا تعلیمی ریکارڈ شاندار ہے۔ اسے شوق بھی بہت ہے۔"

اب ساری توجہ انور کی طرف مبذول ہو گئی۔ یہ تھا قدرت کا انتظام۔ اگر طلعت تعلیم سے دستبردار نہ ہوا ہوتا تو اس کے والدین کب تک دونوں کا بوجھ اٹھاتے اور شاید یہ ہوتا کہ بڑے بھائی کے حق میں اسے اسکول سے اٹھا لیا جاتا۔

اب اس کی عمر بھی بڑھ رہی تھی اور ماحول بھی تبدیل ہو گیا تھا۔ وہ گاؤں سے شہر آ گیا تھا۔ یہاں اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ طبقاتی تقسیم کیا ہوتی ہے۔ یہاں کئی لڑکے ایسے تھے جو کار میں اسکول آتے تھے۔ وہ اپنی شان و شوکت پر ناز کرتے ہوئے دوسرے لڑکوں سے نفرت کرتے تھے۔

اس نے گاؤں میں رہ کر کسی انگریز کی شکل نہیں دیکھی تھی لیکن یہاں دیکھ رہا تھا۔ انگریز کانسٹیبل تو اسے روز ہی نظر آتے تھے۔ موٹر سائیکل پر بیٹھے ہوئے یہ انگریز کانسٹیبل ہر شے پر نفرت کی نظر ڈالتے ہوئے سڑکوں پر پاگلوں کی طرح دوڑتے رہتے تھے۔ لوگ ان سے ڈرتے تھے لیکن وہ ان سے نفرت کرتا تھا اور سوچا کرتا تھا کہ ہمارے ملک میں یہ بدصورت لوگ کیوں آ بسے ہیں۔ اسے شدت سے اپنا گاؤں یاد آنے لگتا۔ اگر یہ ہمارے گاؤں میں ہوتے تو ایک قدم بھی اپنی مرضی سے نہیں اٹھا سکتے تھے۔

طبقاتی تقسیم کا ایک نمونہ خود اس کے اپنے گھر میں موجود تھا۔ قاہرہ کی جگمگاتی دنیا میں اس کے والد اپنی محدود آمدنی میں اپنے تیرہ بچوں کی پرورش کر رہے تھے۔ بازار سے ڈبل روٹی خریدنے کی استطاعت نہیں تھی۔ گھر میں بڑا سا تنور تھا جس میں روٹیاں پکتی تھیں۔

اس کے ساتھی اسکول کینٹین سے بسکٹ یا چاکلیٹ خریدتے تھے جبکہ وہ بمشکل چائے کا ایک کپ خرید سکتا تھا۔ اس کے دوست شاندار سوٹ پہنتے تھے، اس کے پاس ایک پرانا سوٹ تھا جس کو لانڈری سے دھلوانا بھی مشکل تھا۔ یہ بھی طبقاتی تقسیم۔

اس نے اس گھٹن سے تنگ آ کر کئی مرتبہ گاؤں واپس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جانے کا سوچا لیکن اب یہ کیسے ہوسکتا تھا۔ امتحان کا زمانہ قریب آگیا۔ امتحانی فارم پر لگانے کے لیے ایک تصویر چاہیے تھی۔

"فارم پر تصویر لگانی ہے۔ اگر آپ مجھے ایک نیا سوٹ بنوا دیں تو میں اس سوٹ میں نئی تصویر کھنچوا لوں۔"

"میں خود دیکھ رہا ہوں کہ تم سال بھر سے ایک ہی سوٹ پہن رہے ہو لیکن کیا کروں اتنے پیسے ہی جمع نہیں ہوتے۔"

"تمام لڑکے نئے نئے سوٹ پہن کر آتے ہیں۔"

"مجھے تم سے پوری ہمدردی ہے۔ بس دو ایک روز ٹھہر جاؤ۔ میں پیسوں کا بندوبست کرلوں۔"

انور اب بھی یہی سمجھ رہا تھا کہ اس کے والد کے پاس پیسوں کا بندوبست کہاں سے ہوسکے گا۔ خاطر خواہ رقم کا بندوبست تو نہ ہوسکا لیکن اس کے والد نے ایک ترکیب ضرور نکال لی۔

"میری اتنی استطاعت تو نہیں کہ نیا کپڑا لا سکوں تم وکالت البالا (پرانے کپڑوں کی مارکیٹ) چلے جاؤ۔ وہاں میرے ایک جاننے والے کی دکان ہے اس کے پاس چلے جاؤ۔ کوئی نیا سوٹ پسند کرلینا۔ وہ اسے تمہارے ناپ کا بنا دے گا۔"

اس کے والد نے اس خاص دکان کا پتا اسے سمجھا دیا۔

وہ ایک چھوٹی سی دکان تھی۔ الماریوں میں مال رکھا ہوا تھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے دکان کا مالک کھڑا تھا۔ اس نے اپنا تعارف کروایا اور اپنے لیے ایک سوٹ پسند کرلیا۔ دکان دار نے قینچی چلائی اور ڈیڑھ دو گھنٹے میں اس کے ناپ کا بنا دیا۔ یہ سوٹ یقیناً اس کے ساتھیوں سے کم تر تھا لیکن اس کے دل میں کسی احساسِ کمتری نے جگہ نہیں بنائی۔ کپڑوں سے کیا ہوتا ہے آدمی تو وہی رہتا ہے جو ہوتا ہے۔

وہ دوسرے سال کا امتحان پاس کرنے کے بعد جب تیسرے سال میں پہنچا تو اسے بتایا گیا کہ اس کا گریڈ پروفیشنل سرٹیفکیٹ حاصل کرنے کے لیے کافی نہیں۔ اسے کہا گیا کہ وہ دوسرے سال کے امتحان میں پھر شامل ہو۔ وہ اپنا سال ضائع کرنے کے حق میں نہیں تھا لہٰذا اس نے وہ اسکول ہی چھوڑ دیا اور ایک پرائیویٹ اسکول میں تیسرے سال میں داخلہ لے لیا اور امتحان دے کر سرٹیفکیٹ حاصل کرلیا۔

اس کے پاس سرٹیفکیٹ آگیا تھا لہٰذا اس نے پھر اسی اسکول (نوادسیکنڈری اسکول) میں داخلہ لے لیا جو اس نے چھوڑا تھا۔ غالباً اسکول کو یہ دکھانا مقصود تھا کہ وہ سالِ چہارم کا اہل ہے۔ اسے داخلہ تو مل گیا لیکن نتیجہ وہی آیا جو اس اسکول میں پہلے آچکا تھا۔ اس نے پھر پرائیویٹ اسکول میں داخلہ لے لیا۔ اس مرتبہ یہاں بھی یہی ہوا۔ انفرادی طور پر مضمون میں پاس تھا مگر مجموعی نمبر غیر تسلی بخش تھے۔

اب وہ سوچنے پر مجبور تھا کہ ان ناکامیوں کی وجہ کیا ہے۔ اس نے اپنا احتساب کیا تو معلوم ہوا کہ اس کی وجہ حد سے بڑھتی ہوئی خوداعتمادی ہے۔ مجھے خود پر اتنا اعتماد ہو چلا ہے کہ میں پوری طرح تیاری نہیں کرتا۔

اس نے اسی جذبے کے ساتھ ایک اور اسکول میں داخلہ لے لیا جو شبرا کے مقام پر واقع تھا۔ اس نے حقیقی محنت کی اور وہاں جنرل سرٹیفکیٹ آف ایجوکیشن پاس کرلیا۔

اس امتحان کے پاس کرتے ہی اسے یوں لگا جیسے وہ اچانک بالغ ہوگیا ہے۔ اس کے دل میں مادرِ وطن کا احساس جاگا۔ وہ کھلی آنکھوں سے دیکھنے لگا کہ ہماری زندگیوں میں کوئی خامی ہے جسے صحیح سمت میں لانا ہے۔ انگریزوں کے خلاف اس کے دل میں نفرت بھر چکی تھی اور ہر اس شخص کے لیے محبت اور عقیدت بھی جو اپنے مادرِ وطن کی آزادی کے لیے کوشاں تھا۔ وہ مصطفیٰ کمال پاشا بھی ہوسکتا تھا اور گاندھی بھی۔ گاندھی برطانیہ جاتے ہوئے مصر سے گزرا اور اس کی آزادی کی کوششوں کی مصری اخبارات و جرائد نے بہت تعریفیں کیں۔ انور نے یہ خبریں پڑھیں اور پڑھیں تو وہ بھی ان کی محبت میں ڈوب گیا۔ اس نے گاندھی کی نقل کرنا شروع کردی۔ اپنا لباس اتار ڈالا اور ایک چادر سے کمر تک بدن کو ڈھانپا اور گھر کی چھت پر خلوت نشیں ہوکر بیٹھ گیا۔ اس نے گاندھی کو اس کی تصویروں میں اسی طرح دیکھا تھا۔ دوسرے لفظوں میں گاندھی بن کر اپنے وطن کی آزادی کے لیے گیان دھیان لگا کر بیٹھا تھا۔ اس کے والد نے اس کا یہ طرزِ زندگی دیکھا تو سخت برہم ہوئے۔

"تم کیا سمجھتے ہو اس طرح چھت پر بیٹھ کر اپنے وطن کی خدمت کرلو گے؟"

"گاندھی بھی تو اسی لباس میں اپنے وطن کی آزادی کے لیے کوشاں ہے۔"

"انہوں نے اپنی تعلیم مکمل کرلی ہے۔ تم اپنی تعلیم مکمل کرو۔ عملی زندگی میں قدم رکھو اس کے بعد اپنی راہ کا تعین کرلینا۔"

وہ اسے زبردستی چھت سے اتارنے میں کامیاب

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو گئے۔

وہ ایک مرتبہ پھر غور کرنے لگا کہ اسے کیا کرنا ہے اور اس نتیجے پر پہنچا کہ مقصد کے حصول کے لیے طاقت کا ہونا قدرتی شرط ہے۔ وہ اس وقت اس عقیدے پر قائم تھا کہ انقلاب بندوق کی نالی سے آتا ہے۔ وہ یہ طاقت کہاں سے حاصل کرے؟ اس کا ایک ہی طریقہ تھا کہ ملٹری جوائن کرلے۔

رائل ملٹری اکیڈمی میں صرف امرا اور شاہی لوگوں کو داخلہ مل سکتا تھا لیکن قدرت اس کی مدد کر رہی تھی۔ اب عام لوگوں کو بھی اجازت دے دی گئی تھی لیکن دو شرائط کے ساتھ۔ امیدوار کو اپنے والد کی جائداد اور آمدنی کی تفصیلات دینا ہوں گی اور دوسری شرط یہ تھی کہ کسی بڑے منصب دار سے اپنی شناسائی ظاہر کرنی ہوگی۔

اس نے جب فارم بھرنا شروع کیا تو پہلی شرط تو پوری ہو رہی تھی۔ اس کے والد محکمہ صحت میں سینئر کلرک تھے اور ان کی گزر بسر کی بھی آمدنی تھی۔ گاؤں میں تھوڑی سی زمین بھی تھی۔ دوسری شرط البتہ مشکل تھی کیونکہ اس کے والد کے تعلقات کسی بڑی شخصیت سے نہیں تھے۔

جس شخصیت کو داخلے کی درخواستوں کی چھان بین کرنی تھی وہ جنرل ابراہیم خیری پاشا تھے۔ ان کا شمار بڑے روساء میں ہوتا تھا۔ اگر ان کی سفارش زوال دی جاتی تو درخواست یقیناً قبول ہو جاتی لیکن ان تک رسائی اتنی آسان نہیں تھی۔ ان دنوں انور کے والد سخت پریشان تھے۔ انہیں کوئی ایسا آدمی درکار تھا جو جنرل خیری تک ان کی رسائی کو آسان کردے۔ ایک دن اچانک انہیں اپنا ایک دوست یاد آگیا جو یہ کام کرسکتا تھا۔ یہ ایک وارنٹ آفیسر تھا جو سوڈان میں ان کے ساتھ تعینات تھا۔ وہ خوشی سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے انہوں نے انور کو بلایا۔ "تم یہ سمجھو کہ تمہارا کام ہو گیا۔"

"کیا کوئی ایسا شخص نظر آیا؟"

"میرے ساتھ ایک شخص سوڈان میں تھا۔ اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ ہمیں جنرل خیری تک پہنچا دے گا۔ کل تم تیار رہنا۔ میں تمہیں لے کر جنرل خیری کے پاس جاؤں گا۔"

دوسرے دن اس کے والد اسے لے کر خیری کے محل القبہ گارڈن گئے اور اندر داخل ہو کر ہال کے راستے میں کھڑے ہو گئے۔ خیری پاشا کو وہاں سے گزرنا تھا۔ انور اور اس کے والد ایک طرف کھڑے ہو گئے اور خیری کا انتظار کرنے لگے۔

چند منٹ بعد خیری کی آمد کا شور ہوا اور پھر وہ آتے ہوئے نظر آئے۔ وارنٹ آفیسر ان کے قریب گیا اور ان سے سرگوشی میں کچھ کہا۔ وہ چلتے ہوئے انور کے والد کے پاس آئے۔

"او ہاں تم محکمۂ صحت میں کلرک تھے اور یہ تمہارا بیٹا... ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔" انہوں نے کہا اور آگے بڑھ گئے۔

ان تمام کوششوں کے بعد اسے فرج میں لے لیا گیا۔ فہرست میں اس کا نام سب سے آخر میں تھا۔ یہ فہرست 52 ناموں پر مشتمل تھی اور اس کا نام آخری تھا۔

طبقاتی تقسیم کا نمونہ پھر سامنے آیا۔ وزیر جنگ کا خط آیا کہ چھ نشستیں ان کے رشتے داروں کے لیے رکھی جائیں۔ اکیڈمی نے جیسا کرنا تھا ویسا کیا اور آخر کے چھ نام کاٹ دیے۔

یہ اس کے لیے سخت ابتلا کے دن تھے۔ اس نے پھر بھی ہمت نہ ہاری اور آرٹس میں داخلہ لے لیا۔ ساتھ ساتھ قانون اور کامرس کے مضامین بھی پڑھنے لگا۔

ایک مہینا ہوا تھا کہ ایک معجزہ ہو گیا۔ اسے اکیڈمی میں لے لیا گیا۔ ایک مہینا ضائع ضرور ہوا لیکن اس کا خواب پورا ہو گیا۔

وہ ملٹری میں گیا تو مصطفیٰ کمال اتاترک کی عقیدت اس کے ساتھ تھی۔ اس نے ترکی کے انقلاب پر کتابیں پڑھنا شروع کیں۔ اپنے ملک کی تاریخ پر بھی کتابیں پڑھیں۔ 1882ء سے برطانوی قبضے کے بارے میں پڑھنا شروع کیا۔ اس مطالعے نے اسے بتایا کہ مصریوں کو کس کس طرح دھوکے دیے جاتے رہے ہیں۔

وہ مصر کے لیے بہت کچھ کرنا چاہتا تھا لیکن ابھی اس کے ہاتھ میں کچھ نہیں تھا۔ وہ شدت سے اس وقت کا انتظار کرنے لگا جب وہ ملٹری اکیڈمی کا تربیت یافتہ گریجویٹ ہو جائے اور کچھ کرسکنے کے قابل ہو جائے۔

ملٹری اکیڈمی میں تعلیم کے دوران میں وہ تمام رزمیہ نظمیں اس کے کانوں میں گونجتی رہتی تھیں جو بچپن میں اس نے سنی تھیں۔ وہ بھی انگریزوں کو یہاں سے نکال کر مصر کو ان سے نجات دلانے کی خواہش کر رہا تھا۔

اس نے جب گریجویشن کرلیا تو یہ خواہش مزید شدت

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اختیار کر گئی۔ اب دو قوتیں ایک ساتھ مل گئی تھیں۔ اس کے اندر کی طاقت اور بطور فوجی افسر مادّی طاقت۔ وہ ان دو قوتوں سے دو شکار کر سکتا تھا۔ برطانیوں کو مصر سے نکالا جا سکتا تھا اور اس وقت کی بدعنوان حکومت کو بھی برطرف کیا جا سکتا تھا، پھر دیر کیوں کی جائے؟ اس پر جلد ہی عمل پیرا ہو جانا چاہیے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ایک تنظیم قائم کی جائے جو انقلاب کے لیے راستہ ہموار کرے۔ اس نے سوچا افواج میں اس تنظیم کی بدولت مطلوبہ انقلاب برپا کیا جا سکتا ہے۔ ایک تنظیم بنائی جائے جو ان افسروں پر مشتمل ہو۔

اس نے کوششیں شروع کر دیں۔ مصری فوج کے بہت سے افسر اس کے ہم خیال ہو گئے۔ اس نے ان کے سامنے دو باتیں رکھیں جن پر ہر کوئی متفق تھا۔ اپنی جانیں انقلاب کے لیے وقف کر دو اور افسران بالا کو مجبور کر دو کہ وہ برطانوی کمان کے افسران کا حکم ماننے سے انکار کر دیں۔

وہ اس وقت مصر کے بالائی علاقے کے ایک چھوٹے سے قصبے منقباد میں متعین تھا اور اس تنظیم کے اجلاس اس کے کمرے میں منعقد ہونے تھے۔ خوب بحث مباحثہ ہوتا تھا۔ ملک کی سیاسی صورت حال پر تقریریں ہوتیں۔ انور ان اجلاسوں میں قدیم تاریخ سے اقتباس سناتا اور حالیہ واقعات کی روشنی میں ان کی وضاحت کرتا۔ اس نے ابھی اپنا مقصد واضح طور پر بیان نہیں کیا تھا۔ وہ تو ابھی صرف یہ کوشش کر رہا تھا کہ زیر عمر افسروں کے ذہنوں میں ملکی صورت حال واضح ہو جائے اور نجات کے راستے تلاش کرنے کا عزم پیدا ہو۔

یہ سب نوجوان تھے کسی کی بھی عمر بیس سال سے زیادہ نہیں تھی اس لیے یہ اجلاس بہت جلد غیر سنجیدہ گفتگو کا منظر بھی پیش کرنے لگتے تھے۔ دلچسپ واقعات اور لطائف کا مجموعہ۔

☆☆☆

وہ کیڈٹ کی حیثیت میں ایک مرتبہ قاہرہ میں اپنے ایک دور کے رشتے دار کے گھر گیا۔ یہ لوگ زیادہ امیر تو تھے لیکن بڑے شہر میں رہنے کی وجہ سے گاؤں کے لوگوں سے مختلف تھے جس کا وہ عادی تھا۔ یہاں اس نے ایک لڑکی کو دیکھا جو فرانسیسی ادب کی تعلیم حاصل کر رہی تھی۔ اس لڑکی سے کچھ دیر گفتگو ہوئی تو انور کے ذہن میں کئی خیال بجلی کی طرح کوندنے لگے۔ وہ لڑکی جس کا نام جیہان تھا اس سے باتیں کر رہی تھی اور وہ سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی کچھ مختلف قسم کی بیوی ثابت ہو سکتی ہے۔ یہ مصری سیاست پر بھی خوب باتیں کر لیتی ہے۔ اس میں حسِ مزاح بھی ہے اور چند اشاروں میں بات کی تہہ تک اترنے کی صلاحیت بھی رکھتی ہے۔

ان خیالات کے ساتھ ہی وہ خود کو ملامت بھی کر رہا تھا اور شرمندگی کا احساس بھی ہو رہا تھا۔ اس لیے نہیں کہ کوئی نوجوان ان باتوں پر سوچ نہیں سکتا بلکہ یہ شرمندگی اس لیے تھی کہ وہ پہلے سے شادی شدہ تھا۔ خاندانی روایات کے مطابق کم عمری میں ہی اس کی شادی ایک رشتے دار لڑکی سے کر دی گئی تھی۔ اس وقت اسے احساس نہیں تھا کہ ذہنی ہم آہنگی کیا ہوتی ہے۔ ساتھ رہنے کا موقع بھی زیادہ نہیں ملا۔ ملٹری اکیڈمی میں آنے کے بعد اسے محسوس ہوا کہ وہ اور اس کی بیوی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس نئی لڑکی جیہان سے ملنے کے بعد اسے یہ شرمندگی ضرور ہو رہی تھی کہ وہ پہلی بیوی کی موجودگی میں کسی اور لڑکی کے بارے میں سوچ رہا ہے لیکن اس حقیقت کو بھی تسلیم کر رہا تھا کہ یہی وہ لڑکی ہے جو اس کی بیوی بن کر اس کی سوچ کو سیراب کر سکتی ہے۔ فوجی افسر ہونے کے ساتھ ساتھ وہ پبلک لائف بھی گزارنا چاہتا تھا۔ جیہان اس کی بہترین پارٹنر ثابت ہو سکتی تھی۔

وہ گھر آنے کے بعد بھی اس مسئلے میں الجھا رہا۔ وہ پہلی بیوی کو چھوڑنے کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ کیونکہ اس راہ میں کچھ تو خاندانی روایات حائل تھیں اور کچھ اس کی اپنی اقدار جنہیں وہ توڑنا نہیں چاہتا تھا مگر مصیبت یہ تھی کہ اسے طلاق دیے بغیر دوسری شادی نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کے بعد وہ کئی سال تک اس گتھی کو سلجھانے کی کوشش کرتا رہا۔

☆☆☆

اجلاس مسلسل جاری تھے۔ اب دوستوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو گیا تھا۔ انہی اجلاسوں کے دوران میں اس کی ملاقات جمال عبدالناصر سے ہوئی۔ اس کی بٹالین "منقباد" آئی ہوئی تھی اور وہ اجلاس میں شریک ہوا تھا۔ وہ ایک سنجیدہ نوجوان تھا۔ دراصل وہ اپنے ہم عمروں سے ہنسی مذاق کرنا اپنے وقار کے منافی سمجھتا تھا۔ ان اجلاسوں میں وہ جتنی مرتبہ بھی آیا چپ چاپ ہی بیٹھا رہا۔ بہت کم منہ کھولتا تھا اور صرف کام کی بات کرتا تھا۔ دوسرے بھی اس سے بہت دور دور رہتے تھے لیکن انور اس کی دانائی کا قائل تھا اور بہت جلد دونوں میں دوستی ہو گئی تھی۔

انور اب کوششیں کر کر کے تھک چکا تھا۔ اب وہ وسیع پیمانے پر عمل کے لیے کچھ سوچ رہا تھا۔ آخر ایک موقع ملا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسے کچھ دوسرے افسروں کے ساتھ قاہرہ سے قریب ایک مقام ''منقباد'' بھیجا گیا۔ جمال عبدالناصر بھی اس میں شامل تھا۔ یہ 1939ء کے اوائل کا ذکر تھا۔ اس نے یہاں پہنچ کر تیزی سے اپنے تعلقات استوار کرنا شروع کیے اور جلد ہی ایک خفیہ تنظیم قائم کرلی۔ اس میں شامل تمام لوگ فوج سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے مطابق وقت بہت کم تھا لہٰذا اس نے تیزی سے قدم بڑھائے۔ انقلاب کے لیے ایک انقلابی ڈھانچا ترتیب دینے کے لیے اپنی یونٹ میں سپاہیوں سے رابطہ کیا۔ انہیں مصر کے حالات سے آگاہ کیا۔ مصر اور برطانیہ کے موضوع پر لیکچر دیے۔

اس کی ملاقات اخوان المسلمین کے شیخ حسن البنا سے ہوئی۔ انور اب تک یہ سمجھتا رہا تھا کہ اخوان المسلمین ایک مذہبی جماعت ہے لیکن قریب جاکر اسے معلوم ہوا کہ اس جماعت کے عزائم سیاسی ہیں۔ آخر اس نے ہمت کر کے شیخ سے کہہ ہی دیا۔

''میں تمہیں یہ بتانے کی جرأت کررہا ہوں کہ میں ایک فوجی تنظیم قائم کررہا ہوں تاکہ موجودہ حکومت کا تختہ الٹا جاسکے۔''

پہلے تو شیخ اسے حیرت سے گھورتا رہا اور یہ سمجھا کہ انور انٹیلی جنس کا آدمی ہے لیکن انور نے اس کی غلط فہمی دور کی اور ایک مرتبہ پھر زور دے کر کہا۔ ''جو کچھ میں نے کہا وہ سچ ہے۔ میں فوجی انقلاب لانے کے لیے کوشاں ہوں اور بے شمار فوجی میرے ساتھ ہیں۔''

شیخ نے اپنے اطمینان کے لیے کئی سوالات کیے۔ کون سے افسر؟ کون کی یونٹس؟ تم کس قدر طاقتور ہو؟ تم اس انقلاب کے لیے کتنے سپاہی چاہتے ہو وغیرہ وغیرہ۔ جب شیخ ان سوالوں کے جواب سن چکا تو اس نے تعاون کا یقین دلادیا۔

اسی شیخ کی کوششوں سے انور کی ملاقات مصری فوج کے انسپکٹر جنرل عزیز المصری پاشا سے ہوئی۔ یہ وہ شخص تھا جس نے ترک انقلاب کے دوران میں کمال اتاترک کے ساتھ نمایاں کارنامے انجام دیے تھے۔

انور چاہتا تھا کہ وہ عزیز المصری کے تجربے سے استفادہ کرے۔ اس تنظیم جنگجو کی خدمات اسے مل جائیں۔ یہ ملاقات نہایت پُراسرار طریقے سے ہوئی۔ شیخ حسن البنا نے اسے ایک ٹکٹ دے کر ڈاکٹر ابراہیم حسن سرجن سے ملنے کو کہا۔ غرض طبی معائنہ تھا۔

وہ معائنہ گاہ میں بیٹھا رہا اور جب اس کی باری آئی تو وہ ڈاکٹر کے پاس پہنچ گیا اور ٹکٹ دکھایا۔ ڈاکٹر نے سر سے پاؤں تک اسے دیکھا اور ایک کمرے میں بھیج دیا جہاں عزیز المصری موجود تھا۔

''آپ کسی خفیہ تنظیم کے ایجنٹ تو نہیں؟'' عزیز المصری نے شک کا اظہار کیا۔

''اگر ایسا ہوتا تو میں آپ سے براہِ راست ملاقات کرتا۔ حسن البنا کے توسط سے نہ آتا۔ کیا آپ کو ان پر اعتماد نہیں؟''

''تم مجھ سے ملنے کیوں آئے ہو؟ مجھ سے کیا چاہتے ہو؟''

''ہم افسروں نے ایک تنظیم بنائی ہے جس کا مقصد انگریزوں کو مصر سے نکالنا ہے اور ملک کی موجودہ صورتِ حال کو بدلنا ہے۔ ہم اُمید کرتے ہیں کہ آپ فوج کی ایک اہم شخصیت کی حیثیت سے اپنے تجربات سے ہمیں نوازیں گے۔''

تب انہوں نے بولنا شروع کیا۔ ''میں خود برسوں سے اس مقصد کے حصول کے لیے رابطے کیے ہوئے ہوں مگر لوگ ساتھ نہیں دیتے، تھوڑے عرصے بعد بدل جاتے ہیں۔''

''آپ ہمیں بدلنے والوں میں سے نہیں پائیں گے۔ ہم اس بارے میں سنجیدہ ہیں اور آپ کے مشوروں کے طالب ہیں۔''

''تو پھر میرا مشورہ یہ ہے کہ تم خود پر بھروسا کرو اور دوسری ہماری تہذیب ہے۔ تمہیں ذہنوں کو تیار کرنا ہوگا۔ تیسرے یہ یقین کرلو کہ تمہاری تنظیم خوب مضبوط ہے اور کوئی اجنبی تمہارے درمیان گڑبڑ پیدا نہیں کرسکتا۔ یاد رہے کہ خود اعتمادی بہت بڑی نعمت ہے۔ کسی لیڈر کا انتخاب مت کرو۔ تم خود ابتدا کرو۔ تمہیں شاید یقین نہ آئے، جنرل خود ایک لیڈر تھا اور اس کی عمر ستائیس سال تھی تمہاری عمر کتنی ہے؟''

''بائیس سال۔''

''بہت خوب، تمہارے پاس وقت ہے۔'' پھر انہوں نے دوسرا ہی سوال کردیا۔ ''تمہارا اخوان المسلمین سے کیا تعلق ہے؟''

''اتنا کہ میں نے حسن البنا کو بتادیا ہے کہ میرے عزائم کیا ہیں۔''

ملاقات کے خاتمے پر یہ طے ہوگیا کہ آئندہ ہماری

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ملاقاتیں کہاں ہوا کریں گی۔

ہٹلر کی توجہ بڑی تیزی سے یورپ پر چھا رہی تھیں۔ برطانیہ کی پوزیشن روز بروز کمزور ہو رہی تھی۔ یہ بہترین وقت تھا کہ برطانوی تسلط سے آزادی حاصل کر لی جائی لیکن اسی دوران میں اس کی تبدیلی "مارسا نیرو" کر دی گئی۔ یہ علاقہ مصر کے انتہائی شمال میں تھا۔

مارسا نیرو سے واپسی میں اس نے انقلاب کا منصوبہ بنایا لیکن وہ ناکام ہو گیا۔

اسے گرفتار کر لیا گیا اور قاہرہ میں انتظامیہ کے حوالے کر دیا گیا۔ ڈپٹی اتھارٹی نے اسے طلب کیا اور جرح شروع ہو گئی۔

"کیا تمہارا عزیز المصری سے کوئی تعلق تھا۔ کیا تم اس کے پاس جایا کرتے تھے؟"

"ہاں میں جاتا تھا اور یہ کوئی جرم نہیں میں ان سے متاثر تھا۔"

"تم ان تعلقات کے بارے میں جانتے ہو جو عزیز المصری اور جرمنوں کے درمیان ہیں؟"

"میں کیا کہہ سکتا ہوں جبکہ میں قاہرہ سے بہت دور ہوں۔"

انور کے خلاف جرم ثابت نہ ہو سکا۔ ڈپٹی اتھارٹی نے کہا کہ اسے رہا کر کے ڈیوٹی پر واپس بھیج دیا جائے۔ اس نے ڈیوٹی جوائن کر لی مگر سیاسی سرگرمیاں جاری رہیں۔ مصری اور برطانوی افسروں کی ایک کمیٹی نے اس کے گھر پر چھاپا مارا۔

چھاپے کے دوران میں سرکاری پستولوں کے علاوہ بھی انہیں ایک پستول ملا۔ وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے اور ملکی قانون کے مطابق اسے آفیسر میس میں رکھا گیا۔ وہاں اس پر جرح ہوئی لیکن کچھ بھی ثابت نہ ہو سکا پھر انہوں نے ڈرانے دھمکانے کا سلسلہ شروع کیا۔ وہ میس میں بیٹھا تھا کہ اس کے والد اس سے ملنے آئے۔ وہ بہت تھکے ہوئے اور کمزور دکھائی دے رہے تھے۔

"بیٹا تم اقرار جرم کر لو۔"

"کیوں آپ کو یہ خیال کیوں آ گیا؟"

"مجھے بتایا گیا ہے کہ آج شام تک تمہیں فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کر دیا جائے گا۔ اگر تم نے اقرار کر لیا تو تمہارے ساتھ نرمی برتی جائے گی۔"

"یہ آپ سے کس نے کہہ دیا؟"

"میجر جنرل علی سوافی، چیف آف آرمی ایڈمنسٹریشن میرے پاس آئے تھے۔"

"انہیں میری اتنی فکر ہو گئی۔ یہ سب ہتھکنڈے ہیں آپ کو خوفزدہ کرنے کے۔ فائرنگ اسکواڈ کے سامنے کھڑا کرنا اتنا آسان نہیں۔ مجھے فوجی قانون کے مطابق پہلے ملٹری ٹریبونل قصور وار ٹھہرائے گی اور ابھی وہ مرحلہ نہیں آیا۔ انہوں نے صرف مجھے ڈرانے کے لیے آپ کو میرے پاس بھیجا ہے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔"

انور کے رینک اتروا لیے گئے اور اسے غیر ملکیوں کی جیل بھجوا دیا گیا۔ یہ وہ جیل تھی جس میں برطانیہ کے خلاف لڑنے والے قیدی رکھے جاتے تھے۔ یہ سال 1942ء کا تھا۔

جیل میں قدم رکھتے ہی اسے گھر کی یاد آئی پھر یہ خیال آیا کہ خدا جانے یہاں کب تک رہنا ہو۔ رہائی مل بھی تو میں کیا کروں گا۔ فوجی عہدہ پہلے ہی چھن چکا ہے۔ وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا پھر فرش پر بیٹھ گیا۔ اٹھ کر پھر ٹہلنے لگا۔ کئی دن یہی حال رہا اور پھر اس نے حالات سے سمجھوتا کر لیا۔

یہ اذیت زیادہ دیر قائم نہ رہ سکی۔ ایک روز جیلر نے حکم دیا کہ اپنا سامان سمیٹ لو۔ تمہیں یہاں سے لے جایا جا رہا ہے۔

"کہاں؟"

"یہ نہیں بتایا جا سکتا۔"

جب وہ سامان سمیٹ چکا تو ایک کاغذ اس کے سامنے رکھ دیا گیا۔

"یہاں دستخط کر دو۔" اس نے دستخط کر دیے۔ اسے جیل کے صدر دروازے پر لایا گیا جہاں ایک موٹر تیار کھڑی تھی۔ اس کے دونوں طرف دبیز پردے پڑے تھے تاکہ بیٹھنے والا باہر کچھ نہ دیکھ سکے۔ اس گاڑی نے اسے قاہرہ ریلوے اسٹیشن پہنچا دیا۔ پلیٹ فارم پر مسافروں کی بجائے بھاری تعداد میں سپاہی موجود تھے۔ غالباً پلیٹ فارم کو مسافروں سے خالی کروا لیا گیا تھا۔ ایک چھوٹی سی ڈیزل انجن گاڑی انتظار میں کھڑی تھی۔

اسے کچھ معلوم نہیں تھا کہ اس کی منزل کیا ہے۔ گاڑی بھاگ رہی تھی۔ اس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے کہیں دور لے جایا جا رہا تھا۔ گاڑی رکی تو اسے پھر ایک کار میں بٹھا دیا گیا۔ اس پر بھی پردے پڑے ہوئے تھے۔ وہ کچھ دیکھ نہیں سکتا تھا کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

گاڑی سے اترا تو معلوم ہوا کہ وہ شہر ابراہمیہ کے کنارے ایک عالی شان محل کے سامنے کھڑا ہے۔ وہ حیران تھا کہ اسے اس محل میں کیوں لایا گیا ہے۔ اسے تو کسی قید خانے میں ہونا چاہیے تھا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اس محل کو قید خانے کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ یہاں سے فرار ہونا تقریباً ناممکن تھا کیونکہ دیواریں اونچی تھیں اور اس کے باوجود خاردار تاروں کی باڑ لگائی گئی تھی۔

اس محل میں آہستہ آہستہ کچھ اور قیدی بھی آ گئے جن پر برطانیوں کو شبہ تھا کہ وہ انقلاب کی منصوبہ بندی کرتے رہے ہیں۔ ان میں کئی وہ لوگ بھی شامل تھے جو جدوجہد میں انور کے ساتھ تھے۔

یہ محل نہایت حسین اور آرام دہ تھا لیکن پھر بھی جیل خانہ تو جیل خانہ ہی ہوتا ہے۔ یہ احساس ہمیشہ رہتا ہے کہ وہ آزاد نہیں قید میں ہیں۔

اس قید خانے میں اس نے ایک سال گزارا تھا کہ اسے اور اس کے بعض ساتھیوں کو قاہرہ کے قریب زیتون قید خانے میں منتقل کر دیا گیا۔

زیتون میں دو طرح کے قیدی تھے۔ ایک وہ تھے جو مصر، شام یا لبنان میں موجود انگریزوں کے خلاف سینہ سپر تھے یا پھر فرانسیسی نوآبادیات کے لوگ تھے جنہوں نے کسی حکومت یا جرمنوں کو اپنی خدمات سپرد نہیں کی تھیں۔

زیتون کی زندگی بہت بور تھی۔ وقت گزاری کے لیے انہوں نے چڑیاں اور خرگوش پال لیے لیکن پھر بھی وقت چلنے کی بجائے رینگتا ہی رہا۔ اگر یہاں کوئی سہولت تھی تو وہ یہ تھی کہ یہ جگہ قاہرہ سے قریب تھی لہٰذا اس کے اہل خانہ اس سے جلد جلد آ کر مل لیا کرتے تھے۔

1944ء تک آتے آتے سیاست کا رخ تبدیل ہونے لگا۔ جرمنوں کی شکست واضح تھی۔ اس وقت پر رہائی کے لیے کوششیں کی جا سکتی تھیں۔ اس نے اور اس کے دوست حسن عزت نے طے کیا کہ اب زیتون میں لوگوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کروانی چاہیے۔ طے یہ ہوا کہ ان میں سے کچھ لوگ یہاں سے فرار ہو جائیں۔ چھ ساتھیوں کا انتخاب کیا گیا۔ حسن عزت نے کسی طرح باہر پیغام بھیج کر ایک کار کا انتظام کر لیا جو زیتون قید خانے کے باہر ان کا انتظار کر رہی تھی۔

فرار کے لیے شام کا وقت مقرر کیا گیا تھا کیونکہ اس وقت محافظوں کی تبدیلی کا وقت ہوتا تھا۔ طریقہ یہ تجویز ہوا کہ چھت میں سوراخ کیا جائے جو مشکل نہیں تھا۔

یہ چھ افراد اس سوراخ کے ذریعے چھت پر پہنچے اور وہاں سے گلی میں اتر گئے۔ گھپ اندھیرے میں انہوں نے وہ کار پہچان لی جو انہیں لینے آئی تھی۔

یہ سب کار میں بیٹھے اور روانہ ہو گئے۔ ابھی اس کار نے بہ مشکل دو میل کا فاصلہ طے کیا ہوگا کہ کار کا ایک ٹائر برسٹ ہو گیا۔ پہلے یہ طے ہوا کہ کسی قریبی گیراج میں جا کر ٹائر کی مرمت کروائیں لیکن انور نے انکار کر دیا۔

"یاد رکھو ہم سب مفرور ہیں۔ ممکن ہے ہمارا تعاقب بھی ہو رہا ہو۔ ہم زیتون سے زیادہ دور نہیں آئے ہیں جلد ہی پکڑ لیے جائیں گے۔"

"سوال یہ ہے کہ ہم کہاں جائیں؟" حسن عزت نے کہا۔

ان لوگوں میں ایک شخص محسن فاضل بھی تھا جس نے بہت وقت فرانس میں گزارا تھا۔ ایک فرانسیسی عورت اس کی شناسا تھی۔

"ایک فرانسیسی عورت میری واقف کار ہے جو یہاں سے کچھ فاصلے پر رہتی ہے۔ وہ ایک مصری دوست کے ساتھ رہتی ہے۔ اسے جنگ کے خاتمے پر فرانس لوٹ جانا تھا شاید وہ اب بھی اپنے مصری دوست کے ساتھ رہ رہی ہو۔"

اس کے گھر پہنچ کر گھنٹی بجائی تو وہ خود دروازے پر آئی۔ وہ نہایت حسین اور آزادی کے جذبے سے لبریز خاتون تھی۔ محسن نے اسے اپنی داستان سنائی تو اسے رحم آ گیا۔

"تمہیں قسمت سے آزادی ملی ہے اس کی قدر کرو اور کسی اور ملک بھاگ جاؤ۔"

"ہم اپنے حکمرانوں کی توجہ اپنی جانب مبذول کرنے کے لیے فرار ہوئے ہیں۔ ہم قانون شکنی نہیں کریں گے۔ ہم صرف اپنی آواز پہنچا کر پھر جیل چلے جائیں گے۔"

"واہ تم دوبارہ قید خانے کیوں جاؤ گے؟ میرے پاس دو ہزار پاؤنڈ ہیں وہ لے لو اور کسی بھی ملک فرار ہو جاؤ۔"

"مادام آپ کی پیشکش کا شکریہ لیکن ہم کہیں نہیں جا سکتے۔"

"تو پھر میرے گھر میں چھپے رہو جب تک تم یہاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

رہو گے میں تمہارا خرچ برداشت کرتی رہوں گی۔"

انور اور محسن نے یہ پیشکش قبول کر لی اور باقی چار ساتھی فرار ہو گئے۔

وہ رات انہوں نے اس کے گھر میں گزاری۔ صبح ناشتا کرنے ہی انہوں نے ٹیکسی پکڑی اور رائل اپاولین پہنچ گئے۔ استقبالیہ پر شاہی خاندان کا ایک نمائندہ موجود تھا۔ انہوں نے اپنے نام درج کروائے۔

"ہم زندان کے قیدی ہیں اور شاہ کو یہ بتانے آئے ہیں کہ برطانوی حکام ہمارے ساتھ بہت برا سلوک کر رہے تھے۔ ہم نے بطور احتجاج فرار کا راستہ اختیار کیا۔ ہم واپس قید خانے جانے کو تیار ہیں۔ ہمارے چار ساتھی فرار ہو چکے ہیں۔"

ان دونوں کو (انور اور محسن فاولی) اس وعدے پر دوبارہ جیل بھیج دیا گیا کہ اب ان کے ساتھ بہتر برتاؤ کیا جائے گا۔ سپرنٹنڈنٹ جیل تبدیل کر دیا گیا اور ان کے ساتھ واقعی بہتر سلوک ہونے لگا۔

اکتوبر 1944ء تک پرسکون وقت گزرا۔ اس دوران میں ایک ایک کر کے تقریباً تمام قیدی رہا ہو گئے۔ یہ تمام قیدی وہ تھے جو ملکی سیاست سے وابستہ تھے۔ جبکہ انور اور اس کے دیگر ساتھی برطانوی حکام کے احکام پر قید تھے۔ انور سے یہ بے انصافی برداشت نہیں ہوئی اور اس نے اپنے ساتھیوں کی مخالفت کے باوجود بھوک ہڑتال کر دی۔ جب اس کی حالت بگڑنے لگی تو اسے اسپتال منتقل کر دیا گیا۔ وہاں اس نے بھوک ہڑتال ختم کر دی لیکن علاج معالجے کے لیے اسے کچھ دنوں اسپتال میں رکنا تھا۔

کچھ دن بعد حسن عزت اس سے ملنے آیا۔

"تم یہاں پڑے پڑے کیا کر رہے ہو۔ تمہیں تو اب تک بھاگ جانا چاہیے تھا۔"

دوپہر کے کھانے کے وقت [illegible] والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا حسن اسے [illegible] لے گیا۔ اس نے ڈاکٹروں کی پارکنگ میں اپنی کار کھڑی کر دی تھی لیکن انجن بند نہیں کیا تھا۔ وہ دونوں کار میں بیٹھے اور ایک مقام کر ترم الخلیج پہنچ گئے جہاں حسن نے چھپنے کی تیاری کر رکھی تھی۔

کچھ دن وہ روپوش رہا۔ اس دوران میں اس کی داڑھی بڑھ چکی تھی۔ اسے اپنے خاندان کے لیے کچھ نہ کچھ کمانا تھا۔ اس نے حلیہ تبدیل کیا اور اپنا نام حاجی محمد رکھ لیا۔

تاکوما برج جب بنا تو اس پل کی بہت تعریف کی گئی تھی۔ خیال یہ تھا کہ یہ پل کم از کم سو سال تو چل ہی جائے گا۔ لیکن اس پل کو بنانے میں اس کی ڈیزائننگ کی غلطی نے سارا کام خراب کر دیا۔

صرف دو سال کے بعد وہ پل جھول گیا۔

کہا جاتا ہے کہ تیز ہوا کی وجہ سے پل اس انجام کو پہنچا ہے۔ لیکن حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس وقت ہوا کی رفتار صرف چالیس میل فی گھنٹا تھی۔

مرسلہ: احمد خان، ہنگو

1981 میں کنساس سٹی کے حیات ریجنسی ہوٹل کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس ہوٹل کی تعمیر 1979 میں مکمل ہوئی تھی۔

یہ ہوٹل اپنی بناوٹ، ڈیزائننگ اور پلاننگ کے لحاظ سے لاجواب تھا۔ بہت خوبصورت عمارت تھی اس کی۔ لیکن اس کی ڈیزائننگ میں غلطی رہ گئی۔ اس بات کا لحاظ نہیں رکھا گیا کہ اگر کبھی مقررہ تعداد سے زیادہ لوگ آ گئے تو کیا ہوگا۔

اس وقت ہوٹل میں رقص کا مقابلہ ہو رہا تھا۔ یہ مقابلہ ایک ہال میں ہو رہا تھا جس کے چاروں طرف بالکونیاں بنی ہوئی تھیں، اور سیکڑوں لوگ ان بالکونیوں سے اس مقابلے کو دیکھ رہے تھے کہ اچانک بالکونیاں دھڑا دھڑ گرنے لگیں اور ایک کہرام مچ گیا۔

دو سو افراد ہلاک ہو گئے تھے۔

مرسلہ: نصرت پروین، لاہور

9۔ لاس ویگاس کے ہوٹل میں ایک ایسا دل جب حادثہ ہوا کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ یہ حادثہ ایک زبردست تکنیکی غلطی کی وجہ سے ہوا تھا۔

ہوٹل کے پول سائڈ کو سولر سسٹم یعنی شمسی توانائی سے روشن رکھنے اور پانی کو گرم رکھنے کے لیے بڑے بڑے اس قسم کے شیشے لگائے گئے تھے جو شمسی توانائی کے حصول کے لیے لگائے جاتے ہیں۔

یہ بہت تاریخی موقع تھا۔ دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ پول سائڈ پر بہت سے افراد موجود تھے۔ اوپر لگے ہوئے شیشوں کے پردوں کو آہستہ آہستہ ایک طرف ہٹایا گیا اور اس کے ساتھ ہی سورج کی کرنیں براہ راست کچھ اس انداز سے نیچے تک آئیں کہ ان کی حدت میں پچاس گنا اضافہ ہو گیا۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے سورج کی شعاعوں نے وہاں موجود لوگوں کے بالوں اور کپڑوں میں آگ لگا دی۔ ہر طرف چیخ و پکار مچ گئی اور لوگوں نے تالاب میں کود کود کر جانیں بچائیں۔

مرسلہ: نثار بھٹو، لاڑکانہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پہلی ملازمت اسے ویک ٹرک سے مال اتارنے اور چڑھانے کی ملی پھر وہ ایک تاجر کا ڈرائیور بن گیا۔ اس کے بعد قاہرہ کے قریب ایک گاؤں میں بطور مزدور کام کیا۔ اس کا کام قاہرہ اور اسوان کے درمیان بننے والی نئی سڑکوں کے لیے پتھر ڈھونا تھا۔ قریب ہی ایک گیراج تھا جس پر ٹین کی چھت پڑی ہوئی تھی رات وہاں گزار لیتا۔

1945ء کے آغاز میں شرقیہ صوبے میں چلا گیا۔ یہاں نہر کی کھدائی کا کام ہو رہا تھا۔ اسے بھی یہاں کام مل گیا۔ یہ کام ظاہر ہے عارضی تھا۔ جب نہر کی کھدائی ہو چکی تو وہ پھر بے کار ہو گیا۔ اب وہ ''منصورہ'' چلا گیا۔ یہ نیل کے مشرق میں ایک صحرائی علاقہ تھا۔ اس نے کان کنی کی ایک مصری کمپنی سے ٹرانسپورٹ کی ٹھیکے داری کر لی۔ اس کا کام یہ تھا کہ سنگ مرمر لادتا اور اہرام مصر کے قریب پہنچاتا جہاں ایک ریسٹ ہاؤس تعمیر ہو رہا تھا۔

1945ء میں مارشل لا اٹھا لیا گیا۔ قانون کے مطابق اب وہ آزاد تھا۔ اس کی رہائی عمل میں آ گئی۔ وہ تین سال بعد اپنے گھر گیا۔ اس کی بیوی اس کی منتظر تھی لیکن اب انور کو اس سے کوئی ذہنی سروکار نہیں رہا تھا۔ اس کے دل میں اب تک وہ لڑکی آباد تھی جس سے وہ قاہرہ میں مل چکا تھا یعنی جیہان۔ اب تک وہ کہیں ٹک کر بیٹھ نہیں سکا تھا ورنہ شاید شادی بھی کر لیتا۔

اس نے جب اپنی آزادی پر نظر ڈالی تو اسے محسوس ہوا کہ وہ اب بھی قیدی ہے۔ وہ آزاد تھا لیکن اس کا مصر تو اب بھی غیروں کی قید میں تھا۔ آزاد تو وہ ہوتا ہے جو اپنی مرضی اور اپنی پسند سے کام کر سکے یہاں تو سب کچھ دوسروں کی مرضی سے ہو رہا تھا۔

اس دوران میں یہ تبدیلی آ گئی تھی کہ نحاس پاشا وزارت عظمیٰ سے برطرف کر دیا گیا تھا اور علی مہر برسر اقتدار ہو گیا تھا۔

نحاس پاشا گڑبڑ پھیلانے کے لیے کمزور ہدف ہو سکتا تھا کیونکہ اب وہ اقتدار میں نہیں تھا۔

انور نے اپنے ساتھیوں سے رابطہ شروع کیا۔ اس کا رابطہ عمر ابو علی سے بھی ہوا۔ اس نے حسین توفیق سے طور باہر وغیرہ سیاہیوں کو ہراساں کرنے میں بڑا ماہر تھا۔

نحاس پاشا کو ایک جگہ تقریر کرنے کے لیے آنا تھا۔ وہ اب وزیر اعظم نہیں رہا تھا لیکن پھر بھی حالات ایسے تھے کہ اس کی حفاظت کا بندوبست کیا گیا تھا۔

نحاس پاشا کی کار پر دستی بم پھینکنا تھا اور یہ کام حسین توفیق کو سونپا گیا تھا اور باقی لوگ اس کی بیک پر تھے۔ اس نے بڑے صحیح وقت پر بم پھینکا لیکن گرینیڈ چھ سیکنڈ بعد پھٹا۔ وہ بچ گیا۔

حملے کی ناکامی کے بعد تمام دوست وہاں سے کھسک لیے اور ایک قریبی کیفے میں جا کر بیٹھ گئے۔

اس خاموشی کو کچھ ہی دن گزرے تھے کہ نحاس پاشا کا ایک قریبی ساتھی امین عثمان جو انگریزوں کا سب سے بڑا پٹھو تھا، زد میں آ گیا۔

حسین توفیق نے اسے اس وقت قتل کر دیا جب وہ برطانیہ کے ہائی کمشنر سے ملاقات کے بعد واپس ہو رہا تھا۔ لوگ اسے پکڑنے کے لیے بھاگے لیکن اس نے دستی بم پھینک کر سب کو منتشر کر دیا اور خود بہ حفاظت اپنے گھر پہنچ گیا لیکن لوگوں نے اس کا حلیہ پولیس کو بتا دیا اور پولیس نے اسے حراست میں لے لیا۔ اس کے دوسرے ساتھیوں کی چھان بین شروع ہوئی تو انور السادات کا نام بھی آ گیا۔

اسے گرفتار کر لیا گیا اور پہلے کی طرح غیر ملکیوں کی جیل پہنچا دیا گیا۔ اسے قید تنہائی میں رکھا گیا تھا البتہ اسے یہ معلوم ہو گیا کہ حسین توفیق بھی یہیں ہے اور پہلی منزل پر ہے۔

ایک ہفتہ گزر گیا نہ کوئی اس کے پاس آیا نہ اسے بلایا گیا پھر اچانک سرد موسم کی آدھی رات کو اس کا دروازہ کھلا اور سپاہی اسے گھسیٹتے ہوئے جیوری کے سامنے لے گئے۔

''کسی جرح سے پہلے پوچھا ہے کہ تم اپنے جرم کا اقرار کر لو۔''

''کس جرم کا؟ اس جرم کا جو میں نے کیا ہی نہیں ہے۔''

''حسین توفیق نے اعتراف جرم کر لیا ہے۔ اس نے یہ بھی بتا دیا کہ تم شریک ملزم ہو۔''

انور یہ سن کر سناٹے میں آ گیا۔ اگر اس نے سب کچھ بتا دیا ہے تو بچنے کی امید نہیں پھر ایک فوری خیال نے اسے تر و تازہ کر دیا۔ اگر یہ طے ہو جائے کہ توفیق نے یہ بیان ڈرا دھمکا کر دیا ہے تو اس بیان کی کوئی حیثیت نہیں رہ جائے گی۔

''حسین توفیق کا یہ بیان غلط ہے۔ ممکن ہے اسے ڈرایا دھمکایا گیا ہو۔ اسے میرے سامنے لاؤ اسے جو کچھ کہنا ہے میرے سامنے آ کر کہے۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جیل انتظامیہ اس پر تیار نہیں ہوئی۔ اسے پھر تنہائی میں ڈال دیا گیا۔ وہ اسے اعتراف جرم پر مجبور کر رہے تھے اور وہ اپنی ضد پر قائم تھا۔

اب اسے یہ سزا دی گئی کہ اسے قاہرہ سینٹرل جیل منتقل کر دیا گیا۔ یہ جیل غیر ملکیوں کی جیل سے مختلف تھی۔ وہاں کوئی بستر، میز، کرسی یا لیمپ نہیں تھا۔ فرش پر ایک چٹائی بچھی تھی جس پر صرف ایک آدمی سو سکتا تھا۔ ایک گندہ کمبل پڑا تھا۔ فرش پر سیلن تھی جس سے بدبو آتی تھی۔ نہ پڑھنے کی سہولت تھی نہ بدبو سے نجات کی۔ رات کا اندھیرا دور کرنے کے لیے لیمپ تک نہیں تھا۔ وہ اس وقت یہی سوچ سکتا تھا کہ اگر وہ انقلاب لانے میں کامیاب ہو گیا تو سب سے پہلے ان غیر مساوی جیلوں کو ختم کرے گا۔

اس کے آنے کے بعد دوسرے ملزم بھی قاہرہ سینٹرل جیل آنا شروع ہو گئے جس کا مطلب تھا کہ ہمارا مقدمہ ابھی سرکاری طور پر جاری ہے۔ وہ ذہن کے زور لیے اسے بتا چکا کہ اگلا مرحلہ مجسٹریٹ کے سامنے پیش ہونا ہوگا۔ وہ یا تو اس مقدمے کو سیشن کے سپرد کر دے گا یا رہائی عمل میں آجائے گی۔

مجسٹریٹ کے سامنے مقدمہ پیش ہوا تو وکلا آزادی سے مقدمہ لڑ سکتے تھے۔ یہ وکلا مصر کے بہترین وکلا تھے۔ انور نے اعتراف جرم نہیں کیا تھا اس لیے وکلا کو مقدمہ لڑنے میں آسانی ہو رہی تھی لیکن اس کے باوجود وہ صرف دو ملزمان کو ہی ضمانت پر رہائی دلا سکے۔ انور سمیت باقی لوگ جیل ہی میں رہے۔

1946ء میں یہ مقدمہ فوجداری عدالت میں منتقل ہو گیا۔

قاہرہ کی سینٹرل جیل میں جب وقت ساکن ہوا۔ بیرونی دنیا سے رابطہ بالکل منقطع ہو گیا تو وہ اپنے اندر اتر گیا۔ اس نے دیکھا کہ جس جنگ کا آغاز کئی سال پہلے ہوا تھا وہ اب تک جاری ہے۔ ایک طرف اس کی بیوی تھی جو گاؤں میں تھی دوسری جانب جیہان تھی۔ اس نے بڑے دکھ سے سوچا کہ میری بیوی میرے ساتھ کیوں سزا بھگت رہی ہے۔ میری طرح وہ بھی کیوں قید میں رہے۔ کیا اسے طلاق دے دوں۔ یہ نام نہاد شادی کیوں قائم رہے جس میں نہ جسمانی قربت ہے نہ خیالات میں ہم آہنگی پھر جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گیا۔ اس نے اسے پیغام بھیج دیا کہ وہ جیل میں ملاقات کو نہ آیا کرے۔

وہ یہی سمجھی ہوگی کہ کسی نے، شاید میرے والد یا بھائی نے مجھے اکسایا ہے لیکن ایسا نہیں تھا۔ انور نے اس کی وضاحت بعد میں کر بھی دی۔

جیل کے آخری دنوں میں اخبارات، رسائل اور کتابیں پڑھنے کی اجازت مل گئی۔ اس نفرج نے کچھ دنوں کے لیے ان مسائل سے اس کے ذہن کو ہٹا دیا۔

اس نے اب اس سیلن بھری جیل کی کوٹھری سے سمجھوتا کر لیا تھا۔ پھانسی یا عمر قید ہی ہوگا نا۔ اب جو بھی ہو اسے ہونے دو۔

وہ جیل ہی میں تھا کہ عرب اسرائیل کی جنگ چھڑ گئی۔ یہ اس کے لیے نہایت تکلیف دہ دن تھے۔ وہ پابند سلاسل تھا اور اسرائیل فضائیہ بمباری کر رہی تھی۔ مقدمہ الگ چل رہا تھا جس کا انجام کسی کو معلوم نہیں تھا۔

حکومت کا رویہ تبدیل ہو رہا تھا۔ اسے کبھی کبھار باہر نکلنے کی اجازت مل جاتی تھی۔ اس نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اس نے فوجی ڈاکٹر احمد علی کے پاس علاج کے لیے جانے کی اجازت طلب کی۔ یہ ڈاکٹر اس کا دوست بھی تھا۔ اسے یہ اجازت بہ آسانی مل گئی۔ ایک پولیس آفیسر کو اس کے ساتھ کر دیا گیا۔

جیل سے اسپتال تک کا راستہ ایک گھنٹے کا تھا۔ وہ اسپتال پہنچا۔ ڈاکٹر چونکہ اس کا دوست تھا اس لیے اس نے اس سے کہا کہ علاج اطمینان سے کرے تاکہ میں آتا جاتا رہوں۔

اس کا آنا جانا لگا رہا۔ اسی اسپتال میں کبھی کبھی والد سے بھی مل لیتا تھا جو ان دنوں فوجی اسپتال میں کام کرتے تھے۔ اسے یہ آزادی زیادہ دن نصیب نہ ہو سکی کیونکہ حسین توفیق بھاگ نکلا تھا لہٰذا سب پر دوبارہ سے سختی کر دی گئی۔

اگست 1948ء میں مقدمے کا فیصلہ سنا دیا گیا۔ حسین توفیق کو اس کی غیر موجودگی میں دس سال کی قید سنائی گئی اور انور پر الزام ثابت نہ ہو سکا۔

جیل میں اکتیس ماہ گزارنے کے بعد وہ ایک مرتبہ پھر آزاد تھا۔ وہ رہا ہو کر اپنے گھر گیا تو اس کی بیوی اس کی منتظر تھی لیکن اس شکوے کے ساتھ کہ اس نے اپنے والد اور بھائی کے کہنے پر اسے ملاقات کے لیے جیل آنے سے روک دیا تھا۔

"میں اپنے خاندان میں وہ فرد ہوں کہ دوسرے میرے مشورے پر عمل کرتے ہیں نہ یہ کہ میں ان کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مشوروں پر عمل کروں۔ یہ مجھے کسی نے نہیں اکسایا تھا۔ میں نے از خود تمہاری ملاقات کو ختم کیا تھا کیونکہ ہمارا باہم رہنا اب ممکن نہیں۔"

اس نے ایک آنکھ بند وہ فیصلہ کیا اور بیوی کو طلاق دے دی۔

وہ "بلوان" چلا گیا۔ یہ سستی جگہ تھی۔ وہ یہاں کم اخراجات کرکے زیادہ آرام سے رہ سکتا تھا۔ دوستوں سے دور تنہائی میں آئندہ کا لائحہ عمل بھی طے کرسکتا تھا۔

جتنی رقم جیب میں تھی اسے ساتھ لیا اور بلوان میں ایک مکان کرائے پر لے کر رہنے لگا۔ کرنے کو کچھ نہیں تھا اپنا وقت مطالعے میں گزار رہا تھا۔ اسے کسی سے کوئی غرض نہیں تھی۔ معاشرے سے الگ تھلگ تنہائی کے دن گزار رہا تھا۔ تنہائی پسندی اس کی فطرت بن گئی تھی۔ کبھی کبھی یہ ہوک ضرور اٹھتی تھی کہ وہ پھر سے وہی انور السادات بن جائے جو قاہرہ کی سڑکوں پر موٹر کار میں گھوما کرتا تھا۔

حسن عزت جو اس کا ساتھی تھا اور دوست بھی، وہ اسے جگہ جگہ تلاش کرتا پھر رہا تھا اور بالآخر اس نے ایک دن اسے بلوان میں ڈھونڈ ہی لیا۔

دونوں دوستوں میں خوب گلے شکوے ہوئے۔

"تم یہاں اکیلے رہ کر کیا کررہے ہو؟"

"کچھ بھی نہیں، یہ سوچ رہا ہوں کہ میں کیا تھا اور کیا ہوگیا ہوں۔"

"تم تو بہت عملی آدمی تھے۔ یہ تمہیں کیا ہوگیا ہے کہ سب سے کنارہ کشی کرلی۔ انسان کا عمل اسے کسی بڑے مقصد کی طرف بڑھاتا ہے۔ اکیلے پڑے رہو گے تو خوامخواہ کے خیالات ذہن میں پرورش پانے لگیں گے۔ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا پھر یہ بھی سوچو کہ گزر بسر کیونکر کروگے۔ خرچ تو اکیلے آدمی کا بھی ہوتا ہے۔"

"تو پھر کیا کروں، میرے اختیار میں بھی تو کچھ نہیں۔"

"میرے ساتھ چلو۔"

"کہاں؟"

"جہاں میں رہتا ہوں، سوئز میں۔"

"میں تم پر بھی بوجھ بن جاؤں گا۔"

"یہ میرا مسئلہ ہے، تم جلدی سے تیار ہوجاؤ۔ ہم ابھی چلیں گے۔"

"میں مالک مکان سے تو مل لوں، جو کچھ اسے دینا ہے ادا کردوں۔"

"جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔ اب میں تمہیں اس حال میں نہیں دیکھ سکتا۔"

انور نے لباس تبدیل کیا۔ یہ ایک ہی پتلون تھی جو اس کے پاس تھی۔ اس کے سوا کوئی کپڑا اس کے پاس نہیں تھا۔ ایک جیکٹ تھی جو اس نے قمیص کے اوپر پہن لی۔ جب وہ چلنے لگا تو حسن نے دیکھا کہ اس کے کپڑے بہت پرانے ہوچکے ہیں۔ اس کی پتلون تو پیچھے سے گھس بھی چکی ہے۔

"یہ پتلون تو بہت خستہ ہوچکی ہے۔ تم کوئی دوسری پتلون کیوں نہیں پہن لیتے۔"

"میرے پاس بس ایک پتلون رہ گئی ہے۔ اسی سے کام چلانا ہوگا۔"

حسن کو اس کی حالت پر افسوس کے سوا کیا ہوسکتا تھا۔ وہ اسے سوئز لے جانے سے پہلے قاہرہ لے گیا۔ یہاں اس نے انور کے لیے کچھ کپڑے خریدے۔

وہ اسے اپنے گھر لے گیا نہایت خاطر مدارات کیں۔ چند روز کی مہمان داری کے بعد وہ انور کی مالی حالت کی طرف متوجہ ہوا۔

"تم میرے ساتھ کام کیوں نہیں کرتے؟"

"مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ تم آج کل کیا کررہے ہو؟"

"میں کچھ بھی کررہا ہوں۔ تم میرے ساتھ کاروبار میں شریک ہوجاؤ۔"

حسن جو کاروبار کررہا تھا اس میں سوئز کے راستے سعودی عرب کی برآمد ہوتی تھی۔ حسن نے اسے اپنے ساتھ کاروبار میں شریک کرلیا۔ جب آمدنی کا کچھ آسرا ہوگیا تو انور ایک چھوٹے سے ہوٹل میں کرائے پر رہنے لگا۔

ایک روز وہ حسن کے گھر گیا ہوا تھا کہ اس کی ملاقات جیہان سے ہوگئی۔ وہ اسے وہاں دیکھ کر حیران رہ گیا بعد میں معلوم ہوا کہ وہ حسن کی بیوی کی کزن ہے۔ اس لیے یہاں آئی ہوئی ہے۔ ناشتے کی میز پر وہ باتیں کم اسے دیکھتا زیادہ رہا پھر اس طرح دیکھتے رہنا اسے بدتمیزی معلوم ہوئی۔ بہتر یہی ہے کہ کوئی بات کی جائے۔

"آپ تو فرانسیسی ادب میں ایم اے کررہی تھیں، اس کا کیا ہوا؟"

"بس ابھی امتحان دے کر فارغ ہوئی ہوں۔"

"اس خالی وقت میں کیا مشغلہ ہے؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

’’کوئی مہمان آجائے تو اس سے باتیں کر لیتی ہوں۔‘‘ اس نے فقرہ لگایا۔ اس کا اشارہ انور کی طرف تھا۔

’’ارے تم لوگ تو ایک دوسرے کو پہلے سے جانتے ہو۔‘‘ حسن عزت نے کہا۔

’’تمہیں شاید معلوم نہیں۔ ان سے ہماری دور کی رشتے داری ہوتی ہے۔ میں پہلے بھی ان سے کم از کم ایک مرتبہ مل چکا ہوں۔‘‘

’’جیہان، ان سے بچ کر رہنا۔ یہ بڑے خطرناک آدمی ہیں۔‘‘ حسن عزت نے کہا۔

’’ہمارے رشتے دار ہیں خطرناک تو ہونا ہی ہے۔‘‘

ایک ساتھ کئی قہقہے بکھر گئے پھر ادھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔ انور کہیں دور کھویا ہوا تھا۔ جو خیال بہت دن سے نہیں آیا تھا وہ سامنے آکر بیٹھ گیا تھا۔

سب لوگ اٹھے تو اسے بھی اٹھنا پڑا۔ اب سب لوگ ڈرائنگ روم میں بیٹھے ہوئے تھے۔ یہاں بھی وہ زیادہ تر جیہان ہی سے مخاطب رہا۔

مشکل یہ تھی کہ وہ زیادہ دیر نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ اسے حسن عزت کے ساتھ کہیں جانا تھا اور اسے جانا پڑ گیا۔ وہ جانے کے لیے اٹھا۔ اس نے جیہان کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھیں اداس تھیں جیسے اس کا جانا اسے پسند نہ آیا ہو۔

’’ڈیڈی! آپ کے بارے میں کئی مرتبہ پوچھ چکے ہیں۔‘‘ جیہان نے کہا۔ ’’کبھی آیئے گا ہماری طرف۔‘‘

’’اس تقاضے کے بعد تو آنا ہی پڑے گا۔‘‘ انور نے خوش دلی سے کہا اور باہر نکل گیا۔

اس ملاقات نے اس کے زخم تازہ کر دیے تھے۔ جیل میں رہ کر دوسری شادی کے بارے میں فلسفیانہ انداز میں جتنا سوچا تھا وہ سب یاد آنے لگا۔ اس نے جیہان کی آنکھوں میں پسندیدگی کی وہ جھلک بھی دیکھ لی تھی جو وہ پہلی ملاقات میں نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس کا مطلب یہی تھا کہ وہ بھی اس کے بارے میں سوچتی رہی ہے۔

کئی دن کی کاروباری الجھنوں کے بعد وہ ایک روز قاہرہ میں اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ اسے دیکھ کر کھل اٹھی۔ اس نشست میں اس کے والد بھی موجود تھے جو اس کے کاروبار کے سلسلے میں اس سے باتیں کرتے رہے۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے اٹھ کر گئے تو اسے موقع مل گیا۔

’’جیہان، کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ فرصت کے کچھ لمحات تمہارے ساتھ گزارنے کے لیے یہاں آجایا کروں؟‘‘

’’ہماری آپ کی رشتے داری ہے۔ اس کا فائدہ اٹھا کر آپ جب چاہیں آسکتے ہیں۔‘‘

’’میں بھی چاہتا ہوں کہ اس رشتے داری کو کوئی اور رنگ دے سکوں۔‘‘

جیہان کے چہرے پر کئی رنگ بکھر گئے۔ وہ ابھی ان رنگوں سے کھیل رہی تھی کہ اس کے والد آگئے لیکن انور کو اس کے چہرے کے بکھرے ہوئے رنگوں نے سب کچھ بتا دیا تھا۔ وہ جب وہاں سے اٹھا تو وہیں جیسے چھوڑ گیا تھا۔

وہ قاہرہ سے دور نہیں تھا۔ اس نے جیہان کی گرم جوشی کو محسوس بھی کر لیا تھا۔ وہ اس کے گھر جاتا رہا۔ کئی ایسے مواقع آتے رہے جب انہیں تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع ملا تھا۔ جیہان کے دل میں اس کے لیے جگہ بنتی جا رہی تھی اور کبھی کبھی اس کا اظہار بھی ہو جاتا تھا۔

حسن عزت کے ساتھ وہ دلچسپی کے ساتھ کام کر رہا تھا۔ منافع کی رقم آئی تو انور کے حصے میں 180 پاؤنڈ آئے لیکن حسن عزت نے اسے صرف ساٹھ پاؤنڈ دیے باقی اپنی جیب میں رکھ لیے۔ انور کو اس ناانصافی پر سخت غصہ آیا اور وہ اس کے کاروبار سے الگ ہو گیا۔

اب یہ ساٹھ پاؤنڈ اس کا کل سرمایہ تھا اور بے کاری کے دن تھے۔ اسے جلد سے جلد کوئی ملازمت ڈھونڈنی تھی تاکہ سرمایہ ختم ہونے سے پہلے اس کی آمدنی کا کوئی آسرا ہو جائے۔

اس کا ایک دوست احسان عبدالقدوس الہلال نامی اخبار کے ادارتی عملے میں شامل تھا۔ انور نے اس سے رجوع کیا کہ شاید اس کے ذریعے کسی اخبار میں اسے نوکری مل جائے۔ احسان نے اس وقت تو معذرت کر لی لیکن کچھ دن بعد ہی اسے ملازمت چھوڑنی پڑ گئی۔ وہ انور کو اخبار کے مالک شکری زیدان کے پاس لے گیا۔

’’میں اپنا نعم البدل لے آیا ہوں۔ میرے جانے کے بعد یہ آپ کو میری کمی محسوس نہیں ہونے دے گا۔‘‘

’’اس سے پہلے کسی اخبار میں کام کر چکے ہو؟‘‘

’’کہیں کام تو نہیں کیا لیکن لکھنے کی صلاحیت ضرور ہے۔‘‘ اخبار کے مالک نے انور سے پوچھا۔

’’آپ کیا لکھتے رہے ہیں کیا آپ مجھے اس کا کوئی نمونہ دکھا سکتے ہیں؟‘‘

’’میرے پاس جیل میں لکھی ہوئی ڈائری ہے۔ اگر آپ اسے اپنے اخبار میں شائع کریں تو لوگ بڑے شوق

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے پڑھیں گے۔"

"اس ڈائری کو آپ ڈبڑھ کالم میں موزوں کریں۔ یہ قسط وار شائع ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"لیکن یہ کام ابھی ہونا چاہیے اور وہ بھی صرف تین گھنٹے میں۔ کاپیاں پریس میں جانے والی ہیں۔"

انور سمجھ گیا کہ اخبار کا مالک اس کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ اس نے اخبار کے مالک کا شکریہ ادا کیا اور لکھنے بیٹھ گیا۔ جب اس نے ڈیڑھ کالم کا مواد ترتیب دے لیا تو پہلی قسط مالک کے حوالے کر دی۔ اس نے اسے پڑھا اور کاتبوں کے حوالے کر کے خود گھر چلا گیا۔

انور بھی گھر چلا گیا اس وقت وہ یہی سمجھا تھا کہ اخبار کے مالک کو ڈائری پسند آگئی ہے۔ وہ اسے قسط وار شائع کر کے معاوضہ ادا کرے گا یا اپنے اخبار کے لیے آئندہ بھی مضامین لکھواتا رہے گا۔

دوسرے دن اخبار کے مالک نے اسے بلوالیا۔ اسے یہ سن کر حیرت ہوئی کہ اسے بہ وقتی ادارتی عملے میں شامل کرلیا تھا۔ وہ الہلال سے وابستہ ہوگیا۔ جب باقاعدہ تنخواہ کا آسرا ہوگیا تو وہ یہ خوش خبری سنانے جیہان کے گھر گیا۔

"جیہان، اگر میں تم سے وہ فاصلے مٹانے کو کہوں جو اس وقت تک میرے اور تمہارے درمیان ہیں تو تمہارا کیا جواب ہوگا؟"

"اس جواب کا تعلق مجھ سے نہیں میرے والدین سے ہے۔"

"مجھے ان سے پہلے تمہاری اجازت کی ضرورت ہے۔ تم مجھے کس حد تک اپنے لائق سمجھتی ہو؟"

"اب تو آپ برسر روزگار بھی ہوگئے ہیں۔ آپ ڈیڈی سے بات کرسکتے ہیں۔"

"یہ ملازمت کوئی ایسی اعلیٰ درجے کی نہیں۔ کیا خبر اس رشتے کو وہ تمہارے لائق سمجھیں یا نہ سمجھیں۔"

"آپ بات تو کر کے دیکھیں۔ وہ آپ کو بہت اچھا انسان سمجھتے ہیں، انکار نہیں کریں گے۔" اس نے جیہان کے والد سے بات کی اور انہوں نے آمادگی ظاہر کر دی۔

الہلال قاہرہ سے نکلتا تھا۔ جیہان بھی قاہرہ میں رہتی تھی لہٰذا وہ بھی قاہرہ آگیا تھا۔

ایک دن وہ اخبار کے دفتر میں بیٹھا تھا کہ حسن عزت اس سے ملنے آیا بالکل اسی طرح جیسے وہ اس کے پاس بلوان آیا تھا۔

"تمہیں معلوم ہے اب میں قاہرہ آگیا ہوں؟"

"یہ تو بہت اچھا ہوا ملاقاتیں ہوتی رہیں گی۔"

"تم یہاں الہلال میں رہ کر کیوں اپنی صلاحیتیں ضائع کر رہے ہو؟"

"یہ کام میرے مطلب کا ہے۔"

"ایک معمولی تنخواہ کے سوا تمہیں ملتا کیا ہوگا؟"

"میرے لیے بہت ہے۔ محنت بھی زیادہ نہیں ہے۔"

"تم شادی کرلو گے تو تمہارا خرچ بڑھ جائے گا۔"

"اس وقت کچھ اور سوچوں گا۔"

"ابھی کیوں نہیں سوچتے۔ تم میرے ساتھ کاروبار میں شریک ہو جاؤ۔ جو کام میں کرنا چاہتا ہوں اس میں بہت منافع ہے۔" اس نے کچھ اس طرح انور کو سمجھایا کہ وہ اس پر تیار ہوگیا لیکن اب مسئلہ الہلال چھوڑنے کا تھا۔ اس نے استعفیٰ دے دیا۔ مالک یہ سمجھا کہ انور تنخواہ بڑھانے کے لیے استعفے کا حربہ استعمال کر رہا ہے۔ اس نے تنخواہ بڑھانے کی پیشکش کردی لیکن وہ ملازمت چھوڑنے کا فیصلہ کرچکا تھا لہٰذا چھوڑ دی۔

جیہان کے والد شادی پر زور دینے لگے تھے لہٰذا 29 مئی 1949ء کو اس نے جیہان سے دوسری شادی کرلی اور اسے لے کر شرقیہ کے ایک بڑے شہر "زقازیق" منتقل ہوگیا۔

وہاں منتقل ہونا اس لیے بھی ضروری تھا کہ حسن اور انور نے ٹل کر شرقیہ صوبے کے بیرون دیہات کو پینے کا پانی مہیا کرنے کا ٹھیکا لیا تھا۔ یہ ٹھیکا حسن عزت کے نام پر لیا گیا تھا۔

اس نے ٹھیکے میں چھ ماہ میں چھ ہزار پاؤنڈ نفع کمایا۔ اس حوصلہ افزائی کے بعد انہوں نے بڑے بڑے ٹھیکے لینے شروع کر دیے۔ "السیابا" صوبے کے دیہات میں پانی پہنچانے کا ٹھیکا ساٹھ ہزار پاؤنڈ تھا۔ اس ٹھیکے سے تیس ہزار پاؤنڈ منافع ہوا۔

ان منافعوں کی شرح کے لحاظ سے انور کو اپنی مالی حیثیت مستحکم کرنے کا خیال آیا۔ اس نے حسن عزت سے کچھ پیسوں کا مطالبہ کیا۔

"مجھے اپنی بیوی کے لیے رہائش درکار ہے۔ اپنی پہلی بیوی بچوں کو بھی مالی امداد دینا چاہتا ہوں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ بے دلی سے کام لیتا رہا پھر بے دلی سے مان گیا لیکن یہ طعنہ بھی دے دیا۔

”تم پہلے ہی دو ہزار پاؤنڈ لے چکے ہو جو زقازق کے قیام کے دوران میں خرچ کیے تھے۔“

اس کی یہ بے مروتی دیکھ کر انور کے دل کو دھچکا لگا۔ اس نے نہایت خلوص سے کام کیا تھا اور اب یہ صورت حال پیش آ رہی تھی۔ وہ تھوڑی دیر کے لیے یہ سوچنے لگا کہ دولت کی بے قدر شے کے لیے وہ یہ بھول گیا کہ وہ وطن کی آزادی کے لیے گھر سے نکلا تھا۔ اس کا باطن اس پر ہنسنے لگا۔ اس نے حسن عزت سے پیسے نہیں لیے۔ اس کی جیب میں ایک سو تین پاؤنڈ تھے اسی پر تکیہ کیا اور حسن عزت کو خدا حافظ کہہ دیا۔

اس پریشانی میں اسے اپنا دوست یوسف راشد یاد آیا جو شاہی ڈاکٹر تھا۔ انور سمجھتا تھا کہ وہ اسے دوبارہ فوج میں بھیجنے کا کوئی نہ کوئی بندوبست کر دے گا۔ اس نے یوسف راشد سے ملاقات کی اور شروع سے لے کر اب تک کی تمام داستان اس کے سامنے رکھ دی۔ وہ نہایت غور سے سنتا رہا اور پھر چپ چاپ بیٹھا رہا۔

”دیکھو میں کچھ نہ کچھ ضرور کروں گا۔“

”میں نے اپیل کی تھی لیکن وہ رد ہو گئی۔ آپ کو اس سے بڑھ کر کوئی کوشش میرے لیے کرنی ہو گی۔“

”چند دن مجھے کوشش کرنے دو۔ میں خود تم سے رابطہ کروں گا۔“

چند روز بعد یوسف راشد نے اسے اپنے پاس بلایا۔

”کمانڈر انچیف فرخ محمد حیدر پاشا سے جا کر ملو۔“

وہ کمانڈر انچیف کے پاس پہنچ گیا۔ وہ ان کے لیے اجنبی تھا لیکن اس کا ریکارڈ اجنبی نہیں تھا۔ اسے دیکھتے ہی انہوں نے سوالات کی بوچھار کر دی۔ یہ سب سوالات اس کے خراب ریکارڈ کے بارے میں تھے۔ وہ خاموشی سے سنتا رہا اور سوچتا رہا کہ انہوں نے مجھے ملازمت میں لینے کے لیے بلایا تھا یا ڈانٹنے کے لیے۔ اس نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا لیکن کمانڈر انچیف نے اسے کچھ کہنے ہی نہیں دیا۔ انہوں نے گھنٹی بجائی اور پرائیویٹ سیکریٹری کو بلایا۔

”اس لڑکے کو ابھی آج سے بحال کر دو۔“

”جی بہتر۔“

اس حکم پر فوری عمل درآمد ہوا اور اسے کیپٹن کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ یہ وہی عہدہ تھا جس پر اس کی معزولی ہوئی تھی۔

یہ ایسی خوش خبری تھی کہ وہ سیدھا اپنی اہلیہ کے پاس پہنچا۔ کچھ بتائے بغیر اسے اپنے بازوؤں میں بھر لیا اور بڑی دیر تک اسے اٹھائے اٹھائے کمرے میں گھومتا رہا۔

”کیا جنون ہے کیسی دیوانگی ہے کچھ بتائیے تو سہی ہوا کیا ہے۔“

”میں پھر سے بحال ہو گیا ہوں۔ اب میں کیپٹن انور ہوں۔“

”سچ...... یہ تو بڑی خوشی کی بات ہے۔ یہ سب میری دعاؤں سے ہوا ہے۔“

”اس میں کیا شک ہے۔“

”اب کسی ایسے ویسے جھگڑے میں ٹانگ مت اڑا لیجیے۔“

”تم تو ایسا مت کہو۔ تم اسے جھگڑا کہتی ہو۔ یہ تو آزادیٔ وطن کا سوال ہے۔ ہمیں پہلے موجود حکمرانوں سے جان چھڑوانی ہے اس کے بعد انگریزوں کو یہاں سے نکالنا ہے۔ میں نے جو تنظیم بنائی تھی میں اس سے آٹھ سال سے دور رہا ہوں۔ میری غیر موجودگی میں جمال عبدالناصر نے اسے فعال رکھا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میں اس سے دور ہو جاؤں۔“

”میرے کہنے کا مطلب تو یہ تھا کہ اس مرتبہ ذرا احتیاط سے کام لیجیے گا۔“

”ہاں یہ ہو سکتا ہے۔“

یہ خبر جیسے ہی فوج کے حلقوں تک پہنچی کہ انور بحال ہو گیا ہے۔ سب سے پہلے ناصر نے اسے مبارک باد دی۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ آزاد افسروں کی تنظیم بہت پھیل چکی ہے اور مزید طاقت پکڑ رہی ہے۔ اس نے اسے یہ بھی مشورہ دیا کہ وہ ترقی کے امتحان میں بیٹھ جائے۔

وہ امتحان میں بیٹھا اور بہت کم عرصے میں اسے لیفٹیننٹ کرنل کے عہدے پر ترقی دے دی گئی۔

☆☆☆

اخوان المسلمین کے اراکین شہر سویز کے علاقے میں انگریزوں کے خلاف ایسی ہراساں کرنے والی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھے۔ تنظیم کی طرف سے انور کو یہ کردار سونپا گیا کہ وہ فدائین کو تربیت مہیا کرے گا اور انہیں اسلحہ فراہم کرتا رہے گا۔

ناصر محسوس کر رہا تھا کہ اب باقاعدہ کمان سنبھالنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے لیے وقت سازگار ہے۔ اس وقت ملک میں بہت سی خفیہ تنظیمیں کام کر رہی تھیں اس لیے ضروری ہو گیا تھا کہ آزاد افسروں کی آئین ساز جماعت بنائی جائے۔

آزاد افسروں کی تنظیم انور السادات نے بنائی تھی لیکن وہ آٹھ سال اس سے دور رہا تھا۔ اب ناصر ہی اسے چلا رہا تھا پھر بھی اس نے یہ کہا کہ اسے آئین ساز جماعت میں شامل کر لیا۔

جنوری 1952ء میں آئین ساز کونسل قائم ہوئی اور نومبر میں انقلاب کا منصوبہ بنایا گیا لیکن اچانک قاہرہ میں فسادات کی آگ بھڑک اٹھی۔ یہ فسادات کس نے کرائے کچھ پتا نہ چل سکا۔ شاید عوام خود ہی اٹھ کھڑے ہوئے تھے یا جو تنظیمیں کام کر رہی تھیں ان میں سے کسی کی کارستانی تھی لیکن اتنا ضرور ہوا کہ قاہرہ کی یہ آگ انقلاب کا پیش خیمہ بن گئی۔

شاہ فاروق یہ سمجھنے لگے کہ اب وہ اقتدار کو زیادہ طول نہیں دے سکیں گے۔ خفیہ ذرائع سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شاہ فاروق ایک فہرست تیار کر رہے ہیں۔ ان میں ان لوگوں کے نام ہیں جو ان کے ساتھ جیل جائیں گے۔ یہ خوشی کی بات تھی۔ اس طرح آزاد افسروں کی تنظیم کو شاہ کی طرف سے زیادہ مزاحمت برداشت نہ کرنی پڑتی۔

آئین ساز کونسل کا اجلاس بلایا گیا۔ ناصر اور انور نے یہ طے کیا کہ انقلاب 1952ء کے نومبر میں برپا کیا جائے۔

کچھ لوگوں نے مخالفت کی لیکن اس دلیل کے سب قائل ہو گئے کہ اس مہینے شاہ اور حکومت اسکندریہ سے واپس آئیں گے اور انہیں بہ آسانی زیر کیا جا سکے گا۔

انقلاب نومبر میں ہی برپا ہونے والا تھا لیکن حالات نے کروٹ بدل لی۔ یہ خبر آئی کہ شاہ وزیر جنگ تبدیل کر رہا ہے۔ نیا وزیر میجر جنرل حسین عامر ہوگا۔ یہ شخص آزاد افسروں کی تنظیم کے بارے میں سب کچھ جانتا تھا اور شاہ کا اتنا وفادار تھا کہ عہدے پر آنے کے بعد آزاد افسروں کو ختم کر دیتا۔ ناصر نے طے کیا کہ اس کے حلف اٹھانے سے پہلے ہی انقلاب برپا کر دیا جائے۔

انور اپنی ڈیوٹی پر تھا کہ اسے ایک ساتھی کے ذریعے ناصر کا پیغام ملا۔

"انقلاب 22 جولائی سے 5 اگست کے دوران میں کسی وقت بھی برپا ہوگا۔ فوراً قاہرہ پہنچو۔"

وہ اس وقت العریش کے ائیرپورٹ پر تھا۔ اس نے تیاری کی اور 22 جولائی کو قاہرہ پہنچا۔ وہ گھر پہنچا جہاں جیہان اس کی منتظر تھی۔ ناصر کا پیغام پھر ملا۔

"گیارہ بجے عبدالحکیم عامر کے گھر ملو۔"

اس نے جلدی جلدی لباس تبدیل کیا۔ پستول لیا اور عامر کے گھر پہنچ گیا۔ ناصر وہاں نہیں تھا۔ یہ معلوم ہوا کہ وہ العباسیہ فوجی بیرکوں میں ہوگا۔ وہ بھاگم بھاگ بیرک پہنچا۔ اسے جلدی تھی۔ وہ انقلاب برپا ہوتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس نے برسوں جس دن کا انتظار کیا تھا وہ آ گیا تھا اور وہ خود محض تماشائی بن کر رہ گیا تھا۔

وہ فوجی بیرک پہنچ چکا تھا لیکن اسے اندر نہیں جانے دیا جا رہا تھا۔ وہ بار بار کوشش کر رہا تھا لیکن ناکام رہا۔ اسے معلوم ہوا کہ آرمی کمانڈ ہیڈ کوارٹر پر قبضہ ہو چکا ہے۔ چیف آف اسٹاف کو گرفتار کر لیا گیا ہے۔ انور نے اپنی کار آرمی ہیڈ کوارٹر کی طرف دوڑا دی اور بالآخر ناصر سے ملاقات ہو گئی۔

"ہر یونٹ کمانڈر سے ٹیلی فون پر رابطہ کرو اور انہیں بتا دو کہ ہمارا منصوبہ بہ خوبی انجام پا رہا ہے۔" ناصر نے انور سے کہا۔ انور نے ساری فوجی یونٹوں سے سینائی، مغربی صحرا، اسکندریہ، العریش اور دوسری جگہوں پر رابطہ کیا۔ ناصر نے خود کو ڈیوٹی افسر ظاہر کر کے وزیر جنگ سے بات کی اور اسے یقین دلایا کہ سب خیریت ہے۔ فوج میں کوئی غیر معمولی حرکت نہیں۔

23 جولائی کا سورج طلوع ہوا اور انور مصریوں کو آزادی اور انقلاب کی خبر سنانے براڈکاسٹنگ ہاؤس پہنچ گیا۔ وہ جب خبر نشر کر کے ریڈیو اسٹیشن سے باہر نکلا تو سڑکوں پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ سب ایک دوسرے کو چوم رہے تھے۔ مبارک بادیں دے رہے تھے۔ وہ برسوں سے ایک خواب دیکھتے چلے آ رہے تھے اب اس کی تعبیر ان کے سامنے تھی۔

سیاسی جماعتوں پر سے عوام کا اعتماد اٹھ گیا تھا۔ شاہ فاروق اور انگریزوں سے ان کی دشمنی عروج پر تھی۔ اسی لیے فوجی ٹینکوں کو ہر جگہ خوش آمدید کہا جا رہا تھا۔

انور اور ناصر کی پہلی ترجیح یہ تھی کہ حکومت تشکیل دی جائے تاکہ عوامی معاملات تسلی بخش طور پر طے ہو سکیں۔ مختصر بحث کے بعد یہ طے کر لیا گیا کہ علی ماہر کو حکومت بنانے کے لیے کہا جائے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

انور اور علی مہر، علی مہر کے گھر کی اوپری منزل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ انور نے اسے بتایا کہ آئین ساز کونسل نے اسے نئی حکومت تشکیل دینے کے لیے کہا ہے۔

"یہ تجویز آپ دے رہے ہیں۔" علی مہر نے حیرانی سے کہا۔ "ایسی پیشکش تو صرف شاہ کر سکتا ہے۔" اسے شاید انقلاب پر یقین نہیں تھا۔

"انقلاب آچکا ہے۔ تمام اہم مقامات پر فوج کا قبضہ ہو چکا ہے۔"

اس دوران میں چار بمبار طیارے نہایت نیچی پرواز کرتے ہوئے گزرے۔ علی مہر نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

"کیا ان کا تعلق بھی تم سے ہے؟"

"ہاں، آزاد افسروں کی تنظیم نے پوری فوج کا کنٹرول سنبھال لیا ہے۔ تمام محکمے ہمارے قبضے میں ہیں۔ آپ کی غیر جانب داری کو دیکھتے ہوئے ہم آپ کو وزیر اعظم مقرر کرتے ہیں۔"

"آپ نے شاہ کے ساتھ کس انجام کا منصوبہ بنایا ہے؟"

"یہ شاہ پر منحصر ہے۔ وہ یا تو انقلاب کو تسلیم کر لے یا سزا بھگتے۔"

اسی وقت ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ علی مہر دوسرے کمرے میں فون سننے چلا گیا۔ وہ واپس آیا تو اس نے بتایا۔

"شاہ کا فون تھا۔ میں نے ان تک آپ کی پیشکش پہنچا دی کہ آپ لوگ مجھے وزیر اعظم مقرر کرنا چاہتے ہیں۔"

"ان کا فرمان کیا تھا؟"

"انہوں نے منظوری دے دی ہے۔ وہ آج شام اسکندریہ میں میرے منتظر ہوں گے۔"

"مبارک ہو۔"

"آپ ان سے ملاقات کرلیں ہم پھر آپ سے ملاقات کریں گے۔"

آئین ساز کونسل نے فوجی حکومت قائم کرنے کی بجائے علی مہر پر اعتماد کیا تھا۔ ان کا مقصد صحت مند عوامی سیاست کو بحال کرنا تھا تاکہ شاہ سے نجات ملے۔

انقلاب کا پہلا مرحلہ مکمل ہو گیا تھا۔ دوسرے مرحلے میں شاہ کو ملک چھوڑنے پر آمادہ کرنا تھا۔ یہ تصور کیا جا رہا تھا کہ شاہ کی طرف سے مزاحمت ضرور کی جائے گی۔

شاہ اس وقت اسکندریہ میں تھا لہٰذا ضروری سمجھا گیا کہ فوجوں کو اسکندریہ پہنچا دیا جائے اور اس کے بعد جنرل نجیب اور انور السادات اسکندریہ پہنچیں۔

"سنو انور! اس شخص سے جتنی جلدی ہو سکے نجات حاصل کرو۔ اسے جانے پر مجبور کرو۔ ملکی استحکام کے لیے اسے نکال باہر کرنا ضروری ہے۔" ناصر کا اشارہ شاہ فاروق کی طرف تھا۔

جنرل نجیب اور انور السادات ایک چھوٹے فوجی جہاز سے روانہ ہوئے اور اسکندریہ پہنچ گئے۔ وقت ایسا چنا تھا کہ علی مہر وہاں موجود تھے۔

فوج کا کچھ حصہ شاہی محل کے گرد مامور کر دیا گیا۔ محل کے محافظوں نے ہتھیار اٹھا لیے۔ فوجی دستوں سے ان کی جنگ ہو گئی لیکن ظاہر ہے وہ فوج سے نہیں لڑ سکتے تھے۔ شاہ بد حواس ہو گیا اور اس نے محافظوں کو ہتھیار ڈال دینے کے لیے کہا۔

انور السادات نے اپنا بریف کیس کھولا اور سرکاری الٹی میٹم نکال کر علی مہر کے ہاتھ میں دے دیا۔

"شاہ 26 جولائی کی شام چھ بجے مصر سے نکل جائے اور اگر کام ہوا تو حالات کا ذمہ دار وہ ہوگا۔"

علی مہر نے وہ الٹی میٹم شاہ تک پہنچا دیا۔ آدھے گھنٹے بعد وہ واپس آ گیا۔

"شاہ نے الٹی میٹم قبول کر لیا ہے۔"

انور السادات جنگی جہاز "ابراہیم" پر کھڑا تھا۔ طیارے فضا میں گھوم رہے تھے۔ شاہ کو لے جانے والا جہاز تیار کھڑا تھا۔ نجاشی نے شاہ کو الوداعی سیلیوٹ کیا اور جہاز مصری حدود سے نکلنے کے لیے روانہ ہو گیا۔

مصر کا وقار صدیوں بعد بحال ہو رہا تھا۔ اس کا ہیرو انور السادات تھا۔ انقلابی کمان کونسل کا واحد رکن تھا جو انقلاب کی خبر نشر کرنے سے لے کر شاہ فاروق کی روانگی تک متحرک تھا۔

عوام میں بار بار ایک ہی نام آ رہا تھا...... انور السادات۔

انقلاب لانے والوں میں سے کسی نے بھی اپنے لیے عہدوں کا تعین نہیں کیا تھا۔ اس وقت سب سے بڑا اور اہم مقصد انقلاب کا سیاسی تھا اور سیاسی جماعتوں سے توقع تھی کہ وہ حکومت تشکیل دیں گی۔ فوجی افسر صرف حالات پر نظر رکھیں گے لیکن بعد میں حالات کا رخ دیکھ کر فیصلہ کیا گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہم میں سے ہر شخص کو ایک دو وزارتوں کی ذمے داری بھی قبول کر لینی چاہیے، کہ سرکاری کاموں میں براہ راست شریک ہو سکیں۔ رسہ کشی کھل کر سامنے آ گئی، ہر شخص پسندیدہ وزارت کے لیے طلب گار ہو گیا۔ اس چھینا جھپٹی میں انور نے وزارت لینے سے انکار کر دیا۔

''میں وزیر بننا نہیں چاہتا۔ میں بیرونی سیاست کے بارے میں بہت کم جانتا ہوں۔''

عوام انورالسادات کو ہیرو سمجھتے تھے۔ پریس اس کی جدوجہد کے بارے میں بہت کچھ لکھ رہا تھا لیکن اس نے کوئی عہدہ لینے سے انکار کر دیا تھا۔ کچھ اندرونی سازشیں ابھی تک کرامات دور کر جا رہا تھا۔

انقلاب کسی اور ہی ڈگر پر چل پڑا تھا۔ وزیراعظم علی ماہر کو برطرف کر دیا گیا اور جنرل نجیب کو وزیراعظم مقرر کر دیا گیا۔ دیگر تمام وزرا سویلین تھے۔ اقتدار ایک لحاظ سے فوج کے ہاتھ میں آ گیا۔ اب سیاسی جماعتوں نے افواج کے ساتھ تعلقات بڑھانے شروع کر دیے۔

جب کونسل کو اس کی خبر ہوئی تو تمام سیاست دانوں کو حراست میں لے لیا۔ انقلابی کونسل نے قانونی اور انتظامی امور سنبھال لیے۔

ان پابندیوں کا اطلاق تین سال کے لیے تھا۔ فوج کا وعدہ تھا کہ ہم ملک کو آئین دیں گے اور یہ وعدہ پورا بھی کیا گیا۔

جنرل نجیب کو یہ سوچ کر وزیراعظم بنایا گیا تھا کہ بہتر ہے معاملات کو سنبھال لے گا لیکن نئے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوئے اور ہر جھگڑے میں نجیب ملوث تھا۔

ان جھگڑوں سے بچنے کے لیے انورالسادات نے انقلابی کونسل سے مستعفی رہنے کا ارادہ کیا اور اجازت چاہی کہ اسے لبنان میں پناہ لینے کی اجازت دی جائے لیکن ناصر نے اسے ایسا نہیں کرنے دیا۔

ناصر نے کچھ اہم قدم اٹھائے تاکہ حالات میں سدھار آئے۔ عبدالحکیم عامر کو فوج کا کمانڈر انچیف مقرر کر دیا۔ مصر کو جمہوریہ قرار دیا۔ شاہ کی ذاتی جائداد ضبط کر لی اور نجیب کو صدر مقرر کر دیا اور خود ڈپٹی وزیراعظم کا عہدہ سنبھال لیا۔

طویل زیر نشیب و فراز سے گزرنے کے بعد انگریزوں کے انخلا کا معاہدہ طے پا گیا جس کے نتیجے میں 75 سالہ برطانوی قبضہ مصر سے ختم ہو جاتا تھا۔

اس معاہدے کی رو سے آخری برطانوی فوجی نے مصری سرزمین سے 19 جون 1956 کو قدم باہر نکالا۔ برطانوی اڈے پر مصری پرچم لہرانے لگا۔

جنرل نجیب کو برخاست کر دیا گیا۔ انقلابی کونسل 22 جون 1956ء میں ناصر نے اس سے کہا کہ اتحاد کی صورت میں شام اور مصر کی جوائنٹ فیڈرل نیشنل اسمبلی بن رہی ہے اس کے لیے اسپیکر کا انتخاب لڑے تو وہ اس کے لیے تیار ہو گیا اور اسپیکر منتخب ہو گیا۔

☆☆☆

ستمبر 1970ء میں ناصر نے عرب سربراہ کانفرنس بلائی۔ یہ کانفرنس اردن کے شاہ حسین اور فلسطینی دستوں میں خون خرابے کے بعد بلائی گئی تھی۔

یہ کانفرنس ناصر کے اعصاب پر بری طرح بوجھ تھی۔ یہاں موجود بعض لوگوں کے رویے سے وہ بہت بددل ہوا۔ اس کے باوجود وہ ہر سربراہ کو رخصت کرنے کے لیے موجود تھا۔ سب سے آخر میں شاہ فیصل اور امیر کویت کو رخصت ہونا تھا۔ ناصر انہیں بھی رخصت کرنے کے لیے موجود تھا لیکن وہ اتنا تھکا ہوا نظر آ رہا تھا کہ سیدھا چل بھی نہیں پا رہا تھا۔

''تم بہت تھک گئے ہو۔ گھر جا کر آرام کرو۔ مہمان کو میں رخصت کر دوں گا۔'' انور نے اسے مشورہ دیا لیکن وہ نہ مانا۔ اس کا رنگ زرد ہو گیا تھا اور سانس بھی زور زور سے لے رہا تھا۔ مہمان طیارے میں سوار ہوئے اور ناصر میں چلنے کی سکت ختم ہو گئی۔

''میری کار یہیں منگوا دو۔ اب میں گھر جاؤں گا۔''

وہ طیارے کے سامنے ساکت کھڑا تھا۔ کار وہیں آ گئی اور وہ کار میں بیٹھ کر گھر چلا گیا۔ انور بھی اپنے گھر چلا گیا۔ ابھی وہ گھر پہنچا ہی تھا کہ ناصر کے سیکریٹری کا فون آ گیا۔

''صاحب نے آپ کو شام کے کھانے پر بلایا ہے۔''

انور نے کچھ دیر آرام کیا، تھوڑی سی تبدیلی۔ اسے یاد تھا کہ ناصر کے گھر جانا ہے۔ تیار ہوا اور ناصر کے ساتھ کھانے میں شریک ہونے کے لیے پہنچ گیا۔

اسے خبر تو مل ہی گئی تھی۔ وہ اس کے سونے کے کمرے میں گیا۔ ڈاکٹروں نے اسے گھیرا ہوا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ وہ ایک گھنٹا قبل انتقال کر چکا ہے۔

انور نے اس کے منہ سے چادر اٹھائی۔ وہ سو رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

موت کے آثار کہیں بھی نہیں تھے۔

"کیا آپ لوگ سچ کہہ رہے ہیں۔"

"خدا کی رضا اسی میں تھی۔"

"آپ کوشش تو کیجیے شاید وہ بیدار ہوجائے۔" یہ سنتے ہی وہاں موجود لوگ رو پڑے۔

انور نے اس کا جسم خاکی القبہ محل لے جانے کو کہا۔ کونسل کا اجلاس بلایا جس میں یہ طے کیا گیا کہ تدفین تین دن بعد کی جائے گی تاکہ سربراہان مملکت بھی شریک ہوسکیں۔

وہ خود بھی اسی محل میں رہا۔ ان دونوں کی دوستی اس وقت سے تھی جب دونوں کی عمریں انیس، بیس سال تھیں۔ بھلا انور سے زیادہ اس پر کس کا حق تھا۔

جب تدفین کا انتظام ہوچکا۔ سربراہان مملکت آچکے تو ناصر کی میت کو جنازہ گاڑی میں رکھا گیا۔ ابھی یہ گاڑی انقلابی کونسل کے دفتر سے چلی ہی تھی کہ انور بے ہوش ہوکر گر پڑا۔ اسے زیادہ عرصے سلائے رکھنے کے لیے پانچ انجکشن لگائے گئے۔ ناصر کی موت زبردست المیہ تھا اس روز پورا قاہرہ سڑکوں پر تھا۔

☆☆☆

ناصر نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ صدارتی انتخابات اس وقت ہوں گے جب اسرائیلی جارحیت کے اثرات ختم ہوجائیں گے۔ اس پر انور نے کہا تھا میں اس وقت تک نائب صدر کی حیثیت سے کام کرتا رہوں گا جب تک انتخابات ہو نہیں جاتے۔

ناصر کی تدفین مکمل ہوتے ہی انور پر زور دیا جانے لگا کہ وہ صدارت قبول کرلے۔ وہ اپنے صدر ہونے کا اعلان کرسکتا تھا۔ فوج بھی اس کے حق میں تھی۔ عوام بھی اس کی پذیرائی کررہی تھی۔ اقتدار کے حصول کے لیے سازشیں بھی شروع ہوگئی تھیں لہٰذا اسے انتخابات کے لیے راضی ہونا پڑا۔

کمیٹی نے فیصلہ کیا اور اسے صدارتی اُمیدوار نامزد کردیا۔ سینٹرل کمیٹی نے بھی منظوری دے دی۔ انتخابات ہوئے۔ 15 اکتوبر 1970ء کو اسے صدر منتخب کردیا گیا۔ صدر منتخب ہوتے ہی اس نے ڈاکٹر محمود فوازی کو وزیراعظم مقرر کردیا۔ اس کا کہنا تھا۔

"شخصی حکمرانی خطرات سے بھری ہوتی ہے کیونکہ ایک شخص ہر شے کا علم نہیں رکھتا۔ اس کے معاونین طاقت اپنے ہاتھوں میں منتقل کرلیتے ہیں جیسا کہ ناصر کے ساتھ ہوا۔"

انورالسادات کے سامنے کئی چیلنج تھے جو سر اٹھائے کھڑے تھے اور اسے ان سب سے نمٹنا تھا۔ اسرائیل سے فوجی شکست کے اثرات اب بھی موجود تھے۔ معاشی صورت حال تباہ ہوچکی تھی۔ سیاسی جمود طاری تھا۔ بیرونی تعلقات کسی سے نہیں رہے تھے۔ صرف روس سے دوستی تھی اور وہ بھی اس طرح کہ دوستی کا احساس تک نہ ہوتا تھا۔ اس ماحول میں اس نے اعلان کیا تھا۔

"میرا ایمان ہے محبت کی طاقت سب سے بڑی طاقت ہے۔" اس نے یہ بھی اعلان کیا تھا کہ خارجہ پالیسی کے بارے میں امن کی بنیاد پر اصول وضع کیے جائیں گے۔

ناصر نے جو معاشی حالات چھوڑے تھے وہ سیاسی صورت حال سے بھی بدتر تھے۔ اس نے اقتدار سنبھالتے ہی خزانہ اور منصوبہ بندی کے وزیر کو بلایا اور معاشی صورت حال کے بارے میں پوچھا۔ اس نے بتایا کہ خزانہ بالکل خالی ہے اور ہم تقریباً دیوالیہ ہوچکے ہیں۔

ناصر کی وفات پر تعزیت کے لیے آنے والے امریکی نمائندے نے اپنی رپورٹ میں لکھا تھا کہ سادات چھ ہفتے سے زیادہ مسند حکومت پر نہ ٹھہر سکے گا لیکن سادات نے سب کو غلط ثابت کردیا اور مصریوں کے لیے ایک نئی شاہراہ تلاش کرنے میں گم ہوگیا۔

67ء میں مصر اور اسرائیل کی جنگ ہوئی تھی۔ انورالسادات نے معاہدہ امن پیش کیا۔ اسرائیل سینائی سے اپنی فوجیں واپس بلائے تو میں نہر سوئز کھول دوں گا۔ اسرائیل سے معاہدہ امن کیا جائے۔

اس کے مخالفین تو ساکت ہوگئے تھے بیرونی رہنما نے اسے سراہا جبکہ سادات کا کہنا تھا کہ ہمیں جوش کو چھوڑ کر حقیقی جذبے سے کام لینا ہوگا۔

اس نے روس کی بجائے اپنا وزن امریکا کے پلڑے میں ڈالنا شروع کردیا۔ سادات نے فیصلہ کرلیا کہ وہ روسیوں کا قلع قمع کرے گا۔

اس نے حکومت میں کچھ ایسی تبدیلیاں کیں کہ اقتدار کی کشمکش کا ہر ایک باب ہمیشہ کے لیے بند ہوگیا۔ اس نے ایک ایک کرکے تمام روسی فوجی ماہرین کو ملک سے نکالنے کا فیصلہ کرلیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ روس کو بتا دینا چاہتا تھا کہ ہم اپنے فیصلے خود کرتے ہیں۔ وہ روس سے کنارہ کشی کرتے ہوئے امریکا سے تعلقات بڑھا رہا تھا کیونکہ امریکا کے بغیر امن کا معاہدہ تکمیل تک نہیں پہنچ سکتا تھا۔

عربوں اور اسرائیلیوں کے درمیان طویل خوف، نفرت اور دوری تھی۔ نئی نسل اسرائیل کے ساتھ نفرت کا جذبہ لے کر پروان چڑھی تھی۔ نہ عربوں کے دلوں میں گنجائش تھی نہ یہودیوں کے دلوں میں۔ جب تک یہ رویے تبدیل نہیں ہوتے امن قائم نہیں ہوسکتا تھا۔ وہ امریکا کے ساتھ مل کر امن قائم کرنا چاہتا تھا لیکن دونوں فریقوں کی مرضی کے بغیر یہ ممکن نہیں ہوسکتا تھا اس لیے ضروری تھا کہ دونوں قوموں کی نفسیاتی الجھنوں کو دور کیا جائے۔ اس کے خیال میں اب تیاریوں کو نئی سمت کی ضرورت تھی۔ اس کی تجویز یہ تھی کہ پانچ بڑے رہنماؤں کارٹر، برزنیف، کیلاہن، ہوا کوفینگ اور ہیکار جسیکار ڈیستان کو مدعو کیا جائے اور یہ سب عرب رہنماؤں سے ملاقات کریں جن میں خصوصاً شام، اردن، لبنان، فلسطین، مصر شامل ہیں۔

اس نے اسمبلی میں اپنا منصوبہ پیش کیا اور کہا میں امن کی خاطر دنیا میں کہیں بھی جانے کو تیار ہوں کیونکہ میں نہیں چاہتا کہ ایک شخص بھی خوامخواہ اپنی جان سے جاتا رہے۔

اس کی اس تقریر کو کسی نے بھی سنجیدگی سے نہیں لیا۔ سب اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔

"تم نے جو کہا ہے وہ کرو گے بھی۔"

"میں وہ بات کہتا ہی نہیں جو نہ کرسکوں۔"

"مگر یہ کیسے ممکن ہوگا۔"

"اگر یروشلم نہ گیا تو استعفیٰ دے دوں گا۔"

اس نے کر دکھایا۔ وہ یروشلم گیا اور موشے دایان سے ملا جس کے خلاف وہ لڑ چکا تھا۔ وہ اسرائیل کے چیف آف اسٹاف سے بھی ملا۔

وہ مسجد اقصیٰ گیا تو کئی بار اس کے ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ بائیس برس بعد وہ اس علاقے میں آیا تھا۔ وہ اس وقت آیا تھا جب وہ وزیر مملکت تھا۔ اس وقت یہ حصہ عرب علاقہ تھا۔

وہ واپس آیا تو قاہرہ میں اس کا نہایت شاندار استقبال کیا گیا۔ ہر شخص تحفظ کا خواہش مند تھا۔ اس کی خوشی اسی میں تھی کہ لوگ اس سے خوش ہوں اور یہ خوشی اسے مل رہی تھی۔

وہ دو نکات پر اتفاق کر کے اسرائیل سے واپس آیا تھا۔ پہلا نکتہ یہ تھا کہ جو جنگ ہو چکی وہ آخری جنگ تھی اور دوسرا یہ کہ تمام معاملات بات چیت سے ہی طے ہوسکتے تھے۔

اس نے جب اس دورے کے نتائج اسمبلی میں پیش کیے تو دو تین ارکان کے سوا سب اس سے متفق تھے۔

☆☆☆

اس کا بڑا مقصد مشرق وسطیٰ میں فلسطینی مسئلے کا حل بھی تھا اور عرب علاقوں کی بازیابی بھی لیکن جنگ سے نہیں مذاکرات کے ذریعے۔ اس نے کانفرنسیں بلوائیں، ملاقاتیں کیں، ممالک کے دورے کیے۔ مہذب دنیا میں اسے امن کا علم بردار سمجھا جانے لگا تھا۔ اس نے بار بار کہا۔

"مہذب قوموں کی طرح مشرق وسطیٰ میں امن کے ذریعے مسائل کا حل تلاش کروں گا۔"

اس کی ان کوششوں کے جواب میں اسے 1978ء میں نوبل امن انعام سے بھی نوازا گیا۔

اس کی ان کوششوں کی مخالفت بھی کی جا رہی تھی۔ اس کے امن پیغام کو کمزوری سمجھا جا رہا تھا۔ خود مصر میں ایسی طاقتیں موجود تھیں جو اسرائیل سے جنگ چاہتی تھیں مذاکرات نہیں۔ ان کے نزدیک انورالسادات مصریوں کے وقار کے برعکس کام کر رہے تھے۔

ان مخالفین کے ساتھ اقتدار پرست حاسدین بھی شامل ہو گئے جو انورالسادات کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے خائف تھے۔

سازشیں تیار ہو چکی تھیں۔

12 اکتوبر 1981ء کو آرمڈ فورسز ڈے منایا جا رہا تھا۔ صدر انورالسادات کو فوجی پریڈ کی سلامی لینی تھی۔ وہ اسٹیج پر آیا۔ دستے ایک ایک کر کے گزر رہے تھے۔ اچانک ایک فوجی نے اپنی بندوق کا رخ اس کی طرف کیا اور گولی چلا دی۔ انورالسادات کو فوری طور پر ملٹری اسپتال لے جایا گیا لیکن قاتل کامیاب ہو چکا تھا۔

ماخذ: انورالسادات (خودنوشت)
مترجم: سید فضل حسین ہمدانی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

باکمال بہنیں

شکیل صدیقی

وہ تین بہنیں کمالِ فن کی بدولت شہرت کی بلندیوں پر براجمان ہوئیں۔ انتہائی تنگی و ترشی میں زندگی گزاری مگر ادب کی دنیا میں ملکۂ قلم کہلائیں۔ ان بہنوں نے یہ فن کس طرح حاصل کیا یہ ہر ایک کے لیے مشعلِ راہ ہے۔

زمانے کے ادب کی تین باکمال بہنوں کا تعارف

اس مضمون کی سرخی دیکھ کر آپ یقیناً چونک گئے ہوں گے اور آپ کا شہپر تخیل پرواز کرتا ہوا آپ کو ماضی میں لے جائے گا، جب چینلوں کی بھرمار نہیں تھی اور آپ اپنے اہلِ خانہ کے ساتھ اجتماعی طور پر سکون و اطمینان سے ٹیلی ویژن دیکھا کرتے تھے۔ اسی زمانے کے چند رومان انگیز پروگرام آپ کی نگاہ کے سامنے متحرک ہو جائیں گے اور ممکن ہے آپ کی سماعت میں حلاوت انگیز نغمے بھی گونجنے لگیں۔ ان نغموں کو 3 باکمال بہنوں نے مل کر باجماعت گایا تھا۔ تھوڑی دیر بعد

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

توپ کہلاتی تھیں کے "برونٹے سسٹرز۔"

ان کے باکمال ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ان کی باجماعت گائیکی کے معیار کے بارے میں تو کوئی کہنہ مشق گائیک ہی فیصلہ کر سکے گا کہ وہ کس پائے کی مغنیہ تھیں لیکن سننے والوں کو ان کی آواز سریلی اور کانوں میں شہد گھولتی معلوم ہوتی تھی۔

لیکن اس وقت میں جن 3 باکمال بہنوں کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں ان کا تعلق گائیکی کی بجائے دنیائے علم و ادب سے ہے۔ وہ تینوں ناول نویس تھیں۔ پڑھنے لکھنے کا شوق انہیں بچپن سے تھا۔ پڑھنے کے لیے انہوں نے خود کو موضوعات کا پابند نہیں کیا تھا۔ اس غیر موضوعاتی مطالعے سے ان کے دماغوں کو بالیدگی ملی اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں بیدار ہونا شروع ہو گئیں۔

آج کل کے زمانے کی طرح نہ تو اس زمانے میں انٹرنیٹ تھا اور نہ ٹیلی وژن۔ لوگوں کے پاس فرصت ہی فرصت تھی۔ چنانچہ مطالعہ کرنا ان کی سرشت میں شامل تھا۔ اردو زبان میں قصہ کہانیاں، اخبارات اور رسائل سب ہی کچھ تھے جنہیں پڑھنے کے بعد لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کریں؟

ان باکمال بہنوں نے ناول لکھے جو اتنے ضخیم نہیں تھے کہ لوگ کئی ہفتوں تک انہیں ہی پڑھتے رہتے۔ وہ دلچسپ اور معاشرتی ناول تھے جو اب کلاسیک میں شامل ہیں۔ ان تینوں بہنوں کے نام تھے شارلٹ برونٹے (پیدائش 21 اپریل 1816) ایملی برونٹے (پیدائش 30 جولائی 1818) این برونٹے (پیدائش 17 جنوری 1820)۔ ان کی دو بہنیں اور ایک بھائی اور بھی تھا۔ دونوں بہنیں ان سے بھی بڑی تھیں لیکن جلد انتقال کر گئیں۔ برونٹے ان کا خاندانی نام تھا۔

وہ برطانیہ کی کاؤنٹی یارک شائر میں واقع بریڈ فورڈ شہر کے نزدیک ایک قصبے ہاورتھ میں اب سے ڈیڑھ سو برس پہلے رہتی تھیں۔ ان تینوں بہنوں پر حالات نے بڑے ستم ڈھائے لیکن انہوں نے ہمت نہ ہاری اور اپنے حالات کو تبدیل کر کے دم لیا۔

ان کے باپ کا نام پیٹرک برونٹے تھا اور وہ آئرلینڈ کے رہنے والے تھے۔ انہوں نے کیمبرج میں تعلیم حاصل کی تھی۔ انہوں نے 1812ء میں ماریہ برانِ ویل سے شادی کی۔ ان کے چھ بچے ہوئے۔ پانچ بیٹیاں اور ایک بیٹا۔ پہلی دو بیٹیاں ماریہ اور الزبتھ جلد ہی انتقال کر گئیں۔ بیٹا برانِ ویل تھا جو 1817ء میں پیدا ہوا تھا۔

پیٹرک برونٹے 1820ء میں ہاورتھ کے پادری مقرر ہوئے اور پھر ساری زندگی یہیں رہے۔ ان کی بیوی کا سرطان کے عارضے سے 1821ء میں انتقال ہوا۔

پیٹرک برونٹے چونکہ پادری تھے لہٰذا انہوں نے لوگوں کا اخلاق سدھارنے کے لیے اخلاقی کتابیں لکھیں۔ وہ شاعر بھی تھے، تعلیم یافتہ تھے، اس لیے وہ چاہتے تھے کہ ان کی لڑکیاں بھی خوب پڑھیں اور اپنے خاندان کا نام روشن کریں۔

ان کا مکان دو منزلہ تھا اور قدیم زمانے میں تعمیر کیا گیا تھا۔ چرچ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ ان کے مکان کی دونوں منزلوں پر چار چار کمرے تھے۔ ابتدائی حصے میں مسٹر پیٹرک کی مطالعہ گاہ تھی اور دائیں بائیں دو کمرے رہائش گاہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ اس کے بعد باورچی خانہ تھا۔ ان کی لڑکیاں مکان کو خوب صاف ستھرا رکھتی تھیں۔ فرش چمکتا رہتا اور کھڑکیوں کے شیشے دمکتے تھے۔ ہر چیز قرینے سے رکھی رہتی تھی۔

اس زمانے میں لڑکیوں کو زیادہ تعلیم نہیں دی جاتی تھی، صرف گھریلو کام کاج سکھایا جاتا تھا مثلاً سینا پرونا، کھانا پکانا یا موسیقی کے راگ الاپنا۔ اس رواج کے باوجود لڑکیوں کے باپ نے انہیں اچھی تعلیم دلائی۔

جب پیٹرک برونٹے ہاورتھ میں رہائش پذیر تھے تو وہاں کی آبادی صرف ایک ہزار نفوس پر مشتمل تھی جو پچاس برس میں بڑھ کر ساڑھے تین ہزار ہو گئی۔ اس قصبے میں گندے پانی کی نکاسی کا کوئی انتظام نہیں تھا اور ہر جگہ غلیظ پانی کے جوہڑ نظر آتے تھے۔ زمین چونکہ مرطوب تھی، لہٰذا قبرستان سطح زمین پر نہیں بلکہ ایک پہاڑی پر واقع تھا۔ زمین خشک نہیں بلکہ دلدلی تھی اس لیے چلتے ہوئے پاؤں دھنستے تھے۔ جھاڑیوں کی بہتات تھی، اس لیے وحشت سی ہوتی تھی۔

لوگوں کے پاس زیادہ روزگار نہیں تھا۔ اس لیے لوگ کھڈی پر کپڑا بنتے تھے یا پھر بھیڑوں کا اون تیار کرتے تھے۔ سترھویں صدی میں دریا کے قریب کپڑے کی ملیں لگیں تو لوگوں کو روزگار ملنے لگا۔

ہاورتھ میں غذا کی قلت تھی۔ لوگ دلیا کھا کر گزارہ کرتے تھے اور ان کے جسموں میں وٹامنز کی کمی رہتی تھی۔ وہاں رہنے والے بچوں کی بینائی کمزور تھی۔ زمین میں چوہوں نے بڑے بڑے بل کھود رکھے تھے۔ کاٹ بھی لیتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے۔جگہ جگہ غلیظ پانی جمع رہتا تھا اس لیے تعفن پھیلا رہتا تھا۔

پیٹرک کی بیوی کے مرنے کے بعد بچوں کی خالہ ان کے گھر آگئیں جو اگرچہ بہت بیمار اور دبلی تھیں۔انہیں اپنی بہن کے بچوں سے محبت تھی،لہٰذا انہوں نے ان کی تربیت میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔وہ سخت مزاج تھیں اس لیے بچے ان سے کھچے کھچے سے رہتے تھے۔باپ جب غصے میں ہوتے تھے تو کسی سے کچھ نہیں کہتے تھے۔خاموش رہتے تھے۔پھر اپنا پستول نکالتے تھے اور گھر کے پچھواڑے جاکر ہوائی فائرنگ شروع کر دیتے تھے چونکہ وہ پیدل سیر پر جانے کے شوقین تھے،لہٰذا ہمہ وقت اپنے ساتھ ایک پستول ضرور رکھتے تھے تاکہ راہ میں کوئی راہزن پریشان کرے تو وہ اسے ڈرا کر بھاگنے پر مجبور کر دیں۔

باپ پادری تھے اور خالہ ہر وقت پابندیاں لگاتی رہتی تھیں اس لیے گھر کا ماحول سنجیدہ اور خشک سا ہو گیا تھا۔پادری صاحب اور بچیوں کی خالہ کھانا اپنے کمرے میں ہی کھاتی تھیں۔مزاج کے اعتبار سے دونوں خبطی تھے۔

بہرحال بہنوں اور بھائیوں کو اپنا گھر پسند تھا اور وہ دل کر دوستوں کی طرح رہتے تھے۔ان میں یگانگت اور رفاقت تھی۔انہیں کسی نے لڑتے جھگڑتے نہیں دیکھا۔لڑکیاں آس پڑوس میں کسی سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ان کی سہیلیاں اسکول کی حد تک تھیں۔وہ خود کسی کے گھر نہیں جاتی تھیں۔بہنیں آپس ہی میں ہنس بول لیتی تھیں۔

باپ گھر میں ڈسپلن قائم رکھتے تھے۔اس لیے رات کو نو بجے گھر کے صدر دروازے میں تالا پڑ جاتا تھا۔پھر پادری صاحب بڑے گھڑیال میں چابی دینے کے لیے اوپر جاتے تھے تو لڑکیوں کے کمرے کے سامنے سے گزرتے ہوئے بلند آواز سے تلقین کرتے کہ بچوں رات کو زیادہ دیر تک جاگنا ٹھیک نہیں ہے۔جلد سو جانا چاہیے۔

خالہ کی آمد کے بعد بھی جب کام کاج میں دشواری پیدا ہونے لگی تو یہ فیصلہ کیا گیا کہ ایک نوکرانی رکھ لی جائے۔چنانچہ ٹبی کو بطور ملازمہ رکھ لیا گیا۔وہ ایک ہنس مکھ اور لطیفے سنانے والی عورت تھی۔اس لیے بچے جلد اس سے مانوس ہو گئے۔ٹبی کو بچوں کا دل موہ لینا آتا تھا۔وہ انہیں کہانیاں قصے سناتی یا پھر ہاورتھ کے پرانے واقعات۔یہ سب کہانی قصے باورچی خانے میں ہوتے۔سب سننے وہاں جمع رہتے۔

ان کے گھر کے گرد ہرے بھرے میدان تھے جبکہ دوسرے مکانات دور فاصلے پر تھے۔اس زمانے میں جانور پالنے کا شوق تھا۔لڑکیوں کو پرندوں سے عشق تھا۔

بچپن میں ان بہنوں کو دو شوق تھے۔ایک تو یہ کہ کوئی بھی کتاب مل جاتی تو وہ اسے پڑھ ڈالتیں اور پھر سب اس پر تبصرہ کرتیں۔یعنی اس میں کیا اچھا ہے اور کیا برا۔مختلف النوع مزاج کی کہانیاں پڑھنے سے انہیں تاریخ،جغرافیہ،سائنس، سیاست اور ادب سے شغف حاصل ہو گیا۔

ان کا دوسرا مشغلہ گھر کے نزدیک میدان میں گھومنا پھرنا اور کھیلنا تھا۔جب وہ بھاگ دوڑ سے تھک جاتیں تو خوشبودار جھاڑیوں میں بیٹھ جاتیں اور گفتگو کرتیں۔علمی اور ادبی گفتگو۔زندگی کے ہر پہلو پر گفتگو سے ان کے دماغ وسیع اور کشادہ ہو گئے۔ان کے موضوعات میں امیری غریبی،رنج و خوشی،موسم کے مختلف رنگ،اچھائی اور برائی شامل تھیں۔

ان مباحث سے ان کی تخلیقی صلاحیتیں اجاگر ہو گئیں۔وہ خود بھی کہانیاں لکھنے لگیں۔ان کہانیوں کو وہ ڈائری پر لکھتی تھیں۔نثر نگاری کے ساتھ شاعری بھی ہوتی تھی۔جب نظمیں اور شاعری ہو جاتیں تو ان ڈائریوں کو سوئی دھاگے سے سی کر ایک کتاب بنائی جاتی۔اس طرح سے ان کی تخلیقات کا ایک ریکارڈ سا بنتا چلا گیا۔اس زمانے میں انہوں نے ہومر اور ورجل جیسے بڑے شاعروں کی تخلیقات کا مطالعہ کیا جس کی بنا پر ان کے ذہن کو بالیدگی اور نمو حاصل ہوئی۔اس کے علاوہ بائبل ان کے مطالعے میں رہتی تھی۔

یہ ڈائریاں سائز میں ماچس کی ڈبیا کے برابر ہوتی تھیں جس میں وہ انتہائی باریک باریک لکھتی تھیں۔کبھی کیپٹل لیٹرز میں اور کبھی اسمال لیٹرز میں۔کاما اور فل اسٹاپ کا وہ کم ہی خیال نہیں رکھتی تھیں۔البتہ اس میں وہ نقشے اور اسکیچز بھی بناتی تھیں۔ان کی کتابوں میں ساری تفصیلات درج ہوتی تھیں۔

ابتدا میں تو ایسا ہوا کہ سب مل کر نثر لکھتے تھے اور شاعری کرتے تھے۔پھر سب نے اچانک فیصلہ کیا کہ انہیں علیحدہ علیحدہ لکھنا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہو سکے کہ کون کیسا تخلیق کار ہے۔چنانچہ انہوں نے اپنی اپنی کہانیاں الگ لکھنا شروع کر دیں۔

ان کے لکھنے میں پختگی اس وقت آئی جب ان کے گھر تین رسالے آنے لگے جن کے خریدار ان کے والد تھے۔اس کے علاوہ ایک اخبار بھی آنے لگا۔اسی اخبار سے انہیں پتا لگا کہ مرکزی افریقا بھی کوئی جگہ ہے۔برطانیہ نے انہی دنوں اس علاقے پر قبضہ کیا تھا۔وہ ان بہنوں کی کہانیوں میں شامل

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہو گیا۔

شارلٹ جب چودہ برس کی ہوئی تو اس نے لکھنے کے شوق... میں چودہ کتابیں لکھ ڈالیں۔

ایک بار سب بہنوں نے سوچا کہ کوئی رسالہ بھی نکالنا چاہیے۔ چنانچہ ان تینوں نے ایک ایسا قلمی اخبار تیار کرنا شروع کر دیا۔ اس میں ان کے مضامین اور ادھر ادھر کی خبریں ہوا کرتی تھیں۔ برطانیہ کی سیاست سے لے کر محلے کی سیاست اور افواہیں تک شامل ہوتیں۔

بادی النظر۔ بچوں کا کھیل تھا اور وقت ضائع کرنے کے مترادف مگر اس قلمی کھیل نے مستقبل کے ادب میں ان کے مقام کی بنیاد رکھ دی۔

وہ شاعرہ، نثر نگار اور مضمون نگار تو بن گئی تھیں مگر ابھی تک کسی کو اس حقیقت کا پتا نہ تھا۔ ایک روز انہوں نے کتب خانے میں جا کر باپ کی کتابیں دیکھیں تو انہوں نے سوچا کہ ان کے نام کی کتابیں بھی چھپنا چاہئیں۔ شہرت، عزت اور دولت سب کی چیزیں پاؤں چومیں گی۔

قدرت نے انہیں ایسا موقع فراہم بھی کر دیا۔ انگریزی کی ایک کہاوت ہے کہ جب خواہشیں اور امنگیں آپ کے دل میں پروان چڑھتی ہیں تو قدرت نت نئے راستے کھول دیتی ہے۔

ان کے باپ پیٹرک نے 1824ء میں اپنی تینوں صاحبزادیوں کو تعلیم حاصل کرنے کے لیے لنکا شائر کی کاؤنٹی کوون برج کے ایک بورڈنگ اسکول میں پڑھنے کے لیے بھیج دیا۔ سب سے چھوٹی بیٹی این کی عمر اتنی نہیں تھی کہ اسے بھیجا جا سکتا۔

یہ اسکول خاص طور پر پادریوں کی اولادوں کے لیے کھولا گیا تھا۔ اس لیے یہاں فیس کم تھی۔ اسکول میں لباس، رہائش اور کھانے پینے کے اخراجات 14 پاؤنڈ سالانہ تھے۔ جس میں سے نصف کی ادائی پیشگی کرنا ہوتی تھی۔ ایک پاؤنڈ فی طالب علم داخلہ فیس تھی۔ جس میں طالب علموں کو کتابیں بھی فراہم کی جاتی تھیں۔

وہاں طلبہ و طالبات کو گھریلو کام کاج سکھایا جاتا تھا۔ جس میں کڑھائی کے علاوہ کپڑوں پر استری کرنا تک شامل تھا۔ موسیقی اور ڈرائنگ سکھانے کے لیے 3 پاؤنڈ فی سال اضافی ادا کرنے پڑتے تھے۔ طالب علموں پر لازم تھا کہ وہ یونی فارم میں اسکول آئیں۔

اسکول میں کھانا خراب ملتا تھا۔ پڑنگ بارش کے پانی میں پکائی جاتی تھی۔ ایک بڑا سا ٹب چھت پر رکھا رہتا تھا جس میں پانی جمع ہوتا رہتا تھا۔ وہ ٹب چونکہ کھلا پڑا رہتا تھا اس لیے اس میں مٹی اور گرد بھی پڑی رہتی تھی۔ چنانچہ جب پڈنگ تیار ہوتی تھی تو زبان پر رکھنے کے قابل نہیں ہوتی تھی۔ وہ دودھ صرف سفید رنگ کا پانی کہا جا سکتا تھا۔ مٹن پانی جو بنتے میں ایک دن قبل کی اس میں آلو بھی شامل ہوتے تھے۔ اس کے علاوہ دیگچی اس میں ہفتے بھر کی بچی کھچی چیزیں شامل کر دیتا تھا۔ کھانا چونکہ زبان پر رکھنے کے قابل نہیں ہوتا تھا اس لیے اسے دیکھ کر ہی بچیوں کی بھوک اڑ جاتی تھی۔ اس لیے جب وہ بہنیں اسکول سے گھر لوٹیں تو ان کا وزن کم ہو چکا تھا۔

اسکول چونکہ پادریوں کا تھا اس لیے وہاں طالب علموں اور طالبات پر سختی بہت تھی۔ خراب کھانے کا اثر یہ ہوا کہ ماریا اور الزبتھ دونوں کو ٹی بی ہو گئی اور افسوس ناک بات یہ کہ آئندہ برس ان دونوں کا انتقال ہو گیا۔ ان کے علاوہ اسکول میں تعلیم حاصل کرنے والی مزید سات لڑکیاں اور لڑکے بھی ٹائفائیڈ کا شکار ہو گئی تھیں۔

ماں کی موت کے بعد ان بہنوں کے لیے یہ جاں گسل صدمہ تھا۔ ان کی آنکھیں نمناک رہنے لگیں۔ دونوں بہنوں کی موت کا ذمے دار انہوں نے اسکول کی انتظامیہ کو ٹھہرایا اور لوگوں کو باور کرایا کہ خراب غذا کی وجہ سے طالب علموں کی یہ حالت ہوئی ہے۔ اگر کوئی زندہ ہے تو محض اپنی قوت ارادی ہے۔

کافی بعد میں جب شارلٹ ناول نگار بن گئی تو اس نے اپنے ناول جین آئیر میں ایک اسکول لووڈ کا واقعہ بیان کیا ہے۔ حقیقت میں وہ اسکول یہی تھا۔ اس کی ساری جھلکیاں ناول میں ملتی ہیں۔

اپنی دونوں بہنوں کے انتقال کے بعد شارلٹ اور ایملی اپنے گھر آ گئیں۔ ان کے گھر میں چونکہ کافی آزادی تھی لہٰذا جب وہ اسکول سے واپس آئیں تو انہیں یہ محسوس ہوا کہ وہ جہنم کو چھوڑ کر آ گئی ہیں۔ شب و روز کے مشاغل پھر ویسے ہی ہو گئے۔ کہانیاں لکھنا، موسیقی سننا، سیر کرنا اور کھیل کود میں حصہ لینا۔

اب ان کے والد پیٹرک اور ان کی خالہ انہیں تعلیم دیتی تھیں۔

وہ تینوں بہنیں چونکہ تصوراتی دنیا میں رہتی تھیں، اس لیے ان کی ہر بات خیالی اور افسانوی تھی۔ انہوں نے اپنے طور پر دو ریاستیں بنائی تھیں۔ وہ ان ریاستوں میں تفریح، محبت،

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جنگ وجدل کے قصے گھڑتیں اور انہیں تحریر بھی کر لی جاتیں۔

اپنی بہنوں کو تصوراتی دنیا میں رہتے دیکھ کر سب سے چھوٹی بہن این کو بھی اسی شوق نے اپنا اسیر بنالیا۔ وہ بھی قلم سنبھال کر کاغذ کو سیاہ کرنے لگی۔ ان کے باپ نے اپنے بچے کو چار سپاہی کھیلنے کے لیے دیے تھے۔ وہ ان چاروں بہنوں نے آپس میں تقسیم کر لیے اور ان کے نام مشہور شخصیات پر رکھ دیے۔ پھر ان کے متعلق کہانیاں لکھنا شروع کر دیں۔ بظاہر یہ بچکانہ سی بات دکھائی دیتی ہے، لیکن جب مستقبل میں ان بہنوں نے ناول نویسی کو اپنا شعار بنایا تو یہ مشغلے بہت کام آئے۔ ان کی سنجیدہ تحریروں میں کمکل تحریروں سے بالیدگی آئی۔

شارلٹ برونٹے نے 1832ء میں رو ہیڈ کے ایک اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اس کا اس وقت حلیہ کیسا تھا اس کی ایک دوست کی زبانی سنیے "میں نے اسے ایک بگھی سے اترتے دیکھا۔ اس کا لباس قدیم فیشن کے مطابق تھا۔ اس کے چہرے پر نگاہ پڑتے ہی احساس ہوتا تھا کہ وہ سرد مزاج اور کچھ شکستہ سال تھی۔ وہ مس وولر کے اسکول میں آئی تھی۔ جب وہ کلاس میں آئی تو اس کا لباس تبدیل ہو چکا تھا، وہ پہلے سے بہتر تھا لیکن اب بھی اس سے پرانا پن جھلکتا تھا۔ وہ نوجوان کی بجائے بوڑھی اور سنجیدہ عورت لگتی تھی۔ اس کی بصارت کمزور تھی۔ اس لیے کہ وہ اپنے چاروں طرف اس طرح دیکھتی تھی جیسے کسی کو تلاش کر رہی ہو۔ جب استانی نے اسے ایک کتاب پڑھنے کے لیے دی تو وہ کتاب پر اتنی جھک گئی کہ اس کی ناک کتاب سے ٹکرانے لگی۔ جب استانی نے اسے ہدایت دی کہ وہ اپنا سر اٹھائے تو اس نے سر ذرا سا اٹھالیا لیکن اب بھی وہ ہونق سی لگ رہی تھی۔ کلاس کی بہت سی لڑکیاں اس کی ہیئت کذائی دیکھ کر ہنسنے لگیں۔"

مس وولر ایک اچھی استانی تھیں۔ انہوں نے شارلٹ کی کچھ اس طرح سے تربیت کی کہ اس کا ظاہری حلیہ کافی حد تک تبدیل ہو گیا۔ بہرحال وہ اپنی دونوں بہنوں کی موت پر غمگین اور اداس رہتی تھی۔

وہ اپنی بہنوں کو درس دینے کے لیے گھر واپس آگئی۔ وہ جتنے دن اسکول میں رہی اس کی استانی نے اپنے خلیقانہ رویے سے اس میں کافی تبدیلیاں پیدا کر دیں۔ اسی دوران اس نے دو سہیلیاں بھی بنائیں جس سے تمام زندگی بھر دوستی قائم رہی۔

1835ء میں وہ پھر اسی اسکول میں گئی لیکن اب استانی بن کر۔ اس وقت شارلٹ کی عمر انیس برس سے کچھ کم تھی۔ اس بار دونوں بہنیں اور بھائی بھی ساتھ تھا۔ اس کی تعلیم اور ادبی رجحان دیکھ کر اسکول کی انتظامیہ نے اسے استانی بنانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ وہ دل جمعی سے درس دے سکے گی۔

اس اسکول رو ہیڈ میں تین برس تک درس دینے کے بعد شارلٹ وہاں سے واپس آگئی۔ اس کے بھائی اور بہنیں پہلے ہی واپس آچکی تھیں اس لیے کہ انہیں اپنے گھر کی یاد ستانے لگی تھی۔ بیتنے والے اس دورانیے میں اس نے وہاں کئی دوست بنائے اور اچھا وقت گزارا۔ یہ دوست باقی زندگی تک دوستی نبھاتے رہے۔ ان میں سے بہت سے دوستوں نے اس کی رہنمائی کی اور ہر طرح کے مشورے بھی دیے۔

ان کی ملازمہ ٹیبی چونکہ بوڑھی ہو چکی تھی، اس لیے گھر کا کام کاج ایملی کرتی تھی۔ کھانا پکانے سے لے کر کپڑوں کی دھلائی اور استری تک اس نے اپنے ذمے لے لی تھی۔

اس زمانے میں باپ کی مالی حالت اچھی نہیں تھی۔ چنانچہ انہوں نے گھر کے اخراجات اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔ ایملی نے لا ہل اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا جو ہالی فیکس میں واقع تھا۔ ستمبر 1838ء جب اس کی عمر صرف بیس برس تھی وہ بری طرح سے بیمار پڑ گئی۔ اس لیے کہ وہ روزانہ 17 گھنٹے کام کرتی تھی۔ بیماری کی وجہ سے وہ واپس آگئی۔ گھر میں اس نے صفائی ستھرائی، کھانا پکانا اور دوسری گھریلو ذمے داریاں سنبھال لیں۔ بیچ میں وہ ایک اسکول میں پڑھانے بھی جاتی تھی۔

جب کہ شارلٹ اور این دولت مند گھرانوں کے بچوں کی اتالیق بن گئیں۔ گھر کی آمدنی بڑھ گئی اور اخراجات بخوبی پورے ہونے لگے۔

ملازمتوں کے دوران میں ان کی جن جن لوگوں سے ملاقاتیں ہوئیں ان کے خاکے کاپیوں میں درج کر لیے تا کہ آئندہ کہانیاں لکھتے وقت انہیں رہنمائی حاصل ہو سکے۔ انہیں معلوم تھا کہ بڑے ادیب ایسی ڈائریاں رکھتے ہیں جن میں تفصیلات درج کرتے رہتے ہیں تا کہ کہانی کا تانا بانا بنتے وقت رہنمائی ملتی رہے۔ کہانی تو نہیں البتہ ناولیں لکھتے وقت ان کی ڈائریاں بہت کام آئیں۔ حقیقی زندگی میں انہوں نے جن کرداروں سے ملاقاتیں کی تھیں وہ ناولوں کے جیتے جاگتے کردار بن گئے۔

شارلٹ اور ایملی دونوں نے سوچا کہ اگر وہ ہاورتھ میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

زندگی گزارتی رہیں تو ان کے تجربات میں اضافہ نہیں ہوسکے گا، لہٰذا انہیں اپنی تعلیم و تجربات میں اضافہ کرنا چاہیے۔ چنانچہ انہوں نے 1842ء بیلجیم کے شہر برسلز جانے کا فیصلہ کیا۔ اس لیے کہ ان کے والد وہاں ایک چرچ میں حکومت کی طرف سے پادری بن گئے تھے۔

وہاں انہوں نے فرانسیسی اور جرمن زبانیں سیکھیں۔ ایملی نے تو پیانو بجانا بھی سیکھ لیا تھا۔ برسلز میں یہ تینوں بہنیں کونسٹانٹن اہیگر کے اسکول میں پڑھتی تھیں۔ بیلجیم کی بلند عمارات اور کشادہ سڑکوں نے دونوں بہنوں کے ذہنوں پر خوشگوار اثر ڈالا۔ چرچ میں ہونے والی تقریبات اور آرٹ گیلریوں میں لگی ہوئی پینٹنگز نے انہیں متاثر کیا۔

اس اسکول میں تقریباً سو طالب علم تھے اور انہیں تعلیم دینے کے لیے سترہ استاد۔ اس اسکول میں فرانسیسی، جرمنی، ڈرائنگ، موسیقی، گلوکاری، خطاطی اور ریاضی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ شارلٹ اور ایملی آخری قطار میں بیٹھتی تھیں اور بالکل خاموش رہتی تھیں۔ گویا کہ استاد کا کہا ہوا ہر لفظ اپنی سماعت میں اتار رہی ہوں۔

کلاسیں نو سے بارہ بجے تک ہوتی تھیں۔ ڈرائنگ ہال میں دو میزیں پڑی تھیں جن کے اوپر کیروسین کا ایک لیمپ لٹکا رہتا تھا۔ جو لڑکیاں وہاں کھانا کھانا نہیں چاہتی تھیں، محفوظ پارک میں چلی جاتی تھیں۔ کھانے کے وقفے کے بعد دو سے چار بجے تک انگریزی ادب کی کلاسیں ہوتی تھیں۔ پانچ سے چھ بجے تک کھیل کود اور چھ سے سات بجے تک اسباق کی تیاری۔ پھر ایک کلاس اور اس کے بعد آٹھ بجے کھانا ہوتا تھا۔ اسکول اس زمانے میں بارہ گھنٹے کا ہوتا تھا۔

اہیگر کی شخصیت کا شارلٹ پر بہت اثر ہوا۔ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہوگئی۔ جب اسکول کی فیس ان سے ادا نہ ہوسکی تو اہیگر نے انہیں پیشکش کی کہ وہ پڑھنے کے ساتھ پڑھائیں تو ان کی فیس معاف ہوسکتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ طلبا ان سے خوش تھے، اس لیے کہ وہ پڑھانے وقت غصہ نہیں کرتی تھیں، لہٰذا طلبا ان کی عزت کرتے تھے۔ انہیں عام زندگی میں بھی کسی نے اشتعال میں نہیں دیکھا۔ جب کھیل کود کے لیے وقفہ ہوتا تھا تو وہ پارک میں چلی جاتی تھیں۔

اس اثنا میں ان کی خالہ کی طبیعت خراب ہوگئی۔ وہ پادرتھو کی طرف چل پڑیں لیکن جب گھر پہنچیں تو معلوم ہوا کہ خالہ کا نہ صرف انتقال ہوچکا ہے، بلکہ تدفین بھی ہوچکی ہے۔ این اور اپنے والد کو انہوں نے مغموم حالت میں لائبریری میں بیٹھے دیکھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ خالہ نے اپنی جائداد ان لڑکیوں کے نام کردی تھی۔ ان لوگوں کے علاوہ خالہ کا اس دنیا میں اور کوئی تھا بھی نہیں۔

شارلٹ پادرتھو تو آگئی تھی، لیکن اس کا دل برسلز میں ہی رہ گیا تھا۔ وجہ وجیہہ اور تند آور اہیگر تھا۔ اس نے اہیگر کو لگاتار تین خطوط لکھے۔ مگر ان میں سے کسی کا جواب نہیں آیا۔ وہ دل برداشتہ ہوگئی۔

معلوم نہیں کب اہیگر نے ان خطوط کو کھول کر دیکھا جس میں ناصحانہ انداز میں شارلٹ نے اپنی محبت کا اظہار کیا تھا۔ اس نے خطوط کے ٹکڑے کرکے انہیں ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا۔ اس کی بیوی کو تجسس ہوا تو اس نے وہ ٹکڑے ٹوکری میں سے نکال لیے اور انہیں ترتیب سے جوڑ لیا۔ وہ کافی دنوں تک ان خطوط کو سنبھالے بیٹھی رہی۔ شارلٹ کے انتقال کے بعد ان کے بیٹے پال اہیگر نے ان خطوط کو برطانوی میوزیم کے حوالے کردیا۔ ٹائمز اخبار نے وہ خطوط اپنی ایک اشاعت میں چھاپے۔ پھر بعد میں وہ شارلٹ کی سوانح حیات میں شامل کرلیے گئے۔ ان، وہاں خطوط کو بہرحال محفوظ کرلیا گیا۔

کچھ نہ کچھ کرتے رہنا ان کا شعار بن چکا تھا۔ اب انہوں نے سوچا کہ ہاورتھ میں اسکول کھولنا چاہیے۔ وہ محلے پڑوس کے بچوں کو پڑھا کر اپنی آمدنی بڑھا سکتی تھیں۔ انہوں نے تھوڑا سا سرمایہ خرچ کرنے کے بعد اسکول کھولا لیکن جلد ہی اسے بند کرنا پڑا۔ اس لیے کہ ان کے بھائی برانول کے خراب کردار کی وجہ سے کسی نے اپنے بچے کو اس اسکول میں داخل کرانا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ شراب پی کر دنگا فساد کرتا تھا اور لڑکیوں کو چھیڑتا تھا۔ بہت سے لوگوں نے اسے بدکردار عورتوں کے ہاں رات بسر کرتے بھی دیکھا تھا۔ اپنا پیٹ پالنے کے لیے وہ پینٹنگ کرتا تھا۔ 31 برس کی عمر میں 24 ستمبر 1848ء کو اس نے انتقال کیا۔

برانول کے بارے میں جو بھی کہا گیا وہ غلط نہیں تھا لیکن مشہور زمانہ مصنفہ ڈفنی ڈوماریر نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے، جو 1986ء میں شائع ہوئی ہے "برانول ایک ذہین اور نفیس لڑکا تھا۔ اس کی دلچسپی کے موضوعات مختلف تھے جن میں سرفہرست ادب تھا۔ وہ جب اپنی بہنوں سے خیالی اور تصوراتی دنیاؤں پر گفتگو کرتا تھا تو اس کے خیالات سب سے مستحکم اور مضبوط ہوتے تھے۔ اس کے خیالات میں نفاست ہوتی تھی اور اس کا باپ اس کی کاوشوں کو سراہتا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

وہ مصور بننا چاہتا تھا لہٰذا باپ نے ایک پینٹر کو مامور کر دیا تھا کہ وہ اسے پینٹنگ سکھائے۔ کچھ عرصے بعد اس کے باپ نے اسے کچھ رقم دی کہ وہ لندن جا کر رائل اکیڈمی اسکول میں داخلہ لے۔ پینٹنگ سیکھے لیکن وہ بری صحبت میں پڑ گیا اور اس نے وہ رقم الٹوں سیدھوں میں خرچ کر دی۔ جب رقم خرچ ہو گئی تو پھر مصوری کیسے سیکھی جا سکتی تھی؟ رنگ، برش اور کینوس کہاں سے آتے؟ اس نے ایک گھر میں ملازمت کر لی اور پڑھانا شروع کر دیا مگر وہاں سے بھی نکالا گیا اس لیے کہ وہ رابنسن فیملی کی ایک لڑکی سے پیار و محبت کی پینگیں بڑھانے لگا تھا۔

اس نے ایک ناول بھی لکھا تھا لیکن اسے مکمل نہ کر سکا۔ اس کی چند کہانیاں نومبر 1846ء میں شائع ہوئی تھیں مگر وہ اسے ادب میں کوئی نمایاں مقام نہیں دلا سکیں۔

جب وہ واپس آیا تو این برونٹے نے اسے جنوری 1843ء میں ایک پرچون فروش کی دکان پر ملازمت دلا دی مگر تین سال بعد اسے ملازمت سے جواب مل گیا۔ ناکامی اور نامرادی میں تھوڑے عرصے زندگی بسر کرنے کے بعد وہ انتقال کر گیا۔

☆☆☆

برونٹے بہنوں نے اب سنجیدگی سے کوچۂ ادب میں قدم رکھنے کا فیصلہ کر لیا۔ انہوں نے جو کچھ اکتساب کیا تھا وہ اس کا اظہار کرنے کی متمنی تھیں۔

ایک دن شارلٹ جب ایملی کے کمرے میں داخل ہوئی تو اسے میز پر نظموں کی ایک کتاب رکھی دکھائی دی۔ اس نے نظمیں پڑھیں تو اسے بھلی معلوم ہوئیں۔ یہ نظمیں ایملی نے لکھی تھیں۔ وہ ہر لحاظ سے معیاری اور قابل اشاعت تھیں۔ جب اس نے این سے یہ خیال ظاہر کیا تو اس نے بھی آمادگی ظاہر کی اور اپنی نظمیں اسے دے دیں۔

تینوں نے سر جوڑ کر یہ مشورہ کیا کہ تینوں بہنوں کی نظمیں ایک کتاب میں شائع ہونا چاہئیں۔ ایملی نے فیصلہ کیا کہ وہ مردانہ قلمی نام اختیار کریں۔ اس لیے کہ خواتین شاعراؤں کی حوصلہ افزائی نہیں کی جاتی تھی۔ خواتین کو دوسرے درجے کی مخلوق سمجھا جاتا تھا۔

نظموں کا مجموعہ شائع ہوا تو اس میں شارلٹ نے اپنا ادبی نام کیورر بیل رکھا تھا۔ ایملی کا نام ایلس بیل اور این برونٹے کا نام ایکٹن بیل تھا۔ اس میں شارلٹ کی انیس اور باقی دونوں بہنوں کی اکیس، اکیس نظمیں شائع ہوئیں۔

نظموں کا مجموعہ تو شائع ہو گیا لیکن اس کی صرف دو کاپیاں ہی فروخت ہوئیں۔ وہ افسردہ نہیں ہوئیں بلکہ کتاب پر اپنا قلمی نام دیکھ کر انہیں خوشی ہوئی۔ چھپے ہوئے نام میں بہر حال طاقت ہوتی ہے۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ اب ناول لکھے جائیں۔

تینوں نے علیحدہ علیحدہ ناول لکھنا شروع کر دیے۔ ایک جو کچھ لکھتی وہ دوسری بہنوں کو سناتی۔ پھر سب مل کر اس پر تبصرہ کرتیں اور مفید مشوروں سے نوازتیں۔ چند ماہ شارلٹ برونٹے نے دی پروفیسر، ایملی برونٹے نے وودرنگ ہائٹس اور این برونٹے نے اگنیس گرے لکھا۔

ناولوں کے مسودے تیار ہو گئے۔ لیکن یہ سوال ان کے دماغوں میں چبھنے لگا کہ انہیں شائع کون کرے گا؟ انہوں نے مختلف ناشروں سے بات کی۔ انہوں نے مسودے پڑھے۔ مسترد کر دیے۔ شارلٹ نے بھی ہمت نہیں ہاری۔ جب ڈاک سے مسودے واپس آ جاتے تھے تو وہ انہیں نئے لفافے میں رکھ کر اس پر دوسرے ناشر کا نام و پتا لکھتی اور سپرد ڈاک کر دیتی۔

قدرت نے ان کا ہاتھ تھام لیا اور ایک ناشر ولیم اسمتھ انہیں شائع کرنے پر رضامند ہو گیا۔ اس کی رائے تھی کہ دی پروفیسر اس کے معیار پر پورا نہیں اتر رہا ہے۔ اس لیے اسے ایک طرف ڈال دیا جائے۔ البتہ باقی دو میں جان ہے اور وہ قارئین کو متاثر کر سکتے ہیں۔ اس لیے انہیں شائع ہونا چاہیے۔ ان کا نام مصنفوں کی حیثیت سے بہر حال مشہور نہیں ہے اس لیے ناول شائع کرنا رسک ہے۔ اس رسک کو کم کرنے کے لیے ان بہنوں کو بھی اشاعت کے اخراجات میں حصہ دار بننا پڑے گا۔

یہ بعد کی بات ہے۔ اس سے پیشتر نہ جانے کیوں شبہ ہو گیا کہ تینوں ناول ایک ہی لڑکی نے لکھے ہیں۔ اس نے انہیں ایک خط بھیجا اور اس شبہے کا اظہار کر دیا۔ وہ تینوں لندن پہنچ گئیں۔ جب ولیم اسمتھ نے تین خستہ حال لڑکیوں کو ڈھیلے کپڑوں میں دیکھا مفلسی جن کے چہروں سے عیاں تھی تو اس نے معاملہ دریافت کیا۔ انہوں نے وضاحت کی کہ وہ تین بہنیں ہیں اور انہوں نے مل کر نہیں لکھا ہے۔ تینوں کی تخلیق علیحدہ ہے۔ ولیم نے معذرت کی اور انہیں اپنے مہمان کے طور پر ایک روز کے لیے رکھا۔ اس رات وہ انہیں کلب لے گیا اور ان کے ساتھ اس نے ڈنر بھی کیا۔

ولیم نے شارلٹ کو بتایا کہ اس کا ناول کمزور

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔ شارلٹ نے اپنا مسودہ مسترد کیے جانے پر ہمت نہ ہاری اور واپس یاد رتھ آ کر تیز رفتاری سے ایک اور ناول لکھنے لگی۔ یہ ناول اس نے بے انتہا دباؤ کی حالت میں لکھا تھا، اس لیے ان کے والد بیمار ہو گئے تھے۔ انہیں موتیا ہو گیا تھا۔ جس کا آپریشن انہوں نے اگست 1846ء میں مانچسٹر میں کرایا تو بینائی لوٹ آئی۔ جب وہ جزوی طور پر صحت یاب ہوئے تو بھائی برانویل کی طبیعت خراب ہو گئی۔

اس ناول کا نام شارلٹ نے "جین آئیر" رکھا تھا۔ اس نے وہ ناول ایک ناشر کو بھیجا۔ اسے ناول اتنا پسند آیا کہ اس نے فوراً ہی اسے شائع کرنے کا فیصلہ کر ڈالا۔ اس کا کہنا تھا کہ جب اس نے ناول پڑھنا شروع کیا تو اسے ہاتھ سے نہ رکھ سکا۔ اسے حیرت تھی کہ یاورتھ جیسی جنگل بیابان جگہ پر رہنے والی لڑکی کا مشاہدہ اور تخلیقی قوت کتنی جان دار ہے کہ اس نے زندگی سے قریب تر ایک ناول لکھ ڈالا۔

جب 1847ء میں یہ ناول شائع ہوا تو علم و ادب کی دنیا میں تہلکہ مچ گیا۔ اخبارات و رسائل میں اس ناول پر مثبت تبصرے شائع ہوئے اور شارلٹ کو خوب شاباشی ملی۔ یہ ناول ان کے اصلی ناموں سے شائع ہوئے تھے۔ "جین آئیر" جلد ہی بیسٹ سیلرز لسٹ میں شامل ہو گیا۔

ولیم تھیکرے اس زمانے کا عظیم ناول نویس کہلاتا ہے۔ اس نے تبصرہ کیا "ناول ہاتھ میں آنے ہی میں سارا دن اسے پڑھتا رہا۔ اس کی کہانی اتنی جان دار اور واقعات اتنے اثر انگیز تھے کہ میں اسے ہاتھ سے رکھ ہی نہ سکا۔ مجھ پر کہانی کا اتنا اثر ہوا کہ بعض مقامات پر رونے لگا۔ اختتام پر پہنچ کر جب میں نے اسے ہاتھ سے رکھا تو اس کے سحر میں مبتلا ہو چکا تھا۔"

شارلٹ نے اپنا ناول اپنے والد کو پڑھنے کے لیے دیا تو انہوں نے پڑھ کر اسے ستائشی جملوں سے نوازا۔ "تمہارا ناول عام سا جذباتی ناول نہیں ہے۔ یہ مختلف ہے اور اس میں لازوال کردار نگاری کی گئی ہے۔ میں اس سے بہت متاثر ہوا ہوں۔ امید کرتا ہوں کہ تم ادب کے میدان میں اس سے بڑا کارنامہ انجام دو گی۔"

جین آئیر کا مرکزی کردار جین ہے، جس کی ماں مر چکی ہے۔ وہ سیدھی سادی، شرمیلی اور جذباتی ہے لیکن ذہین بھی۔ جین نے اپنے بچپن کا تذکرہ اس طرح سے کیا ہے کہ وہ عرصہ اس نے تکالیف میں گزارا، کیوں کہ اس کی خالہ کا مزاج سخت تھا۔ وہ اسی کے گھر میں رہتی تھیں اس لیے رات دن ان سے سابقہ پڑتا تھا۔ پھر اس نے ایک اسکول میں داخلہ لے لیا۔ یہ خیراتی اسکول تھا۔ جس کا نام لووڈ تھا۔ اس اسکول میں اس نے بے دردیاں، تنگیں اور سختیاں بھی برداشت کیں۔ کچھ عرصے بعد اس نے اسی اسکول میں پڑھانا شروع کر دیا۔ اس کے بعد وہ ایک پُراسرار بچی کی اتالیق بن جاتی ہے۔ وہ اسی کے گھر میں رہنے لگتی ہے۔ اس گھر کا مالک ایڈورڈ روچسٹر ہوتا ہے۔

رات کو اس مکان کے ایک کمرے سے رونے چیخنے کی آوازیں آتی ہیں۔ جین کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ وہ روچسٹر سے اس کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ جواب دینے میں ہچکچاتا ہے۔

روچسٹر اور جین میں محبت ہو جاتی ہے اور دونوں شادی کرنے کا فیصلہ کر لیتے ہیں لیکن شادی کے دن یہ عقدہ کھلتا ہے کہ روچسٹر شادی شدہ ہے اور اس کی بیوی تیسری منزل پر ایک کمرے میں مقید ہے۔ اس لیے کہ وہ ذہنی طور پر معذور ہے۔ وہ راتوں کو چیختی چلاتی ہے۔

جین اس راز کو پا کر بہت آزردہ ہوتی ہے۔ وہ اس گھر کو چھوڑ دیتی ہے اور اپنے گاؤں آ کر ایک اسکول میں پڑھانے لگتی ہے۔ چند ماہ بعد اسے معلوم ہوتا ہے کہ روچسٹر کی پاگل بیوی نے مکان کو آگ لگا دی اور اسی میں جل کر مر گئی۔ روچسٹر نے اسے بچانے کی کوشش کی، لیکن بری طرح سے مجروح ہو گیا اور اس کی بینائی جاتی رہی۔ جین وہاں جاتی ہے اور جذباتی طور پر یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اسے روچسٹر سے شادی کر لینا چاہیے۔ وہ دونوں ہنسی خوشی ساتھ رہنے لگتے ہیں۔

ناول میں یارک شائر کے مناظر کی عکاسی ہے، ہرے بھرے حسین میدان اور گرد و پیش میں پھیلے ہوئے باغات۔ ناول میں جا بجا شارلٹ کی زندگی کا عکس نظر آتا ہے۔ جو واقعات اس کی زندگی میں پیش آئے تھے وہ اس نے ناول میں سمو دیے تھے۔ بعض ناقدین کا خیال ہے کہ وہ جگ بیتی کی بجائے آپ بیتی ہے۔

جس بورڈنگ اسکول میں شارلٹ نے اپنی بہنوں کے ساتھ تعلیم حاصل کی تھی یا اتالیق کی حیثیت سے اس پر جو گزری تھی اس کا تذکرہ اس کے ناول میں ملتا ہے۔ یہ ناول جذبات نگاری، پُراسرار مناظر کی عکاسی اور حسین منظر کشی سے مزین ہے۔ عورتوں کے نازک احساسات، کردار نگاری اور اپنے بیان و اسلوب کی بنا پر ناول لوگوں میں بہت مقبول ہوا۔

بہت سے لوگ معاشرے میں اس وقت عورتوں کو کوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مقام دینے کے قائل نہیں تھے۔ انہیں یہ ناول پسند نہیں آیا۔ انہوں نے اعتراض کیا کہ شارلٹ برونٹے نے اپنے ناول میں ایک ایسی عورت کو پیش کیا ہے جو خود مختار ہے۔ وہ سوچنے سمجھنے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ دوسروں کی عزت کرتی ہے اور اپنی عزت کرا جانتی ہے۔ اپنے فیصلے خود کرتی ہے، اپنے کام خود کرتی ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ خوددار ہے۔

اس ناول کا ایک اہم اقتباس "تم کیا سمجھتے ہو کہ میں کوئی مشین ہوں؟ ایسی مشین جس میں احساسات و جذبات نہیں ہوتے؟ تمہارا خیال ہے کہ تم میرے منہ سے روٹی کا وہ ٹکڑا بھی چھین سکتے ہو جو میں نے تھام رکھا ہے؟ پانی کا وہ قطرہ بھی میرے حلق تک نہ پہنچنے دو گے جو میرے گلاس کی تہہ میں ہے؟ محض اس لیے کہ میں ایک مفلس، حقیر، سادہ اور بے کار سی لڑکی ہوں؟ مجھ میں روح نہیں ہے اور میرے سینے میں دل نہیں دھڑکتا؟ تمہاری سوچ غلط ہے۔ مجھ میں تم سے زیادہ طاقت اور روح ہے۔ میرا دل تم سے زیادہ تندرست رہتا ہے۔ خدائے بزرگ و برتر نے مجھے یہ دل تحفتہً عنایت کیا ہے۔ جس میں کائناتی خوبصورتی ہے اور جمالیاتی دولت بھی ہے۔ میں تم سے استدعا کرتی ہوں کہ مجھے تنہا چھوڑ دو اور میں بھی تم سے بے نیاز ہو جاتی ہوں۔

میں عام اور روایتی طریقے سے نہیں ملنا چاہتی۔ یہ میری روح ہے جو تمہاری روح سے متعلق ہے۔ جب ہم اپنی قبروں میں چلے جائیں گے تو اس کے بعد خدا کے دربار میں ایک سطح پر کھڑے ہوں گے۔ ہم میں سے کوئی کسی پر فوقیت نہیں رکھتا ہوگا۔ غالباً اس وقت تم مجھے قبول و منظور کرلو گے؟"

اس ناول کی شہرت حاصل کرنے کے بعد شارلٹ نے دو ناول مزید لکھے۔ ایک کا نام 'شرلی' تھا۔ اس میں اس نے اپنا کردار بھرپور طریقے سے پیش کیا تھا۔ چنانچہ ناقدین کہتے ہیں کہ شرلی خود شارلٹ ہے۔ اس ناول میں یارک شائر کا ماحول رچا بسا ہوا ہے۔ وہاں کے سارے رنگ اس میں سموئے ہوئے ہیں۔ لوگوں کے معاشرتی مسائل، گھریلو جھگڑے، روئی، کپڑے کے کارخانے اور مشینیں لگنے پر ہاتھ سے کام کرنے والوں کا روزگار ختم ہوا جا رہا تھا۔ اس لیے حکومت سے لڑائی جھگڑا شروع ہو گیا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہنگامے ہوئے۔ ان کا تذکرہ ناول میں بدرجہ اتم تھا۔

اپنے دوسرے ناول 'ولیٹ' میں شارلٹ نے بہنوں کا تذکرہ کیا جب وہ برسلز میں تعلیم حاصل کرنے گئی تھیں اور وہاں نے کونسٹانٹن ایجر کی تعلیم گاہ کا نقشہ اس میں پیش کیا تھا۔ وہاں اس کی جن افراد سے ملاقاتیں رہیں ان ... کا تذکرہ مختلف کرداروں کی صورت میں موجود ہے۔ یہ ناول بھی آپ بیتی کہا جا سکتا ہے۔

اس کے باپ کا نائب آرتھر بلنکس تھا یعنی نائب پادری۔ وہ ان لوگوں سے گزشتہ پانچ برس سے واقف تھا۔ اسے شارلٹ سے انسیت پیدا ہوگئی۔ چنانچہ اس نے شارلٹ کو پیغام دے دیا۔ وہ اچھا تعلیم یافتہ تھا اور اس کی کوئی علمی اور ادبی حیثیت نہیں تھی۔ وہ عام سے پادریوں کی طرح تنگ مزاج اور فرسودہ خیالات کا حامل تھا لہٰذا شارلٹ نے انکار کر دیا۔ پھر اپنی ایک دوست کو خط لکھا اور تفصیلات سے آگاہ کیا۔ اس کی دوست کے نزدیک آرتھر بلنکس قابل قبول تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ اس سے محبت کرتا ہے اس لیے زندگی اچھی گزرے گی۔ شارلٹ نے اس کے مشورے پر عمل کیا۔ چنانچہ 18 جون 1854ء میں وہ دونوں رشتۂ ازدواج میں بندھ گئے۔ یہ رشتہ شارلٹ کی موت تک قائم رہا۔

شارلٹ بہرحال اس رشتے سے مطمئن تھی، اس لیے کہ آرتھر بلنکس ایک اچھا شوہر ثابت ہوا تھا۔ شادی کے بعد وہ دونوں ہنی مون منانے آئرلینڈ گئے جہاں بلنکس کی خالہ اور کزن سے ملاقات ہوئی۔ شارلٹ نے اپنی سہیلیوں کو خطوط لکھے کہ اس کی زندگی کا مقصد یکسر تبدیل ہو چکا ہے اور اب وہ ایک اچھی بیوی بن کر زندگی گزارنا چاہتی ہے۔

خوشیاں اسے راس نہ آئیں یا مصلحت ایزدی یہی تھی کہ ایک سال بعد ہی فرشتۂ اجل اس کے دروازے پر دستک دینے آ گیا۔

شارلٹ کی موت کی وجہ ٹی بی بتائی جاتی ہے مگر ڈاکٹروں نے اندیشہ ظاہر کیا تھا کہ اس کی موت کا سبب ٹائیفائیڈ بھی ہو سکتا ہے، اس لیے کہ ہاورتھ اور اس کے گرد و نواح میں صاف پانی کی کمی تھی اور لوگوں کو ناقص پانی نصیب ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ اس کے ہاں بچے کی ولادت وقت سے پہلے ہو گئی۔

اس کی موت کے بعد اس کے والد پیٹرک برونٹے کی ہدایت پر الزبتھ گاسکل نے شارلٹ کی سوانح حیات لکھی جو 1857ء میں شائع ہوئی۔

☆☆☆

دونوں بہنیں باکمال تھیں۔ شعر و شاعری اور علم و فن میں یکتا۔ تینوں ناول نگار تھیں۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے کون سب سے زیادہ با صلاحیت اور بڑی تخلیق کار تھی۔ ناقدین نے ایملی کو سب سے زیادہ با صلاحیت اور با کمال تسلیم کیا ہے۔ اس کی تحریروں میں جذبات نگاری اپنے عروج پر ہے اور خیالات کی وسعت و بلندی ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس کی نظموں میں تصوف کا رنگ دکھائی دیتا ہے۔

ایملی برونٹے نے تقریباً دو سو نظمیں لکھی ہیں جو اس کے انتقال کے بعد شائع ہوئی ہیں۔ ناقدین کا خیال ہے کہ ایملی برونٹے میں والٹر اسکاٹ، ورڈز ورتھ، شیلے اور کیٹس بلیک کا رنگ جھلکتا ہے۔ وہ اپنے دور کے ان شعراء سے بڑی حد تک متاثر تھی۔

ایملی کا ناول 'وودرنگ ہائٹس' 1847ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں حقیقت سے قریب جذبات نگاری ہے اور قدرتی مناظر کا حسین بیان ہے۔ ایملی کا ناول بڑی بہن شارلٹ کے ناول 'جین آئیر' کی طرح سے مقبولیت تو حاصل نہ کر سکا لیکن بہر حال اس نے پڑھنے والوں کی بڑی تعداد کو متاثر کیا۔ انہوں نے اسے بھی بڑا ناول نویس تسلیم کیا۔ بعض نقاد کہتے ہیں کہ اس کے ناول کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

کچھ ناقدین کا خیال ہے کہ اس کی سپر نیچرل باتیں قابل قبول نہیں ہیں۔ ناول رومانی انداز کا ہے، لیکن اس کے ہیرو کا انتقامی جذبہ اور اس کا ظلم وجور پسند نہیں کیا گیا۔ اس کے باوجود ناقدین کی ایک اکثریت نے ایملی کی کردار نگاری، مکالمہ نگاری، حالات و واقعات کی عکاسی، منظر کشی اور ڈرامائی صورت حال اور انداز بیان کی تعریف کی ہے۔ روایتی رومان پروری کی بجائے اس ناول کا خاکہ نفرت سے بنا گیا ہے۔ نفرت و محبت کی آمیزش اس میں نہایت مہارت اور چابک دستی سے کی گئی ہے۔

اس ناول میں ارن شا ایک بے گھر اور یتیم لڑکے ہیتھ کلف کو اپنے گھر میں پناہ دیتا ہے۔ اس گھر کا نام وودرنگ ہائٹس ہوتا ہے۔ اس گھر میں اس کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا جاتا۔ البتہ ارن شا کی بیٹی کیتھرین اس سے ہمدردی کا اظہار کرتی ہے۔ دونوں میں محبت ہو جاتی ہے۔ مگر آپس میں شادی نہیں ہوتی، اس لیے کہ ارن شا اسے مفلس اور گنوار سمجھتا ہے۔ اپنی بیٹی کی شادی وہ ایک مالدار شخص ایڈگر لنٹن سے کر دیتا ہے۔

وہ بچپن سے لے کر ناکامیوں اور نامرادیوں سے ہمکنار ہوتا ہے۔ چنانچہ مکمل طور پر منفی سوچ کا حامل ہو جاتا ہے۔ وہ دونوں خاندانوں سے انتقام لینے کا منصوبہ بناتا ہے اور ان کے درمیان غلط فہمیوں، عناد اور بغض کی اونچی دیواریں کھڑی کر دیتا ہے۔ ان خاندانوں کے درمیان نفرت اور عداوت پیدا ہو جاتی ہے۔

اس کا انتقام کیتھرین کی موت کے بعد بھی جاری رہتا ہے اور وہ آنے والی نسلوں کو بھی بغض و عناد کی آگ میں جھلساتا رہتا ہے۔ پھر وہ اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ ناول کا اختتام مثبت انداز سے ہوتا ہے۔ دونوں خاندانوں کے درمیان ایک جوڑے میں محبت ہو جاتی ہے اور پھر شادی۔ اس طرح سے وہ ہولناک نفرت اور عداوت ختم ہو جاتی ہے۔

'وودرنگ ہائٹس' پر اعتراضات ہوئے اور اسے منفی سوچ کا ناول قرار دیا گیا۔ تاہم اس کی ادبی حیثیت مسلم ہے۔ اسے اب تک پڑھا جاتا ہے اور اس کے مرکزی خیال کو لے کر فلمیں اور ڈرامے تخلیق کیے جاتے ہیں۔ وہ ایک سماجی اور انقلابی ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس سے پیشتر ایسا ناول انگریزی ادب میں نہیں لکھا گیا تھا۔ ایملی بہر حال ادب میں ایک نمایاں مقام رکھتی ہے، اس لیے کہ وہ شاعرہ بھی اور مصورہ بھی۔

ناول کے چند اقتباسات "تم اپنے بیٹے کو یہ سکھاؤ کہ وہ اس دنیا میں سچائی اور دیانت داری سے چلے۔ تمہیں اس کی راہ سے روڑے اور پتھر نہیں ہٹانا پڑیں گے بلکہ یہ سکھانا ہوگا کہ وہ مضبوطی سے قدم جما کر چلے۔ تمہیں اس کا ہاتھ تھامنے کی بھی ضرورت نہیں۔ اس کی تربیت اس طرح سے کرو کہ وہ دنیا میں کسی کی مدد کے بغیر چلنے کے قابل ہو سکے۔"

ستمبر 1848ء میں ان کے بھائی برانول کا انتقال ہوا تو ایملی اس کے جنازے میں شریک ہونے کے لیے وہاں گئی۔ اسے نزلے اور زکام نے اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ ٹی بی اسے پہلے ہی سے تھا۔ دونوں بیماریوں نے اسے ادھ موا کر ڈالا۔ اس کی حالت روز بروز ابتر ہوتی جا رہی تھی، لیکن اس نے طبی امداد لینا بند کر دی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ میرے جسم میں زہر پھیل رہا ہے۔ کسی ایسے ڈاکٹر کو بلاؤ جو اس زہر کو نکال سکے۔ بظاہر معمولی سمجھی جانے والی بیماری زکام نے اس کا کام تمام کر ڈالا اور وہ دسمبر 1848ء میں اس جہان فانی سے کوچ کر گئی۔ اپنے بھائی کی موت کے ٹھیک دو ماہ بعد۔ شارلٹ نے لکھا تھا "وہ روز بروز نحیف ہوتی جا رہی تھی۔ فزیشن نے مجھے کان میں بتا دیا تھا کہ اب اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں رہی ہے۔ بہر حال اس نے چند دوائیں تجویز کر دی تھیں جنہیں ایملی نے ہاتھ تک نہ لگایا۔ تب میں نے خدا سے دعا کی کہ اب

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تو ہی آخری سہارا ہے۔ ہم سب کو اپنی امان میں رکھ۔"

سہ پہر تک اس کی حالت ناقابل بیان ہو گئی۔ وہ سرگوشیوں میں گفتگو کر رہی تھی۔ اس نے شارلٹ سے کہا "اگر کوئی ڈاکٹر ہو تو اسے بلاؤ۔"

شارلٹ مایوسی کے سمندر میں غوطے کھانے لگی اس لیے کہ ڈاکٹر کو بلانے کا وقت گزر چکا تھا۔ اس کا بھائی ٹھیک اسی دن موت سے ہم کنار ہوا تھا۔ سہ پہر کے بعد شارلٹ نے بھی رخت سفر باندھ لیا۔

موت کے وقت وہ اتنی دبلی پتلی تھی کہ اس کے تابوت کی چوڑائی صرف سولہ انچ تھی۔ بڑھئی نے کہا کہ اس نے آج تک اتنی کم چوڑائی کا تابوت نہیں بنایا۔ اس کی آخری رسومات سینٹ مائیکل کے چرچ میں ادا کی گئیں۔

اپنی موت کے وقت وہ اس حقیقت سے بے بہرہ تھی کہ وہ صرف ایک ناول وودرنگ ہائٹس لکھ کر دنیائے علم و ادب کا ایک جگمگاتا ستارہ بن گئی تھی۔ اپنے ناول کی اشاعت کے صرف ایک برس بعد ہی اسے فرشتہ اجل نے آلیا۔ وہ اپنی موت تک مشہور نہیں ہوئی تھی۔ بہرحال بعد میں اسے لازوال شہرت ملی۔ وودرنگ ہائٹس کے دوسرے ایڈیشن کا دیباچہ اس کی بڑی بہن شارلٹ برونٹے نے لکھا تھا۔ اس ایڈیشن میں ایملی کی کچھ نظمیں بھی شامل کی گئی تھیں۔ موت کے وقت ایملی کی عمر صرف تیس برس تھی۔

☆☆☆

برونٹے بہنوں میں سب سے چھوٹی بہن "این" تھی۔ اس نے دو ناول لکھے۔ 1847ء میں "اگنس گرے" جب کہ دوسرا ناول "دی ٹیننٹ آف وائلڈ فل ہال" 1848ء میں شائع ہوا۔ اس کے ناولوں کو بڑی بہنوں جیسی مقبولیت تو حاصل نہ ہو سکی، لیکن وہ سلیس اور سادہ ناول ہیں اور ان میں جذبوں کی سچائی ملتی ہے۔ بڑی حد تک مذہبی رنگ بھی پایا جاتا ہے۔ "اگنس گرے" ایک اتالیق عورت اور پادری کی کہانی ہے۔ دوسرے ناول "دی ٹیننٹ آف وائلڈ فل ہال" ایک نشے باز کی کہانی ہے۔ وہ عادات و خصائل کی بنا پر اوباش کہا جاتا ہے۔ ایک عورت ہیلن گراہم اس شخص آرتھر ہنٹنگڈن کی محبت میں گرفتار ہو کر اس سے شادی کر لیتی ہے۔ کچھ روز بعد پتا چلتا ہے کہ وہ تشدد کا حامی ہے اور نشہ کرتا ہے۔ وہ گالی گلوچ کا بھی عادی ہوتا ہے اور کوئی اسے اچھی نظر سے نہیں دیکھتا ہے۔ وہ آرتھر کو چھوڑ کر راز داری سے وائلڈ فل ہال میں پناہ لے لیتی ہے مگر جب آرتھر کی صحت بگڑنے لگتی ہے تو وہ اس کے پاس واپس آجاتی ہے اور اس کی موت تک وہاں سے نہیں ہلتی۔

تنقید نگاروں کا خیال ہے کہ اس کے مرکزی کردار میں برونٹے کے بھائی برانول کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ فی زمانہ یہ ناول خواتین کے لیے دلچسپی کا حامل ہے اور "زنانہ ناول" کہا جاتا ہے، جس کی ہیروئن ٹیک پروین تھی۔

این برونٹے حساس لڑکی تھی۔ وہ نرم مزاج، متحمل اور مذہبی تھی۔ اس کی شخصیت کا اظہار اس کے ناولوں سے بھی ہوتا ہے۔ وہ ایک زمانے میں اتالیق کی حیثیت سے بچوں کی نگرانی پر مامور تھی۔ اس نے اپنی زندگی کے اس دور کی اپنے دونوں ناولوں میں بھرپور عکاسی کی۔ اس کا ناول "اگنس

کچھ تجارتی غلطیاں

کوک سے کون واقف نہیں ہے۔ یہ مشروب پوری دنیا کا مشہور ترین مشروب ہے۔ اس وقت جب وہ بازار میں آیا تو اسی وقت ایک اور مشروب بھی سامنے آگیا۔ وہ تھا پیپسی۔ اس زمانے میں پیپسی والوں پر معاشی بحران آیا ہوا تھا۔ پیپسی کے بند ہونے کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا۔ انہوں نے کوک والوں سے کہا کہ وہ اس برانڈ یعنی پیپسی کو خرید لیں۔ چونکہ کوک والوں کے دماغ اس وقت آسمان پر تھے۔ اس لیے انہوں نے پیپسی کی درخواست پر غور کرنا ہی مناسب نہیں سمجھا۔

اس کے بعد بھی پیپسی سنبھالا لے کر ان کے راستے کی دیوار بن گئی۔ اس مشروب نے کوک کی مارکیٹ کو بہت بری طرح نقصان پہنچایا تھا۔

مشہور موجد الیگزینڈر گراہم بیل اپنا بنایا ہوا ٹیلی فون لے کر ویسٹرن یونین والوں کے پاس پہنچ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ اپنی یہ ایجاد اس کمپنی کو فروخت کر کے کچھ حاصل کر لے گا۔ لیکن یونین والوں نے اس کا مذاق اڑاتے ہوئے کہا۔ "مسٹر۔ یہ تم کیا فالتو چیز اٹھا کر لے آئے ہو۔ اس کے تو تمہیں کوئی دس ڈالرز بھی نہیں دے گا۔"

گراہم بیل مایوس ہو کر واپس چلا آیا۔ لیکن صرف دو سال بعد وہی کمپنی گراہم کو 25 ملین ڈالرز دینے کو تیار ہو چکی تھی۔ لیکن اب دیر ہو چکی تھی۔ گراہم نے کہیں اور سودا کر لیا تھا۔

مرسلہ: نسیم مشرف، بھکر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرے ٹا ایک اتالیق کی کہانی پر مشتمل ہے۔ وہ ایک خوددار عورت ہے جو اپنی آزادی سے اپنی زندگی گزارنا چاہتی ہے اور کسی کی دست نگر نہیں ہونا چاہتی۔ وہ ملازمت کر کے عزت سے رہنا چاہتی ہے۔ وہ اپنی مرضی کی مالک رہنا چاہتی ہے اور کسی کے حکم کی پابند نہیں ہونا چاہتی۔

لیکن اس نے جو کچھ سوچ رکھا ہے، اس کے مطابق نہیں ہو پاتا۔ اسے مجبوری اور لاچاری میں وہ کام کرنا پڑتے ہیں جو وہ نہیں کرنا چاہتی۔ بے حسی اور مایوسی اس پر غالب آجاتی ہے۔ اس ناول میں اعلیٰ طبقے کی سچی عکاسی کی گئی ہے۔ ان کی سنگدلی، بے حسی اور تعلیم سے بے اعتنائی کو موضوع بنایا گیا ہے۔ اونچے طبقے کے بچے جو تعلیم حاصل کرنے میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے ان کی حالت زار بھی بیان کی گئی ہے۔ سب کچھ عبرت ناک اور حیرت انگیز ہے۔

ناول کی ہیروئن اگنیس ہے جو اتالیق ہے۔ وہ اس بنا پر پریشان رہتی ہے کہ وہ بچوں کو بہترین تعلیم دینا چاہتی ہے لیکن ناکام رہتی ہے۔ وہ فرسٹریشن اور ڈپریشن کا شکار ہو چکی ہے۔ ایک پادری اس کی زندگی میں داخل ہوتا ہے اور چند ماہ بعد وہ ہمیشہ کے لیے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیتے ہیں۔ اگنیس کی بھٹکی ہوئی روح کو سکون حاصل ہو جاتا ہے۔

ایک تبصرہ نگار نے ناول پڑھ کر یوں کہا "یہ ناول سادگی اور نفاست سے سلے ہوئے لباس کی طرح خوب صورت ہے۔"

این برونٹے کے ناولوں میں اس دور کے برطانیہ کے درمیانی طبقے کی روزمرہ کی زندگی کی عکاسی بہت بہترین انداز میں کی گئی ہے اور ہر پہلو کو سچائی اور سادگی سے بیان کیا گیا ہے۔ وہ اپنی تحریروں میں تصنع اور بناوٹ کی قائل نہیں تھی۔

اس کی تحریر کے اہم اقتباسات

یہ عورت ذات ہی ہے، جو کسی ایک مرد سے محبت کرتی ہے وہ اندھے پن سے، شفقت و اپنائیت سے وہ خدا اس مخلوق پر اپنی رحمتیں اور عنایتیں نازل فرمائے۔

خوبصورتی ایک وصف ہے جیسے کہ دولت جو سب کو عزیز ہوتی ہے سب اس کے طلب گار ہوتے ہیں یہاں تک کہ دنیا کا سب سے رذیل شخص بھی۔

میں خوش ہوں کہ میرا وجود ہے۔ میں ہر لحاظ سے مکمل نہیں ہوں مگر میں دیانت دار ہوں۔ ایسی ہوں کہ لوگ مجھ سے محبت کریں، میری طرف توجہ دیں اور میرے بارے میں باتیں کریں۔ میں ایسی کوشش نہیں کرتی کہ میں جو نہیں ہوں وہ بن جاؤں۔ میں کسی کو متاثر کرنے کی بھی کوشش نہیں کرتی۔ میں خوش ہوں کہ میں وجود رکھتی ہوں۔

دوسری بہنوں کی طرح این برونٹے کو بھی ٹی بی ہو گئی۔ شارلٹ نے اپنی ادبی سرگرمیاں موقوف کر دیں اور بہنوں کی خدمت کو شعار بنا لیا۔ اس نے این کا ہر ممکن علاج کرایا لیکن اسے موت کی وادیوں میں جانے سے نہ روک سکی۔ 29 مئی 1849ء میں این اس دنیائے رنگ و بو سے چلی گئی۔ اس وقت اس کی عمر 29 برس تھی۔

اس کی موت سے کچھ پہلے شارلٹ اسے اسکاربرا لے گئی تھی۔ این کا انتقال وہیں ہو گیا اور اس کی تدفین بھی وہیں ہوئی۔ جب شارلٹ دوبارہ اس کی قبر پر گئی تو اس نے گورکن سے کہا کہ قبر کا کتبہ بنانے والے سے غلطی ہوئی ہے۔ این کی عمر 29 برس تھی نہ کہ 28 برس۔ وہ اس کو درست کر دے۔ گورکن نہ جانے اس بات کو بھول گیا یا اس نے دانستہ اس معاملے میں پڑنے کی کوشش نہیں کی۔ چنانچہ یہ غلطی اب تک اس کتبے پر موجود ہے اور علم و ادب کے جو شائقین وہاں آتے ہیں اسے 28 برس کا ہی سمجھتے ہیں۔

برونٹے بہنوں میں اب شارلٹ تنہا اور مغموم رہ گئی۔ رنجور و دل گرفتہ۔ آنسو تھے کہ اس کی پلکوں پر نہ تھمتے تھے۔ وہ اپنی بہنوں کی تدفین کے بعد ہاورتھ واپس آئی تو خالی مکان اسے کاٹنے کو دوڑنے لگا۔ وحشت تھی کہ در و دیوار پر بال کھولے سو رہی تھی۔

شارلٹ نے اس وحشت سے چھٹکارا پانے کے لیے زور و شور سے لکھنا شروع کر دیا۔ اپنا ناول شرلی اس نے اسی دور میں مکمل کیا تھا۔ یہ 1849ء میں شائع ہوا۔ اپنی تنہائی سے نجات پانے کے لیے شارلٹ لندن کے چکر بھی لگاتی رہی۔ اس وقت تک قارئین کو معلوم ہو چکا تھا کہ کیورل، ایلس اور ایکٹن کے نام سے انہی بہنوں نے لکھا تھا۔

چنانچہ جب شارلٹ لندن جاتی تو اس کی عزت و توقیر کی جاتی۔ ادیب اور شاعر اسے ہاتھوں ہاتھ لیتے۔ اس کے ناولوں پر گھنٹوں باتیں ہوتیں۔ ان ادیبوں میں ایک ناول نگار گیسکل سے اس کی ملاقات ہوئی۔ وہ شارلٹ سے متاثر ہو گیا اور اس کی موت کے بعد اس نے شارلٹ کی سوانح حیات لکھی ہے، جو 'شارلٹ برونٹے کی زندگی' کے نام سے شائع ہوئی ہے۔

اس نے لکھا "تیز چمکدار آنکھوں اور دبلے پتلے جسم والی پستہ قامت شارلٹ کا معمول تھا کہ وہ سونے سے پیشتر کھانے کے کمرے میں جاتی اور کچھ وقت وہاں ضرور گزارتی۔ حقیقت

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں وہ ان گزری ہوئی باتوں کو یاد کرتی جو اس کی بہنوں نے ان سے کی تھیں۔ اب اسی کمرے میں تو بیٹھا کرتے اور حالات حاضرہ پر گفتگو کیا کرتے تھے۔ شارلٹ کا کہنا تھا کہ اگر وہ ڈائننگ ہال میں نہ جائے تو اسے نیند ہی نہیں آتی۔"

پھر اس کی زندگی میں بھی موت کی تاریکی داخل ہوگئی۔ 31 مارچ 1855ء میں جب کہ اس کی عمر تقریباً 38 برس تھی وہ اپنی بہنوں سے جا ملی۔ اس کی سب سے اول تخلیق 'دی پروفیسر' اس کی موت کے دو برس بعد شائع ہوئی۔ 'ایما' کے نام سے اس نے جو ناول لکھنا شروع کیا تھا اسے مکمل کرنا نصیب نہ ہوا۔ شارلٹ کا شمار مشہور ادیبوں اور شاعروں میں ہوتا ہے اور جین آئیر کو بہترین ناول تسلیم کیا جاتا ہے۔ اسے قارئین اب تک پڑھتے ہیں کیوں کہ اسے ادب میں اعلیٰ مقام حاصل ہے۔

شارلٹ کے انتقال کے بعد ہاورتھ کے اس مکان میں اس کے والد اور اس کا شوہر آرتھر بل نکولس اور دو ملازم رہ گئے۔ پادری صاحب نے مسز گاسکل نامی ایک مصنفہ کو شارلٹ کی سوانح حیات لکھنے کی ہدایت کی۔ جب وہ مکمل ہو کر ان کے ہاتھ آئی تو انہوں نے اعتراض کیا کہ اس میں آرتھر بل نکولس کا کردار دبا دیا گیا ہے۔ (اس لیے کہ مصنفہ کو آرتھر سے بغض للہ تھا۔ وجہ یہ تھی کہ آرتھر کو وہ جاہل سمجھتی تھی) پادری صاحب کے کہنے پر سوانح حیات میں ترمیم کی گئی۔ جب وہ شائع ہو کر سارے برطانیہ میں تقسیم کی گئی تو ملک میں دھوم مچ گئی۔ اس سوانح حیات سے برونٹے خاندان کی شہرت میں اضافہ ہوا۔ ہاورتھ کے مکان پر شارلٹ کی زندگی ہی میں ادیبوں کا مجمع لگا رہتا تھا لیکن سوانح حیات کے شائع ہونے کے بعد تو جیسے تانتا لگ گیا۔ سب ہی برونٹے بہنوں کے والد سے ملنے کے متمنی رہتے تھے۔ آرتھر بل نکولس کا بیان ہے کہ انہیں چرچ تک جانے میں پریشانی ہونے لگی تھی اس لیے کہ لوگ ان سے ملاقات کرنے کے لیے راستوں پر کھڑے ہو جاتے تھے۔

چند ماہ بعد جب وہ سوانح حیات برطانیہ سے نکل کر امریکا تک پہنچی تو شائقین وہاں سے بھی آنے لگے۔ چنانچہ برونٹے ان سے خندہ پیشانی سے ملتا تھا اور اس نے کبھی اپنے داماد کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ ایک ادبی جائزے کے مطابق ہاورتھ دنیا کی ایسی جگہوں میں شامل ہے جہاں ادب کے پرستاروں نے کافی دورے کیے۔

شارلٹ کے انتقال کے بعد اس کے والد کا انتقال 1861ء میں ہوا۔ انتقال کے وقت ان کی عمر 84 برس تھی۔ انتقال کے وقت ان کا داماد (شارلٹ کا شوہر آرتھر بل نکولس) ان کے قریب تھا۔

برونٹے بہنیں ناول نویس تھیں، شاعرہ تھیں اور عورتوں کے حقوق کی علم بردار۔ وہ ان کی آزادی اور معاشرے میں ان کے مقام کے لیے سرگرداں تھیں۔ عورتوں کی بے بسی اور بے چارگی کو انہوں نے اپنی تحریروں کا موضوع بنایا۔ وہ بہت باہمت تھیں۔ زندگی نے ان کے بہت سے امتحانات لیے مگر ان کے قدم نہ ڈگمگائے۔ وہ مصیبتوں اور آلام کے سامنے سینہ سپر رہیں۔ انہوں نے آخری وقت تک ہتھیار نہیں ڈالے۔ چنانچہ ادبی دنیا میں انہیں بلند مقام حاصل ہے۔ وہ حقیقت میں 3 باکمال بہنیں ہیں۔

ان کی موت کے بعد حکومت برطانیہ نے ان کے ہاورتھ والے مکان کو میوزیم کا درجہ دے دیا ہے اور ادب کے شائقین اسے دیکھنے کے لیے اب تک آتے ہیں۔ برونٹے بہنوں کی یاد میں ان کے پرستاروں نے ایک سوسائٹی قائم کی، جو ان کے مسودات اور یادگاری چیزوں کو سنبھالتی ہے۔ اس سوسائٹی کی شاخیں آسٹریلیا، کینیڈا، فرانس، آئرلینڈ، جنوبی افریقہ اور امریکا میں ہیں۔

مشہور مصنفہ ورجینیا وولف نے 1904ء میں ہاورتھ کا دورہ کیا اور برونٹے بہنوں کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے ایک مضمون بھی لکھا۔ اس مضمون کا ایک پیراگراف کچھ یوں تھا کہ ہاورتھ، برونٹے بہنوں کی نمائندگی کرتا ہے اور برونٹے بہنیں ہاورتھ کی نمائندگی کرتی ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے اس طرح سے لازم و ملزوم ہیں جیسے مرغی اور اس کا ڈربا!

کرٹس برن ہارڈ نے 1946ء میں 'ڈیووشن' کی فلم بنائی جو برونٹے بہنوں کی سوانح حیات پر مبنی تھی۔ جس میں ایڈا لیپنو نے ایملی اور اولیویا ہاویلینڈ نے شارلٹ برونٹے کا کردار ادا کیا۔

1979ء میں فرانس میں بھی ایک فلم بنائی گئی جس میں ازابیل ایڈجانی نے ایملی اور میری فرانس نے شارلٹ کا کردار ادا کیا۔

ایملی کے ناول "وودرنگ ہائٹس" پر اسی نام سے تین بار مغنیہ ڈرامہ (اوپیرا) لکھا گیا جسے اوپیرا کے لیے برنارڈ ہرمین نے 1943ء اور 1951ء کے درمیان تحریر کیا۔ وہ اوپیرا بے حد مقبول ہوا اور اسے کئی بار ناظرین کی تفنن طبع کے لیے پیش کیا گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نوبیل انعام یافتہ مسلمان

عقیل عباس جعفری

دنیا بھر میں سب سے بڑا مگر متنازع اعزاز کہلانے والا نوبیل ایوارڈ 1901ء سے جاری ہے لیکن مسلمانوں نے اب تک گنتی کے ایوارڈ حاصل کیے۔ یہ ایک لمحۂ فکریہ ہے۔ کیا مسلمانوں میں اہل علم و دانش کم ہوتے جارہے ہیں؟ یا پھر ہم تعصب کا شکار ہیں۔

ایک فکر انگیز مختصر مگر جامع تحریر

دنیا بھر میں صاحبانِ علم و دانش کی پذیرائی کے لیے جتنے انعامات بھی دیے جاتے ہیں ان میں نوبیل انعام سب سے زیادہ باتوقیر اور اعلیٰ ممتاز انعام سمجھا جاتا ہے۔

اس انعام کا آغاز 1901ء میں اس انعام کے بانی الفریڈ نوبیل کی پانچویں برسی سے ہوا تھا۔ الفریڈ نوبل 21 اکتوبر 1833ء کو سویڈن کے شہر اسٹاک ہوم میں پیدا ہوا تھا۔ 1867ء میں اس نے ڈائنامیٹ ایجاد کیا اور اس کی بدولت بے پناہ دولت کمائی۔ دولت مند ہونے کے باوجود اس کی زندگی بے حد سادہ تھی۔ اس نے شادی بھی نہیں کی تھی اس لیے اس نے مرنے سے قبل سوچنا شروع کیا کہ اپنی دولت کو کیسے خرچ کیا جائے کہ بنی نوع انسان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ ہوسکے۔ چنانچہ اس نے اپنی موت سے کوئی ایک برس پہلے 27 نومبر 1895ء کو اپنا وصیت نامہ تحریر کیا جس میں اس نے لکھا کہ اس کی کل جائیداد سے ایک وقف قائم کیا جائے جس سے حاصل کی گئی آمدنی سے ہر سال دنیا میں امن، ادب، طبیعات، کیمیا اور طب میں کارہائے نمایاں انجام دینے والے افراد میں انعامات تقسیم کیے جائیں۔ 10 دسمبر 1896ء کو الفریڈ نوبیل وفات پا گیا اور وصیت کے مطابق اس کی جائیداد سے حاصل ہونے والی تمام رقم 89 لاکھ 60 ہزار ڈالر سے ایک وقف قائم کیا گیا اور ہر سال اس کے منافع سے انعامات تقسیم کیے جانے لگے۔

1969ء میں بینک آف سویڈن نے ان انعامات میں معاشیات کے انعام کا بھی اضافہ کردیا اور یوں انعامات کے شعبے چھ تک جا پہنچے۔ اب اس انعام کے قیام کو 114 برس گزر چکے ہیں۔ ان 114 برسوں میں ماسوائے چند برسوں کے جب پہلی اور دوسری جنگ عظیم کے باعث یہ انعامات تقسیم نہیں ہوسکے ان انعامات کی تقسیم کا سلسلہ آج بھی جاری ہے اور ہر سال اکتوبر کے مہینے میں ان انعامات کا اعلان دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ان 114 برس میں اب تک 567 انعامات تقسیم کیے جا چکے ہیں۔ جو مجموعی طور پر 864 افراد اور 25 اداروں میں تقسیم ہوئے ہیں۔ ان 864 افراد میں چار افراد اور ان 25 اداروں میں تین ادارے ایسے بھی ہیں جنہوں نے یہ اعزاز دو یا دو سے زیادہ مرتبہ حاصل کیا ہے۔

ان انعام یافتگان کی فہرست پر نظر ڈالیں تو اس میں عالم اسلام سے تعلق رکھنے والی محض گیارہ شخصیات کے نام نظر آتے ہیں۔ ان میں سے بھی ایک شخصیت ڈاکٹر عبدالسلام کی ہے جو پاکستان کے شہری تھے لیکن ان کا تعلق احمدی مسلک سے تھا۔ لہٰذا یہ فہرست مسلمانوں کی حد تک صرف دس افراد تک محدود ہو جاتی ہے۔

ان شخصیات کو ان کے شعبوں کے حوالے سے تقسیم کیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ عالم اسلام سے تعلق رکھنے والے افراد نے سب سے زیادہ نوبل انعامات امن کے شعبے میں حاصل کیے ہیں جن کی تعداد سات ہے۔ اس کے بعد ادب کا شعبہ ہے۔ جس میں دو ادیب اس انعام کے مستحق قرار پائے ہیں۔ ایک سائنسدان نے کیمسٹری میں نوبل انعام حاصل کیا ہے جب کہ ایک سائنسدان طبیعات کے شعبے میں اس انعام کے مستحق ٹھہرے ہیں۔ آئیے ان سے ملاقات کریں۔

انور السادات

مصر کے سابق صدر انور السادات نوبل انعام حاصل کرنے والی مسلمان شخصیت تھے۔ انہوں نے یہ انعام

انور سادات

1978ء میں اسرائیل کے وزیر اعظم مناخم بیگن کی معیت میں حاصل کیا۔

انور السادات 25 دسمبر 1918ء کو پیدا ہوئے تھے۔ جمال عبدالناصر کی وفات کے بعد وہ ملک کے صدر بنے۔ 1973ء میں انہوں نے اسرائیل کے خلاف جنگ میں ملک کی قیادت کی۔ 1977ء میں سادات نے اسرائیل کا پہلا دورہ کیا۔ وہ یہ دورہ کرنے والے پہلے عرب سربراہ مملکت تھے۔ انہوں نے اسرائیل کے وزیر مناخم بیگن کے ساتھ قیام امن کے لیے مذاکرات کیے اور اسرائیلی پارلیمنٹ سے خطاب بھی کیا۔ ان کی کوششوں کے نتیجے میں 1978ء میں کیمپ ڈیوڈ سمجھوتے پر دستخط ہوئے اور یوں عرب اسرائیل تنازعات کے مستقل حل کی تلاش کی کوششوں کا آغاز ہوا۔ یہی وہ معاہدہ تھا جس پر دستخط کرنے کی وجہ سے انور السادات اور مناخم بیگن کو 1978ء کے امن کے نوبل انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ انور السادات کا یہ اقدام جہاں دنیا بھر میں سراہا گیا وہیں عرب دنیا میں شدید تنقید کا باعث بھی بنا اور اسی اقدام کی وجہ سے مصری فوجیوں کے ایک گروپ نے 6 اکتوبر 1981ء کو ایک فوجی پریڈ کے دوران انور السادات کو قتل کر دیا۔

ڈاکٹر عبدالسلام

ڈاکٹر عبدالسلام 29 جنوری 1926ء کو موضع سنتوک داس ضلع ساہیوال میں پیدا ہوئے تھے۔ جھنگ سے ابتدائی تعلیم حاصل کرنے کے بعد انہوں نے گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم ایس سی کیا۔ ایم ایس سی میں اول آنے پر انہیں کیمبرج یونیورسٹی سے اعلیٰ تعلیم کے لیے اسکالر شپ مل گیا چنانچہ 1946ء میں وہ کیمبرج چلے گئے جہاں سے انہوں نے نظری طبیعات میں پی ایچ ڈی کیا۔ 1951ء میں وہ وطن واپس آئے اور گورنمنٹ کالج لاہور اور پھر پنجاب یونیورسٹی میں تدریس کے فرائض انجام دینے لگے۔ 1954ء میں وہ دوبارہ انگلستان چلے گئے وہاں بھی وہ تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے۔ 1964ء میں ڈاکٹر صاحب نے اٹلی کے شہر ٹریسٹ میں انٹرنیشنل سینٹر برائے نظری طبیعات کی بنیاد ڈالی۔ 1979ء میں انہیں طبیعات کا نوبل انعام عطا کیا گیا۔ وہ یہ اعزاز حاصل کرنے والے پہلے پاکستانی تھے۔ حکومت پاکستان نے انہیں صدارتی تمغہ برائے حسن کارکردگی، ستارۂ امتیاز اور نشان امتیاز کے اعزازات عطا کیے تھے انہیں دنیا کی 36 یونیورسٹیوں نے ڈاکٹریٹ کی اعزازی ڈگریاں عطا کی تھیں اس کے علاوہ انہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

عبدالسلام

22 ممالک نے اپنے اعلیٰ اعزازات سے نوازا تھا، جن میں اردن کا نشان استقلال، وینزویلا کا نشان اندرے بیلو، اٹلی کا نشان میرٹ، ہاپکنز پرائز، ایٹم برائے امن، میکسویل میڈل، ایٹم پرائز برائے امن، گتھیری میڈل، آئن اسٹائن میڈل اور لومن سوف میڈل سرفہرست ہیں۔ ڈاکٹر عبدالسلام نے نظری طبعیات اور تیسری دنیا کی تعلیمی اور سائنسی مسائل کے حوالے سے 300 سے زیادہ مقالات تحریر کیے جن میں سے چند کتابی مجموعوں کی صورت میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔ 21 نومبر 1996ء کو ڈاکٹر عبدالسلام لندن میں انتقال کر گئے۔ وہ ربوہ میں آسودہ خاک ہیں۔

نجیب محفوظ

مصر سے تعلق رکھنے والے نجیب محفوظ پہلے عرب مصنف تھے جن کو ادب کا نوبل انعام ملا۔ وہ 11 دسمبر 1911ء کو قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ نجیب محفوظ نے سترہ سال کی عمر میں لکھنا شروع کیا لیکن جب ان کی پہلی تصنیف شائع ہوئی تو اس وقت ان کی عمر اڑتیس سال تھی۔ 1988ء میں ان کو ادب کا نوبل انعام دیا گیا۔

نجیب محفوظ کہا کرتے تھے کہ ایک مصنف کا کام ان حالات کی نقشہ کشی کرنا ہوتا ہے جن میں وہ رہتا ہے اور اگر حالات تبدیل ہو جاتے ہیں تو مصنف بھی تبدیل ہو جاتے ہیں۔ نجیب محفوظ کے ناولوں میں قاہرہ کی زندگی کی نقشہ کشی کی گئی ہے۔ ابتدائی سالوں میں نجیب محفوظ نے حافظ نجیب، طہٰ حسین اور سلامہ موسیٰ کو پڑھا اور وہ ان سے متاثر بھی ہوئے۔

نجیب محفوظ نے کم از کم پچاس کے قریب ناول اور سینکڑوں کہانیاں اور دو سو سے زیادہ مضامین تحریر کیے لیکن ان ناولوں اور مضامین کی تفصیل کے لیے ایک الگ دفتر درکار ہے۔ کچھ سال پہلے ان کی ایک کلیات پانچ جلدوں میں شائع ہوئی جو تین ہزار صفحات پر مشتمل ہے اور یہ ان کا نصف کام بھی نہیں ہے۔

نجیب محفوظ کی زندگی تضادات کا مجموعہ رہی۔ وہ سرکاری ملازم رہا اور اس پر سرکار کا عتاب بھی وقتاً فوقتاً نازل ہوتا رہا۔ وہ ایک معتدل مزاج مسلمان تھا۔ اپنے ناول "گلی کے بچے" کو وہ

نجیب محفوظ

ایک مذہبی ناول کہتا تھا لیکن اسی ناول کے حوالے سے اس پر واجب القتل ہونے کا فتویٰ بھی دیا گیا۔ یہ اسی فتوے کا نتیجہ تھا کہ 82 سال کی عمر میں اس پر قاتلانہ حملہ ہوا۔ اس حملے میں وہ بچ تو گیا لیکن اس کا سیدھا ہاتھ ناکارہ ہو گیا اور لکھنا اس کے لیے ممکن نہیں رہا۔ پھر بھی وہ اپنے خیالات کے اظہار سے باز نہیں آیا اور بول کر لکھواتا رہا۔ نجیب محفوظ کا انتقال 30 اگست 2006ء کو ہوا۔

یاسر عرفات

نوبل انعام حاصل کرنے والی تیسری مسلمان شخصیت یاسر عرفات کی تھی۔ 24 اگست 1929ء کو قاہرہ کے فلسطینی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

یاسر عرفات

گھرانے میں پیدا ہونے والے یاسر عرفات کی زندگی جدوجہد سے عبارت رہی۔ کبھی وہ دہشت گرد کہلائے۔ کبھی انہیں امن کے نوبل انعام سے نوازا گیا۔ کبھی انہیں فلسطینی کاز کا دشمن قرار دیا گیا اور کبھی وہ فلسطینیوں کے نجات دہندہ کہلائے۔ سات بہن بھائیوں میں یاسر عرفات کا چھٹا نمبر تھا۔ ان کا پورا نام محمد یاسر عبدالرحمان عبدالرؤف عرفات القدوہ الحسینی تھا۔ کنگ فواد یونیورسٹی سے سول انجینئرنگ میں گریجویشن کی۔ آزاد فلسطین کے لیے ان کی جدوجہد کی ابتدا 1948ء میں ہوئی۔ یاسر عرفات کو ان کی جدوجہد کی بنا پر نوبل پرائز بھی دیا گیا۔ وہ پی ایل او کے چیئرمین رہے۔ یاسر عرفات فلسطینی نیشنل اتھارٹی کے صدر بھی مقرر ہوئے۔ انہوں نے اپنی سیاسی جماعت الفتح کی انیس سو انسٹھ میں بنیاد رکھی۔ یاسر عرفات نے اپنی زندگی کا بیشتر وقت اسرائیل کے خلاف جدوجہد میں گزارا۔ یاسر عرفات تحریک آزادی فلسطین کے وہ رہنما ہیں کہ جنہوں نے فلسطین پر اسرائیل کے غاصبانہ قبضے کے خلاف مسلح جدوجہد شروع کی اور عالمی صیہونی تحریک پر ایسی کاری ضرب لگائی کہ صرف خطے میں ہی نہیں بلکہ پورے عالم اسلام میں الفتح اور یاسر عرفات کی جدوجہد کے چرچے ہونے لگے۔ یاسر عرفات کی تحریک 1960ء کی دہائی میں ہمسایہ عرب ممالک سے اسرائیل کے خلاف جدوجہد کرتی رہی۔ ان کی آزادی کی تحریک کو کئی پڑوسی ممالک میں فوجی آپریشنز کا بھی سامنا رہا۔ انیس سو نوے میں یاسر عرفات نے فلسطین کی رہائشی عیسائی سوہا نامی عیسائی خاتون سے شادی کی۔ یاسر عرفات کی جدوجہد آزادی میں کئی موڑ آئے۔ انہوں نے اپنی تحریک کی کامیابی کے لئے پوری دنیا کے دورے بھی کیے اور اسرائیل کو اس کی ہٹ دھرمی سے ہٹانے کے لیے سفارت کاری کا بھی سہارا لیا۔ لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب اسرائیل کو تسلیم نہ کرنے والے یاسر عرفات کی سوچ بدل گئی۔ فلسطین میں دو ریاستوں کی بات کرنے پر بہت سے لوگ ان کے خلاف ہوگئے۔ تاہم وہ اسرائیل اور امریکا کے ساتھ مذاکرات کے نہ ختم ہونے والے سلسلے میں شامل رہے، یہ ان کی کوششیں تھیں، جس کے جواب میں انہیں امن کے نوبل انعام سے نوازا گیا اور انیس سو ترانوے کے اوسلو معاہدے کے تحت فلسطین میں یاسر عرفات کی حکومت قائم ہوگئی۔ مگر پھر اسرائیل سے تعلقات میں بگاڑ آنا شروع ہوگیا۔ یہاں تک کہ اسرائیل نے رملہ میں انہیں ان کے گھر میں نظربند کر دیا۔ 2004ء میں وہ ایک پراسرار بیماری میں مبتلا ہوگئے، علاج کے لیے انہیں پیرس لے جایا گیا، جہاں وہ 11 نومبر 2004ء کو انتقال کر گئے۔ یاسر عرفات پاکستان سے بہت محبت رکھتے تھے۔ اور پہلی اسلامی سربراہی کانفرنس میں بھی شرکت کی۔ وہ امت مسلمہ کی وحدت پر یقین رکھتے تھے۔ اس کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے۔

احمد حسن زویل

احمد حسن زویل نوبل انعام حاصل کرنے والی عالم اسلام کی پانچویں شخصیت تھے۔ ان کا تعلق مصر سے تھا۔ جہاں وہ 26

احمد حسن زویل

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

فروری 1946ء کو پیدا ہوئے۔ انہوں نے مصر کی اسکندریہ یونیورسٹی سے ایم ایس سی کی ڈگری حاصل کی اور پھر امریکا کی پنسلوانیا یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کیا۔ وہ امریکا کی نیشنل اکیڈمی آف سائنس کے منتخب رکن بھی رہے اور کیلی فورنیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی سے بھی وابستہ رہے۔ انہیں 1999ء میں فیمٹو سکنڈ طیف نمائی طریقہ استعمال کرتے ہوئے کیمیائی تعاملات کی عبوری حالتوں کے مطالعے پر کیمیا کے نوبیل انعام سے نوازا گیا۔ اپریل 2009ء میں امریکا کے صدر بارک اوباما نے احمد زویل کو پریذیڈنٹس کونسل آف ایڈوائزرز آن سائنس اینڈ ٹیکنالوجی میں اپنا مشیر مقرر کیا اور اسی برس نومبر میں انہیں مشرقِ وسطیٰ میں امریکا کے پہلے سائنسی سفیر کے طور پر تعینات کیا۔ 2011ء میں احمد زویل نے مصر میں زویل سٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی کے نام سے ایک اعلیٰ تعلیمی ادارہ قائم کیا جو مصر میں سائنسی نشاۃ الثانیہ کا ایک جزو مرکز بن چکا ہے۔

شیریں عبادی

2003ء میں امن کا نوبیل انعام ایران سے تعلق رکھنے والی ماہر قانون اور انسانی حقوق کی علم بردار خاتون شیریں عبادی کو دیا گیا۔ وہ عالم اسلام سے تعلق رکھنے والی پہلی مسلمان خاتون تھیں جنہیں یہ اعزاز عطا ہوا تھا۔ شیریں عبادی 21 جون 1947ء کو پیدا ہوئیں۔ 1969ء میں اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد انہوں نے 1970ء میں بطور جج اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔

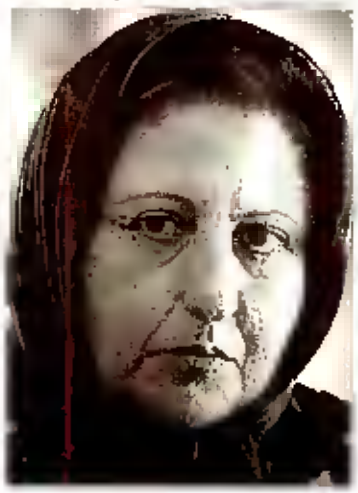

شیریں عبادی

1975ء میں وہ کسی قانون ساز ادارے کی سربراہی سنبھالنے والی پہلی ایرانی خاتون تھیں۔ تاہم 1979ء میں جب ایران میں اسلامی انقلاب برپا ہوا تو عدلیہ میں خواتین کی شمولیت اور سربراہی پر پابندی لگا دی گئی اور یوں شیریں عبادی اپنے عہدے سے معزول کر دی گئیں۔ تب شیریں عبادی نے تدریس کا شعبہ اختیار کیا اور ساتھ ہی ساتھ خواتین اور بچوں کے حقوق میں بچوں کے جسمانی تشدد کے خلاف تحریک کا آغاز کیا اسی تحریک کا نتیجہ تھا کہ ایرانی پارلیمنٹ میں ایک بل پاس کیا گیا جس کا مسودہ شیریں عبادی نے تحریر کیا تھا۔ 2003ء میں جب انہیں امن کے نوبیل انعام کا مستحق قرار دیا گیا تو عام الناس نے اس کا خیر مقدم کیا لیکن بہت سے عناصر نے اسے ایک سیاسی فیصلہ قرار دیا۔

محمد البرادعی

2005ء میں امن کا نوبیل انعام انٹرنیشنل انرجی ایجنسی اور مصر کے محمد البرادعی نے مشترکہ طور پر حاصل کیا۔ محمد البرادعی اس ادارے کے ڈائریکٹر جنرل کے عہدے پر فائز تھے اور انٹرنیشنل لا ایسوسی ایشن اور امریکن سوسائٹی آف انٹرنیشنل لا

محمد البرادعی

کے رکن بھی رہے تھے۔ محمد البرادعی 17 جون 1942ء کو قاہرہ میں پیدا ہوئے۔ 1962ء میں انہوں نے قاہرہ یونیورسٹی سے قانون کے شعبے میں بیچلرز ڈگری اور 1974ء میں یونیورسٹی اسکول آف لا سے ڈاکٹریٹ کی سند حاصل کی۔ وہ مصر کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں؟ ۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

WWW.PAKSOCIETY.COM

وزارت خارجہ سے وابستہ رہے اور انہوں نے اقوام متحدہ میں بھی خدمات انجام دیں۔ محمد البرادعی 1980ء میں مصر کی وزارت خارجہ سے مستعفی ہو کر اقوام متحدہ سے براہ راست منسلک ہو گئے جہاں انہیں اقوام متحدہ کی انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی میں خدمات انجام دینے کا موقع ملا۔ یکم دسمبر 1997ء کو دو ترقی کرنے کرتے اس ادارے کے ڈائریکٹر جنرل کے منصب پر فائز ہوئے۔ اس ادارے نے دنیا میں ایٹمی اسلحے کی تخفیف کے لیے نمایاں خدمات انجام دیں۔ انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی اور محمد البرادعی کی ان خدمات کے اعتراف میں 2005ء میں انہیں امن کے نوبل انعام کا مستحق قرار دیا گیا۔ محمد البرادعی، تین مرتبہ انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی کے سربراہ مقرر ہوئے۔ اس عہدے سے سبکدوشی کے بعد انہوں نے مصر کی ملکی سیاست میں حصہ لینا شروع کیا۔ حسنی مبارک کی معزولی کے بعد وہ مصر کی صدارت کے مضبوط امیدواروں میں شامل تھے۔ تاہم انہیں یہ عہدہ حاصل نہ ہو سکا اور کچھ عرصہ بعد وہ ایک مختصر مدت کے لیے مصر کے نائب صدر کے عہدے پر فائز رہے۔ محمد البرادعی کئی کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔

> نوبل انعامات کے قیام سے لے کر اب تک 2006ء وہ واحد سال ہے جب عالم اسلام سے تعلق رکھنے والے دو افراد دو مختلف شعبوں میں نوبل انعام کے مستحق قرار پائے۔ امن کا نوبل انعام پانے والے محمد یونس کا تعلق بنگلہ دیش سے تھا اور ادب کا نوبل انعام حاصل کرنے والے ادیب اورحان پاموک ترکی کے باشندے تھے۔

محمد یونس

28 جون 1940ء کو چاٹگام میں جنم لینے والے محمد یونس ابتدا ہی سے ایک شاندار تعلیمی کیریئر کے حامل رہے ہیں۔ ڈھاکا یونیورسٹی سے تعلیم کی تکمیل کے بعد انہیں فل برائٹ اسکالرشپ کے لیے منتخب کر لیا گیا اور یوں انہوں نے امریکا کی وینڈر بلٹ یونیورسٹی سے 1931ء میں پی ایچ ڈی کی سند حاصل کر لی۔ وہ کچھ دن امریکا میں تدریس کے شعبے سے وابستہ رہے لیکن بنگلہ دیش کے قیام کے بعد وہ وطن واپس لوٹ آئے اور چٹاگانگ یونیورسٹی کے شعبہ معاشیات کے سربراہ بن گئے۔

1976ء میں انہوں نے اپنے طالب علموں کے ساتھ اپنے قریب ترین گاؤں کا رخ کیا۔ وہاں ان کی ملاقات چند

محمد یونس

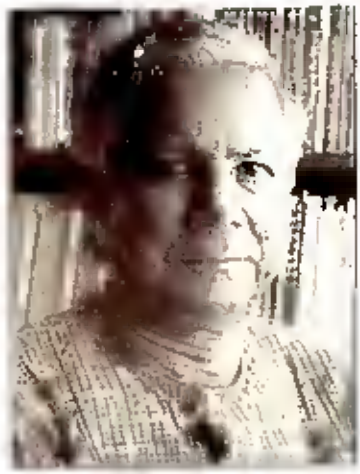

ایسی عورتوں سے ہوئی جو کسی نہ کسی ہنر سے آگاہ تھیں مگر ان کے بچے فاقے کر رہے تھے اور ان کے پاس اتنی بھی رقم نہیں تھی کہ وہ اپنے ہنر کو کام میں لا کر کوئی کاروبار کر سکیں۔ تبھی سے محمد یونس کے دل میں ان مجبور عورتوں کو قرض دینے کا خیال ابھرا۔ اس نے ان عورتوں کو اپنی جیب سے ادھار دیا۔ ان عورتوں نے جلد ہی اسے کاروبار میں لگایا اور محمد یونس کی رقم کو تھوڑا تھوڑا کر کے واپس کر دیا۔ محمد یونس نے کئی بینکوں کو اس نوع کی قرض اسکیمیں شروع کرنے کا مشورہ دیا لیکن سب نے اس کا مذاق اڑایا۔ محمد یونس نے ہمت نہیں ہاری اور اس نے تین برس میں اپنی جیب سے پانچ سو عورتوں کو چھوٹا موٹا کاروبار کرنے کے لیے رقم ادھار دی جو آہستہ آہستہ نہ صرف اپنے پیروں پر کھڑی ہو گئیں بلکہ انہوں نے محمد یونس کی رقم بھی ایک معمولی سے سود کے ساتھ واپس کر دی۔ 1979ء میں محمد یونس نے گرامین بینک کے نام سے غریب افراد کو قرض دینے والے ایک بینک کا افتتاح کیا جس کی شاخ آج بنگلہ دیش کے اٹھاون دیہاتوں میں قائم ہیں اور اس سے 53 لاکھ غریب عورتیں قرض لے چکی ہیں اور واپس کر چکی ہیں۔ قرض کی رقم پانچ ارب دس کروڑ ڈالر ہے۔ گرامین بینک سے قرض لینے والوں کے اہل خانہ کا بھی حساب لگایا جائے تو ایک محتاط اندازے کے مطابق اب تک بنگلہ دیش کے سوا پانچ کروڑ افراد محمد یونس کے بینک کے توسط سے اپنی قسمت بدل چکے ہیں۔ محمد یونس کا یہ منصوبہ اتنا کامیاب ہوا کہ آج دنیا کے بہت سے ملک گرامین بینک کی طرز پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بینکنگ شروع کر چکے ہیں۔ 2006ء میں عوام کی ایک بڑی تعداد کی قسمت بدلنے پر محمد یونس کو امن کا نوبل انعام عطا کیا گیا لیکن بعض ناقدین کے نزدیک سے محمد یونس کی زندگی کا ایک افسوس ناک باب بھی شروع ہو گیا اور ان کے اس اعلان کے بعد کہ وہ ملک کی تقدیر بدلنے کے لیے سیاست میں حصہ لینے کے بارے میں سوچ رہے ہیں ان کے خلاف حکومتی کارروائیوں کا آغاز ہو گیا۔ 2012ء میں انہیں جبری طور پر گرامین بینک کی سربراہی سے برطرف کر دیا گیا اور اس کا جواز یہ بتایا گیا کہ محمد یونس کی عمر 70 برس سے زیادہ ہو چکی ہے اور وہ قانونی طور پر اس عہدے پر فائز نہیں رہ سکتے۔ اس سے قبل ان پر بینک کی رقم غیر قانونی طور پر استعمال کرنے کے الزامات بھی عائد کیے گئے تھے۔ محمد یونس نے یہ الزامات مسترد کر دیے تھے اور اس سے بدعنوانی کی تحقیقات کے نتیجے میں محمد یونس اور ان کا بینک دونوں بے قصور پائے گئے تھے۔ محمد یونس کی سوانح عمری Banker to the poor کے نام سے شائع ہو چکی ہے۔

اورحان پاموک

ترکی سے تعلق رکھنے والے اورحان پاموک مصر کے نجیب محفوظ کے بعد عالم اسلام کے وہ دوسرے ادیب ہیں جنہیں ادب کے شعبے میں نوبل انعام سے سرفراز کیا گیا ہے۔ اورحان پاموک ترکی کے ایک متمول صنعت کار گھرانے میں 7 جون 1952ء کو پیدا ہوئے تھے۔ اورحان پاموک نے آرکیٹیکچر

اورحان پاموک

کی تعلیم حاصل کی مگر ان کا میلان طبع صحافت کی طرف تھا۔ چنانچہ انہوں نے صحافت کے شعبے کو اپنایا اور خود کو ایک صاحب قلم کے طور پر متعارف کروایا۔ اورحان پاموک کا تعلق ایک مسلمان گھرانے سے ہے لیکن وہ اسلام کے نام پر ہونے والے معرکوں پر نکتہ چینی کرنے کی شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے ایک مرتبہ اپنی حکومت پر بھی اس بات پر تنقید کی کہ ترک حکومت نے پہلی جنگ عظیم کے دوران آرمینیا کے دس لاکھ عیسائی باشندوں اور بعد ازاں جنوب مشرقی صوبوں میں آباد تیس ہزار کرد باشندوں کو قتل کرنے کے اقدام پر بھی افسوس یا شرمندگی کا اظہار نہیں کیا۔ ترکی حکومت نے پاموک کے اس بیان پر ان کے خلاف مقدمہ چلانے کا اعلان کیا لیکن عوامی دباؤ کے باعث وہ مقدمہ کبھی چلایا نہیں گیا۔ اورحان پاموک کے ناول ترکی بالخصوص استنبول کے شہری ماحول کے اردگرد گھومتے ہیں۔ ان کی کتابوں کے پچاس سے زیادہ زبانوں میں تراجم ہو چکے ہیں

دو انعام یافتگان نے انعام لینے سے انکار کر دیا

☆...... جین پال سارتر کو 1964ء کا ادب میں نوبل انعام دیا گیا لیکن انہوں نے لینے سے انکار کر دیا کیونکہ انہوں نے تمام آفیشل انعام نہ لینے کا عہد کر لیا تھا۔

☆...... 1973ء میں امریکی سیکریٹری آف اسٹیٹ ہنری کسنجر اور ویت نام کے لی ڈک تھو کو مشترکہ نوبل انعام دینے کا اعلان ہوا مگر لی ڈک تھو نے انعام لینے سے انکار کر دیا۔

حکومتی دباؤ میں آکر انعام نہ لینے والے چار نوبل انعام یافتگان

☆...... رچرڈ کوہن

☆...... اڈولف بیوٹنٹ

☆...... گرہارڈ ڈومک

دوسری جنگ عظیم کی وجہ سے ان تینوں کو اڈولف ہٹلر نے انعام نہ لینے کا حکم دیا تھا۔

☆...... بورس پاسترناک کو 1958ء میں سوویت روس کی حکومت نے انعام نہ لینے کا حکم دیا تھا۔ ان چاروں میں سے تین لوگوں نے بعد میں تمغے اور اسناد لیے مگر انعامی رقم انہیں نہیں ملی۔

قید کے دوران انعام حاصل کرنے والے

☆...... جرمن صحافی کارل وان اوسیتزکی۔

☆...... برما کی سیاستدان آنگ سان سوچی۔

☆...... چین کی ناجی کارکن لی ژیاؤ بو۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جن میں اردو بھی شامل ہے۔ اورحان پاموک نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ میں جب لکھنے لگتا ہوں تو مکمل طور پر اپنی تحریر میں گم ہو جاتا ہوں۔ گویا اسی کا حصہ بن جاتا ہوں۔ جو لوگ میری زندگی کو دیکھنا چاہتے ہیں وہ میرے ناولوں کا مطالعہ کر لیں۔

توکل کرمان

توکل کرمان عالم اسلام کی دوسری خاتون ہیں جنہیں نوبل انعام سے نوازا گیا۔ انہیں یہ انعام 2011ء میں امن کے شعبے میں دیا گیا۔ توکل کرمان کا پورا نام توکل عبدالسلام خالد کرمان ہے۔ وہ یمن کے شہر مبک یاف میں 7 فروری 1979ء کو پیدا ہوئیں۔ ان کے والد عبدالسلام کرمان پیشے کے اعتبار سے وکیل اور سیاست دان تھے جنہوں نے علی عبداللہ صالح کی حکومت سے بطور قانونی امور کے وزیر استعفیٰ دیا اور ملک میں آمریت کے خلاف آواز اٹھائی جانے والی آوازوں کا حصہ بنے۔ توکل کرمان کے بھائی طارق کرمان شاعر ہیں۔ ان کی چھوٹی بہن صفا کرمان معروف چینل الجزیرہ کے لیے کام کرتی ہیں۔ توکل کرمان نے محمد اسمٰعیل سے شادی کی اور وہ 3 بچوں کی ماں ہیں۔ توکل کرمان نے یونیورسٹی آف سائنس اینڈ ٹیکنالوجی صنعاء سے کامرس میں ڈگری حاصل کی۔ انہیں کینیڈا کی لاء یونیورسٹی نے ڈاکٹریٹ کی ڈگری بھی دی تھی۔ 2010ء میں عوامی احتجاجی تحریک کے دوران ایک خاتون نے خنجر سے ان پر قاتلانہ حملہ کیا جس میں ان کی جان بچ گئی لیکن ان کے جذبے میں اضافہ ہو گیا۔ اس قاتلانہ حملے کے بعد ترکی کی حکومت نے انہیں اپنے ملک کی شہریت دینے کی پیش کش کی جسے توکل کرمان نے قبول کر لیا اور ترکی کی حکومت کی پیش کش کو قبول کرنے کی وجہ بتاتے ہوئے توکل نے کہا کہ ان کے آباؤ اجداد کا تعلق اناطولیہ سے ہے اور وہ ترکی کے شہر کرمان کے رہنے والے تھے۔ اسی بنیاد پر توکل کا خاندان اپنے نام کے ساتھ کرمان استعمال کرتا ہے۔ توکل جب ملک میں ہونے والے مظالم اور غیر انسانی سلوک کے کئی واقعات دیکھتی تو ان کا دل کڑھتا تھا۔ توکل نے سب سے پہلے آزاد پریس کے حق میں تحریک چلائی۔ توکل نے روائتی نقاب ختم کر کے اسکارف اوڑھنا شروع کیا۔ 2004ء میں ہونے والی ایک کانفرنس میں وہ پہلی مرتبہ اسکارف اوڑھ کر شامل ہوئیں اور ایک سوال کے جواب میں صحافیوں کو بتایا کہ حجاب پہننا یمن کی ثقافت ہے لیکن اسلام میں اس کی پابندی نہیں۔ اسلامی تقاضوں کے مطابق اسکارف لیا جا سکتا ہے جس میں کسی خاتون کے بالوں کی بجائے صرف اس کا چہرہ نظر آئے۔ اب وقت آ گیا ہے کہ ہم ثابت کریں کہ خواتین مردوں کے ساتھ شانہ بشانہ کام کرنے کی اہلیت رکھتی ہیں۔ یمن میں

توکل کرمان

خواتین اور لڑکیوں کی بجائے لڑکوں کو زیادہ حقوق اور مواقع فراہم کیے جانے کے خلاف بھی ان کی آواز اٹھتی تھی۔ توکل نے 17 سال سے کم عمر لڑکیوں کی شادیوں پر بھی پابندی کا مطالبہ کیا۔ ان کا یہ موقف خود ان کی جماعت کے موقف سے ٹکراتا تھا۔ توکل نے حکومتی کرپشن کو بھی اپنے احتجاج کا موضوع بنایا اور کرپشن کے ان کیسوں کی نشاندہی کی جن میں علی عبداللہ صالح کے حواریوں نے سادہ لوح دیہاتیوں کی زمین ہتھیا لی تھی۔ توکل کی جدوجہد کے اعتراف کے طور پر انہیں 2011ء میں امن کے نوبل پرائز سے نوازا گیا۔ وہ پہلی عرب اور دوسری مسلمان خاتون تھیں جن کے حصے میں یہ اعزاز آیا۔

ملالہ یوسف زئی

نوبل انعام حاصل کرنے والی پاکستان کی دوسری اور عالم اسلام کی کم عمر ترین شخصیت ملالہ یوسف زئی کی ہے۔ وہ 12 جولائی 1997ء کو خیبر پختون خوا کے ضلع سوات کے علاقے مینگورہ میں پیدا ہوئیں۔ یہ سن 2009ء کی بات ہے جب سوات کی وادی میں طالبان کا طوطی بولتا تھا۔ فوجی آپریشن سے پہلے حالات انتہائی کشیدہ تھے اور شدت پسند مذہبی راہنما مولانا فضل اللہ کے حامی مینگورہ وادی کے بیشتر علاقوں پر قابض تھے۔ لڑکیوں کی تعلیم پر بھی پابندی لگا دی گئی تھی۔ اس زمانے میں مینگورہ سے روزانہ گلا کٹی یا پھر بجلی کے کھمبوں یا درختوں پر لٹکی ہوئی لاشیں ملتی تھیں۔ طالبان کے خوف سے اس صورت حال

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پر میڈیا میں بھی کوئی بات نہیں کرسکتا تھا۔ حکومت طالبان کے سامنے بے بس نظر آرہی تھی اور یوں لگ رہا تھا کہ اس علاقے میں حکومت نام کی کوئی چیز نہیں رہ گئی۔ یہ طالبان کا مملکتی علاقہ ہے جہاں اب صرف ان کا حکم چلتا ہے۔ ایسے میں اچانک گل مکئی کے نام سے ایک آواز بلند ہوئی جس نے لڑکیوں کی تعلیم کا نعرہ بلند کیا۔ اس فرضی نام کے پیچھے چھپی ملالہ یوسف زئی نے طالبان کے زیرسایہ اپنی روزانہ کی زندگی پر جو ڈائری لکھی اس نے دلوں پر اثر کیا۔ ان حالات میں ملالہ یوسف زئی نے کم سنی ہونے کے باوجود بھی انتہائی جرأت کا مظاہرہ کیا اور بی بی سی اردو سروس کے لیے باقاعدگی سے ڈائری لکھنا شروع کی۔ اس ڈائری میں وہ سوات میں ہونے والے واقعات اور طالبان کے ظلم و ستم کی کہانیاں لکھا کرتی تھیں۔ اس ڈائری کو اتنی شہرت حاصل ہوئی کہ ملالہ یوسف زئی کی تحریریں مقامی اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ میں بھی باقاعدگی سے شائع ہونے لگیں۔

ملالہ پر میڈیا کے دو بین الاقوامی اداروں نے دستاویزی فلمیں بھی بنائیں جن میں انہوں نے کھل کر تعلیم پر پابندیوں کی بھرپور مخالفت کی۔ ملالہ یوسف زئی کی اس کاوش سے لڑکیوں میں بیداری شروع ہوئی۔ لوگوں نے اس پر بات کرنا شروع کر دی اور ایک بچی کے قلم نے طالبان کا مقابلہ کیا۔ ملالہ کی اس ہمت پر ہالینڈ کی بین الاقوامی تنظیم کڈز رائٹس کی طرف سے انٹرنیشنل چلڈرن پیس پرائز کے لیے نامزد کیا گیا۔ ملالہ کی یہ ساری "کارروائیاں" طالبان کو شدید ناگوار گزریں اور 9 اکتوبر 2012ء کو ملالہ کو اسکول جاتے ہوئے جان سے مارنے کی کوشش کی گئی۔ زندگی و موت کی جنگ لڑتی ملالہ کو علاج کی غرض سے انگلینڈ منتقل کروا دیا گیا جہاں وہ یہ بازی جیتنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کو گویا ایک نئی زندگی مل گئی۔ جس کا اس نے بھرپور فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔ اس کا ارادہ مزید پختہ ہو گیا اور وہ اپنی آواز دنیا بھر کے کونے کونے میں پہنچانے کے لئے مصروف ہو گئی۔ ملالہ نے پاکستان میں ہی نہیں بلکہ نائجیریا میں "بوکو حرام" (مغربی تعلیم حرام) کے نام سے منظم گروہ کی طرف سے لڑکیوں کے اغوا کے خلاف مہم بھی چلائی۔ اپنی کم عمری کے باوجود دنیا کو حیران کر گئی۔ عالمی برادری نے بھی اس کا بھرپور ساتھ دیا اور اس کی خدمات کو سراہنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ اس کے عزم و ہمت کے اعتراف میں اس کو اب تک 34 سے زیادہ عالمی اعزازات سے نوازا جا چکا ہے۔ کئی ایوارڈز تو ایسے ہیں جن کو حاصل کرنے والی ملالہ یوسف زئی سب سے کم عمر شخصیت ہے جن میں سب سے نمایاں نوبیل امن انعام ہے۔

کئی کئی بار انعام حاصل کرنے والی شخصیت

☆...... جے بارڈین طبیعات میں 1956ء اور 1972ء میں انعام حاصل کیا۔

☆...... مادام کیوری نے 1903ء میں طبیعات میں اور 1911ء میں علم کیمیا میں انعام حاصل کیا۔

☆...... لائنس پالنگ نے 1954ء میں علم کیمیا میں اور 1962ء میں امن کا انعام حاصل کیا۔

☆...... الف سانگر نے 1958ء میں علم کیمیا اور 1980ء میں بھی علم کیمیا کا انعام حاصل کیا۔

☆...... ICRC نے 1917، 1944، 1963 کا انعام برائے امن حاصل کیا۔

☆...... UNHCR نے امن کا انعام 1954ء اور 1981ء میں حاصل کیا۔

نوبیل انعام حاصل کرنے والے خاندان

میاں بیوی

☆...... میری کیوری اور پیرے کیوری

☆...... مے بریٹ موزر اور ایڈورڈ آئی موزر

☆...... آئرین جولیٹ کیوری اور فیڈریک جولیٹ

☆...... الوا میرڈال اور گنر میرڈال

☆...... گرٹی کوری اور کارل کوری

ماں بیٹی

☆...... میری کیوری اور آئرین جولیٹ کیوری

باپ بیٹی

☆...... آئرین جولیٹ کیوری اور پیرے کیوری

باپ بیٹا

☆...... ولیم برگ اور لارنس برگ

☆...... آرتھر کورن برگ اور روگر ڈی کورن برگ

☆...... نیلس بوہر اور آگی این بوہر

☆...... منے سیگبان اور کئی ایم سیگبان

☆...... ہانس وون ایولر چیلپن اور الف وون ایولر

☆...... جے جے تھامسن اور جارج پیجٹ تھامسن

بھائی بھائی

☆...... جان ٹن برگن اور نکولس ٹن برگن

سن 2011ء میں سوات میں طالبان کے زمانہ عروج میں لاغرف و خطر خواتین اور بچوں کے حقوق کے لئے جدوجہد

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ملالہ یوسف زئی

کرنے پر اس نے پاکستان کا پہلا "قومی اعزاز برائے امن" بھی جیتا۔ حکومت پاکستان نے اسے "ستارۂ جرأت" سے نوازا۔ 2013ء میں یونیورسٹی آف ایڈنبرا نے ملالہ کو اعزازی ڈگری دی۔ ملالہ کو اکتوبر 2013ء میں انٹرنیشنل چلڈرن پیس پرائز حاصل ہوا۔ لندن میں گلیمر ویمن آف دی ایئر کا اعزاز دیا گیا۔ اس کے علاوہ "پرائیڈ آف برٹین" ایوارڈ حاصل کیا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل نے ملالہ کی خدمات کو سراہتے ہوئے "ایمبیسڈر آف کانشنس" (سفیر برائے آگاہی) قرار دیا اور اسے ایوارڈ سے نوازا۔ اسے یورپی یونین کی جانب سے سخاروف ایوارڈ 2013ء دیا گیا۔ ملالہ یوسف زئی کو یورپ کے سب سے بڑے ایوارڈ سخاروف لینے کا اعزاز بھی حاصل ہوا اور دنیا کے انتہائی اہم ایوارڈ "گلوبل لیڈرشپ ایوارڈ" کا حق دار بھی ٹھہرایا گیا۔ ملالہ کو "مدر ٹریسا ایوارڈ برائے سماجی انصاف" دیا گیا اور فلاڈلفیا میں نیشنل کانسٹی ٹیوشن سینٹر کی طرف سے لبرٹی میڈل سے بھی نوازا گیا۔ ملالہ کا نام فارن پالیسی میگزین کی "سو عالمی مفکرین" کی فہرست میں بھی شامل کیا جا چکا ہے۔ ملالہ کی تصویر لندن کی نیشنل پورٹریٹ گیلری کی زینت بن چکی ہے۔ اس کی انگریزی زبان میں ایک کتاب بھی شائع ہو چکی ہے جس کا نام "میں ملالہ ہوں" ہے۔ 2013ء میں اقوام متحدہ نے ملالہ کے یوم پیدائش 12 جولائی کو "ورلڈ ملالہ ڈے" یا عالمی یوم ملالہ قرار دیا تھا۔ اس دن کا مقصد دنیا میں ہر بچے کے لیے تعلیم کے حصول کو ممکن بنانے کے لیے جدوجہد کرنا ہے۔ اس دن ملالہ یوسف زئی نے اقوام متحدہ میں تقریباً ایک سو ممالک سے آئے ہوئے ایک ہزار سے زائد مندوبین سے خطاب کیا۔ اس موقع پر برطانیہ کے سابق وزیراعظم اور دنیا بھر میں تعلیم کے سفیر گورڈن براؤن اور اقوام متحدہ کے جنرل سیکریٹری بان کی مون بھی موجود تھے۔ اس تقریب کو دنیا بھر میں لاکھوں افراد نے ٹی وی پر براہ راست دیکھا۔ ملالہ نے اپنی تقریر میں کہا کہ ملالہ ڈے صرف میرا دن نہیں۔ آج کا دن ہر اس لڑکی اور لڑکے کا دن ہے جس نے اپنی آواز اپنے حقوق کے لیے اٹھائی۔ ان کا کہنا تھا کہ میں ان کی آواز ہوں جن کی آواز کوئی نہیں سن رہا۔ اور جو پُرامن ماحول میں رہنے اور تعلیم کے حصول کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔ ملالہ کا کہنا تھا کہ وہ دنیا کے ان لاکھوں افراد میں سے ایک ہیں جو دہشت گردوں کا نشانہ بن کر زخمی ہوئے اور طالبان کا خیال تھا کہ ان کی گولی ہمیں خاموش کر دے گی لیکن ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے کہا کہ اس گولی سے کمزوری اور ناامیدی مر گئی جبکہ طاقت اور حوصلے کو نئی زندگی ملی۔ میں وہی ملالہ ہوں۔ میرے عزائم، امید اور حوصلہ وہی ہیں۔ ہمیں قلم اور کتاب کی اہمیت کا اندازہ بندوق دیکھ کر ہوتا ہے۔ شدت پسند تعلیم کی طاقت سے خوفزدہ تھے۔ وہ خواتین سے ڈرتے ہیں۔ وہ تبدیلی اور اس برابری سے خوفزدہ ہیں۔

ملالہ یوسف زئی پاکستان کی وہ بیٹی ہے جس پر انتہا پسندوں نے اپنے ہی وطن کی زمین تنگ کر دی اور اب وہ بیرون ملک قیام پذیر ہے۔ اس کے باوجود اس کے دل سے پاکستان کی محبت اور اہل پاکستان کا درد کم نہ ہو سکا۔ یہ محبت یقیناً یک طرفہ نہیں ہے۔ اہل پاکستان کے دل بھی اس کی محبت سے لبریز ہیں۔ اس پر جتنا بھی فخر کیا جائے وہ کم ہے کیونکہ اس نے پاکستان کا نام نوبل امن انعام سے ایسے وقت میں جوڑا ہے جب پاکستان دہشت گردی کے خلاف نبرد آزما ہے۔ بعض حلقے ملالہ کو نوبل انعام کا حقدار ٹھہرائے جانے پر بے جا تنقید بھی کر رہے ہیں، کوئی جو بھی کہے حقیقت یہی ہے کہ ملالہ نے دنیا پر ثابت کر دیا ہے کہ پاکستانی پُرامن لوگ ہیں اور ان کا پیغام بھی امن و آشتی ہے۔ اپنے آپ کو دو سال کی قید سے آزاد کر کے جو جدوجہد اس نے شروع کی وہ بے نظیر ہے۔ آج بہت سے پاکستانی لڑکیوں کے لیے ملالہ ایک مثال ہے۔ اس نے تمام پاکستانی عورت کو لڑنے کا حوصلہ بخشا ہے۔ اپنے حقوق کے لیے کھڑے ہونے کا درس دیا ہے۔ ایک نئی اُمید کی کرن دکھائی ہے۔ اپنی مدد آپ کا جذبہ جگایا ہے۔ ملالہ نے سب کو باور کرایا ہے کہ اگر دل میں چاہ ہو تو کٹھن سے کٹھن راستہ بھی آسان لگنے لگتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تلاش

حمان خان

پُراسراریت کی کوکھ سے کبھی کبھی ایسے واقعات جنم لے لیتے ہیں جن پر یقین کرنے کے لیے غور کرنا پڑتا ہے۔ یہ داستان بھی کچھ ایسی ہی ہے۔ وقت گزاری کے تمام عوامل موجود ہیں اور پُرلطف اندازِ تحریر بھی ہے۔

ایک محیرالعقول داستانِ سفر کا دوسرا اور آخری حصہ

میں نے ابھی تک جان کو بھی اپنے ساتھ گزرے ہوئے ان پُراسرار واقعات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔ اس کو تو بتانے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔

میں خیمے سے باہر آکر ٹہلنے لگا۔ میرے اعصاب چیخ رہے تھے۔ خیمے کے باہر برف بچھی ہوئی تھی۔ لیکن میرے وجود میں آگ دہک رہی تھی۔

بہت دیر بعد میں اپنے آپ پر قابو پا کر خیمے میں واپس آگیا۔ اب یہ احساس ہوتا جا رہا تھا کہ میرے ساتھ کچھ نہ کچھ ضرور ہونے والا ہے۔ یہ سارا سلسلہ یوں ہی نہیں سجایا گیا ہوگا۔ کوئی نہ کوئی اس کا جواز ضرور ہوگا۔ وقت کرتا ہے پرورش برسوں۔ حادثہ ایک دم نہیں ہوتا۔

یہ حادثہ بھی ایک دم نہیں ہوا تھا۔ اس کی پلاننگ شاید بہت پہلے ہو چکی تھی۔ شاید صدیوں پہلے۔

اتنے خواب کیا جا رہا تھا۔

خیمے میں کوپان اور جان ایک دوسرے سے گپ شپ میں مصروف تھے۔ جان کوپان کو ٹیلی ویژن والی کہانی سنا رہا تھا۔

کچھ دیر بعد ہمارے لیے کھانا لایا گیا۔ جو کے آٹے کی روٹی جس کو یہ لوگ سالیا کہتے ہیں۔ بکرے کا گوشت جس کو ایک خاص طرح سے مکھن میں تل کر پیش کیا جاتا ہے۔ بہت ہی لذیذ ہوتا ہے۔

یہ بہت سیدھے سادے لوگ تھے۔ وہاں رہ کر مجھے ان کے بارے میں اور بہت سی باتیں معلوم ہوئیں۔ جیسے ان کے مختلف قبائل ہیں۔ سون پاس۔ چیانگ، لوپاس، پان اور بوئی وغیرہ۔ ساتویں صدی تک یہ ایک وسیع ملک تھی بعد میں یہ ٹکڑیوں میں تقسیم ہو گئی۔

بدھ مت کے آنے سے پہلے ان لوگوں کا مذہب بون تھا جس کے اثرات آج بھی پائے جاتے ہیں۔

اس ملک کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ بعض معلوم تاریخ ہی بیس ہزار سال پہلے سے شروع ہوتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

شاوک ان کا ایک مقدس مذہبی شہر تھا۔ ویسے تو پورے تبت میں جگہ جگہ کچھ بکھرے ہوئے ہیں لیکن چند خاص مقامات کو بہت اہمیت حاصل ہے۔

جان کو جو مرہم لگایا گیا تھا، اس کے اثرات دو دن بعد ہی ظاہر ہونا شروع ہو گئے۔ وہ اب آہستہ آہستہ چلنے کے قابل بھی ہو گیا تھا۔

اس قبیلے کی ایک لڑکی جان پر بہت مہربان ہو رہی تھی۔ وہ اس کی خدمت کیا کرتی۔ جبکہ لطف یہ تھا کہ نہ تو جان اس کی زبان سمجھ سکتا تھا اور نہ ہی وہ بے چاری جان کی انگریزی سمجھ پاتی تھی۔

ایک دن کوپان نے بتایا۔ ”ہم لوگوں نے سفر کی تیاری تقریباً مکمل کر لی ہے۔ پرسوں ہمارا قافلہ یہاں سے شاوک کے لیے روانہ ہو جائے گا۔ اب تم لوگ بتاؤ تمہارا کیا پروگرام ہے؟“

”یار، کیسی بات کر رہے ہو۔“ جان نے کہا۔ ”ہمارا کیا پروگرام ہو سکتا ہے۔ ہم یہاں سے کہاں جا سکتے ہیں۔“

”ظاہر ہے ہمیں تمہارے ساتھ شاوک تک جانا ہے۔“ میں نے جانے کی بات مکمل کی۔ ”پھر وہاں سے آگے کی طرف سفر کریں گے۔“

”لیکن دوست، تم تو شاید نہیں جا سکو گے۔“ کوپان نے جان سے کہا۔

”وہ کیوں بھائی۔“

”اس لیے کہ ہماری چوگی تم کو دل دے بیٹھی ہے۔“ کوپان نے بتایا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"چھگی! کون چھگی؟" جان نے حیرت سے پوچھا۔

"وہی لڑکی جو تمہاری دیکھ بھال کیا کرتی ہے۔" کوہان نے مسکراتے ہوئے بتایا۔ "وہ تمہیں پسند کرنے لگی ہے اور شارک پنچ کر تم سے شادی کرنا چاہتی ہے۔"

"ارے... یہ کیا۔" جان بے چارہ حیران اور پریشان رہ گیا تھا۔ "یہ کیسے ہوسکتا ہے۔"

"مبارک ہو بھائی جان۔" میں نے اسے چھیڑا۔ "تمہیں تو ہر جگہ کوئی نہ کوئی مل ہی جاتی ہے۔ ایک وہ ملی تھی جس نے ریوار جین پر تم سے ملنے کا وعدہ کیا تھا اور ایک یہ ملی ہے جو رضا کے ایک دور دراز خطے میں تمہارے انتظار میں نہ جانے کب سے بیٹھی ہوئی ہوگی۔"

جان کی حالت دیکھنے کے قابل ہورہی تھی۔

کوہان بھی اس وقت اسے تنگ کرنے کے موڈ میں تھا۔ "چھگی بہت اچھی لڑکی ہے جان۔" اس نے کہا۔ "بہت خیال رکھنے والی اور بہت محنتی۔ ذرا سی دیر میں دس دس یاک کا دودھ نکال لیتی ہے۔ جو ہم مردوں کے بس کی بھی بات نہیں ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ اس نے خود تمہیں پسند کرلیا ہے۔"

"یار! اس بے وقوف لڑکی کو سمجھاؤ۔ میں اس کے قابل نہیں ہوں۔" جان نے کہا۔ "میری دنیا کچھ اور ہے۔ میرا لائف اسٹائل کچھ اور ہے۔ وہ برف کا پھول ہے۔ وہ میرے ساتھ جا کر مرجھا جائے گی۔"

"وہ تمہارے ساتھ کیوں جانے لگی۔ تم اس کے ساتھ رہو گے۔"

"ارے نہیں بھائی! میں یہ نہیں کرسکوں گا۔" جان نے کہا۔ "میں اس کی محبت کی آنچ کو محسوس کرسکتا ہوں۔ مجھے اندازہ بھی ہورہا ہے۔ اس کے باوجود ہمارے درمیان بہت فاصلے ہیں۔ اس کو سمجھاؤ۔"

اسی دوران وہ لڑکی جان کے لیے چائے لے کر آگئی تھی۔ کوہان نے اس سے کچھ کہا۔ اس نے بھی کچھ کہا۔ پھر میں نے دیکھا کہ اس لڑکی کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ وہ چادر رکھ کر اپنے چہرے کو چھپاتے ہوئے خیمے سے باہر چلی گئی تھی۔

خیمے کی فضا اچانک ہی سوگوار سی ہوگئی تھی۔

"پاگل ہے یہ لڑکی بھی۔" کوہان بول پڑا۔ "میں اس کے لیے کتنے اچھے رشتے لاتا رہا ہوں۔ لیکن سب کو انکار کرتی رہی۔ اور اب اس نے محبت بھی کی تو ایک اجنبی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے۔''

''یار کوپان، تم خود ہی اس سے شادی کیوں نہیں کر لیتے۔'' جان نے کہا۔

''شاید میں تم کو بتانا بھول گیا۔ چونگی میری چھوٹی بہن ہے۔'' کوپان نے بتایا۔ اس وقت اس کے لہجے میں ایک بھائی کا پورا پیار سمٹ آیا تھا۔

☆☆☆

تیسری رات چاند کی روشنی میں ہمارا سفر شروع ہو گیا۔

سب سے آگے جھنڈے اٹھائے ہوئے لوگ تھے۔ ان کے پیچھے عام مردوں کی قطاریں۔ پھر عورتیں اور بچے۔ آخر میں قافلے کا پورا سامان۔ یاک اور دوسرے مویشی۔

مجھے اور جان کو یاک پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اس وقت ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے وقت سفر کرتا ہوا پیچھے بہت پیچھے چلا گیا ہو۔ دور تک پھیلی ہوئی برف پر چاندنی میں چلتا ہوا یہ پُراسرار قافلہ نہ جانے کتنی صدیوں کی داستانیں دہرا رہا تھا۔

ہم شانگ کی طرف جا رہے تھے۔ وہ پُراسرار شہر جس کے بارے میں اس پُراسرار بھٹکی ہوئی روح نے مجھے بتایا تھا۔

میں نے ابھی تک کوپان سے اس موضوع پر بات نہیں کی تھی اور نہ ہی جان کو کچھ بتایا تھا۔ اچانک آگے جانے والے لوگوں نے کوئی مذہبی نغمہ گانا شروع کر دیا۔

آواز پہلے مدھم پھر تیز اور تیز ہوتی گئی۔ اور اچانک مجھے کچھ یاد آ گیا۔ یہ تو وہی دھن تھی۔ وہی سحر انگیز دھن جو میں نے ایک رات اپنی خواب گاہ میں اپنے بستر پر لیٹے ہوئے سنی تھی۔

فرق صرف یہ تھا کہ اس بار ان آوازوں میں موسیقی بھی شامل تھی اور یہ نغمہ بغیر موسیقی کا تھا۔ مردوں اور عورتوں کی آوازیں اس ماحول میں عجیب تاثر پیدا کر رہی تھیں۔

میرے دل کی دھڑکنیں تیز اور تیز ہوتی جا رہی تھیں۔ شاید کوئی ایسی منزل میرے قریب آنے والی تھی جس کے لیے مجھے اشارے دیے جا رہے تھے۔

ہم جدید زمانے میں صدیوں پرانے ماحول میں سانسیں لے رہے تھے۔ میری طرح جان پر بھی سحر سا طاری ہو گیا تھا۔ وہ بھی خاموش تھا۔

میں نے اپنے ساتھ پیدل چلتے ہوئے کوپان سے پوچھا۔ ''کوپان، یہ کون سا نغمہ ہے؟''

''یہ ہماری شہزادی کے حضور ہمارا نذرانۂ عقیدت ہے۔'' کوپان نے بتایا۔ ''اس تہوار کے موقع پر ہم اسے خاص طور پر یاد کرتے ہیں۔''

''شہزادی، کون سی شہزادی!''

''اس شہزادی کا نام لی چانگ تھا۔'' کوپان نے بتایا۔

لی چانگ۔ ایک بار پھر میرے بدن میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ لی چانگ۔ یہ نام میرے ذہن میں ہتھوڑے برسانے لگا تھا۔ اس لڑکی نے اپنا نام لی چانگ ہی تو بتایا تھا۔ اس پُراسرار لڑکی کا نام لی چانگ ہی تو تھا۔ کیا یہ وہی شہزادی تھی جو مجھے کھینچ کر یہاں لے آئی تھی۔ اس نے ایک دور جاتے ہوئے مسافر کو راستے میں اتار لیا تھا۔

''کوپان، کون تھی یہ شہزادی۔ کیا تم مجھے اس کے بارے میں کچھ بتاؤ گے؟'' میں نے پوچھا۔

''مسٹر جواد، یہ صدیوں پہلے کی بات ہے۔'' کوپان نے بتانا شروع کیا۔ ''اس وقت ہمارا یہ ملک بہت بڑا ہوا کرتا تھا۔ چین اور منگولیا کے علاقے بھی اس میں شامل تھے۔ ہمارا ایک طاقت ور بادشاہ ہوا کرتا تھا جس کا نام SongTangawpo تھا اس نے 604 سے 650 تک حکومت کی۔ اس نے دو شادیاں کی تھیں۔ اس کی پہلی بیوی نیپال کی شہزادی تھی۔ اس کا نام Bhiruli تھا۔ اس کی موت کے بعد اس نے 640 میں ایک طاقت ور چینی حکمران تائی زونگ کی بھتیجی سے شادی کی۔ اس سے لی چانگ پیدا ہوئی جو بیک وقت خوش نصیب بھی تھی اور بدنصیب بھی۔''

''وہ کس طرح؟''

''وہ بہت خوبصورت تھی مسٹر جواد۔ اس پر گیت بنائے جاتے تھے اور اسے حاصل کرنے کی دعائیں کی جاتی تھیں۔ نہ جانے کتنے راجا اور مہاراجا اس سے شادی کے خواہش مند تھے۔ لیکن اس نے ایک عام سے نوجوان کو پسند کر لیا تھا۔ اس نوجوان کا نام وانگ تھا۔ وہ ایک موسیقار تھا اور ایک ساز، رانگ بہت خوبصورت بجایا کرتا۔''

کوپان بتا رہا تھا اور میں اپنے آپ کو سنبھالنے میں لگا ہوا تھا۔ اس لڑکی نے بھی تو یہی کہا تھا کہ میرا نام وانگ تھا اور میں موسیقار تھا۔ میں ساز بجایا کرتا اور وہ رقص کیا کرتی۔ بالکل وہی کہانی کوپان دہرا رہا تھا۔

آخر میرا کیا تعلق تھا؟ یہ کیسا بھید تھا۔ کیا میں وہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

وانگ تھا؟ لیکن یہ کیسے ہو سکتا تھا۔

"آگے بتاؤ کوپان، آگے بتاؤ۔ پھر کیا ہوا؟" میں نے بے چین ہو کر پوچھا۔

"کیا بات ہے دوست، تم اس کہانی میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہے ہو؟" اس نے پوچھا۔

"کوپان، میں تمہیں سب بتا دوں گا۔" میں نے کہا۔ "تم مجھے اس کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دو جو تم جانتے ہو۔"

کوپان نے الجھی ہوئی نگاہوں سے میری طرف دیکھا پھر بولنا شروع کیا۔ "ان دونوں کی اس محبت کی کہانی پورے ملک میں مشہور ہو گئی۔ نوجوان لڑکے اور لڑکیوں نے لی چانگ کو اپنی دیوی ماننا شروع کر دیا۔ کیونکہ وہ محبت کی علامت بن گئی تھی۔ محبت جو روح کا تناتت ہے۔ جو خون بنا کر رگوں میں دوڑا کرتی ہے۔ لیکن ان کی یہ محبت بادشاہ کو پسند نہیں آئی۔ کیونکہ وہ ایک عام انسان سے محبت کر رہی تھی۔ اس نے اپنے اصولوں کے مطابق لی چانگ کو موت کی سزا دے دی۔"

"اور یہ موت کی سزا کس طرح دی گئی تھی؟" میں نے پوچھا۔

"اسے زہر سے بھرا ہوا جام دیا گیا تھا۔" کوپان نے بتایا۔ "لیکن اس سے پہلے ایک اور بات ہوئی۔ لی چانگ کی موت سے پہلے آسمانوں سے ایک دیوتا اتر کر اس کے پاس آیا اور اس نے لی چانگ سے کہا۔ تو نے بادشاہوں کے اصولوں کے خلاف کام کیا ہے اس لیے تجھے سزا دی جا رہی ہے۔ لیکن چونکہ تو نے محبت بھی کی ہے اس لیے تجھے کبھی نہ کبھی تیرا پیار ضرور مل جائے گا اور اس تلاش میں تجھے کئی بار موت آئے گی۔ تو کئی بار مرے گی اور بالآخر ایک بار تو اپنا پیار حاصل کر لے گی۔"

کوپان خاموش ہو گیا۔

اب مردوں اور عورتوں کا نغمہ بھی ختم ہو چکا تھا۔ ہر طرف ایک گہری خاموشی تھی جو بالکل غیر ارضی محسوس ہو رہی تھی۔

ہم خاموشی سے چلتے رہے اور جہاں تک میرا سوال تھا تو میں نہ جانے کہاں تھا، کس دور میں تھا، کن وادیوں میں بھٹکتا پھر رہا تھا۔

☆☆☆

ہم شاوک پہنچ چکے تھے۔

یہ ایک بڑی بستی تھی۔ جس میں مخروطی طرز کے مکانات بنے ہوئے تھے۔ ایک اونچے مقام پر بڑا پگوڈا یا معبد بنا ہوا تھا۔

یہ منگولین طرز کی ایک بہت عظیم الشان عمارت تھی۔ اوپر جانے کے لیے سیڑھیاں بنی ہوئی تھیں۔ مجموعی طور پر وہ عمارت کسی قلعے کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ اس عمارت کے ساتھ بہت بڑا میدان تھا۔ اس میدان میں قافلے آ آ کر قیام کر رہے تھے۔

ہر قبیلے کا اپنا نشان اور اپنا پرچم تھا۔ جس سے یہ ظاہر ہو جاتا تھا کہ یہ قبیلہ کون سا ہے۔ وہاں دکانیں بھی تھیں۔ طرح طرح کا مقامی سامان فروخت ہو رہا تھا۔

ایک رنگا رنگ میلے کا سا سماں تھا۔ میں اور پان اس رنگا رنگی میں گھومتے گئے تھے۔ "یار، یہ تو بہت دلچسپ جگہ ہے۔" جان نے بتایا۔ "حالانکہ یہاں بھی بہت سردی ہے۔ لیکن اس تبتی میدان سے بہت کم ہے۔"

شام کے وقت کوپان نے مجھ سے کہا۔ "حماد چلو، میں اپنے مونک سے تمہاری ملاقات کرواتا ہوں۔"

"یہ مونک کون ہیں۔" میں نے پوچھا۔

"یہ ہمارے مذہبی پیشوا ہیں۔" کوپان نے بتایا۔ "بہت پڑھے لکھے آدمی ہیں۔ انگلینڈ سے تعلیم حاصل کی ہے۔ تم ان سے مل کر بہت خوش ہو گے۔"

کوپان مجھے اپنے ساتھ لے کر پگوڈا کی طرف چل پڑا۔ ہر قدم پر ایسا احساس ہو رہا تھا جیسے میں اس مقام سے اچھی طرح واقف ہوں۔ یہاں آتا رہا ہوں۔ یہ پورا ماحول جانا پہچانا تھا۔

تقریباً سو سیڑھیاں چڑھ کر ہم معبد میں پہنچ گئے جس کے دروازے پر مہاتما بدھ کا بہت بڑا مجسمہ نصب تھا۔ کمروں کی قطار تھی۔ پوری سجاوٹ تبتی انداز کی تھی۔ اس میں برما اور چین کے طرز تعمیر کی بھی جھلک تھی۔

کوپان نے شاید میرے بارے میں مونک کو بتا دیا تھا۔ اسی لیے اس نے بہت گرم جوشی سے ہمارا استقبال کیا۔ لیکن مجھے دیکھ کر وہ کچھ سوچ میں پڑ گیا تھا۔ جیسے وہ الجھن میں مبتلا ہو گیا ہو۔

کوپان نے اس سے میرا تعارف کروایا۔ میں اس کے سامنے ادب سے بیٹھ گیا۔ اس کی شخصیت میں گہرا تاثر تھا۔ منڈا ہوا سر، چمکتی ہوئی آنکھیں۔ جسم پر گیروے رنگ کا لبادہ اور بہت دھیما اور شائستہ لہجہ۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"جناب! میں آپ کو دیکھ کر آپ سے بہت متاثر ہوا ہوں۔" میں نے کہا۔ "آپ کی شخصیت میں جو تاثر ہے وہ میں الفاظ میں ادا نہیں کر سکتا۔"

"میرے بچے! اس کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔" وہ باوقار لہجے میں بولا۔ "میرے لیے یہی بہت ہے کہ تم یہاں تک آ گئے ہو۔ بدھا کے دروازے ہر ایک کے لیے کھلے ہوئے ہیں۔"

"میرے محترم! میں اپنی معلومات کے لیے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کیا یہاں بھی بدھ مت کی وہی تعلیمات ہیں جو ہندوستان، سری لنکا، برما اور چین وغیرہ میں ہیں۔"

"ہاں۔ کیونکہ اصل تو ایک ہی ہے۔ ہم سب بدھا کی دکھائی ہوئی روشنی میں اپنا سفر طے کر رہے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "یہ اور بات ہے کہ ہمارے پاس روشنی کے ذرائع مختلف ہیں۔"

"محترم! میں اپنی معلومات کے لیے یہ سب جاننا چاہتا ہوں۔ اگر آپ کو اعتراض نہ ہو۔"

"اس میں اعتراض کیسا۔ یہ تو خوشی کی بات ہے۔" اس نے کہا۔ "میں تمہیں بتا رہا ہوں تاکہ تمہیں کچھ اندازہ ہو سکے۔"

"جی ہاں محترم! میں سننے کے لیے بے چین ہوں۔" میں نے کہا۔

"دیکھو! ہمارا بدھ مت اپنی اصل حالت میں چاہے کچھ بھی رہا ہو لیکن مختلف جغرافیائی عمل نے اسے مختلف مسالک اور طریقوں میں ڈھال رہا ہے۔ جیسے یہاں ہمارے لیے اس دھرم کے چار اصول ہیں۔ بلکہ تم انہیں چار روایات کہہ سکتے ہو۔ نمبر ایک جیلنگ پا نمبر دو کگ یو پا نمبر تین ننگ ما پا اور نمبر چار ساک یاپا۔"

"محترم! کیا آپ یہ بتا سکتے ہیں کہ روحیں کہاں چلی جاتی ہیں اور کہاں سے واپس آتی ہیں؟" میں نے پوچھا۔

"نوجوان! اس سوال کا تمہاری زندگی سے بہت گہرا تعلق ہے۔" مونک نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اصل بات یہ ہے کہ یہ کائنات کے ایسے ایسے بھید ہیں جو انسانی عقل میں نہیں آتے۔ ہم سب روح کی چھوٹی چھوٹی لہروں کی طرح ہیں۔ ہمارا سفر جاری ہے اور ایک دن ہمیں بڑے سمندر میں جا کر مل جانا ہے اور اس سمندر کو تم کوئی بھی نام دے سکتے ہو۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی لہر ذرا سی دیر کے لیے کنارے پر آ جاتی ہے اور پچھلی زندگی ذرا سی دیر کے لیے آنکھوں کے سامنے آ جاتی ہے۔ اس کے بعد سمندر کا پھر وہی سفر شروع ہو جاتا ہے۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے محترم! میرے لیے بتائیں مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں! تمہیں یہاں لایا گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "تم خود سے نہیں آئے۔ کوئی طاقت تمہیں اپنے ساتھ یہاں تک لے آئی ہے۔ کیوں لائی ہے یہ میں ابھی نہیں بتا سکتا۔ ہو سکتا ہے کہ میرے ذہن کے دروازے کھل رہے جائیں اور میں تمہیں سب بتا سکوں یا مجھے اجازت مل جائے۔"

"کیا میں اپنے مہمان کو گھوڑا دکھا سکتا ہوں۔" کوپان نے پوچھا۔

"ابھی نہیں۔ ابھی اس کی اجازت نہیں ملی ہے۔" مونک نے کہا۔ "لیکن تم اپنے مہمان کا بہت خیال رکھنا۔ یہ ہم سکھوں کے لیے بہت مقدس ہے۔"

"جی محترم!" کوپان نے احترام سے اپنی گردن جھکا دی۔

کچھ دیر بعد ہم اس گھوڑا سے باہر آ گئے۔ پھر پیچ سیڑھیاں اترتے ہوئے ہم نیچے اترے۔ اور ادای رفت ایک مانوس سی آواز نے میرے قدم روک لیے۔ یہ اذان کی آواز تھی۔

اذان جو ہماری شناخت ہے۔ اذان جس کی آواز ہمارے تصور تک میں شامل ہوتی ہے۔ ہم جس کی چھاؤں میں پوری زندگی گزار دیتے ہیں۔

اسی مانوس اذان کی آواز اس اجنبی ماحول میں گونج رہی تھی۔

"کوپان یہ یہ آواز۔" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں، یہ اذان کی آواز ہے۔" کوپان نے بتایا۔ "شارک میں بھی مسلمان آباد ہیں لیکن بہت کم تعداد میں۔ جبکہ ہمارے دارالحکومت لہاسا میں بہت مسلمان ہیں۔ وہاں ایک شاندار جامع مسجد بھی ہے۔"

"کوپان! میں مسجد تک جانا چاہتا ہوں۔" میں نے کہا۔

"ہاں کیوں نہیں، آؤ میرے ساتھ۔ مسجد زیادہ دور نہیں ہے۔"

میں کوپان کے ساتھ چل پڑا۔ ہم لوگوں کے درمیان سے گزرتے رہے۔ یہ وہ لوگ تھے جو دور دراز سے کھنچ کر شارک آ گئے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

یہاں ان کا مذہبی تہوار منایا جا رہا تھا۔ رنگ برنگے لباسوں اور جھنڈوں نے عجیب تاثر پیدا کر رکھا تھا۔

ان کے درمیان ایک مسجد سے اٹھتی ہوئی اذان مجھے اپنی طرف بلا رہی تھی۔

وہ اذان گرچہ ختم ہو چکی تھی۔ لیکن اس کی گونج مجھے ابھی بھی محسوس ہو رہی تھی۔ ہم دو چار گلیوں کے بعد ایک مسجد کے دروازے پر آ گئے۔ یہ ایک مینار والی مسجد تھی۔ ویسی ہی تھی جیسی ہمارے یہاں کے دیہاتوں کی ہوا کرتی ہے۔ سامنے ایک نورانی صورت بزرگ اپنے تبتی لباس میں ملبوس مسجد کے کچے صحن میں کھڑے ہوئے تھے۔ ان کے علاوہ اس مسجد میں دو چار اور بھی تھے۔

یہ سب مقامی لوگ تھے۔ ہمیں دیکھ کر ان بزرگ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ انہوں نے آگے بڑھ کر مجھے مخاطب کیا۔ "آؤ، میں تمہارا ہی انتظار کر رہا تھا۔"

☆☆☆

عصر کی نماز پڑھ کر ہم ان ہی بزرگ کے پاس بیٹھ گئے تھے۔

کوپان کو بھی بیٹھنے کی اجازت مل گئی تھی اور دو چار مقامی مسلمان بھی تھے۔ یہ سب عمر رسیدہ لوگ تھے۔ ان بزرگ نے اپنا نام جلال پانگ بتایا تھا۔

انہوں نے اپنی عمر کا بہت سا حصہ ہندوستان میں گزارا تھا۔ اسی لیے وہ اردو بول سکتے تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ اتنی دور کی مسجد میں نماز پڑھ کر بڑا سکون محسوس ہوا تھا۔

جلال پانگ صاحب نے بتایا۔ "تبت میں مسلمانوں اور اسلام کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ مسلمان یہاں آٹھویں یا نویں صدی میں آئے تھے۔ پہلے لہاسا میں تھے۔ پھر دور دراز علاقوں میں پھیل گئے۔ یہاں ہم بہت سکون اور آرام کے ساتھ زندگی گزارتے ہیں۔ ہم پر کسی قسم کا دباؤ نہیں ہے۔"

"یہ تو بہت اچھی بات ہے جناب۔ یہ بتائیں کہ آپ نے یہ کیوں فرمایا تھا کہ آپ کو میرا انتظار تھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، یہ بات بہت اہم ہے۔" امام صاحب نے فرمایا۔ "بیٹا تمہارے بارے میں کئی دنوں سے اشارے مل رہے تھے۔"

"میرے بارے میں اشارے؟" میں حیران رہ گیا تھا۔ "کس قسم کے اشارے؟"

"کاش، میں ان کی توجیہہ کر سکتا۔" امام صاحب نے کہا۔ "بہرحال اب تم کچھ اپنے بارے میں بتاؤ۔"

"اپنے بارے میں کیا بتاؤں۔ میرا طیارہ چین جاتے ہوئے گر کر تباہ ہو گیا تھا۔" میں نے بتایا۔ "ہم صرف دو زندہ بچ گئے۔ ایک میں اور ایک جان۔ پھر ان لوگوں نے ہمیں پناہ دی، ہماری مدد کی، پھر ہم ان کے ساتھ یہاں تک آ گئے۔"

"محترم، اب یہ دو چار دنوں کے بعد لہاسا چلے جائیں گے۔" کوپان نے بتایا۔ "وہاں سے یہ اپنے ملک کے سفارت خانے یا کونسلیٹ کے ذریعے اپنے ملک پاکستان واپس ہو جائیں گے۔"

"بیٹا، اگر تمہیں وقت ہو تو آج رات کا کھانا ہمارے ساتھ کھاؤ۔" امام صاحب نے کہا۔ "ہم آٹھ دس مقامی مسلمان بھی جمع ہو جائیں گے۔ ان لوگوں کو ایک پاکستانی مسلمان سے مل کر خوشی ہو گی۔"

"محترم! اس کا انحصار میرے میزبان کوپان پر ہے۔" میں نے کوپان کی طرف اشارہ کیا۔

"مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔" کوپان جلدی سے بولا۔ "آج رات ویسے بھی ہماری ایک خاص عبادت ہوا کرتی ہے۔ ہم اس میں مصروف رہیں گے۔"

یہ طے پا گیا کہ میں رات کے کھانے پر امام صاحب کے پاس آ جاؤں گا۔ ان سے اجازت لے کر واپس جاتے ہوئے میں نے راستے میں اس تہوار کی تیاریاں دیکھ لیں۔

"یہ ہماری خوشی کا تہوار ہے۔" کوپان نے بتایا۔ "خاص طور پر محبت کرنے والوں کے لیے اس تہوار کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ محبت کے جوڑے پگوڑا کی سیڑھیوں پر آج رات دیے روشن کرتے ہیں اور ایک دوسرے سے وفا کا عہد کرتے ہیں۔"

"ہاں ہاں۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "شاید دنیا کے سارے تہوار کا بنیادی مرکز محبت ہی ہوتا ہے۔ ایک بات بتاؤ، کیا تم نے کسی سے محبت کی؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں۔" کوپان نے گردن ہلا دی۔ "ایک دور دیس کی لڑکی سے محبت کی ہے۔ میں لہاسا میں رہتا تھا۔ وہاں گائیڈ کے فرائض انجام دیا کرتا۔ وہ لڑکی بدھ مت پر ریسرچ کرنے انگلینڈ سے آئی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے۔ پھر وہ انگلینڈ واپس چلی گئی۔ اس نے لوٹ آنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ آج رات میں اس کی بارش میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک بار روشن کروں گا۔"

"لیکن دیا تو وہ روشن کرتے ہیں جن کی محبت ان کے ساتھ ہوتی۔" میں نے کہا۔ "تاکہ وہ ایک دوسرے کا ہاتھ تھام کر محبت کے وعدے کر سکیں۔"

"نہیں، کوئی ضروری نہیں ہے۔ دور کے محبوب کے لیے بھی دیا روشن ہو سکتا ہے۔" کرپان نے بتایا۔

"کیا میں دیا روشن کر سکتا ہوں۔ اس پر کوئی پابندی نہیں ہے۔" میں نے پوچھا۔

"نہیں، کوئی پابندی نہیں ہے۔ لیکن تم کس کے لیے روشن کرو گے؟ کہاں ہے تمہارا محبوب۔"

"یہ تو میں نہیں جانتا۔" میں نے کہا۔ "لیکن نہ جانے کیوں یہ یقین ہو رہا ہے کہ اسے میرے دیا جلانے کی خبر ہو جائے گی۔"

کرپان نے پھر کچھ نہیں پوچھا۔

ہم قصبہ بستی میں آ گئے۔ یہاں جان میرے انتظار میں ٹہل رہا تھا۔ "بھائی کہاں چلے گئے تھے تم۔" اس نے پوچھا۔ "میں تو اس جنگلی جگہ سے گھبرا گیا ہوں۔"

"وہ کیوں؟" میں نے پوچھا۔

"یہاں رکھا ہی کیا ہے۔" وہ برا سا منہ بنا کر بولا۔ "نہ جانے قسمت ہمیں کہاں لے کر آ گئی ہے۔ دو چار دنوں تک تو یہ پھر ذرا اچھا لگتا ہے۔ کیونکہ نئی نئی بات ہوتی ہے۔ اس کے بعد بوریت ہونے لگتی ہے۔"

"اچھا یہ بتاؤ، آج رات دیا جلاؤ گے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں بھائی، میں ان خرافات پر یقین نہیں رکھتا۔" اس نے کہا۔ "دیوار چین والی تو مجھ سے مایوس ہو کر کسی اور کی طرف چلی گئی ہوگی۔ پھر میں کس کے لیے دیا جلاؤں۔"

یہ اتفاق تھا کہ اسی وقت چوگی دکھائی دے گئی جو ہم سے کچھ فاصلے پر کھڑی ہوئی تھی۔ "اس لڑکی کے لیے۔" میں نے چوگی کی طرف اشارہ کیا۔

"بھائی، میرے لیے تمہیں کوئی اور نہیں مل سکی تھی، جو میں اس کے لیے دیا جلاؤں گا۔"

ہم باتیں کرتے ہوئے خیمے میں پہنچ گئے۔ یہاں ہمارے لیے کھانا تیار تھا۔ اس قسم کے تہواروں کے موقع پر یہاں ایک خاص قسم کی ڈش بنائی جاتی ہے جسے گوتھک کہتے ہیں۔

یہ گوتھک دو چاول اور ساگ کے ذریعے بنائی جاتی ہے اور بہت لذیذ ہوتی ہے۔ (یہ ساری باتیں کرپان نے بتائی تھیں) گوتھک کھا کر بان اس جنگلی مقام کو گالیاں دیتے دیتے سو گیا تھا۔

جبکہ مجھے خیالات سونے نہیں دے رہے تھے۔ بہت تیزی سے پندرہ بیس دنوں کے اندر اندر میرے ساتھ کئی حیرت انگیز واقعات پیش آ چکے تھے۔ آخری واقعہ یہ ہوا تھا کہ امام صاحب نے فرمایا تھا کہ میرے بارے میں انہیں اشارے مل رہے تھے۔

یہ کیسے اشارے تھے۔ میرے بارے میں کیا انکشاف ہونے والا تھا یا امام صاحب کو کیا بتایا جا رہا تھا۔ پتا نہیں آنے والا کل اتنا پُراسرار اور دھند میں لپٹا ہوا کیوں ہوتا ہے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ چار قدم کے فاصلے پر کیا ہے۔

مغرب کی اذان نے ایک بار پھر مجھے مسجد کی طرف بلا لیا۔ راستہ تو نہیں معلوم تھا۔ لیکن اذان مجھے ہاتھ پکڑ کر مسجد کی طرف لے جا رہی تھی۔

اس وقت مسجد میں پندرہ بیس کے قریب مقامی مسلمان موجود تھے۔ میں نے وہاں ایک اور بات دیکھی جو مجھے پاکستان میں کہیں دکھائی نہیں دی تھی۔ میں نے مسجد کے باہر بدھ مت مردوں عورتوں اور بچوں کو دیکھا جو ایک قطار میں بیٹھے ہوئے تھے۔ پتا چلا کہ یہ سب نمازیوں سے دم کروانے کے لیے آیا کرتے ہیں۔ پتا نہیں یہ کیسا عقیدہ تھا۔

نماز کے بعد امام صاحب نے پھر یاد دہانی کرائی کہ مجھے عشا کی نماز کے بعد ان کے ساتھ ان کے گھر جانا ہے۔ میں ان سے وعدہ کر کے واپس آ گیا۔

خیمے میں کرپان ایک دیا لیے کھڑا تھا۔ "یہ لو۔" اس نے وہ دیا میری طرف بڑھا دیا۔ "یہ لو، یہ تمہارے لیے۔ تمہارے اس محبوب کے لیے جس نے تم سے محبت کی ہوگی۔"

اس نے ایک دیا جان کو بھی دینا چاہا۔ لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ "نہیں بھائی، میرا کوئی محبوب نہیں ہے۔" کچھ دیر بعد میں اکیلا معبد کی طرف جا رہا تھا۔

معبد گاہ کی سیکڑوں منڈیروں پر ہزاروں دیے جگمگا رہے تھے۔ بہت ہی دل کش منظر تھا۔

نوجوان لڑکے اور لڑکیوں کا ایک ہجوم تھا۔ دیوں کی روشنی پورے ماحول کو مقدس اور روشن کر رہی تھی۔ میں نے ایسا منظر کم ہی دیکھا ہوگا۔

میں نے سیڑھیوں پر قدم رکھا اور تب مجھے چوگی بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دکھائی دے گئی۔ وہ پاگل لڑکی برشا بد جان کے لیے دیے جلانے آئی تھی۔

میں نے دیے کی جھلملاتی روشنی میں اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھ لیے تھے۔ واقعی یہ محبت بھی کیا چیز ہے۔ ہر طرح کی سیاست اور ذات پات کے بندھنوں سے آزاد۔ صرف قربانی دینا جانتی ہے۔ اسے جغرافیائی سرحدوں کا بھی ادراک نہیں ہوتا۔

مجھے بھی تو ایک انجانا جذبہ ہی وہاں تک کھینچ لایا تھا۔

نہ جانے وہ کون تھی، کہاں تھی جس کے لیے میں دوبارہ دن کرنے جا رہا تھا۔

اور میں نے اس پُراسرار لڑکی کی یاد میں دیا روشن کر کے سیڑھی پر رکھ دیا۔ اسی وقت ایک عجیب سی بات ہوئی۔ بہت ہی عجیب۔ شاید ایسا واقعہ صدیوں میں پیش آیا ہو۔

نہ جانے کہاں سے اچانک ہوا چلنے لگی تھی۔ بہت تیز ہوا۔ اس ہوا نے سارے دیے بجھا دیے اور صرف دو ہی دیے جلتے رہ گئے تھے۔ ایک میرا اور ایک چوکی کا۔

ہر طرف حیرت زدہ آوازیں گونجنے لگی تھیں۔ لوگوں نے گیت گانے شروع کر دیے۔ بہت ہی پُراسرار اور طلسمی ماحول ہو گیا تھا۔

میں اور چوکی سیڑھیوں پر حیران اور پریشان کھڑے رہ گئے تھے۔ پھر چوکی سیڑھیاں اترتی ہوئی نیچے چلی گئی اور اسی وقت میں نے اس کو دیکھ لیا۔

وہ اپنی پوری آن بان، حسن اور جلال کے ساتھ مندر کی سب سے اونچی سیڑھی پر کھڑی ہوئی تھی۔ یہ وہی تھی، بلاشبہ وہی۔ میں اسے تو بھلا ہی نہیں سکتا تھا۔

وہی سفید لبادہ۔ وہی بھیگا ہوا بدن۔ وہی اس کے ہونٹوں پر سجی ہوئی انتہائی خوبصورت مسکراہٹ اور آنکھوں میں چمک۔

میں نہیں کہہ سکتا کہ کوئی اور بھی اسے دیکھ رہا تھا یا نہیں۔ لیکن وہ مجھے دکھائی دے رہی تھی۔ وہ شاید میرے جلائے ہوئے دیے کی لاج رکھنے کے لیے میرے پاس آ گئی تھی۔ وہ کچھ کہہ رہی تھی۔ اس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ لیکن اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ پھر اس نے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا اور میں نے ایک بے خودی کے عالم میں اس کی طرف دوڑ لگا دی۔

☆☆☆

وہ میرے آگے آگے جا رہی تھی۔

گرچہ اس کی رفتار اتنی زیادہ نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں اپنی کوششوں کے بعد بھی اسے پکڑنے یا اس کے قریب ہونے میں ناکام رہا تھا۔

وہ جیسے ہولے ہولے ہواؤں میں تیرتی جا رہی ہو۔ مجھے اس وقت کوئی ہوش نہیں تھا۔ میں ایک ٹرانس کی کیفیت میں تھا۔ اس کا خوبصورت نازنین سراپا میرے سامنے تھا۔ یہ وہ لڑکی تھی جس کیا نے مجھے اپنے سحر میں گرفتار کر رکھا تھا۔ جس نے نہ جانے کتنی بار مجھے اپنے پُراسرار وجود کا احساس دلایا تھا۔

وہ ایک بار پھر میرے سامنے تھی اور مجھے اپنے ساتھ کہیں لے جا رہی تھی اور میں اس کی طرف دوڑتا جا رہا تھا۔ بستیوں کی بستی پیچھے رہ گئی تھی۔

اب کوئی آبادی بھی نہیں تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ میں اس کا تعاقب کرتے ہوئے کہاں سے کہاں آ گیا ہوں۔ اس کو قریب سے دیکھنے اس کو چھونے یا اس کو پانے کی ایک دھن سی سوار ہو گئی تھی۔

اب ہم کھنڈرات کے درمیان آ گئے تھے۔

نہ جانے کس صدی کے کھنڈرات تھے۔ ٹوٹی ہوئی دیواروں اور ملبے کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ وہ لڑکی ان ہی دیواروں اور ملبے کے درمیان بھٹکتی پھر رہی تھی اور اچانک وہ ایک جگہ رک گئی۔ اس وقت چاند کی کرنیں بہت ہلکی تھیں لیکن ارد گرد کے مناظر دیکھے جا سکتے تھے۔

اس روشنی میں اس کا چہرہ بہت تابناک ہو رہا تھا۔ جیسے شعلے دہک رہے ہوں۔ پھر وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اس نے اپنے دونوں ہاتھ دعائیہ انداز میں اوپر کی طرف پھیلا رکھے تھے اور کچھ زور زور سے بول رہی تھی۔

وہ جو کچھ بھی بول رہی تھی وہ مجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ بہت ہی عجیب نازک سی زبان تھی۔ اب مجھ میں اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ میں آگے بڑھ کر اس کے قریب جا سکتا۔

میرے پاؤں جیسے جم کر رہ گئے تھے۔

اس نے بولتے بولتے میری طرف دیکھا اور گردن سے مجھے اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں آہستہ آہستہ اس کے قریب ہوتا گیا۔ اس وقت مجھے کوئی ہوش نہیں رہا تھا۔

وہ اپنے لبادے اور اپنے آپ کو سمیٹے ہوئے کھڑی تھی۔ اس نے اپنی دونوں باہیں اس طرح پھیلا دیں جیسے وہ میری آغوش میں چھپ جانا چاہتی ہو۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے بھی اپنے بازو کشادہ کر دیے۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا اور میں اس کے جسم سے ٹکرا گیا۔ میرے خدا! وہ تو گوشت پوست رکھنے والا وجود تھا۔ اس کے خوبصورت اور مہکتے ہوئے بدن میں ایک فرحت انگیز حرارت تھی۔

مجھ پر خود فراموشی کی کیفیت طاری ہو گئی تھی۔ اس نے اپنے جلتے ہوئے ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھ دیے۔ میرا پورا بدن سلگ اٹھا تھا۔

ایسی بے خودی اور سرشاری تھی کہ میں بیان نہیں کر سکتا۔ اس لذت کا کوئی تصور ہی نہیں تھا جس لذت سے اس نے روشناس کرایا تھا۔

اور اچانک وہ بدن میرے بازوؤں کی گرفت میں تحلیل ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اس طرح غائب ہو گئی جیسے اس کا کوئی وجود ہی نہ رہا ہو۔ لیکن اس کے گرم بوسے کی حرارت میرے ہونٹوں پر محفوظ ہو کر رہ گئی تھی۔

میں بے خودی اور خود فراموشی کے عالم میں نہ جانے کب تک کھڑا رہا۔ اچانک کئی ٹارچ کی روشنیاں مجھ پر پڑنے لگیں اور ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ "رک جاؤ میاں، رک جاؤ۔ وہیں کھڑے رہو۔"

☆☆☆

میں عشا کی نماز سے فارغ ہو کر امام صاحب کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔

وہ آواز امام صاحب کی تھی۔ ٹارچ لیے ہوئے لوگ مقامی افراد تھے۔ امام صاحب کے بیان کے مطابق وہ اس مسجد سے باہر کسی کام سے جا رہے تھے۔ جب انہوں نے مجھے بستی سے باہر جاتے ہوئے دیکھا تھا۔ ان کا یہ کہنا تھا کہ میں کسی ٹرانس کے سے عالم میں دوڑا چلا جا رہا تھا۔

امام صاحب یہ دیکھ کر پریشان ہو گئے۔ انہوں نے آس پاس سے دو چار آدمیوں کو بلایا اور وہ سب میرا تعاقب کرنے لگے۔ پھر انہوں نے مجھے اس کھنڈر میں تلاش کر لیا تھا۔

"آخر یہ سب کیا ہے امام صاحب۔" میں نے تھکی تھکی آواز میں پوچھا۔ "وہ کون سی جگہ تھی جہاں مجھے لے جایا گیا تھا۔ مجھے تو کچھ ہوش ہی نہیں تھا۔ میں تو بس ایک ہیولے کے پیچھے دوڑا چلا جا رہا تھا۔"

"ہاں۔ تم اس علاقے کے ایک طاقتور راجا Song Tan Campo کے محل کے کھنڈرات میں تھے۔" امام صاحب نے بتایا۔ "اس نے ایک چینی حکمران تانگ زونگ کی بھتیجی سے شادی کی تھی اور ان کی ایک اولاد تھی۔ لی چانگ جس نے ایک معمولی آدمی سے محبت کی تھی جس کی سزا کے طور پر اسے زہر دیا گیا تھا۔ اور تم جس جگہ کھڑے ہوئے پائے گئے ہو یہاں اس شہزادی کا کمرا تھا۔ اسی کمرے میں اس نے اپنی موت کو گلے لگایا تھا۔"

"امام صاحب، خدا کے لیے مجھے اس گورکھ دھندے سے بچائیں۔" میں نے کہا۔ "اس کہانی سے میرا کیا تعلق۔ میں کیوں اس کہانی کا ایک کردار بنتا جا رہا ہوں؟"

"میرے بیٹے، کیا تم مجھے بتاؤ گے کہ تم ایسا کیوں کہہ رہے ہو کہ تم اس کہانی کا کردار بن گئے ہو۔ ہو سکتا ہے تمہاری کہانی سن لینے کے بعد وہ اشارے میری سمجھ میں آ جائیں۔"

امام صاحب کے کہنے پر میں نے اپنی کہانی شروع کر دی۔ میں نے ان سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ وہ سب کچھ بتا رہا جو اب تک مجھ پر گزری تھی۔

امام صاحب میری کہانی سننے کے دوران کچھ ورد بھی کرتے رہے تھے۔ میرے خاموش ہو جانے کے بعد وہ بہت دیر تک اپنی گردن جھکائے رہے۔ پھر میری طرف دیکھ کر کہا۔ "میاں، قدرت کے کھیل بہت عجیب ہوا کرتے ہیں۔ کون جانے ہم کس طرح اور کہاں کائنات کے پراسرار رازوں کا ایک حصہ بن جاتے ہیں۔ ہو تم بھی ایک حصہ بن چکے ہو، ایک بہت اہم کردار۔ شاید مرکزی کردار تم ہی ہو۔"

"امام صاحب، آپ یہ فرمائیں کہ یہ روح کیا ہے۔ کیا واقعی ایسا ممکن ہے کہ روح جسمانی طور پر یا ہیولے کے طور پر نگاہوں کے سامنے آ سکتی ہو۔" میں نے پوچھا۔

"دیکھو بیٹا، یہ بہت گہرا اور پیچیدہ موضوع ہے۔" امام صاحب نے کہا۔ "اطبا کے نزدیک یہ ایک بخار لطیف ہے جو دل میں پیدا ہوتا ہے اور حیات و حرکت کا باعث ہوتا ہے۔ فقہا کے نزدیک امر الٰہی ہے۔ شیخ علما اس بات پر اتفاق رکھتے ہیں کہ بعد فنائے ابدان ارواح باقی رہتی ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ روح حیوانی کی شکل رنگ اور قامت جسم کے مشابہ ہوتی ہے۔ فرض کرو اگر زید کے جسم کی جگہ اس کی روح حیوانی نکل کر بیٹھے اور زید کا جسم غائب ہو جائے تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہ زید نہیں بلکہ اس کی روح ہے۔

علما نے اس پر غور و فکر کرنے سے منع فرمایا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کشف المحجوب میں داتا صاحب نے فرمایا کہ روح مخلوق اور حکم الٰہی ہے۔ کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ یہ روح حیوانی صدیوں تک گردش میں رہتی ہے۔ اپنی ناتمام آرزؤں اور حسرتوں کے ساتھ۔ تمہاری کہانی میں بھی کچھ ایسا ہی دکھائی دے رہا ہے۔"

"امام صاحب، مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں۔" میں نے پوچھا۔ "میرے ساتھ آج جو کچھ بھی ہوا ہے وہ انتہائی حیرت انگیز ہے۔ کیا میں واقعی کسی جنم میں اس شہزادی کا محبوب رہ چکا ہوں۔"

"ہمارا مذہب ایسی باتوں کو نہیں مانتا۔" امام صاحب نے کہا۔ "یہ سب شیطانی چکر ہوتے ہیں جن کی اپنی بھی طاقت ہوتی ہے، اختیار ہوتا ہے۔ یہ طاقتیں نگاہوں کے سامنے حیرت انگیز مناظر پیدا کر دیتی ہیں اور ہم ان میں الجھ کر رہ جاتے ہیں۔"

"امام صاحب میرے لیے کیا مشورہ ہے۔" میں نے پوچھا۔

"بیٹا، تمہارے لیے سب سے بہتر یہی ہے کہ تم فوری طور پر واپس چلے جاؤ۔" امام صاحب نے کہا۔ "ورنہ یہ بھید تمہیں اپنے سحر میں جکڑ لے گا اور تم کہیں کے نہیں رہو گے۔"

"تو میں لہاسا کے لیے روانہ ہو جاؤں؟"

"ہاں فوراً۔ بغیر کسی تاخیر کے۔" امام صاحب نے کہا۔ "بلکہ تم کہو تو میں تمہیں وہاں تک بھیجنے کا بندوبست کر دوں۔ لوگ تمہیں وہاں تک پہنچا آئیں گے۔"

"یہ آپ کی مہربانی ہوگی امام صاحب۔"

"اب آؤ، گھر چلتے ہیں۔" امام صاحب نے کہا۔ "وہاں تمہارے لیے کچھ مہمان بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔"

میں امام صاحب کے ساتھ ان کے گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ دو چار اور بھی ہمارے ساتھ تھے۔ یہ مقامی مسلمان تھے جو وہاں چھوٹی موٹی تجارت کیا کرتے تھے۔

منگولین طرز کا بنا ہوا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔ اس مکان کے بیرونی دروازے کے ساتھ ایک پختہ صحن تھا۔ اس صحن کے بعد ایک دالان جس کی چھت کو لکڑیوں نے سہارا دے رکھا تھا۔ دالان میں کمرے بنے ہوئے تھے جن کے دروازوں پر پردے لٹک رہے تھے۔

صحن میں ایک بڑا سا دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ یہاں بھی چار پانچ افراد پہلے سے موجود تھے جو ہمیں دیکھ کر کھڑے ہو گئے تھے۔

امام صاحب نے ہر ایک سے تعارف کروایا تھا۔ یہ مقامی افراد تھے اور مسلمان تھے جنہیں امام صاحب نے میرے بارے میں صرف یہ بتایا تھا کہ میرے جہاز کو حادثہ پیش آ گیا تھا اور میں کسی طرح یہاں تک پہنچ گیا ہوں اور میرا تعلق پاکستان سے ہے۔

وہ سارے کھانے لانے لگے۔ یہ کھانے ہندوستانی طرز کے تھے کیونکہ امام صاحب کی بیوی کا تعلق ہندوستان سے تھا۔

بہت دنوں کے بعد اپنے ذائقے کے پکوان کھانے کا موقع مل رہا تھا اس لیے میں نے خوب پیٹ بھر کر کھایا تھا۔ کھانے کے بعد مقامی طور پر تیار کی ہوئی خاص چائے پینے کو دی گئی۔

بہت دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ اس کے بعد پڑوسیوں اور دیگر مہمانوں نے اجازت لی اور سوائے میرے سب رخصت ہو گئے۔

پھر میں نے بھی امام صاحب سے جانے کی اجازت طلب کی اور اسی وقت وہی پراسرار لڑکی میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی۔

☆☆☆

میں سکتے کے عالم میں اس کی طرف دیکھتا رہ گیا۔

یہ وہی لڑکی تھی۔ وہی دمکتا ہوا چہرہ۔ وہی ہونٹوں پر سجی ہوئی خوبصورت مسکراہٹ۔ وہی آنکھوں کی چمک اور وہی سفید لبادہ۔ وہ میرے سامنے آ کر کھڑی ہو گئی تھی اور اسے دیکھ کر مجھے خود اپنا ہوش نہیں رہا تھا۔ میں نے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے۔ "نہیں، خدا کے لیے نہیں۔" میں زور زور سے چیخ رہا تھا۔

"کیا ہوا بیٹے۔" امام صاحب نے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔ "کیا ہوا ہے تمہیں؟"

"امام صاحب، یہ..... یہ وہی لڑکی ہے۔" میں نے اس لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔

"کون لڑکی؟"

"وہی، میں نے جس کے بارے میں آپ کو بتایا تھا۔"

"بیٹا، یہ تو میری بیٹی ورشا ہے۔" امام صاحب نے بتایا۔

"کیا؟" میں نے اپنے چہرے سے ہاتھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بتا لیے۔ ”امام صاحب‘ یہ... یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔“

”ہاں‘ یہ میری بچی ہے زرینا۔“

”خدا کی قسم! یہ بالکل رہی ہے۔“ میں نے بتایا۔ ”امام صاحب آپ یقین کریں۔ اس لڑکی میں اور اس لڑکی میں ذرا بھی فرق نہیں ہے۔“

”میرے خدا!“ امام صاحب نے گہری سانس لی۔ ”اب میری سمجھ میں آ رہا ہے کہ مجھے کس قسم کے اشارے مل رہے تھے۔“ امام صاحب نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ ”بیٹھ جاؤ‘ بیٹا بیٹھو۔ زرینا تم بھی بیٹھو۔“ امام صاحب نے اپنی بچی سے کہا۔

اندر سے باہر آنے والی دو عورتیں تھیں۔ ایک تو زرینا ہی تھی۔ دوسری یقیناً زرینا کی ماں یعنی امام صاحب کی بیوی ہو سکتی تھیں۔

ہم سب پھر بیٹھ گئے۔ میری نگاہیں اس لڑکی کے چہرے پر مرکوز ہو کر رہ گئی تھیں۔ حالانکہ یہ بات تہذیب کے خلاف تھی۔ مجھے امام صاحب کی موجودگی میں ایسی حرکت نہیں کرنی چاہیے تھی۔ لیکن میں اپنے ہوش میں کہاں تھا۔

بالآخر کچھ دیر بعد امام صاحب نے مجھ سے کہا۔ ”بیٹا‘ یہ بھید اب اور بھی گہرا ہو گیا ہے۔ اس وقت میں سمجھ نہیں سکا۔ لیکن اب سمجھ میں آ گیا ہے۔“

”وہ بھید کیا ہے امام صاحب؟“ میں نے پوچھا۔

”بیٹا! وہ کچھ اشارے ہیں جو تمہارے بارے میں خواب میں مل رہے تھے۔“ امام صاحب نے بتایا۔ ”وہ خواب کچھ یوں تھا کہ ایک مہمان میرے گھر کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔ اس سے پہلے کہ میں دروازہ کھولوں اندر سے پھولوں کا ایک ہار نکلتا ہے جو تمہارے گلے کے گرد لپٹ جاتا ہے۔ میں ان پھولوں کو اچھی طرح پہچانتا ہوں۔ ہندوستان میں اس پھول کو لاجونتی کہتے ہیں لیکن یہاں کے لوگوں نے اپنی شہزادی کی محبت میں اس کا نام لی چانگ رکھ دیا ہے۔“

”اوہ!“ میں نے ایک گہری سانس لی۔ ”یہ تو عجیب بات ہے امام صاحب۔“

اس سے زیادہ عجیب یہ ہے کہ ہم نے تمہیں جن کھنڈروں میں دیکھا تھا‘ یہ پھول ان ہی کھنڈروں کے آس پاس پائے جاتے ہیں اور میری یہ زرینا ان پھولوں کی عاشق ہے۔“

”ہاں بابا۔“ زر لڑکی بھی بول پڑی۔ میں پہلی بار اس کی آواز سن رہا تھا اور یہ آواز بالکل اسی پُراسرار لڑکی کی آواز تھی‘ بالکل رہی۔ ”بابا مجھے لی چانگ کے پھول بہت اچھے لگتے ہیں۔“

”بیٹا‘ میں یہ خواب کئی بار دیکھ چکا ہوں۔“ امام صاحب بتا رہے تھے۔ ”لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ کیسا اشارہ ہے۔ خواب میں تمہارا چہرہ واضح تھا۔ اس لیے میں نے تمہیں دیکھتے ہی تم سے کہا تھا کہ مجھے تمہارا ہی انتظار تھا۔ لیکن پھولوں کی علامت سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ اب سمجھ میں آ گئی ہے۔“

”بابا‘ اب میں آپ کو ایک بات بتاؤں۔“ زرینا نے کہا۔ ”میں نے یہ بات پہلے کسی کو نہیں بتائی۔ اس لیے کہ میں خود بہت الجھی ہوئی تھی۔ میری سمجھ میں کچھ نہیں آتا تھا لیکن اب ان کو دیکھ کر سمجھ میں آ گیا ہے۔ میں ان کو بہت دنوں سے جانتی ہوں...!“

”کیا...!“ میں اور امام صاحب دونوں ہی چونک اٹھے تھے۔ ”تم کس طرح جانتی ہو؟“ امام صاحب نے پوچھا۔

”میں کئی بار اپنے خواب میں ان کے گھر جا چکی ہوں۔“ زرینا نے بتایا۔

”بیٹا تم یہ کیا کہہ رہی ہو۔“

”میں سچ کہہ رہی ہوں بابا۔ میں نے کئی بار اپنے خواب میں ان کا گھر دیکھا ہے۔ خود ان کو دیکھا ہے۔ ان کے گھر کی ایک ایک تفصیل مجھے یاد ہے۔ اگر کہیں تو میں بتا دوں۔“

”ہاں بتاؤ۔“ میں نے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ اس لڑکی کی طرف دیکھا۔

اس نے میرے گھر کے بارے میں بتانا شروع کر دیا۔ وہ آنکھیں بند کر کے اس طرح بول رہی تھی جیسے اپنے تصور کی آنکھ سے میرے گھر کو دیکھ رہی ہو اور یاد کر کر کے بتا رہی ہو۔

حیرت انگیز طور پر اس نے سب کچھ صحیح بتایا تھا۔ دیواروں اور پردوں کے رنگ تک بتا دیے تھے۔ میری خواب گاہ میں کون کون سی چیزیں تھیں وہ بھی اس نے بتا دی تھیں۔

”امام صاحب‘ یہ سب بالکل درست ہے۔“ میں نے ہوش میں آنے کے بعد کہا۔ ”زرینا نے جو کچھ بتایا ہے۔ میرا گھر بالکل ویسا ہی ہے۔“

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اب اس عجوبہ کا دائرہ اور وسیع ہو گیا تھا۔

پہلے یہ عجوبہ میرا ذاتی تھا۔ صرف مجھ ہی پر گزر رہی تھی۔ لیکن اب امام صاحب اور ان کی بیٹی بھی اس کہانی کے کردار بن گئے تھے۔

کیا تھا یہ سب؟ قدرت مجھے کہاں سے کہاں کس کے لیے لے آئی تھی۔ کیا یہ سب کچھ لوحِ محفوظ پر تحریر ہوگا۔ میں اس رات واپس کوہان کے پاس آ گیا۔

اس شخص کو ابھی تک میری کہانی کے بارے میں کچھ نہیں معلوم تھا۔ وہ صرف اتنا ہی سمجھ رہا تھا کہ ایک حادثہ کہانی مجھے اس مقام تک لے آیا ہے۔

میں وہاں پہنچا تو وہ میرے انتظار میں تھا۔ ”کہاں چلے گئے تھے تم؟“ اس نے پوچھا۔

”امام صاحب کے پاس۔“

”کیا تم جانتے ہو کہ تم نے جو دیے روشن کیے تھے، وہ جلتے رہے ہیں۔ تیز ہواؤں کے باوجود۔“

”ہاں، اور تمہاری بہن کا دیا بھی جلتا رہا تھا۔“

”جانتے ہو اس کا کیا مطلب ہے؟“

”نہیں، مجھے کوئی اندازہ نہیں ہے۔“

”حارث، اس کا مطلب ہے... ہوا کہ تمہیں اور میری بہن کو بھی اپنی محبت میں کامیابی ہوگی۔“ اس نے بتایا۔ ”وہ دیے قدرت کے ہاتھوں نے علامت کے طور پر روشن رکھے تھے۔“

”میرے دوست، میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا کہ میرے اردگرد کیا ہو رہا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میں تو ایک عجیب کردار بن گیا ہوں۔“

”فی الحال بھول جاؤ یہ سب۔“ اس نے کہا۔ ”اور ہمارے اس تہوار کی رنگا رنگی کا حصہ بن جاؤ۔ کچھ دیر میں رقص اور موسیقی شروع ہو جائے گی۔ اسی پگوڈا کے پاس۔“

”جان کہاں ہے؟“

”پتا نہیں۔ وہ بھی شاید کہیں تفریح کے لیے گیا ہوگا۔“

کچھ دیر بعد موسیقی کی آوازیں آنے لگیں۔ میں اپنے خیمے سے باہر آ گیا۔ اس وقت خاصی رات ہو چکی تھی۔ لیکن ہر طرف روشنیاں جل رہی تھیں۔

معبد گاہ کی سیڑھیوں پر سازندے کھڑے روایتی ساز بجا رہے تھے۔ یہ بگل نما قسم کے ساز تھے۔ بہت لانبے۔ ان کے ساتھ زرم بجائے جا رہے تھے اور مقدس نغمات گائے جا رہے تھے۔

میرے لیے پراسرار اور اجنبی ہونے کے باوجود یہ سب بہت مانوس محسوس ہو رہا تھا۔ جیسے میں بھی کبھی ان کا حصہ رہ چکا ہوں۔

میں اس بھیڑ کے درمیان بھی اکیلا ہی تھا۔

میری نگاہیں نہ جانے کس کو تلاش کر رہی تھیں۔

اچانک کسی نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے حیرت سے ہاتھ تھامنے والی کو دیکھا اور دنگ ہو کر رہ گیا۔ یہ وہی تھی۔ وہی پراسرار لڑکی۔

”تک... کون ہو تم۔“

”ورشا۔ امام صاحب کی لڑکی۔“ اس نے مسکرا کر بتایا۔ ”میں تمہاری تلاش میں تمہارے خیمے تک گئی تھی۔ وہاں سے یہاں تک تمہیں ڈھونڈتی ہوئی آئی ہوں۔ آؤ میرے ساتھ۔“

ہم جیسے عام انسانوں اور سوچنے والوں کے درمیان یہی فرق ہے کہ وہ اپنی غلطیوں اور خطاؤں سے بھی کوئی نہ کوئی مفید پہلو نکال ہی لیتے ہیں کہ اس تخریب میں مضمر ہے ایک تعمیر کی صورت۔

اور ہمارا یہ حال ہے کہ ہم تعمیر میں تخریب کے بہانے تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ ایسی ہی صورت حال پلاسٹک کی ایجاد کے ساتھ ہوئی تھی۔

چارلس گڈ ایئر ربر کی کوئی اور قسم بنانے کے لیے تجربے کر رہا تھا۔

اس نے ربڑ اور سلفر کے ملغوبے کو ایک برتن میں رکھ کر اسٹو پر رکھ دیا۔ اس کا خیال تھا کہ اسٹو بجھا ہوا تھا۔ اس میں آگ نہیں ہے۔ پھر وہ کسی کام سے باہر جا گیا۔ ایک گھنٹے بعد اسے یاد آیا کہ اس نے چولہا تو بند ہی نہیں کیا تھا۔ وہ دوڑتا ہوا گھر آیا۔ چولہے کی طرف دیکھا اور یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ سلفر اور چونے کے اشتراک سے کوئی اور چیز بن گئی تھی... اور یہی پلاسٹک تھی۔ اس کے بعد اس نے مزید تجربات کیے اور لوگوں نے بھی اس فیلڈ میں کام کیا... اور آج کی پلاسٹک آپ کے سامنے ہے۔

یعنی ایک غلطی ایسی ہی ہوتی ہے جو مفید ثابت ہو جاتی ہے۔

مرسلہ: اعجاز فرحت، سکھر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھ پر پھر بے خودی طاری ہو چکی تھی۔ دربشا میں بھی وہی کشش تھی۔ وہی سحر تھا جو اس لڑکی میں تھا کیونکہ یہ بھی تو وہی تھی، اس جیسی۔

میں اس کے ساتھ چل پڑا۔ اس نے گرچہ میرا ہاتھ چھوڑ دیا تھا لیکن میں جیسے اس کے ساتھ بندھا ہوا چلا جا رہا تھا۔

ہم ایک بار پھر ان ہی کھنڈروں کی طرف جا رہے تھے۔

فرق یہ تھا کہ پہلے میں اس پُراسرار لڑکی کے ساتھ جا رہا تھا اور اس بار دربشا مجھے اپنے ساتھ لے جا رہی تھی۔ بالآخر ہم شور مچانے اور تفریح کرنے لوگوں کو بہت پیچھے چھوڑ کر اس کھنڈر کے پاس آ گئے۔

"حماد صاحب، میں نے یہ سنا تھا کہ آپ کل صبح یہاں سے چلے جائیں گے۔" دربشا نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں۔ کیونکہ یہاں رہنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔"

"جواز تو ہے حماد صاحب۔" اس نے کہا۔ "کیونکہ آپ کو اپنا فرض پورا کر کے جانا ہے۔"

"کیسا فرض؟"

"میں نے بابا کو بھی اس بارے میں کچھ نہیں بتایا ہے۔" اس نے کہا۔ "کیونکہ خود میری سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔ میں برسوں سے اپنے آپ کو خواب میں دیکھتی آ رہی ہوں۔"

"اپنے آپ کو۔"

"ہاں۔" وہ کھوئے کھوئے انداز میں بول رہی تھی۔ "میں نے اپنے آپ کو شہزادی کے روپ میں دیکھا ہے۔ میرے جسم پر بھی سفید لبادہ ہوتا ہے اور میں آپ کے ساتھ پہاڑوں میں گھومتی رہتی ہوں۔ اس کے بعد خوابوں کا وہ سلسلہ شروع ہوا جو میں آپ کو بتا چکی ہوں یعنی میں نے خود کو آپ کے گھر میں دیکھا ہے۔"

"یہ سب بہت حیرت انگیز ہے دربشا۔ اس کا کیا مطلب ہوتا ہے۔"

"اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ قدرت نے ہم دونوں کو کسی بندھن سے باندھ دیا ہے۔" اس نے کہا۔ "اور یہ بندھن اس وقت اور بھی مضبوط ہو گیا جب آپ نے میرا بوسہ لیا تھا۔"

"کیا!" میں بری طرح چونک اٹھا تھا۔ "تمہارا بوسہ!"

"ہاں، میں نہ جانے کیوں ان کھنڈروں میں بھٹکتی رہتی ہوں۔ خدا جانے اس جگہ سے میرا کیا تعلق ہے۔" اس نے کہا۔ "آج بھی میں یہاں تھی جب میں نے آپ کو آتے ہوئے دیکھا۔ آپ کا چہرہ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ میں آپ کو پہچان کر دنگ رہ گئی تھی کیونکہ آپ تو وہی تھے، میرے خوابوں والے۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ میں بے خود ہو کر آپ کے بازوؤں میں سما گئی اور اسی وقت بابا کی آواز آئی، ٹارچ کی روشنیاں لہرائیں اور میں جلدی سے ایک طرف چھپ گئی۔"

"کیا! کیا تم مندر کی سیڑھیوں پر بھی تھیں۔ کیا میں تمہارے ہی پیچھے یہاں تک آیا تھا۔"

"نہیں تو۔ میں تو مندر کی طرف گئی بھی نہیں تھی۔" اس نے بتایا۔ "میں تو گھر سے سیدھی یہیں آ گئی تھی۔"

"او خدا! اسی لیے وہ ہیولا مجھے گوشت پوست کا جاندار محسوس ہوا تھا کیونکہ وہ تم تھیں۔"

☆☆☆

میں ایک بار پھر موتک کے پاس بیٹھا ہوا تھا۔ کوپان بھی ساتھ تھا۔ وہ رات گزر چکی تھی۔ میں نے تقدیر کے آگے اپنی گردن جھکا دی تھی۔ میں یہ جان گیا تھا کہ تقدیر مجھے یوں ہی یہاں تک نہیں لائی ہے۔

موتک نے بہت گرم جوشی سے میرا استقبال کیا تھا۔ "میرے بیٹے وہ وقت آ گیا ہے جب تمہیں سب کچھ بتا دیا جائے اور تم سے وہ کام لیا جائے جس کے لیے تم یہاں تک لائے گئے ہو۔"

"جی ہاں محترم! میں حاضر ہوں۔"

"نوجوان، کیا تمہیں اندازہ ہے کہ ہماری محترم شہزادی لی چانگ کے محبوب تم ہو۔"

"مقدس موتک، یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔" کوپان اچھل پڑا تھا۔

موتک کے ہونٹوں پر ایک بھید بھری مسکراہٹ نمودار ہو گئی۔ اس نے کوپان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "وہی جو تمہارے کانوں نے سنا ہے۔ اس بدنصیب شہزادی کا محبوب یہی تمہارا دوست ہے۔ جسے وقت کی طنابیں حادثے کی شکل میں کھینچ کر یہاں تک لے آئی ہیں۔ اس کا یہاں آنا مقدر ہو چکا تھا۔ جس وقت یہ تمہارے ساتھ داخل ہوا تھا، میں اسے دیکھ کر چونک اٹھا تھا کیونکہ میں اس کی تصویر سیکڑوں بار

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دیکھ چکا ہوں۔"

"آپ شاید ٹھیک کہتے ہیں محترم۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ میرے ساتھ خود ایسے واقعات پیش آچکے ہیں۔"

پھر میں نے بتایا کہ میرے ساتھ کیا کیا گزری ہے۔ کوپان تو حیرت سے سنتا رہا تھا لیکن موںک کے تاثرات ایسے تھے جیسے وہ سب کچھ جانتا ہو۔

میرے خاموش ہوجانے کے بعد اس نے کہا۔ "نوجوان، تم آج کے انسان ہو یا قدیم دور کے۔ ہمارے لیے احترام کے قابل اس لیے ہو کہ تمہارا تعلق ہماری مقدس شہزادی سے ہے۔ ہم اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ اب میں یہ نہیں جانتا کہ یہ سب کچھ کیسے ہوا ہوگا لیکن ہوچکا ہے۔"

"محترم! عقل پھر بھی تسلیم نہیں کرتی۔ لیکن......"

"عقل کی رفتار بھی ایک حد پر آکر تھم جاتی ہے۔" موںک نے کہا۔ "تمہارا کھڑکی سے کشتی کا منظر دیکھنا۔ بھٹکی ہوئی شہزادی کا تمہارے پاس آنا۔ تم سے باتیں کرنا۔ حالانکہ صدیوں کے فاصلے بھی درمیان میں ہیں۔ پھر شہزادی کا تمہاری اپنی زبان میں تم سے گفتگو کرنا۔ اپنے بارے میں بتانا۔ شاوک کا نام بتانا۔ غرضیکہ یہ سب ایسے معاملات ہیں جو سمجھ سے باہر ہیں۔ اس کے باوجود تم ایک زندہ حقیقت کی طرح ہمارے سامنے بیٹھے ہو۔"

"حیرت انگیز معاملات ہیں محترم۔" میں نے کہا۔ "میرا چین کے سفر پر جانا۔ راستے میں جہاز کی تباہی۔ میرا زندہ بچ نکلنا۔ اور اسی جگہ آجانا جہاں کے لیے اس لڑکی نے مجھے اشارے دیے تھے۔"

"یہ تم خود سے نہیں آئے ہو۔" موںک میری طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "تمہیں قدرت نے یہاں پہنچایا ہے۔ شاید قدرت بھی چاہتی ہے کہ تم اپنا فرض پورا کر جاؤ۔ اس بدنصیب کی آخری رسومات کی ذمہ داری تمہارے سپرد کی گئی تھی۔ اسی لیے تمہیں یہ سب تو کرنا ہی تھا۔ یہاں تو آنا ہی تھا۔"

"جی ہاں محترم! اب تو یہی لگ رہا ہے۔"

"میرے دوست مجھے یہ اندازہ نہیں تھا کہ تم ہمارے لیے اتنے مقدس ہو۔" کوپان نے عقیدت بھری نگاہوں سے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم آسمانوں سے اتر کر ہمارے پاس آئے ہو۔ اور واقعی تم آسمان ہی سے آئے تھے۔ اب صدیوں تک ہمارے قبیلے کی عزت صرف تمہاری وجہ سے کی جائے گی کہ ہم نے تمہیں اپنا مہمان بنایا تھا۔"

"جانتے ہو ہماری قدیم کتابوں میں لی چانگ کی آخری وصیت کے بارے میں کیا تحریر ہے۔"

"نہیں جناب! میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔"

"میں بتاتا ہوں۔ تحریر یہ ہے کہ اس کی لاش کو بالاش کے بتایا بات کہ اس کے محبوب کے ہاتھوں کریا کرم ہو؟ ہے۔ یعنی اس کا محبوب آخری رسومات کی ادائیگی کرے گا۔ تب جاکر اس کی بھٹکی ہوئی روح کو سکون ملے گا۔"

"محترم! ضروری بات تو یہ ہے کہ کیا اس کی لاش اب تک محفوظ ہے؟"

"نوجوان اس کی لاش تو محفوظ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ کئی بار مرچکی ہے۔ آخری بار اس کی کشتی سمندر میں ڈوب گئی تھی۔ البتہ اسی معبد میں ایک صندوق ہے۔ جس میں اس زمانے کے کسی مصور نے اس کی اور اس کے محبوب کی روغنی تصویر بنائی تھی وہ ابھی تک اپنی اصل حالت میں محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ اس صندوق میں اس کے کپڑے ہیں۔ اس کے سنگھار کا سامان ہے۔ اس کے محبوب کو بس یہ کرنا ہے کہ وہ اس صندوق کو اپنے ہاتھوں میں اٹھا کر Yarlung Tsang po دریا میں بہا دے۔ اس بدنصیب شہزادی کی روح کو سکون مل جائے گا۔"

"جناب، کیا میں وہ صندوق دیکھ سکتا ہوں۔" میں نے موںک سے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ اب تو تمہاری ہی امانت ہے۔" موںک نے کہا۔ "آؤ میرے ساتھ۔" پھر اس نے کوپان سے کہا۔ "تم بھی آؤ تاکہ تم ایک گواہ کے طور پر ہمارے ساتھ رہو۔"

موںک مجھے اور کوپان کو اس کمرے سے باہر لے آیا۔ ایک اور کمرا۔ اس کے بعد ایک راہداری جس کے آخر میں بنے ہوئے ایک کمرے میں سیڑھیاں نیچے اتر رہی تھیں۔

راستے میں ملنے والے لوگ بڑے احترام سے سلام کرتے رہے تھے۔

ہم کئی سیڑھیاں اترتے ہوئے تہ خانے میں پہنچ گئے۔ یہاں ہر طرف کافوری شمعیں روشن تھیں جن کی بو پورے تہ خانے میں پھیلی ہوئی تھی۔

تہ خانہ میں ایک بڑا سا مجسمہ ایک اونچے سے پلیٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

فارم پر تھا۔ اور اس پلیٹ فارم پر ایک صندوق رکھا ہوا تھا۔ یہ لکڑی کا بنا ہوا بہت بڑا صندوق تھا جس کی حالت بہت خستہ ہو رہی تھی۔

موبنگ نے بلند آواز میں کوئی اشلوک پڑھنا شروع کر دیا۔ موبنگ نے ہم دونوں کو اشارہ کیا کہ ہم اپنے جوتے اتار دیں۔

ہم دونوں نے جوتے اتار دیے اور پلیٹ فارم پر آ گئے۔ موبنگ نے دیوار پر لگی ہوئی ایک جلتی ہوئی مشعل اتار لی۔

شاید یہاں روشنی کا مستقل بندوبست کیا جاتا ہوگا۔

موبنگ نے وہ مشعل جوہان کے ہاتھ میں دے دی اور خود صندوق کا ڈھکن آہستہ آہستہ کھولنے لگا۔ صندوق کے اندر ایک رنگین تصویر تھی۔ کسی ماہر مصور کی بنائی ہوئی تھی۔ جو کیمرے سے کھینچی ہوئی تصویر کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔

موبنگ نے وہ تصویر صندوق سے نکال لی۔ مشعل کی روشنی قریب آئی اور میں حیرت سے گنگ رہ گیا۔ وہ تصویر اسی پُراسرار لڑکی کی تھی جس کا نام لی چانگ تھا اور اس کے ساتھ کھڑا ہوا آدمی میں تھا، سو فیصد میں۔ وہ میرے علاوہ اور کوئی ہو ہی نہیں سکتا تھا۔

"اب یہ دیکھو۔" موبنگ نے صندوق میں رکھے ہوئے لبادے کی طرف اشارہ کیا۔

وہ سفید رنگ کا لبادہ تھا۔ ویسا ہی جیسا میں اس لڑکی کے جسم پر کئی بار دیکھ چکا تھا۔ "محترم! یہ...... یہ سب کچھ میری سمجھ سے باہر ہے۔ یہ تو وہی لڑکی ہے اور یہ میں ہوں۔ اور یہ اس کا لبادہ ہے۔"

"اب اس لبادے کو چھو کر دیکھو۔" موبنگ نے کہا۔

میں نے اس لبادے کو چھو کر دیکھا۔ وہ بھیگا ہوا تھا جس طرح میں کئی بار پہلے دیکھ چکا تھا۔

☆☆☆

میں جیسے خوابوں کے درمیان سفر کر رہا تھا۔

اس شہزادی کی آخری رسومات میرے ہاتھوں ہو رہی تھیں۔ میں لکڑی کے اس صندوق کو اٹھائے دریا کی طرف جا رہا تھا۔ میرے پیچھے ہزاروں کا مجمع تھا۔

یہ لوگ وہی گیت گا رہے تھے جو میں نے اپنی خواب گاہ میں سنا تھا۔ یہ جلوس صدیوں کے بعد اپنی منزل کی طرف جا رہا تھا اور اس کا مرکزی کردار میں تھا۔

سب کچھ خواب اور حقیقت کے درمیان تھا۔ میں نے ان لوگوں کے مقدس کلمات کے ساتھ اس صندوق کو دریا کے حوالے کر دیا۔

شاید صدیوں کے بعد اس شہزادی کی روح کو سکون مل گیا ہوگا۔ اس کے محبوب نے اس کی وصیت پوری کر دی تھی۔

اس کے بعد کے مرحلے بھی کچھ کم نہیں تھے۔

اس شہر میں خود میری حیثیت بھی بہت مقدس ہو گئی تھی۔ مجھے اس بات کی خوشی تھی کہ میری وجہ سے ایک بے چین روح نے سکون پالیا ہوگا۔

کیا یہ ممکن ہے یا نہیں ہے! میں یہ سب نہیں جانتا۔ میرے ساتھ جو بھی گزری ہے وہ میں نے اپنی داستان میں تحریر کر دی ہے۔

میں نے بڑی مشکلوں سے ان لوگوں سے اجازت لی تھی۔ ہاں، ایک اور واقعہ ہوا تھا۔ جب میں نے جوہان سے چلنے کے لیے کہا تو اس نے انکار کر دیا تھا۔ "نہیں دوست، میں اب نہیں جا سکوں گا۔"

"وہ کیوں؟"

"یار اس لڑکی کے آنسوؤں نے میرا راستہ روک لیا ہے۔ میں اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ مجھے محبت مل گئی ہے۔"

"مبارک ہو تمہیں۔" میں نے اسے گلے سے لگا لیا۔ "اس محبت کی قدر کرنا دوست۔ ان کے لیے محبت زندگی اور موت کا مسئلہ ہوا کرتا ہے۔"

"ہاں یار، محبت میں واقعی بہت طاقت ہوا کرتی ہے۔" جوہان نے کہا۔ "اس کے جاہ سے ہو سکے جب نے اپنا کام کر دکھایا۔ جس بار تمہارا وہ بھی تو چلتا رہا تھا۔ اس کا کیا ہوگا۔"

"وہ بھی اپنا کام دکھا چکا ہے۔" میں نے بتایا۔ "میں امام صاحب کی بیٹی وریشا سے شادی کر رہا ہوں۔"

"کیا!" جوہان خوش ہو گیا تھا۔

"ہاں یار، بزرگ کہتے ہیں کہ محبت جہاں سے ملے حاصل کر لو۔ مجھے اپنا جیون ساتھی شاید یہیں سے ملنا تھا۔ اسی لیے قدرت اپنے عجیب انداز سے مجھے یہاں تک لے آئی ہے۔"

ان واقعات کو برسوں گزر چکے ہیں۔ میں اپنے ملک واپس آ گیا ہوں۔ وہ پُراسرار لڑکی اب دکھائی نہیں دیتی۔ اس کی ضرورت بھی نہیں ہے کیونکہ میری محبت میرے پاس ہی ہے۔ وریشا میری بیوی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جہنمی آگ

ابن کبیر

امریکا کی تاریخ کا ایک ہولناک واقعہ جس نے ہر طرف خوف وہراس پیدا کر دیا تھا۔ اتنے سال گزرنے کے بعد بھی لوگ اس واقعے کو بھول نہیں پائے ہیں۔ ایک ہلکی سی کوتاہی نے اتنے بڑے سانحے کو جنم دے دیا اور اتنی بڑی تعداد میں لوگ جان سے ہار گئے۔

امریکی تاریخ کی ایک بڑی آتش زدگی کا قصہ

اُس شام بروف کا بدن اندر ہی اندر جھلس رہا تھا۔

ہوٹل میں ایک بڑی ضیافت کا اہتمام کیا گیا تھا۔ ہوٹل کے مالک کی حیثیت سے اسے اختتامی کلمات کہنے تھے۔ وہ ایسا بارہا کر چکا تھا مگر 6 دسمبر کی وہ شام کچھ عجیب تھی۔ بروف کو یوں لگ رہا تھا جیسے اس ہوٹل میں کچھ [illegible] ہو۔ اس نے مائیک پر آنے سے معذرت کر لی اور پچھلی صفوں میں بیٹھا سرخ شراب کے گھونٹ لیتا رہا۔

اس شاندار ہوٹل میں معمول کی چہل پہل تھی۔ زرق

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

برقی ملبوسات میں اعلیٰ طبقے کی خواتین سرگوشیوں میں باتیں کر رہی تھیں۔ مہنگے سوٹ میں ملبوس تاجر اور سرکاری افسر خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ تیزی سے آنے جانے رپورٹر بھی نے خیال اظہار کے تھے۔ ہوٹل منیجر جون اسٹن بھی انتہائی قیمتی سوٹ پہنے، مسکراہٹ ہونٹوں پر سجائے ہال کے دروازے پر کھڑا تھا۔ ایک کونے میں موسیقاروں کا گروہ راکس بجا رہا تھا۔

اس بھری پری محفل میں ڈبلیو ایف رگکوف شہر اطلانٹا کا رئیس ترین آدمی بالکل تنہا تھا۔ اس نے گہرا سانس لیا۔ اندر کی جلن بڑھ گئی۔ جی متلانے لگا۔ اسے نے محسوس ہوئی۔

اس کیفیت کا آغاز آج صبح کے واقعے سے ہوا۔ اسے ایک سستا سا، زرد رنگ کا لفافہ موصول ہوا تھا۔ چاک کیا تو ایک بوسیدہ کاغذ برآمد ہوا جس کے کنارے جلے ہوئے تھے۔ وہ کسی بچے کے ہاتھ کی بنی ڈرائنگ تھی۔ شاید کوئی چرچ۔ شاید کسی اسکول کی عمارت۔

وہ اس ناقابل فہم پیغام میں الجھا ہوا تھا کہ میز پر دھرا ٹیلی فون بجا۔ اس نے ریسیور اٹھایا۔ کافی دیر تک وہ ہیلو ہیلو کرتا رہا۔ جب ریسیور رکھنے کو تھا تو ایک بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔

"رگکوف، کیسے ہو؟"

"کون۔ کون صاحب بات کر رہے ہیں؟" اس بے تکلفی نے اُسے کچھ حیران کر دیا۔ شہر کا رئیس سے رئیس آدمی بھی اسے انتہائی احترام سے مخاطب کیا کرتا تھا۔ آخر وہ رگکوف جیسے بڑے اور مہنگے ہوٹل کا مالک تھا۔

"ایک لفافہ بھجوایا تھا تمہارے نام۔ مل تو گیا ہوگا؟" دوسری طرف موجود شخص نے اپنا تعارف کروانے کی زحمت نہیں کی۔

"ہاں مل گیا۔" اس نے ایک بار پھر ڈرائنگ پر نظر ڈالی۔ "مگر میں سمجھ نہیں سکا جناب۔"

"افسوس رگکوف افسوس۔ تم اپنا بچپن بھول گئے۔" کچھ دیر دوسری طرف خاموشی چھائی رہی۔ "خیر جلد تمہیں سب یاد آ جائے گا۔ تمہارا بچپن، تمہارا اسکول، اور تمہارے دوست۔ سب کچھ۔ آگ بے حد نزدیک ہے۔"

ان الفاظ کے ساتھ لائن کٹ گئی۔ اضطراب نے رگکوف کو گھیر لیا۔ کچھ دیر وہ خاموش بیٹھا ذہن پر زور ڈالتا رہا۔ ماضی بازیافت کرنے کی کوشش کی۔ اپنا بچپن یاد کیا جو مختلف شہروں میں گزرا تھا۔ ان اسکولوں کے بارے میں سوچا جہاں وہ زیر تعلیم رہا۔ اس زمانے کے دوستوں کے چہرے ذہن میں تازہ کرنے کی کوشش کی، مگر کچھ یاد نہیں آیا۔

"کیا کبھی کوئی حادثہ ہوا تھا؟" اس نے سوچا۔ "کسی طالب علم کی آتشزدگی میں موت ہوئی تھی؟ اور یہ ڈرائنگ..... یہ جلی ہوئی کیوں ہے؟"

اس نے ذہن پر بہت زور ڈالا مگر کچھ یاد نہیں آیا۔ بے چینی بڑھتی گئی۔ اس نے منیجر جون اسٹن کو کمرے میں بلوا لیا۔

جون ایک پُرجوش اور خوش شکل نوجوان تھا۔ اس نے رگکوف کی باتیں سن کر قہقہہ لگایا۔ "سر کوئی پاجی آپ کو ستا رہا ہے۔ ٹھگوں نے نئے نئے طریقے اپنا لیے ہیں۔ آپ کیوں پریشان ہوتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے۔" بوڑھا رگکوف کھسیانی ہنسی ہنسا مگر بے چینی کم نہیں ہوئی۔ "ڈ بے آگ سے نمٹنے کے انتظامات تو پورے ہیں ناں؟"

"آگ... آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں جناب۔" جون کے لہجے میں حیرت تھی۔ "ہمارے ہر اشتہار میں اس نکتے کی تشہیر کی جاتی ہے کہ رگکوف ہوٹل مکمل فائر پروف ہے۔ بلکہ آپ ہی نے تو اشتہار میں یہ الفاظ شامل کروائے تھے۔"

"اوہ، ہاں یاد آیا۔" وہ جھینپ گیا۔ "بارہ انچ موٹی دیواروں کو بھلا آگ کیا نقصان پہنچائے گی۔"

"بالکل جناب۔" منیجر نے تالی بجائی۔ "کیا آپ کچھ وائن لینا پسند کریں گے۔"

"ہاں ضرور۔" اس نے رعب سے کہا۔

جون چلا گیا۔ چند لمحوں بعد میز پر وائن کا گلاس رکھا تھا مگر وہ بہت دیر تک یونہی پڑا رہا کیونکہ رگکوف اندر ہی اندر کھولتا رہا تھا۔ وہ اس پراسرار کال کی وجہ سے لاعلم تھا۔

☆☆☆☆

"جناب رگکوف کیسے مزاج ہیں؟"

اسے ایک شوخ آواز سنائی دی۔ رگکوف پلٹا۔ ایک خوبرو، گھنگھریالے بالوں والی ایک لڑکی اس کے سامنے کھڑی تھی۔ اس کی نیلی آنکھوں میں شناسائی تھی۔ رگکوف کی بے زحمت خاموشی کے بعد پریشانی میں بدلنے لگی۔

"میں ڈیزی میکب۔ آپ سے گزشتہ ہفتے ہمارے میوزیم میں ملاقات ہوئی تھی۔"

"اوہ مس میکب۔ کیسے مزاج ہیں؟" رگکوف نے یوں ظاہر کیا، جیسے وہ اسے پہچان گیا ہو۔

"میں طلبا کے ایک وفد کے ساتھ اسی ہوٹل میں ٹھہری ہوئی ہوں۔" لڑکی مسکرائی۔ "اگلے چند روز ہم آپ کے مہمان

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہا۔"

"خوش آمدید۔" وکوف پھر سنبھل گیا۔ "آپ کی آمد ہماری خوش نصیبی ہے۔ فرمائیں خاکسار کیا خدمت کر سکتا ہے؟"

"دراصل جس تنظیم نے ہمارے اطالیا کے دورے کا انتظام کیا ہے، اس کے لیے مجھے ایک رپورٹ مرتب کرنی ہے۔ میں اس عالی شان ہوٹل کے بارے میں بھی معلومات اکٹھی کرنا چاہتی ہوں۔"

"ضرور۔" وکوف مسکرایا۔ اس نے ہال کی سمت دیکھا۔ تقریب ستم چکی تھی۔ بیشتر مہمان گھروں کو لوٹ گئے تھے۔ ہوٹل میں ٹھہرے ہوئے افراد لفٹ کی سمت جا رہے تھے۔ اس نے جون کو آواز دی۔ وہ دوڑا چلا آیا۔

"محترمہ بینکیب ہوٹل کی تاریخ کے بارے میں کچھ جاننا چاہتی ہیں۔" وہ لڑکی کی سمت مڑا۔ "مسٹر جون آپ کو تمام معلومات فراہم کر دیں گے۔ تو کل صبح ملتے ہیں محترمہ۔ الوداع۔"

وکوف نے ہاتھ آگے بڑھایا۔ لڑکی نے مصافحہ کیا۔ اُسے وکوف کا ہاتھ گرم اور سخت محسوس ہوا۔ بوڑھا آدمی بوجھل قدموں سے لفٹ کی سمت چلا گیا۔ اضطراب اس میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

"جناب وکوف کی طبیعت کچھ ناساز ہے۔" جون مسکرایا۔ لڑکی نے سر ہلایا۔ اس کی نیلی آنکھیں وکوف پر لگی تھیں، جس کے جھکے ہوئے کاندھے ایک شکستہ انسان کی کہانی بیان کر رہے تھے۔

بوڑھا اسی ہوٹل کے ایک اپارٹمنٹ میں رہائش پذیر تھا۔ لفٹ مین نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ وکوف مسکرایا اور سر کے اشارے سے جواب دیا۔

یہ آخری موقع تھا جب کسی نے وکوف کو مسکراتے دیکھا۔ وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا اور ڈھیلے بدن کے ساتھ بستر پر گر گیا۔

☆☆☆☆

"یہ پندرہ منزلہ شاہکار 1913ء میں تعمیر کیا گیا تھا۔"

جون لڑکی کو ہوٹل سے متعلق معلومات فراہم کر رہا تھا۔

لڑکی اپنا دایاں ہاتھ رجسٹر پر جھٹک رہی تھی۔ اسے ہتھیلی پر خارش محسوس ہو رہی تھی۔

"اپنی تعمیر کے وقت یہ شہر کی بلند ترین عمارت تھی۔ اور آج بھی چند ہی عمارتیں اس کی قامت کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔

البتہ سروس کے معاملے میں ہم اطالیا کے تمام ہوٹلوں سے آگے ہیں۔ وکوف خاندان نے بالخصوص پیچ ژری انٹیریئر کو چنا۔ انہیں اندازہ تھا کہ جلد یہ شہر کی شہ رگ کی حیثیت اختیار کر جائے گی۔ اس کا ڈھانچہ بہترین اسٹیل کا ہے۔ پہلی دو منزلیں انتظامی امور اور تقریبات کے لیے وقف ہیں، تیسری سے پندرہویں منزل تک کا حصہ مہمانوں کے لیے ہے۔"

جون بتا تا رہا اور لڑکی بے چینی سے ہاتھ جھٹکتی رہی۔ وکوف کے ہاتھ نے اس میں بے چینی سی پیدا کر دی تھی۔

"اس کا چکردار زینہ معروف آرکیٹیکٹ زولیاں نے ڈیزائن کیا ہے۔ اس میں دو لفٹ ہیں اور..." اچانک اسے اپنے باس سے ہونے والی صبح کی گفتگو یاد آئی۔ "اور یہ مکمل فائر پروف ہے۔" وہ مسکرایا۔

"ہاں میں نے سنا تھا کہ یہاں آگ سے نمٹنے کا بہترین انتظام ہے۔" زیزی بھی جواباً مسکرائی۔

"بالکل۔ بارہ انچ موٹی دیواروں کو آگ قطعی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ پھر فائر الارم ہے۔ آگ بجھانے والے آلات ہیں... آپ چھت پر نصب آلات دیکھ سکتی ہیں۔ دھواں ان تک پہنچا نہیں کہ پانی کا چھڑکاؤ شروع ہو گیا۔"

"بلاشبہ۔ اور ہنگامی دروازے تو سب سے اہم ہیں، نہیں؟" زیزی نے بات آگے بڑھائی۔

"اوہ... ہنگامی دروازے... جی جی بالکل۔" منیجر ہکلایا۔ وہ جب بھی جھوٹ بولتا تھا، زبان میں لکنت آ جاتی۔ اور اس لمحے کچھ ایسی ہی کیفیت تھی۔

ایک باوقار اور حسین عورت اُن کے قریب سے گزری۔ اس کی گود میں ایک گول مٹول، سبز آنکھوں والا بچہ تھا۔ وہ ایک بڑے تاجر کی بیوی تھی۔

"اوہ مسز چیپلن... کیسی ہیں آپ۔ جونیئر چیپلن تو آج موڈ میں ہیں۔"

عورت نے مہذب انداز میں سر ہلایا۔ زیزی نے آگے بڑھ کر بچے کے گالوں کو چھوا۔

"مسٹر چیپلن نظر نہیں آ رہے؟" منیجر نے کہا۔

"وہ ایک میٹنگ کے سلسلے میں کیلیفورنیا گئے ہیں۔ وہ تین دن بعد لوٹیں گے۔" عورت نے کہا۔ "براہِ مہربانی کسی بیرے کو پانچویں منزل پر بھیج دیں۔ مجھے جونیئر کے لیے کچھ چیزوں کی ضرورت ہے۔"

"ضرور مسز چیپلن۔"

عورت آگے بڑھ گئی۔ جون پھر زیزی کی جانب متوجہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوا۔ لڑکی اپنی ہتھیلی کی خارش کو بھول چکی تھی۔ شاید بے چینی کا جو آسیب اس پر سوار ہوا تھا اب وہ کسی اور پر منتقل ہو چکا تھا۔

جرالڈ کی کسی بات پر لڑکی نے قہقہہ لگایا۔ وہ سر پیچھے کر کے ہنسنے لگی۔ وہ بے حد حسین لگ رہی تھی۔ جرالڈ اس کی صراحی دار گردن کو تکتا رہا۔ اس وقت وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ کچھ گھنٹوں بعد اس لڑکی کا حسن ماند پڑ جائے گا۔

☆☆☆

مسز چیپلن لفٹ میں داخل ہو گئیں۔

ابھی دروازہ بند ہو ہی رہا تھا کہ ایک جوتا آڑے آ گیا۔ سیاہ اوورکوٹ پہنے ایک دراز قد آدمی اندر داخل ہوا۔ اس کے ہاتھ میں سگار تھا۔ آدمی کے سر پر پرانا ہیٹ تھا۔ چہرے پر زخم کا نشان۔ جلد جھلسی ہوئی۔ وہ مسلسل سگار پی رہا تھا۔ لفٹ میں دھواں بھر گیا۔ عورت کو الجھن محسوس ہونے لگی۔ بچہ رونے لگا۔

آدمی نے بچے اور عورت پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اس لاتعلقی نے عورت کو آگ بگولا کر دیا۔ "جناب، کیا ہی بہتر ہو کہ آپ یہ سگار بجھا دیں۔ میرا تو دم گھٹ رہا ہے۔"

آدمی نے کوئی جواب نہیں دیا۔ ناگواری اس کے چہرے سے عیاں تھی۔ البتہ اس نے سگار بجھا کر کالر کھڑے کر لیے۔

مسز چیپلن کو وہ آدمی مشکوک لگا۔ وہ چار روز سے یہاں تھی اور آج پہلا بار اس نے اوورکوٹ میں ملبوس اس آدمی کو دیکھا تھا۔

"آپ کو پہلے کبھی نہیں دیکھا؟" عورت نے سوال کیا۔

"میں نے آج ہی چیک ان کیا ہے۔" آدمی کی آواز کھردری تھی۔

لفٹ چوتھی منزل پر رک گئی۔ اسی پر ہوٹل کے مالک مسٹر وکوف کا اپارٹمنٹ تھا۔ آدمی ہٹا بچے کے لفٹ سے باہر نکل گیا۔ اس نے مہذب آدمی کی طرح ایک بار بھی پلٹ کر عورت کو الوداع نہیں کہا۔

"میں کل مسٹر وکوف سے بات کروں گی۔" عورت بڑبڑائی۔ "ایسے بدتہذیب آدمی کو شرفا کے درمیان جگہ دینا زیادتی ہے۔"

لفٹ کا دروازہ بند ہو گیا۔ اب وہ پانچویں منزل کی جانب بڑھ رہی تھی۔

☆☆☆

جیکب نے ونٹرز میں داخل ہوتے ہی کوٹ سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔

گو دسمبر شروع ہو چکا تھا مگر اس بار سردی معمول سے کم تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا اور کافی بنانے چلا گیا۔ وہ ایک فائر فائٹر تھا اور چیف ٹرنی فائر اسٹیشن میں ڈپٹی سٹفٹ کا انچارج تھا۔ یہ اسٹیشن وکوف ہوٹل سے دو بلاک کے فاصلے پر تھا۔ ان کے پاس ایک واٹر ٹینکر اور دو سیڑھیاں تھیں۔

عام طور سے اس اسٹیشن میں خاموشی چھائی رہتی۔ بہت عرصے سے اٹلانٹا میں کوئی بڑا سانحہ نہیں ہوا تھا۔ اس کے ساتھی مطمئن ہو بے پروا ہو گئے تھے البتہ جیکب کا معاملہ دیگر تھا۔ وہ ایک نڈر اور ایمان دار شخص تھا۔ اپنے پیشے کو خدمت سمجھتا۔ اس کی حالات حاضرہ پر بھی گہری نظر تھی۔ 1946 میں امریکا میں آتش زدگی کے دو ہولناک واقعات رونما ہوئے تھے۔ ایک واقعہ 5 جون کو ہوا، جب شکاگو کے ایک ہوٹل میں لگنے والی آگ نے 61 زندگیاں نگل لیں اور شہر پر ایک آسیب طاری کر دیا۔ اس کے کچھ روز بعد ریاست آیووا کے شہر ڈوبیوک کی ایک عمارت میں آگ بھڑک اٹھی اور بیس افراد اپنی جان سے گئے۔

ان واقعات کے بعد یہ بحث چل نکلی کہ کثیر المنزلہ عمارتوں میں آگ سے بچنے کے لیے خاطر خواہ انتظامات کیوں نہیں کیے جاتے۔ یہ معاملہ پارلیمنٹ میں بھی زیر بحث آیا، مگر اس حوالے سے ابھی قانون سازی نہیں ہوئی تھی۔ شاید منتخب نمائندوں کو ایک اور سانحے کا انتظار تھا۔ ایسا سانحہ جو پورے امریکا کو ہلا دے۔

☆☆☆

آرنلڈ ہارڈی ایک لاابالی نوجوان تھا۔

جیورجیا انسٹی ٹیوٹ آف ٹیکنالوجی کا یہ گریجویٹ ایک شوقیہ فوٹو گرافر تھا۔ جب بھی وہ گھر سے باہر نکلتا تو کیمرا ساتھ ہوتا۔ دیگر فوٹو گرافروں کے برعکس کوئی خاص موضوع اس کی دلچسپی کا محور نہیں تھا۔ اسے جو جہاں کوئی اچھا فریم نظر آتا، وہ کیمرے کا بٹن دبا دیتا۔

جس لمحے ہوٹل وکوف کا منیجر ایک دو نمبروں سے خوش گپیوں میں مصروف تھا، مسز چیپلن اپنے کمرے کا دروازہ کھول رہی تھیں، فائر فائٹر جیکب پیسٹا بو ٹچھ رہا تھا... یہ نوجوان ایک ڈانس کلب کی جانب بڑھ رہا تھا۔ کیمرا کاندھے پر تھا۔

وہ کلب میں داخل ہوا۔ اندر کا ماحول نسبتاً بہتر تھا۔ تیز موسیقی چل رہی تھی۔ لڑکے لڑکیاں رقص میں محو۔ کچھ لوگ بار

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے سامنے بیٹھے سے نوشی کر رہے تھے۔ اس نے کیمرا انجینئر کے حوالے کرنے کے بعد دو جام چڑھائے۔ کچھ دیر بعد وہ ایک لڑکی کے ساتھ رقص کر رہا تھا۔

شاید وہ کچھ دیر اور رکتا، مگر کلب کا میوزک سسٹم اچانک خراب ہو گیا۔ لوگ بددل ہو کر جانے لگے۔ اس نے ایک اور جام چڑھایا اور کلب سے باہر آ گیا۔ اٹلانٹا کی سرد ہواؤں نے اس کا استقبال کیا۔ سردی بڑھ چکی تھی۔

اس نے کالر کھڑے کر دیے اور پیدل ہی اپنے اپارٹمنٹ کی جانب چل دیا۔

☆☆☆

رات کے تین بج چکے تھے اور اٹلانٹا کی سڑکوں پر بے رونقی حرکت کر رہی تھی۔

ڈکوف ایک خواب میں تھا جس میں تاریکی تھی، دھواں تھا اور اضطراب تھا۔

اپارٹمنٹ میں پہنچنے کے بعد وہ کافی دیر تک بستر پر لیٹا کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کا جسم اب بھی اندر ہی اندر جھلس رہا تھا۔ آخر اس نے نیند کی دو گولیاں لیں اور آنکھیں موند کر لیٹ گیا۔ نیند آئی ضرور، مگر اس میں بے آرامی کی آمیزش تھی۔ اس نے عجیب و غریب خواب دیکھے۔ اس دوران کچھ دیر کو آنکھ کھلی اور اگلے ہی لمحے گولیوں کا اثر اسے پھر سلا دیتا۔

کچھ یہی حال فائر فائٹر جیکب کا بھی تھا۔ اپنی کرسی پر بیٹھے بیٹھے وہ کچھ دیر کو غنودگی میں چلا جاتا مگر اگلے ہی لمحے ایک جھٹکے سے جاگ جاتا۔ یوں لگتا، جیسے کوئی اسے پکار رہا ہے۔

سوئی کے کانٹے تین کے ہندسے پر تھے کہ منیجر کا فون گنگنا اٹھا۔ جون نے اگاتھا کرسٹی کا ناول ایک طرف رکھا اور ریسیور اٹھایا۔

”او مسز چیپلن۔ میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں۔ اچھا جونیئر چیپلن ابھی سوئے نہیں؟ او گرم دودھ... آپ بے فکر رہیں، میں ابھی ویٹر کو پانچویں فلور پر روانہ کرتا ہوں۔“

جس ویٹر کو جون نے مسز چیپلن کے روم میں جانے کی ہدایت کی، وہ تین بج کر پندرہ منٹ پر بوتل ہاتھ میں لیے زینہ پھلانگ رہا تھا۔ جب اس نے تیسری منزل کا زینہ عبور کیا، اسے کچھ دھواں محسوس ہوا۔ جلنے کی بو آئی۔ ہلکی سی تپش محسوس ہوئی۔

”کہیں آگ لگ گئی ہے۔“ وہ بڑبڑایا۔ اس نے ریلنگ سے جھانک کر دیکھا۔ شاید قالین سے شعلے اٹھ رہے تھے۔

جلتا ہوا تھیٹر

30 دسمبر 1903 کو امریکا میں ایک ایسا سانحہ پیش آیا، جس کی سسکیاں آج بھی سنائی دیتی ہیں۔ اس روز شکاگو کے وسطی علاقے میں واقع آئرکوئس تھیٹر میں شعلوں نے شیطانی رقص کیا۔

تھیٹر ابھی نیا نیا تعمیر ہوا تھا۔ حادثے والے روز اس میں عملے سمیت 2105 افراد موجود تھے۔ یہ تعداد گنجائش سے بہت زیادہ تھی۔ عمارت میں آگ بجھانے کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ فائر الارم موجود نہیں تھے۔ ہنگامی دروازے ضرور تھے، مگر ان پر تالے پڑے تھے۔ گو کہ انتظامیہ نے دعویٰ کیا تھا کہ یہ تھیٹر فائر پروف ہے۔

جب واقعہ پیش آیا، اسٹیج پر مشہور کھیل ”مسٹر بلیو بیئرڈ“ پیش کیا جا رہا تھا۔ آگ شارٹ سرکٹ کی وجہ سے لگی۔ چھت پر ایک بڑی سی پینٹنگ لٹکی ہوئی تھی، شعلے اس پر گرے اور وہ بھڑک اٹھی۔ تیز ہوا نے آگ کی شدت بڑھا دی۔ کئی آلات لپیٹ میں آ گئے۔ بھگدڑ مچ گئی۔ کئی افراد کچلے گئے۔ دروازوں پر لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ فائر فائٹرز موقع پر پہنچ گئے، مگر دروازوں پر پڑی لاشوں کی وجہ سے انہیں اندر جانے میں شدید مشکلات پیش آئیں۔ آگ بجھانے کے بعد لاشیں نکالی گئیں تو انکشاف ہوا کہ مرنے والوں میں زیادہ تعداد عورتوں اور بچوں کی ہے۔ چھ سو افراد اپنی جان سے گئے۔ تفتیش کاروں نے تھیٹر مالکان کے ساتھ حکومتی اداروں کو بھی ذمے دار ٹھہرایا، جنہوں نے انتظامیہ کی جانب سے بلڈنگ کوڈز کی بدترین خلاف ورزیوں کے باوجود انہیں تھیٹر کھولنے کی اجازت دے دی تھی۔

”اوپر پہنچتے ہی منیجر کو مطلع کرتا ہوں۔“ اس نے سوچا۔ اور یہ ایک مہلک فیصلہ تھا۔ تا تجربہ کار نہیں جانتا تھا کہ آگ لمحوں میں پھیلتی ہے اور سب کچھ جلا کر بھسم کر دیتی ہے۔ پانچویں فلور تک پہنچنے میں اسے چالیس سیکنڈ لگے۔ اتنی ہی دیر اسے مسز چیپلن کے دروازے پر انتظار کرنا پڑا۔ جو گاؤن پہن کر بال درست کر رہی تھیں۔ اس ڈیڑھ منٹ کے مختصر دورانیے نے تباہی کے اسباب کو قوت دی۔ وہ بھڑک اٹھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بعد میں واقعات اس تیزی سے رونما ہوئے کہ نوجوان ویٹر نیچے نہیں اتر سکا۔ وہ اوپر ہی پھنس گیا۔

دودھ کی بوتل میز پر رکھنے کے بعد اس نے مسز چیپلن سے منیجر کو فون کرنے کی اجازت چاہی۔

جیسی مہذب خاتون ہو اس پاختہ نہ ہو جائیں، یہ سوچ کر وہ منیجر سے اشاروں کنایوں میں بات کرتا رہا۔ جب جرن نے اس کی سرزنش کرتے ہوئے واضح الفاظ میں اپنا موقف بیان کرنے کے لیے کہا، تب وہ بولا۔ ”سر! شاید نمبر ے فلور پر آگ لگ گئی ہے۔ وہاں دھواں بھرا ہوا تھا۔“

”فوراً نیچے پہنچو۔“ جون نے فون کاٹ دیا۔

ویٹر مڑا تو پیچھے مسز چیپلن کھڑی تھیں۔ ان کے چہرے پر اندیشے تھے۔

”سب ٹھیک ہے؟“ عورت نے سوال کیا۔

”جی بالکل۔“ ویٹر بوکھلا گیا۔ ”جی حالات قابو میں ہیں۔ آپ... آپ بے فکر رہیں۔ بس باہر نہیں جائیے گا۔“

عورت اسے گھور رہی تھی۔

”جی وہ... کچھ مرمت کا کام چل رہا ہے شاید... وہ مسز چیپلن کیسے ہیں؟ اچھا اجازت۔“

باہر نکلتے ہی لڑکا زینے کی طرف دوڑا۔ ابھی کچھ ہی قدم پھلانگے تھے کہ اس کی آنکھوں میں ریزہ دھواں بھر گیا اور دم گھٹنے لگا۔ وہ خوف زدہ ہو گیا اور واپس اوپر کی سمت دوڑا۔ ساتویں منزل پر فلور انچارج کا دفتر تھا۔ جب وہ وہاں پہنچا، فلور انچارج تام منہ کھولے خراٹے لے رہا تھا۔

لڑکے کی کوشش کے باوجود وہ نہیں جاگا۔ شاید اس نے زیادہ جام چڑھا لیے تھے۔

☆☆☆

کوئی عام دن ہوتا تو شاید جون اسٹن کی حالت اتنی خراب نہیں ہوتی، مگر ویٹر کے منہ سے لفظ آگ سنتے ہی اس کے ذہن میں مسٹر وکوف سے ہونے والی گفتگو گھومنے لگی۔ دھڑکن تیز ہو گئی۔

اس نے ایک سیکیورٹی گارڈ کو حالات کا جائزہ لینے کے لیے روانہ کیا، جو ایک منٹ بعد لوٹا، تو حال برا تھا۔ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا اور خوف چہرے پر منجمد ہو گیا تھا۔

”آگ پھیل گئی ہے سر... تیسری منزل سے اوپر کا راستہ...“

جون نے ریسیور اٹھا کر مسٹر وکوف کے اپارٹمنٹ کا نمبر ڈائل کیا۔ بہت دیر تک گھنٹی جاتی رہی مگر کسی نے جواب نہیں دیا۔ اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ فیصلہ لینے کی قوت جواب دے گئی۔ اس نے ایک اور کوشش کی، جواب ندارد۔

جب اس نے الارم بجانے کا فیصلہ کیا، آگ کو آغاز ہوئے لگ بھگ دس منٹ بیت چکے تھے۔

ہوٹل میں آٹومیٹک الارم نصب نہیں تھا۔ اسے چالو کرنے کے لیے ایک شخص درکار ہوتا۔ جون نے ایک پختہ عمر ویٹر کو کنٹرول روم کی جانب روانہ کیا۔ اگلے کئی سیکنڈز تک اس کے کان الارم کی چنگھاڑ کا انتظار کرتے رہے، مگر ہوٹل میں موت کی خاموشی چھائی رہی۔ وہ متفکرات بکتا ہوا کنٹرول روم کی جانب دوڑا۔

ویٹر وہاں بے بسی کی تصویر بنا کھڑا تھا۔ اس کا ہاتھ لیور پر تھا۔ ”یہ کام نہیں کر رہا جناب۔“

جون اسے دھکیل کر خود لیور پر زور آزمائی کرنے لگا۔ کوشش بے کار گئی۔ لیور جام ہو چکا تھا۔

”لعنت ہے۔“ وہ چلایا۔ اچانک اس کا ذہن پانی کے خود کار چھڑکاؤ کے نظام کی جانب گیا۔ وہ کاؤنٹر کی سمت پلٹا۔

جون چار برس قبل اس ہوٹل کا حصہ بنا تھا۔ یوں تو وہ اس کے چپے چپے سے واقف تھا، مگر وہاں نصب مشینوں کی بابت زیادہ نہیں جانتا تھا۔ خاص کر پانی کے چھڑکاؤ کے نظام کی بابت تو قطعی علم نہیں تھا۔ تکنیکی اسٹاف کا سربراہ بوڑھا گولائی تھا اور یہ راز اسی کے سینے میں دفن تھا۔

بوڑھا گولائی ایک خود سر آدمی تھا۔ کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ ڈیوٹی کے دوران بھی نشے میں دھت رہتا۔ وہ ہوٹل کا سب سے پرانا ملازم تھا۔ پہلے وہ وکوف خاندان کا محافظ ہوا کرتا تھا۔ اس بات کا وہ خوب فائدہ اٹھاتا۔ اس کی بدزبانی کے باعث تکنیکی شعبہ ہوٹل ملازمین کے لیے ایک ڈراؤنا خواب تھا۔ کوئی وہاں نہیں جانا چاہتا تھا۔ اور اب... جون اسٹن کو اس خرانٹ بڈھے سے معاملہ کرنا تھا۔

بڈھے گولائی کا کمرا بیسمنٹ میں تھا۔ جون نے اس کا نمبر ملایا۔

بہت دیر بعد نشے میں ڈوبی ایک آواز سنائی دی۔ ”کیا مصیبت ہے؟“

”مسٹر گولائی... ہوٹل میں آگ لگ گئی ہے۔“

”آگ۔“ کچھ دیر خاموشی رہی۔ پھر بڈھے کی خباثت لوٹ آئی۔ ”تو میں کیا کروں؟“

جون کو غصہ تو بہت آیا، مگر اس نے ضبط کیا۔ ”جناب براہ مہربانی مجھے بتائیں کہ پانی کے چھڑکاؤ کا نظام کیسے چالو

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوگا؟"

"پانی کے چھڑکاؤ کا نظام..." بوڑھے کی آواز دور سے آتی محسوس ہوئی۔ "کون سا نظام بیوقوف؟ کیا تم نے کبھی اسے استعمال ہوتے دیکھا ہے؟"

"جی... نہیں مگر آلات تو نصب ہیں... تہ خانے میں موجود ٹینک..."

بوڑھے نے بات کاٹ دی۔ "آلات جنگی جہاز میں... دو برسوں قبل نصب کیے گئے تھے۔ اب تو انہیں زنگ لگ گیا ہوگا۔ اور تہ خانہ میں موجود ٹینک خالی ہے۔ اسے کبھی بھرا ہی نہیں گیا۔ اب مجھے سونے دو۔"

"مگر جناب..." جون نے کہنے کی کوشش کی مگر اتنی دیر میں لائن کٹ گئی۔ اس نے ریسیور پٹخ دیا۔ اگلے چند لمحات شدید مایوسی کے تھے۔ گراؤنڈ فلور کے بیرا اور دیگر ملازمین اس کے گرد جمع ہوگئے۔ وہ اندیشوں میں گھرے تھے۔

اچانک مینیجر نے سر اٹھایا۔ "تمام مہمانوں کو مطلع کردو کہ ہوٹل میں آگ لگ گئی ہے۔ وہ جلد از جلد یہاں سے نکل جائیں۔"

"مگر جناب۔" سینئر ویٹر کے لہجے میں تذبذب تھا۔ "ہوٹل میں تین سو سے زائد مہمان ہیں۔ ہم کتنے لوگوں کو مطلع کرسکتے ہیں۔"

"ہم کوشش تو کرسکتے ہیں۔" اس نے ریسیور اٹھایا۔

سب سے پہلے اس نے ساتویں منزل پر موجود فلور انچارج تام گرزن کیا۔ اس کی آواز نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

"کیا واقعی؟" اس نے جمائی لی۔ "یہ ہمارا ولسن بھی کہیں بیٹھا ہے۔ ابھی سے تو یہ کہانی نہیں گھڑی؟"

"ہوش میں آؤ تام۔ ہوٹل میں آگ لگ چکی ہے۔" وہ دہاڑا۔

اب اس نے چودھویں فلور کے انچارج سے رابطہ کیا۔ کیمرون اس کے حاسدین میں شامل تھا اور اکثر اس کے خلاف سازشوں میں مصروف رہتا۔ اس نے ہیرن کی ہدایات منسوب نہ ہونے دیں۔ حسد کے دبیز پردے کے باعث وہ حالات کی سنگینی کا اندازہ کرنے میں ناکام رہا۔ بجائے اس کے کہ وہ مہمانوں کو سانحے سے آگاہ کرتا، اس نے چودھویں اور پندرھویں فلورز کے کمروں پر دستک دے کر یہ کہنا شروع کردیا کہ نچلے حصے میں معمولی آگ لگ گئی ہے۔ بہتر ہے کہ وہ باہر نکلنے کی بجائے اپنے کمروں ہی میں رہیں۔

"پریشانی کی کوئی بات نہیں۔" وہ ہر ایک سے یہی کہتا۔

"اگر کوئی مسئلہ ہوتا تو الارم بج چکا ہوتا۔"

اس حاسد شخص کی غفلت 7 دسمبر 1946ء کی رات کو ایک قاتل رات کا روپ دینے والی تھی۔

☆☆☆

ریسیور رکھتے ہی وہ کمرے سے نکل گیا۔ قدم زینے کی جانب بڑھ رہے تھے اور اس کے مضبوط جسم میں اضطراب جنبش کررہا تھا۔

جن مہمانوں کو ٹیلی فون کے ذریعے اطلاع دی گئی تھی، ان میں سابق فوجی افسر میجر جیک کاش بھی شامل تھا، جو اپنی ماں کے ساتھ ہوٹل کے آٹھویں فلور پر ٹھہرا ہوا تھا۔ اس نے بچ جانے کی کوشش کی، تو چوتھے فلور پر اس کا سامنا دھوئیں کے بادل سے ہوا۔ وہ تپش محسوس کرسکتا تھا۔ اس نے پلوں میں اندازہ لگالیا کہ آگ زینے کے نزدیک ہی لگی ہے، جس کی وجہ سے زینہ ناکارہ ہوچکا ہے۔ اس نے لفٹ کا جائزہ لیا۔ وہ کام نہیں کررہی تھی۔ اس نے اندازہ لگالیا کہ راستے مسدود ہوگئے ہیں، اگر فوری آگ نہیں بجھائی گئی، تو یہ ہوٹل جہنم میں تبدیل ہوجائے گا۔

عام لوگوں کے برعکس میجر مضبوط اعصاب کا مالک تھا۔ وہ اس نوع کے معاملات کا تجربہ رکھتا تھا۔ گھبرانے کے بجائے وہ سیدھا اپنے کمرے میں گیا۔ اس کا کمرا مغربی جانب تھا، جب کہ آگ مشرقی حصے میں لگی تھی۔ اس نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ قریب ہی ایک پانچ منزلہ عمارت تھی۔ اس کی چھت اور میجر کے کمرے کی کھڑکی کے درمیان ایک چھجا سے کا تھا۔

وہ بہ آسانی کھڑکی سے چھت پر کود سکتا تھا۔ ایک آدھ پسلی ٹوٹ جاتی، لیکن زیادہ چوٹ نہیں آتی۔ مگر اسے اپنی ماں اور دیگر مہمانوں کی فکر کھائے جارہی تھی۔ اس نے بوڑھی عورت کو جگا کر تیار ہونے کے لیے کہا۔ پھر وہ راہداری میں نکل گیا اور دیگر کمروں کے دروازوں پر دستک دینے لگا۔

ابتدا میں تو نیند میں ڈوبے مہمانوں نے اسے سنجیدگی سے نہیں لیا، مگر جب کچھ نوجوانوں نے کھڑکی سے نیچے جھانکا اور سفید دھواں پھیلتے دیکھا تو ان کی نیند اڑ گئی۔

میجر نے بستر کی چادروں کو ملا کر ایک رسی بنانے کی تجویز دی۔

"سب سے پہلے میں اتروں گا۔" اس نے کہا۔ "ایک بار میں چھت پر پہنچ گیا تو دوسرے سرے کو وہاں کسی شے سے باندھ دوں گا۔ آپ لوگ بہ آسانی اس پر پھسلتے ہوئے دوسری

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

طرف پہنچ جائیں گے۔"

چند لوگ تو اس کے ساتھ جانے کو تیار ہوگئے مگر اکثریت نے پس و پیش سے کام لیا۔ ان کے نزدیک یہ طریقہ پرخطر تھا۔ پھر انہیں یقین تھا کہ انتظامیہ جلد اس مسئلے پر قابو پالے گی۔

میجر جانتا تھا کہ آگ کسی کو نہیں بخشتی۔ خوشیاں چاٹ جاتی ہے۔ انسانوں کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔ اس کے لیے ہر لمحہ قیمتی تھا۔

اس کے اصرار پر کچھ لوگ اپنے بستروں کی چادر لے آئے۔ وہ اپنے کمرے کی جانب بڑھا۔ اس کی ماں جاگ چکی تھی۔ انہوں نے چادروں کو آپس میں باندھ کر رسی بنائی۔ کچھ دیر اس کی مضبوطی کی جانچ کی۔ پھر اسے کمرے کے ایک ستون سے باندھ دیا۔ کونے سے فون میجر نے استقبالیہ کا نمبر ڈائل کیا۔

"کیا آپ نے فائر بریگیڈ ڈپارٹمنٹ کو فون کر دیا؟" اس نے جون سے سوال کیا۔

"فائر بریگیڈ... اوہ میں... بھول ہی گیا تھا۔" جون بوکھلایا ہوا تھا۔

"شاید آپ کی یہ بھول بہت سے جانوں کے ضیاع کا سبب بن جائے۔" میجر نے سرد لہجے میں کہا اور فون پٹخ دیا۔

☆☆☆

ڈکوف کی آنکھ کھل گئی۔

یہ راکھ اور کہرے کی دنیا تھی۔ تیز ہوائیں چل رہی تھیں۔ دور دور تک یاسیت۔ نہ آدم نہ آدم ذات۔ کچھ فاصلے پر شعلے ابھر رہے تھے۔

"کیا میں جاگ چکا ہوں؟" ڈکوف بڑبڑایا۔ "نہیں... یہ تو ایک خواب ہے۔ فقط ایک برا خواب۔"

ہاں، وہ درست تھا۔ یہ ایک خواب ہی تھا، مگر اس ادراک کے باوجود ڈکوف اس سے باہر نکلنے سے قاصر رہا... وہ خواب میں قید ہوگیا تھا۔

کچھ دیر وہ کہرے اور راکھ کے طوفان میں تنہا کھڑا رہا۔ اس کی نظر دور سے اٹھتی آگ کی لپٹوں پر گئی تھیں۔ یکدم کسی نے اسے پکارا۔ پہلے پہل اس نے اسے اپنا وہم سمجھا، سر جھٹک دیا مگر آواز پھر سنائی دی۔ یہ کسی بچے کی آواز تھی۔ جو اسے مدد کے لیے پکار رہا تھا۔

ڈکوف شعلوں کی سمت بڑھنے لگا۔ آواز پھر سنائی دی۔ اس کی رفتار تیز ہوگئی۔ وہ جھاڑیوں اور اونچے نیچے راستوں سے ہوتا ہوا آخر اس عمارت کے نزدیک پہنچ گیا۔

وہ ایک اسکول تھا جو دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ اچانک کچھ حرکت ہوئی۔ اس نے ایک بچے کو بیرونی دروازے سے نکل کر بائیں جانب بھاگتے دیکھا۔ اس کے ہاتھ میں ماچس کی ڈبیا تھی۔

ڈکوف اس بچے کو دیکھ کر ششدر رہ گیا۔ اس میں وہ اپنا عکس دیکھ سکتا تھا۔ ہاں، وہ ننھا ڈکوف ہی تو تھا جو ایک روز کلاس روم میں بیٹھا ماچس سے کھیل رہا تھا کہ ایک ظالم شعلہ کھڑکی پر پڑے پردوں میں جا گھسا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ بری طرح جل رہے تھے۔ آگ فرنیچر کی سمت بڑھنے لگی۔

بچہ خوف زدہ ہوگیا۔ وہ تیزی سے باہر نکلا اور کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ آگ کی خبر جلد اسکول میں پھیل گئی۔ لوگ جان بچانے کے لیے دوڑ پڑے۔ بچوں کو بھی نکال لیا گیا مگر ایک بچہ... ایک بچہ پیچھے رہ گیا! اسی کمرے میں جہاں سے اس وحشت کا آغاز ہوا تھا۔ جس کا دروازہ ننھے ڈکوف نے بند کر دیا تھا۔

اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا پسینے میں تر بدن بری طرح تپ رہا تھا۔ ڈکوف نے اٹھنے کی کوشش کی مگر اس کا جسم ڈھے گیا۔ کسی پراسرار قوت نے اس کے بدن سے جان نکال لی تھی۔

کمرے میں دھواں بھرا ہوا تھا اور باہر سے چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔

انتقام نزدیک آگیا تھا۔

☆☆☆

یوں تو آتش زدگی کی ہر خبر جیکب کی دھڑکن تیز کر دیتی تھی مگر آج ذات تو اندیشے فضاؤں میں منجمد تھے۔

جب فون کرنے والے شخص نے جس کا نام جان اسمتھ تھا، یہ بتایا کہ آگ ڈکوف ہوٹل میں لگی ہے تو جیکب نے تیزی کو دا سے دبانے کی کوشش کی۔ "ہم فقط دو بلاک دور ہیں... مرکزی سڑک پر... ابھی ٹریفک بھی نہیں ہوگا۔ ہم ایک منٹ میں پہنچ جائیں گے۔"

اس نے خود کو تسلی دینے کی کوشش تو کی مگر اس کا اندرون پکار رہا تھا کہ ایک سانحہ ہونے کو ہے۔

"آگ کس منزل پر لگی ہے؟" اس نے سوال کیا۔

"غالباً تیسری منزل پر۔" جون نے تھوک نگلا۔

"ہوٹل میں کتنے افراد ٹھہرے ہیں؟" جیکب نے قلم تھام لیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"مسافروں کی تعداد 304 ہے۔ اسٹاف کو ملا کر ہوٹل میں اس وقت ساڑھے تین سو افراد موجود ہیں۔"

"کیا ہوٹل میں پانی کے چھڑکاؤ کا خودکار نظام ہے؟"

"ہاں... نہیں... میرا مطلب ہے کہ وہ کام نہیں کر رہا۔" جران اسٹن کی آواز میں شکستگی تھی۔

"اور ہنگامی راستے؟" جیکب کو یقین تھا کہ اس سوال کا جواب اثبات میں آئے گا، مگر آج کی پُراسرار رات اس کے یقین کو متزلزل کرنے پر تلی تھی۔

"نہیں... ہوٹل میں ہنگامی راستے نہیں بنایا۔"

جیکب اتنی زور سے چلایا کہ فائر اسٹیشن کے آخری کونے پر بیٹھا ڈرائیور بری طرح ڈر گیا۔

"زینے اور لفٹ کے علاوہ..." جران نے تھوک نگلا۔ "باہر جانے کو کوئی راستہ نہیں۔ اور دونوں ہی بے کار ہو گئے ہیں۔"

"اور تم لوگ دعویٰ کرتے تھے کہ ہوٹل فائر پروف ہے۔" جیکب کے لہجے میں کاٹ تھی۔ "آگ کتنی دیر پہلے لگی؟"

"آدھا گھنٹے پہلے۔" جران کی زبان سے ادا ہونے والے ان الفاظ نے جیکب کو دہلا دیا۔

ریسیور رکھتے ہوئے اس کے ذہن میں زلزلے آ رہے تھے اور دل چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ اٹلانٹا فائر اسٹیشن اپنی تاریخ کے بدترین بحران کا سامنا کرنے والا ہے۔

☆☆☆

کمرے میں دھواں تھا، چیخیں تھیں اور آنسو تھے۔

منظر دھندلا رہا تھا اور چیزیں پگھل رہی تھیں۔ پلاسٹک کی اشیا اپنی ہیئت کھونے لگیں۔ لوہا تپنے لگا۔

عورت نے اپنے بچے کی سمت دیکھا، جو بری طرح رو رہا تھا۔ اُسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ ناک سے پانی بہہ رہا تھا۔ خود اس کا بھی یہی حال تھا۔ آنکھیں جل رہی تھیں اور جلد جھلسنے لگی تھی۔

مسٹر چیلپن کی بیوی اپنے دو سالہ بچے کے ساتھ ایک جہنمی کھائی میں پھنس چکی تھی۔ ایسی کھائی جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ وہ بیڈ کے سٹور سے برابر کمرے میں ٹھہری تھی اور اب یہ کمرہ اس کی قبر بننے والا تھا۔ باہر جانے کے راستے مسدود ہو چکے تھے۔

اوپری منزلوں کا بھی یہی معاملہ تھا۔ کئی لوگوں نے خود کو یہ سوچ کر کمروں میں بند کر لیا تھا کہ اس طرح وہ آگ سے محفوظ رہیں گے، مگر اب انہیں اپنی غلطی کا اندازہ ہو رہا تھا۔

عورت نے بچے کو گود میں اٹھا لیا۔ اب اسے ایک پُرخطر فیصلہ کرنا تھا۔ وہ کھڑکی کی سمت بڑھی۔ دونوں پٹ کھول دیے۔ باہر کی ٹھنڈی ہوا نے جھلستے بدن کو کچھ سکون دیا۔ تھوڑا سا سانس بحال ہوا۔ اس نے نیچے نظر ڈالی۔ اسے چکر آنے لگے۔ یوں لگا، جیسے وہ پہاڑ کی چوٹی سے نیچے دیکھ رہی ہے۔

سڑک سیاہ اور خاموش تھی۔ ایک چھوٹا سا ہجوم فٹ پاتھ پر کھڑا اوپر کی سمت دیکھ رہا تھا۔ ان کی آنکھوں میں حیرت بھی تھی اور خوف بھی۔

تذبذب کی شکار عورت کو ایک دھماکا سنائی دیا۔ شاید کوئی دیوار گری تھی۔ وہ مڑی۔ اگلے ہی لمحے حلق سے چیخ برآمد ہوئی۔ کمرے کے دروازے میں شعلے رقص کر رہے تھے۔

اس نے مڑ کر سڑک کی سمت دیکھا۔ وہ آگ اور پانی کے درمیان تھی۔ اب فیصلہ کرنا تھا کہ اُسے جل کر مرنا ہے یا ڈوب کر۔

☆☆☆

آدمی نے کسی ماہر کرتب باز کی طرح جست لگائی۔ اگلے ہی لمحے وہ قریبی عمارت کی چھت پر تھا۔

میجر جیک نے مڑ کر دیکھا۔ کھڑکی میں کئی اجنبی چہرے تھے، جن پر موت ثبت تھی۔ بس اس کی ماں کے چہرے پر کچھ سکون تھا۔ میجر نے رسی کا سرا اٹھایا ہوا تھا۔ اسے چھت پر ایک لوہے کا ہُک نظر آیا۔ اس نے وہ سرا ہُک سے باندھ دیا۔

اب اس نے پلٹ کر دکھوف ہوٹل کی سمت دیکھا۔

"آپ کو اس رسی سے لٹک کر آنا ہوگا۔ جلدی کریں۔"

وہاں کوئی حرکت نہیں ہوئی۔ سب خوف زدہ تھے۔ نہ تو ان کے بدن میجر کی طرح کسرتی تھے، نہ ہی وہ اس کی طرح نڈر اور بلند حوصلہ تھے۔ گو ہوٹل اور اس عمارت کی چھت کے درمیان ایک پتلی سی گلی تھی، مگر اس وقت وہ فاصلہ ایک دشوار گزار کھائی معلوم ہو رہا تھا۔

میجر پھر چلایا۔ اسے سرخی حصے سے اٹھتا دھواں اور آگ کی روشنی صاف نظر آ رہی تھی۔ کھڑکی میں کھڑی بوڑھی عورت حرکت میں آئی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے رسی تھامی اور اپنے پیروں کو پھندے کی شکل دے دی۔ اب وہ دھیرے دھیرے کھسکتے ہوئے چھت کی سمت آ رہی تھی۔

وہ قیامت کے لمحے تھے۔ لوگ دم سادھے کھڑے تھے۔ کچھ اور لوگ بھی اپنی کھڑکیوں سے جھانک رہے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میجر کے لبوں پر دعائیں تھیں۔

بالآخر عورت کنارے پر پہنچ گئی۔ بیٹے نے اسے گلے لگا لیا۔

"جلدی کریں۔ وقت کم ہے۔" میجر پھر چلایا۔

اب ایک نوجوان نے ہمت مجتمع کی اور رسی سے لٹک گیا۔ اس نے تیزی سے فاصلے طے کیے۔ جب وہ چھت پر پہنچا، اس کا چہرہ سفید ہو رہا تھا۔ نوجوان کے بعد اس کی بیوی رسی کے سہارے چھت پر پہنچی۔

"میں اگلے حصے میں جا کر رکتا ہوں۔" میجر نے نوجوان سے کہا اور اپنی ماں کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر زینے کی سمت بڑھا۔ دفعتاً اسے ایک چیخ سنائی دی۔ وہ پلٹا۔ ایک بوڑھا رسی سے لٹکا جھول رہا تھا۔

"اپنے پیروں کا پھندا...." اس سے قبل کہ میجر کا جملہ مکمل ہوتا، بوڑھا ایک دل دوز چیخ کے ساتھ اندھیرے میں غائب ہو گیا۔ ہوٹل کی کھڑکی میں جھانکتے لوگوں کے دل حلق میں آ گئے۔ میجر نے پرنم آنکھوں کے ساتھ ہوٹل کی سمت دیکھا اور زینے سے نیچے اترنے لگا۔

عمارت سے باہر آتے ہی اسے ایک ہجوم نظر آیا۔ اس وقت وہ عمارت کے شمالی حصے کی جانب تھا۔ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا۔ ایک خوبرو مگر ڈری ہوئی عورت اپنے بچے کو تھامے منڈیر پر کھڑی تھی۔

شاید وہ سکتے میں تھی۔ یا شاید مدد کے لیے پکار رہی تھی۔

فاصلہ زیادہ تھا اور درمیان میں دھوئیں کے بادل تیر رہے تھے۔

بچے کو دیکھ کر میجر کا دل بھنچ گیا۔ اس نے دائیں بائیں دیکھا۔ شاید کوئی چادر مل جائے مگر انتشار کے اس لمحے مدد کا کوئی امکان نہیں تھا۔ کہیں دور سائرن سنائی دے۔

"میری مدد کرو۔" عورت چلائی۔

جبکہ ایک وین کی چھت پر چڑھ گیا اور پوری قوت سے چلایا۔ "انتظار کرو۔ مدد آ رہی ہے۔"

"کمرے میں آگ لگ چکی ہے۔ سب ختم ہو گیا۔" عورت کے الفاظ رو رہے تھے۔

"ٹھہرو۔ جلد بازی نہ کرو... ابھی۔"

"میرا بچہ... کیا تم اسے پکڑ سکتے ہو؟ لو میں اسے اچھال رہی ہوں۔ تم اسے تھام لو گے نا؟ وعدہ کرو۔"

عورت کو سمجھانا بے کار تھا۔ میجر نے گہرا سانس لیا۔ اپنی توجہ مرکوز کی۔ سر اٹھایا۔ "ہاں، میں اسے سنبھال لوں گا۔"

وہ وین سے اتر کر کھڑکی کے نیچے آ گیا۔ اس کی نظریں عورت کی نظروں سے چار ہوئیں۔ عورت کی آنکھوں میں خوف تھا اور مرد کی آنکھوں میں اعتماد۔

"میں سنبھال لوں گا۔" مرد نے کہا۔

عورت نے بچے کو بوسہ دیا۔ اس کے آنسو پونچھے۔ مرد کی سمت دیکھا اور بچے کو ہوا میں اچھال دیا۔

ہجوم سے چیخیں بلند ہوئیں۔ بچہ کسی گیند کی طرح دھوئیں کو چیرتے ہوئے نیچے آ رہا تھا۔ مرد کی نظریں مرکوز تھیں۔ عورت کے لبوں پر دعائیں تھیں۔

دعائیں قبول ہوئیں۔ میجر نے بچے کو تھام لیا۔ اس نے بچے کو سینے سے لگا لیا۔ ہجوم سے نعرے بلند ہونے۔ وہ دوڑتا ہوا ہجوم کی سمت گیا۔ بچہ اپنی ماں کے حوالے کر دیا۔ ہر کوئی خوش تھا۔ ارگرد کی آنکھوں میں نمی تھی۔ اطمینان تھا۔

اچانک ایک شخص چلایا۔ سب کی نظریں اٹھیں۔ عورت بازو پھیلائے کھڑکی میں کھڑی تھی۔ اس کا چہرہ آسمان کی جانب تھا۔ سفید لبادہ ہوا میں لہرا رہا تھا۔ وہ کود نے کو تھی۔

"رک جاؤ۔" میجر چلایا۔ مگر دیر ہو چکی تھی۔ عورت نے فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ تیزی سے گری۔ اس کا سر زمین سے ٹکرایا۔ وہاں خون پھیل گیا۔

آنسوؤں سے میجر کا حلق تر ہو گیا۔ سائرن قریب آ رہے تھے۔

☆☆☆

اشتیاق جو عشرت وحاظ اور خوف کے بادل چھا گئے۔

بہت سے لوگ لفٹ کی جانب دوڑے، مگر وہ جام ہو چکی تھیں۔ انہوں نے زینے کا رخ کیا مگر نیچے جھانکتے ہی اوسان خطا ہو گئے۔ وہاں فقط سفیدی اور تپش تھی۔ ایک دو نے نیچے جانے کی کوشش کی، وہ پانچویں منزل تک پہنچ گئے۔ اس سے آگے جانا ممکن نہیں تھا۔ کچھ تو وہیں دم گھٹنے سے مر گئے۔ جو واپس لوٹ سکے، ان پر مسلسل غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔

کچھ لوگ غسل خانوں سے پانی کی بالٹیاں لے آئے، مگر وہ کام نہیں آئیں۔ آگ اب پھیل چکی تھی۔ اموات اسے قوت فراہم کر رہی تھیں۔

لوگ چیخنے چلانے لگے۔ کئی ہوٹل کے مالک اور انتظامیہ کو گالیاں دے رہے تھے۔ چند گریہ کرتے ہوئے واپس اپنے کمروں میں چلے گئے۔ کچھ ہی دیر بعد چھٹی منزل پر بھی حدت بڑھنے لگی۔ لوگوں نے کپڑے اپنے بدن سے الگ کر دیے۔ کمروں میں رکھے ٹیلی فون مسلسل بج رہے تھے اور پانی کی رگوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اشیاء پگھل گئیں۔ اسٹیل اور لوہا اس قدر تپ گیا کہ اسے چھونا محال ہوگیا۔ لوگوں نے گھڑیاں اور عورتوں نے زیورات اتار کر پھینک دیے۔

اب کھڑکیاں ہی اکلوتا راستہ تھیں۔ لوگ ان کی سمت دوڑے۔ انہوں نے نیچے، بہت نیچے ایک ہجوم دیکھا۔ کچھ نوجوان یہ سوچ کر کہ وہ دیوار کی جھریوں اور پائپ کے سہارے نیچے اتر جائیں گے، کھڑکی سے لٹک گئے۔ مگر یہ تکنیک جلد ہی ناکامی سے دوچار ہوگئی۔ دو نوجوانوں کا ہاتھ پھسل گیا اور سیاہ سڑک اُن کے خون سے بھر گئی۔

کچھ لوگوں نے میجر جیک کا طریقہ اختیار کرنے کا سوچا۔ چادروں سے رسی تیار کی گئی، مگر ان کی قسمت اتنی اچھی نہیں تھی۔ میجر کا کمرا تو مغربی حصے میں تھا جہاں قریب ہی ایک عمارت تھی۔ وہاں رسی سے پہنچا جا سکتا تھا مگر ہوٹل میں موجود سیکڑوں افراد اس سہولت سے محروم تھے۔

اوپری منزل سے لٹکائی جانے والی رسیاں بہ مشکل پانچویں منزل تک پہنچ پائیں۔ جن لوگوں نے اس سے اترنے کی کوشش کی، ان کی بیچ راستے میں ہمت ساتھ چھوڑ گئی اور ان کے سر زمین سے ٹکرا کر پاش پاش ہوگئے۔ کئی ایسے تھے، جو نیچے سے اٹھتی لپٹوں کا شکار ہوگئے اور رسیوں میں معلق جل کر خاک ہوگئے۔

7 دسمبر 1946ء کی اس رات موت کا عفریت رقصاں رہا تھا اور اٹلانٹا پر خوف کے بادل چھائے تھے۔

☆☆☆☆

جیکب نے پیچ ٹری اسٹریٹ پر جو ہیبت ناک منظر دیکھا، وہ اسے ساری زندگی یاد رہنے والا تھا۔

شعلوں کے اژدہے نے چودہ منزلہ عمارت کو لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس کی زہریلی پھنکار سے چہار سو سفید دھواں پھیل گیا۔ اس کی آنکھوں میں خوف تھا۔ سڑک پر وحشت رقص کر رہی تھی۔ اور خوف زدہ ہجوم دانتوں تلے انگلیاں دبائے اُسے تک رہا تھا۔

پہلی ہی نظر میں جیکب کو اندازہ ہوگیا کہ آج وہ ایک کٹھن محاذ پر کھڑا ہے۔ دشمن کو شکست دینے کے لیے اسے ایڑی چوٹی کا زور لگانا ہوگا۔ مزید کمک درکار ہوگی۔ مزید ہتھیاروں کی ضرورت پڑے گی۔ اس کے اشارے پر ٹیم کا ایک رکن مرکزی فائر اسٹیشن سے رابطہ کرنے کے لیے ٹیلی فون بوتھ کی سمت دوڑا۔

جیکب اور اس کے ساتھی ہجوم کو چیرتے ہوئے آگے بڑھے۔ انہوں نے لوگوں کو پیچھے دھکیل دیا۔ اس نے صورتِ حال کا جائزہ لیا۔ بہت سے لوگ کھڑکی سے لٹکے ہوئے امدادی کارکنوں کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

آگ تیسرے اور چوتھے فلور کے سرکاری حصوں کو نگل چکی تھی۔ ان کے پاس فائر بریگیڈ کا فقط ایک انجن تھا۔ سیڑھیاں صرف دسویں منزل تک رسائی کے لیے کارآمد تھیں۔

1871 کی ہولناک تباہی

وکوف ہوٹل جیسے ہولناک واقعات سے امریکی تاریخ بھری پڑی ہے۔ کچھ تو اس سانحے سے بھی زیادہ کربناک تھے۔

اکتوبر 1871 میں شکاگو اور وسکونسن کے جنگلات میں لگنے والی آگ نے بربادی کی ایک بے انت داستان رقم کی، جسے سننے والے انگشت بدنداں رہ گئے۔ 8 اکتوبر کو پیٹرک اولیری نامی شخص کے گودام میں اچانک آگ بھڑک اٹھی، جس نے دیکھتے ہی دیکھتے پورے شکاگو کو لپیٹ میں لے لیا۔ آگ لمحوں میں پھیلی۔ مغربی حصوں میں کئی گھر شعلوں میں گھر گئے۔ شکاگو میں بیشتر عمارتیں لکڑی کی بنی تھیں، پھر آگ بجھانے کا انتظام ناکافی تھا۔ اس لیے اموات اور بربادی بڑھتی گئی۔ آگ دو دنوں تک بھڑکتی رہی۔ یہ بارش سے تھمی۔ اس واقعے میں 300 افراد اپنی جان سے گئے۔

سانحہ یہیں تک محدود نہیں تھا۔ جس روز شکاگو میں آگ لگی، اسی روز بڑے ہی پراسرار انداز میں وسکونسن کے جنگلات میں آگ بھڑک اٹھی۔ عام خیال ہے کہ شکاگو ہی سے کوئی چنگاری وہاں لگی تھی۔ یہ آگ اتنی شدید تھی کہ شکاگو کے شعلے اس کے سامنے ماند پڑ گئے۔ اس نے ڈیڑھ ملین ایکڑ پر پھیلے جنگلات کو چاٹ ڈالا۔ کئی قصبے اس کی لپیٹ میں آئے اور صفحۂ ہستی سے مٹ گئے۔ ہوا نے آگ کو تیزی سے پھیلا دیا۔ ڈیڑھ ہزار افراد لقمۂ اجل بن گئے۔ بیس کروڑ کا نقصان ہوا۔

اتنے بھاری نقصان کا بنیادی سبب وفاقی حکومت کی غفلت تھی، جس کی کل توجہ شکاگو پر مرکوز تھی۔ تمام مشینری اور عملہ شکاگو کو بھیج دیا گیا تھا اور وسکونسن کے غریب باسیوں کو مرنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوٹل کے بیرونی حصے سے مزید اوپر جانا دشوار تھا۔ اس کے لیے اندرونی زینہ ہی اکلوتا سہارا تھا۔ فائر فائٹر اندر داخل ہو کر نویں دسویں منزل کی کھڑکیوں سے ہوٹل میں پھنسے ہوئے لوگوں کو نکال سکتے تھے۔

اس نے لاؤڈ اسپیکر پر اعلان کیا۔ ”میں ہوٹل میں موجود تمام افراد سے درخواست کروں گا کہ وہ حتیٰ الامکان آگ سے دور رہیں... اگر آپ کے فلور پر دھواں بھر گیا ہے تو کھڑکیوں کی سمت آجائیں۔ آپ کو ہر صورت پُرسکون رہنا ہوگا۔“

اندر پھنسے لوگوں نے اس بیان کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ وہ ہراساں ہوگئے تھے اور مدد کے لیے چلّا رہے تھے۔

”ہم آپ کی مدد کرنے آئے ہیں۔ ہمارے ساتھ تعاون کریں۔“ جیکب نے کھڑکی میں کھڑے لوگوں کو پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ ”پہلے ہمیں نچلی منزلوں پر پھنسے لوگوں کو...“

ابھی جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ ساتویں منزل کی کھڑکی سے دو آدمیوں نے چھلانگ لگادی۔ اگلے ہی پل زمین ان کا خون چاٹ رہی تھی۔

جیکب کی آواز حلق میں اٹک گئی۔ وہ تیزی سے ہوٹل کے اندر داخل ہوا۔ ایک وجیہہ مگر گھبرایا ہوا شخص اس کی سمت دوڑتا ہوا آیا۔ وہ ہوٹل کا منیجر جون تھا۔

”نچلی منزلوں پر کتنے لوگ ہیں؟“ جیکب نے سوال کیا۔

”کوئی نہیں... یہ ملازمین کے لیے مخصوص ہے جو جان بچانے کے لیے باہر جا چکے ہیں۔ البتہ اسٹاف کے کچھ لوگ مہمانوں کے ساتھ اوپر پھنسے ہوئے ہیں۔“

”اور ہوٹل کے مالک مسٹر ونکوف؟“

”وہ... وہ اپنے اپارٹمنٹ میں تھے... ان کا اپارٹمنٹ مغربی حصے میں ہے... شاید اب تک...“ آواز رندھ گئی۔

جیکب نے لفٹ پر نظر ڈالی۔ وہ کسی قبر کی مانند خاموش کھڑی تھی۔ بجلی معطل ہوچکی تھی۔ پھر وہ زینے کی سمت دوڑا۔ چکردار زینے کے پاس پہنچ کر جب اس نے سر اٹھایا تو آدمی کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ وہ راستہ سیدھا جہنم کو جاتا تھا۔

”تم لوگوں نے بلڈنگ کوڈز کی خلاف ورزی کرکے درجنوں انسانوں کو موت کے منہ میں دھکیل دیا ہے۔“ وہ دہاڑا۔

اس نے اپنی ٹیم کو ہدایات جاری کیں۔ چار فائر فائٹرز چھوٹی سیڑھیاں لے کر ہوٹل کی پچھلی طرف چلے گئے۔ انہوں نے بوجھے اور پانچویں فلور میں داخل ہونے کی کوشش کی مگر انہیں شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔ ایک بہادر فائر فائٹر کھڑکی کا شیشہ توڑ کر بمشکل اندر داخل ہوا۔ اسے گھٹن زدہ ہوئے کمرے میں ایک مرد اور عورت کی لاش ملی۔

کچھ کارکن پائپ لیے زینے کی سمت آگئے۔ انہوں نے اوپر چڑھنے کی کوشش کی مگر تپش رکاوٹ بن گئی۔ انہوں نے دوسری منزل کے زینے پر پانی کا چھڑکاؤ شروع کردیا۔ اس کوشش کے ابتدائی نتائج حوصلہ شکن تھے۔

باہر سے سیڑھی لگا کر تیسری اور چوتھی منزل پر لگی آگ بجھانے کی کوشش کی جارہی تھی۔ فائر فائٹرز کی کوشش تھی کہ آگ کچھ کم ہو تو وہ کھڑکیاں توڑ کر اندر داخل ہوجائیں۔ چار کارکن بڑا سا جال تان کر کھڑے ہوگئے تاکہ کودنے والوں کو دبوچ سکیں۔

جیکب لاؤڈ اسپیکر پر ہدایات جاری کررہا تھا۔ ”اپنے اوپر قابو رکھیں، ایک ایک کرکے کودیں۔ اگر آپ نے جلد بازی کی تو ہمارے لیے مشکلات پیدا ہوجائیں گی۔“

ان باتوں پر بھلا کون دھیان دیتا۔ جب موت تعاقب میں ہو تو حواس ساتھ نہیں دیتے۔ ساتویں منزل سے ایک عورت نے جال میں چھلانگ لگائی۔ ٹھیک اسی لمحے نویں منزل سے ایک شخص نے اپنے بچے کو جال کی سمت اچھال دیا۔ جال تک پہنچنے سے قبل ہی بچہ اور عورت ٹکرا گئے۔ بچے کو تو جال میں دبوچ لیا گیا مگر عورت بری طرح زمین سے ٹکرائی اور اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی۔

ہجوم سکتے میں تھا۔ ایسے میں گیارہویں منزل سے ایک بوڑھے شخص نے جال میں چھلانگ لگائی۔ وہ جال تک تو باحفاظت پہنچ گیا مگر بعد میں پتا چلا کہ وہ چھلانگ کے دوران ہی دہشت سے مرچکا تھا۔

☆☆☆

آر تھر ہاتھ کوٹ کی جیبوں میں ٹھونسے، کیمرا لٹکائے چلا جارہا تھا کہ اسے فائر بریگیڈ کی گاڑیوں کے سائرن سنائی دیے۔

چھٹی حس نے اسے چوکنا کردیا۔ اس نے اِدھر اُدھر نظریں دوڑائیں۔ بہت دور کہیں سرخ روشنیاں جھلملا رہی تھیں۔ گاڑیاں ڈاؤن ٹاؤن کی سمت جارہی تھیں۔ پاس ہی ایک فون بوتھ تھا۔ وہ اس میں گھس گیا۔ اگلے ہی لمحے وہ فائر اسٹیشن کا نمبر ڈائل کررہا تھا۔

”آگ کہاں لگی ہے؟ کیا ونکوف ہوٹل... وہ بوچ رہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

روڈ پر ہے۔"

بوتھ سے نکلتے ہی وہ ہوٹل کی سمت دوڑ پڑا۔ کیمرا کاندھے پر جھول رہا تھا۔ اُسے دور سے دھواں اٹھتا نظر آیا۔ آگ ہوٹل کے درمیانی حصے کو اپنی لپیٹ میں لے چکی تھی۔

عین اُسی وقت فائر بریگیڈ کی مزید دو گاڑیاں وہاں آکر رکیں۔ فائر فائٹرز کود کر باہر نکلے اور اپنے ساتھیوں کی مدد کو آگے بڑھے۔ کچھ لوگ پائپ لے کر اندر کی سمت دوڑے۔ ایک گاڑی کو بیرونی حصے کی آگ بجھانے کے لیے وقف کر دیا گیا۔

کچھ فائر فائٹرز ہوٹل کی اوپری منزلوں سے، جہاں آگ کی شدت کچھ کم تھی، اندر داخل ہو گئے۔ وہاں بھیانک مناظر نے ان کا استقبال کیا۔ کئی لوگ دم گھٹنے سے مر گئے تھے۔ بعد میں پوسٹ مارٹم سے پتا چلا کہ کچھ کی موت کا سبب حرکتِ قلب بند ہو جانا تھا۔

ایک فائر فائٹر کو دھوئیں سے بھرے غسل خانے کے ٹب میں ایک عورت اور دو بچے ملے۔ وہ تینوں تپش سے محفوظ رہنے کے لیے بھرے ہوئے ٹب میں بیٹھ گئے تھے۔ جب فائٹر نے انہیں نکالا تو آکسیجن کی کمی کے باعث وہ بے ہوش ہونے کو تھے۔

آرنلڈ کو سنبھلنے میں تھوڑا وقت لگا۔ اس نے کبھی ایسے ہیبت ناک مناظر نہیں دیکھے تھے۔ جب حواس واپس آئے تو وہ مدد کے لیے آگے بڑھا، مگر سینئر فائر فائٹر جیکب نے اسے پیچھے دھکیل دیا۔ "نہیں، آگے خطرہ ہے۔"

اسی وقت آرنلڈ کو کاندھے پر لٹکے کیمرے کا خیال آیا۔ وہ تیزی سے ہیبت کے ان مناظر کو کیمرے میں محفوظ کرنے لگے۔ دھوئیں اور تپش کے باعث صحیح فریم کا حصول انتہائی دشوار تھا۔ اس نے چند تصاویر بنائیں، مگر وہ جانتا تھا کہ وہ آؤٹ آف فوکس اور لاحاصل ہیں۔

☆☆☆

اچانک نویں منزل کی کھڑکی سے لٹکی ایک عورت سب کی توجہ کا مرکز بن گئی۔ وہ بری طرح چیخ رہی تھی۔ ایک بڑی سیڑھی دیوار سے لگائی گئی۔ ایک کارکن تیزی سے اوپر چڑھا۔ چند منٹ میں وہ عورت تک پہنچ گیا۔ نیچے کھڑے لوگوں نے تالیاں بجا کر اس بہادر شخص کو داد دی۔ کسی نے نہیں سوچا تھا کہ بہادری کا یہ مظاہرہ جلد ایک المیے میں تبدیل ہونے کو ہے۔

ابھی اس نے نویں منزل کی کھڑکی سے لٹکی عورت کو تھاما ہی تھا کہ چودھویں منزل سے ایک بھاری بھرکم عورت نے چھلانگ لگا دی۔ وہ سیدھی مرد اور عورت سے ٹکرائی۔

داد دینے والے مجمع کی چیخیں نکل گئیں۔ اگلے ہی پل وہ تینوں زمین پر پڑے تھے۔ ان کے سر پاش پاش ہو گئے تھے۔

یہ منظر دیکھ کر آرنلڈ کو قے آ گئی۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔

ایمبولینس کا سائرن چیخ رہا تھا۔ کچھ لوگ زخمیوں کی سمت بڑھے۔ البتہ بیشتر لاشیں اٹھانے میں جت گئے۔ کچھ دیر بعد ایمبولینس اسپتالوں کی سمت جا رہی تھیں۔ ان کی جگہ دوسری ایمبولینسوں نے لے لی اور انہوں نے بھی یہ مشق دہرائی۔

اندرونی حصے میں آگ بجھانے کی کوشش کا خاطر خواہ نتیجہ سامنے نہیں آیا۔ زینہ اب بھی لپٹوں میں گھرا تھا، البتہ بیرونی حصے سے بڑی کامیابی ملی تھی۔ شعلے کچھ کم ہوئے اور چند فائر فائٹرز اندر داخل ہو گئے۔

گو جیکب انچارج تھا، اس کی ذمے داری ٹیم کی سربراہی کرنا تھی، مگر ان حالات میں وہ خود کو روک نہیں سکا۔ وہ آٹھویں منزل کی کھڑکی سے اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔ اس نے لاؤڈ اسپیکر تھام رکھا تھا اور وہ مسلسل ہدایات جاری کر رہا تھا۔

جیکب کے سامنے ایک جہنمی دنیا تھی۔ وہ زینے سے نیچے اترا اور چھٹی منزل پر پہنچ کر رک گیا۔ نیچے سے کچھ جانے والے حصے کا ذریعہ شعلے کچھ کم ہوئے تھے، مگر اب وہ قابلِ استعمال نہیں رہا تھا۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ تیسری اور چوتھی منزل پر بھاری تعداد میں اموات ہوئی ہوں گی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو چھٹی اور ساتویں منزل کے کمروں کا جائزہ لینے کی ہدایت کی۔ وہاں ان کا سامنا آسیب زدہ انسانوں سے ہوا۔ کئی اپنے حواس کھو بیٹھے تھے۔ چند پر غشی کے دورے پڑ رہے تھے۔ چند کی دم گھٹنے کے باعث موت ہو گئی تھی۔ مرنے والوں میں عورتیں بھی تھیں اور بچے بھی۔ بوڑھے بھی اور جوان بھی۔ موت نے کسی کو نہیں بخشا۔ آگ کا دیوتا قربانیوں کا بھوکا تھا۔

جیکب نے اپنے حواس مجتمع کیے اور توجہ زندہ بچنے والوں پر مرکوز کی۔ ہیبت کے ان لمحات میں فقط زندگی ہی موت کو شکست دے سکتی تھی۔

☆☆☆

عورت گہری نیند میں تھی اور آج سے قبل کبھی نیند اس پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بوں امر باں نہیں ہوتی تھی۔

بے گرمی کا شدید احساس تھا جس نے پہلے پہل اس پر بے چینی طاری کی۔ اس نے جلد ہی جمائیوں سے آزادی حاصل کر لی۔ کچھ دیر بعد دم گھٹنے کا احساس غالب آ گیا۔ اور آنکھیں جلنے سی لگیں۔ بستر سے اٹھنے کے بعد اسے کچھ جلنے کی بو آئی۔ اس نے قمیص پہنی اور کھڑکی کی سمت بڑھی۔

نیچے ایک ہجوم اس کا منتظر تھا۔ وہ حیران رہ گئی۔ اس نے مزید جھک کر جائزہ لیا۔ اچانک نیند غائب ہو گئی اور منظر واضح ہونے لگا۔

گیارہویں منزل پر موجود اس عورت نے فائر بریگیڈ کی گاڑیاں دیکھیں۔ عمارت کی کھڑکیوں سے نکلتے انسانوں کی چیخیں سنیں۔ سڑک پر پڑی لاشیں دیکھیں۔ اور تب وہ سمجھ سکی کہ ایک سانحہ اس کی زندگی کو لپیٹ میں لے چکا ہے۔

"ہوٹل میں آگ لگ چکی ہے۔" ذہن میں سرگوشی ہوئی۔ وہ دروازے کی سمت دوڑی۔ دروازے کی ناب بری طرح تپ رہی تھی۔ اس کا ہاتھ جل گیا۔ اس نے بازو کی ٹھوکر سے دروازہ کھولا۔ راہداری کے سرخی جیسے میں اسے دھواں نظر آیا۔ وہ خوف زدہ ہو کر پلٹ آئی۔

اس نے کھڑکی سے جھانکا۔ نیچے سے کوئی چلایا۔ "پیچھے ہو جاؤ۔"

ابھی وہ کچھ سمجھ نہیں پائی تھی کہ کوئی شے برق کی رفتار سے اس کے پاس سے گزری۔ وہ ایک بوڑھا آدمی تھا، جس نے اوپری منزل سے چھلانگ لگائی تھی۔ امدادی کارکنوں نے اسے جال میں دبوچ لیا۔

"کود جاؤ۔" عورت کا اندرون پکار اٹھا۔ اس نے نفی میں سر ہلایا، مگر آواز مسلسل آتی رہی۔ اس نے چوکھٹ پر ہاتھ جمائے اور بیرونی حصے میں آ گئی۔ اچانک توازن بگڑا۔ وہ زور سے چلائی۔

اس کے سنہری گھنگھریالے بال ہوا میں لہرا رہے تھے اور اس کی نیلی آنکھوں میں خوف تھا۔

نیچے کھڑے ہوٹل منیجر نے اس کی سمت دیکھا۔ گو فاصلہ بہت زیادہ تھا، مگر اس نے پہچان لیا۔ "ارے یہ تو ڈیزی میکب ہے۔ مجھے لگا تھا یہ مر گئی۔"

ایک انتہائی خوب صورت لڑکی گیارہویں منزل کی کھڑکی سے لٹکی بری طرح چلا رہی تھی۔ سب کی نظریں اس پر جمی تھیں۔ دو فوٹو گرافروں نے اس پر کیمرا فوکس کیا۔ ایک مشہور اخبار اٹلانٹا جرنل کا فوٹو گرافر جیکب جیک تھا اور دوسرا ایک نوجوان تھا، آرنلڈ ہارڈی... اور قسمت کسی ایک پر ہی مہربان ہونے والی تھی۔

انہوں نے کچھ دیر تک کیمرا لڑکی پر جمائے رکھا۔ گیارہویں منزل سے بھی وہ اس کی چیخیں سن سکتے تھے۔ یہ چیخیں جون اسٹن کے دل میں جمید گر رہی تھیں، جس نے کچھ ہی گھنٹوں قبل اس پری وش کو وہاں ٹھہرتے دیکھا تھا۔

جیکب نے لاؤڈ اسپیکر سنبھال لیا۔ اور چلایا۔ "پیچھے ہٹ جاؤ۔ ہم مدد کے لیے آ رہے ہیں۔"

لڑکی نے ایک لفظ نہیں سنا۔ وہ اس کیفیت میں تھی ہی نہیں۔ اس پر تو دہشت سوار تھی۔

اچانک عمارت کے اندر ایک دھماکا ہوا۔ شاید کوئی سلنڈر پھٹا تھا یا پھر کوئی دیوار گری تھی۔ اس ہولناک آواز نے لڑکی پر لرزہ طاری کر دیا۔ اٹلانٹا جرنل کے فوٹو گرافر کی توجہ منتشر ہو گئی۔ جیکب اور اس کی ٹیم نے اس سمت دیکھا، مگر آرنلڈ ہارڈی نہ جانے کیوں... اسی لڑکی کی سمت دیکھتا رہا۔ شاید کسی پراسرار قوت نے اس کے کان میں سرگوشی کی تھی کہ وہ لمحہ آن پہنچا ہے، جو اس کے نام کو امر کرنے والا ہے... وہ اپنی زندگی کے اہم ترین فوٹو گراف کے بے حد نزدیک پہنچ گیا ہے۔

لڑکی بری طرح لرز رہی تھی۔ اس کا توازن بگڑنے لگا۔ اس نے خود کو سنبھالا، مگر پھر ایک دھماکا ہوا... اب اس کی برداشت جواب دے گئی۔

ڈیزی میکب نے، اس خوب رو حسینہ نے گیارہویں منزل کی کھڑکی سے چھلانگ لگا دی...

شاید وہ ایک عام سا لمحہ تھا۔ اس تاریک اور وحشت ناک رات کئی ہلاکتیں ہوئی تھیں، کئی لوگوں نے کھڑکیوں سے چھلانگ لگائی۔ شاید ڈیزی کی اس چھلانگ کو بھی بھلا دیا جاتا، کوئی اس کا تذکرہ نہیں کرتا، اگر اس رات نوجوان آرنلڈ ہارڈی کا کیمرا اس پر فوکس نہ ہوتا... اور اس نے بالکل صحیح لمحے کیمرا کا بٹن نہ دبایا ہوتا۔

فلیش چمکا اور ڈیزی کے کچھ بل والے چھجے پر گرنے سے ایک سیکنڈ پہلے کا منظر اس میں قید ہو گیا۔ اسی تصویر کو ایسوسی ایٹڈ پریس نے تین سو ڈالر میں خرید لیا اور اسی تصویر نے اگلے برس کا پلٹزر پرائز حاصل کیا۔

جوں ہی ڈیزی چھجے سے ٹکرائی، جون اسٹن کے حلق سے ایک چیخ برآمد ہوا، کیمرا مین آرنلڈ کے دل پر گھونسا لگا، جیکب

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے گہرا سانس لیا۔

سب کو یقین تھا کہ وہ حسین لڑکی مرچکی ہے۔ بھلا گیارہویں منزل سے گر کر بھی کوئی بچتا ہے۔ انہیں اس کی موت کا دکھ تھا۔ شدید دکھ۔ مگر مایوسی کے ان لمحات میں... اوپر کچھ حرکت ہوئی۔ کسی کی سسکی سنائی دی۔ جیکب سیڑھی پر تیزی سے چڑھا اور اوپر پہنچ گیا۔

وہ منظر سے غائب ہوگیا۔ اور جب وہ دوبارہ نظر آیا، زخمی وزیری سبکب اس کی گود میں تھی۔ اس کی سانسیں چل رہی تھیں... لوگوں کی خوشی سے چیخیں نکل گئیں۔ ہجوم تالیاں بجانے لگا۔

وزیری کو اسپتال پہنچا دیا گیا۔ وہ جلد صحت یاب ہو کر گھر لوٹ گئی۔ گو اس واقعے نے اسے دنیا بھر کی توجہ کا مرکز بنا دیا تھا، اس کی تصویر سیکڑوں اخبارات میں چھپی، مگر اس بے چاری کی روح اتنی دہل گئی تھی کہ پھر وہ کبھی میڈیا کے سامنے نہیں آئی۔

اس کی موت گمنامی میں ہوئی۔

☆☆☆☆

سائرن کا شور سنائی دینے لگا۔ بریک چرچرائے۔

مزید کمک پہنچ گئی تھی۔ اب فائر فائٹروں نے نئی حکمت عملی اپنائی۔ انہوں نے قریبی عمارتوں کا رخ کیا۔ ان کی کھڑکیوں اور ہوٹل کی کھڑکیوں کے درمیان سیڑھیوں کو پل کی صورت رکھ دیا۔ ایک جانب چھ منزلہ عمارت تھی، دوسری طرف بارہ منزلہ عمارت۔ اور اس وقت وہ دونوں کسی نعمت سے کم نہیں تھیں۔

یہ چھوٹا سا نسخہ کام کرگیا۔ انہوں نے تیزی سے لوگوں کو باہر نکالنا شروع کر دیا۔ آگ بجھانے کے عمل میں بھی تیزی آگئی۔ مگر اس وقت تک شعلے اپنا کام کر چکے تھے۔ موت کا عفریت چال چل گیا۔

اس رات اٹلانٹا کی تاریخ کے سب سے بڑے ریسکیو آپریشن میں 385 فائر فائٹرز نے حصہ لیا۔ انہوں نے جی جان کی بازی لگا دی۔ ان کے پاس 22 پانی سے بھری گاڑیاں تھیں۔ 11 ٹرک تھے، جن پر مختلف سائز کی کئی سیڑھیاں تھیں۔ مگر ساز و سامان اور تجربہ کار فائر فائٹرز کی کوششیں کام نہیں آئیں۔ لاشیں اتنی زیادہ تھیں کہ امدادی کارکن صبح تک انہیں ہوٹل سے باہر لانے کا کرب ناک عمل انجام دیتے رہے۔

انہوں نے لاشوں کو سنبھالنے کے سامنے والی سڑک پر رکھ دیا، جہاں مشہور فلم "گون ود دی ونڈ" دکھائی جارہی تھی۔

لاشوں کے سامنے فلم کے چمکیلے پوسٹرز ماند پڑ گئے۔ اٹلانٹا کرب میں ڈوبا تھا۔

قطار سے لاشیں رکھ دی گئیں۔ کچھ جسم سوختہ تھے۔ کچھ کے چہرے جھلسے ہوئے۔ اور کچھ کو دیکھ کر یوں لگتا تھا کہ ابھی اٹھیں گے اور آپ کا حال چال پوچھنے لگیں گے۔ آخر الذکر وہ تھے، جو دم گھٹنے سے ہلاک ہوئے۔

ہوٹل کے باہر موجود کئی افراد وحشت ناک مناظر کی تاب نہ لاکر پرنم آنکھوں کے ساتھ اپنے ٹھکانوں کو لوٹ گئے۔ البتہ ایک دراز قد آدمی، جس نے اوور کوٹ پہن رکھا تھا اور جس کے چہرے پر زخم کا نشان تھا، بہت دیر تک کھڑا رہا۔ وہ اس وقت تک موجود رہا جب تک فائر فائٹرز ولیم انیف وولف کی لاش باہر نہیں لے آئے۔

اس نے آگے بڑھ کر ایک نظر لاش پر ڈالی اور پھر کہرے میں غائب ہوگیا۔

وہ آدمی پھر کبھی نظر نہیں آیا۔

☆☆☆

جو سانحہ بتایا جارہا ہے، اسے لفظوں میں بیان کرنا ناممکن ہے۔

آگ بجھانے میں چھ گھنٹے لگے۔ ہوٹل کے 194 کمروں کا فرنیچر جل کر خاکستر ہوگیا۔ پلاسٹک بہہ گیا اور لوہے کی اشیا پگھل گئیں۔

ہوٹل میں موجود 304 افراد میں سے 119 کو موت کے اژدہے نے نگل لیا۔ موت نے کسی پر رحم نہیں کیا۔ مرنے والوں میں 132 ایسے تھے، جنہوں نے بالائی کھڑکیوں سے کود کر اپنی جان گنوائی، یا سیڑھی سے اترتے ہوئے پاؤں پھسل گیا۔ ایک امدادی کارکن بھی زندگی کی بازی ہار گیا تھا۔ مرنے والوں میں ایک بڑی تعداد ان بدنصیبوں کی تھی، جنہوں نے بھاگنے کا کوئی راستہ نہ پاکر خود کو کمروں میں بند کرلیا تھا۔ وہ دم گھٹنے سے مرے۔

165 افراد بری طرح گھائل ہوئے۔ چند ایسے تھے، جن کے زخم تو کچھ روز میں بھر گئے، مگر وہ زندگی بھر کے لیے معذور ہوگئے۔ فائر فائٹر نے 120 ایسے افراد کو ہوٹل سے باہر نکالا، جن کے جسموں پر تو ایک بھی خراش نہیں آئی، مگر ان کی روح بری طرح زخمی ہوگئی تھی۔ کئی افراد کو نفسیاتی عوارض نے آن گھیرا۔ علاج کا مرحلہ طویل اور اذیت ناک تھا۔ مگر یہ ہر ایک کے لیے کارآمد ثابت نہیں ہوا۔ چند مستقل پاگل ہوگئے۔

7 دسمبر 1946ء کی دہشت ناک رات ہیوون شہر سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

آئے چالیس طالب علم وکوف ہوٹل میں ٹھہرے تھے۔ ان میں سے کئی نوجوانوں نے اس روز دنیا کو الوداع کہہ دیے۔ ان کے والدین یہ سانحہ برداشت نہیں کر سکے۔ تین عورتیں حرکت قلب بند ہونے سے انتقال کر گئیں۔

اس سانحے نے اٹلانٹا پر سوگ طاری کر دیا۔ جب کرب کے بادل کچھ چھٹے، تو احتجاج کا سلسلہ شروع ہوا۔ مظاہرین نے، جن کی اکثریت مرنے والوں کے لواحقین کی تھی، نہ صرف ہوٹل انتظامیہ کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا، بلکہ بلڈنگ کنٹرول اتھارٹی پر بھی کڑی تنقید کی۔

مقدمے نے خصوصی توجہ حاصل کی۔ وکوف خاندان کی شکست یقینی تھی، جس کا سبب وہ دعویٰ تھا، جو انہوں نے ہوٹل کے فائر پروف ہونے سے متعلق کیا تھا۔ وہ دعویٰ جھوٹ پر مبنی تھا۔ ان کی دھوکا دہی کی وجہ سے سو سے زائد انسان موت کے منہ میں چلے گئے۔

مرنے والوں کے لواحقین کی جانب سے چار ملین کا دعویٰ کیا گیا۔ وہ مقدمہ جیت گئے۔ ہوٹل انتظامیہ کی درخواست خارج کر دی گئی، مگر عدالت نے جو رقم ادا کرنے کا پابند کیا، وہ انتہائی معمولی تھی... فقط ساڑھے تین لاکھ ڈالر۔ ہوٹل انتظامیہ اور حکومت میں گٹھ جوڑ ہو گیا تھا۔ بہت سے افسران کو خرید لیا گیا۔ رشوت دی گئی۔

لوگ چیخ اٹھے۔ تنقید کا طوفان آ گیا، مگر اس زمانے میں دوسری جنگ عظیم جاری تھی۔ لوگوں کی توجہ ہٹانے کے لیے میڈیا کو بھرپور انداز میں استعمال کیا گیا۔ انہیں دیگر خبروں میں الجھا دیا گیا۔ یوں دھیرے دھیرے یہ معاملہ دب گیا۔

☆☆☆

آخر وکوف ہوٹل میں آگ کیسے لگی؟

ستر سال گزر گئے، مگر تفتیش کاروں کے پاس آج بھی کوئی جواب نہیں۔ ایک عام مفروضہ تو یہی ہے کہ آگ سگریٹ کے شعلے سے لگی۔ اس کا آغاز تیسرے فلور سے ہوا۔ زینے کے پاس بچھے قالین نے شعلہ پکڑا، جس کے بعد اس نے اردگرد موجود فرنیچر کو لپیٹ میں لے لیا۔

اس مفروضے پر یقین رکھنے والوں کا کہنا ہے کہ اگر اس رات پانچویں منزل پر جانے والا ویٹر دھواں دیکھ فوراً حرکت میں آ جاتا، تو اتنی بڑی تباہی نہیں ہوتی۔ اسی طرح اگر منیجر نے بروقت فیصلے کیے ہوتے، فوراً فائر اسٹیشن فون کر دیا ہوتا تو ہلاکتیں یقینی طور پر خاصی کم ہوتیں۔

ایک بڑا حلقہ ہوٹل انتظامیہ کو اصل مجرم ٹھہراتا ہے۔ ان کا موقف غلط نہیں ہے۔ ہوٹل میں پانی کے چھڑکاؤ کا نظام ناکارہ ہو چکا تھا۔ ہنگامی راستے نہیں تھے۔ زینہ فقط ایک تھا اور اس کا ڈیزائن ایسا تھا کہ ایک بار آگ کی لپیٹ میں آنے کے بعد وہ جہنم کا دروازہ بن گیا۔ الارم کا بروقت نہ بجنا بھی نقصان میں اضافے کا باعث بنا۔ الغرض ہوٹل انتظامیہ نے غفلتوں کے باب میں سیاہ ترین تاریخ رقم کی۔ اگر ڈبلیو ایف وکوف خود اس حادثے میں ہلاک نہیں ہو گیا ہوتا، تو اسے امریکا کے سب سے ناپسندیدہ شخص کا خطاب مل جاتا۔

کچھ لوگوں نے دیگر پہلوؤں کا بھی جائزہ لیا۔ چند محققین نے خیال پیش کیا کہ اس پورے سانحے کے پیچھے ایک سازش تھی۔ یہ وکوف خاندان کے دشمنوں کی چال تھی۔ کوئی مسٹر وکوف سے انتقام لینا چاہتا تھا۔ اس ضمن میں کتابیں بھی لکھی گئیں۔ ڈاکومینٹری فلمیں بنیں۔ کچھ میں سانحے کی رات کی تصاویر میں مشتبہ افراد کی نشان دہی کی گئی۔ کچھ نے تو باقاعدہ نام دیے کہ فلاں فلاں شخص نے ہوٹل میں آگ لگائی تھی۔ شکاگو کے ایک شوقیہ محقق نے اپنی کتاب میں تذکرہ کیا کہ اس رات ایک شخص نے ہوٹل میں کمرا بک کروایا تھا، جس کا نام جوزف ہیری تھا، مگر نہ تو وہ آتشزدگی کے دوران ہلاک ہوا، نہ ہی پھر کبھی سامنے آیا۔

مفروضے تو بہت ہیں، مگر تفتیش کاروں کے ہاتھ کچھ نہیں آیا۔ اگر ہوٹل کو آگ لگائی گئی تھی، تو اس کے تمام شواہد آگ میں جل کر خاکستر ہو گئے۔ اگر یہ کسی کی سازش تھی، تو سازشی ذہن صاف بچ نکلا۔

اس پورے معاملے کا اکلوتا مثبت پہلو یہ رہا کہ ملک بھر میں تعمیراتی قوانین پر گرما گرم بحث چھڑ گئی۔ قانون سازی کا آغاز ہو گیا۔ بلڈرز کو پابند کیا گیا کہ وہ ہنگامی حالات سے نمٹنے کے لیے جامع انتظامات کریں۔ فائر کوڈز میں بھی بہتری کی گئی۔ فائر فائٹرز کے تربیتی پروگرام شروع کیے گئے۔ ان کے لیے جدید آلات کا اور سہولیات کا انتظام کیا گیا۔ کچھ ماہرین تعمیرات کا خیال ہے کہ یہ وکوف ہوٹل کا سانحہ ہی تھا، جس نے پارلیمنٹ کو اس ضمن میں جامع اور ٹھوس قانون سازی کی تحریک دی اور انہوں نے وہ اقدامات کیے، جنہوں نے مستقبل میں کروڑوں افراد کی زندگیوں کو بہتر اور محفوظ بنایا۔

وکوف ہوٹل آج بھی موجود ہے، مگر آج کل یہ ایلی ہوٹل کہلاتا ہے اور اب یہ حقیقی معنوں میں فائر پروف ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

فلمی الف لیلہ

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

علی سفیان آفاقی

قسط نمبر: 233

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں جو نصف صدی سے علم وادب، صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روز اول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہوئی نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آیا۔ آفاقی صاحب ایسے ہی جوان فکر و بلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے میں بھی گئے وہاں … اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کر دیے۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران جب انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا دید و شنید اور عمل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب و صحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستان در داستان سرگزشت

سرگزشت کے خطا نمبر پر مدیر نے بہت محنت کی ہے اور یہ ایک اچھا اور محفوظ رکھنے کے قابل شمارہ ہے۔

میں بارہا... لکھ چکا ہوں کہ جو کچھ کہتا ہوں مجھ سے بھی ہو جاتی ہیں کہ کئی بار کسی اور کا نام شائع ہو جاتا ہے اور کسی فلم یا گیت لگنے کے بارے میں ذہن بھٹک جاتا ہے حالانکہ اس بارے میں اس سے پہلے بھی لکھا جاتا رہا ہے۔ ایسی کوتاہیوں کی اصلاح کے لیے میں شکرگزار ہوں کہ اس غلطی کا سبب بیان کر دیتا ہوں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک مسئلہ یہ ہے کہ فلمی الف لیلہ گزشتہ 23 سال سے مسلسل شائع ہو رہا ہے۔ اس میں دنیا بھر کی معلومات، تبصرے اور واقعات درج ہوتے ہیں لیکن بعض قارئین یا تو ہر شمارہ پڑھ نہیں سکتے یا پھر نوعمری کے باعث بے خبر ہوتے ہیں۔ مجھے اس بات پر ناز تو نہیں ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ فلمی الف لیلہ جیسا سلسلہ جو گزشتہ 23 سال سے چل رہا ہے اس میں مختلف شخصیات اور موضوعات کے بارے میں اتنی زیادہ معلومات فراہم کی گئی ہیں جو اردو کی کسی اور کتاب یا تصنیف میں دستیاب نہیں ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے اگر کوئی صاحب ایک یا دو جرائد یا کتابوں میں اس قسم کے بے لاگ اور سچی پرمبنی تحریریں پیش کر دیں تو میں ذاتی طور پر ممنون ہوں گا۔ اپنے منہ میاں مٹھو بننے والی بات نہیں ہے۔ یہ اللہ کا فضل اور مہربانی ہے کہ اس نے مجھے سیکڑوں قابل افراد سے نہایت قریبی تعلق رکھنے اور ان کی باتوں اور حالات و واقعات کو کم و بیش کسی مبالغے کے بغیر پیش کرنے کے لیے ایک ایسا حافظہ دیا جس کی وجہ سے واقعات کے علاوہ تصویر بھی میری آنکھوں کے آگے گھومنے لگتی ہے اور بعض اوقات تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے وہ شخصیت زندہ میرے سامنے کھڑی مجھ سے مخاطب ہے۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی دین ہے جس پر میں جتنا بھی شکر ادا کروں کم ہو گا۔ پھر اس نے اپنی مہربانی سے مجھے بہت سے شعبوں میں کام کرنے اور سیکڑوں بلکہ ہزاروں مختلف قسم کے کرداروں سے ملنے کا موقع فراہم کیا۔ دنیا کے مختلف ملکوں میں رہنے اور وہاں کی معاشرت اور لوگوں کو قریب سے دیکھنے کا موقع فراہم کیا۔ دراصل میں جو لکھتا ہوں اس کی کوئی ڈائری یا نوٹس بھی میرے پاس نہیں ہیں۔ جب لکھنا شروع کرتا ہوں تو بے شمار واقعات اور شخصیات خود بخود میرے قلم کی نوک پر آجاتے ہیں۔ جب کہ غالب نے کہا ہے۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالب صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

خدانخواستہ غالب جیسے عظیم ذہین شاعر سے موازنہ مقصود نہیں ہے۔ صرف یہ بیان کرنا مقصود ہے کہ یہ ساری باتیں غیب سے میرے ذہن میں آتی ہیں۔ دنیا میں اور بھی ایسے ہنرمند اور باکمال لوگوں کا تذکرہ موجود ہے جن پر اللہ تعالیٰ شعر، واقعات اور خیالات نازل کرتا رہا ہے۔

خط نمبر کے شہرِ خیال میں واقعی ایک نیا شہر آباد ہے۔ لکھنے والوں کے تبصرے، چٹکلے اور تنقید بہت دلچسپ اور مطالعے کے قابل ہوتی ہے۔

اس نمبر میں محمد جاوید پاشا کا ایک خط شائع ہوا ہے۔ وہ ناظم پانی پتی کے بیٹے اور ولی صاحب جیسی ہمہ گیر شخصیت کے بھتیجے ہیں۔ انہوں نے مجھے مخاطب کر کے شکایت کی ہے کہ میں نے اپنی تحریروں میں ناظم پانی پتی، ولی صاحب اور ان کی بیگم ممتاز شانتی کا ذکر کبھی نہیں کیا۔ میں نہیں جانتا کہ جاوید پاشا صاحب کی عمر کیا ہے اور انہوں نے کب سے سرگزشت کا مطالعہ شروع کیا ہے اور اس کا ہر شمارہ پڑھا ہے یا نہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی عمر غالباً چالیس سال ہو گی جب کہ فلمی الف لیلہ کی اشاعت گزشتہ 23 سال سے جاری ہے۔ ممکن ہے کہ انہوں نے سرگزشت کا مطالعہ بیس سال کی عمر میں شروع کیا ہو اور باقاعدگی سے ہر شمارہ پڑھا بھی نہ ہو۔ ان کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ ولی صاحب، ممتاز شانتی اور ناظم پانی پتی کا تذکرہ مختلف اوقات میں ہوتا رہا۔ اس کے بعد بھی ولی صاحب، ممتاز شانتی اور ناظم پانی پتی کے بارے میں علیحدہ سے مفصل لکھا گیا ہے۔

جن دنوں ولی صاحب لاہور میں رہائش پذیر تھے ان کی ہر روز ایورنیو اسٹوڈیو کے مالک آغا جی اے گل کے دفتر میں شام کو محفل جما کرتی تھی۔ وہ آغا صاحب کے قریبی اور بے تکلف دوستوں میں شامل تھے۔ میں ان دنوں ایورنیو اسٹوڈیو میں فلمیں بناتا اور ہدایت کاری کرتا تھا۔ اس لیے کم و بیش ہر روز ان سے شرفِ ملاقات حاصل ہوتی رہتی تھی اور بعض اوقات وہ میری فلموں کے بارے میں اپنی رائے بھی پیش کرتے تھے۔ وہ اس عمر میں بھی صحت مند اور بھاری جسم کے مالک تھے۔ میں نے انہیں بہت کم بولتے ہوئے سنا ہے کیونکہ میں آغا صاحب کی محفلوں میں اپنے کام یا کسی شکایت کے لیے جاتا تھا مگر وہ اور شریف نیر صاحب کبھی کبھی مجھ پر جملے بھی کس دیتے تھے۔

میں نے ولی صاحب کے بارے میں ایک مفصل کالم لکھا تھا جس میں ممتاز شانتی کا بھی مفصل تذکرہ تھا۔ ان کی فلم ''قسمت'' جس کے ہیرو اشوک کمار تھے اس زمانے میں سو ہفتے چل کر ریکارڈ قائم کر چکی تھی۔ یہ بمبئی ٹاکیز نے بنائی تھی۔ میں نے یہ بھی لکھا تھا کہ لاہور میں اداکاروں کو دریافت کرنے اور فلمی دنیا میں لانے کا سہرا بھی ولی صاحب ہی کے سر تھا۔

ناظم پانی پتی نے فلمی گیت نگاری کا آغاز بمبئی سے کیا تھا۔ بمبئی کے حالات سے بیزار ہو کر وہ بھی ولی صاحب کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

طرح لاہور آگئے تھے۔ میری ان سے ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ بہت مہذب اور باخبر انسان تھے۔ جن دنوں میں لاہور کی ایک ایڈورٹائزنگ کا چیئرمین تھا میں نے ناظم پانی پتی صاحب کو اس ادارے کے لیے کام کرنے پر مجبور کیا تھا۔ اس طرح ہماری ملاقات کم و بیش ہر روز ہو جاتی تھی۔ ان کے مالی حالات بھی اطمینان بخش نہیں رہے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے راشد مختار صاحب کی فلم "میرے ہم سفر" کا یونٹ جب شوٹنگ کے لیے یورپ گیا تو ناظم پانی پتی، پروڈیوسر ملک کے چیف اسسٹنٹ کے طور پر یونٹ کے ہمراہ یورپ بھی گئے تھے مگر اس بارے میں مجھے ٹھیک سے یاد نہیں رہا ہے کہ ولی صاحب نے بمبئی میں "جوانی کی ہوا" بنا کر بہت شہرت حاصل کی تھی۔ ظفر اقبال بھی مجھے بہت اچھی طرح جانتے ہیں۔ لاہور میں ولی صاحب نے پنجابی فلمیں بنائی تھیں جن کا دوبارہ تذکرہ غیر ضروری ہے۔ ممتاز شانتی نے ولی صاحب سے شادی کے بعد ہر ایک سے ملنا بند کر دیا تھا۔ وہ ایک نیک اور مذہبی خاتون تھیں۔ شادی کے بعد چشم فلک کے سوا کسی نے ان کی جھلک تک نہ دیکھی۔ وہ خواتین تک سے ملنا گوارا نہیں کرتی تھیں۔ محمد جاوید پاشا کے لیے میں از سر نو تمام کالم تو نہیں لکھ سکتا لیکن بہتر ہوتا کہ وہ شکوہ کرنے سے پہلے تصدیق کر لیتے۔

میرے کالم پر صحیح یا (میری دانست میں) غلط اعتراض کرنے والے بھی اپنے خیالات کا شہر خیال میں تذکرہ کرتے رہتے ہیں اور اکثر بجا لیکن بے جا تنقید بھی کرتے ہیں۔ جن کا جواب دینا میں ضروری نہیں سمجھتا۔ البتہ ایک پرانا لطیفہ ضرور یاد آجاتا ہے۔

"ایک نوجوان مصور نے وقت کے عظیم ترین مصور کی شاگردی اختیار کی۔ جب اس کا ہاتھ پختہ ہو گیا تو استاد نے کہا کہ تم اپنی یہ تصویر نمائش میں بھی رکھ دو۔ اور لکھ دو کہ اپنی رائے سے آگاہ کریں۔ نوجوان مصور جب شام کو نمائش میں گیا تو اس نے دیکھا کہ اس کی تصویر کا کوئی حصہ ایسا نہیں تھا جس پر غلطیوں کے نشانات نہ تھے۔ نوجوان شاگرد بہت دل برداشتہ ہوا اور اس نے اپنی نشان زدہ تصویر دکھا کر کہا کہ معلوم ہوتا ہے میں نے آپ سے کچھ سیکھا ہی نہیں۔ تجربہ کار استاد نے کہا کہ تم دوبارہ یہی تصویر بنا کر میرے پاس لاؤ۔ شاگرد کئی دن کی محنت کے بعد وہی تصویر دوبارہ تخلیق کر کے استاد کے پاس لے گیا۔ استاد نے کہا تم یہ تصویر نمائش میں رکھ دو اور اس کے نیچے یہ تحریر لکھ دو کہ اگر کسی کو کہیں غلطی نظر آئے تو اس کو درست کر دے۔ نوجوان مصور شام کو نمائش میں گیا تو تصویر پر کسی نے قلم تک نہیں لگایا تھا بلکہ دیکھنے والوں نے اس کی تعریف بھی کی تھی۔ استاد مسکرایا اور کہا "بیٹا! اعتراض کرنا بہت آسان ہے لیکن اس کی اصلاح کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے۔"

☆......☆

لالی وڈ اور بالی وڈ کے بارے میں تو بہت کچھ بتایا گیا۔ آج ہالی وڈ کا تذکرہ ہو جائے تو منہ کا مزہ بدل جائے گا اور بہت ممکن ہے کہ بہت سے لوگوں کو بھولی ہوئی کہانیاں یاد آجائیں۔

ہالی وڈ کسی زمانے میں دنیا بھر کا فلمی مرکز تھا۔ اس کی فلموں نے ساری دنیا کو اپنا گرویدہ کر لیا تھا۔ پاکستان میں بھی ہالی وڈ کے فلم ساز اداروں کے دفاتر موجود تھے۔ وہاں کی بہترین فلمیں ہی پاکستان آتی تھیں اور انگریزی داں فلم بینوں کے علاوہ عام فلم بین بھی ان کے نام جانتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے۔ بالی ووڈ کی ایکٹریس اور ایکٹر گھر گھر مقبول تھے۔ ان کے نام آج بھی لوگوں کو یاد ہیں۔

اس وقت جس مایہ ناز اداکارہ کے بارے میں تذکرہ کیا جا رہا ہے آپ کا نام آڈرے ہیپ برن ہے۔ آڈرے ہیپ برن دبلی پتلی، معصوم شکل اداکارہ تھیں۔ اس زمانے کی دوسری معروف ایکٹریس کی طرح ان میں سیکس اپیل نہ تھی۔ انہوں نے فلمی صنعت سے وابستہ ہونے کی بہت کوشش کی لیکن فلم سازوں نے سیکس اپیل کی کمی کے باعث انہیں منتخب نہیں کیا کیوں کہ اس زمانے کی بالی ووڈ کی ہیروئنیں خوب صورت اور طرح دار تھیں لیکن سیکس اپیل ایک لازمی ضرورت تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی تصاویر شوقین لوگوں کے کمروں میں لگی ہوئی نظر آتی تھیں۔ اخبارات میں ان کی دلکش تصاویر اور دلربا انداز کے ساتھ ساتھ اسکینڈلز بھی لوگ بہت شوق سے دیکھتے اور پڑھتے تھے۔

پاکستان میں ان کی پہلی فلم ”رومن ہالی ڈے“ نمائش کے لیے پیش کی گئی تھی جو سپرہٹ ہوگئی۔ اس کے ہدایت کار بالی ووڈ کے ممتاز اور کامیاب ہدایت کار جارج کیوکر تھے۔ (میری یادداشت کے مطابق) جارج کیوکر کا شمار بالی ووڈ کے صف اول کے اداکاروں میں ہوتا تھا۔ پاکستان میں دکھائی جانے والی بالی ووڈ کی فلم ”بھوانی جنکشن“ کے ہدایت کار بھی وہی تھے۔ اس فلم میں بالی ووڈ کی حسین ترین اداکارہ ایوا گارڈنر تھیں۔ اس فلم کا تفصیلی تذکرہ کیا جا چکا ہے۔

”رومن ہالی ڈے“ ایک انتہائی دلچسپ، پُراثر اور یادگار فلم تھی۔ ہیرو معروف اداکار گریگری پیک تھے۔ اس فلم کا موضوع انوکھا اور انتہائی دلچسپ تھا۔ مختصراً اس کی کہانی یہ ہے کہ آڈرے ہیپ برن ایک ریاست کی شہزادی بلکہ بادشاہ کی جانشین تھیں لیکن محل کی رسومات اور پابندیوں سے وہ عاجز تھیں۔ شاہی خاندانوں میں حسب مراتب اور شاہانہ دستور ہوتا تھا اور شاہی خاندان کے افراد ایک عام آدمی کی طرح زندگی نہیں گزار سکتے تھے۔ پھر ہیپ برن تو ملک کی ہونے والی ملکہ بھی تھیں۔ اس لیے ان کی شاہی آداب کی تربیت پر بہت زور دیا جاتا تھا۔ آڈرے ہیپ برن ان پابندیوں اور شاہانہ انداز طرز سے عاجز تھیں اور ایک عام لڑکی کی طرح زندگی بسر کرنا چاہتی تھیں۔

انہیں اس کا موقع اس وقت ملا جب وہ شاہی دورے پر روم آئیں۔ یہاں بھی ان کے شاہانہ انداز اور پابندیوں کی نگرانی کی جاتی تھی۔ ایک رات وہ موقع پا کر محل سے نکل گئی۔ وہ ایک عام انسان کی نظر سے دنیا کو دیکھنا چاہتی تھی۔ اسے نہ راستوں کا پتا تھا نہ محل واپس جانے کا ذریعہ جانتی تھی۔ جیب میں ایک کوڑی بھی نہ تھی۔ ایک عام اسکرٹ پہن کر وہ ایک عام شہری لڑکی نظر آتی تھی۔

کچھ دیر وہ روم میں گھومتی رہی اور اس بہانے ہدایت کار نے روم کا خوب صورت اور تاریخی شہر کا ایک حصہ دکھا دیا۔ پیدل چلتے چلتے وہ تھک چکی تھی۔ بھوک بھی ستا رہی تھی۔ وہ خاموشی سے ایک فٹ پاتھ پر بیٹھ گئی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اب کیا کرے۔

فلم کا ہیرو گریگری پیک ایک اخباری رپورٹر تھا۔ اس کے ساتھ اس کا فوٹوگرافر دوست بھی خبریں اور تصاویر بنایا کرتے رہتے تھے۔

اخبار کا ایڈیٹر ایک درمیانی عمر کا دلچسپ آدمی تھا۔ اس کو گریگوری پیک سے یہ شکایت تھی کہ وہ کافی عرصے سے کوئی اہم خبر لے کر نہیں آیا تھا۔ وہ گریگوری پیک سے کہتا ہے کہ اگر تم اسی طرح کام کرتے رہے تو دوسرے اخبارات ہم پر بازی لے جائیں گے۔ کوئی کارنامہ کرو ورنہ کسی اور اخبار میں نوکری تلاش کرو۔ گریگوری کو معلوم تھا کہ اس کا نیک دل اور نرم مزاج ایڈیٹر اس کو ہرگز برطرف نہیں کرے گا لیکن اسے احساس تھا کہ وہ کافی عرصے سے کوئی سنسنی خیز رپورٹ نہیں لا سکا تھا۔

اُدھر شاہی مہمان خانے میں شہزادی کے لاپتا ہونے کی وجہ سے ایک مصیبت پڑی ہوئی تھی۔ اس کے ساتھ آنے والے مصاحب اور سرکاری عہدے دار بادشاہ کو بھی یہ خبر نہیں دے سکتے تھے۔ وہ اپنے طور پر شہزادی کو تلاش کر رہے تھے لیکن اس بات کی کسی اور کو کانوں کان خبر تک نہیں دینا چاہتے تھے۔ اس طرح اندر ہی اندر ایک طوفان اٹھ رہا تھا۔

گریگوری پیک جب اپنی چھوٹی سی کار لے کر دفتر سے نکلا تو اس کی نظر آڈرے ہیپ برن پر پڑ گئی جو ایک فٹ پاتھ پر بیٹھی تھی۔

ایک خاص بات بیان کرنا ضروری ہے کہ شاہی مہمان خانے میں رات شہزادی کو خواب آور گولی کھلائی گئی تھی جو کہ روز کا معمول تھا۔

گریگوری پیک کی نظر فٹ پاتھ پر بیٹھی آڈرے ہیپ برن پر پڑی۔ ایک خوب صورت لڑکی کو رات کے وقت فٹ پاتھ پر بیٹھا دیکھ کر اس کی طرف گیا اور پوچھا کہ وہ اس کی کیا مدد کر سکتا ہے۔ اس نے شاہانہ انداز میں کہا۔ ”ہمیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ڈنر کی ضرورت ہے۔"

گر گوری پیک سامنے کی دکان سے اس کے لیے برگر لے آیا جو دونوں نے کھایا۔ اس کے بعد گر گوری پیک نے اس سے پوچھا کہ "آپ کو کہاں جانا ہے۔ میں آپ کو پہنچا دیتا ہوں۔"

مگر اب اس پر خواب آور گولی کا اثر ہونا شروع ہو گیا تھا اور نہ ہی وہ یہ جانتی تھی کہ اس کو کہاں جانا ہے۔ وہ نیم خوابی کے عالم میں تھی اس لیے کوئی معقول جواب نہ دے سکی۔ اس کو اونگھتے ہوئے دیکھ کر گر گوری پیک نے پھر اس کو اس کے گھر چھوڑنے کی پیشکش کی اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اٹھایا تو وہ اس کا سہارا لے کر کھڑی ہو گئی۔

ہیرو اس صورت حال سے بیزار تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک کال گرل ہے اور اس وقت شراب کے نشے میں ہے مگر رات گئے اس سے چھٹکارا حاصل کرنا بھی دشوار تھا۔ مجبوراً اس نے سہارا دے کر اس کو اپنی چھوٹی سی کار میں بٹھایا اور سوچا کہ صبح تک اس کو ہوش آ جائے گا تو وہ اس کو کہیں پہنچا دے گا۔

ہیرو ایک درمیانے درجے کے علاقے میں ایک کمرے کے فلیٹ میں رہتا تھا۔ ہیروئن کو اپنے ساتھ لے کر آ گیا مگر فکر مند تھا کہ کسی محلے دار یا جاننے والے کی نظر نہ پڑے ورنہ مفت میں بدنامی ہو گی۔ اس نے سیڑھیاں چڑھ کر جب ہیروئن کو دیوار کے سہارے کھڑا کر کے کمرے کا قفل کھولنا چاہا تو ہیروئن جو نیند میں سو چکی تھی اور دیوار کے سہارے پھسل کر گرنے والی تھی بمشکل ہیرو اس کو اندر لے گیا۔ کمرے میں صرف ایک ہی بیڈ تھا۔ ہیروئن اس بیڈ پر گر گئی۔ وہ نیند کے عالم میں دنیا و مافیہا سے بے خبر تھی۔

ہیرو جب نائٹ سوٹ پہن کر آیا اور ہیروئن کو اپنے بستر پر بے خبر سوتا پایا تو اس کو جھنجوڑا اور کہا کہ "یہ تو میرا بستر ہے۔ تم صوفے پر سو جاؤ" مگر وہ تو بے خبر تھی۔ آخر ہیرو نے بستر سمیت اس کو اٹھا کر صوفے پر لٹا دیا مگر وہ بے خبر سوتی رہی۔

صبح ہوئی تو ہیروئن نے اپنے اسٹاف کے لوگوں کو پکارا۔ اپنا لباس دیکھا اور پھر چھت کو دیکھا تو وہ شاہی محل سے مختلف تھی۔ جب اس نے ہیرو کو دیکھا تو اس سے بھی شاہانہ انداز میں مخاطب ہوئی۔ ہیرو نے کہا صبر کرو میں ناشتا تیار کر رہا ہوں۔ اس وقت ہیروئن کو احساس ہوا کہ وہ عالم خوابی میں کہیں اور پہنچ گئی ہے۔

اسی دوران میں اس کے فوٹو گرافر دوست نے آ کر اس کو اطلاع دی کہ اس کو خفیہ ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ فلاں ملک کی شہزادی شاہی مہمان خانے سے غائب ہے۔ اس کا شاہی عملہ اس خبر کو عام نہیں کرنا چاہتا۔ اخبارات میں شہزادی کے روم آنے کی خبر تصویر کے ساتھ شائع ہوئی ہے۔

جب ہیرو نے شہزادی کی تصویر دیکھی تو چونک پڑا۔ دوبارہ جا کر شہزادی کو تصویر سے ملا کر دیکھا اور فوٹو گرافر دوست سے کہا کہ تم یہاں اس کا خیال رکھو میں ایڈیٹر سے مل کر ابھی واپس آتا ہوں۔

وہ فوراً ایڈیٹر کے پاس پہنچا جب اس نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کوئی کاغذ ہے تو اس پر برس پڑا۔ "مجھے معلوم تھا کہ تم جیسے کام چور شخص کو اسٹوری نہیں ملے گی۔"

ہیرو بہت پُرجوش تھا۔ اس نے ایڈیٹر کو بتایا کہ وہ اس کو دو تین دن کے اندر ایسی اسٹوری اور تصاویر لا کر دے گا جو اخباری دنیا میں تہلکہ مچا دے گی مگر اس کا معاوضہ بہت زیادہ ہو گا۔

ایڈیٹر پہلے تو اسے چرب زبانی سمجھا مگر پھر مان گیا کہ اگر وہ ایسی اسٹوری لا کر دے گا تو اس کو منہ مانگا معاوضہ ملے گا۔

ہیرو بھاگا بھاگ گھر جا کر مہمان کی بہت خاطر مدارات کرتا ہے۔ ہیروئن اپنے بارے میں اس کو کچھ نہیں بتاتی سوائے اس کے کہ وہ پہلی مرتبہ روم دیکھنے آئی ہے۔ ہیرو فون کر کے اپنے فوٹو گرافر دوست کو بلاتا ہے۔ ایک طرف لے جا کر مختصراً اس کو حقیقت بتاتا ہے کہ تم ہمارے ساتھ رہنا اور تصاویر بناتے رہنا۔ ہیرو اپنا گہرا دوست کہہ کر فوٹو گرافر کا تعارف کراتا ہے جس کے پاس ایک جدید ترین کیمرا ہے جو دیکھنے میں سگریٹ لائٹر نظر آتا ہے۔

ادھر شہزادی کے مصاحب اور دوست کی خفیہ پولیس کے لوگ شہزادی کو تلاش کر رہے ہیں مگر کسی کو یہ راز بتانے بھی نہیں۔

ہیرو، ہیروئن اور فوٹو گرافر روم کے تاریخی و یادگار مقامات پر جاتے ہیں اس بہانے کہ فلم بین اس خوب صورت شہر کی جھلکیاں بھی دیکھ لیتے ہیں۔ ہیرو کا دوست فوٹو گرافر تجویز دیتا ہے کہ ہیروئن کے بال چھوٹے اور ہیئر اسٹائل مختلف ہونا چاہیے۔ چنانچہ ہیروئن نئے اسٹائل کے چھوٹے بالوں کا ہیئر اسٹائل بنوا لیتی ہے۔ ان دونوں کے ساتھ گھومتے ہوئے وہ بے حد خوش ہے۔ اس کو پہلی مرتبہ شاہانہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بندشوں سے آزادی حاصل ہوتی ہے جو اس کے لیے بہت کامیاب اور دلچسپ تجربہ ہے۔ وہ ان کے ساتھ ہر جگہ گھوم رہی ہے۔ ہیئر اسٹائل تبدیل ہونے کی وجہ سے پہلی نظر میں اس کو پہچاننا مشکل ہے اور فوٹو گرافر نے اسی مصلحت کی خاطر اس کا ہیئر اسٹائل تبدیل کیا ہے۔ اس کو ایک نیا لباس بھی خرید کر پہنایا گیا ہے۔

یہ لوگ ایک ہوٹل میں جاتے ہیں جہاں ریاست کی فوج کے دو کارندے بھی موجود ہیں وہ شہزادی تک پہنچنا چاہتے ہیں مگر ہیرو اور فوٹو گرافر اس کو روکنے کے لیے دوسرے گاہکوں پر گرم گرا دیتے ہیں۔ اس طرح ان لوگوں سے گاہکوں کی لڑائی اور جھگڑا ہوجاتا ہے، ہیروئن بھی ایک کرسی اٹھا کر جھگڑا کرنے والوں کو مارتی ہے جس کی فوٹو گرافر تصویر بنالیتا ہے۔ یہ فلم ان دلچسپیوں سے بھرپور ہے، جو لوگ دیکھنا چاہتے ہیں۔ فلم بین بھی اس سے بہت لطف اندوز ہوتے ہیں۔ سارا دن ساتھ رہنے کی وجہ سے ہیرو اور ہیروئن ایک دوسرے کو پسند کرنے لگتے ہیں جس کا تھوڑا بہت اظہار بھی ہوتا رہتا ہے۔

رات گئے ہیروئن کو اپنے شاہی مہمان خانے کا پتا یاد آتا ہے اور اس نے یہ بھی سمجھ لیا کہ اس کی ریاست کے اہلکار اس کی تلاش میں ہیں۔ وہ ہیرو سے کہتی ہے کہ رات کو میں نے شب خوابی کا لباس پہنا ہوا تھا اور میں گولیوں کے نشے میں بھی۔ آپ لوگوں کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ مہربانی سے مجھے میری رہائش گاہ پر پہنچا دیں۔ ہیرو اور اس کا فوٹو گرافر دوست اس کو مہمان خانے کے گرد و نواح میں ڈراپ کردیتے ہیں لیکن ہیرو اور ہیروئن دونوں اداس اور غمگین ہیں کیونکہ اب جدائی کا وقت آگیا ہے۔

ہیروئن کو مہمان خانے کے گرد و نواح میں پہنچا کر دونوں واپس آتے ہیں۔ فوٹو گرافر تصویروں کو ڈیولپ کر کے پرنٹ نکالتا ہے۔ بے شمار اور بہت دلچسپ تصویریں ہیں۔ دونوں دوست ان تصویروں کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہیں۔

دوسرے دن پروگرام کے مطابق شہزادی کی واپسی ہے۔ جانے سے پہلے دستور کے مطابق ایک پریس کانفرنس منعقد ہوتی ہے۔ سارے صحافی اکٹھے ہیں جن میں گریگوری پیک اور فوٹو گرافر بھی شامل ہیں۔ کچھ دیر بعد شہزادی شاہانہ لباس اور انداز میں نمودار ہوتی ہے اور حسب دستور سب صحافیوں سے ہاتھ ملاتی ہے۔ ہیرو سے بھی ہاتھ ملاتی ہے۔

اس کی آنکھوں میں اداسی اور بے بسی جھلک رہی ہے۔ فوٹو گرافر سے ہاتھ ملاتی ہے تو وہ مودب ہو کر تمام تصاویر کا لفافہ اس کو پیش کرتا ہے۔ وہ ایک تصویر کو دیکھتی ہے اور مسکرا کر رکھ لیتی ہے۔

ایک مختصر تقریر کر کے وہ روم کی تعریف کرتی ہے۔ عملہ اس کو اشارہ کرتا ہے کہ پریس کانفرنس ختم ہو چکی ہے۔ وہ جاتی ہے مگر پلٹ کر ایک نظر دوبارہ ہیرو پر ڈالتی ہے۔ دونوں میں سے کوئی بھی کچھ نہیں بولتا لیکن یہ منظر یادگار ہے جو دیکھنے والے کبھی نہیں بھول سکتے۔

رفتہ رفتہ تمام صحافی باہر جاتے ہیں مگر ہیرو وہیں کھڑا ہے۔ اس کے تاثرات دل پر اثر کرنے والے ہیں۔ یہ دیکھ کر فوٹو گرافر بھی خاموشی سے باہر چلا جاتا ہے۔ ہیرو چند لمحے وہیں کھڑا رہتا ہے پھر پلٹ کر جاتا ہے۔ پورے ہال میں صرف اس کے جوتے کی آواز گونج رہی ہے۔ وہ ایسے قدموں سے چل رہا ہے جیسے اس کا سب کچھ لٹ چکا ہے۔

اس سے پہلے گریگوری پیک اخبار کے لیے اپنی لکھی ہوئی رپورٹ کو پھاڑ دیتا ہے اور تصاویر بھی پھاڑ کر ردی کی ٹوکری میں ڈال دیتا ہے۔ اخبار کے ایڈیٹر سے مل کر کہتا ہے کہ آج بھی کوئی اسٹوری نہیں دے سکتا۔ ایڈیٹر ناراض ہو کر کہتا ہے کہ تم تو پہلے ہی کام چور ہو۔ بہرحال تم جو شرط ہارے ہو اس کی رقم میرے حوالے کرو۔

''رومن ہالی ڈے'' ایک سپرہٹ فلم تھی جس کے ساتھ ہی آڈرے ہیپ برن بھی راتوں رات صف اول کی ہیروئن بن گئی۔ جن نقادوں اور فلم سازوں نے فیصلہ دیا تھا کہ آڈرے ہیپ برن کسی طرح بھی فلمی ہیروئن بننے کے لائق نہیں ہے۔ اس کا جسم سوکھی ہوئی لکڑی کی طرح نظر آتا ہے۔ نہ بات کرسکتی ہے اور بے حد شرمیلی ہے۔ اس کی فلم سازوں کے سامنے آواز ہی نہیں نکلتی۔ وہ کیمرے کے سامنے مکالمے کیسے بولے گی۔

مگر آڈرے ہیپ برن کی پہلی ہی فلم نے سب کے منہ بند کردیے۔ اس کی معصوم صورت اور سادگی سے مکالمے بولنے کا انداز سب کو بھا گیا۔ اس فلم کی کامیابی میں عظیم ہدایت کار جارج کیوکر اور اداکار گریگوری پیک کی بے ساختہ اداکاری کا بھی نمایاں ہاتھ تھا۔ اسکرپٹ انتہائی مہارت سے لکھا گیا اور کرداروں کا انتخاب ایسے تھا جیسے انگوٹھی میں نگینے۔

اس طرح آڈرے ہیپ برن راتوں رات سپر اسٹار

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بن گئی اور ہالی ووڈ کی عظیم ترین اداکاراؤں کی صف میں شامل ہوگئی۔

"رومن ہالی ڈے" ایک ہلکی پھلکی رومانی فلم تھی اور ہیرو ہیروئن کے ایک دوسرے سے قربت اور آئی لو یو کا ایک لفظ بھی نہ کہنے کے باوجود یہ ایک ایسی اثر انگیز رومانوی فلم تھی جسے دیکھنے والے کبھی نہ بھلا سکیں گے۔ اس کے بعد آڈرے ہیپ برن نے متعدد کامیاب اور یادگار فلموں میں کام کیا اور مختلف قسم کے کردار بڑی خوب صورتی اور مہارت سے نبھائے۔ اس کی اداکاری میں بے ساختگی اور سادگی تھی۔ اس کا بھولا معصوم چہرہ بھی اس کے لیے اللہ کی ایک دین ہی تھی۔ وہ اس انداز سے اداکاری کرتی تھی جیسے فلم میں بھی عام زندگی جیسا ایک جیتا جاگتا کردار ہے۔ فلمی نقادوں کا کہنا تھا کہ اس کی فلمیں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ہم خواب دیکھ رہے ہیں۔ Nuns story، ٹو فار دی روڈ اس کی یادگار فلمیں ہیں۔ بڑے بڑے فلم ساز اور ہدایت کار کسی فلم میں کاسٹ کرنے سے پہلے اس کی رائے دریافت کیا کرتے تھے جو کہ عام طور پر ان دنوں دستور نہ تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے یہ معصوم اور سادہ سی لڑکی فیشن کا نمونہ بن گئی۔ وہ جو بھی لباس پہنتی تھی وہ فیشن بن جاتا تھا۔ وہ سپر اسٹار تو بن گئی مگر اس کے جسم کی ساخت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ ہالی ووڈ کی ہیروئنوں کے لیے جسم کے پیچ و خم کا ہونا ضروری ہے مگر آڈرے ہیپ برن آخر دم تک دبلی پتلی، سپاٹ جسم کی ہیروئن ہی رہی۔ دراصل اس کی اداکاری اور سحر انگیز شخصیت ان ضرورتوں کو چھپا رہی تھی۔ اس کی شخصیت میں وقار اور کشش تھی۔ وہ ہالی ووڈ کی محفلوں میں بھی کم ہی نظر آتی تھی۔

اس نے ہالینڈ میں اس زمانے میں ہوش سنبھالا تھا جب ملک پر جرمنوں کا قبضہ تھا۔ حریت پسندوں نے آس پاس کے گھنے جنگلوں میں پناہ لے لی تھی۔ آڈرے ہیپ برن تمام خطرات کو نظر انداز کر کے ان کے لیے کھانے پینے کا سامان لے کر جنگلوں میں جایا کرتی تھی۔ ایک بار جرمن فوج کے دستے نے اسے گھیر لیا لیکن اس کے چہرے کی معصومیت دیکھ کر جانے دیا۔ آڈرے نے اسے بتایا کہ وہ اپنے گھر والوں کے لیے یہ سامان لے کر جا رہی ہے۔ اس نے ایک اداکار سے شادی کر لی تھی۔ وہ بھی اس کی طرح سادگی پسند اور ہجوم سے دور رہنے کا عادی تھا۔

Singing in the rain بھی اس کی مشہور میوزیکل فلم تھی۔ اس کے ایک اہم سوانح نگار نے لکھا ہے کہ یہ اس کی اداکاری کا بہترین نمونہ تھا۔ ایک طرح سے یہ اس کی اداکاری کا پہلا امتحان تھا جس میں وہ سو فیصد نمبروں سے پاس ہوگئی۔

آڈرے کو فیشن ایجاد کرنے والی شخصیت اس لیے قرار دیا گیا کہ وہ انتہائی سادہ لیکن بہترین سلا ہوا لباس پہنتی تھی جو خواتین میں فوراً مقبول ہو جاتا تھا۔

فلم رائٹر فاسں نے یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ جب ہم برن میں "ٹو فار دی روڈ" کی شوٹنگ ہو رہی تھی تو مجھے اپنا لکھا ہوا ایک سین پسند نہیں آیا اور میں نے وہ سین دوبارہ لکھ دیا۔ یونٹ کے دوسرے لوگ لنچ میں مصروف تھے اس دوران میں، میں اپنے کام سے فارغ ہو گیا۔ لنچ کے خاتمے پر جب دوبارہ شوٹنگ شروع ہوئی تو میں آڈرے کے پاس گیا اور اس کو اپنا نیا لکھا ہوا سین دکھایا۔

اس نے سین کو پڑھ کر پوچھا مگر اس تبدیلی کی ضرورت کیا تھی؟

اس نے کہا "مجھے وہ سین غیر منطقی محسوس ہو رہا تھا۔"

آڈرے نے ایک لمحے کی خاموشی کے بعد کہا۔ "اگر تم برا نہ مانو تو کہوں کہ مجھے پہلے والا سین پسند ہے وہ اس سے زیادہ بہتر ہے۔"

ان دنوں میں نوجوان اور جذباتی تھا۔ میں نے کہا۔ "آڈرے سوری میرے خیال میں تمہارا خیال درست نہیں ہے کیوں کہ پہلا سین غیر منطقی ہے جو شاید فلم دیکھنے والوں کے دلوں میں یہ سوال پیدا کرے کہ بھلا ایسا کیونکر ہو سکتا ہے۔"

آڈرے نے کہا۔ "ہم ایک طرف بیٹھ کر دونوں سین پڑھتے ہیں۔" پھر ہم مس ہیپ برن کے کارواں میں چلے گئے۔

آڈرے نے کہا۔ "اب بولو ہم پہلے کون سا سین پڑھیں؟"

میں نے کہا۔ "اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہم کوئی بھی سین پہلے کر سکتے ہیں۔"

ہم دونوں بیڈ پر پاس پاس بیٹھے تھے۔ آڈرے نے کہا۔ میرے خیال میں ہم پہلے والا سین کرتے ہیں۔ اس نے سین کا آغاز کیا۔ پہلا فقرہ یہ تھا۔ "گڈ مارننگ ڈارلنگ۔" پورا سین کرنے کے بعد اس نے میری طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ میں نے کہا۔ "آڈرے تمہارا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

خیال درست ہے پہلے والا سین واقعی بہت اچھا ہے۔ دوسرے سین کو ڈراپ کر دینا چاہیے۔"

دراصل اس نے اس سین کے مکالموں کی ادائیگی اس انداز سے کی تھی کہ وہ ایک بدلا ہوا سین محسوس ہوتا تھا۔ دراصل آڈرے نے اداکارہ کی حیثیت سے اس سین کو پرکھا تھا جب کہ میں نے صرف رائٹر کے طور پر لکھا تھا اور یہی فرق تھا۔

یہی آڈرے کا انداز تھا۔ اس نے اپنی فلموں میں صرف ایسے کردار کیے جن کے بارے میں فلم بینوں کا خیال تھا کہ صرف وہی کر سکتی ہے۔ فلم ساز اس کو "نخرے والی" کہا کرتے تھے مگر اس نے جو بھی کردار کیے ایسا لگا جیسے صرف وہی ان سے انصاف کر سکتی ہے۔ تقریباً بیس سال کے بعد میں نے آڈرے کو اپنا ایک اور اسکرپٹ بھیجا۔ اس میں اس کا کردار ایک بیوہ عورت کا تھا۔ اس کو معلوم ہوا کہ اس کا شوہر کسی اور عورت سے بھی تعلق رکھتا ہے۔ ان دونوں کی اتفاق سے ملاقات ہو گئی تو پتا چلا کہ اس عورت کو بھی معلوم تھا کہ اس کا محبوب شادی شدہ ہے۔ اس طرح ان دونوں کا غم یکساں تھا۔

جواب میں آڈرے نے اپنے ہاتھ سے ایک چھ صفحے کا خط لکھا اور بتایا کہ ان دنوں وہ ایک فلم "دی چلڈرنز آور" میں کام کر رہی تھی جس کی کہانی بھی اسی نوعیت کی ہے اس لیے وہ بیک وقت میری فلم میں کام نہیں کر سکتی۔ فلم رائٹر اور نقاد انیتا جاسن نے لکھا ہے کہ ہماری آخری ملاقات سنڈی پر آسٹر بلیا میں ہوئی تھی۔

اس نے کہا کہ تمہاری لکھی ہوئی فلموں میں کام کر کے مجھے حقیقی خوشی اور اطمینان حاصل ہوتا تھا۔ میں نے جواب میں کہا کہ ان فلموں میں اس کی اداکاری سے میرے لیے خوشی اور افتخار کا باعث تھی۔

اس ملاقات کے کچھ عرصے بعد آڈرے ہیپ برن کا انتقال ہو گیا اور ہالی ووڈ ایک منفرد اور انتہائی باصلاحیت اداکارہ سے محروم ہو گیا۔

اس نے اپنے وقت کے عظیم اور نامور اداکاروں کے ساتھ کام کیا جو بہت کامیاب رہیں۔ خاص بات یہ ہے کہ ہالی ووڈ میں کبھی آڈرے ہیپ برن کا کوئی اسکینڈل مشہور نہیں ہوا۔ وہ ایک عجیب و غریب عورت اور اداکارہ تھی۔

آڈرے ہیپ برن کے بارے میں ہم نے لکھا کہ زندگی بھر ان کا کوئی اسکینڈل مشہور نہیں ہوا۔ ایسا نہیں ہے کہ اس زمانے کے اداکار اور اداکارائیں بہت پارسا تھے۔ اس زمانے میں ہالی ووڈ سے کئی فلمی جریدے شائع ہوتے تھے جن میں لکھنے والے اسکینڈلز پر زیادہ زور دیتے تھے۔ ان میں اکثریت خواتین کی تھی۔ یہ لکھنے والیاں اداکاروں اور اداکاراؤں پر طنز بھی کرتے رہتے تھے اور ان کی ذرا سی بات کا بتنگڑ بنا دیتے تھے۔

اس زمانے کے اسکینڈلز ڈھکے چھپے ہوتے تھے۔ فن کاروں کی دوستی کے چھوٹے موٹے واقعات کو یہ خواتین نمک مرچ لگا کر بیان کرتی تھیں۔ فن کاروں کا آپس میں میل جول بھی تھا لیکن کسی اداکار کے ساتھ کسی اداکار کو گھومتے پھرنے یا سمندر کی سیر پر جانے کے واقعات کو بھی خبر بنا دیتی تھیں۔

دراصل اس وقت کا ہالی ووڈ آج کے ہالی ووڈ سے مختلف تھا۔ جہاں اخلاقی قدروں کا خیال رکھا جاتا تھا۔ فن کاروں کی ازدواجی اور گھریلو زندگی عام طور پر خوشگوار ہوتی، شوہر کی بیوی سے بے وفائی اور بیوی کا شوہر کی بے وفائی عام نہیں تھی لیکن فلمی صحافی خواتین ان کا بھی پتا لگا لیتی تھیں اور انہیں رنگ آمیزی کے ساتھ پیش کیا جاتا تھا۔ آج کا ماحول اس کے برعکس ہے۔ ہیرو اور ہیروئنوں کی محبت کی جگہ وقتی وقت گزاری نے لے لی ہے۔ قانون کی رو سے اب شادی کے بغیر فن کاروں کا اکٹھا رہنا ایک معمول بن چکا ہے۔ اس کو جدید زبان میں ریلیشن شپ کہا جاتا ہے۔ یہ تعلقات بنتے اور ٹوٹتے میں کچھ دیر نہیں لگتی۔ بعض اوقات تو ایک سال کے بعد بھی ساتھی بدل لیا جاتا ہے اور اس کو برا نہیں سمجھا جاتا۔ دراصل اس معاملے میں آج کے فنکار (بلکہ تمام مغربی ممالک) جانوروں کی طرح زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کچھ وقت گزرے پھر تم کہاں اور ہم کہاں۔ خاندان اور بچے اب بے معنی ہو چکے ہیں۔ سترہ سال کی عمر کے بعد لڑکی گھر سے رخصت ہو جاتی ہے اور کیا گل کھلاتی ہے اس سے والدین کو سروکار نہیں ہے۔ شادی کے بغیر بچے پیدا کرنا بھی برا نہیں سمجھا جاتا۔ یہ طریقہ جنگلوں میں رہنے والے جانوروں کا ہے لیکن "ترقی یافتہ" مغرب نے اب اسی حیوانی زندگی کو اپنا لیا ہے۔

اس داستان کو بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ آج کا ہالی ووڈ بھی بدل چکا ہے۔ قدریں اور روایات بدل چکی ہیں۔ جب فن کار ذاتی طور پر بات بات ٹھکانے بدلتے رہیں تو پھر اسکینڈل بن سکتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پرانے ہالی ووڈ میں شادی کے بندھن اور گھر کو اہمیت دی جاتی تھی۔ اس لیے معاشرہ خرابیوں سے بہت حد تک پاک تھا۔ فن کاروں کی ملاقاتیں چوری چھپے ہوتی تھیں۔ محبت اور عشق کا تو اس زمانے میں بھی کوئی تصور نہیں تھا مگر اس زمانے میں بھی چند عشق کی داستانیں بہت مشہور ہوئی تھیں۔

ان میں سرفہرست تو الزبتھ ٹیلر ہی ہیں۔ اس دور میں بھی وہ کسی اخلاقی پابندی کی قائل نہیں تھیں۔ یوں تو اب 73 سال کی عمر میں بھی ان کا دل جوان ہے مگر سوچیے کہ جب وہ واقعی جوان تھیں تب بھی دنیا اور معاشرے کی پروا نہیں کرتی تھیں۔

الزبتھ ٹیلر نے آٹھ شادیاں کیں۔ رچرڈ برٹن سے انہوں نے دوبار شادی کی اور دونوں بار طلاق ہوگئی۔ آئیے ان کی رنگین اور من موجی زندگی پر ایک نظر ڈالتے ہیں:

الزبتھ کی ہر شادی محبت کی شادی ہوتی تھی جس سے وہ بچوں کی طرح لطف اندوز ہوتی تھیں اور کہتی تھیں کہ مجھے میری منزل مل گئی۔

1950ء میں انہوں نے مشہور زمانہ ہلٹن ہوٹل کے مالک کونارڈ ہلٹن جونیئر سے شادی کی تھی۔ آج کل جو پیرس ہلٹن کے بہت چرچے ہیں وہ کونارڈ ہلٹن کی پڑپوتی ہیں اور اربوں کھربوں کی یہ جائیداد انہیں ورثے میں ملی ہے۔

الزبتھ ٹیلر کی شادی کے بعد ایک صحافی نے ان سے دریافت کیا کہ ان میں اور ان کے شوہر میں کیا چیزیں مشترک ہیں؟ جواب ملا۔ "بہت سی باتیں ہم دونوں میں مشترک ہیں مثلاً ہم دونوں کو ہیمبرگر پسند ہے۔ ہم دونوں اپنے سائز سے بڑے سوئیٹر پہننا پسند کرتے ہیں۔ ہم روزن انلی کی کلاسیکی موسیقی پسند کرتے ہیں۔"

"اور؟"

"اور بس۔ کیا ایک خوش گوار ازدواجی زندگی کے لیے یہ کافی نہیں ہیں؟"

الزبتھ ایک ایسی ایکٹریس تھی جو کہ اس زمانے میں بھی اپنی رنگین مزاجی اور دل پھینک فطرت کے حوالے سے مشہور تھی۔ الزبتھ کوئی اچھی اداکارہ نہیں تھی اگرچہ بعد میں اس نے اداکاری پر ایوارڈز بھی حاصل کیے مگر ابتدائی دور میں اس کی شہرت کی وجہ اس کا حسن اور بے باکی تھا۔ اس دور کے ہالی ووڈ کے ماحول میں بھی وہ اپنی غیر معمولی حرکتوں کی وجہ سے مشہور تھی۔

مسٹر ہلٹن سے اس کی شادی بہت دھوم دھام سے ہوئی تھی جس میں اس زمانے کے تقریباً معروف فن کاروں نے شرکت کی تھی۔

شادی کے بعد ہالی ووڈ کو خیرباد کہہ کر ان دونوں نے نواحی علاقے میں کرائے پر ایک شاندار گھر لیا تھا۔ اس نے اپنی ایک دوست سے کہا۔ "تمہیں کیا بتاؤں کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے کتنی محبت کرتے ہیں اور ہماری محبت کتنی سچی اور خلوص سے بھری ہوئی ہے۔"

الزبتھ ٹیلر نے کہا کہ وہ گھر کے تمام کام خود کرے گی۔ کپڑے دھونا، کھانا پکانا اور گھر کے سارے کام وہی کرے گی۔ اس زمانے میں وہ فلم "فادر آف دی برائیڈ" کی شوٹنگ میں مصروف تھی۔ وہ اپنے گھر کے کاموں سے بے تعلق تھی۔ سارا دن جینی سگریٹ پیتی رہتی تھی۔ جب ہلٹن نے اعتراض کیا تو ان کا جھگڑا ہو گیا۔

ہلٹن نے کہا۔ "تم نے جو وعدے کیے تھے وہ کیا ہوئے؟"

"وعدوں کا کیا ہے۔ انسان ہر روز بیار وعدے کرتا ہے اسے نبھانا ضروری تو نہیں ہے۔ تم نے بھی تو صرف میری خوب صورتی کی وجہ سے شادی کی تھی۔ تم اپنے گھر میں ایک گولڈ فش بنا کر رکھنا چاہتے تھے آرائش کے لیے۔"

اس طرح یہ نوجوان محبت کی شادی ایک ہی سال بعد یعنی 1951ء میں ختم ہوگئی۔ ٹیلر کو طلاق دے کر ہلٹن کو اسے بہت دولت بھی دینی پڑی۔ اس طرح یہ شادی جس میں مشترک چیز ہیمبرگر پسند کرنا تھی، ختم ہوگئی۔ اس کے بعد الزبتھ نے جتنی شادیاں کیں اور طلاقیں لیں ان کی وجہ سے مغربی قانون کے مطابق وہ ہر بار مالدار ترین ہوتی رہی۔

کوئی اور لڑکی ہوتی تو شاید اس تجربے کے بعد دوبارہ کافی عرصے تک نہ سوچتی۔ اگرچہ الزبتھ اپنی آزاد زندگی کے حوالے سے بھی مشہور تھی اور آئے دن اس کی رومانی داستانیں شائع ہوتی رہتی تھیں حالانکہ اس دور کے ہالی ووڈ میں یہ دستور نہ تھا۔ مگر وہ الزبتھ ٹیلر تھی۔ کھلے عام فن کاروں سے تعلقات قائم کرتی اور توڑ دیتی تھی۔

الزبتھ ٹیلر کا سب سے مشہور عشق اور شادی فلم "قلوپطرا" کے دوران میں ہوئی تھی۔ اس فلم کی شوٹنگ روم میں ہو رہی تھی۔ الزبتھ اپنے بارہ کتوں اور چار ملازمین کے ساتھ روم پہنچی تو اس کے لیے ایک علیحدہ شاندار گھر کرائے پر حاصل کیا گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اسی فلم میں اس کی ملاقات برطانوی اداکار رچرڈ برٹن سے ہوئی اور وہ دونوں ایک دوسرے کے عشق میں گرفتار ہو گئے۔ حالانکہ دونوں شادی شدہ تھے۔ برٹن کی بیوی اداکارہ بیتی تھی مگر دونوں پرسکون زندگی گزار رہے تھے۔ الزبتھ ٹیلر نے برٹن سے عشق اور شادی کرنے سے پہلے یہ بھی نہیں سوچا کہ کچھ عرصہ قبل ہی اس کی شادی مشہور اداکار اور گلوکار ایڈی فشر سے ہوئی ہے۔ اس شادی سے پہلے یہ اسکینڈل ساری دنیا میں مشہور ہو گیا مگر وہ دونوں محبت میں اندھے ہو چکے تھے۔ بدنامی یا نیک نامی کی تو دونوں کو پروا نہیں تھی لیکن ایک برطانوی اداکار ہونے کی وجہ سے رچرڈ برٹن سے اس کی توقع نہیں تھی۔

اس سے پہلے رچرڈ برٹن نے کسی ہالی ووڈ کی فلم میں کام نہیں کیا تھا لیکن وہ انگلستان میں ایک نامور اداکار تھا۔ فلموں کے علاوہ وہ اسٹیج پر بھی لازوال کردار ادا کر چکا تھا۔ الزبتھ اس کو دیکھتے ہی اس کی مردانہ وجاہت اور بے تکلفی سے متاثر ہوئی۔

ان دونوں کے عشق کی کہانیاں عام ہوئیں تو پہلے تو ایڈی فشر کو ان پر یقین ہی نہیں آیا۔ وہ دونوں ٹیلی فون پر ایک دوسرے سے بات چیت کرتے رہتے تھے اور الزبتھ ٹیلر اس کو بتاتی تھی کہ یہ محض افواہیں ہیں۔

قلوپطرا ایک مہنگی فلم تھی۔ پھر الزبتھ ٹیلر کے ناز نخروں اور بیماریوں کی وجہ سے اس کی لاگت میں اضافہ ہو گیا۔ نمائش کے بعد فلم کو متوقع کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ اس لیے کئی بینکوں اور سرمایہ کار کمپنیوں کا دیوالیہ نکل گیا۔ فلم قلوپطرا 1962ء میں ریلیز ہوئی تھی لیکن ہدایت کاروں اور اسکرپٹ لکھنے والوں کی بار بار تبدیلی اور دوسرے اداکاروں کے باہمی اختلافات کی وجہ سے اس کی تکمیل میں تاخیر ہوتی رہی۔

الزبتھ ٹیلر نے طلاق لینے کا اعلان کیا تو کسی کو حیرت نہ ہوئی۔ البتہ ایڈی فشر سے سارے ہالی ووڈ کو ہمدردی ہو گئی۔ کچھ عرصے بعد اس نے اداکارہ ڈیبی رینالڈز سے شادی کر لی جو بہت کامیاب ثابت ہوئی۔ انہیں امریکا کے سوئیٹ ہارٹ کا لقب دیا گیا۔ شادی کے بعد فشر نے گلوکاری میں بہت ترقی کی۔

مشہور فلمی کالم نویس ہیڈا ہوپر نے لکھا: ”میں جب بھی ان دونوں کو دیکھتی ہوں تو میرے کانوں میں شادیانے بجنے لگتے ہیں۔ الزبتھ کی وجہ سے جب ایڈی فشر کی طلاق ہوئی تو اخبارات نے ٹیلر کو آدم خور، شوہر چرانے والی اور کئی خراب ناموں سے یاد کیا لیکن الزبتھ ٹیلر ان چیزوں سے ماورا تھی۔ اس نے کسی کی پروا نہیں کی۔ اس شادی کو نہ صرف عوام نے برا سمجھا بلکہ ویٹی کن نے بھی اس کی مذمت کی۔

قلوپطرا ایک انتہائی بورنگ اور ناکام فلم تھی جس نے کئی سرمایہ کاروں کو ڈبو دیا مگر الزبتھ ٹیلر کو پروا نہیں تھی۔ دوسری شادی کے بعد برٹن کے ساتھ مسلسل ہنی مون مناتی رہی۔

ان دونوں کی شادی کی خبریں بڑے بڑے باوقار اخباروں میں بھی شائع ہوئیں جو کبھی فلمی خبریں شائع نہیں کرتے تھے۔ ان دونوں نے بعد میں جن فلموں میں کام کیا ان میں سے بیشتر فلاپ ہو گئیں۔ عشق کا یہ جادو زیادہ عرصے تک اثر نہ رہا۔ جسمانی کشش کے سوا ان دونوں میں کوئی بات بھی مشترک نہ تھی۔ برٹن عموماً شراب کے نشے میں رہتا تھا۔ وہ اسٹیج پر شیکسپیئر کے ڈراموں میں اداکاری کر کے شہرت حاصل کر چکا تھا۔ اس کا رجحان ادب کی طرف تھا جب کہ الزبتھ ان چیزوں سے محروم تھی۔ ذاتی زندگی میں وہ بہت بورنگ عورت تھی۔ اس سے گفتگو کرنے سے کچھ حاصل نہ ہوتا تھا سوائے بیزاری کے۔ وہ کسی بھی موضوع پر بات نہیں کر سکتی تھی کیوں کہ نہ تو اس کا مطالعہ تھا اور نہ وہ پڑھے لکھے لوگوں کی صحبت میں بیٹھنے کی عادی تھی۔ برٹن کو نمائشی طور پر ظاہر داری کا بہت شوق تھا۔ وہ بے دردی سے روپیا لٹاتا تھا۔ الزبتھ کو وہ نہایت قیمتی تحفے دیتا تھا جس کا ہر طرف چرچا ہو جاتا تھا۔ ٹیلر بھی خرچ کرنے کے معاملے میں کم نہ تھی۔ وہ کسی ارب پتی کی طرح فضول خرچی اور عیاشی پر دولت لٹاتی تھی۔ ان حالات کی وجہ سے ان دونوں کی زندگی ایک عذاب بن گئی تھی۔

ان حالات میں گزارہ ممکن نہ تھا۔ بالآخر 1974ء میں ان دونوں کی طلاق ہو گئی۔ لوگ حیران تھے کہ دو مختلف عادات و اطوار کے جوڑے نے اتنا عرصہ ایک ساتھ کیسے گزارا؟ اس کی ایک وجہ تو دونوں کی مصروفیت تھی دوسرے یہ کہ وہ عموماً اپنی مصروفیات کی وجہ سے ایک دوسرے سے دور رہتے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ 1974ء میں شادی کے تین سال بعد ان دونوں نے دوبارہ شادی کر لی مگر نتیجہ پھر طلاق۔ ان دونوں کے راستے ہمیشہ کے لیے الگ ہو گئے۔ اس کے بعد الزبتھ نے اور بھی شادیاں کیں اس کا فلم ساز شوہر جس نے اراؤنڈ دی ورلڈ ان 80 ڈیز

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

(Around the world in 80 days) بنا کر بہت شہرت اور دولت حاصل کی تھی۔ غبارے کے ایک حادثے میں ہلاک ہوگیا۔ الزبتھ ٹیلر نے چند روز سوگ منایا اور پھر معمول کی زندگی شروع کردی۔ اس کا کہنا تھا کہ اپنے مرحوم شوہر سے اس کو واقعی سچی محبت تھی مگر کچھ عرصہ گزرنے کے بعد اس نے پھر شادی کرلی۔ یہ امریکی کانگریس کا ایک رکن تھا مگر یہ شادی بھی زیادہ عرصے نہ چل سکی۔

شادیوں سے قطع نظر الزبتھ ٹیلر اور رچرڈ برٹن کی رومانی داستان ایک ناقابلِ فراموش داستان بن گئی۔ ہالی ووڈ نے محبت کا یہ رخ پہلے نہیں دیکھا تھا۔ اس لیے اس کو ہالی ووڈ کی پہلی رومانی داستان کہا جاسکتا ہے۔

☆......☆

ہالی ووڈ کی ایک اور رومانی داستان جس نے بہت شہرت حاصل کی۔ یہ ہالی ووڈ کے عظیم اداکار ہمفری بوگارٹ اور اداکارہ لورین بیکال کی داستانِ محبت ہے۔ ہمفری بوگارٹ کے دوستوں میں اس وقت زیادہ تر بڑے اداکار شامل تھے لیکن اس کی ذاتی زندگی بہت سادہ تھی۔ لورین بیکال اور وہ شادی کے بعد علیحدہ ہو چکے تھے لیکن ایک ساتھ ہی رہتے تھے۔ علیحدگی سے پہلے ان دونوں کے درمیان جو اختلافات تھے وہ انہوں نے آہستہ آہستہ دور کرلیے تھے۔ مثلاً بوگارٹ نے اپنی شراب نوشی کم کردی تھی۔ لورین بیکال بازار سے گھریلو اشیاء کی خریداری کرلی تھی اور بوگارٹ کی پسندیدہ چیزیں خرید کر لائی تھی۔

بوگارٹ اور لورین بیکال اپنی محبت کو چھپانے بھی نہیں تھے۔ ان دونوں کی علیحدگی کی کوئی خاص وجہ بھی نہیں تھی۔ آپ یہ دونوں کی ذہنی پختگی کا زمانہ کہہ سکتے ہیں۔ جیسے جیسے ان کے ذہن پختہ ہوتے گئے ان دونوں میں ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔ شادی کے بعد وہ چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑتے رہتے تھے مگر یہ ان کا بچپنا تھا حالانکہ دونوں ہالی ووڈ کے ٹاپ اسٹارز تھے۔ ان کا رہن سہن ہالی ووڈ کے فن کاروں سے مختلف اور سادہ تھا۔ اس دور میں ان دونوں رومانوں کو بہت شہرت حاصل ہوئی تھی۔ اس زمانے میں اداکار رابرٹ ٹیلر اور جوئی ووڈ کے رومان کی کہانیاں بھی مشہور ہوئیں مگر یہ

ممتاز شانتی

سلسلہ جلد ہی ختم ہوگیا۔

موجودہ دور میں انجلینا جولی اور بریڈ پٹ کی داستانِ محبت سب سے زیادہ مشہور ہوئی۔ انجلینا جولی تین شادیاں کرچکی تھی اور پھر بھی اکیلی تھی۔ بریڈ پٹ کی شادی ایک اداکارہ کے ساتھ ہوئی تھی اور پانچ برس ہنسی خوشی گزر گئے تھے لیکن اس کی کہانی کا آغاز اور انجام بھی الزبتھ ٹیلر ہی کی طرح کا ہوا۔ انجلینا جولی کو ہالی ووڈ میں "گھر توڑنے" والی کہا جاتا ہے۔ وہ بسنے بسے گھروں میں نقب لگا کر شوہر پر قبضہ کرلیتی تھی۔

ان دونوں کی محبت کا آغاز بھی ایک فلم میں ایک ساتھ کام کرنے سے ہوا تھا۔ فلم کی شوٹنگ کے دوران ہی میں بریڈ پٹ، انجلینا جولی کی محبت میں گرفتار ہوگیا۔ انجلینا کو دنیا کی حسین ترین عورت کہا جاتا ہے مگر خدا جانے یہ حسن کا کون سا معیار ہے۔ وہ دبلی پتلی جس میں کوئی تازگی نہیں ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے وہ اپنی جوانی کے بہترین دن گزار چکی ہے پھر بھی اس میں بہت کشش ہے۔ بریڈ پٹ نے بیوی کو طلاق دے دی اور انجلینا جولی پانچ سال سے زیادہ عرصے تک ساتھ ہے۔ ان کی ایک بچی بھی ہے لیکن انجلینا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جولی کو ایشیائی ملکوں کے بچے گود لینے کا شوق ہے اور باقاعدہ قانونی کارروائی کے بعد ان رنگ برنگے بچوں کو گود لے کر حقیقی ماں کی طرح پالتی ہے۔ بے چارہ بریڈ پٹ بھی اس کے ساتھ ان بچوں کو گود میں اٹھائے پھرتا ہے۔

ان دونوں کے اختلافات کی خبریں بھی سامنے آتی رہیں۔ انجلینا کو شک تھا کہ بریڈ پٹ آج بھی اپنی پہلی بیوی سے ملتا ہے اور اس کو بھولا نہیں ہے اور حقیقت دیکھی جائے تو اس کی بیوی آج بھی جوان اور تر و تازہ لگتی ہے۔ اس میں جسمانی کشش بھی ہے۔ وہ خوش مزاج بھی ہے۔ اس نے چند رومان تو کیے مگر دوسری شادی نہیں کی جس کی وجہ انجلینا جولی کے شکوک و شبہات میں مزید اضافہ ہوا۔ حالانکہ وہ بریڈ پٹ کو بھلا چکی ہے اور 41 سال کی عمر میں بھی ایک نوجوان لڑکی نظر آتی ہے۔

بریڈ پٹ اور انجلینا تقریباً ہم عمر ہیں لیکن دیکھنے میں بریڈ پٹ نو عمر اور چھبیلا نظر آتا ہے مگر عشق پر کسی کا زور نہیں ہے۔

پچھلے دنوں (2014) میں بریڈ پٹ اور انجلینا نے باقاعدہ شادی کرلی۔ ہالی ووڈ کے موجودہ ماحول کے مطابق وہ شادی کے بغیر پانچ سال سے زائد ایک دوسرے کے ساتھ میاں بیوی کے طور پر رہے اور آخرکار شادی کرلی۔

اگرچہ اب ہالی ووڈ میں ہر روز رشتے بدلنے کا رواج ہے اس لیے کسی رومانی داستان نے بھی جنم نہیں لیا۔ ہر روز ایک نیا جوڑا مل جائے تو کہاں کا عشق اور کہاں کی دنیا داری۔ اب ہر ہفتے نئے تعلقات قائم ہوتے اور ٹوٹتے رہتے ہیں۔

☆.....☆

ہالی ووڈ کی اداکارہ زینت امان تو آپ کو یاد ہوگی یا بھول گئے؟ زینت امان کو 1970ء میں فلم ساز و اداکار دیو آنند نے اپنی فلم ''ہرے راما ہرے کرشنا'' میں متعارف کرایا تھا۔ فلم کا موضوع نشہ تھا کیوں کہ اس زمانے میں دنیا بھر میں ہپی گھومتے پھرتے تھے۔ کبھی جوڑوں کی صورت میں تو کبھی گروہوں کی صورت میں۔ ان میں اکثر بڑے گھرانے کے لڑکے اور لڑکیاں ہوا کرتی تھیں جو اپنے ماحول کی یکسانیت سے اکتا کر خود اپنی ہی بنائی ہوئی دنیا میں رہتے تھے۔ یہ لوگ دنیا کے ہر شہر میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان کی نہ کوئی ذریعہ آمدنی تھی اور نہ ہی مستقل ٹھکانا۔ زیادہ سے زیادہ سر چھپانے کے لیے بعض پیڑوں کے پاس چھوٹے چھوٹے خیمے ہوتے تھے اور جہاں رات ہوئی وہیں بسیرا کرلیا۔ ان میں بہت بڑی اکثریت چھوٹے موٹے کام کر کے یا مانگ تانگ کر گزارہ کرلیا کرتے تھے۔ مغربی ملکوں میں ان کے لیے شہروں سے باہر کوئی کھلی جگہ مقرر کردی جاتی تھی۔

ان میں زیادہ تر یورپ اور امریکا کے نوجوان تھے جو اپنے ماحول اور رکھ رکھاؤ طرز زندگی سے تنگ آکر ایک نئی دنیا کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے تھے۔ یورپ و ایشیا سے لے کر نیپال تک یہ ٹکڑیوں میں پھیلے ہوئے تھے۔ ان میں اکثر لڑکے اور لڑکیاں خوب صورت تھے لیکن گندگی اور غلاظت میں رہنے کی وجہ سے ان کے حلیے بگڑ چکے تھے۔ مردوں کے لمبے لمبے جھاڑ جھنکار بال، عجیب و غریب پھٹے پرانے لباس، یہ لوگ کئی کئی ہفتے نہاتے تھے نہ منہ ہاتھ دھوتے تھے۔ اگر پاس سے گزر جائیں تو ان کے جسموں کی بدبو پریشان کردیتی تھی۔

ہم جب فلم ''میرے ہم سفر'' کی شوٹنگ کے لیے یورپ گئے تو وہاں چند یورپین لڑکیوں کی ضرورت پڑی جنہیں ماحول پیدا کرنے کے لیے دکھانا تھا۔ اس سلسلے میں چند خوش شکل لڑکیوں کو منتخب کیا گیا لیکن شرط یہ تھی کہ وہ نہا دھو کر مناسب لباس پہن کر آئیں گی۔ لباس انہیں خرید کر دے دیے گئے جو شوٹنگ کے بعد ان ہی کی ملکیت ہو جاتے۔ مزید انہیں پانچ پاؤنڈ معاوضہ دینے کا بھی وعدہ کیا گیا۔ اس طرح ہم انہیں قریب سے دیکھنے اور ان کے بارے میں جاننے کے قابل ہوگئے۔

دیو آنند کی فلم ''ہرے کرشنا ہرے رام'' کی زیادہ تر شوٹنگ ہندوستان ہی میں سیٹ لگا کر کی گئی تھی۔ زینت امان نے بھی اس فلم میں ایک ہپی لڑکی کا کردار کیا تھا۔ اس فلم کا موضوع بھارتی فلموں کے لیے نیا تھا اور دیو آنند کی اداکاری اور ہدایت کاری بھی بہت اچھی تھی۔ یہ فلم سنیماؤں میں نمائش پذیر ہوتے ہی سپر ہٹ ہوگئی اور اس کے ساتھ ہی اپنی بے باک اداکاری اور نیم عریاں لباس کی وجہ سے زینت امان بھی سپر اسٹار ہوگئیں۔

زینت امان نے جس فیاضی سے اپنے جسم کی نمائش کی تھی اس کے بعد انہیں سیکس کی دیوی کا لقب دیا گیا اور وہ اس لقب سے مشہور ہوگئیں۔ زینت کی اس بے باکی اور آزاد خیالی کا سبب یہ تھا کہ اس نے زندگی کا خاصا بڑا حصہ یورپ میں گزارا تھا۔ اس کے والد امان

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک ہندوستانی تھے جنہوں نے ایک برطانوی خاتون سے شادی کی تھی۔ اس امتزاج کی وجہ سے ان پر مغرب کا رنگ بھی چڑھ گیا تھا۔ ان کی بے باک اداکاری اور آزاد پسندی کا یہی سبب تھا کہ وہ ایسے کردار بھی قبول کر لیا کرتی تھیں جن میں جسم کی نمائش کو نمایاں اہمیت دی جاتی تھی۔ راج کپور کی فلم

"ستیم شیوم سندرم" میں کئی مناظر میں وہ اس طرح پیش کی گئی ہیں کہ بالکل عریاں نظر آتی ہیں۔

زینت امان کی عمر اس وقت 56 سال کے لگ بھگ ہے لیکن صحت اچھی ہے اور وہ کافی پھرتیلی اور چاق و چوبند ہیں۔ انہوں نے کافی عرصہ پہلے فلمی دنیا کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ ان کے اسکینڈلز بہت زیادہ بننے لگے تھے پھر انہوں نے شادی کر لی جو خوشگوار ثابت نہ ہوئی۔ پھر ماں بننے کی وجہ سے وہ فلموں اور فلم بینوں کی نگاہوں سے دور رہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ زینت امان نے خود کو ہندوستانی ماحول میں ڈھالنے کی کوشش ہی نہیں کی اس لیے وہ ہندوستانیوں کے لیے بھی اجنبی رہیں اور فلمی دنیا میں بھی گھل مل نہ سکیں پھر بھی جن لوگوں نے ان کی یہ فلمیں دیکھی ہیں "ستیم شیوم سندرم، دم مارو دم، ہرے کرشنا ہرے رام۔" وہ زینت امان کے متناسب جسم اور ان کے ہیجان انگیز کرداروں کو نہیں بھلا سکتے۔ شوہر سے علیحدگی کے بعد انہوں نے اپنے دونوں بچوں کو ماں اور باپ بن کر پالا ہے۔

زینت امان سے ممبئی کے ایک صحافی کی ملاقات کے بعد جو سوالات معلوم ہوئے وہ پیش کیے جا رہے ہیں:۔

سوال: ہر نئی آنے والی اداکارہ آپ کی نقل کرتی ہے اور آپ سے ان کا موازنہ کیا جاتا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے؟

زینت امان: یہ دیکھ کر مجھے بہت ناز ہوتا ہے۔ مجھے بہت خوشی اور فخر ہوتا ہے کہ نئی اداکارائیں میری پیروی کر رہی ہیں۔

سوال: آپ اسکرین پر بہت کم نظر آتی ہیں۔ اس کا سبب؟

زینت امان: سچ تو یہ ہے کہ مجھے ایسے کردار آفر ہی نہیں کیے گئے جن میں اداکاری کی گنجائش ہو اگر کیریکٹر اچھا نہ ہو تو کام کرنے کا کیا مزہ۔ اس کے علاوہ پچھلے دس سال میں میں نے اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی خاطر فلموں میں کام کرنا پسند نہیں کیا کیوں کہ ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی اور نہ تھا۔ میں نے بچوں کی خاطر فلمی زندگی ترک کر دی کیونکہ ایک سنگل مدر کی طرح مجھے ان کی پرورش کرنی تھی۔ اب جب کہ بچے سمجھدار ہو گئے ہیں اور میں فلموں میں کام کرنے کو تیار ہوں تو کوئی فلم ساز میرے دروازے پر دستک نہیں دیتا۔

سوال: آپ پر اپنے وقت کے بہترین گانے فلمائے گئے مثلاً

1۔ ہائے ہائے مجبوری

2۔ میرے گورے گالوں کو چرا لیا ہے تم نے۔ اس کے علاوہ بھی کئی سپر اسٹارز کے ساتھ آپ نے کام کیا جسے بھلا نہیں سکتے۔

زینت امان: واقعی میں اس لحاظ سے خوش نصیب ہوں کہ بہت اچھے گانے مجھ پر فلمائے گئے اور مجھے بڑے بڑے اداکاروں کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

سوال: آپ آج کی فلمیں دیکھتی ہیں؟

زینت امان: بہت کم۔ مجھے فلمیں سوتو ریاد دیکھنے کا شوق ہے۔ میں نے فلم "اوم شانتی اوم" دیکھی تو مجھے بہت

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اچھی لگی۔

سوال: آپ کو مشکل حالات سے بھی سابقہ پڑا ہو گا۔ خصوصاً اداکاری چھوڑنے اور شوہر سے علیحدگی کے بعد۔

زینت امان: واقعی میں نے بہت مشکل وقت گزارا ہے لیکن ان مشکلوں نے مجھے مزید مضبوط اور میرے ارادوں میں پختگی پیدا کر دی۔ اتنی زیادہ شہرت مقبولیت اور دولت دیکھنے کے بعد یہ مشکل زندگی میں نے بڑے حوصلے سے گزاری۔ یہ اس طرح ہے کہ کوئی سمندر کی لہروں میں پھنس جائے، کبھی لہریں اٹھا کر اونچا لے جائیں اور کبھی پستی میں دھکیل دیں۔ اس سے مقابلہ کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ آپ جدوجہد کریں اور ڈوبنے سے بچ جائیں۔

سوال: آج کل کی اداکارائیں آتے ہی شہرت اور مقبولیت حاصل کر لیتی ہیں۔ مطلب یہ کہ آج کل اسٹار بننا مشکل نہیں ہے۔

زینت امان: میرے خیال میں یہ سوچ غلط ہے۔ ہر نئی آنے والی لڑکی نے مقبولیت اور کامیابی حاصل نہیں کر لی۔ ہاں چند لڑکیوں کو زیادہ جدوجہد نہیں کرنی پڑی لیکن زیادہ تر کو اسٹار بننے کے لیے بہت جدوجہد کرنی پڑتی ہے۔ یہ سب قسمت کے کھیل ہیں۔

سوال: آپ نے اپنے زمانہ عروج میں ہی شادی کر لی اور فلمی زندگی ترک کر دی۔

زینت امان: میں دوسری اداکاراؤں کے بارے میں تو کچھ نہیں کہہ سکتی لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے مجھے ماں بننے کی خواہش تھی۔ میں اپنے والدین کی اکیلی اولاد تھی اس لیے بھی مجھے بچوں سے بہت پیار تھا۔ میں اپنے گھر میں بھی چھوٹے چھوٹے معصوم بچوں کو کھیلتا اور شرارتیں کرتا دیکھنا چاہتی تھی۔ فلموں میں پندرہ سال گزارنے کے بعد میں اپنا گھر بسانا چاہتی تھی اور بچے شادی کے بغیر میں حاصل نہیں کر سکتی تھی۔ میں بغیر شادی کے ماں بننا نہیں چاہتی تھی کہ لوگ کہیں کہ دیکھو وہ جا رہا ہے بچہ جس کا باپ کوئی نہیں ہے۔ میں اپنے بچوں کے نام کے ساتھ ناجائز بچے کا الزام نہیں لگانا چاہتی تھی۔ ایک اکتوبر کو شادی ہوئی اور اگلے اکتوبر کو میں ماں بن گئی۔

سوال: آپ کے بچے آج کل کیا کر رہے ہیں؟

زینت امان: میرا بڑا بیٹا ازان انگلینڈ میں فلم ڈائریکشن کا کورس کر رہا ہے۔ اس کی عمر 21 سال ہے۔ میرا چھوٹا بیٹا زہان سترہ سال کا ہے۔ وہ ابھی نوعمر ہے اس لیے اس کے ارادے بدلتے رہتے ہیں۔ اب دیکھنا ہوگا کہ وہ بننا کیا چاہتے ہیں۔

سوال: آپ اپنا دن کیسے گزارتی ہیں؟

زینت امان: روزمرہ کے کاموں میں دن گزرنے کا احساس ہی نہیں رہتا۔ کچھ وقت جِموں کے ساتھ گزرتا ہے۔ میرے بیوروں کے کاروبار میں کام کی دیکھ بھال اور اسٹاف کو ہدایات دینا پھر جم جانا۔ سارا دن پلک جھپکتے گزر جاتا ہے۔

سوال: کیا آپ نے ان مردوں کو معاف کر دیا جنہوں نے آپ سے بے وفائی کی اور آپ کو دکھ دیے؟

زینت امان: ہاں، میں نے انہیں معاف کر دیا ہے۔ اب کبھی تو ان کے بارے میں سوچتی بھی نہیں ہوں۔ میرے اندر نفرت یا انتقام کا جذبہ بھی نہیں ہے شاید وہ ماضی تھا جو گزر چکا اب میں اپنے حال پر زیادہ توجہ دیتی ہوں۔ گزرے ہوئے زمانے کو یاد کرنے کا فائدہ بھی کیا ہے؟

اور واقعی زینت امان بہت پرسکون اور مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ وقت نے انہیں بہت کچھ سکھایا ہے۔ گزرے ہوئے وقت کو بھلا دینا ہی بہتر ہے۔

☆......☆

"اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر تم، تمہارے بنا ہم بھلا کیا جئیں گے"

ایک زمانے میں اس فلمی نغمے نے پاکستان ہی میں نہیں ہندوستان بلکہ بیرون ملک مقیم پاکستانیوں کو اپنے سحر میں جکڑ لیا تھا۔ یہ گانا وحید مراد کی بنائی ہوئی دوسری فلم "ارمان" کا تھا اور اس فلم کے موسیقار سہیل رعنا تھے۔ وحید مراد کی پہلی ذاتی فلم "انسان بدلتا ہے" زیادہ کامیاب نہ ہو سکی تھی جس کے ہدایت کار شور رشید اور موسیقار ظفر خورشید تھے۔

اس زمانے میں وحید مراد پہلے فلم ساز تھے جنہوں نے اپنی فلموں کی تکمیل کے لیے لاہور کا رخ نہیں کیا۔ یہ ایک خالص کراچی والوں کا فلم یونٹ تھا۔

وحید مراد نے یوں تو اپنی فلمی زندگی کا آغاز فلم "ساتھی" اور "اولاد" میں مختصر کرداروں سے کیا تھا جو پسند بھی کیے گئے تھے لیکن ان کی فلمی دنیا میں دھماکا خیز آمد فلم ساز کی حیثیت سے ہوئی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پہلی فلم کی ناکامی کے بعد بھی انہوں نے دوسری فلم "جب سے دیکھا ہے تمہیں" کا آغاز کر دیا۔ اس فلم میں بھی انہوں نے لاہور کی فلمی صنعت سے مدد لینے کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ "جب سے دیکھا ہے تمہیں" کاروباری لحاظ سے ایک درمیانہ درجے کی فلم تھی۔ وحید مراد کی تیسری فلم "ہیرا اور پتھر" تھی۔ اس فلم کا یونٹ وحید مراد کے ذاتی دوستوں پر مشتمل تھا۔ سہیل رعنا، وحید مراد اور پرویز ملک ایک ساتھ پڑھے تھے۔ جب کہ بعد میں پرویز ملک فلمی تکنیک کی تربیت حاصل کرنے کے لیے امریکا چلے گئے۔ مسرور انور کے گیت ان دنوں ریڈیو کے ذریعے بہت مقبولیت حاصل کر چکے تھے۔ مسرور بھی ان "چار یاروں" میں شامل تھے وہ نغمہ نگار اور اسکرپٹ رائٹر بھی تھے۔ اس طرح ان چار دوستوں کی مشترکہ کاوش سے بنائی ہوئی فلم "ہیرا اور پتھر" انتہائی کامیاب ہوئی۔ اس فلم میں وحید مراد کے ساتھ زیبا نے ہیروئن کا کردار ادا کیا تھا۔ دراصل صحیح معنوں میں زیبا کو شہرت اسی فلم سے حاصل ہوئی تھی۔

"ہیرا اور پتھر" کی کہانی عام فلموں سے مختلف تھی۔ سہیل رعنا کی موسیقی، مسرور انور کے گیت اور پرویز ملک کی ہدایت کارانہ صلاحیتوں نے اس فلم کو ایک سنگ میل بنا دیا۔ فلم کی بے انتہا مقبولیت کی وجہ سے اس نے سلور جوبلی، گولڈن جوبلی منائی۔ یہ اعزاز کراچی میں کسی پہلی پاکستانی فلم کو حاصل ہوا تھا۔ اس کی بے پناہ کامیابی نے کراچی والوں کو اپنا گرویدہ کر لیا اور وہاں کی فلمی صنعت میں پہلی بار یہ اعتماد پیدا ہوا کہ ہم خود کفیل ہیں اور لاہور کی مضبوط فلمی صنعت کے محتاج نہیں ہیں۔

اب ان نوجوانوں کے حوصلے بڑھ چکے تھے۔ چاروں دوست سر جوڑ کر بیٹھے اور انہوں نے "ارمان" کا اسکرپٹ تیار کیا۔ اس فلم کے مرکزی کردار بھی وحید مراد اور زیبا تھے۔ ساری کاسٹ کراچی کے فنکاروں پر مشتمل تھی۔

"ارمان" کے گانے لاہور میں ریکارڈ ہوئے تھے کیوں کہ اس وقت کراچی میں کوئی معیاری ساؤنڈ اسٹوڈیو نہ تھا جب یہ گانا صدا بند ہوا تو لاہور کے ایور نیو اسٹوڈیو میں ہر ایک کی زبان پر یہی نغمہ تھا۔

اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر تم۔ تمہارے بنا ہم بھلا کیا جئیں گے

اس فلم کے گانے لاہور کے اسٹوڈیو والوں کو بہت پسند آئے مگر کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ فلم سارے پاکستان کو دیوانا کر دے گی۔ سہیل رعنا نے مسرور انور کے نغمات کی دل پذیر دھنیں بنائی تھیں۔ کہانی نے بھی فلم بینوں کے دلوں پر گہرا اثر کیا۔ پرویز ملک کی ہدایت کارانہ مہارت نے "ارمان" کو ایک یادگار فلم بنا دیا۔ فلم کے دوسرے اداکاروں میں نرالا، ابراہیم نفیس، صابرہ سلطانہ اور ترنم بھی شامل تھیں۔ یہ فلم بہت خوب صورت تھی لیکن اس کی روح سہیل رعنا کی موسیقی تھی۔

سہیل رعنا کا نام پاکستان کے ممتاز موسیقاروں میں شامل ہو گیا۔ چند اور فلموں میں کام کرنے کے بعد انہوں نے موسیقار کی حیثیت سے ریڈیو میں ملازمت کر لی۔ انہوں نے اس زمانے میں اس لیے ریڈیو کا انتخاب کیا تھا کیوں کہ وہ لاہور میں مستقل رہائش اختیار کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ریڈیو میں انہوں نے بچوں کو موسیقی سکھانے کا پروگرام شروع کیا تھا جو بعد میں ٹی وی میں بھی باقاعدگی سے پیش کیا جاتا رہا۔ لاہور سے یہ پروگرام خلیل احمد اور مصلح الدین نے بھی پیش کیا۔ اس پروگرام نے پاکستان کو مستقبل کے بڑے بڑے گلوکار اور گلوکارائیں فراہم کیں۔ فلم ساز اقبال شہزاد کی فلم "بازی" میں پہلی مرتبہ حبیب ولی محمد کے دو گانے پیش کیے جنہوں نے سب کو چونکا دیا۔ "بازی" پاکستان کی پہلی فلم تھی جس میں دو سپر اسٹار محمد علی اور ندیم نے ایک ساتھ کام کیا تھا۔ نشو کو اس فلم میں پہلی بار ہیروئن منتخب کیا گیا تھا۔ اقبال شہزاد اور ان کی بیگم نے نشو کو باوقار انداز میں چلنے، اٹھنے بیٹھنے اور بات کرنے کا سلیقہ سکھایا۔ تقریباً دو ماہ تک ان کی تربیت جاری رہی۔ سہیل رعنا نے فلم "قسم اس وقت کی" میں جوش ملیح آبادی کا ایک نغمہ بھی شامل کیا تھا۔ ریڈیو کے بچوں کے پروگرام میں انہوں نے پہلی بار مسرور انور کا یہ قومی نغمہ پیش کیا تھا۔

سوہنی دھرتی اللہ رکھے۔ قدم قدم آباد تجھے

آج کوئی جانتا بھی نہیں کہ یہ خوب صورت پُراثر نغمہ مسرور انور نے لکھا تھا اور سہیل رعنا نے اس کی دھن بنائی تھی۔

سہیل رعنا کم اور منتخب کام کرنے کے عادی تھے۔ ان کی چند فلموں کے نام پیش کیے جا رہے ہیں۔

فلم جب سے دیکھا ہے تمہیں۔ ہدایت کار منور رشید۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

فلم بیس دن۔ ہدایت کار اعجاز میر۔
فلم ہیرا اور پتھر۔ ہدایت کار پرویز ملک۔
فلم احسان۔ ہدایت کار پرویز ملک۔
فلم دوراہا۔ ہدایت کار پرویز ملک۔
فلم شہنائی۔ ہدایت کار ایس اے حافظ۔
فلم دل دے کے دیکھو۔ ہدایت کار ایس اے حافظ۔
فلم قسم اس وقت کی۔ ہدایت کار اے جے کاردار۔
فلم بازی۔ ہدایت کار اقبال شہزاد۔
فلم پھر چاند نکلے گا۔ ہدایت کار رفیق رضوی۔
فلم سوغات۔ ہدایت کار پرویز ملک۔
فلم میرے ہمسفر۔ ہدایت کار پرویز ملک۔
فلم شہر اور سائے۔ ہدایت کار رضا سرحدی۔
فلم مسافر۔ ہدایت کار جاوید جبار۔
فلم روشانہ کرو۔ ہدایت کار منور رشید۔
فلم بادل اور بجلی۔ ہدایت کار محسن شیرازی۔
فلم حساب۔ ہدایت کار جاوید فاضل۔

ان کے چند مشہور گانوں کی فہرست بھی ملاحظہ کیجیے۔

1۔ مجھے اک لڑکی سے پیار ہو گیا۔ فلم ہیرا اور پتھر۔

2۔ جب پیار میں دو دل ملتے ہیں۔ فلم ارمان گلوکار احمد رشدی، مالا۔

3۔ اکیلے نہ جانا ہمیں چھوڑ کر (اس گانے کو علیحدہ علیحدہ رشدی اور مالا نے گایا تھا)۔

4۔ میرے خیالوں پہ چھائی ہے اک صورت متوالی سی۔ گلوکار احمد رشدی۔

5۔ میری قسمت کیا، کیا ہے میری خطا۔ فلم ارمان، گلوکار مالا۔

6۔ او وقت ہر جینا میرا اپنا۔ فلم ارمان، گلوکارہ آئرین پروین۔

7۔ زندگی اب تک تھی اپنی اڑتے بادل کی طرح۔ فلم ارمان گلوکار احمد رشدی۔

سہیل رعنا سے ہماری اکثر ملاقات رہی بلکہ ملاقاتیں رہیں۔ وہ ایک خوش اخلاق، مہذب اور تعلیم یافتہ خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ ان کا گھرانا علم و ادب کا شیدائی تھا۔ ان کے والد رعنا اکبر آبادی ایک مشہور شاعر تھے۔ سہیل رعنا شہر آگرہ میں پیدا ہوئے۔ شاید ان کے مزاج کے حسن میں تاج محل کا عکس بھی پڑا ہو گا جس نے انہیں فنون لطیفہ کی طرف مائل کیا ہوگا۔

ہجرت کے بعد یہ خاندان کراچی میں رہائش پذیر ہو گیا۔ اس وقت سہیل رعنا کی عمر نو سال تھی۔ کراچی ہی میں انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ انہیں موسیقی کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ انہوں نے اس فن میں ماہرین فن سے خوب فائدہ اٹھایا۔ راگ راگنیوں اور کلاسیکی موسیقی کے رموز سیکھے۔ وہ ایک گراموفون کمپنی سے وابستہ ہو گئے۔ اسکول کے زمانے میں ان کی وحید مراد سے دوستی ہو گئی۔ جب وحید مراد تعلیم مکمل کرنے کے بعد فلم سازی کی طرف آئے تو انہوں نے انہیں اپنی دوسری فلم "جب سے دیکھا ہے تمہیں" میں موسیقی مرتب کرنے کا موقع دیا جو کامیاب رہی۔ اس دوران میں وحید مراد کے ایک اور ساتھی پرویز ملک امریکا سے فلم تکنیک کی تربیت اور کیمرا لے کر آئے۔ تینوں اکٹھے ہوئے تو انہوں نے فلم "ہیرا اور پتھر" بنائی جو انتہائی کامیاب فلم تھی۔ اس نے گولڈن جوبلی منائی۔ اس کامیابی نے ان دوستوں کی بہت حوصلہ افزائی کی۔ ان کی ہمتیں بلند ہو گئیں۔ انہوں نے اس کے بعد فلم "ارمان" بنائی جو پاکستان کی پہلی پلاٹینم جوبلی فلم ثابت ہوئی۔ ارمان ہر اعتبار سے ایک معیاری فلم تھی لیکن سہیل رعنا کی موسیقی نے اس کی دلکشی میں مزید اضافہ کر دیا تھا۔ وحید مراد اور زیبا بھی سپر اسٹار بن گئے۔

کراچی میں فلم سازی کا زوال ہوا اور کراچی کے فن کاروں نے لاہور کا رخ کیا تو سہیل رعنا دل برداشتہ ہو کر موسیقار کے فرائض سے سبکدوش ہو گئے اور پی آئی اے میں نوجوان گلوکاروں کی تربیت کا کام شروع کر دی۔ ان کی زیر تربیت کئی نوجوان گلوکاروں اور گلوکاراؤں نے بہت نام پیدا کیا۔ اس کے بعد وہ کینیڈا چلے گئے مگر موسیقی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا۔ وہاں بھی انہوں نے ایک میوزک اکیڈمی قائم کی۔ ایک نیا تجربہ انہوں نے یہ کیا کہ پاکستانی گانوں کو انگریزی سازوں سے سجا کر پیش کیا جنہیں مشرق اور مغرب دونوں جگہ مقبولیت حاصل ہوئی۔

سہیل رعنا ایک خوش شکل اور خوش لباس موسیقار تھے۔ دیکھنے میں وہ ہمیشہ ویسے کے ویسے ہی نظر آتے رہے۔ ان سے ہماری آخری ملاقات اسلام آباد کے ایک خوب صورت بنگلے میں ہوئی جس کی کھڑکیوں سے مرگلہ کی حسین پہاڑیاں نظر آتی تھیں۔ ہم اس وقت ٹی وی کی صنعت سے وابستہ تھے۔ وہ ہر تک پاکستانی اور غیر ملکی فلموں کے بارے میں گپ شپ ہوتی رہی۔ وہ دیکھنے میں بالکل ویسے ہی تھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سائرہ بانو، دلیپ کمار اور بیگم سعدیہ

جیسا کہ ہم نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔

اس آخری ملاقات میں انہوں نے ہمیں خاص انگلش چائے اور درآمد شدہ بسکٹ کھلائے۔ اس وقت ہم دونوں میں سے کسی کو یہ احساس نہ تھا کہ اب ہم پھر نہ مل سکیں گے۔ وہ زیادہ دبائو نہیں تھے لیکن بہت دلچسپ اور معلوماتی گفتگو کرتے تھے۔ خوش اخلاقی کے اعتبار سے وہ پرانے زمانے کے وضعدار انسان نظر آتے ہیں۔ آخر تاج محل کے شہر میں پیدا ہوئے اور ایک شاعر کا بیٹا ہونے کا بھی تو اثر ہوا ہوگا۔ وہ پرانا زمانہ وہ محفلیں وہ لوگ اب آنکھ کو ترس کر رہ گئے ہیں۔

☆......☆

دلیپ کمار کی انگریزی میں لکھی ہوئی خودنوشت بازار میں آتے ہی فلمی دنیا اور فلم بینوں میں ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ دلیپ کمار کے بارے میں کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جو اس کے قریب ترین صحافیوں اور دانش وروں نے لکھی ہیں۔ اس کے باوجود ہر ایک نے اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے جن کے بارے میں دلیپ کمار نے سادگی اور دیانت داری سے حقائق بیان کر کے بہت سی غلط فہمیاں دور کر دی ہیں۔

کتاب کے آغاز میں انہوں نے پشاور میں اپنی ابتدائی زندگی اور پھر ان کے والد کے کاروبار بمبئی منتقل کرنے کے بارے میں لکھا ہے۔ کس طرح دیویکا رانی کی نگاہوں نے ان کا انتخاب کیا اور بمبئی ٹاکیز میں انہوں نے پہلی فلم "جوار بھاٹا" میں کام کیا جس کے بعد "ملن" ریلیز ہوئی جس نے اداکار کے طور پر انہیں نقادوں اور فلم بینوں میں مقبول کرایا لیکن جس فلم نے انہیں سپر اسٹار بنایا وہ سید شوکت حسین رضوی کی فلم تھی۔

دلیپ کمار کی زندگی اور اداکاری کے بارے میں سب ہی جانتے ہیں اور انہیں ہندوستان کا عظیم ترین اداکار تسلیم کرتے ہیں۔ نئے آنے والے فن کاروں نے بھی آغاز میں دلیپ کمار کی اداکاری کی نقل کرنے کی کوشش کی لیکن کامیاب نہ ہو سکے۔ یہ تمام چیزیں بار بار کتابوں اور مضامین کے ذریعے سب کے علم میں ہیں۔

اس کتاب میں دلیپ کمار نے یہ اعتراف کیا ہے کہ وہ اور کامنی کوشل ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے لیکن جب کامنی کوشل کے بھائی نے یہ دھمکی دی کہ اگر یہ سلسلہ ختم نہ ہوا تو وہ خودکشی کرلے گا تو کامنی کوشل نے محبت کا یہ رشتہ ختم کرلیا۔ ان دونوں کی فلمیں بہت کامیاب ہوئی تھیں اور فلم بین اس جوڑی کو اسکرین پر دیکھنے کے خواہش مند رہا کرتے تھے اس کے بعد دلیپ کمار تو کامیابی کی سیڑھیاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

چرچے رہے حالانکہ ان کا دل ٹوٹ چکا تھا لیکن کامنی کوشل کی فلمیں زیادہ کامیاب نہ ہوئیں اور انہوں نے اداکاری کو خیرباد کہہ دیا۔ ٹریجڈی کردار دلیپ کمار نے پہلے بھی کئی فلموں میں ادا کیے تھے لیکن کامنی کوشل کی جدائی نے ان کی اداکاری میں غم واندوہ اور دکھوں کا اضافہ کردیا۔ یہ دلیپ کمار کی پہلی محبت تھی۔

ان کی زندگی میں جو دوسری عورت محبت کا پیغام لے کر آئی وہ مدھو بالا تھی۔ مدھو بالا کے ساتھ دلیپ کمار نے امر، ترانہ اور مغل اعظم میں کام کیا تھا۔ ان کے جذبات میں ڈوبے ہوئے رومانی مناظر کے حوالے سے یادگار بن چکے ہیں لیکن مغل اعظم ہی کی تکمیل کے دنوں میں دونوں میں علیحدگی ہوگئی۔ مغل اعظم وہ فلم تھی جو دس سال کے عرصے میں مکمل ہوئی تھی اور بہت طویل بھی تھی لیکن اس کو ایک لافانی فلم تسلیم کیا جاتا ہے۔

مدھو بالا سے علیحدگی کا سبب عموماً یہ بھی بیان کیا جاتا ہے کہ وہ ہنگ رنت کسی اور سے بھی محبت کی پینگیں بڑھا رہی تھی مگر دلیپ کمار نے ایسا کوئی تذکرہ نہیں کیا۔ علیحدگی کا بنیادی سبب مدھو بالا کے والد عطاء اللہ خان تھے جو کسی قیمت پر بھی سونے کی چڑیا کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔ اس لیے وہ ان دونوں کی محبت میں پہاڑ بن کر کھڑے ہوگئے۔ مدھو بالا آخر دم تک دلیپ کمار کا دم بھرتی رہیں لیکن وہ ایک کمزور عورت تھی جو والد کے خلاف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتی تھی۔ دلیپ کمار نے اس کو منگنی کی انگوٹھی پہنائی تھی مگر فلم ''نیا دور'' کے سلسلے میں فلم ساز اور مدھو بالا کے والد کے مابین جو تنازع پیدا ہوا اور نوبت عدالت تک پہنچ گئی تو دلیپ کمار نے عدالت میں اعتراف کیا کہ وہ مدھو بالا سے محبت کرتا ہے لیکن نیا دور کے جھگڑے میں اس نے مدھو بالا کے خلاف گواہی دی تو مدھو بالا کے باپ کو مدھو بالا کو بہکانے کا ایک اور بہانہ مل گیا۔

غیر ضروری غلط فہمی جو مصنفین نے پیدا کی وہ یہ ہے کہ دلیپ کمار اور راج کپور کے مابین تعلقات کشیدہ رہے تھے ورنہ راج کپور ہمیشہ دلیپ کمار کے توڑ میں لگا رہتا تھا۔ دلیپ کمار نے لکھا ہے کہ ہم دونوں پشاور میں بچپن کے دوست تھے۔ ہمارے خاندانوں میں بھی باہمی محبت کا رشتہ قائم تھا جو آخر دم تک قائم رہا۔ راج کپور اکثر معاملات میں دلیپ سے مشورہ بھی لیا کرتا تھا۔ دونوں بہت مخلص اور بے غرض دوست تھے۔ دونوں کے خاندانوں میں بھی یہی رشتہ قائم تھا۔ راج کپور کے بھائی بڑے بھائی کی طرح دلیپ کمار کی عزت کرتے تھے۔ دلیپ کمار ہمیشہ راج کپور کو شراب نوشی میں کمی کا مشورہ دیتا رہا جس کی وجہ سے وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا ہوگیا تھا۔ دلیپ کی شادی میں راج کپور خوشیاں منانے میں پیش پیش تھا اور گھٹنوں کے بل سیڑھیاں چڑھ کر آیا تھا کہ مبارک باد دے گیا تھا۔ راج کپور کی وفات کی خبر ملی تو دلیپ کمار بمبئی سے بہت دور شوٹنگ میں مصروف تھا مگر سب کام چھوڑ کر فوراً بمبئی پہنچا اور دوست کی میت کے پاس بیٹھا روتا رہا۔ اس نے راج کپور کے بھائیوں کو بھی تسلی دی اور یقین دلایا کہ انہیں راج کپور کی کمی محسوس نہیں ہوگی۔

سائرہ بانو کے ساتھ شادی کے سلسلے میں حقیقت یہ ہے کہ سائرہ بانو پرستش کی حد تک دلیپ کمار سے محبت کرتی تھی اور جب دلیپ کمار کو سائرہ کی والدہ نسیم بانو نے بتایا کہ سائرہ مغرب میں تعلیم حاصل کرنے کی وجہ سے بہت آزاد خیال ہے جس کو وہ بچے والے کچھ اور معنی پہناتے ہیں۔ سائرہ کے تحفظ کے لیے بہتر ہے کہ دلیپ کمار اس سے شادی کرلے ورنہ وہ بھٹک جائے گی۔ ان دونوں کی عمروں میں سولہ سال کا فرق تھا اور دلیپ کمار نے کبھی اس خیال سے سائرہ کے بارے میں سوچا بھی نہ تھا لیکن بالآخر دلیپ کمار اس شادی کے لیے تیار ہوگیا جو بے حد کامیاب رہی۔ سائرہ، دلیپ کمار کو صاحب کہہ کر مخاطب کرتی ہے۔ ان دونوں میں کبھی کوئی غلط فہمی پیدا نہیں ہوئی یہاں تک کہ عاصمہ کے ساتھ خفیہ شادی کی خبر سن کر بھی سائرہ نے غصے کا اظہار نہیں کیا۔ دلیپ کمار نے اس شادی کو اپنی حماقت قرار دیا ہے۔ آج جب کہ دلیپ کمار بیماری کی وجہ سے کافی حد تک معذور ہیں لیکن سائرہ کی محبت میں کمی نہیں آئی اور وہ ہمیشہ ان کی تعریف اور ان سے محبت کا اظہار کرتی رہتی ہے۔

امیتابھ بچن نے جب عروج حاصل کیا تو اس کو دلیپ کمار کا حریف قرار دیا گیا حالانکہ حقیقت اس کے برعکس تھی۔ امیتابھ، دلیپ کمار کی عظمت کا کھلے عام اعتراف کرتا رہتا ہے۔ فلم ''شکتی'' میں ان دونوں نے ایک ساتھ کام کیا اور امیتابھ کا کہنا ہے کہ اس نے دلیپ کمار سے بہت کچھ سیکھا۔ دلیپ کمار نے بھی امیتابھ کو ایک مکمل اداکار قرار دیا۔

14 دسمبر 2011 کو دلیپ کمار نے امیتابھ کو جو خط لکھا اس سے ان دونوں کے باہمی تعلقات کا اظہار ہوتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دلیپ کمار نے سن 40ء سے 60ء تک ہندوستانی اسکرین پر حکمرانی کی ہے اور مختلف قسم کے کردار اس خوبی سے ادا کیے ہیں کہ آج ذہنی اکیڈمی میں دو طالب علموں کو دکھا کر انہیں اداکاری سکھائی جاتی ہے۔ ہندوستان کے تمام سپر اسٹارز تسلیم کرتے ہیں کہ اداکاری میں وہ دلیپ کمار کی فلموں سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔ امیتابھ بچن، شاہ رخ خان، عامر خان نے ہمیشہ دلیپ کمار کی طرح اور اس کے انداز میں کسی نہ کسی مرحلے پر نقل کرنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ وہ دلیپ کمار کو ایک مثالی اداکار تسلیم کرتے ہیں۔

شاہ رخ خان کے بارے میں اس کتاب میں یہ دلچسپ انکشاف کیا گیا ہے کہ دلیپ کمار اور سائرہ بانو دونوں اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ دلیپ نے لکھا ہے کہ سائرہ بانو کا کہنا ہے کہ اس کی خواہش رہی ہے کہ اگر ان کا کوئی بیٹا ہو تو وہ شاہ رخ جیسا ہو۔ شاہ رخ ان دونوں کا لاڈلا ہے اور ان سے بے حد پیار کرتا ہے۔

دلیپ کمار نے 1950ء کے تین بڑے اداکاروں دلیپ کمار، راج کپور اور دیو آنند، کے بارے میں اس خیال کی تردید کی ہے کہ ان میں آپس میں رقابت تھی اس کے برعکس وہ ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے اور ایک دوسرے کے کام کی تعریف بھی کرتے تھے۔ دیو آنند نے اپنی خود نوشت میں لکھا ہے کہ ہندوستان نے دلیپ کمار جیسا عظیم اداکار دوبارہ پیدا نہ کیا۔

شاہ رخ خان نے فلم دیوداس میں دیوداس کا کردار کیا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ اس کو ہر لمحہ یہی خیال رہتا تھا کہ وہ دلیپ کمار کی ہمسری نہیں کر سکتا۔ اسی لیے اس نے اپنے کردار میں کچھ تبدیلی بھی کرائی تھی۔ اس کے باوجود اس کا کہنا ہے کہ دلیپ کمار نے جس پائے کی حقیقی اداکاری کی ہے اس کا کوئی جواب نہیں ہے۔ مجھے اکثر یہ خیال ستاتا رہا کہ مجھے دیوداس کا کردار ادا کرنے کے لیے رضامند نہیں ہونا چاہیے تھا یہ میری حماقت تھی کہ میں نے دیوداس کا کردار قبول کیا۔

فلم دیوداس میں وجنتی مالا نے دیوداس سے عشق کرنے والی اور بنگالی اداکارہ سچترا سین نے پارو کا کردار ادا کیا ہے۔ جو لوگ دلیپ کمار کی اداکاری کی معراج دیکھنا چاہتے ہیں انہیں یہ فلم ضرور دیکھنی چاہیے۔ اداکاروں کے لیے بھی یہ ایک سبق کی حیثیت رکھتی ہے۔

دلیپ کمار نے مختلف اداکاراؤں کے ساتھ مختلف قسم کے کردار ادا کیے ہیں اور ہمیشہ ہر اداکارہ کے ساتھ اس کی جوڑی کو پسند کیا گیا ہے۔ دلیپ کمار نے نرگس، مدھوبالا، وجنتی مالا، وحیدہ رحمٰن کے ساتھ کئی فلموں میں کام کیا ہے اور ہر فلم کو سراہا گیا۔

دلیپ کمار نے 1970ء میں محسوس کیا کہ اس کی مقبولیت کم ہو رہی ہے تو انہوں نے فلموں میں اداکاری کو خیرباد کہہ دیا۔ وہ خود بھی تھک چکا تھا اور نئی نسل کے اداکاروں کو موقع دینا چاہتا تھا لیکن فلم ساز اس کو کب چھوڑنا چاہتے تھے۔ 1980ء میں اس نے کئی فلمیں سائن کیں۔ ان فلموں میں بھی دلیپ کمار نے ہیرو سے زائد معاوضہ وصول کیا۔

فلم ”شکتی“ میں امیتابھ نوجوان ہیرو تھے۔ اس فلم میں دلیپ کمار اور امیتابھ کے آمنے سامنے صرف دو سین تھے مگر امیتابھ نے دلیپ کمار کی حوصلہ افزائی اور خود اعتمادی کی وجہ سے بہت اچھی اداکاری کی۔ امیتابھ کا کہنا ہے کہ مجھے ہر لمحے یہ احساس رہا کہ میں دلیپ کمار کے مقابل کام کر رہا ہوں۔ اس فلم نے کامیابی کے نئے ریکارڈ قائم کیے اور دلیپ کمار کی عظمت کا سب نے اعتراف کیا۔ بڑی عمر کے کرداروں میں بھی دلیپ کمار نے ہر فلم پر اپنی اداکاری کی چھاپ لگا دی۔ ”شکتی“ نے ثابت کر دیا کہ دلیپ کمار ہر ماحول میں ڈھل جاتا ہے اور اپنی اداکاری سے دیکھنے والوں کے دل موہ لیتا ہے۔ 1984ء میں ہی دلیپ کمار کے نئے دور کی دوسری فلم مشعل نمائش پذیر ہوئی اور اس فلم میں بھی دلیپ کمار کی اداکاری کو بہت سراہا گیا۔ ان فلموں نے ثابت کر دیا کہ دلیپ کمار کی اداکاری کا جادو آج بھی ویسا ہی پُراثر ہے جیسا کہ جوانی میں تھا اور وہ آج بھی فلم کی اسکرین کو اپنی اداکاری سے سجا سکتے ہیں۔ دلیپ کمار نے حربہ تین فلموں میں کام کیا اور پھر 1990ء میں اداکاری کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ دیا مگر وہ نئے آنے والے اداکاروں کو اداکاری کا ہنر سکھا گئے۔ ایک نقاد نے کیا خوب لکھا ہے کہ فلم میں دلیپ کمار کی اہمیت نمک جیسی ہے جس کے بغیر کوئی بھی کھانا لذیذ نہیں ہو سکتا۔

دلیپ کمار کے مداحوں کو اس کی پرانی فلمیں ضرور دیکھنی چاہئیں اور اس کی خود نوشت کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے یہ ایک دلچسپ، پُرلطف اور معلوماتی کتاب ہے۔

(جاری ہے)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تباہ کن

مریم کے خان

ایک معمولی سا ذرہ کس طرح تباہی کا عفریت بن کر شہر کے شہر تباہ کر سکتا ہے۔ لاکھوں لاکھ لوگوں کو ایک پل میں موت کی نیند سلا سکتا ہے اسی پر ایک مختصر سی تحریر، قصۂ دلپذیر۔ سائنس کی حشر سرمانیاں۔

معلومات حاصل کرنے کے شائقین کے لیے دلچسپ تحریر

یونانی فلسفیوں نے مادے کی سب سے چھوٹی اکائی کو ایٹم کا نام دیا۔ یونانی زبان میں اس کے دو معنی ہیں ایک نظروں سے اوجھل اور دوسرا ناقابل تقسیم۔ صدیوں تک اس کے یہی معنی رائج رہے لیکن 1898ء میں دو فرانسیسی سائنسدانوں پیئری کیوری اور میری کیوری نے کئی سال کی محنت اور جان لیوا خطرے کا سامنا کرتے ہوئے یورینیم کی ایک بڑی دھات پچ بلنڈی سے ایک عنصر الگ کیا اور اسے ریڈیم کا نام دیا۔ تب دنیا پہلی بار تابکاری سے روشناس ہوئی۔ سائنس داں مختلف ریڈیائی لہروں سے واقف تھے۔ جیسے روشنی اور ریڈیو کی لہریں۔ مگر کیوری جوڑے کی کاوشوں سے پہلی بار ایسی شعاعیں سامنے آئیں جو روشنی اور ریڈیائی لہروں سے مختلف ہوتی تھیں۔ یہ ریڈیائی لہروں کی طرح آنکھ سے اوجھل اور روشنی کی طرح کیمیائی عناصر پر اثر انداز ہوتی تھیں جیسے فوٹو گرافی کی پلیٹ ان نظر نہ آنے والی شعاعوں سے متاثر ہوتی تھیں۔

اس دریافت نے فزکس کی دنیا میں ایک انقلاب برپا کر دیا تھا کیونکہ صدیوں سے مادے سے توانائی حاصل کرنے کا خیال ایک خواب بنا ہوا تھا۔ یعنی مادے کو براہ راست توانائی میں بدل دیا جائے کیونکہ فزکس کی رو سے مادہ اور توانائی دونوں ایک ہی چیز ہیں اور یہ آپس میں بدل سکتے ہیں۔ بیسویں صدی کے آغاز میں البرٹ آئن اسٹائن نے مشہور زمانہ تھیوری پیش کی تھی کہ کسی طرح سے مادہ توانائی میں بدل سکتا ہے۔ مگر یہ عمل کس طرح واقع ہو سکتی ہے اس کا کوئی طریقہ اب تک سامنے نہیں آیا تھا۔ جب کیوری جوڑے نے ریڈیم دریافت کیا اور اس سے نظر نہ آنے والی تواتر شعاعوں کا اخراج ثابت ہو گیا تو سائنسداں پر امید ہو گئے کہ اب مادے کو براہ راست توانائی میں تبدیل کیا جا سکتا ہے۔ ریڈیم یا اسی طرح کے تابکار عناصر سے تابکار شعاعوں کا اخراج اصل میں مادے کا توانائی میں تبدیل ہونا ہی ہے۔ لیکن یہ عمل بہت سست روی سے اور لاکھوں کروڑوں سال میں جا کر ہوتا ہے جیسے یورینیم مسلسل تابکاری خارج کر کے کئی کروڑ سال میں جا کر سیسے میں بدل جاتی ہے۔

1934ء میں برطانوی سائنس داں لیوز یلارڈ نے پہلی بار ایٹم کو پھاڑنے اور اس سے کثیر مقدار میں توانائی حاصل کرنے کے لیے اس پر الفا ذرات کی بوچھاڑ کا نظریہ پیش کیا۔ اس نے اپنا نظریہ برطانیہ میں پیٹنٹ کرایا اور یہ اتنی اہم دریافت تھی کہ جب لیوز یلارڈ نے اسے شائع کرنا چاہا تو اسے فوجی راز قرار دے کر شائع کرنے سے روک دیا گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسی وقت مغربی طاقتیں اس طریقے کو ہتھیار سازی میں استعمال کرنے کا سوچنے لگی تھیں۔ اسی بنا پر برطانوی حکومت نے چین ری ایکشن کی تھیوری کو شائع ہونے سے روک رکھا تھا۔ اسی سال فرانسیسی سائنسدانوں ایرینے اور فریڈرک جیولٹ کیوری نے مصنوعی تابکار مادہ تیار کیا۔ انہوں نے الفا ذرات کی بوچھاڑ سے ایک عام مادے کو تابکار مادے میں بدل دیا۔ اسی سال ایک اطالوی سائنسداں انرکو فرمی نے چین نیوکلیئر ری ایکشن کا پہلا عملی تجربہ کیا جب اس نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

یورینیم پر نیوٹرون کی بمباری کی تو نتیجے میں یورینیم کے ایٹم دو ٹکڑوں میں بٹ گئے اور ایٹم ٹوٹنے سے کثیر مقدار میں توانائی کا اخراج ہوا تھا۔ اس طرح انرک فرمی کو بجا طور پر نیوکلیئر سائنس کا بانی کہا جاسکتا ہے۔

ایک طرف سائنس کی دنیا میں یہ انقلابی پیش رفت ہو رہی تھی تو دوسری طرف یورپ اور دنیا کی سیاست نئی کروٹ لینے کو تیار تھی۔ جرمنی میں فاشسٹ اور روس میں سوشلسٹ اقتدار میں آگئے تھے اور یہ دونوں مغربی یورپ اور امریکا کے لیے خطرے کی گھنٹی بجا رہے تھے۔ 1938ء میں جب جرمنی میں ہٹلر اقتدار میں آگیا تو دو جرمن سائنسدانوں اوٹو ہان اور فرٹز اسٹراس مان نے یورینیم پر نیوٹرون کی بوچھاڑ کا تجربہ کیا اور انہوں نے جواب میں بیریم کا عنصر حاصل کیا۔ یہ نیوکلیئر دھماکے کی طرف ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس تجربے کو تکنیکی لحاظ سے ایک دھماکے کی صورت لیز مائنر اور اس کے بھتیجے اوٹو رابرٹ فریش نے دی تھی۔ جرمن سائنسدانوں کی اس معاملے میں دلچسپی نے امریکا اور اس کے اتحادیوں میں تشویش کی لہر دوڑا دی تھی۔ دوسری جنگ عظیم کے آغاز کے ساتھ ہی برطانیہ اور امریکا کی حکومتیں اس امر پر متفق ہوگئی تھیں کہ انہیں جلد از جلد ایٹمی توانائی کو ایک قابل استعمال بم کی صورت میں ڈھال لینا چاہیے۔

ایک طرف برطانوی اور امریکی سائنسداں اس کام کے لیے کوشاں تھے تو دوسری طرف مشرقی یورپ سے امریکا ہجرت کرنے والے سائنسدانوں نے ایٹم بم کی تیاری کے لیے قابل ذکر کام کیا تھا۔ رفتہ رفتہ امریکا میں ایک ٹیم اکٹھا ہوگئی اور تین ممالک یعنی امریکا، برطانیہ اور کینیڈا نے مل کر پہلے ایٹم بم کی تیاری کے لیے مین ہٹن پروجیکٹ کی بنیاد رکھی۔ بظاہر تو مین ہٹن پروجیکٹ امریکا میں ایریزونا کے صحرا کی لاس آلموس لیب میں جاری تھا لیکن درحقیقت یہ ان تین ممالک کی تیس سے زائد تجربہ گاہوں میں جاری تھا۔ سائنسداں متفق تھے کہ اگر یورینیم دو سو اڑتیس سے یورینیم دو سو پینتیس نکال لی جائے تو ایٹمی دھماکا کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس کا پورا خطرہ تھا کہ جرمنی پہلے ایٹم بم نہ بنالے اور اسے استعمال نہ کرلے۔ ان تینوں ممالک کی حکومتوں نے پروجیکٹ کی فوری منظوری دے دی اور اس کے لیے فنڈز اور تمام سہولتیں بھی مہیا کردیں۔

اس وقت مین ہٹن پروجیکٹ میں ابتدائی ریکروٹمنٹ ایک لاکھ افراد کی تھی۔ فوج کا ایک پورا ڈویژن اس کام

WWW.PAKSOCIETY.COM

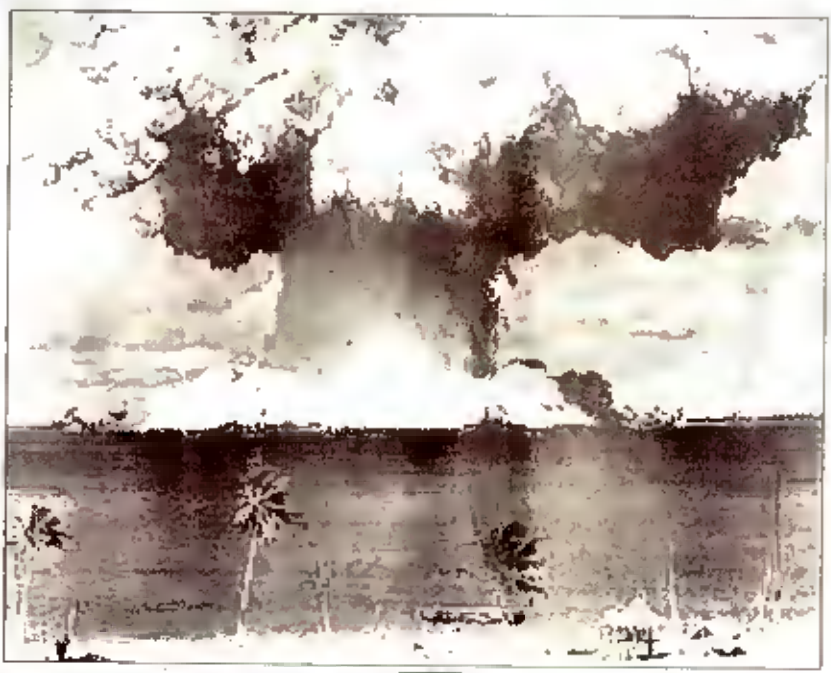

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے لیے مخصوص کر دیا گیا تھا اور پروجیکٹ انچارج میجر جنرل لیزلی گرووز تھا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ پروجیکٹ شروع سے امریکی فوج کے کنٹرول میں تھا۔ یہ حقیقت ہے کہ امریکی سیاست داں اور سول انتظامیہ اس کے بارے میں بہت کم جانتی تھی کہ جب ہنری ٹرومین صدر بنا تو اسے بھی علم نہیں تھا کہ امریکا میں ایک تباہ کن بم تیار کیا جا رہا ہے۔ ہنری ٹرومین نائب صدر تھا جو امریکی صدر کی اچانک موت سے صدر بن گیا۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ رازداری کس حد تک تھی۔ پریس اور عام لوگوں کو علم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کہتے ہیں اس پروجیکٹ کا آغاز البرٹ آئن اسٹائن کے ایک خط سے ہوا جو اس نے امریکی صدر روز ویلٹ کو لکھا اور اس میں اس پر زور دیا کہ وہ فوری طور پر ایٹم بم کی تیاری کا کام شروع کرے اس سے پہلے کہ جرمن یہ کام کر گزریں۔ اسی آئن اسٹائن نے جب ہیروشیما اور ناگاساکی کی تباہی دیکھی تو ایٹم بم کا مخالف ہو گیا لیکن ساتھ ہی وہ اسرائیل کے ایٹمی قوت بننے میں مسلسل معاون و مددگار رہا۔ وہ یونیورسٹیاں جہاں اسرائیل نے پہلے پہل ایٹمی ریسرچ کیں، براہ راست آئن اسٹائن کی نگرانی میں کام کرتی تھیں۔

آج کل سائنس پڑھنے والا ہر بچہ جانتا ہے کہ ایٹم سے توانائی کس طرح حاصل کی جاتی ہے لیکن 1939 میں جب مین ہٹن پروجیکٹ صرف ایک ریسرچ کے لیے شروع ہوا تھا تو اس بارے میں معلومات بہت کم تھیں۔ لاس آلموس کے مقام پر اولین ری ایکٹر کی تعمیر کی گئی اور پھر وہاں گیس ڈفیوژن کے طریقے سے یورینیم تین دو سو پینتیس کی مقدار بڑھائی جانے لگی۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ ہزاروں میل سے فولادی لائنوں میں یورینیم کو گیس میں تبدیل کر کے مسلسل چکر دیا جاتا تھا۔ اس عمل کے دوران میں دو سو اڑتیس بھاری ہونے کی وجہ سے نیچے بیٹھ جاتی تھی اور دو سو پینتیس ہلکی ہونے کی بنا پر آگے رواں دواں رہتی تھی۔ ایک بار گیس کو لائنوں سے گزار کر جمع کیا جاتا اور پھر دوبارہ لائنوں سے گزارا جاتا۔ یوں کئی ہزار چکروں کے بعد گیس میں یورینیم دو سو پینتیس نوے فیصد کی خالص سطح تک پہنچ گیا۔ اس دوران میں کم افزودہ دھات کو ری ایکٹر میں بہ طور ایندھن جلایا گیا تو اس سے پلوٹونیم پیدا ہوا یہ بھی بہ طور بم دھات استعمال ہو سکتا تھا اس لیے جو ایٹم بم ناگاساکی پر گرایا گیا اس میں پلوٹونیم استعمال ہوا تھا۔

گیس ڈفیوژن کا طریقہ نہایت پیچیدہ، مہنگا اور مشکل تھا۔ اگر اس وقت امریکا جیسا بڑا، دولت مند اور جنگ سے محفوظ ملک نہ ہوتا تو اتحادیوں کے لیے ایٹم بم کا حصول ناممکن تھا۔ صرف انہی وجوہات کی بنا پر جرمنی جیسا تکنیکی لحاظ سے نہایت ترقی یافتہ ملک ایٹم بم نہیں بنا سکا تھا۔ جنگ کے ماحول میں یہ کام ممکن ہی نہیں تھا۔ اگر جرمنی لاس آلموس جیسی بڑی سائٹ بناتا تو اس کا اتحادیوں کی نظروں سے پوشیدہ رہنا ناممکن تھا اور وہ فوراً بمباری کر کے اسے تباہ کر دیتے۔ لیکن جنگ سے دور امریکا کے وسط میں لاس آلموس نہایت محفوظ جگہ تھی اور وہاں بم کی تیاری کا کام سکون اور خاموشی سے انجام پا گیا۔ حالانکہ آخری دنوں میں مین ہٹن پروجیکٹ پر کام کرنے والے افراد کی تعداد تین لاکھ تک پہنچ گئی تھی جن میں تیس ہزار سائنس داں اور اعلیٰ درجے کے انجینئرز شامل تھے۔ پروجیکٹ کا کل خرچ تقریباً پونے تین بلین ڈالرز تھا جو آج کے لحاظ سے تقریباً تیس بلین ڈالرز بنتے ہیں۔ اس رقم کا نوے فیصد تعمیرات اور تکنیکی سہولتوں کی فراہمی پر خرچ ہوا۔ اصل بم پر دس فیصد لاگت بھی نہیں آئی تھی۔

گیس ڈفیوژن کا طریقہ بعد میں ترک کر دیا گیا تھا کیونکہ یہ نہایت مشکل اور مہنگا تھا۔ اس کی بجائے کم خالص یورینیم کو ری ایکٹرز میں استعمال کر کے اس کی بائی پروڈکٹ یعنی پلوٹونیم کو ایٹم بم میں استعمال کرنا زیادہ آسان اور کم خرچ ثابت ہوا تھا۔ ری ایکٹر ایک طرف تو کثیر مقدار میں بجلی پیدا کرتے ہیں تو دوسری طرف ان میں ایسا ایٹمی فضلہ پیدا ہوتا ہے جسے صاف کر کے کئی اقسام کے کارآمد تابکار مادے حاصل کیے جاتے ہیں جیسے پلوٹونیم اور اسٹرونشیم وغیرہ۔ یہ تمام مادے مختلف کاموں میں استعمال ہوتے ہیں اور ان میں سے بعض کینسر کے مریضوں کے علاج میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مگر ری ایکٹرز بنانا نہایت مہنگا اور مشکل کام ہے اور آج بھی اس کی مکمل ٹیکنالوجی گنے چنے چند ممالک کے پاس ہے اس لیے نئے ملکوں نے ایٹم بم کے لیے یورینیم کی افزودگی کو ترجیح دی اگرچہ یہ نہایت مہنگا کام ہے لیکن ساتھ ہی قابل عمل بھی ہے۔

مین ہٹن پروجیکٹ کا اصل آغاز کولمبیا یونیورسٹی میں ہوا تھا۔ اطالوی انرکو فرمی بھی وہاں آ گیا تھا اور اس نے دوسرے امریکی سائنس دانوں کے ساتھ مل کر پہلا امریکی نیوکلیئر فزن کا تجربہ کیا اور اسی کی بنیاد پر ایٹم بم پروجیکٹ کو آگے بڑھایا گیا۔ دوسری طرف برطانیہ میں بھی اس سلسلے میں سنجیدہ کام ہو رہا تھا۔ وہاں ایک باقاعدہ یورینیم کمیٹی کام کر رہی تھی جو اس بات کا جائزہ لے رہی تھی کہ نیوکلیئر فزن کو بم میں کیسے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ 1940ء میں برمنگھم یونیورسٹی کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دو پروفیسروں اوٹو فرچ اور روڈولف پیرلز نے ایک تخمینہ لگایا کہ اگر چین ری ایکشن ایک حد سے بڑھ جائے تو اس سے توانائی کی بہت بڑی مقدار خارج ہو سکتی ہے۔ اس کا پہلا مظہر شدید حرارت کی صورت میں ہوگا جو تقریباً سورج کے وسط میں موجود درجۂ حرارت کے مساوی ہوگا۔ اس سے آس پاس کی ہر شے گیس کی صورت اختیار کر لے گی اور ایک بہت بڑا دھماکا ہو گا۔ اگرچہ وہ درست طور پر نہیں بتا سکے کہ اس سے کتنا بڑا علاقہ متاثر ہوگا لیکن ان کے خیال میں کسی بڑے شہر کا مرکز اس دھماکے میں مکمل طور پر تباہ ہو سکتا تھا۔ بعد میں ان کا تخمینہ ایٹم بم کی حد تک درست ثابت ہوا۔ انہوں نے اسے سپر بم کا نام دیا تھا اور ان کا خیال تھا کہ اگر سنجیدگی سے کوشش کی جائے تو چند سالوں میں اس بم کا حصول ممکن تھا۔

ان دونوں کی تحقیق کی بنیاد پر برطانیہ نے ایک پروجیکٹ شروع کیا جسے "ٹیوب ایلائے" کا نام دیا گیا۔ مگر جنگ کے ماحول میں جب کہ برطانیہ مسلسل جرمن فضائیہ کے حملوں کی زد میں تھا اس قسم کا بڑا پروجیکٹ شروع کرنا ناممکن حد تک مشکل تھا۔ اس لیے جب امریکا میں مین ہٹن پروجیکٹ شروع ہوا تو ٹیوب ایلائے کو اس میں ضم کر دیا گیا۔ تمام سہولتیں اور سائنسدان وہاں چلے گئے۔ شروع میں پروجیکٹ پر کام کی رفتار بہت سست تھی اور اس کی بنیادی وجہ اس پروجیکٹ کا بیورو کریسی کے ہاتھ میں ہونا تھا جو معاملات کو اپنے انداز میں اور سستی سے آگے بڑھاتے ہیں جب کہ اس پروجیکٹ میں اصل اہمیت وقت کی تھی فیصلہ سازی سائنسدانوں کے ہاتھ میں نہیں تھی۔ لیکن 1942ء میں میجر جنرل گروو نے کانگریس کی ایک کمیٹی کے سامنے پہلی بار مین ہٹن پروجیکٹ کا انکشاف کرتے ہوئے اسے سول بیورو کریسی کے چنگل سے آزاد کرانے کی درخواست کی اور یوں پہلی بار مین ہٹن پروجیکٹ سائنسدانوں کے ہاتھ میں آ گیا۔ ایٹم بم ڈیزائن ٹیم کا انچارج رابرٹ اوپن ہائمر پروجیکٹ کا سربراہ بن گیا اور بعد میں ایٹم بم کی تخلیق کا سہرا بھی اس کے سر باندھ دیا گیا۔ حالانکہ اس نے اکیلے یہ کام نہیں کیا تھا۔ کم سے کم تین سو اعلیٰ درجے کے سائنسدان اس کام پر مصروف تھے۔

اس پروجیکٹ کو سب سے بڑی مشکل ایک اچھی حسابی مشین کی عدم دستیابی تھی۔ ابھی کمپیوٹر تو کیا کیلکولیٹر بھی ایجاد نہیں ہوا تھا۔ اس لیے پیچیدہ حسابی مساوات کو حل کرنے کے لیے بے شمار اعلیٰ درجے کے ریاضی داں جن میں سے اکثر پی ایچ ڈی تھے اس پروجیکٹ کے لیے حاصل کیے گئے اور انہوں نے ایٹم بم کو عملی صورت میں لانے کے لیے کاغذ پر قلم سے تین لاکھ سے زیادہ پیچیدہ حسابی مساوات حل کر کے اس کام کو ممکن بنا دیا۔ صرف پانچ سال بعد دنیا کے پہلے کمپیوٹر نے یہی کام جو تین ہزار افراد نے تقریباً تین سال میں جا کر کیا تھا، صرف تین مہینے میں کر کے دکھا دیا۔ آج کا ایک اچھا سائنٹیفک کیلکولیٹر یہ کام ایک دن میں کر سکتا ہے اور سپر کمپیوٹر کو ایک لمحہ لگے گا۔ اس سے قارئین اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مین ہٹن پروجیکٹ صحیح معنوں میں مین ہنٹ (انسانوں کا شکار) ثابت ہوا تھا۔ بے شمار لوگ اور سائنسدان اس کام کے دباؤ کی وجہ سے جسمانی اور ذہنی امراض کا شکار ہوئے۔ کئی ایک کام کے دوران میں ہی چل بسے۔ بے شمار ٹیکنیشین جو براہِ راست یورینیم کا سامنا کرتے تھے وہ تابکاری کا شکار ہوئے اور جب اس پروجیکٹ نے دنیا کے اوّلین ایٹم بم بنائے تو ان کا شکار تقریباً پانچ لاکھ افراد ہوئے تھے۔

بعد میں روس، برطانیہ اور فرانس کو امریکی محنت کا بنا بنایا پھل مل گیا۔ برطانیہ اور فرانس تو اتحادی تھے اس لیے ایٹم بم میں ان کا حصہ بنتا تھا لیکن روس نے امریکا میں موجود اپنے ایجنٹوں کی مدد سے معلومات اور ڈیزائن چرا کر بہت تیزی سے یعنی جنگ ختم ہونے کے صرف چار سال بعد 1949ء میں اپنا پہلا ایٹمی دھماکا کر دیا۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ روس نے صرف چوری شدہ معلومات اور ڈیزائن کے بل بوتے پر یہ کام کیا تھا بلکہ روس میں بے شمار اعلیٰ درجے کے ماہرین طبیعیات پہلے ہی اس سلسلے میں کام کر رہے تھے۔ امریکی معلومات سے ان کے کام میں آسانی پیدا ہوگئی اور یہی وجہ تھی کہ بہت تیزی کے ساتھ روس نے چند برس بعد ہی اپنے اوّلین ہائیڈروجن بم کا تجربہ بھی کر لیا اور یہ تجربہ اس نے امریکا اور دنیا کے اوّلین ہائیڈروجن بم کے تجربے کے صرف نو مہینے بعد کر لیا تھا۔ آج کے جدید دور میں ٹیکنالوجی کی منتقلی کو روکنا نہایت مشکل کام ہے اور جو کام کوئی ایک ملک کرتا ہے وہی کام دوسرا ملک بھی کر سکتا ہے۔

جس وقت مین ہٹن پروجیکٹ پر کام جاری تھا تو تمام اتحادی ممالک جیسے برطانیہ، فرانس (سائنسدانوں کی حد تک کیونکہ فرانس پر تو جرمنی کا قبضہ تھا) کینیڈا، آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ جیسے چھوٹے ملک کو بھی اس میں شامل کیا گیا تھا۔ لیکن روس جیسے بڑے اتحادی کو اس کی ہوا بھی نہیں لگنے دی گئی تھی۔ یہ طے کر لیا گیا تھا کہ ایٹم بم کے استعمال سے پہلے روس کو اس بارے میں کچھ نہیں معلوم ہونا چاہیے۔ مگر روس کو کن کن

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

WWW.PAKSOCIETY.COM

حل ہوگئی تھی۔ ایک تو چین نیوکلیئر ری ایکشن کے بارے میں مغربی جرائد نے چھاپنا بند کردیا تھا اس سے روسی کھٹک گئے کہ دال میں کچھ کالا ہے اور انہوں نے امریکا میں موجود سوشلسٹ نظریات رکھنے والے عناصر کو استعمال کیا۔ درحقیقت اس زمانے میں روس نے امریکا میں اپنا جاسوسی کا نہایت موثر نظام قائم کرلیا تھا اور اس کی رسائی نہایت خفیہ معلومات تک ہوگئی تھی اس لیے یہ بات تسلیم کی جاتی ہے کہ سوویت یونین کو مین ہٹن پروجیکٹ کے بارے میں علم تھا اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ وہاں کیا بنایا جارہا تھا۔

1940ء تک سائنسداں طے کرچکے تھے کہ یورینیم دو سو پینتیس کا ایٹم ہی فیوژن میں استعمال ہوسکتا ہے کیونکہ جب اس پر نیوٹرون کی بوچھاڑ کی جاتی ہے تو یہ دو حصوں میں تقسیم ہوجاتا ہے اس عمل کو فزژن (انشقاق) کہتے ہیں۔ ایٹم ٹوٹنے کے بعد کثیر مقدار میں توانائی کے ساتھ اوسطاً ڈھائی آزاد نیوٹرون بھی پیدا ہوتے ہیں اور یہ مزید ایٹم توڑتے ہیں جس سے مزید نیوٹرون پیدا ہوکر مزید ایٹم توڑتے ہیں اور اس عمل کو ہی چین ری ایکشن کہا جاتا ہے۔ ایک دفعہ وقوع پذیر ہونے کے بعد یہ خود بہ خود جاری رہتا ہے حتیٰ کہ تمام ایٹم ٹوٹ جاتے ہیں۔ دو سو پینتیس کے مقابلے میں یورینیم دو سو اڑتیس کا ایٹم نیوٹرون تو جذب کرلیتا ہے لیکن ٹوٹتا نہیں ہے۔ اس لیے یہ دھماکے کے لیے بے کار ہوتا ہے۔ سائنسدانوں نے تخمینہ لگایا کہ جب تک دو سو پینتیس اسی فیصد تک خالص نہیں ہوگی چین ری ایکشن نہیں ہوگا کیونکہ اگر دو سو اڑتیس کی مقدار زیادہ ہوگی تو وہ نیوٹرون جذب کرکے چین ری ایکشن روک دے گا۔

1960ء کی دہائی میں پاکستان میں بھی دو ایٹمی ری ایکٹرز کام کررہے تھے اور یہ خاصی مقدار میں ایٹمی مواد پیدا کرتے تھے لیکن اسے صاف کرنے کے لیے ہمارے پاس کوئی ری پروسیسنگ پلانٹ نہیں تھا۔ بھٹو دور میں پاکستان نے فرانس سے ری پروسیسنگ پلانٹ حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن ہمارے مہربان دوست امریکا نے یہ کوشش ناکام بنادی۔ جب کہ انڈیا کے ایٹمی دھماکے پر اس نے چپ سادھ لی تھی۔ یہ نہیں معلوم کہ ہم نے اپنے طور پر کوئی ری پروسیسنگ پلانٹ بنایا ہے یا نہیں کیونکہ ری پروسیسنگ پلانٹ بہرحال سینٹری فیوج پلانٹ کی نسبت سستا اور آسان ہوتا ہے۔

یہی وجہ تھی کہ مین ہٹن پروجیکٹ کے تحت جہاں یورینیم صاف کرنے کے دونوں طریقے بروئے کار لائے جارہے تھے۔ دوسرا طریقہ الیکٹرومیگنیٹک لیک کے عمل سے یورینیم کے دونوں آئسوٹوپس کو الگ کرتا تھا۔ لیکن یہ بھی نہایت مشکل اور پیچیدہ تھا اس کے لیے بجلی کی بہت بڑی مقدار چاہیے تھی جو دستیاب نہیں تھی۔ یہ ری ایکٹرز یونیورسٹی آف شکاگو کے تہ خانے میں انرکو فرمی کی نگرانی میں بم گریڈ دھات کی صورت میں حاصل کرلیا گیا۔ بعد میں اسے ہین فورڈ سائٹ واشنگٹن منتقل کردیا گیا تاکہ اس ری ایکٹر کو دریائے کولمبیا کے پانی سے سرد رکھا جاسکے۔

ایک طرف بم گریڈ دھات کے حصول کی کوششیں عروج پر تھیں تو دوسری طرف اس دھات کو قابل استعمال بم کے ڈیزائن کے لیے بھی بڑے پیمانے پر کام جاری تھا۔ اس سلسلے میں رابرٹ اوپن ہائمر اور اس کی ٹیم نے تین طریقے واضح کرلیے تھے۔ پہلا طریقہ یورینیم گن کا تھا۔

پلوٹونیم گن میں تقریباً یہی طریقہ استعمال کیا گیا بس فرق مقدار کا تھا۔ تیسرا طریقہ پلوٹونیم پر نیوٹرون کی بمباری کا تھا۔ مگر یہ طریقہ جو پلوٹونیم امپلیشن کہلایا اپنی پیچیدگی اور حساسیت کی وجہ سے استعمال نہیں کیا گیا اس میں خطرہ تھا کہ کسی وجہ سے گن چل جائے تو بم پھٹ سکتا ہے۔ تباہی پھیلانے کے لیے پلوٹونیم کی مخصوص مقدار درکار ہوتی ہے اور یہ حساس ہوتی ہے۔ مگر یہ قابل عمل طریقے بھی آسان نہیں تھے۔ اس میں بے شمار تکنیکی پیچیدگیاں اور رکاوٹیں تھیں جن کی وجہ سے 1945ء کے آغاز میں بھی مین ہٹن پروجیکٹ ایک حتمی بم کی تیاری سے کوسوں دور تھا۔

اس دوران میں یورپ کی حد تک جنگ عظیم اپنے آخری مراحل میں داخل ہوگئی تھی۔ نازی جرمنی تیزی سے پسپا ہورہا تھا۔ ایک طرف سے امریکا اور اس کے اتحادی آگے بڑھ رہے تھے تو دوسری طرف سوویت یونین کی فوج مشرقی جرمنی کو فتح کرتی ہوئی جرمنی کی حدود میں داخل ہوچکی تھی۔ امریکا اور اس کے اتحادیوں کو خطرہ لاحق ہوگیا تھا کہ روسی کہیں جرمنوں کی ایٹم بم کی تیاری کی کوششوں کا ثمر حاصل کرلیں اس لیے میجر جنرل گروو کو فوری طور پر ایک اسپیشل یونٹ کے ساتھ یورپ روانہ کیا گیا تاکہ وہ روسیوں سے پہلے جرمن سائنس دانوں اور ان کے ایٹمی تجربات کے ثمر کو ہتھیا سکیں۔ گروو کی ٹیم نے اپنا کام تن دہی سے کیا اور مقبوضہ جرمنی سے ہزاروں سائنسدانوں کو سمیٹ کر امریکا پہنچادیا گیا۔ اسی طرح ملنے والی لیب کے سامان اور ڈاکومنٹس کو بھی امریکا کی مدد سے امریکا بھیجا گیا۔

لیکن افواہوں اور جاسوسی رپورٹس کے برعکس جرمن ایٹم بم کا کوئی نام ونشان نہیں ملا۔ ایک ایٹمی پروگرام جرمن

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سائنسداں ورنر ہیسن برگ کی سرکردگی میں ضرور کام کر رہا تھا لیکن جرمن حکومت نے اس کے لیے ضروری وسائل مہیا نہیں کیے تھے اس لیے جرمن ایٹم بم کہیں موجود نہیں تھا۔ حد یہ کہ اس کے لیے کوئی ری ایکٹر یا یورینیم صاف کرنے کا پلانٹ بھی نہیں لگایا گیا تھا۔ اس سے بھی بڑھ کر جرمنی میں کہیں یورینیم یا دیگر دھاتوں کے اتنے ذخائر نہیں تھے جو ایٹمی تحقیق یا ایٹم بم کی تیاری کے لیے کافی ہوں۔ اس کی بنیادی وجہ وہی ہے جو اس مضمون میں پہلے بھی بیان کر چکے ہیں کہ اس وقت ایٹم بم کی تیاری بالکل نامعلوم چیز کو وجود میں لانے کے مترادف تھی۔ پھر اس کے لیے بہت بڑی رقم اور بہت بڑا انفرا اسٹرکچر درکار تھا۔ لاکھوں کی افرادی قوت چاہیے تھی۔ جرمنی کے وسائل جنگ میں خرچ ہو چکے تھے اور اس کی مالی اور افرادی حالت اسے ایٹمی پروگرام چلانے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔

اس کے باوجود یہودیوں کے زیر اثر تاریخ دانوں کا ایک حلقہ دعویٰ کرتا ہے کہ جرمن ایٹم بم بنانے کے بہت قریب تھے۔ مارچ 1945ء میں جب جرمن جنگ ہار چکے تھے تو ایک جرمن ماہر طبیعیات کرٹ ڈیبنر نے ماہرین کی ایک ٹیم تشکیل دی تا کہ ایک قابل عمل ایٹمی ڈیوائس تیار کی جا سکے اور اس کے خام مواد ہیگر لوچ کی ایک زیر زمین ری ایکٹر تیار کیا جا رہا تھا لیکن اس دوران میں جنگ ختم ہو گئی۔ اس کہانی کا کوئی ثبوت سامنے نہیں آیا نہ تو ایسے کسی پروجیکٹ کا پتا چلا اور نہ ہی ہیگر لوچ میں کسی زیر زمین ری ایکٹر کا سراغ ملا۔ اس کے باوجود جرمنوں کو بدنام کرنے کے لیے یہ کہانی بہت زور و شور سے نہ صرف پریس اور میڈیا کے ذریعے پھیلائی گئی بلکہ اس پر کئی ڈاکومینٹریز اور فلمیں بھی بنیں۔ درحقیقت نازی جرمنی کے حکمران کبھی ایٹم بم بنانے میں سنجیدہ نہیں ہوئے تھے ورنہ ان کے لیے یہ کام ناممکن نہیں تھا۔

امریکا میں حالات صدر فرینکلن ڈی روز ویلٹ کی اچانک موت سے بدل گئے اور اقتدار نائب صدر ہنری ٹرومین کے ہاتھ میں آ گیا۔ اسے دنیا اور جاپان کی بدقسمتی ہی کہا جا سکتا ہے کہ ٹرومین بیٹھے بٹھائے ایک ایسے خوفناک ہتھیار کے استعمال کا مجاز بن گیا جس کے بارے میں اسے پتا بھی نہیں تھا۔ اس نے میجر جنرل گروو سے پہلا سوال یہی کیا تھا۔ ”یہ ہتھیار کتنے دن میں استعمال کے لیے تیار ہو سکتا ہے؟“

”تین سے چار ہفتے میں۔“ گروو نے جواب دیا۔

”اسے جلد از جلد مکمل کیا جائے اور کوشش کی جائے کہ جرمنی برلن سے پہلے اس کو ٹیسٹ کر لیا جائے۔“ ٹرومین

ملاقات

زندگی کے گمشدہ رستوں اور دل کے ٹوٹے رشتوں میں الجھی داستان.....
آخری صفحات پر **ڈاکٹر ساجد امجد** کی ایک نرالی کہانی

لاوارث وارث

تاریخ کے جھروکوں سے بدلتے حالات و واقعات کی دلچسپ
ترتیب..... **الیاس سیتاپوری** کے قلم کی دلکشی

ستاروں پر کمند

پہاڑ کی چوٹیوں کو سر کرنے والے ایک دلاور کی شجاعت و استقامت کا انوکھا
انداز..... **طاہر جاوید مغل** کے قلم سے مسافر کا آخری پڑاؤ

ماروی

ایک انار..... دو بیمار..... دل کی مدھر دھڑکنوں کے ساتھ ساتھ رقص
اجل کا تماشا..... **محی الدین نواب** کے خیالات کی پرواز

کاشف زبیر، منظر امام، سلیم انور، امجد رئیس، تنویر ریاض
ڈاکٹر شیر شاہ سید اور غلام قادر کی انوکھی کہانیاں آپ کی منتظر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے حکم جاری کیا۔ مگر اسے علم نہیں تھا کہ لاس آلموس میں ایٹم بم کی تیاری میں کیا مشکلات درپیش تھیں۔ ابھی تک ایک بھی ذریعہ ایسا منتخب نہیں کیا جا سکا تھا۔ بالآخر فیصلہ ہوا کہ کم سے کم ایٹم بم کا تجربہ ضرور کرلیا جائے۔ اس مقصد کے لیے نیو میکسیکو کے صحرا المو گورڈو میں ایک ویران جگہ کو منتخب کیا گیا جہاں کبھی ایک فوجی کیمپ ہوا کرتا تھا لیکن اب وہ ویران پڑا تھا۔ دھماکے کے لیے پلوٹونیم امپلوژن کا طریقہ چنا گیا حالانکہ پہلے بم بنانے کے لیے اسے مسترد کر دیا تھا لیکن ٹرنٹی ٹیسٹ کے لیے یہ طریقہ بہترین تھا۔ اس دھماکے کی طاقت انیس کلوٹن تھی۔ انسانی تاریخ میں آج تک اتنا تباہ کن اور طاقتور دھماکا نہیں ہوا تھا۔ سائنسدانوں اور فوجی ماہرین کی ایک ٹیم اس تجربے کا مشاہدہ کرنے کے لیے موجود تھی۔ جیسے ہی ڈیوائس کا ٹریگر دبایا گیا آگ کی ایک خوفناک گیند نمودار ہوئی جو اوپر جاتے ہوئے پھیل رہی تھی۔ دھماکے کی لہر چند سیکنڈ بعد ہی پانچ کلومیٹر دور نگران گاہ سے ٹکرائی اور اس نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ بہت ہی خوفناک منظر تھا لیکن وہاں موجود لوگ خوش تھے کہ ان کے ہاتھ ایک بھیانک ہتھیار آ گیا تھا۔

تجربے کی کامیابی کی خبر فوری طور پر صدر ہنری ٹرومین تک پہنچائی گئی اور اس نے چند دن بعد برلن کے پاس اتحادی سربراہ کانفرنس میں سوویت صدر اسٹالن اور دوسرے سربراہوں سے کہا کہ امریکا نے انسانی تاریخ کا سب سے خطرناک ہتھیار تیار کرلیا ہے۔ ٹرومین برتری کے مرض میں مبتلا ایک نفسیاتی مریض تھا اور اس نے امریکا واپسی سے پہلے ہی اس ہتھیار کو جنگ میں استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ یورپ کی حد تک جنگ ختم ہو گئی تھی لیکن ایشیا میں جاپان بدستور امریکا کے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔ امریکی فوج اور انتظامیہ بھی ایٹم بم کے استعمال کے حق میں تھی۔ اس لیے ٹرومین کو کسی خاص مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ البتہ لوگوں کی رائے تین حصوں میں تقسیم تھی۔ ایک گروہ کی رائے یہ تھی کہ جاپان کے غیر آباد حصے میں بم گرا کر انہیں دہشت زدہ کر دیا جائے۔ دوسرے گروہ کی رائے تھی کہ کسی بڑی فوجی تنصیب پر حملہ کیا جائے لیکن امریکی انتظامیہ کے سب سے طاقتور گروہ کی رائے یہ تھی کہ حملہ کسی بڑے آباد شہر پر کیا جائے۔ بدقسمتی سے ٹرومین بھی اسی گروہ کا حامی تھا۔ اس کے خیال میں شہر پر حملہ جاپان کو بہت جلدی ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دے گا ورنہ جزیرے پر قبضے کے لیے امریکا کو بہت ساری جانوں کی قربانی دینا پڑے گی۔ ٹرومین کے لیے یہ فیصلہ آسان تھا کہ جنگ جاپانیوں کی جانوں کی قیمت پر ختم کی جائے۔

شہر کا فیصلہ ہوتے ہی سب سے پہلا انتخاب وار انگوست ٹوکیو تھا۔ لیکن پھر ٹوکیو کو چھوڑنے کا فیصلہ ہوا کہ کہیں اس کی تباہی جاپانی قوم کو مزید مزاحمت پر نہ اکسا دے۔ دوسرے شہر ہیروشیما، کیوٹو، یوکوہاما اور کوکورا تھے۔ اس فہرست میں بدنصیب ناگاساکی شامل نہیں تھا مگر موسم کی خرابی نے کیوٹو کی بجائے ناگاساکی کو نشانہ بنوا دیا۔ المو گورڈو کے تجربے نے مین ہٹن پروجیکٹ کو تیزی سے آگے بڑھایا اور جلد دو عدد ایٹم بم تیار ہو گئے۔ پہلا "لٹل بوائے" تھا یعنی یورینیم سے تیار کیا ہوا ایٹم بم تھا۔ اسے 6 اگست 1945ء کے دن ہیروشیما پر گرا دیا گیا۔ تقریباً ڈیڑھ لاکھ آبادی کا شہر آناً فاناً برباد ہو گیا۔ تین منٹ بعد پلوٹونیم سے تیار کیا ہوا "فیٹ مین" نامی ایٹم بم ناگاساکی پر گرا دیا گیا۔ ان دونوں بموں نے لاکھوں افراد کو فی الفور موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔ فوری مرنے والے جلنے اور دھماکے کی وجہ سے مارے گئے جب کہ بعد میں تابکاری کا شکار ہونے والے لاکھوں افراد سسک سسک کر مرے۔ ان دو بموں نے پورے جاپان میں خوف کی لہر دوڑا دی اور پھر ٹرومین نے دھمکی دی کہ اگر جاپان نے فوری ہتھیار نہ ڈالے تو ایک ایک کر کے اس کے سارے شہر اسی طرح تباہ کر دیے جائیں گے۔ ناگاساکی حملے کے ایک ہفتے بعد جاپان نے ہتھیار ڈال دیے۔

لیکن ٹرومین کی دھمکی صرف دھمکی تھی کیونکہ اب امریکا کے پاس صرف ایک عدد یورینیم کا ایٹم بم بچا تھا اور اسے مزید ایٹم بم تیار کرنے میں مزید کئی مہینے درکار ہوتے۔ امریکی جاپان پر قابض ہو گئے اور انہوں نے باقی دنیا سے اسے کاٹ دیا اس لیے دنیا کو صحیح معنوں میں پتا ہی نہیں چل سکا کہ ایٹم بم نے کیا تباہ کاری مچائی تھی۔ جو لوگ تابکاری سے شدید متاثر تھے وہ تو چند ہفتوں میں سسک سسک کر مر گئے اور جو اس سے کم درجے متاثر ہوئے تھے ان میں سے بیشتر بعد میں کینسر کے مرض سے زندگی ہار گئے۔ ان خبروں کو نہایت مہارت سے چھپایا گیا خود امریکی پریس کو بھی اجازت نہیں تھی کہ وہ ہیروشیما اور ناگاساکی کے بارے میں آزادانہ خبریں چھاپ سکیں۔ اس لیے حقائق باہر آنے میں بہت عرصہ گزر گیا تھا۔

جنگِ عظیم دوم کے فوراً بعد سوویت یونین مغرب اور خاص طور سے امریکا کا حریف بن کر سامنے آیا۔ اگر امریکا نے مغربی یورپ کو نازیوں سے آزاد کرایا تھا تو سوویت یونین نے مشرقی یورپ کو اپنے چنگل میں لے لیا۔ اپنے دستِ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دو عریض رہے۔ سائنسی ہتھیاروں میں ترقی اور ایک مخالف نظریے نے سوویت یونین کو امریکا کا حریف بنا دیا اور دونوں میں سرد جنگ شروع ہو گئی۔ اسے گرم جنگ میں کوریا نے تبدیل کیا جہاں دونوں ممالک حریف بن کر سامنے آئے۔ اسی سال سوویت یونین نے اپنے پہلے ایٹم بم کا تجربہ کر لیا۔ امریکی خوش فہمیوں کے برعکس سوویت یونین مین ہٹن پروجیکٹ سے واقف تھا اور اسے یہ بھی علم تھا کہ وہاں کیا ہو رہا ہے کیونکہ کئی رضاکار جاسوس وہاں کام کر رہے تھے اور وہ سوویت یونین کو مسلسل معلومات فراہم کر رہے تھے ایک اعلیٰ درجے کا جاسوس جس کا کوڈ نیم اینورموز تھا۔ اس نے سوویت یونین کو بیش بہا معلومات فراہم کیں۔

اینورموز کی فراہم کردہ معلومات کا سوویت ایٹمی پروگرام کا انچارج سائنسداں آئیگور کرشاتوف باریک بینی سے جائزہ لے رہا تھا اور اس کی روشنی میں روسی بم کے پروگرام کو آگے بڑھا رہا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ برلن سمٹ میں جب ٹرومین نے اسٹالن کو اپنے طاقتور بم کے بارے میں بتایا تو اس نے کوئی توجہ نہیں دی تھی اور ٹرومین کو جھٹکا لگا تھا۔ اسٹالن پہلے ہی اس بم کی تیاری سے واقف تھا۔ امریکیوں کی بدقسمتی کہ مین ہٹن پروجیکٹ میں سوویت یونین کے تمام جاسوس رضاکار اور مقامی تھے ان میں سے ایک بھی روسی نژاد شخص نہیں تھا اس لیے ان پر شک کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اپنی حیثیت سے فائدہ اٹھا کر انہوں نے تقریباً تمام ہی خفیہ معلومات روس تک پہنچا دی تھیں۔ ان میں سب سے اہم ایک جرمن نژاد سائنسداں کلاؤس فیوکس تھا وہ جرمنی سے ہجرت کر کے برطانیہ میں آباد ہوا اور وہیں اس نے ایٹمی پروگرام میں شرکت کی جب مین ہٹن پروجیکٹ شروع ہوا تو وہ برطانیہ کی طرف سے اس کے اہم سائنس دانوں میں شامل ہو گیا تھا۔ اس کی رسائی تمام خفیہ معلومات تک تھی۔

فیوکس شروع سے سوشلسٹ نظریے کا حامی تھا اور اسی بنا پر وہ جرمنی کی شہریت ترک کر کے برطانیہ آ گیا تھا کیونکہ جرمن نازی سوشلسٹوں سے شدید نفرت کرتے تھے اور ان کا اولین نشانہ سوشلسٹ ہی تھے۔ لاس آلموس میں فیوکس اس گروپ کے ساتھ تھا جو امپلوژن ہتھیار پر کام کر رہی تھی۔ وہ اولین ایٹمی دھماکے کے تجربے میں بھی شامل رہا اور اس نے تمام معلومات سوویت یونین کو فراہم کر دی تھیں۔ دوسرے کئی جاسوس بھی اہم جگہوں پر کام کر رہے تھے جیسے تھیوڈور ہال اور ڈیوڈ گرین گلاس۔ یہ ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے اور سب اپنی اپنی جگہ معلومات فراہم کر رہے تھے۔ یوں روسیوں کو معلومات کے موازنے کا موقع بھی مل رہا تھا۔

جنگ میں مصروف روسی صرف معلومات جمع کر رہے تھے اور اپنے ایٹمی پروگرام کی بیس تیار کر رہے تھے کیونکہ جنگ کی وجہ سے ان کے بیشتر وسائل اس کے لیے مخصوص تھے۔ جس وقت مین ہٹن پروجیکٹ جاری تھا تو یہ سوال بھی سامنے آیا کہ اس خطرناک ہتھیار کو کون کنٹرول کرے گا اس پر کام کرنے والے بیشتر سائنسداں ایک بین الاقوامی ادارے کے حامی تھے جو ایٹمی ہتھیاروں کو کنٹرول کرے اور اس کام میں تمام سپر پاورز شامل ہوں مگر سوویت یونین کی اس معاملے سے بے اعتنائی نے امریکا کو موقع فراہم کیا کہ اس نے مین ہٹن پروجیکٹ مکمل طور پر اپنے قبضے میں کر کے ایک طرح کی ایٹمی اجارہ داری قائم کر لی۔ امریکا نے برطانیہ کو جو افرادی قوت کے لحاظ سے برابر کا شریک تھا بھیک کی طرح ایٹمی ٹیکنالوجی فراہم کی اور کینیڈا کو دودھ سے مکھی کی طرح نکال کر پھینک دیا حالانکہ کینیڈا ایک سرگرم شراکت دار تھا اور اس نے اپنی زمین پر پروجیکٹ کے لیے بہت ساری سائنس مہیا کی تھیں۔ فرانس نے بھی بعد میں ایٹمی ٹیکنالوجی حاصل کر لی لیکن کینیڈا اس سے محروم ہی رہا۔ اس سویلین مقاصد کے لیے کینیڈا نے خود ایٹمی ٹیکنالوجی وضع کی۔ کراچی کے قریب کینپ میں کام کرنے والا ایٹمی ری ایکٹر کینیڈا نے ہی مہیا کیا تھا۔ یہ اعلیٰ درجے کا ری ایکٹر آج بھی کام کر رہا ہے اور اس کا شمار دنیا کے قدیم ترین دو تین ری ایکٹرز میں ہوتا ہے کیونکہ اسے کام کرتے ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا وقت ہو چکا ہے۔ اسی طرح آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ بھی بم سے محروم رہے۔

نئی قائم ہونے والی اقوام متحدہ میں ایٹمی ہتھیاروں کے بین الاقوامی کنٹرول کی ایک نیم دلانہ کوشش کی گئی۔ جب بروچ پلان کے تحت امریکا اور روس کو راضی کرنے کی کوشش کی گئی کہ ایٹمی ہتھیار بین الاقوامی کنٹرول میں دے دیے جائیں۔ روس نے اس کے حق میں ووٹ دیا کہ اس طرح اسے ایٹمی ہتھیاروں تک رسائی کا موقع مل رہا تھا لیکن امریکا نے دم سادھ لیا یوں یہ پلان اپنی موت آپ مر گیا۔ سوویت یونین نے جنگ کے فوراً بعد اپنی ساری توجہ اور قوت اپنا ایٹم بم تیار کرنے پر لگا دی تھی مگر مسئلہ یورینیم کا تھا۔ دنیا میں واحد معلوم ذخائر کانگو میں تھے اور ان پر امریکا کا قبضہ تھا وہ یہاں سے کسی کو یورینیم دینے کو تیار نہیں تھا مگر خوش قسمتی سے چیکوسلواکیہ پر روس کا قبضہ تھا اور یہاں یورینیم کے ذخائر موجود تھے۔ روسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے ان کی تلاش شروع کی اور جلد اسے مطلوبہ مقدار میں یورینیم مل گئی۔ بعد میں سوویت یونین میں بھی یورینیم نکل آئی اور یہ ذخائر اس کی ضرورت سے بھی زیادہ تھے۔

ناگاساکی پر حملے کے دو دن بعد امریکی حکومت نے مین ہٹن پروجیکٹ کی ایک سرکاری رپورٹ جاری کی جس کا ڈرافٹ پرنسٹن یونیورسٹی کے ماہر طبیعات ہنری ڈی وولف اسمائتھ نے لکھا اس لیے یہ اسمائتھ رپورٹ کہلاتی ہے اس رپورٹ میں امریکی حکومت نے ٹیکس دہندگان کو مطمئن کرنے کی کوشش کی کہ ان کا دیا ہوا ٹیکس ہرگز بے جا نہیں ضرورت کی بنا پر اس پروجیکٹ میں استعمال کیا گیا اور اس کا کوئی حساب کتاب بھی کانگریس پارلیمنٹ میں پیش نہیں کیا گیا تھا۔ روسیوں نے اس رپورٹ کا تفصیلی جائزہ لیا اور خاص طور سے اس بات کا امریکیوں نے اوک رج اور ہن فورڈ کے شہروں کو بھی نقشے سے نکال دیا تھا اور ایک عشرے تک پرنٹ ہونے والے نقشوں میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہوتا تھا۔ کے جی بی کی پیش رو ایجنسی این کے وی ڈی کے سربراہ لیورینٹی بیریا نے اس رپورٹ کی بنیاد پر حکومت کو تجویز دی کہ وہ بھی ایٹمی سائنس ریسرچ اور دراز اور نامعلوم مقام پر رکھے اور نقشوں میں ان کا کوئی ذکر نہیں ہونا چاہیے۔ بیریا روس کے ایٹمی پروگرام کا انچارج بھی تھا۔

روس کا لاس آلموس ارزماس سولہ تھا۔ یہاں ماہر طبیعات یولی خاریٹون کی قیادت میں روس کا ایٹمی پروگرام جاری تھا۔ بیریا سائنسدانوں پر اعتماد نہیں کرتا تھا وہ ان کی کڑی نگرانی کراتا تھا اور اس کی بہت سادہ وجہ تھی خود سوویت یونین نے ایٹم بم کے بارے میں معلومات مین ہٹن پراجیکٹ میں کام کرنے والے سائنسدانوں سے حاصل کی تھیں۔ بیریا جسے اس پروگرام کا سربراہ مقرر کیا گیا تھا اس نے ایک ہی کام کے لیے سائنسدانوں کی کئی ٹیمیں تیار کیں اور ان کو ایک دوسرے کا پتا نہیں تھا۔ جب وہ مختلف نتائج نکالتے تو بیریا انہیں پہلی بار ایک جگہ جمع کرتا اور انہیں آمادہ کرتا کہ اپنے کام کا تقابل کریں۔ ساتھ ہی وہ مین ہٹن پروجیکٹ سے حاصل شدہ معلومات کو اپنے سائنسدانوں کی کارکردگی جانچنے کے لیے استعمال کرتا تھا اسے پتا چلتا کہ اس کے ماہرین ٹھیک راستے پر ٹھیک رفتار سے گامزن ہیں یا نہیں۔

بیریا نے ایک عقل مندی کا ثبوت اور دیا اس نے اپنے سائنسدانوں کو ایٹم بم کے مختلف ڈیزائنوں میں الجھانے کی بجائے انہیں اس ایٹم بم کے ڈیزائن پر کام کرنے کا حکم دیا جو امریکا نے ناگاساکی پر گرایا تھا اور اسے فیٹ مین کا نام دیا گیا تھا۔ یہ کارکردگی اور رفتار کاری میں نہایت موثر رہا تھا حالانکہ اس میں پلوٹونیم کی مقدار کم تھی۔ تاہم اس وقت جب سوویت ایٹمی پروگرام نہایت کامیابی اور خاموشی سے روس کے طول و عرض میں جاری تھا اس وقت امریکی بزعم خود ایٹمی میدان میں اپنے کسی بھی حریف یعنی سوویت یونین سے کوسوں آگے تھے۔ وہ اتنے بے خبر تھے کہ جب 29 اگست 1949ء کو روس نے اپنے اولین ایٹم بم کا تجربہ کیا تو امریکی انگشت بدنداں رہ گئے تھے۔ انہیں اس وقت بھی یقین نہیں آیا جب قازقستان میں ہونے والے اس تجربے کی تصاویر جاری کی گئیں۔

یہ ایٹمی ہتھیاروں کے معاملے امریکی اجارہ داری کا ایک فطری نتیجہ تھا جس وقت امریکی ایٹم بم کے لیے بین الاقوامی کنٹرول کی تجویز مسترد کر رہے تھے تب ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ بہت جلد دنیا میں ایٹمی ہتھیاروں کی نہ ختم ہونے والی دوڑ شروع ہو جائے گی لیکن اب وقت ان کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ اس وقت امریکا میں کے جی بی اپنا نیٹ ورک وسیع کر رہی تھی اور سوویت یونین کے زوال کے بعد جو دستاویزات منظر عام پر آئیں ان سے ظاہر ہوتا تھا کہ بہت سارے روسی جاسوس بھی سامنے نہیں آئے حد یہ کہ امریکی ان کا سایا بھی نہیں دیکھ سکے تھے۔ وہ ہر جگہ تھے اور سوویت یونین کو معلومات فراہم کر رہے تھے جب صدر ہنری ٹرومین نے روسی ایٹم بم کے دھماکے کے صدمے سے سنبھل کر ایک کریش پروگرام کا اعلان کیا جس کی مدد سے ایٹم بم سے کہیں زیادہ طاقتور ہائیڈروجن بم بنانا تھا تو روسی اس سے واقف تھے۔

ہائیڈروجن بم کوئی نئی چیز نہیں تھی بلکہ بہت پہلے جب رابرٹ اوپن ہائمر ایٹم بم کو ڈیزائن کر رہا تھا تو اس وقت کیلیفورنیا کی برکلے یونیورسٹی میں ہنگرین نژاد امریکی سائنسدان ایڈورڈ ٹیلر انرکو فرمی کے نظریے کے مطابق ایک سپر بم کے ڈیزائن پر کام کر رہا تھا۔

ہائیڈروجن بم ایٹم بم کی نسبت کتنا زیادہ طاقتور ہوتا ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ بڑے سے بڑا ایٹم بم سو کلوٹن سے زیادہ طاقت کا دھماکا نہیں کر سکتا ہے جب کہ ہائیڈروجن بم کم سے کم بھی دس میگاٹن کا دھماکا کرتا ہے۔ ایک میگا میں ایک ہزار کلو ہوتے ہیں۔ روس نے بعد میں ایک ایسے ہائیڈروجن بم کا تجربہ کیا جس کی طاقت پچاس میگاٹن تھی۔ اگر اسے نیویارک شہر پر پھینکا جاتا تو پورا شہر آن واحد میں بھاپ بن کر غائب ہو جاتا اور تقریباً چالیس فیصد امریکا ایک ہفتے سے بھی پہلے اس کی تابکاری کی نذر ہو جاتا۔ یہی وجہ تھی کہ مین

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جن پروجیکٹ کے اکثر سائنسداں اس کے سخت مخالف تھے ان کا کہنا تھا کہ ایٹم بم جنگی ہتھیار ہے اس سے جنگ لڑی اور جیتی جا سکتی ہے اگرچہ یہ بھی بہت تباہی پھیلاتا ہے۔ مگر ہائیڈروجن بم تو سراسر تباہی تھا اور اس سے سوائے انسانوں کی نسل کشی کے اور کوئی کام نہیں لیا جا سکتا ہے۔ ایٹم بم کی نسبت اس کی تباہ کاری لامحدود ہے کیونکہ نہایت تابکار اسٹرونشیم پیدا کرتا ہے اور یہ مادہ نہایت بلندی پر جا کر بادلوں اور ہواؤں کی مدد سے براعظموں تک پھیل سکتا ہے یہ ہوا پانی اور خوراک کو متاثر کرتا ہے اور بالآخر انسانوں کی ہڈیوں میں پہنچ کر ان کے خون بنانے والے سیلز کو تباہ کر دیتا ہے۔

جب تمام سائنسداں ایک آواز ہو کر ہائیڈروجن بم کی مخالفت کر رہے تھے تو صرف ایڈورڈ ٹیلر اس پر کام کر رہا تھا۔ اس کے ساتھ ارنسٹ لارنس اور لوئیس الورز اس منصوبے کی حمایت کر رہے تھے ان کا کہنا تھا کہ سوویت یونین لازمی ہائیڈروجن بم بنائے گا اس لیے امریکی عوام کے تحفظ کے لیے امریکا کو بھی اس ہتھیار سے لیس ہونا چاہیے۔ اوپن ہائمر جو جنرل ایڈوائزری کمیٹی کا سربراہ بن گیا اس نے ہائیڈروجن بم کی مخالفت کرتے ہوئے دلائل پیش کیے کہ ہائیڈروجن بم جیسے وسیع پیمانے پر تباہی اور دہشت پھیلانے والے ہتھیاروں کے مقابلے میں کم طاقت کے اسمارٹ ایٹم بم امریکی فوج کے لیے زیادہ کارگر ہتھیار ہوں گے جو عام لوگوں کو نقصان پہنچائے بغیر صرف مخالف فوج یا مخصوص ٹارگٹس کو تباہ کر سکیں گے۔ اس کے مقابلے ہائیڈروجن بم صرف اس وقت کام آتا جب آپ جنگ ہار چکے ہوتے تھے اور اپنے ساتھ دشمن کو بھی ختم کرنا چاہتے ہوں۔ ایٹم بم کا خالق اس کی تباہ کاری دیکھ کر اب دل سے اس کا مخالف بن گیا تھا اس نے جذباتی انداز میں کہا۔ ''ہائیڈروجن بم آپ کو جنگ نہیں جتوا سکتا یہ صرف انسانوں کو مار سکتا ہے۔''

مگر دوسری طرف ایڈورڈ ٹیلر اور اس کی لابی کام کر رہی تھی اور ہنری ٹرومین جیسے جنگ پسند صدر کی موجودگی سے انہوں نے فائدہ اٹھایا اور امریکا کے اولین ہائیڈروجن بم کا پروگرام منظور کروا لیا۔ اس مقصد کے لیے لاس آلموس میں ایک تجرباتی ونگ تشکیل دیا گیا کیونکہ اب تک ہائیڈروجن بم صرف تھیوری کی صورت میں موجود تھا اور یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ بنایا کیسے جائے گا۔ مگر یہ ایٹم بم بنانے کی نسبت مشکل کام نہیں تھا اول تو فیوژن کا ایندھن یعنی ہائیڈروجن کی ہم جنس ڈیوٹیریم یا ٹیریم حاصل کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا اور یہی بم کے مواد کا کام کرتے۔ بالآخر پہلے تجرباتی ہائیڈروجن بم کا ڈیزائن تیار ہوا اور اس کے لیے بحرالکاہل کے وسط میں آسٹریلیا اور انڈونیشیا سے یکساں فاصلے پر موجود مارشل آئی لینڈز کے ایک جزیرے ایلوگیلیب جزیرے کو چنا گیا یہ اینیوٹاک نامی غیر آباد مجموعہ جزائر میں واقع ہے اور کسی بھی ملک سے اس کا فاصلہ دو ہزار میل سے کم ہے۔

ایلوگیلیب کے جزیرے کا رقبہ ایک کلومیٹرز سے زیادہ تھا اور اس کی سطح سمندر سے بلندی ایک سو پچاس میٹرز تھی بالکل غائب ہو گیا۔ زیر آب ایک سو ساٹھ فٹ کی گہرائی میں ایک گڑھا باقی رہ گیا جس کا قطر تقریباً دو کلومیٹرز تھا۔ اس کامیابی کی خبر فوری وائٹ ہاؤس پہنچائی گئی لیکن ٹرومین نے فی الحال اسے میڈیا پر جاری نہ کرنے کا فیصلہ کیا ان دنوں اس کی صدارتی مہم جاری تھی اور اسے خدشہ تھا کہ اس خبر سے یہ مہم متاثر نہ ہو۔ اس کا اعلان 7 جنوری 1953ء کو کیا گیا۔ جب سابق سوویت یونین نے اس خبر کا کوئی خاص نوٹس نہیں لیا کیونکہ اس کا ہائیڈروجن بم کا پروگرام تقریباً تکمیل کے قریب تھا اور اب اسے ایک اخلاقی بہانہ ہاتھ آ گیا تھا کہ اسے امریکا سے خطرہ ہے اور وہ ہائیڈروجن بم کا تجربہ کرنے میں حق بجانب ہے۔ یہ درست ہے کہ امریکا ہائیڈروجن بم نہ بناتا تب بھی سوویت یونین اسے لازمی بناتا۔

صرف ساڑھے نو مہینے بعد سوویت یونین نے نوجوان سائنسداں آندرے سخاروف کے ڈیزائن کیے ہوئے ہائیڈروجن بم کا تجربہ کر لیا۔ یہ تجربہ امریکا کے برعکس قازقستان میں اور آبادیوں کے پاس ہی کیا گیا تھا۔ سوویت یونین نے اپنے تمام ایٹمی تجربات جن میں دنیا کا سب سے بڑا کھلی فضا میں ایٹمی تجربہ بھی شامل ہے قازقستان میں ہی کیے ان تجربات نے کم سے کم پچاس لاکھ افراد کی جان لی یا ان کو جان لیوا بیماریوں میں مبتلا کر دیا۔

بہرحال اس وقت روسی تجربے نے امریکیوں کے ہاتھ پاؤں ایک بار پھر پھلا دیے کیونکہ وہ ابھی ہائیڈروجن کے تجربے کی کامیابی پر ٹھیک سے فارغ بھی نہیں ہوئے تھے کہ روس نے جواب دے دیا اور جواب بھی کیسا اس نے پہلے ہی ڈلیوری کے قابل ہائیڈروجن بم تیار کر لیا تھا اور پھر اس کا تجربہ کیا۔ مغربی میڈیا نے اسے جو ٹرو کا نام دیا کیونکہ سوویت یونین نے اس کی کوئی تفصیل نہیں بتائی تھی سوائے اس کے کہ اس نے اولین ہائیڈروجن بم کا کامیاب تجربہ کر لیا ہے۔ یعنی روس کے پاس پہلا ان کا ہتھیار آ گیا تھا جب کہ امریکا کے پاس ابھی یہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مشکل سوکھوئی کا ہتھیار استعمال والی شکل میں موجود تھا۔ طاقت کا توازن واضح طور پر سوویت یونین کے حق میں جھک گیا تھا۔

اس پر امریکا میں ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا وہ تمام سائنسدان اور ماہرین جنہوں نے ہائیڈروجن بم کی مخالفت کی تھی اچانک مجرم کی حیثیت سے کٹہرے میں آ گئے۔ اوپن ایٹم بم کے معمار رابرٹ اوپن ہائمر کو سیکیورٹی کلیرینس دینے سے انکار کر دیا گیا اور اس پر الزام لگایا کہ وہ تمیں کی دہائی سے بائیں بازو کے لوگوں کے ساتھ ہے۔ ایسے میں صرف ایڈورڈ ٹیلر جیسے لوگوں کی بن آئی تھی جو آغاز سے ہائیڈروجن بم کو ایک ہتھیار کے طور پر بنانے، رکھنے اور استعمال کرنے کے حامی تھے۔ بڑی دشواری اور محنت کے بعد امریکی بالآخر اپنا اولین ڈلیوری کے قابل ہائیڈروجن بم بنانے میں کامیاب رہے۔ اپنے پہلے تجربے کی طرح انہوں نے اس بار بھی مارشل آئی لینڈ کا انتخاب کیا۔ یہ جزائر اس صدی کے آغاز سے امریکی قبضے میں تھے۔ یہاں ہزاروں سال سے قدیم باشندے آباد تھے۔ ان معصوم لوگوں کو علم ہی نہیں تھا کہ ان پر کیا قیامت ٹوٹنے والی ہے۔

اس بم کو ''شریمپ'' کا کوڈ نیم دیا گیا تھا۔ آپریشن کیسل براوو کے تحت جزیرہ بکینی پر اس بم کو فضا سے پھینکا گیا۔ اس بم نے پندرہ میگاٹن کا دھماکا کیا جو اندازے سے تین گنا زیادہ تھا۔ پھر جو موسم تجربے کے لیے چنا گیا وہ نہایت خراب تھا۔ نتیجے میں یہ تجربہ امریکی تاریخ کا سب سے بڑا تابکار حادثہ ثابت ہوا۔ تیز ہواؤں اور طاقت میں اندازے کی غلطی نے آناً فاناً تابکار راکھ کو سات ہزار مربع میل کے علاقے میں پھیلا دیا۔ اس نے نزدیکی جزیرے پر آباد قدیم باشندوں کو متاثر کیا اور ساتھ ہی اس علاقے میں ماہی گیری کرتے ایک جاپانی بحری جہاز کے عملے کو بھی متاثر کر دیا۔ راکھ باریک برف کی طرح گرتی رہی اور اس نے ہر ایک کو جلا دیا اور جو ویسے بچ گئے وہ تابکاری سے متاثر ہوئے۔ ... پر موجود تمام امریکی بچ گئے کیونکہ انہوں نے ... سے حفاظتی انتظامات کر رکھے تھے اور ان کے تجربے کی قیمت ایک بار پھر غیر امریکیوں کو ادا کرنا پڑی۔

مارشل جزائر کے باشندے آنے والے دس سال تک تابکاری کے ہاتھوں کینسر اور ایب نارمل بچوں کی پیدائش کا شکار رہے۔ نصف کے قریب آبادی موت کے گھاٹ اتر گئی مگر افسوس کسی نے ان معصوم لوگوں کے لیے آواز بلند نہیں کی۔ اسی طرح جاپانی کریو بھی تابکاری سے شدید متاثر ہوا تھا اور ایک

دنیا کی سب سے اونچی مسجد

سعودی عرب کے شہر ریاض میں دنیا کی سب سے اونچی مسجد واقع ہے جسے شاہ عبداللہ مسجد کہا جاتا ہے۔ یہ مسجد کنگڈم سینٹر بلڈنگ کی 77 ویں منزل پر بنی ہوئی ہے جو زمین سے 183 میٹر کی بلندی پر ہے۔ اس کی تعمیر 5 جولائی 2004ء کو مکمل ہوئی تھی۔ کنگڈم سینٹر سعودی عرب کی سب سے اونچی عمارت ہے جو آسمان کو چھوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔ یہ ''بیسٹ نیو اسکائی اسکریپر ایوارڈ'' بھی جیت چکی ہے۔

رابرٹ بریفالٹ مسلمانوں کی شان میں لکھتا ہے ''سائنس سے مراد تحقیق کی نئی روح، تفتیش کے نئے طریقے اور پیمائش و مشاہدہ کے نئے اسلوب ہیں...... جن سے یونانی بے خبر تھے۔ یورپ میں اس روح اور ان اسالیب کو رواج کرنے کا سہرا عربوں کے سر ہے۔''

ایچ جی ویلز لکھتا ہے کہ عربوں کے بہت سے نسخے ہم ابھی تک اپنے استعمال میں لا رہے ہیں۔ عرب جراحی میں کلوروفارم استعمال کرتے تھے جبکہ مسیحی رہنما طب کو حرام قرار دے رہے تھے۔

اقتباس: تناظرات اسلامی سائنس از ڈاکٹر عطش درانی

فرد جھلس بھی گیا تھا جب وہ واپس جاپان پہنچے تو ان کی حالت خراب تھی۔ بدقسمتی سے کشتی پر موجود مچھلی اور دوسری اشیا بازار میں پہنچ گئیں اور اس وقت لوگوں کو تابکاری کے بارے میں زیادہ علم نہیں تھا۔ جھلس جانے والا فرد مر گیا اور دوسرے افراد بعد میں کینسر کا نشانہ بنے۔ اس حادثے نے جاپانیوں میں تابکاری سے متعلق شعور بیدار کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔

ہائیڈروجن بم ایٹم بم کا سب سے بھیانک روپ ہے۔ اگر یہ کسی ایسی جگہ بلاسٹ کرے جہاں ہوائیں تواتر سے چلتی ہیں تو نصف امریکا جتنا بڑا رقبہ صرف ایک ہفتے میں تابکاری سے متاثر ہو جائے گا اور اس کے بعد یہ تابکاری بادلوں اور ہواؤں کی مدد سے جہاں جہاں پہنچے گی وہاں حیات کو متاثر کرے گی۔ ایٹم بم کے مقابلے میں ہائیڈروجن بم نہ صرف کہیں زیادہ توانائی خارج کرتا ہے جس سے ہونے والا بلاسٹ تقریباً چار ہزار مربع میل میں پھیلی تنصیبات کو تباہ کر سکتا ہے۔ توانائی کے ساتھ یہ بہت زیادہ مقدار میں کئی دوسری طرح کے جان لیوا تابکار پیدا کرتا ہے۔ یہ ذرے باریک سفوف کی شکل میں ہوتے ہیں اور با آسانی بادلوں اور ہوا کے ساتھ ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل ہو سکتے ہیں۔

امریکی ٹیسٹ نے روس کو مزید بڑھاوا دیا اور اس نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنے ایٹمی پروگرام کو نیشنل سیکیورٹی سے منسلک کر کے اوّلین حیثیت دے دی۔ پورے روس میں جابجا ایٹمی تحقیق کی تنصیبات بچھا دی گئیں اگرچہ اس دوران میں روس نے بجلی بنانے کے لیے ری ایکٹرز بھی ڈیزائن کیے لیکن اس کا زیادہ تر رو فوجی مقاصد کی طرف رہا تھا۔ یہی کام امریکا بھی کر رہا تھا۔ ساٹھ کی دہائی میں یورپ کی ری بلڈنگ کے فوراً بعد امریکا نے برطانیہ اور فرانس کو بھی ایٹمی ہتھیاروں کی ٹیکنالوجی فراہم کر دی اور اب یہ ملک بھی ایٹمی ہتھیار رکھنے کے اہل تھے۔ پانچواں ملک جس نے ایٹمی ہتھیار حاصل کیے وہ چین تھا جس نے روس سے ٹیکنالوجی حاصل کی اور پانچواں ایٹمی مملکت بن گیا۔ لیکن درحقیقت ایٹمی اسلحے کی دوڑ امریکا اور روس کے درمیان جاری تھی۔ دونوں ایک سے بڑھ کر ایک ایٹمی ہتھیار بنا رہے تھے۔ ہائیڈروجن بم نے خطرے کی گھنٹی بجا دی تھی اور اس کا استعمال تقریباً اجتماعی خودکشی کے مترادف قرار پایا تھا اس کے باوجود دونوں ملکوں کے ایٹمی اسلحہ خانوں میں سب سے زیادہ تعداد ہائیڈروجن بموں کی تھی۔ روس نے اکتوبر 1961ء میں دنیا کے طاقتور ترین ہائیڈروجن بم کا تجربہ کیا جس کی طاقت پچاس میگا ٹن تھی۔ کہتے ہیں کہ روس کے اسلحہ خانے میں سو میگا ٹن طاقت کا بم بھی موجود ہے۔ یہ سو کلومیٹر دور موجود انسان کو تیسرے درجے تک جلانے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ سوویت یونین کی تحلیل تک اس کے پاس ایک محتاط اندازے کے مطابق تیس ہزار ایٹمی ہتھیار وار ہیڈ یا خام صورت میں موجود تھے۔ اس سے نصف امریکا کے پاس تھے باقی ممالک کے پاس ان کی تعداد چند سو سے زیادہ نہیں ہے۔

ایک بار جب دونوں ملکوں نے قابل استعمال ایٹم بم اور ہائیڈروجن بم بنا لیے تو اب انہیں دشمن تک پہنچانے کے ذرائع کی طرف متوجہ ہوئے اس مقصد کے لیے دور مار بمبار طیارے اور پھر میزائل بنائے گئے۔ ساٹھ کی دہائی کے آخر تک دونوں ملک اس قابل ہو چکے تھے کہ دنیا میں کہیں بھی ایٹمی حملہ کر سکتے تھے۔ دونوں ملکوں نے ایک دوسرے کے تقریباً ہر اہم شہر اور فوجی ٹھکانے کو اپنے میزائلوں کی زد میں لے لیا تھا۔ اس کے ساتھ دنیا پہلی بار خاتمے کے حقیقی خدشات کے گہرے سائے میں آ گئی کیونکہ اگر غلطی سے ایک بار جنگ شروع ہو جاتی اور دونوں طرف سے میزائل باری شروع کر دی جاتی تو نوّے فیصد انسان چند دن میں موت کے گھاٹ اتر جاتے اور بچ جانے والے آنے والے چند مہینوں میں سسک سسک کر مر جاتے یہ ایسی جنگ ہوتی جس کا کوئی فاتح ہوتا اور نہ کوئی مفتوح۔

جوابی حملے کی پالیسی نے دونوں اطراف سے نیوکلیئر میزائلوں سے لیس ایٹمی آبدوزوں کو ختم دیا اور اب ایٹمی حملے کو روکنا ناممکنات میں شامل ہو گیا تھا۔ روس نے کیوبا میں میزائل لگائے تو ایٹمی جنگ کا خطرہ بالکل سامنے نظر آنے لگا مگر بالآخر روس نے گھٹنے ٹیک کر میزائل واپس منگوا لیے اور دنیا تباہی سے بچ گئی۔ سوویت یونین کے زوال کے بعد وسیع ایٹمی جنگ کا خطرہ بہت کم رہ گیا ہے لیکن اس کے ساتھ ساتھ محدود ایٹمی جنگ کے خطرات بڑھتے جا رہے ہیں جو دو چھوٹے ملکوں کے درمیان ہو۔ جیسے پاکستان اور انڈیا یا شمالی اور جنوبی کوریا کے درمیان۔ ایک خطرہ اسرائیل ہے جس کے پاس دو سو سے زیادہ جدید قسم کے ایٹمی ہتھیار موجود ہیں۔ اس کے سامنے نہتے فلسطینی یا عیش و عشرت میں مگن عرب ریاستیں ہیں۔ اسے واحد خطرہ ایٹم بم سے ہو سکتا ہے اسی لیے اس نے عراق کا ایٹمی ری ایکٹر تباہ کیا، بعد میں پاکستان کے ایٹمی پروگرام پر حملے کی منصوبہ بندی کرتا رہا۔ مگر اسے کامیابی نہیں ہوئی۔ اس نے شام کے خفیہ پروگرام کو تباہ کر دیا اور اب ایران کے پیچھے پڑا ہے۔

دیگر ممالک جو ایٹم بم بنانے کی صلاحیت رکھتے ہیں لیکن یا تو انہوں نے بنایا نہیں یا اپنی صلاحیت رضا کارانہ ختم کر دی۔ ان میں جنوبی افریقا اور برازیل شامل ہیں۔ جنوبی افریقا نے شاید بم بھی زیر آب ٹیسٹ کیا تھا لیکن مغربی دنیا اسے چھپا گئی۔ نسل پرست حکومت کے خاتمے کے بعد آنے والی حکومتوں نے ایٹمی پروگرام سے ہتھیار سازی کا عنصر خارج کر دیا اسی طرح برازیل نوّے کی دہائی میں یورینیم کو نوّے فیصد افزودہ کرنے میں کامیاب رہا تھا لیکن پھر اس نے ایٹمی پروگرام سے دست برداری اختیار کر لی۔ شمالی کوریا نے ایٹمی پروگرام کے لیے بہت کوشش کی اور اس کے سائنسدانوں نے ایک نیم ناکام اور نیم کامیاب تجربہ بھی کیا لیکن شمالی کوریا کی ایٹمی ٹیکنالوجی کسی قابل نہیں ہے اور ممکن ہے وہ چین اور مغرب کے دباؤ پر اس سے دست برداری اختیار کر لے۔ آج کل سب کی توجہ ایران پر مرکوز ہے۔ جو اس میدان میں نہایت تیزی سے ترقی کر رہا ہے۔ لیکن کوئی یوکرائن، فلپائن اور جارجیا کے ایٹمی پروگراموں پر توجہ نہیں دے رہا ہے جو ایٹم بم بنانے کے عزائم رکھتے ہیں۔ ایٹم بم ایک خوفناک ہتھیار ہے لیکن اس سے زیادہ خوفناک چیز عالمی سیاست کی وہ پالیسیاں ہیں جنہوں نے ظالم اور مظلوم میں فرق ختم کر دیا ہے۔ جب تک یہ پالیسیاں ختم نہیں ہوں گی ایٹم بم بنتے رہیں گے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

الوداع

حسن رزاقی

اپنی قومی ایئرلائن کا اپنا مزاج ہے۔ اس ایئرلائن میں برسوں خدمت انجام دینے والے ایک افسر کے شب وروز کی لفظی تصویر کہ وہ کس طرح اور کن کن مراحل سے گزرا۔ کہنے کو یہ زندگی نامہ کی جھلک ہے مگر اپنے اندر بہت کچھ مخفی رکھتا ہے۔

L-1011 جہاز رجسٹریشن HZ-AHB سمیت کی تعداد بڑھانے کے لیے ہانگ کانگ روانہ ہو چکا تھا۔

اب میرے پاس وقت تھا کہ میں سعودیہ کے شعبۂ ہاؤسنگ جاکر اپنے رہنے کے لیے گھر مہیا کرنے کی درخواست کروں۔ میں نے وہاں سے ایک گھنٹا کی چھٹی لی اور ہاؤسنگ کے دفتر کے لیے روانہ ہوا۔

اس وقت سعودیہ نے اپنے انجینئرنگ ملازمین کے لیے کئی رہائشی کمپاؤنڈ کرائے پر لے رکھے تھے۔ ان میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سب سے بڑا کمپاؤنڈ شرجلی کے نام سے مشہور تھا۔ شرجلی میں معمول کے گھر نہیں تھے۔ موبائل ہومز کی قطاریں لگی ہوئی تھیں۔ یہ موبائل گھر مغربی دنیا میں عارضی رہائش کے لیے مستعمل ہیں اور بہت ہی ہلکی لکڑی سے بنائے جاتے ہیں مگر شرجلی میں یہ گھر مستقل رہائش کے لیے استعمال ہو رہے تھے۔ ہر قطار میں سات آٹھ گھر اس کے بعد چھوٹی سی گلی۔ مجھے بھی ان موبائل گھروں میں سے ایک گھر الاٹ کر دیا گیا۔ اس مکان کی چابی لے کر میں شاداں و فرحاں اپنے دفتر لوٹ آیا۔

دفتر کا وقت ختم ہوا تو میں اپنی بہن کے گھر آ گیا اور کھانا کھانے کے بعد بغل میں بستر دبا کر اور ہاتھ میں سوٹ کیس اٹھا کر شرجلی کے لیے روانہ ہوا کہ اب میں سر چھپانے کے لیے بہن کا احسان مند نہیں رہا تھا۔

شرجلی آ کر میں نے گھر کی جھاڑ پونچھ کی اور پلنگ پر بستر بچھا دیا۔ اس کے بعد کمپاؤنڈ کا جائزہ لینے نکل گیا۔ واپس آیا تو رات ہو چکی تھی بستر میرا انتظار کر رہا تھا۔ ابھی میری آنکھ لگی ہی تھی کہ کچھ عجیب سی آوازیں آنے لگیں جیسے کوئی آہیں بھر رہا ہو۔ میں گھبرا کر بستر سے اٹھ آیا اور پریشان تھا کہ آوازیں کہاں سے آ رہی ہیں کیونکہ گھر کے اندر میرے علاوہ اور کوئی موجود نہیں تھا۔ تفتیش کرنے پر پتا چلا کہ یہ آوازیں پڑوسی کے ٹریلر سے آ رہی تھیں۔ اس ٹریلر کی خواب گاہ میری خواب گاہ سے جڑی ہوئی تھی درمیان میں صرف ایک ہلکی سی لکڑی کی دیوار تھی۔ شرجلی کے بارے میں مشہور تھا کہ ان گھروں میں جب خاتون خانہ اپنے شوہر کو ہنی کہہ کر بلاتی تھی تو اس کو جواب میں تین یس ڈارلنگ سننے پڑتے تھے۔ ایک دائیں ہاتھ والے ٹریلر سے ایک بائیں ہاتھ والے ٹریلر سے اور ایک اپنے شوہر سے۔ میں ان یس ڈارلنگ سے مزید لطف اندوز نہیں ہونا چاہتا تھا۔ صبح دفتر جاتے وقت میں نے اپنا بستر لپیٹا، سوٹ کیس ہاتھ میں پکڑا اور ان دونوں اشیا کو بہن کے گھر واپس پہنچا دیا۔

دوپہر کے وقت ایک گھنٹے کی چھٹی لے کر میں ہاؤسنگ کے دفتر کے لیے روانہ ہوا کہ شرجلی کے گھر کی چابی واپس کر کے ان سے دوسرے گھر کی درخواست کروں۔ ہاؤسنگ کے دفتر کے کاؤنٹر پر ایک سوڈانی کو کھڑے پایا۔ میں نے چابی اس کو واپس کرنا چاہی تو اس نے سوال کیا۔

"ابھی کل ہی تو تم یہ چابی ہاتھ ہلا کر لے گئے تھے پھر آج کیوں واپس کر رہے ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "ان ٹریلر کے بنے گھروں میں کوئی پرائیویسی نہیں ہے۔ اپنے کمرے میں سرگوشی بھی کرو تو پڑوس کے گھر والوں کو پتا چل جاتا ہے۔"

"یہ تو تمہارے اپنے فائدے میں ہے۔ اس طرح سے اگر تمہارا پڑوسی تمہارے خلاف سازش کرے گا تو اس کی سازش کامیاب ہونے سے پہلے ہی تم کو علم ہو جائے گا۔ تم اپنا بچاؤ کر سکو گے۔"

میں نے اس کو بتایا کہ مجھے اپنے کسی پڑوسی سے کسی سازش کا کوئی خطرہ نہیں ہے اس کے علاوہ مجھے ان گھروں پر ایک اعتراض اور بھی ہے۔

"وہ کیا؟" اس نے سوال کیا۔

میں نے جواب دیا۔ "یہ گھر انتہائی ناقص ہے۔ بہت ہی ہلکی لکڑی کے بنے ہوئے ہیں۔" ان گھروں کی ہلکی لکڑی سے بنے ہونے میں بھی میرا فائدہ مضمر تھا اگر سوڈانی اس پر روشنی نہ ڈالتا تو مجھے کبھی اس کا پتا نہ چلتا اور میں بغیر ان فوائد کے جانے ہوئے ہی اس دار فانی سے رخصت ہو جاتا۔ سوڈانی نے اس راز سے پردہ ہٹایا۔

"اس ہلکی لکڑی کا بہت فائدہ ہے۔ زلزلے کی صورت میں اگر اس کی چھت تمہارے اوپر گر بھی جائے تو تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ تمہارے بدن پر خراش نہیں آئے گی۔ تمہیں معلوم نہیں کہ جاپان میں لوگ خاص طور سے ہلکے گھر بناتے ہیں تاکہ دوران زلزلہ ان کو کوئی نقصان نہ پہنچے۔"

میں نے جواب دیا۔ "جاپان میں اس لیے ہلکے گھر بنتے ہیں کہ وہاں پر زلزلے کثرت سے آتے ہیں۔" پھر پوچھا۔ "مجھے بتاؤ سعودی عرب میں آخری دفعہ زلزلہ کب آیا تھا؟"

"مجھے ٹھیک سے اندازہ نہیں ہے میں اس وقت سوڈان میں تھا، تم کل آ کر میرے منیجر سے معلوم کر لینا وہ سعودی ہے اس کو زیادہ تفصیل معلوم ہوگی۔ آج وہ چھٹی پر ہے۔" اس سے مکالمے سے میں تنگ آ چکا تھا، میں نے چابیاں اس کے کاؤنٹر پر رکھیں اور مطالبہ کیا کہ مجھے دوسرے کمپاؤنڈ میں ہاؤسنگ کا گھر الاٹ کیا جائے۔

جواب ملا۔ "تم کو دوسرا گھر نہیں مل سکتا کیونکہ تمہارا استحقاق صرف دو کمرے والے گھر کا ہے۔ اس وقت شرجلی کے علاوہ اور کسی کمپاؤنڈ میں دو کمرے کا گھر خالی نہیں ہے۔" اب میری سمجھ میں آیا کہ سوڈانی کیوں مصر تھا کہ میرے لیے شرجلی سے زیادہ بہتر اور کوئی گھر نہیں تھا۔

سعودیہ میں گھروں کا استحقاق اس طرح سے تھا کہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

غیر شادی شدہ ملازمین کو اور بے اولاد جوڑوں کو دو کمرے کا گھر ملتا تھا۔ بچے والے جوڑوں کو اگر ان کے صرف لڑکے یا صرف لڑکیاں ہوں تو تین کمرے کا گھر اور اگر لڑکے، لڑکیاں دونوں ہوں تو چار کمروں کا گھر ملتا تھا۔ حد سے زیادہ اولاد والوں کو ساتھ ہی ساتھ خاندانی منصوبہ بندی کا لیکچر بھی ملا کرتا تھا جس کا منظوم لب لباب ہمارے شاعر انور مسعود صاحب نے کچھ اس طرح ڈھالا تھا۔

فرحت میں جنجون سے مجموعہ
پوچھا کرنے تھے بچوں کا مجموعہ
ایک دن تنگ آکر آپ کے ساتھ
اس دن سے منکوحہ ہے ممنوعہ

یہ اٹھتی ہوئی آبادی دنیا کا مسئلہ نمبر 1 ہے۔ دنیا کی آبادی ہر چالیس سال میں دوگنی ہو رہی ہے۔ آنے والے سو سال میں دنیا کی آج کی 8 ارب کی آبادی 45 ارب سے تجاوز کرنے کی اہل ہے۔ اس کرۂ ارض کی محدود وسعت اور اس کے محدود وسائل اس آبادی کی سونامی کو کس طرح سنبھالیں گے؟ عقل ہے محوِ تماشائے لب بام ابھی۔

میں نے سوزانا سے چابیاں واپس لینے سے انکار کر دیا۔ ”جب تک کوئی اور دو کمروں کا گھر خالی نہیں ہو جاتا میں اپنے رہنے کا بندوبست خود کر لوں گا۔“ جدہ میں میرا گھر موجود تھا اس پر آخر دوسرا ابھی تو کوئی حق بنتا تھا۔

سوزانی سے شرف ملاقات حاصل کرنے کے دو ہفتے بعد میرے دفتر کے ایک ساتھی نے ہم دوستوں کو اپنے گھر کھانے پر بلایا۔ ان کا گھر سعود یہ سٹی میں واقع تھا۔ چار کمروں والا بہت ہی عمدہ گھر۔

سعود یہ سٹی سعود یہ کا اپنا رہائشی احاطہ تھا جو سعود یہ کے غیر ملکی ملازمین کی رہائش کے لیے معرض وجود میں آیا تھا۔ اس میں تقریباً ڈھائی ہزار مختلف قسم کے گھر بنائے گئے تھے۔ گھروں کے ساتھ ساتھ دیگر سہولیات بھی موجود تھیں۔ شاپنگ مال، پیٹرول پمپ، دیگر ریکریشن سینٹر کلب اور کئی عدد سوئمنگ پول وغیرہ۔ سعود یہ سٹی کی تعمیر میں یہ سوچ کارفرما تھی کہ روزمرہ کی تمام سہولیات یہاں پر رہنے والوں کو دستیاب ہوں۔ ان کو تمام احتیاج کے لیے سٹی سے باہر نہ جانا پڑے۔ کھانے پر تو وہاں نہیں گیا سعود یہ سٹی پر نظر گئی کہ اور ہر والی تمام خوبیوں کے ساتھ ساتھ سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ سعود یہ سٹی کی تعمیر حال ہی میں مکمل ہوئی تھی اور یہاں پر گھر ملنے کے امکانات بہت زیادہ روشن دکھائی دے رہے تھے۔

وات مبنی بڑی مشکل سے آئی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں نیند میں ہوں اور یادہ دوست تمام خالی گھروں کو لے اڑیں اور میں خواب و بکنار رہ جاؤں۔ صبح صبح میں ہاؤسنگ کے دفتر میں موجود تھا۔ کاؤنٹر پر سوزانی موجود نہیں تھا اس کے منیجر سے ملاقات ہوئی۔ وہی منیجر جو مجھے سعودی عرب میں آنے والے زلزلوں کی تمام تفصیل سے آگاہ کر سکتے تھے۔ ان سے عرض احوال کیا تو بے چارے آبدیدہ ہو گئے کہ سوزانی نے جو سلوک میرے ساتھ کیا تھا وہ ایک مسکین پاکستانی سے تو روا رکھا جا سکتا تھا لیکن ایک کینیڈین کے ساتھ یہ سلوک ناقابل معافی جرم تھا۔ انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ اب میرے اور سعود یہ سٹی کے گھر کے درمیان دنیا کی کوئی طاقت نہیں آسکتی سوائے ان کی اپنی ذات کے لیکن اب چونکہ وہ میرے گہرے دوست بن چکے ہیں، ایک کینیڈین کے دوست وہ میرے آڑے نہیں آئیں گے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ انہوں نے مجھے ایک دو کمروں والے گھر کی چابی تھماتے ہوئے کہا۔ ”بذات خود تو میں تمہیں چار کمرے والا گھر دیتا چاہ رہا تھا مگر کمپنی کے اصول اجازت نہیں دیتے۔“

ان کا کہنا تھا کہ اگر میں پھر بھی چار کمروں کے گھر کے لیے راضی ہوں تو اس کو حاصل کرنے کے لیے مجھے شادی کے پل صراط پر سے گزرنا ہوگا۔ وہ مزید کرے اس قدر پرکشش نہیں تھے کہ میں اس کے لیے اس خطرناک حد کو پار کرتا۔ میں دو کمروں پر اکتفا کر گیا۔

دفتر ختم ہونے کے بعد گھر پہنچ کر صبیحہ کو خوش خبری سنائی اور سعود یہ سٹی جانے کی تیاری کرنے لگا۔ صبیحہ نے کہا۔ ”کھانا کھا کر چلے جانا۔“

میں نے جواب دیا۔ ”کھانا میں باہر کھا لوں گا۔ مجھے فوراً اس گھر پر قبضہ جمانا ہے۔“

میں نے سکندر اعظم کی احساس فتح مندی کی سرشاری میں اپنا سوٹ کیس اٹھایا کہ اتنی عجلت میں کسی اور کا بندوبست نہیں ہو سکتا تھا اور ٹیکسی میں بیٹھ گیا کہ گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھنے کا بندوبست بھی نہ ہو سکتا تھا اور سعود یہ سٹی کی جانب جادہ پیما ہوا۔

خیال تھا کہ سعود یہ سٹی کے گیٹ پر رک کر سیکیورٹی والوں سے معانقہ کروں گا لیکن گیٹ پر سیکیورٹی کی چوکی خالی پڑی تھی۔ خیال ہوا کہ شاید سیکیورٹی اہلکار میرے استقبال کے لیے میرے الاٹ شدہ گھر کے باہر میرے منتظر ہوں گے لیکن وہاں بھی کوئی موجود نہیں تھا۔ یہاں پر کوئی عالیشان گھر بھی موجود نہیں تھا۔ ایک تین منزلہ عمارت تھی جس میں ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

چھوٹا سا دو کمروں کا فلیٹ مجھے الاٹ کر دیا گیا تھا۔ سکندر اعظم کا جاہ و جلال نپولین کے واٹرلو میں ڈھلتا دکھائی دیا۔ واپسی پر بہن نے کھانے کے لیے لا بٹھایا۔ بوتلوں میں بند کھانے کے کمرے میں موجود تھا۔ سکندر اعظم کا شاہی دستر خوان خراب بن چکا تھا۔

زیادہ مشکل جو کیے جاتے ہیں پائے جاتے ہیں ان میں تین کا بڑا مشکل رخ ہے۔ ہو سکتا ہے کہ سطحی عمل میں بھی ہوتا ہو۔ طلاق میں تو ہے کہ نکاح کا پھندا ایک دفعہ میں ہی پڑ سکتا ہے۔ صیاد اس طرح سے نکاح کا جال پھیلائے بیٹھا ہوتا ہے کہ صید کا بچنا محال ہو جاتا ہے، وہ یوں پھنس جاتا ہے جیسے کچے دھاگے سے چلے آئیں گے سرکار بندھے لیکن ایک دفعہ اس جال میں پھنسنے کے بعد اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے تین دفعہ پنجرے بدل بدل کر جان تڑوانی پڑتی ہے۔ پہلے پنجرے میں ہی گلو خلاصی پا جانے والے خوش نصیب کہلاتے ہیں۔

مجھے بھی اب تلاش دوبارہ کا تیسرا پنجرہ بدل کر ہاؤسنگ ڈپارٹمنٹ کا رخ کرنا تھا لیکن اس دفعہ لازم تھا کہ میں اپنی منشا کے مطابق کوئی گھر پہلے سعودی بستی میں انتخاب کر لوں پھر ہاؤسنگ کا رخ کروں۔ سعودی بستی میں گھروں کے اطراف چہار دیواری نہیں بنائی جاتی تھی۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ جب امریکا میں گھروں کے اطراف چہار دیواری کا رواج نہیں ہے تو پھر سعودی بستی میں کیسے ہو سکتا تھا۔ دنیا کی آج کی سوچ میں مہذب اور روشن خیال کہلانے کی پہلی کسوٹی یہ ہے کہ ہر معاملے میں امریکا کی تقلید کی جائے۔ ہر کام امریکا میں ہوتا ہے جو رواج امریکا میں ہے وہی یہاں ہو جاتا ہے۔ رواج آپ کی اپنی روایات سے کتنا ہی منحرف کیوں نہ ہو۔ مجھے اچانک ایک صورت گناہ بھی دکھائی دی۔ دس گھروں کی ایک قطار تھی جس میں ہر گھر کے آگے اس کا اپنا احاطہ تھا، چہار دیواری تھی۔ خیال ہوا کہ یقیناً چار کمروں کے گھر ہوں گے اور ان کو پانے کے لیے شادی کا پل صراط طے کرنا ہوگا۔ بلاوا اندر چل کر معلوم کرتے ہیں۔ اندر جا کر معلوم ہوا کہ یہ صرف دو کمروں کے گھر تھے اور ابھی خالی تھے۔ مغرب کا وقت ہو چکا تھا میں بہن کے گھر لوٹ آیا۔ رات ایک دفعہ پھر وہی بے چینی کا عالم تھا کہ کہیں میں خواب دیکھتا رہ جاؤں اور دوسرے رقیب یہ گھر لے اڑیں۔ اس سے پیشتر کہ کوئی اور ان گھروں کو نگاہ بد سے دیکھتا میں ہاؤسنگ کے دفتر میں موجود تھا۔

سوڈانی کاؤنٹر پر موجود تھا۔ اس نے میرے اوپر ایک نگاہ غلط ڈالی۔ میں نے بھی اس کی نگاہ ناز کا جواب نگاہ ناز سے دیا کہ اب مجھے اس کی کوئی پروا نہیں تھی۔ اس کا منیجر میرا دوست بن چکا تھا۔ میں منیجر کے کمرے سے برآمد ہوا تو میرے ہاتھ میں میرے مطلوبہ گھر کی چابیاں تھیں۔ ضروری ہو گیا تھا کہ وہ چابیاں سوڈانی کو دکھاؤں اور اس کو تمام تر تفصیل سے آگاہ کروں۔ جواباً سوڈانی نے مجھے خیر سگالی کے جذبات کے جن کلمات سے نوازا ان کا بیان دہرانا مناسب نہیں۔

سوڈانی سے یہ میری آخری ملاقات نہیں تھی۔ سعودیہ سے میری نوکری ختم ہوئی تو گھر چھوڑنے سے پہلے سعودیہ ہاؤسنگ نے اپنا ایک نمائندہ گھر کے معائنے کے لیے بھیجا کہ وہ اپنا اطمینان کر لے کہ میں نے گھر کو کوئی نقصان تو نہیں پہنچایا تھا۔ معائنے کے لیے آنے والا نمائندہ بھی سوڈانی تھا۔ اس نے مسکرا کر میری طرف دیکھا۔ ”بس ابھی سے واپس جا رہے ہو۔“

میری نوکری ختم ہو چکی تھی اس کی ابھی قائم تھی آخری جیت ہمیشہ ہارنے والے دشمن کی ہوتی ہے۔

میں سعودی بستی میں قیام پذیر ہو چکا تھا۔ ثانوی روزگار کے تمام تر مراحل طے ہو چکے تھے۔ اب روزگار کو جاری رکھنے کے لیے کام پر توجہ دینا ہوگی۔ یہ توجہ بہت جلد میری دنیا کی ذاکری کو از دوا کرے۔ سو اصنات طارات اور کنٹریکٹ کا لبادہ مجھے پہنا دے گی۔

☆☆☆☆☆

اس دن جب میں اپنے دفتر آ کر سیٹ پر بیٹھا ہی تھا کہ ایلن میرے سامنے آ کر کھڑا ہوا۔ وہ میرا باس تھا۔ بحیثیت پروجیکٹ منیجر ایویانکس کام کر رہا تھا۔ وہ امریکی تھا اس نے اپنی نوکری سے استعفیٰ دے دیا تھا۔ چند ہفتے بعد امریکا واپس جانے والا تھا۔ اس کے ہاتھ میں چند کاغذ تھے جو اس نے میری طرف بڑھائے۔ ”آج تم کو اپنی روزی حلال کرنا پڑے گی۔“

پھر روزی حلال کرنے کے طریقے کار کی تفصیل بتائی۔ ”بوئنگ B-737 کا ایئر کنڈیشن ٹھیک کام نہیں کر رہا۔ میں نے اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے یہ سرکٹ بنایا تھا مگر مسئلہ حل نہیں ہوا۔ دیکھو اس سرکٹ میں کیا خرابی ہے۔“ کاغذ میرے ہاتھ میں تھما کر وہ اپنی سیٹ پر چلا گیا۔

پچھلے سات آٹھ سال سے میں نے کسی سرکٹ کو ہاتھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں لگایا تھا۔ بہت سی چیزیں میرے ذہن سے اتر چکی تھیں۔ جو کام پندرہ بیس منٹ میں ختم ہو جانا چاہیے تھا اس میں تین گھنٹے سے زاید لگ گئے۔ غلطی اتنی بڑی بھی نہیں تھی۔ اس سرکٹ میں جو کپیسٹر لگایا گیا تھا اس کی ویلیو کم تھی اس کی جگہ بڑا کپیسٹر لگانے کی ضرورت تھی۔ لگایا تو یہ سرکٹ کام کرنے لگا۔ عزت بچ گئی مگر اگلے روز اس عزت کی مزید آزمائش کا ہونا ابھی باقی تھا۔

انجن نے مجھے اشارے سے اپنی میز کی طرف بلایا۔ میں وہاں پہنچا تو اس نے ایک انجینئرنگ رجسٹر ER میری طرف بڑھایا۔ ”ہم نے لاک ہیڈ کے L-1011 ٹرائی اسٹار جہاز کے INS کے نظام میں ایک Change Over Switch لگایا تھا مگر وہ مطلوبہ کام نہیں کر رہا ہے۔ ذرا دیکھو کیا مسئلہ ہے!“

میں نے INS کا نام دوائی جہاز کی نسبت سے پہلی بار سنا تھا۔ ایک اور پہلی دفعہ والا کھاتہ کھل رہا تھا۔ میری معلومات کے مطابق امریکا میں INS کی اصطلاح امیگریشن ڈپارٹمنٹ کے لیے استعمال ہوتی ہے لیکن جہاز تو امیگریشن ڈپارٹمنٹ کی اجازت کے بغیر ہی ایک ملک سے دوسرے ملک جاتے ہیں۔ INS سے بھلا ان کا کیا واسطہ؟ میں انجن سے یہ نہیں معلوم کرنا چاہتا تھا کہ یہ INS کیا بلا ہے۔ PIA کی بے عزتی ہوتی کہ انہوں نے مجھے یہ تک نہیں بتایا کہ INS کیا ہے لیکن PIA کو اس بارے میں مورد الزام نہیں ٹھہرایا جا سکتا کہ ان کے پاس جو بوئنگ کے اور دوسرے جہاز تھے ان میں INS کا بندوبست تھا ہی نہیں۔ میں انجن سے کاغذ لے کر واپس اپنی سیٹ پر آ گیا۔

میرے پیچھے والی سیٹ پر کریم بیرس بیٹھا کرتا تھا۔ اس نے پوچھا: ”انجن نے کیا کام دیا ہے؟“

میں نے بے پروائی کا مظاہرہ کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”کچھ نہیں بس INS کے سوئچ کا کوئی معمولی سا مسئلہ ہے۔“

کریم نے کہا۔ ”جس وقت کمپنی نے انرشل نیویگیشن سسٹم میں اس سوئچ کے لگانے کے لیے EO تیار کیا ہے میں نے اسی وقت......“ اپنے جملے میں کریم نے کیا کہا مجھے اس سے قطعی کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ میں اس کا شکر گزار تھا کہ کم از کم اس نے یہ عقدہ تو کھول دیا تھا کہ INS انرشل نیویگیشن سسٹم کا مخفف ہے۔

نیویگیشن وہ نظام ہوتا ہے کہ جس کے ذریعے جہاز کی سمت کا تعین کیا جاتا ہے اور اسے کنٹرول کیا جاتا ہے۔ نیویگیشن کے کئی مختلف نظام ہوتے ہیں۔ مثلاً HF, VHF, Omega وغیرہ۔ اور INS۔

مجھے INS کے بارے میں کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس لیے کہ جس وقت میں PIA میں کام کر رہا تھا اس وقت PIA کے جہازوں میں INS نصب نہیں کیا گیا تھا۔ ان جہازوں میں صرف HF اور VHF سسٹم لگے ہوئے تھے۔

اب میرے لیے لازمی ہو چکا تھا کہ میں ٹیکنیکل لائبریری جا کر INS کی مکمل معلومات حاصل کروں اس کے بعد موجودہ INS کے مسئلے کو حل کروں۔ یہ لمبا کام تھا اس کے پانچ مراحل تھے۔

سب سے پہلے معلوم کروں کہ INS کیسے کام کرتا ہے۔ پھر معلوم کروں کہ L-1011 جہاز پر یہ کس طرح نصب کیا گیا ہے۔ پھر کمپنی کے لکھے ہوئے EO کو پڑھوں۔ اس EO کے کام نہ کرنے کی وجہ معلوم کروں۔ اس بیچ کر یا اس نقص کا حل تلاش کروں۔

ان دنوں سعودیہ میں سات گھنٹے کام ہوتا تھا۔ صبح ساڑھے سات بجے سے ڈھائی بجے دوپہر تک۔ جب میں چار بجے تک گھر نہیں پہنچا تو بیگم کا فون آیا۔ ”کیا ہوا؟“

میں نے جواب دیا۔ ”کام میں مصروف ہوں، گھر آنے میں دیر لگے گی۔“

بیگم نے پوچھا۔ ”کتنی دیر؟“

میں نے جواب دیا۔ ”معلوم نہیں۔“

طے ہوا کہ وہ ایک گھنٹے بعد ہینگر کے باہر میرا انتظار کر رہی ہوں گی۔

پانچ بجے باہر آیا تو ڈاکٹر صاحب اور صبیحہ کو منتظر پایا۔ گاڑی میں بیٹھا تو صبیحہ نے دو تھرموس، ایک پانی کا اور ایک چائے کا اور ٹفن میں سینڈوچ پیش کیے۔ جواب میں، میں نے ان کو ڈانٹ دیا کہ اس پاگل پن کی کیا تک ہے۔ ہم گھر تو جا ہی رہے تھے۔

بھائیوں سے بہنوں کی یہ محبت عالمگیر ہے۔ ہر ملک میں ہے۔ دنیا کے کونے کونے میں ہے اور ہر جگہ بہنیں اپنی ہمدردی کے عوض بھائیوں کی ڈانٹ سنتی رہتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عورت اپنے دماغ کا بایاں حصہ زیادہ استعمال کرتی ہے جس میں ہمدردی اور ممتا کا عنصر زیادہ ہوتا ہے۔ مرد اپنے دماغ کا دایاں حصہ زیادہ استعمال میں لاتا ہے جس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں عملی زندگی کے معاملات زیادہ فوقیت رکھتے ہیں۔ اس میں بھی اس بنانے والے کی حکمت مضمر ہے جس نے ساری کائنات کو بنایا ہے۔ زندگی گزارنے کے لیے یہ دونوں طرز عمل ضروری ہیں۔ صرف ایک کے سہارے زندگی نہیں گزر سکتی۔ توازن میں ہی زندگی کی بقا ہے۔

پیٹ کا پاگل پن مسلم محمد بھائی کو بھوک اور پیاس دونوں ہی لگ رہی تھیں۔ میں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا۔ سینڈوچ کھائے پھر چائے پی۔ چائے ختم کر لینے کے بعد ایک دفعہ پھر صبیحہ کو ان کی کوتاہی پر ڈانٹنا پڑا۔ میں نے کہا۔

"یہ چائے ٹھنڈی ہو چکی تھی۔ آئندہ دوسرے تھرموس میں لانا۔"

ذائقے کا خاطر خواہ اثر ہوا۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے گلے ہو گئیں کہ بھیا کے لیے ابھی نیا تھرموس لینا ہے۔ ایسے موقعوں پر جیت ہمیشہ بیویوں کی ہی ہوتی ہے۔ نیا تھرموس لے لیا گیا گو کہ ڈاکٹر صاحب کا اصرار تھا کہ "اگلی دکان" پر اس سے اچھا تھرموس ملے گا۔ ڈاکٹر صاحب ہر خریداری کے موقع پر اصرار کیا کرتے تھے کہ اگلی دکان پر اس سے اچھا مال ملے گا۔ وہ اگلی دکان کو دریا کا دوسرا کنارہ کا ہم وزن سمجھتے تھے کہ دوسرے کنارے پر سبزہ ہی سبزہ ہوتا ہے۔ کبھی کبھی اگلی دکان پر واقعی سبزہ زیادہ ہوتا تھا۔

مجھے INS کی بنیادی معلومات حاصل ہو چکی تھیں۔ ان بنیادی معلومات کو حاصل کرنے کے بعد میں نے L-1011 کے سسٹم کو پڑھا۔ اب معاملہ سنبھلتا نظر آ رہا تھا۔ میں نے کام مکمل کیا اور ایلن کے سامنے سینہ تان کر کھڑا ہو گیا۔ ایلن نے سر اٹھا کر پوچھا۔ "کیا بات ہے؟"

میں نے جواب دیا۔ "وہ INS کا مسئلہ......" میرا جملہ ختم ہونے سے پہلے ہی اس نے اپنے سامنے رکھی ہوئی ٹرے کی طرف اشارہ کیا۔ "یہاں رکھ دو۔ میں اس کو پرسوں دیکھوں گا۔ دو دن میں مصروف ہوں۔" ایلن INS کا بھلا چکا تھا۔ میں بلاوجہ ہلکان ہوا۔

تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو
مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

خود ستائش کی بات ہے مگر بات ہے سچائی کی۔ میں خود بھی نیویگیشن کے ہنر میں طاق تھا۔ امریکا کی فلائٹ کو میں سنگاپور میں آنکھ بند کر کے اتروا سکتا تھا اور وہ بھی پائلٹ کو شبے میں ڈالے بغیر۔

میں نے دنیا کے چالیس سے زیادہ ملکوں میں سفر کیا ہے مگر آج تک ان ملکوں میں سے کسی ایک کو بھی اس شکایت کا موقع نہیں دیا کہ میں اس کے شہروں کی شاہراہوں پر بھٹکتا رہا ہوں۔ جدہ سے مجھے خاص انسیت تھی۔ جدہ میں جب بھی مجھے باہر جانا ہوتا تھا تو میں اپنے بھائی سے راستہ بتانے کی درخواست کرتا تھا۔ اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ وہ جدہ میں پانچ برسوں سے قیام پذیر تھے۔ مجھے جدہ میں رہتے ہوئے صرف ساڑھے تیرہ مہینے گزرے تھے۔

میں INS کے پل صراط سے گزر چکا تھا۔ مگر یہ پل صراط صرف اس دنیا کی صراط مستقیم کی طرف لے جاتا تھا۔ آخرت کی صراط مستقیم تک رسائی حاصل کرنے کے لیے میں حج کی سعادت حاصل کر سکتا تھا۔ حج اگلے ہفتے شروع ہونے والا تھا۔ حج کا موضوع میری ذات سے برتر ہے۔ میں اس پر قلم اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ میں صرف حج سے متعلق چند امور پر اپنے خیالات کا اظہار کرنا چاہتا ہوں۔

میں نے حج 1978ء میں کیا تھا۔ اس وقت سعودی عرب کی آبادی اسی لاکھ کے قریب تھی جس میں وہاں پر رہنے والے غیر ملکی بھی شامل تھے۔ سعودی عرب نیا نیا تیل کی دولت سے مالا مال ہوا تھا۔ اس کا شمار اس وقت پسماندہ ملکوں میں ہوتا تھا۔ گو کہ وہ ترقی کی طرف گامزن تھا۔ اس اسی لاکھ آبادی کے ملک میں حج کی غرض سے آنے والے لوگوں کی تعداد دس لاکھ سے تجاوز کر چکی تھی۔ (آج یہ تیس لاکھ سے تجاوز کر چکی ہے)۔ حاجیوں کی اس سیلاب نما تعداد کے لیے سعودی حکومت کو ہر طرح کی سہولتوں کا بندوبست کرنا پڑتا تھا جس میں سواری، رہنے کی جگہ، پانی، کھانے کی اشیاء، اسپتال، کھانے پکانے کا بندوبست اور دوسری سہولیات شامل تھیں۔ اور یہ سعودی قوم نئی دنیا کے تقاضوں سے نابلد۔ اس کی حکومت کو یہ انتظام صرف چند ماہ کے لیے کرنا ہوتا تھا۔

ان تمام کوہ گراں جیسے انتظامات کے بوجھ کے باوجود اگر خدانخواستہ حج کے دوران کوئی حادثہ ہو جاتا تھا تو اس کا چرچا ساری دنیا میں کیا جاتا تھا۔ حد درجہ کی سنسنی پھیلائی جاتی تھی اور سعودی عرب کی حکومت کو نااہلی کا مورد الزام ٹھہرا کر اس کی کوتاہیوں پر لعنت ملامت کی جاتی تھی۔

سعودی عرب کی حکومت پر لعن طعن کرنے کی بجائے اس کے انتظامات کو سراہنا چاہیے تھا۔ سوال یہاں یہ نہیں اٹھتا تھا کہ یہ حادثات...... جو بہت کم تعداد میں ہوتے تھے۔ کیوں ہوئے۔ بلکہ سوال یہ اٹھتا تھا کہ اس جم غفیر کے اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

عارضی انتظام میں حادثات اتنی کم تعداد میں کیوں ہوتے تھے۔ اس کا ایک ہی جواب ہے۔ سعودی حکومت کے بہترین انتظامات۔ ان کی تمام تر پسماندگی کے باوجود دنیا میں اور کون سا ایسا ملک ہے جو اپنی آبادی کے بار دیگر نصف تعداد کے مہمانوں کے لیے سال میں دو دن ہفتے کے لیے اتنے بڑے پیمانے پر زندگی کی ہر سہولت کا بندوبست کر سکے۔ یہ موقع سعودی حکومت پر الزام تراشی کا نہیں بلکہ اس کی کاوشوں کو سراہنے کا ہے۔

☆☆☆

حج سے واپسی کے بعد آج دفتر میں میرا پہلا دن تھا۔ میری میز پر رکھے ہوئے ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ منیجر انجینئرنگ کا فون تھا۔ مجھے اپنے کمرے میں بلایا تھا۔ عمر صاحب واپس اپنے عہدے پر آچکے تھے۔ وہ پروجیکٹ منیجر ایئر فریم تھے۔ پچھلے چند مہینوں سے وہ قائم مقام ایکٹنگ منیجر انجینئرنگ کے فرائض انجام دے رہے تھے۔ عمر صاحب کی جگہ اب کرٹ منیجر انجینئرنگ کے فرائض منصب پر تھے مگر وہ بھی ایکٹنگ تھے۔ سعودیہ کے ساتھ TWA کا مینجمنٹ کنٹریکٹ اپنے آخری دنوں پر تھا۔

کرٹ جرمن نژاد امریکی تھے۔ فربہ اور گنجے، بھورے بالوں سے فارغ، جنس کے، جرمن قوم کی مشہور زمانہ سخت گیری کی خصوصیت سے متصف، کرٹ کا حلیہ اور شخصیت بیان کرنے کے لیے صرف ایک لفظ کافی ہے ”شاندار“۔ آنے والے دنوں میں ہم میں اور کرٹ گہرے دوست بننے والے تھے۔ کرٹ کے پاس میرے لیے ایک پروجیکٹ تھا۔ اس پروجیکٹ کی تفصیل میں جانے سے پہلے دو چیزوں کا جاننا ضروری ہے۔ ایک تو چند (خشک) تکنیکی معلومات اور دوسری سعودیہ کے اس وقت کے حالات کا پس منظر۔

ہر جہاز اپنی خصوصی ”مواصفات“ (صفت کی جمع) کے مطابق بنایا جاتا ہے۔ یہ مکمل مواصفات ہر چھوٹی بڑی صفت کی مکمل تفصیل کے ساتھ جہاز بنانے والی کمپنی کی طرف سے ایک ضخیم کتاب کی صورت میں تیار کی جاتی ہیں۔ یہ کتاب اس ماڈل کے جہاز مثلاً B707..... کا معیاری مواصفات کہلاتی ہے۔ جہاز بنانے والی کمپنی کی یہ قانونی ذمے داری ہوتی ہے کہ وہ اس ماڈل کا ہر جہاز مکمل طور پر اس کتاب کے مطابق بنائے۔ وہ ان مواصفات سے چھوٹے سے چھوٹا انحراف بھی نہیں کر سکتی۔

لیکن دنیا کی کوئی بھی ائرلائن صرف ان معیاری مواصفات پر تیار کیا ہوا جہاز نہیں خریدتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر ائرلائن کی اپنی مخصوص ضروریات اور مطالبات ہوتے ہیں جو وہ اپنے خریدے ہوئے جہاز میں رکھنا چاہتی ہے۔ ان میں سے بعض مطالبات معمولی نوعیت کے ہوتے ہیں اور کبھی کبھار بہت بڑے جس کا پورے جہاز کی تیاری پر اثر پڑ سکتا ہے۔

جہاز کا آرڈر دینے سے پہلے ائرلائن اس جہاز کے معیاری مواصفات کا باریک بینی سے مطالعہ کرتی ہے پھر اپنی

قارئین متوجہ ہوں

پرچا نہیں ملتا

کچھ عرصے سے بعض مقامات سے یہ شکایات مل رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچا نہیں ملتا۔ ایجنٹوں کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے ہماری گزارش ہے کہ پرچا نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط یا فون کے ذریعے مندرجہ ذیل معلومات ضرور فراہم کریں۔

☆ بک اسٹال کا نام جہاں پرچا دستیاب نہ ہو۔
☆ شہر اور علاقے کا نام۔
☆ ممکن ہو تو بک اسٹال کا PTCL یا موبائل فون نمبر

رابطے اور مزید معلومات کے لیے

ثمر عباس

03012454188

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

سسپنس، جاسوسی، پاکیزہ، سرگزشت

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

35802552- 35386783- 35804200

ای میل: jdpgroup@hotmail.com

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ضروریات کو مدِنظر رکھتے ہوئے تیار کرتی ہے۔ کمپنی کو اس معیاری مواصفات میں کیا کیا تبدیلی درکار ہے۔ وہ ان تمام مطلوبہ تبدیلیوں کی اطلاع جہاز بنانے والی کمپنی کو چینج ریکوسٹ (CR) کے ذریعے دیتی ہے۔ کمپنی ہر CR کا الگ الگ جواب دیتی ہے۔

اگر چینج ریکوسٹ میں درخواست کی جانے والی تبدیلی جہاز میں لائی جاسکتی ہے تو کمپنی اس کی تفصیل ائرلائن کو مہیا کرتی ہے اور جہاز کی قیمت اور ڈلیوری پر اس کا کیا اثر پڑتا ہے اس کی تفصیل بھی بتاتی ہے۔ یہ تفصیل (SCN) میں درج ہوتی ہے۔ اب یہ ائرلائن پر منحصر ہے کہ وہ تبدیلی اپنے جہاز میں کروانی ہے یا نہیں۔

اگر کمپنی CR کی مطلوبہ تبدیلی نہیں کرسکتی تو وہ اس کی وجہ ائرلائن کو ایک ٹیکنیکل نوٹ کے ذریعے بتاتی ہے۔

آخری مرحلے میں جو جو تبدیلیاں ائرلائن اپنے جہاز کے لیے قبول کرتی ہے ان تبدیلیوں کی تفصیلات اور اثرات کو اس ماڈل کے معیاری مواصفات میں ضم کر کے نئے مواصفات تیار کیے جاتے ہیں جو اس ائرلائن کے خصوصی مواصفات ہوتے ہیں۔ اس ائرلائن کا اس ماڈل کا ہر جہاز ان ہی خصوصی مواصفات کے مطابق تیار کیا جاتا ہے۔

اس تمام کارروائی کو قانونی حیثیت دینے کے لیے جہاز کے معیاری مواصفات کو اور ائرلائن کے خصوصی مواصفات کو جہاز کے کنٹریکٹ خریداری میں شامل کرلیا جاتا ہے۔ اس کام کے لیے اکثر چینج آرڈر کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ اب آپ سکون کا سانس لے سکتے ہیں۔ مجھے بھی اس سے پہلے یہ تفصیل نہیں معلوم تھی۔ آپ سوچ سکتے ہیں کہ اس تمام کام کو کرنے کے بعد میرا کیا حال ہوا ہوگا۔ آپ تو صرف ذکر سن کر پریشان ہوگئے۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو ان معلومات کو ہضم کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

اس پروجیکٹ کی باریکیوں کو سمجھنے کے لیے سعودیہ کے اس وقت کے پس منظر کا جاننا بھی ضروری ہے۔ یہ 1978ء کا زمانہ تھا۔ اس وقت سعودی عرب تیل کی دولت میں ڈوبا ہوا تھا۔ زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی ہو رہی تھی۔ ہر چیز کی مانگ اپنے عروج پر تھی۔ ریگستان کو گلزار بنانے کا کام زوروں پر جاری تھا۔ دنیا کی ہر کمپنی سعودی عرب کی اس تیل کی دولت میں سے اپنا حصہ بٹانا چاہتی تھی۔ تجارت اور ملازمت کے مقصد سے آنے جانے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ ان کی تعداد میں ہر روز اور ہر رات اضافہ ہو رہا تھا۔ اس بڑھتی ہوئی مسافروں کی تعداد سے نمٹنے کے لیے سعودیہ کو سخت مشکلات کا سامنا تھا اور گو کہ سعودیہ نے بہت سے جہاز دوسری جگہوں سے لیز پر لے رکھے تھے پھر بھی جہازوں کی قلت کا سامنا تھا۔ نئے جہاز خریدنا ناگزیر ہوچکا تھا۔ اس وقت سعودیہ کے پاس تین قسم کے جہاز تھے۔ بوئنگ B-737 اور B-707 اور لاک ہیڈ کا ٹرائی اسٹار L-1011 لیکن ان جہازوں کی موجودہ تعداد ناکافی پڑ رہی تھی۔ اس پس منظر میں کرٹ نے مجھے اپنے دفتر میں طلب کیا تھا۔

کرٹ نے کام کی تفصیل بتانا شروع کی۔ ”سعودیہ کو فوری طور پر مزید L-1011 جہاز خریدنے ہیں لیکن انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ ہم جن تین قسم کے جہازوں کو اڑا رہے ہیں ان کے حتمی مواصفات کیا ہیں۔ ساری دستاویزات ہمارے پاس ہیں لیکن یہ نہیں معلوم کہ کہاں ہیں۔“

پھر کرٹ نے میرے برابر کھڑے ہوئے میرے ساتھی کی طرف اشارہ کیا۔ ”رضوان اس پر پچھلے دو مہینے سے کام کر رہا ہے مگر ہم ابھی تک اندھیرے میں ہیں۔ ہم کو کچھ پتا نہیں کہ ہماری خریدی ہوئی SCN کی تفصیل کیا ہے۔ نہ ہی یہ معلوم ہے کہ چینج آرڈرز کہاں غائب ہوگئے ہیں۔“

پھر کرٹ نے مجھے الٹی میٹم دیا۔ ”رضوان کے ساتھ مل کر یہ کام تم کو تین مہینے کے اندر اندر مکمل کرنا ہے۔“ کرٹ کا جرمن خون جوش مار رہا تھا۔

اگلا جملہ کرٹ نے زبانی طور پر ادا نہیں کیا مگر اس کے انداز سے اس کا بوجھنا مشکل نہیں تھا۔ ”ورنہ تمہارا بوریا بستر گول۔“

اپنی سیٹ پر واپس آنے کے بعد میں نے عمر صاحب سے مدد چاہی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ سعودیہ سے میرا بوریا بستر اتنی جلدی گول ہوجائے۔ عمر صاحب نے ہر طرح سے میری مدد کی۔ پورا انتظام مجھے سمجھایا اور مشورہ دیا کہ میں آگے بڑھنے سے پہلے تمام مطلوبہ معلومات کو جمع کر کے ان کا مطالعہ کرلوں۔ عمر صاحب کو بھی میرے بوریا بستر کی فکر تھی۔ اگر یہ گول ہوجاتا تو میرے لیے پاکستان کا نام روشن رکھنا مشکل ہوجاتا۔

عمر صاحب ایسے موقعوں پر جوش میں آجایا کرتے تھے۔ ان کا تقاضا ہوتا۔ ”ہم...... مجھے...... مجھے صرف دو...... دو گولیاں چاہئیں۔ ایک ایک...... میں کا...... کا...... کامل سندی کو ماروں گا (کامل سندی سعودیہ کے ڈائرکٹر جنرل تھے) اور دوسری اس کو...... اس کو...... اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کو.....'' یہ اس کو اس کو موقع محل کے ساتھ بدلتا رہتا تھا۔

آج اس کو اس کو کا رخ کرٹ کی طرف تھا۔ میں نے بڑی جدوجہد کے بعد ان دونوں معصوموں کی جان بچائی تھی۔

اگلا پورا ہفتہ میں نے تینوں جہازوں B-707, B-737 اور L-1011 کے متعلق تمام معلومات ہر ایک دفتر میں جا کر جمع کیں اس کے ہر کونے کھدرے میں ڈھونڈ ڈھونڈ کر۔ اس کے بعد میں نے ان تمام معلومات کو قاعدے کے ساتھ الگ الگ جلدوں میں تقسیم کر کے رکھا۔ اس کے بعد ان چیزوں کی فہرست بنائی جو غائب تھیں۔ غائب تو تھیں مگر ان کو حاصل کیسے کیا جائے؟ عمر صاحب ایک دفعہ پھر کام آ گئے۔ بولے۔ ''بوئنگ اور لاک ہیڈ سے منگوا لیں۔''

چھٹی کا وقت ہو چلا تھا۔ میں نے گھر کا رخ کیا۔ آج بدھ کا دن تھا۔ اگلے دو دن چھٹی تھی۔ سعودیہ میں ہفتہ وار چھٹی جمعرات اور جمعہ کے دن ہوا کرتی تھی۔

ہفتے کے روز صبح دفتر پہنچ کر اپنے کارنامے کو دیکھا۔ یہ اس وقت تک نامکمل تھا جب تک کہ بوئنگ اور لاک ہیڈ سے گمشدہ چیزیں دوبارہ نہ منگوائی جاتیں مگر یہ معلوم نہیں تھا کہ بوئنگ سے ان کو کیسے منگوایا جا سکتا تھا۔

میرے برابر والی میز جج زورز کی تھی۔ مجھے سراسیمہ دیکھ کر پوچھنے لگے۔ ''کیا ہوا؟''

میں نے جواب دیا۔ ''مجھے یہ معلومات اور چیزیں بوئنگ اور لاک ہیڈ سے منگوانا ہے لیکن مجھے نہیں معلوم کہ ان سے یہ چیزیں کس طرح منگوائی جا سکتی ہیں۔''

کہنے لگے۔ ''یہ کون سا ایسا مسئلہ ہے۔ سیتا بھیج دو۔''

جج زورز امریکی تھے مگر ان کی بیگم پاکستانی نژاد برطانوی شہری تھیں۔ انگریز اور امریکن لوگ عجیب طرح کے لوگ..... حرف ''ت'' نہیں بول سکتے ہیں، وہ اس کو ''ٹ'' کی طرح سے ادا کرتے ہیں۔ ان دونوں باتوں کو ملا کر دیکھا تو مجھے اپنی ذہانت پر ناز ہوا۔ یہ سیتا دراصل سیتا ہوگی جو شاید امریکا میں رہتی ہو جس کو بوئنگ اور لاک ہیڈ بھیج کر یہ چیزیں منگوائی جا سکتی ہیں لیکن میری جبلت مجھے مذاق کی سوجھی۔ میں نے ازراہ مذاق جج کو مخاطب کیا۔ ''یہ تو بوئنگ اور لاک ہیڈ کا معاملہ ہے۔ یہ کوئی رام تھوڑی ہے کہ ہم سیتا کو اس کے پاس بھیجیں۔''

مجھے اپنی حماقت پر افسوس ہوا۔ جج غصے میں آ چکے تھے۔ جھلاتے ہوئے بولے۔ ''میں سیتا نہیں سیتا کی بات کر رہا ہوں۔ مجھے معلوم ہے رام کی سیتا کون ہے۔''

طلیطلہ

طلیطلہ گاتھ قوم کے فرمانرواؤں کا پایہ تخت تھا۔ یہاں ان کا خزانہ دولت اور نوادرات تھے۔ اہل طلیطلہ نے جب سنا کہ طارق بن زیاد ان پر چڑھائی کے ارادے سے چلا آ رہا ہے تو انہوں نے اس کے آنے سے پہلے ہی یہاں کی تمام دولت اور نوادرات دوسرے مقاموں پر منتقل کر دیا اور خود شہر چھوڑ کر جبل بشارت کی پشت پر بسے شہر میں پناہ لے لی۔ طارق بن زیاد جب یہاں پہنچے تو انہوں نے شہر کو خالی پایا اور اس طرح بغیر جنگ و جدل کے طلیطلہ پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا۔

اقتباس: فاتح اندلس از مغیث الدین

اب میں تین سیتاؤں یا سیتاؤں کے بھنور میں چکر کھا رہا تھا۔ اس بھنور سے مجھے جج نے ہی نکالا۔ ''تم کو معلوم نہیں کہ سیتا کیا ہے؟''

میں نے نفی میں سر ہلا دیا۔

جج نے مجھے سیتا کی تفصیل سے آگاہ کیا۔ یہ بھی نئی معلومات تھیں جو پہلی بار سنا اسے کھاتے میں چلی گئی۔

پتا چلا کہ سیتا دراصل Sita تھا۔ یہ ایک طرح کا برقی پیغام رسانی کا نظام ہے جو صرف ائر لائن یا جہاز سازی سے تعلق رکھنے والی بعض بڑی بڑی کمپنیاں استعمال کر سکتی ہیں۔

میں نے SITA کو بار بار استعمال کر کے تمام مطلوبہ معلومات حاصل کر لیں اور مطلوبہ چیزیں منگوا لیں۔ تین ہفتے سے کچھ پہلے ہی پروجیکٹ مکمل ہو چکا تھا۔

کرٹ نے پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے تین مہینے رکھے تھے۔ رضوان کی مدد سے یہ پروجیکٹ تین ہفتے میں ہی مکمل ہو گیا تھا۔ کرٹ پر احسان جتانا اور رعب ڈالنا ضروری تھا ورنہ باسز بھی گول ہونے سے بچ گیا تھا۔

حسب عادت میں نے جتنی آکسیجن سینے میں سما سکتی تھی اس سے بھی کتنا زیادہ آکسیجن اپنے سینے میں جمع کی اور کرٹ کے آفس کا رخ کیا۔ رضوان میرے ساتھ تھا مگر اس کا سینہ پھولا ہوا نہیں تھا۔ معمول کے مطابق تھا۔

کرٹ کے دفتر میں داخل ہو کر میں نے بغیر کسی تمہید کے کرٹ کو مخاطب کیا۔ ''کام ہو گیا۔''

''کس کا کام ختم کر کے آئے ہو؟'' کرٹ نے طنزیہ پوچھا۔

میں کرٹ کے طنز کو نہیں سمجھ پایا تھا۔ میں نے جواب دیا۔ ''اچھا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرٹ میری باوفائی پر مسکرایا اور اشارہ کیا ”تمام کاغذات میز پر رکھ دو۔ میں اسے بعد میں دیکھوں گا۔“

میں نے کاغذات میز پر رکھ دیے۔ اپنے سینے کو فاسٹو آکسیجن سے نجات دلوائی۔ دو گھنٹے بعد کرٹ نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا۔

”جب تم نے اور رضوان نے بتایا کہ تمہارے پروجیکٹ کا کام ختم ہو گیا تو مجھے یقین نہیں تھا کہ یہ کام اتنی جلدی کر لیا جائے گا۔ بعد میں جب میں نے تمہارے چھوڑے ہوئے کاغذات کو دیکھا تو معلوم ہوا کہ تم ٹھیک کہہ رہے تھے۔“ پھر کرٹ نے اپنی کرسی سے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ یہ میری اور کرٹ کی دوستی کی شروعات تھیں ہماری یہ دوستی میرے سعودیہ چھوڑنے کے بعد بھی قائم رہی۔ باہمی عزت، خیال اور بھروسے کے ساتھ۔

جب میں نے سعودیہ کی نوکری سے استعفیٰ دیا تو میں نے کرٹ سے ایک تعارفی خط حاصل کیا۔ اس خط میں کرٹ نے کچھ اس طرح سے لکھا تھا۔ ”اپنے پینتیس سالہ تجربے میں، میں نے لاتعداد لوگوں سے معاملات کیے ہیں لیکن مجھے شاذ ہی ایسے لوگ ملے ہیں جو اس درجہ کی صلاحیتوں کے حامل ہوں جیسے حسن کی تھا۔“

میں نے یہاں یہ الفاظ خود ستائشی کی خاطر نہیں دہرائے ہیں۔ یہ الفاظ میں نے صرف اس لیے دہرائے ہیں کہ میں بھی کرٹ کے متعلق بالکل ایسی ہی رائے رکھتا ہوں۔ آج بھی جب کبھی میں کرٹ کو یاد کرتا ہوں تو میرے ذہن میں صرف ایک لفظ گونجتا ہے۔ ”شاندار۔“

میں کرٹ کے دفتر سے واپس اپنی میز پر آیا تو چھٹی کا وقت ہو چکا تھا۔ میں نے میز پر پھیلے ہوئے کاغذات کو اکٹھا کر کے دراز میں بند کیا اور گھر جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ آج شام ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جدہ ڈاؤن ٹاؤن یا سوق بازار جانے کا پروگرام تھا۔

ڈاکٹر صاحب شام کی چائے یعنی شام کے وقت یعنی شام کے ٹھیک ساڑھے آٹھ بجے نوش کیا کرتے تھے۔ ان کا یہ معمول آج بھی اسی پابندیٔ وقت سے جاری ہے۔ اگر کبھی اتفاق سے کسی دن چائے شام آٹھ بجے بھی پی لیتے تو طبیعت الجھی الجھی سی رہتی تھی۔ جب تک کہ ساڑھے آٹھ بجے مزید ایک پیالی چائے اور نہ پی جائے۔ اس کے بعد نماز سے فارغ ہونے پھر وظیفہ پڑھتے تاکہ پچھلے تمام گناہ معاف کروا لیں۔ بغیر پچھلے گناہ معاف کروائے ہوئے تازہ گناہ کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا ہاں۔ ان سارے عوامل کے تکمیل پا لینے کے بعد سوق جانے کی باری آتی تھی۔

ڈاکٹر صاحب کو دکانداروں کی غیر ذمے داری سے بڑی کوفت ہوا کرتی تھی کہ اکثر یہ دکاندار اپنی دکان کو ٹھیک طرح سے بند نہیں کرتے تھے۔ ان دکان داروں کو اپنے نقصان کا کوئی اندیشہ نہیں تھا۔ ڈاکٹر صاحب کا معاملہ دوسرا تھا۔ وہ ہر وقت دکان داروں کے نقصان کا سوچ سوچ کر پریشان رہا کرتے تھے کیا آخر کو انہوں نے معاشیات میں پی ایچ ڈی کر رکھا تھا اور کسی کی بھی معاشی حالت کو بگڑتا ہوا نہیں دیکھ سکتے تھے۔ آبدیدہ ہو جاتے۔ دکان داروں کی اس غفلت اور کوتاہی کا حل انہوں نے یہ تلاش کیا تھا کہ جب تک سوق کی آخری دکان بند نہ ہو جائے اور ڈاکٹر صاحب اپنا اطمینان نہ کر لیں کہ دکان دار نے دکان کو ٹھیک طریقے سے بند کیا ہے وہ گھر واپس نہیں آتے تھے۔ اس امر کو یقینی بنانے کے لیے وہ کبھی کبھی مجھے بھی اپنے ساتھ سوق لے جایا کرتے تھے۔ آج بھی ان کو میرے صبر کا امتحان لینا مقصود تھا۔

جدہ شہر کی حالت اس وقت خاصی پسماندہ اور ابتر تھی۔ سوق میں گاڑیاں پارک کرنے کی جگہ نہیں تھی۔ گاڑیاں سڑک پر پارک کی جاتی تھیں۔ پھر سڑک پار کر کے ڈھلان سے اتر کر سوق جانا پڑتا تھا۔ پارکنگ کی جگہ بہت کم تھی اور گاڑیاں پارک کرنے والوں کی تعداد بہت زیادہ۔ اس پارکنگ کی کمی کو دور کرنے کے لیے ضروری تھا کہ گاڑیاں برابر برابر، دو دو تین تین کی قطاروں میں پارک کی جائیں۔ لوگ آتے اپنی مرضی سے تھے لیکن واپسی بڑوں میں پارک کی ہوئی گاڑی کے مالک کی مرضی سے ہوا کرتی تھی کہ کب وہ سوق سے واپس آ کر اپنی گاڑی ہٹاتا ہے۔ راستہ صاف ہوتا ہے اور آپ اپنی گاڑی نکال سکتے ہیں۔ کبھی کبھی ایک ایک گھنٹہ انتظار کرنا پڑتا تھا۔ اس صورت حال سے نمٹنے کی غرض سے کئی لوگ اپنے ساتھ پکنک کا سامان ساتھ لے آیا کرتے تھے۔ اکثر اوقات سڑک کے ساتھ والے فٹ پاتھ پر لوگ جنریٹر چلا کر ٹی وی پروگرام دیکھنے کے مزے لوٹا کرتے تھے۔

سوق میں کچھ لوگ تو خریداری کرنے کی غرض سے آتے تھے اور کچھ خریداری کے لیے آئی ہوئی خواتین کے دیدار کی غرض سے۔ موخرالذکر لوگوں کی تعداد خریداری کی غرض سے آنے والے لوگوں کی تعداد سے زیادہ ہوا کرتی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھی۔ ان میں اکثریت فلپائن اور جنوبی ایشیا کے نوجوانوں کی ہوا کرتی تھی۔ ان لوگوں کو اپنے گھر والوں کو جدہ میں بلا کر رکھنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس لیے کہ ان میں سے زیادہ تر کی تنخواہیں اس حد سے کم تھیں کہ جس کے بعد ان کو فیملی ویزا مل سکتا تھا۔ جدہ میں کسی قسم کی تفریح کا بندوبست بھی نہیں تھا۔ اس صورت حال کے پیش نظر اگر یہ نوجوان بازاروں میں بھی نہ گھومتے تو کہاں جاتے؟

سوق میں ہر طرح کا سامان ملا کرتا تھا۔ زیادہ تر لوگ الیکٹرانکس کا سامان اور کپڑے وغیرہ خریدتے تھے۔ یہ سامان اس غرض سے خریدا جاتا تھا کہ سالانہ چھٹی پر گھر جاتے ہوئے اپنے پیاروں کے لیے بطور تحفہ لے جایا جا سکے۔

اس خریداری میں سونا اور سونے سے بنے ہوئے زیورات بھی کثرت سے خریدے جاتے تھے جیسے میں پہلے ذکر کر چکا ہوں اس ضمن میں سب سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ تھی کہ صراف بازار میں کسی بھی ایک وقت میں کروڑوں کا سونا دکانوں پر ہونے کے باوجود یہاں عام گشت کرنے والے سپاہیوں کے علاوہ کسی قسم کی سکیورٹی کا کوئی بندوبست نہیں تھا کہ اس قسم کے بندوبست کی یہاں ضرورت ہی نہیں تھی۔ اگر دنیا کے کسی اور ملک میں صورت حال ہوتی تو یہ دکانیں دن دہاڑے لوٹ لی جاتیں مگر جدہ کی بات اور تھی۔ یہاں پر لوگوں کو اپنا ہاتھ کٹوانے میں کوئی خاص دلچسپی نہیں تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اگر دونوں ہاتھ سلامت رہیں تو زیادہ بہتر ہے لیکن آج جدہ میں صورت حال بدل چکی ہے۔

ہم لوگ سوق کی تمام گلیوں کا معائنہ کر چکے تھے اور سامان بھی خرید چکے تھے۔ دکانوں کے بند ہونے کا وقت آ چکا تھا۔ زیادہ تر دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ آخری تین چار دکانوں کا ابھی بند ہونا باقی تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا کہ جیسے ہی یہ آخری تین چار دکانیں بند ہو جائیں گی ہم ان کے تالوں کو ٹھیک ٹھیک بجا کر یہ تسلی کر لیں گے کہ تالے ٹھیک طرح سے لگائے گئے ہیں۔ پھر ہم لوگ گھر جا سکتے ہیں۔ اچھی تجویز تھی مگر میرا ذہن مطمئن نہیں تھا۔ گھر کا راستہ سیدھا گھر نہیں جاتا تھا۔ گھر جانے سے پہلے ہم لوگوں کا بنی مالک جانا از حد ضروری تھا۔

بنی مالک جدہ میں وہ جگہ ہے جس کے اوپر پاکستانی ... دوکان داروں اور ہوٹل والوں کا قبضہ ہے۔ ہوٹلوں کے آگے کٹا کٹ کی آوازیں اور چکن تکے اور سیخ کباب کی

چھوٹی چھوٹی غلطیاں فلموں میں بہت زیادہ دیکھنے میں آیا کرتی ہیں۔ کہیں یہ تکنیکی یعنی تسلسل کی غلطیاں ہوتی ہیں۔ اور کہیں اسکرپٹ ڈائریکشن کی۔

آئیں۔ ہم آپ کو کچھ مشہور فلموں کی ایسی غلطیاں بتاتے ہیں۔

ڈسپیئر، بہت ہی مشہور فلم۔ اس سیکوئل کی کئی قسطیں بن چکی ہیں۔ اس فلم کی ایک دلچسپ غلطی ملاحظہ فرمائیں (یہ فلم 2003 میں ریلیز ہوئی تھی) ڈسپیئر 3 کا ایک سین ہے کہ جان اور کیمبرلی دوڑتے ہوئے ائرپورٹ کے ہینگر میں داخل ہوتے ہیں تو وہاں ایک طیارہ کھڑا ہے جس کا نمبر ہے N3035C دونوں وہ طیارہ لے کر پرواز کر جاتے ہیں۔ اور جب طیارہ فضا میں بلند ہوتا ہے تو اس کا نمبر ہوتا ہے N.3973F اور جب طیارہ زمین پر اترتا ہے تو اس کا نمبر وہی پہلے والا ہو جاتا ہے یعنی N.3035C. ہے نا مزیدار غلطی۔

امریکن پائی۔ یہ بھی ایک مشہور فلم ہے اور 1999 میں آئی تھی۔

اس فلم کا ایک منظر ہے کہ لڑکی نے اپنے ہاتھ میں بیئر کا گلاس اٹھا رکھا تھا اور جب کیمرا لڑکی کو پیچھے سے دکھاتا ہے تو گلاس کی بجائے اس کے ہاتھ میں کافی کا ایک کپ ہے اور جب کیمرا دوبارہ سامنے آتا ہے تو پھر وہی بیئر کا گلاس۔

ایسی ہی ایک اور غلطی 2005 میں ریلیز ہونے والی فلم مسٹر اور مسز اسمتھ میں ہوئی تھی۔ نیویارک کے پس منظر میں بننے والی اس فلم کے ایک منظر میں انجلینا اور براڈ پٹ ایکشن سین میں گاڑی دوڑاتے ہوئے بھاگے جا رہے ہیں۔ ان کے تعاقب میں تین اور گاڑیاں لیکن جب شہر کے مختلف بورڈز پر کیمرا جاتا ہے تو وہ بورڈز لاس اینجلس کے ہیں۔

خود سوچیں گاڑیاں نیویارک کی سڑکوں پر دوڑ رہی ہیں اور بورڈز لاس اینجلس کے ہیں۔

مرسلہ: فوزیہ تنویر۔ جہلم

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اشتہا انگیز خوشبو کی لپٹیں بھوکوں کو اپنی طرف متوجہ کرتی ہیں۔ یہاں پر پاکستانی رسالے اور ہندوستانی فلموں کی ویڈیو کیسٹ بھی ملا کرتے تھے۔ ریکھا کی نئی فلم آئی تھی جس کی ویڈیو کیسٹ لینا بہت ضروری تھا۔ اس کار خیر کے بعد ہم لوگ گھر جاسکتے تھے۔

گھر پہنچ کر رات کا کھانا کھایا۔ یہ گزرے ہوئے دن کا کھانا تھا۔ گھڑی رات کے ساڑھے بارہ بجا رہی تھی۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب کا اصرار تھا کہ ویڈیو دیکھنے کے بعد سونے کے لیے جاؤں تاکہ برے خواب دیکھنے سے محفوظ رہوں۔ مجھے برے خواب رکھنا منظور تھا لیکن مزید جاگنے کی ہمت جواب دے چکی تھی۔ میں نے بستر کا رخ کیا۔ رات بھر ریکھا خوابوں میں آتی رہی۔ خواب اتنے برے نہ لگے۔

☆☆☆

ایویانکس انجینئرنگ میری پیشہ ورانہ مہارت تھی۔ سعودیہ نے مجھے بطور ایویانکس انجینئر کے ہی ملازم رکھا تھا۔ PIA میں، میں بحیثیت جز بیڑا یکو یکو ایویانکس میں کام کر چکا تھا مگر یہ آج سے سات آٹھ سال پہلے کی بات تھی۔ پچھلے سات آٹھ سال سے میرا ایویانکس سے کوئی واسطہ نہیں پڑا تھا جس کے نتیجے میں ایویانکس سے متعلق زیادہ تر چیزیں میرے دماغ سے محو ہو چکی تھیں۔ مجھے اپنا کام کرنے میں معمول سے زیادہ وقت لگ رہا تھا جو میرے لیے فکرمندی کا باعث تھا۔ اپنی اس کمی کو دور کرنے کے لیے جب بھی مجھے موقع ملتا میں لائبریری میں جاکر مطالعہ کرتا۔ میرا مقصد ایویانکس کی بھولی ہوئی چیزوں پر جلد از جلد عبور حاصل کرنا تھا۔ میں جلد از جلد ایویانکس کی مہارت کی طرف لوٹ آنا چاہتا تھا لیکن کرٹ نے میرے لیے کچھ اور ہی منصوبہ بنا رکھا تھا۔ ایک صبح میرے پاس کرٹ کا فون آیا۔ "شرمی تم کو بلا رہا ہے۔ تم فوراً اس کے دفتر میں آجاؤ۔ میں تم سے وہیں ملوں گا۔"

جب میں شرمی کے کمرے میں جانے کے لیے ان کے دفتر کے دروازے سے میں داخل ہو رہا تھا تو مجھے مرحبا کی گرجدار آواز سنائی دی۔ خیال ہوا کہ شاید میرے پیچھے کوئی اور بھی آرہا تھا کہ جس کے استقبال کے لیے شرمی نے یہ مرحبا کی توپ داغی ہے۔ میں اس آنے والے کو راستہ دینے کی خاطر دروازے کی ایک طرف ہوگیا لیکن میرے پیچھے کوئی اور نہ تھا۔ شرمی نے یہ توپ مجھ ناتواں کے لیے ہی داغی تھی۔

اس سے قبل میرا مرحبا سے صرف اتنا واسطہ پڑا تھا کہ کراچی میں ایک چھوٹا سا ہوٹل نما چائے خانہ تھا جس کا نام مرحبا تھا۔ کالج کے زمانے میں کبھی کبھی میں وہاں پر دوپہر کا کھانا کھانے چلا جایا کرتا تھا مگر اس جگہ پر تو توپیں نصب نہیں کی گئی تھیں۔ میں کسی گرج چمک کے بغیر ہی کوئی خالی کرسی کھینچ کر اس پر بیٹھ جایا کرتا تھا۔ میں جیسے ہی کرسی پر بیٹھتا فوراً ایک بیرا اس اہتمام کے ساتھ کہ اس کے ہاتھ میں پانی سے بھرے تین گلاس ہوتے اور ہر گلاس میں اس کی ایک ایک انگلی ہتھیلی تک ڈوبی ہوئی، میرے سامنے آکھڑا ہوتا۔ ان تین گلاسوں میں ایک گلاس میرے سامنے ٹھاک کرکے رکھتا اور حکم دیتا۔ "آرڈر کریں۔"

مرحبا کی اس مناسبت سے میں نے شرمی سے مؤدبانہ عرض کیا۔ "حکم کریں۔"

شرمی نے کہا۔ "یا اخی۔"

میں نے کہا۔ "جی حضور۔"

بولے۔ "یا اخی (اے میرے بھائی) کرٹ کا کہنا ہے کہ تم کو بھی جہاز کی خریداری میں شامل کرلیا جائے۔"

میں نے نئی نئی نوکری شروع کی تھی۔ ابھی میرے پاس اتنے پیسے جمع نہیں ہو پائے تھے کہ میں اپنے لیے کوئی گاڑی ہی خرید سکوں۔ میں اس خوش فہمی میں مبتلا ہوگیا کہ شاید شرمی میرے سعودیہ سٹی سے دفتر آنے جانے کے لیے میرے لیے کوئی چھوٹا جہاز خریدنا چاہتے ہیں لیکن سعودیہ سٹی میں تو کوئی لینڈنگ اسٹرپ تو تھی ہی نہیں کہ جس پر کوئی جہاز اتارا جاسکے۔ ہاں سامنے والی سڑک پر ضرور اس جہاز کو اتارا جاسکتا تھا مگر اس کے لیے اس سڑک پر ٹریفک رکوانی پڑتی۔ اس لحاظ سے جہاز کا آنا جانا تو مشکل معلوم ہوتا تھا۔ ہاں مگر ہیلی کاپٹر خریدا جاسکتا تھا کہ اس کے لیے سڑک کی ٹریفک روکنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ اس مقصد کے لیے سعودیہ سٹی میں ایک ہیلی پیڈ بنایا جاسکتا تھا جس پر ہیلی کاپٹر باآسانی اتارا جاسکتا تھا۔

میں نے شرمی سے تصدیق کرنا چاہا کہ کیا ہیلی کاپٹر خریدنے کا ارادہ ہے تو انہوں نے واضح کر دیا کہ وہ ہیلی کاپٹر نہیں بلکہ جہاز خریدنے کی بات کر رہے ہیں۔ وہ مالک تھے۔ جو چاہے خریدتے۔ طیارہ لینڈ کروانا ان کا درد سر تھا۔ میرا نہیں۔ میں تو صرف دفتر آنے جانے سے سروکار رکھتا تھا لیکن ایک فکر ضرور تھی۔ کہیں اس کا کرایہ تو نہیں دینا پڑے گا۔ اور اپنے اس خدشے کا میں نے اظہار بھی کر دیا مگر اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سوال کا جواب دینے کی بجائے شرمی نے حیرت کا اظہار کیا۔ "تم کرائے کے لیے کیوں پریشان ہو؟ کرایہ تو اس میں سفر کرنے والے مسافر دیں گے۔"

اب مجھے شک گزرا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ شاید یہ جہاز میرے لیے نہ ہو۔ اپنے اس اندیشے کو دور کرنے کی خاطر میں نے پوچھا۔ "تو کیا میں اس جہاز میں سفر نہیں کر سکتا؟"

بولے۔ "ضرور۔ جب بھی تم کو یورپ جانا ہو اس میں چلے جانا۔"

میں یورپ کے سہانے خوابوں میں کھو گیا۔ کرٹ کی آواز مجھے یورپ کے جہاز سے اتار کر واپس شرمی کے دفتر میں لے آئی۔ "دراصل ہم مزید L-1011 جہازوں کے خریدنے کی بات کر رہے ہیں۔"

کرٹ کی اس وضاحت سے دو باتیں ہوئیں۔ ایک تو یہ معلوم ہو گیا کہ کس جہاز کی خریداری کی بات ہو رہی ہے۔ دوسری یہ کہ میری امیدوں پر پانی پھر گیا۔

خریداری کی تفصیل بتاتے ہوئے کرٹ نے کہا۔ "اس وقت ہمارے پاس دس L-1011 جہاز ہیں جن کو ہم اپنی یورپ اور ہندوپاک کی پروازوں کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ اس کے علاوہ ہم نے تین L-1011 جہاز اور آرڈر کر رکھے ہیں جو اگلے چند ماہ میں سعودیہ کے بیڑے میں شامل ہو جائیں گے۔"

کرٹ کی ادھوری بات کو شرمی نے اچک لیا۔ "مگر اب سعودی عرب آنے جانے والوں کی تعداد اتنی بڑھ چکی ہے کہ ان تین نئے جہازوں کی ہمارے بیڑے میں شمولیت کے باوجود، ہم اس بڑھتی ٹریفک کو نہیں سنبھال پائیں گے۔ ہمیں فوری طور پر مزید چار L-1011 جہاز خریدنے پڑیں گے۔ کرٹ کا مشورہ ہے کہ میں ان جہازوں کی خریداری کے لیے جو ٹیم تشکیل دوں اس میں تمہیں بھی شامل کیا جائے۔"

اب مجھ پر یہ راز کھلا کہ مجھے شرمی کے دفتر میں کیوں بلایا گیا تھا۔ یہ سب مکافات عمل تھا۔ جہازوں کے مواصفات کے پروجیکٹ کو تین مہینے کی بجائے تین ہفتے میں مکمل کرنے کے گناہ کبیرہ کا۔ میری گردن اس کام کے لیے پھنس چکی تھی جس کا علم میرے فرشتے بھی نہیں رکھتے تھے اور ستم یہ کہ اپنی گردن سے اس پھندے کو نکال پھینکنے کی کوئی امید کی کرن بھی دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

ابھی تک میرا ایک بال بھی بیکا نہیں ہوا تھا۔ صرف زبانی جمع خرچ تھی۔ یہ صورت حال زیادہ دیر قائم رہنے والی نہیں تھی۔ میرا بال اگلے چند منٹ میں بیکا ہونے والا تھا۔ شرمی نے اپنے سامنے رکھی ہوئی تین چار ضخیم کتابوں کی طرف اشارہ کیا۔ "یہ وہ کنٹریکٹ ہیں جن کی بنیاد پر ہم نے لاک ہیڈ سے ماضی میں جہاز خریدے ہیں۔ ان میں وہ کنٹریکٹ امنڈمنٹ بھی شامل ہے جو لاک ہیڈ نے ہمیں تازہ ترین چار جہازوں کے لیے بھیجی ہے۔ ان تمام چیزوں کو اچھی طرح سے پڑھ کر ان پر تبصرہ کرو اور بتاؤ کہ ہم اس کنٹریکٹ کو آنے والے جہازوں کے لیے کس طرح سے سعودیہ کے حق میں بہتر بنا سکتے ہیں۔"

ابھی شرمی نے اپنا جملہ مکمل ہی کیا تھا کہ کرٹ نے مجھے مخاطب کرنے کے لیے اپنا منہ کھولا۔ لگتا تھا کہ ان دونوں نے میرے خلاف محاذ بنا کر شرمی کے دفتر کو دفتر کی بجائے ون ڈے کرکٹ کی پچ بنا رکھا تھا کہ جہاں بیٹسمین سنگل رن بنا کر دوسرے بیٹسمین کو باری دیتا ہے کہ وہ چھکا لگائے۔ اب کرٹ کے چھکا لگانے کی باری تھی اور ہاں ایلن کو بتا دینا کہ اب تم ابوباکس کی بجائے اس پروجیکٹ پر کام کرو گے۔"

پھر کچھ سوچتے ہوئے کرٹ نے اپنے احکام میں تبدیلی کی۔ "ایلن کو میں بتا دوں گا۔" اصل چھکا تو اب لگا تھا۔ "تم ایلن سے صرف L-1011 کے مواصفات اور اس کے ساتھ ساتھ جو جو تبدیلیاں اس میں کی گئی ہیں وہ ساری کتابیں لے لینا اور انہیں بھی پڑھ کر تیاری کر لینا۔"

یہ وہ چھکا تھا جو اسٹیڈیم کی عمارت کے بھی اوپر سے گزر گیا تھا۔ یک نہ شد دو شد۔ شرمی نے تو صرف کنٹریکٹ کے بوجھ تلے ہی دبایا تھا مگر اب ساتھ ہی ساتھ مواصفات پر بھی کام کرنا پڑے گا اور یہ سب مجھے اگلے چار دنوں میں لاک ہیڈ کی ٹیم اگلے ہفتے جدہ میں ہوگی اور ان تمام عوامل کے ساتھ طرہ یہ کہ کنٹریکٹ کے بارے میں میری معلومات صفر سے بھی کم تھیں اور مواصفات کے بارے میں صفر سے تھوڑی سی زیادہ۔ ڈاکٹر جے بی کوٹس ایک بار پھر میرے سامنے کھڑے مسکرا رہے تھے۔

L-1011 کے کنٹریکٹ کے پروجیکٹ پر مامور ہونے کے بعد ایلن کے لیے میرا وجود بے کار ہو چکا تھا۔ میری میز کرسی مجھ سے چھین کر دوسرے انجینئر کو دے دی گئی۔ میرے لیے سب سے پیچھے پڑی ہوئی میز کرسی کا انتخاب کیا گیا کہ غداروں کی یہی سزا ہے۔ حالانکہ ابوباکس سے کنٹریکٹ میں جانے کی غداری میں نے از خود نہیں کی تھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور نہ ہی میں اس سے خوش تھا۔ یہ غداری مجھ سے کروائی گئی تھی۔ مجھ سے اس غداری کے کروانے والے اپنے اس اقدام پر شاید خوش تو نہ ہوں مگر وہ میرے متعلق خوش فہمی میں ضرور مبتلا تھے جس کا خمیازہ ان کو بھگتنا ہوگا۔ مجھے اس کی پروا نہیں تھی۔ میرا خوف تو صرف یہ تھا کہ جب ان کی امیدیں ٹوٹیں گی تو میرا کیا بنے گا؟

میرا ابتدائی کام سرواصفات کے ساتھ نہیں تھا۔ اس پر دوسرے لوگ کام کر رہے تھے۔ میرے لیے اس کی بنیادی معلومات کافی تھیں۔ میرا اصل کام L-1011 کے کنٹریکٹ میں سعودیہ کے نکتۂ نظر سے بہتری لانا تھا۔ میں نے پورے دو دن اس کنٹریکٹ کے پڑھنے میں لگائے اور کنٹریکٹ لکھنے والے کی قابلیت پر عش عش کرتا رہا۔ کنٹریکٹ کا ایک ایک لفظ اپنے مقام پر نگینے کی طرح جڑا ہوا تھا۔ پھر مجھے یہ خیال آیا کہ میرا کام کنٹریکٹ کی تعریف و توصیف کرنا نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس اس کنٹریکٹ میں خامیاں تلاش کرنا تھا۔ ان دو دنوں میں مجھے اس کنٹریکٹ میں ایک بھی خامی دکھائی نہیں دی تھی۔

پھر تیسرے دن قسمت اچانک مجھ پر مہربان ہو گئی۔ مجھے اس کی ڈرافٹنگ میں ایک سجے کی غلطی نظر آ گئی۔ یہ صرف ابتدا تھی۔ ایک دفعہ اور پڑھنے پر دو اور سجے کی غلطیوں کا انکشاف ہوا۔ میرا پروجیکٹ مکمل ہو چکا تھا۔ اب میں بے تاب تھا کہ شرمیں کے دفتر جا کر ان کا دل خوش کر دوں۔ میں شرمیں کے دفتر کی جانب گامزن ہو گیا۔

نا معلوم کیا بات ہے کہ جب بھی میں کوئی بڑا کارنامہ انجام دے کر اس کی روداد اپنے افسر کو سنانے کے لیے جاتا ہوں تو میرا سینہ تن جاتا ہے۔ گردن اکڑ جاتی ہے۔ ہونٹوں پر مسکراہٹ فاتحانہ ہوتی ہے اور آنکھوں میں چمک۔ چال میں بھی کچھ کچھ شاہانہ پن آ جاتا ہے۔ میں اسی طمطراق کے ساتھ شرمیں کے دفتر میں داخل ہوا اور تینوں کی تینوں سجے کی غلطیاں ان کے سامنے ایک کے بعد ایک پیش کر دیں اور سوچنے لگا کہ جب شرمیں مجھے تحسین بھرے کلمات سے نوازیں گے تو میں کن الفاظ میں ان کا شکریہ ادا کروں گا۔ دل میں ایک جشن بپا تھا۔ ایک دو نہیں پوری تین سجے کی غلطیاں پکڑی تھیں میں نے۔

شرمیں نے میری طرف خونخوار نظروں سے دیکھا۔ مجھے محسوس ہوا کہ جیسے کچھ طیش میں ہیں۔ آنکھیں مل کر دوبارہ دیکھا۔ یقین ہو گیا کہ طیش میں ہیں مگر اس طیش کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ میں ابھی یہ عقدہ حل کرنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ شرمیں نے دھاڑنے کے لیے منہ کھولا مگر پھر غصے کا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اگر اس وقت سمندر بھی ان کے سامنے ہوتا تو وہ اس غصے کے سمندر کو بھی بغیر ڈکار لیے پی جاتے مگر سمندر پینے میں دو باتیں مانع تھیں۔ ایک تو یہ کہ جدہ کے سمندر کے پانی کو میٹھا پانی بنانے والے کارخانہ کو بند کرنا پڑتا اور دوسرے یہ کہ جدہ کی حیات آبی کو زمین پر آ کر سانس لینے کی عادت ڈالنی پڑتی۔

شرمیں اپنا غصہ پی نہیں سکے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ مجھ سے کچھ کہنا سننا فضول ہے۔ ”اس کمبخت کو بلاؤ جس نے مجھے اس جہنم میں جھونکا ہے۔“ ان کا اشارہ کرٹ کی طرف تھا۔ ”میں اس سے سمجھوں گا۔“ سارا غصہ انہوں نے کرٹ پر اتارنے کے لیے محفوظ کر لیا تھا۔ ان کا سیکریٹری کرٹ کو بلانے کے لیے بھاگا۔ کرٹ کے نصیب اچھے تھے۔ وہ نہ دفتر میں ملا اور نہ ہی بنگر میں۔ فی الوقت اس کی جان بچ گئی تھی۔

شرمیں نے اپنا نظامِ صوتی (ساؤنڈ سسٹم) فرشتوں سے کہہ کر اسپیشل آرڈر پر بنوایا تھا۔ اس کی ابتدا شیر کی سی گرج دار آواز سے ہوتی تھی۔ پھر یہ مردانہ آواز بتدریج لڑکی بولی پڑوسنوں کی آواز کی طرح باریک ہو جاتی مگر ایک فرق رہ جاتا۔ پڑوسنیں جب لڑتی ہیں تو باٹ دار آواز میں لڑتی ہیں تاکہ پورے محلے میں ان کی صوتی برتری کی دھاک بیٹھ جائے۔ شرمیں کی آواز کا معاملہ ذرا مختلف تھا۔ یہ آواز زنانہ آواز کے مرحلے میں داخل ہونے کے بعد نحیف ہو کر بمشکل سنائی دیتی تھی۔ یہ آواز اتنی آہستہ ہو جاتی تھی کہ کان ان کے منہ کے قریب لے جا کر سننا پڑتا تھا کہ وہ کیا کہنا چاہ رہے ہیں۔ اس تلخ مرحلے سے ہم سب لوگ اس وقت گزرتے ہیں جب اپنا محبوب ترین ڈراما (آج کل حالاتِ حاضرہ کے پروگرام کہ اب ان میں زیادہ چسکا ہوتا ہے) ٹی وی پر دیکھ رہے ہوں اور ٹی وی کا گلا عین اس وقت رندھ جاتا ہے جس وقت ہیرو اور ہیروئن حاصلِ ڈراما مکالمہ ادا کر رہے ہوں اور ہیروئن کی آئندہ زندگی کا انحصار اس حاصلِ بیان مکالمے پر ہو۔ اس وقت پورا خاندان ٹی وی سے آنکھیں ہٹا کر اپنے اپنے کان ٹی وی اسپیکر سے لگا دیتا ہے اس امید کے ساتھ کہ شاید اس جان لیوا مکالمے کا کوئی ایک آدھ لفظ کانوں کو ٹھنڈک اور دل کو سکون پہنچا سکے لیکن شرمیں کا معاملہ ٹی وی کے ڈراموں سے مختلف تھا۔ شرمیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جب آواز کے اس کمزور مرحلے پر پہنچے تھے تو وہ اشاروں میں باتیں کرنا شروع کر دیتے تھے کہ ان کی زبان ان کے جذبات کا ساتھ دینا چھوڑ چکی ہوتی تھی۔ اس وقت بھی وہ اسی کیفیت پر پہنچ چکے تھے۔ لہٰذا زبان استعمال کرنے کی بجائے انہوں نے مجھے ہاتھ سے دفع ہو جانے کا اشارہ کیا۔
میں نے خیریت اسی میں جانی کہ جلد سے جلد ان کی نگاہوں سے دور ہو جاؤں۔ ان کے دفتر سے نکلتے وقت میرے پسینے کا ناؤ معمول پر آ چکا تھا۔ چال بھی مناسب تھی۔ صرف پیشانی کو نہانے والے تولیے کی حاجت محسوس ہو رہی تھی اور گلا خشک ہو رہا تھا۔ باقی سب کچھ اللہ کا شکر ہے ٹھیک تھا۔
اپنی سیٹ پر واپس آ کر میں نے ساری کتابیں میز پر رکھیں۔ پیشانی کو پسینے سے پاک کیا اور پانی پینے چلا گیا۔ پانی پینے کے بعد میں واپس اپنی سیٹ پر آ کر بیٹھ گیا۔
کریم میری تمام حرکات و سکنات دیکھ رہا تھا۔ پوچھنے لگا۔ ''خیریت، کیا شرمی نے کچھ کہہ دیا؟''
''نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''شرمی تو بہت خوش ہوا میرا کام دیکھ کر۔'' اس سے پہلے شاید میں نے اتنا سفید جھوٹ کبھی نہ بولا ہو۔
کریم نے میری بات سن کر پوچھا۔ ''پھر آخر تم اتنا بے حال کیوں ہو؟''
میں نے جواب دیا۔ ''دفتر میں گرمی بہت تھی۔ میں کینیڈا میں اتنے سال رہنے کے بعد گرمی نہیں برداشت کر سکتا۔''
میرا یہ جواب کریم کو تسلی بخش لگا۔ وہ خود بھی جدہ کی گرمی کا ہر وقت شاکی رہتا تھا۔ گرمی کی یہ شکایت میرا آج کا دوسرا سفید جھوٹ تھا۔ دسمبر جنوری کے مہینوں میں جدہ کا موسم اچھا خاصا خوشگوار ہوتا ہے۔
کریم سے فارغ ہو کر میں علامہ اقبال کے سے انداز میں اپنے سیدھے ہاتھ کی مٹھی پر اپنا گال رکھے سوچنے لگا کہ آخر میرے ساتھ اس قدر خوشگوار واقعات اتنے تسلسل اور تواتر سے کیوں پیش آتے ہیں۔ میں اپنی ان ہی سوچوں میں غرق تھا کہ کسی نے میرے شانے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے سر اٹھا کر دیکھا تو یہ کرٹ تھا۔ میں اپنے خیالوں میں اتنا کھویا ہوا تھا کہ مجھے اس کے آنے کا پتا ہی نہ چلا۔
''کن سوچوں میں گم ہو؟'' کرٹ نے پوچھا۔
''کچھ نہیں۔ کوئی خاص بات نہیں۔'' میں نے بے رخی سے جواب دیا۔

کرٹ بلا کا ذہین اور موقع شناس آدمی تھا۔ وہ مزید پوچھ گچھ کر کے مجھے خفت میں نہیں ڈالنا چاہتا تھا۔ اس نے مجھ سے صرف میری رپورٹ مانگی۔ رپورٹ تو تھی ہی نہیں۔ صرف میں نے ایک صفحے پر چند لائنیں لکھی تھیں۔ وہ صفحہ میں نے کرٹ کو تھما دیا۔ کرٹ نے میرا کاندھا تھپتھپایا اور اپنے دفتر لوٹ گیا۔
کنٹریکٹ میں کام کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔ تلخ تھا۔ میں اپر باکس میں واپس جانا چاہتا تھا۔ اگلے روز میں دفتر پہنچا تو میں نے کرٹ سے اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ اس کا جواب دوٹوک تھا۔
''یہ کوئی ایسی خاص بات نہیں ہے کہ جس کی وجہ سے تم اپنے حوصلے پست کرو اور کام کرنا چاہتے ہو یہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے۔'' پھر کرٹ نے مجھے الٹی میٹم دیا۔ ''مجھے اپنا آخری فیصلہ آج ہی بتا دینا۔ اس لیے کہ اگر تم دم دبا کر بھاگنا چاہتے ہو تو مجھے تمہاری جگہ کسی اور کا انتخاب کرنا پڑے گا۔''
اپنے پست حوصلوں کو اٹھا کر کھڑا کرنے کے لیے دو طریقے تھے۔ ایک تو یہ کہ کسی کرین کو استعمال کیا جائے اور دوسرا طریقہ مثبت سوچ کا تھا۔
ان دنوں مثبت سوچ کا بڑا چرچا تھا۔ بعض نفسیاتی ڈاکٹروں نے ایسے کلینک بھی کھول رکھے تھے جن میں دو طرح کے خواب دکھائے جاتے تھے۔ سبز باغوں والے خواب اور مثبت خواب۔ لیکن خواب میری منزل نہ تھے۔ مجھے ٹھوس کامیابیوں کی ضرورت تھی۔
مجھے یقین تھا کہ میری کامیابیوں کی فہرست لیلیٰ کی زلف کی طرح دراز ہو گی لیکن نیا زمانہ تھا۔ نیا دور تھا۔ نئے فیشن تھے۔ لیلیٰ کی زلف دراز زلف بریدہ میں تبدیل ہو چکی تھی۔ میری کامیابیوں کی طویل فہرست کا لامتناہی سلسلہ ایک سے شروع ہو کر ایک پر ہی ختم ہو چکا تھا۔
اس کامیابی کا سہرا پاکستان کے نظامِ تعلیم کے سر تھا کہ جنہوں نے میری جیسی ذہانت رکھنے والے طالب علم کو کامیابی کے ساتھ انجینئر بنا دیا تھا اور وہ بھی بغیر نقل کیے۔ سفارش کا بھی اس میں کوئی دخل نہیں تھا حالانکہ پاکستان میں ہر طرح کا کام کروانے یا کامیابی حاصل کرنے کے لیے اعظم برادران میں سے کسی ایک کی ضرورت یقینی پڑتی ہے۔ اسمِ اعظم کی یا تائیدِ اعظم کی۔ لیکن مجھے اعظم برادران کے آگے دستِ سوال دراز کرنے کی ضرورت نہیں پڑی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاکستان کا نظام تعلیم میرے جیسے لوگوں کو ہی بام عروج پر پہنچانے کے لیے معرض وجود میں لایا گیا ہے۔ ویسے تو بے شمار جگنو ہیں جو ہمارے نظام تعلیم کی ظلمت میں جگمگاتے ہیں لیکن یہ ایک جگنو اپنی مثال آپ ہے۔ قابل ذکر و تحسین ہے۔

انجینئرنگ کے آخری سال میں (Electro magnetic fields) EMF کا کورس میرے سر سے کئی فٹ اونچا گزر رہا تھا۔ باوجود ہزار کوشش کے میری سطح دماغ پر آنے سے گریزاں تھا۔ جب یہ ظالم کسی طرح سے قابو میں نہیں آیا تو میں نے ارادہ کیا کہ میں EMF کا پرچہ سپلیمنٹری دے دوں گا کیونکہ اس کا اثر میری ڈگری پر پڑتا لیکن یہ طریقہ فیل ہونے سے زیادہ قابل عزت تھا۔ میں نے اپنے اس منصوبے کا ذکر اپنے دوستوں سے کیا۔ پہلے تو ان لوگوں نے اپنے آزمودہ دماغ کے ڈاکٹر کا پتا اور ٹیلی فون نمبر دیا پھر اس کے بعد ان میں سے دو دوستوں نے پیشکش کی کہ وہ EMF کے ایک ایک باب میں میری مدد کریں گے کہ وہ دونوں اسی باب میں طاق تھے۔ ایک کا بیڑہ میرے دن رات کے ساتھی غلام حسین نے اٹھایا اور دوسرے کا محمد خان نے۔

محمد خان منجھاں میرے عزیز دوست ہیں لمبا قد ہونے کے باوجود سال دو سال میں ایک آدھ بات ذہانت کی بھی کر جاتے ہیں۔ وہ اس خامی کو دور کرنے کی کوشش میں اکثر لگے رہتے ہیں تاحال ناکامی کا سامنا کرنے کے بعد وہ مایوس ہو چکے ہیں۔ اسی مایوسی کے عالم میں اسلام آباد میں "الفوز اکیڈمی" کو کامیابی کے ساتھ چلا رہے ہیں کہ جوانی کی غلطیوں کا ازالہ کر سکیں۔ بے داغ جوانی کے دھبوں کو اس خشوع و خضوع کے ساتھ دھو دھو کر دور کرنے کی یہ میں نے مکمل مثال دیکھی ہے۔ بے مثال آرٹی ہیں۔

مجھ پر خان صاحب کی خاص عنایت تھی۔ وہ مجھ سے بہت محبت کرتے تھے۔ ان کو میرے عادات و اطوار، میری شکل و صورت سے بھی زیادہ بھاتے تھے۔ وہ میرے نیک اور صالح اعمال سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ جس دن میرے نیک اور صالح اعمال میرے پچھلے دنوں کے نیک اور صالح اعمال سے فروغ تر ہوتے اس دن خان صاحب کے دل میں میری محبت کا سمندر جوار بھاٹا بن کر ٹھاٹھیں مارنے لگتا۔ اس وقت میرے لیے ان کی محبت کے جذبات تمام حدوں کو پار کر چکے ہوتے تھے اور وہ شفقت پدرانہ سے مغلوب ہو کر جھوم جھوم کر کف افسوس ملتے اور میرے NED میں داخلہ لینے کی حماقت کو یوں بتاتے "اگر تو NED نہ آ گیا ہوتا تو کراچی کا سب سے بڑا غنڈا ہوتا۔"

اگر اتفاقاً کبھی ان کی ملاقات کسی ایسے عادات و اطوار والے شخص سے ہو جاتی کہ جس سے یہ خطرہ ہو کہ شاید وہ کراچی کا سب سے بڑا غنڈا ہونے کا اعزاز مجھ سے چھین لے تو رات رات بھر وظیفے پڑھ پڑھ کر اس کے سدھرنے کی دعائیں فرمایا کرتے۔

حال ہی میں میری ملاقات خان صاحب سے اسلام آباد میں ہوئی تو مجھ سے تعزیتی انداز میں کہنے لگے۔ "میرا کلیجہ منہ کو آتا ہے کہ تو کراچی کا سب سے بڑا غنڈا نہ بن سکا۔ اگر بن گیا ہوتا تو یوں ساری دنیا میں دربدر کی ٹھوکریں نہ کھانی پڑتیں۔ کراچی کی ہر سیاسی جماعت تجھے سر پر اٹھا کر گھومتی۔"

خان صاحب نے میرے دل کی بات کہہ دی تھی مگر "اب کا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت" غلام حسین اور خان صاحب کی ان خلاکاریوں کا نتیجہ امیدوں کے بالکل برعکس نکلا۔ یہ دونوں حضرات جو EMF کے ماہر تھے۔ مشکل سے پاس ہونے کے نمبر حاصل کر سکے۔ میرا نتیجہ بھی غیر متوقع تھا۔ میرے اس مضمون میں سب سے زیادہ نمبر آئے تھے۔ اس سے بہتر نظام تعلیم کی مثال ساری دنیا میں مفقود ہے۔

اگر پاکستان کا نظام تعلیم میرا کچھ نہیں بگاڑ سکا تو شرمی کی کیا حقیقت کہ وہ میرا کچھ بگاڑ سکیں۔ صرف ایک مسئلہ باقی تھا۔ ایجابکس کی زلف ابھی تک میرے پاؤں میں الجھی ہوئی مواصلات اور کنسٹرکشن میں جانے کا میرا راستہ روک رہی تھی۔

میں چاہتا تھا کہ ایجابکس کی زلف برباد اور مواصلات اور کنسٹرکشن کی زلف دراز میں مقابلہ نہ ہو۔ ان میں راضی نامہ ہو جائے۔ اس طرح کہ "زلفوں نے تو پائی رخ تاباں کی معافی۔ چوٹی کو ملی بے ادبی با جبر پشت۔"

میں کرنٹ کے پاس جا کر اس کو اپنا فیصلہ سنانے کے لیے تیار تھا۔ زلفوں کے راضی نامہ کی دلی دبی خواہش بھی دل میں تھی۔

میں نے کرنٹ سے پوچھا۔ "کیا ایجابکس سے میرا تعلق برقرار رہے گا؟"

اس نے جواب دیا۔ "نہ صرف برقرار رہے گا بلکہ گہرا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تعلق ہوگا۔ لیکن یہ تعلق صرف نئے خریدے جانے والے جہازوں سے ہوگا۔ بینگر سے تمہارا تعلق ختم ہو جائے گا۔" یعنی یہ دلفیں اب بھی میرے ہاتھ سے سنور ہی گی۔

میں نے کرٹ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ "اپنے نئے مواصفات اور کنٹریکٹ کے انجینئرز سے ملیے۔"

کرٹ نے اپنی زندگی سے بھرپور مخصوص مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا۔ یہ لمبا مصافحہ تھا۔ ساڑھے چار سال چلتا رہا۔

ان دنوں سعودیہ کے شعبہ انجینئرنگ کی باگیں یاجوج ماجوج یعنی کرٹ اور فلاشنڈ گیرنگ کے پاس تھیں اور ان دونوں کی باگیں ٹرسچی کے ہاتھوں میں تھیں۔ یہ مثلث انجینئرنگ کے کل معاملات کا محافظ و نگہبان تھا۔ آج یہ مثلث لاک ہیڈ کی جدہ آنے والی ٹیم سے چار نئے جہازوں کی خریداری کے لیے نبرد آزما ہونے والا تھا۔ کچھ انجینئرز فلاشنڈ کے تھے اور کچھ کرٹ کے۔ میں کرٹ کے حصے میں تھا۔ مداری کا تماشا شروع ہونے والا تھا۔ ڈگڈگی کے اشارے کا انتظار تھا۔

میٹنگ کا آغاز ہو چکا تھا۔ دونوں ٹیموں نے اپنے اپنے مورچے سنبھال لیے تھے۔ سعودیہ میز کے اس طرف اور لاک ہیڈ میز کے اس طرف۔ ابھی میٹنگ کا پہلا مرحلہ چل رہا تھا۔ خوش اخلاقی کا بہترین مظاہرہ کرنا۔ موسم کی شکایت کرنا اور ایک دوسرے کے بال بچوں کی خیریت کی تفصیل معلوم کرنا۔ اگر یہ میٹنگ اندرون سندھ منعقد کی گئی ہوتی تو یہاں کے ڈھور ڈنگر بھی اپنی قسمت پر ناز کرتے کہ لاک ہیڈ والے ان کی بھی خیریت معلوم کر کے امریکا میں اپنے ہیڈ آفس کو تفصیل کے ساتھ نام بہ نام بتاتے۔ خوش اخلاقی کے اس مرحلے میں صرف نیک تمناؤں کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اس مرحلے کے دوران ہر دو فریق اپنے اپنے خنجر اپنے اپنے بریف کیس میں چھپائے رکھتے ہیں۔

میٹنگ کا دوسرا مرحلہ بین الاقوامی سطح پر دنیا کی ہر میٹنگ کا اہم ترین مرحلہ مانا جاتا ہے۔ اس مرحلے کو سرکاری طور پر اس کا جائز مقام دلوانے کے لیے روزِ اول سے اقوام متحدہ میں اس دن سے منظوری کے لیے پڑا ہوا ہے جس دن سے اقوام متحدہ قائم ہوئی ہے۔ اقوام متحدہ کے سرد خانے میں یہ دنیا کا سب سے قدیم ریزولوشن ہے۔ مسئلہ کشمیر سے بھی زیادہ قدیم۔ امید ہے کہ مسئلہ کشمیر کی طرح اقوام متحدہ اس مسئلے کو بھی فی الفور طے کروا دے گی۔ یہ مرحلہ چائے کا ہوتا ہے۔

دنیا کی ہر ایک میٹنگ کی کامیابی یا ناکامی کا سہرا چائے کے اچھے یا برے ہونے کے سر ہوتا ہے۔ چائے کے ساتھ ساتھ کافی بھی رکھی جا سکتی ہے۔ دونوں جڑواں بہنیں ہیں۔ دونوں کی مانگ میں گنجین بھرا ہوتا ہے۔ یوں تو شاید چائے کی سب سے زیادہ قسمیں سری لنکا میں پائی جاتی ہیں لیکن دنیائے عرب کی یہ ویت۔ الائچی اور لیموں کی آمیزش سے جو۔ جو شاندی بنائی جاتی ہے اس کا مقابلہ سری لنکا کی چائے کی کوئی بھی ورائٹی نہیں کر سکتی ہے۔ یہ جوشاندی نزلے کے لیے آزمودہ ہے لیکن مغربی دنیا نے ابھی اس کی قدر نہیں پہچانی ہے۔

ہمارے یہاں سندھ میں جب کسی محفل میں باتوں کا سلسلہ دم توڑنے لگے اور بات کرنے کے لیے کوئی موضوع نہیں مل رہا ہو یا جھگڑا اس حد تک بڑھ جائے کہ شرکائے محفل کے دست و گریباں ہونے کا خدشہ ہو تو لوگ از سر نو ایک دوسرے کی خیریت پوچھنا شروع کر دیتے ہیں۔ دنیا کی تقریباً ہر میٹنگ بھی اس تعطل یا جھگڑے کے امکانات کے دور سے گزرتی ہے۔ اس نازک مرحلے سے گزرنے کے لیے دو میں سے ایک ترکیب کارگر ہوتی ہے۔ یا تو میٹنگ ختم کر دی جائے یا پھر سندھ کے دستور کی پیروی کرتے ہوئے چائے کا ایک دور اور چل جائے اور ایک دوسرے کی خیریت دوبارہ سے پوچھی جائے۔ جیسے عام طور سے سندھ کی ہوتی ہے۔

ہماری میٹنگ دوسرے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی۔ لاک ہیڈ والے بوڑھے اور لیموں والی چائے کی تاب نہ لا سکے لیکن عربی کافی، جو الائچی استعمال کر کے بنائی جاتی ہے، یہ سب اس پر ٹوٹ پڑے۔ عربی کافی نہایت لذیذ ہوتی ہے۔ چھوٹے سے فنجان میں اس سے بھی چھوٹی (کم) مقدار میں پیش کی جاتی ہے۔ پہلے منہ میں ایک کھجور رکھ کر عربی کافی چھوٹے چھوٹے گھونٹوں (گھونٹ) میں پی جاتی ہے۔ اس کا مزہ ہی اور ہوتا ہے۔

میٹنگ کا اہم ترین مرحلہ یعنی چائے کا مرحلہ ختم ہو چکا تھا۔ اب موقع تھا کہ دونوں ٹیمیں اپنے اپنے ہاتھ اپنے اپنے بریف کیسوں کی طرف بڑھائیں تاکہ شکوہ شکایت کے مرحلے کا آغاز کیا جا سکے۔ اس مرحلے کا آغاز کچھ اس طرح سے ہوتا ہے کہ "تھوڑے شکوے بھی ہوں کچھ شکایت بھی ہو۔ تو مزہ جینے کا اور بھی آتا ہے۔"

اس شکوہ اور شکایت کے نتیجے میں مزے یا بدمزگی کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوتا فریقین کی نسبت پر ہوتا ہے۔ یہ میرے کئی نے والے پچیس سال کے تجربے کا نچوڑ ہے۔

جہاں فریقین کے شکوے شکایت بجا ہوں۔ ایمانداری پر مبنی ہوں اور دل میں ان کو دور کرنے یا ان کا ازالہ کرنے کی خواہش سچی اور برحق ہو۔ وہاں پر ہر شکوہ کا حل نکل آتا ہے۔ ایسا حل جو تمام فریقین کے لیے قابل قبول ہو مگر جس شکوہ یا مسئلہ کے در پردہ اول روز سے ہی بدنیتی یا بے ایمانی چھپی ہوئی ہو۔ وہ مسئلہ کبھی حل نہیں ہوتا ہے، اور اگر کسی صورت سے حل ہو بھی جاتا ہے تو یا تو یہ حل دائمی نہیں ہوتا ہے یا پھر اس حل کی بنیاد کسی ایک یا زیادہ فریق کے حق کے قتل عمد پر قائم ہوتی ہے جو فریقین کے آئندہ کے کسی کاروبار کے لیے قاتل ہوتا ہے۔

ہماری اس میٹنگ میں کام کی ابتدا اس رپورٹ سے ہوئی جو میں نے رضوان کے ساتھ مل کر L-1011 کے مواصفات سے متعلق تیار کی تھی کہ یہی وہ بنیاد تھی جس کے مطابق سعودیہ کے ساتھ نمبر دو L-1011 جہاز تیار کیے گئے تھے۔ جس وقت میں نے یہ رپورٹ تیار کی اس وقت مجھے ٹھیک طرح سے علم نہیں تھا کہ جہاز کے خریداری کے کنٹریکٹ سے اور مواصفات کا تعلق واضح کیا تھا۔ اب یہ تمام گرہیں کھلنے والی تھیں۔

سعودیہ نے اپنے L-1011 جہازوں کے اڑانے اور ان کی مرمت اور دیکھ بھال کر کے جو تجربہ حاصل کیا تھا اس کی بنیاد پر وہ اپنے آنے والے چار نئے جہازوں میں کچھ تکنیکی تبدیلیاں چاہتی تھی۔ ان مطلوب تبدیلیوں کی تفصیل پہلے سے ہی لاک ہیڈ کو تبدیلی مواصفات، چینج رکویسٹ (CR) کے ذریعے مہیا کی جا چکی تھی۔ اب لاک ہیڈ کو یہ بتانا تھا کہ وہ مطلوبہ تبدیلیاں سعودیہ کو فراہم کر سکتے ہیں یا نہیں اور اگر فراہم کر سکتے ہیں تو یہ مفت ہوں گی یا قیمتاً فراہم کی جائیں گی اور کیا ان میں سے کسی تبدیلی کا اثر جہاز کی ڈلیوری پر ہوگا۔ یہی اس میٹنگ کا مقصد اولین تھا۔

بحث مباحثے کے بعد ان مطلوبہ تبدیلیوں میں سے چند ایک سعودیہ نے قبول کر لیں جو جہاز کے مواصفات میں شامل کر دی جائیں گی۔ باقی تبدیلیاں طاق نسیاں ہو گئیں۔ بنیادی طور پر زیر تبدیلیاں سعودیہ چاہتی تھی۔ معمولی نوعیت کی تھیں۔ یہ معاملات خوش اسلوبی سے طے پا گئے مگر ایک بڑا مسئلہ حل طلب رہ گیا، وہ مسئلہ تھا جہاز کی قیمت۔

لاک ہیڈ نے زیر بحث چار نئے جہازوں کے لیے جو قیمت تجویز کی تھی وہ ان تین جہازوں سے کہیں زیادہ تھی جو اگلے چند ماہ میں سعودیہ کے بیڑے میں شامل ہونے والے تھے۔ سعودیہ کے لیے یہ قیمت قابل قبول نہیں تھی۔ لاک ہیڈ کی ٹیم کا جواب دو ٹوک تھا۔ ”سعودی عرب تیل کی قیمت کم کر دے۔ ہم جہاز کی قیمت کم کر دیں گے۔“

ان کا موقف تھا کہ قیمتوں میں اضافے کی تمام تر ذمہ داری سعودی حکومت کے سر تھی۔ تیل کی قیمت میں اضافے کا اثر دنیا کے کونے کونے میں ہر ہر شے پر ہو رہا تھا۔ جیسے ہی تیل کی قیمت میں کمی آئے گی جہاز کی قیمت خود بخود کم ہو جائے گی۔ ہمارے کہے بغیر۔ یہ بحث ایک گھنٹے سے زیادہ چلتی رہی۔ آخر کار لاک ہیڈ کو ماننا پڑا کہ حاضرین میٹنگ سعودی عرب کی حکومت نہیں چلا رہے تھے۔ صرف چھوٹے چھوٹے جہاز اڑانے کے گناہ گار ہیں اگر ہم نے آج کی اس میٹنگ میں تیل کی قیمت آدھی کر بھی دی تو نہ صرف یہ کہ سعودی حکومت اس نئی قیمت کی پابند نہیں ہوگی بلکہ یہ بھی کہ لاک ہیڈ کے ہی کسی پرانے جہاز میں بٹھا کر ہم لوگوں کو اپنے اپنے ملک بھجوانے کا بندوبست بھی کر دے گی سوائے شرعی کے کہ ان کے معقول آرام کا بندوبست کسی بھی سعودی جیل میں کیا جا سکتا تھا۔ منطق لاک ہیڈ کی سمجھ میں آ گئی۔

یہی وہ مناسب موقع تھا کہ جب میٹنگ کے مرحلہ نمبر 2 یعنی چائے کے دور کی سب کو شدت سے یاد آئی۔ تازہ چائے کا آرڈر دے کر حاضرین میٹنگ نے سندھ کے روایتی انداز میں ایک دفعہ پھر سے ایک دوسرے کا حال احوال پوچھنا شروع کر دیا۔ وقت کی کمی کے باعث ذہور ذکر ایک دفعہ پھر اپنے ذکر سے محروم کیے جا چکے تھے۔

میٹنگ اپنے اختتام کو پہنچ چکی تھی۔ مجھ پر مواصفات تبدیلی مواصفات، تبدیلی کنٹریکٹ، چینج آرڈر، SCN وغیرہ وغیرہ کی آپس کی ہر قسم کی جائز و ناجائز رشتے داریاں عیاں ہو چکی تھیں۔ آنے والے چند سال میں یہی کچھ میرا اوڑھنا بچھونا دکھائی دیتا سب کچھ ہوگا۔

سعودیہ کے جہازوں کی خریداری میں میری انگلی کا لہو بھی شامل ہو چکا تھا۔ یہ صرف ابتدا تھی آنے والے چند سالوں میں سعودیہ جو نئے جہاز خریدے گا ان کے لیے میرا مزید لہو درکار ہوگا مگر اس کا نتیجہ کچھ ایسا نکلے گا اس کا پیشگی اندازہ نہ تھا۔

(جاری ہے)

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بٹگرام

محمد ایاز راہی

سکندر اعظم کی آمد سے قبل کا ایک شہر جس نے تاریخ کے بے شمار مدوجزر کو جھیلا۔ جہاں خون کی ندیاں بھی بہائی گئیں، مار دھاڑ ہوئی انھیں اور امن و ترقی کا پرچم بھی لہرایا۔ پھر بھی آج نظر انداز ہے۔

اپنی مٹی اپنی تاریخ اور اپنے لوگوں سے پیار کرنا ہماری پہچان ہے

رام داس کا چہرہ فرطِ عقیدت سے سرخ ہو رہا تھا اور میں اس کے سامنے بیٹھا غور سے اس کے چہرے کو تک رہا تھا۔ بات ہی ایسی تھی کہ کچھ دیر کے لیے سارا ماحول اور ہم سب یک لخت خاموش ہوگئے تھے۔ میرا ذہن اتھل پتھل ہو رہا تھا۔ یہ آج سے پانچ برس پہلے کی بات ہے۔ میں ان دنوں یہاں کے دو تین اضلاع (ایبٹ آباد۔ مانسہرہ۔ بٹگرام) میں رنگوں کی ترسیل کا کام کرتا تھا۔ یہ رنگ چونے (سفیدی) میں استعمال ہوتے ہیں۔ یہ کام جس میں عموماً

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اپنی گاڑی یا مخلف مالک کی گاڑی ضروری ہوتی ہے کہ اس کے بغیر یہ کام خاصا دشوار ہو جاتا ہے۔ میرا شمار ان زیبل کاروں میں ہوتا تھا جو اکثر پیدل یا کرائے کی گاڑیوں میں دھکے کھانے خوار ہوتے ہیں۔ بانجھ اور کاندھے بال کے بوجھ تلے دبے ہوتے ہیں اور پاؤں زمین کی کشش ثقل سے بوجھل۔ جنہیں اٹھانے کے لیے نہ صرف جسم و جاں کی سوچا توانائی صرف کرنی پڑتی ہے بلکہ جھوٹی آشا کا سراب بھی سامنے رکھنا پڑتا تھا۔ بہر حال یہ کام جہاں دوڑ دھوپ پر مشتمل مشقت طلب کام تھا وہاں تماشائے اہل کرم دیکھنے کا سبب بھی تھا۔ یہاں مجھے کسی دانش ور کا ایک خوب صورت قول یاد آ گیا کہ ہماری تعلیم میں یہی خامی ہے کہ ہم کتابیں تو پڑھتے ہیں مگر سفر کے ذریعے صحیفۂ قدرت کا مطالعہ یا مشاہدہ نہیں کرتے۔ میری مجبوری یا خوش قسمتی مجھے اس بیوپار میں گھسیٹ لائی تھی اور میں ایک بنجارے کی طرح نگری نگری گھومتا پھرتا بلکہ یہاں کے پہاڑ اور ان کی وادیاں میری جولا نگاہ ہوتیں "بستی بستی پربت پربت گاتا جائے بنجارہ ...... لے کر دل کا اکتارا۔"

میرے ہاتھ میں دل کا اکتارا تو نہیں، مال کا پشتارا ضرور کاندھوں پر ہوتا۔ ایسے میں میری پوری کوشش ہوتی کہ اگر بنجارے کی طرح گا نہ سکوں تو کم از کم مشاہدہ ہاتھ سے نہ جانے دوں۔ دراصل بیٹھے کا موزی روگ زیادہ کام کرنے دیتا ہے نہ زیادہ آرام۔ دونوں صورتوں میں یہ بگڑ اٹھتا ہے۔ زیادہ کام کی صورت میں اک نا قابل برداشت تھکن ہڈیوں میں اتر جاتی ہے اور آدمی بے سدھ ہو جاتا ہے۔ راولپنڈی اور شیخوپورہ میں میرے ساتھ تلہ گنگ کے ایک مزدور نگراں تھے سید قاسم علی شاہ مرحوم۔ ذیابیطس سے عاجز ہو کر کہتے۔ "ابا زا تھکیڑہ بدہوں ہو ہی رہا اے"۔ بہر کیف میں طلوع آفتاب سے پہلے علی الصباح گھر (گلی باغ) سے نکلتا، مانسہرہ پہنچتا۔ سورج پہاڑوں کی اوٹ سے جھانک کر اپنے سفر کا آغاز کرتا تو میں بھی کرائے کی گاڑی میں شمال کی جانب عازم سفر ہوتا۔ راستے میں مختلف شہر آتے۔ شنکیاری جہاں سے پہاڑوں پر چڑھنے، سفر کی ابتداء ہوتی۔ یہ وہی شنکیاری ہے جہاں 1970ء کے لگ بھگ چند سال پہلے اور پھر کچھ برس بعد تک پاکستانی اردو، پنجابی فلموں کی عکس بندی ہوتی رہی ہے۔ ان میں سے دو فلمیں تو میں نے دیکھ رکھی ہیں۔ اردو فلم "زہر اور زندگی" وحید مراد مرحوم۔ شبنم ذرا۔ پنجابی فلم "دو چڑا ماراں دے" عالیہ اعجاز حبیب

روز بڑا اچھی موسیقی بھی ان فلموں کی پہچان ہے۔ قدیم فوجی چھاؤنی بھی شنکیاری کا امتیاز ہے۔ پھر 18 اکتوبر کے زلزلے کی تباہی بھی نا قابل فراموش ہے۔ آگے چل کر پہاڑوں میں "بٹل" نام کا شہر آتا ہے جو کسی زمانے میں دیسی گھی کی فروخت کے لیے مشہور تھا۔ بزرگوں کا کہنا ہے کہ ان دنوں بٹل شہر کے بازار میں داخل ہوتے ہی خالص اور عمدہ دیسی گھی کی خوشبو آدمی کو گھیر لیتی تھی۔ اب یہ بات قصہ پارینہ ہو گئی ہے۔ بلند و بالا پہاڑوں کے نشیب و فراز سے ہوتے کچھ اور آگے بڑھیں تو چھتر پلین کا بڑا قصبہ اور بازار آتا ہے جو ان پہاڑوں میں تھوڑا سا میدانی علاقہ ہونے کی بنا پر معروف ہے۔ واپس آنے میں دوپہر کا کھانا یہیں پر کھاتا۔ مجھے دفت نہ کی کی۔ باسی، دال یہ رکاب رکھتی۔ سو یہ مختصر سا مشاہدہ بھی حصے میں آتا اور وہاں سے کھانا کھا کر فرنٹ نکل کھڑا ہوتا کیونکہ کرائے کی گاڑیاں اپنی مرضی اور صوابدید پر چلتی ہیں۔ مسافر عموماً مجبور ہوتے ہیں۔ شمالی علاقہ جات کے یہ پہاڑ جہاں بلندی و سربلندی کا لطف اور احساس دلاتے ہیں وہیں ان کی تاریک گہرائیاں دیکھ کر خوف سے آنکھیں مند جاتی ہیں جو یقیناً خوں خوار پہاڑی درندوں کا مسکن ہوتے ہوں گے۔ اللہ پناہ دے۔ آسمان سے باتیں کرتے سیدھے کھڑے چیڑھ کے وافر اور بے شمار درختوں کا ذخیرہ اندھیرا سا کیے رکھتا ہے جس میں کہیں کسی اندھے، بہتے چشمے کا رواں پانی زندگی کی علامت ہوتا ہے۔ یہاں اکثر گاڑیاں کھڑی نظر آتی ہیں۔ یہ صاف و شفاف، تازہ اور صحت بخش پانی پینے، گاڑیوں میں بھرنے اور انہیں دھونے میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ اکثر اتباں لیتے مسافروں کی چہلیں اور چہل قدمی کے مناظر دل بستگی کا سامان بنتے ہیں۔ بچوں کے خوشی سے کھلے چہرے اور پانی سے اٹھکیلیاں دیدنی ہوتی ہیں۔ ایک دفعہ بارش کا موسم تھا۔ دوران سفر ایک اونچی چوٹی پر سے گاڑی گزری تو نیچے وادی کے نشیب سے بادل کا ایک رنگین ٹکڑا اوپر اٹھتا نظر آیا۔ یہ نظارہ اس قدر دل فریب اور دل کش تھا کہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے سرمایہ حیات بن گیا۔ گاڑی کے دیگر مسافر تو اکثر اونگھتے یا سوتے نظر آتے مگر میری آنکھیں کسی بھوکے درندے کی مانند بے قراری سے آگے اور دائیں بائیں بھٹکتی رہتیں۔ کوئی بھی حسین دلربا منظر دیکھ چکنے کے بعد مزید کی ہوس اور تشنگی بڑھ جاتی۔ ایک بار انہی پہاڑوں میں سفر کرتے اچانک برف باری شروع ہو گئی۔ دور دور تک سفید روئی کے نرم نرم گالے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرنے بکھرنے لگے تو یوں لگا جیسے آسمان کسی شفاف رنگیں کی طرح روئی دھنک رہا ہو۔ میں نے بڑی خوش دلی سے دایاں ہاتھ گاڑی سے باہر نکالا۔ بوڑھے حلاج (آ ننان) کو بچی بھر کے باد ودی اور شکر روسہ کرر مرحبا کہا۔ جواباً میری پھیلی ہوئی ہتھیلی پر بھی ایک درخشندے برف مگر نرم گالے رکھے بہ بے گئے۔ یہ بھی قدرتی سوغات تھی۔

میری منزل ضلع بٹگرام ہوتا جہاں اہلِ ہنود کی خاصی تعداد آباد ہے۔ قیام پاکستان کے بعد کچھ اہلِ ہنود تو بھارت سدھار گئے اور کچھ نے یہیں رہنے کو ترجیح دی۔ سو یہیں کے ہو رہے۔ بٹگرام شہر اور اس کے مواضعات ہندوؤں کے ہی بسائے ہوئے ہیں۔ دیکھا جائے تو ہزارہ کے اکثر شہر قصبے گاؤں اور دیہات کے اصل باشندے ہندو ہی تھے جو صدیوں سے یہاں کے باسی تھے۔ جس کا واضح ثبوت آبادیوں کے نام ہیں جو انہی لوگوں کے تجویز کردہ تھے۔ مثلاً ہری پور، مانسہرہ، گاندھیاں، بفہ، بٹگرام وغیرہ۔

بٹگرام میرا ہر ہفتے جانا ہوتا۔ واضح رہے کہ لفظ بٹ یہاں کشمیری ذات والا بٹ نہیں ہے۔ ہندکو یا ہندی میں بٹ یا بٹہ پتھر کو کہا جاتا ہے اور گرام کے معنی گاؤں کے ہیں جیسے بٹگرام وغیرہ۔ وہ یہ ہندی نام تھا۔ مجھے ہندی جاننے کا شوق اہلِ ہنود کے قریب لے گیا۔ یہ لوگ بٹگرام بازار میں حکمت، طبابت اور جدید انگریزی طریقہ علاج سے منسلک تھے۔ بٹگرام بازار کو ایک قدرتی پہاڑی ندی یا نالہ دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے جس کے اوپر مضبوط اور پختہ پل باندھا گیا ہے۔ جہاں سے چھوٹی بڑی ہر قسم کی گاڑیاں گزرتی ہیں۔ ان اہلِ ہنود کی دکانیں پل کے اس طرف بھی ہیں۔ دونوں طرف کی دکانوں پر کام کرنے والے آپس میں رشتے دار بھی ہیں۔

ہندوؤں کی اس آبادی سے مجھے عجب سی انسیت محسوس ہوتی تھی۔ صرف اس لیے کہ ان کے پاس بھی علم کا کچھ حصہ ہے اور علم حاصل کرنے کی للک مجھ میں بھی ہے۔ میں نے ان کے بارے میں معلومات جمع کرنے کے ساتھ بٹگرام کے بارے میں بھی معلومات جمع کرنا شروع کر دی۔

میری معلومات کے مطابق بٹگرام خیبر پختونخوا کا وہ ابھرا ہوا شہر ہے جو 1301 اسکوائر کلومیٹر کے رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ 2004-05ء کی مردم شماری کے مطابق یہاں کی آبادی 361000 نفوس پر مشتمل ہے اور زبان پشتو۔

کچھ بلنڈرز یا غلطیاں ایسی بھی ہوتی ہیں جو آگے چل کر فائدہ پہنچا دیتی ہیں۔ خاص طور پر ایجادات کے شعبے میں ایسی مفید غلطیاں بہت ہو چکی ہیں۔ قدرت جان بوجھ کر ان لوگوں کے لیے غلطیوں کے مواقع فراہم کر دیتی ہے کہ ان کی غلطیوں سے کچھ فائدہ ہو جائے۔ ایسی ہی ایک غلطی الیگزینڈر فلیمنگ سے ہوئی۔ وہ ایک سائنس داں تھا اور اپنے کام خود ہی کیا کرتا۔ اس کا یہ کہنا تھا کہ میں کام کے دوران بھی سوچتا رہتا ہوں اور اس سوچ بچار میں کوئی روشنی میرے سامنے آجاتی ہے۔ اسے بہت سارے برتن دھونے تھے۔ یہ اس کے مزاج میں شامل تھا۔ صفائی کا خبط رکھنے والا شخص۔ اگر گھر میں ذرا سی بھی گندگی دیکھ لیتا تو اس کو الرجی ہو جاتی۔ اس نے ایک بڑی غلطی یہ کی کہ سنک میں گندے برتن چھوڑ کر تفریح کے لیے شہر سے باہر چلا گیا۔ اسے برتنوں کی صفائی کا خیال ہی نہیں رہا تھا۔ واپس آیا تو ان برتنوں میں گندگی کی وجہ سے پھپھوندیاں لگ چکی تھیں سوائے ایک حصے کے۔ وہ حصہ بالکل محفوظ رہا تھا۔ اس نے اس حصے کو کیپبل کا مشاہدہ کیا۔ اس پر ریسرچ کیا۔ اور آپ جانتے ہیں کہ اس غلطی کی وجہ سے کتنی بڑی دوا ہمارے سامنے آگئی۔

جی ہاں پنسلین۔ اس کامیاب اینٹی بائیوٹک کی ایجاد اسی طرح ہوئی تھی۔

مرسلہ: نزہت اباز، کراچی

سنسکرت میں بٹگرام کے معنی برہمن ذات کے لوگوں کا علاقہ۔ جغرافیائی اعتبار سے یہ ضلع کوہستان، قبائلی علاقہ کالا ڈھاکا، ضلع شانگلہ اور بالا کنڈ ضلع کے سرحد سے متصل ہے۔ وہ سب ڈویژن اور 20 یونین کونسل پر مشتمل ہے۔

سکندر اعظم نے 327 سال قبل مسیح میں یہاں حکومت قائم کر کے اسے ہند کے راجا ابسارا کو سونپا تھا۔ 2 سن عیسوی میں یہاں سیالکوٹ کے راجا رسالو کو شکست دے کر راجا سلیمان نے اپنی حکومت قائم کی۔ اس کی بہادری اور عوام پر خصوصی توجہ کی وجہ سے اسے عوام میں خاصی پذیرائی حاصل ہوگئی۔ لوگ اسے اپنا ہیرو قرار دینے لگے۔ بڑے بوڑھے بچوں کو اس کی بہادری، پیار و محبت کے قصے سناتے۔ اس کے قصے میں اس کی بیوی رانی کنگاں بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

شامل ہوئی۔ کنگلاں عقل و دانش، فہم و فراست اور حسن لازوال سے مالا مال تھی۔ اسے دیکھنے والا نظریں جھپکانا بھول جاتا۔

چینی سیاح ہوان سانگ جب سیاحت کی غرض سے یہاں آیا تو یہ علاقہ کشمیر کے راجا ورمن دھاتہ کے زیر حکومت تھا۔

997 عیسوی میں سلطان محمود غزنوی نے غزنوی حکومت قائم کی اور 1005 عیسوی میں خیبر پاس سے ہوتا ہوا ہند میں داخل ہوا۔ اس کے ساتھ ہی صوفیا کرام کی آمد شروع ہوگئی جو تبلیغ دین کے لیے خیبر پختون خواہ کے چپے چپے پر مرکز بناتے چلے گئے۔ یہ انہی صوفیا کرام کی محنت ہے کہ اس علاقے کے 99 فیصد لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ ہر طرف توحید کا پرچم لہرانے لگا اور مسلمانوں کی حکومت قائم ہوتی چلی گئی۔

مسلم اور ہندو شاہی نے ایک کے بعد ایک حکومت سنبھالی اور اس علاقے پر حکومت کی۔ ہندو شاہی میں راجا جے پال کے دور کو سب سے اچھا قرار دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ دور زیادہ طویل نہ تھا۔ محمود غزنوی نے راجا جے پال کو ہند پر پہلے حملے میں ہی شکست دے دی۔ یہ اس بات کا تاریخی ثبوت ہے کہ محمود کے پہلے حملے میں ہندو دور حکومت کا 11 ویں صدی میں خاتمہ ہوگیا اور کشمیری حکومت قائم ہوگئی جو کالاشان کے زیر نگرانی تھی اور 1063ء سے 1089ء عیسوی تک قائم رہی۔ 1112ء سے 1120ء تک راجا سوشالہ نے حکومت کی۔ بارہویں صدی میں اصالت خان نے محمد غوری کے انتقال کے بعد اس علاقے پر قبضہ کرلیا۔

1399ء میں شہنشاہ تیمور نے اس علاقے کو فتح کیا اور اپنے سپاہیوں کو یہاں نامزد کردیا کہ وہ اس علاقے پر قبضہ برقرار رکھیں۔ اس طرح ان کی اولادیں یہاں کی مقامی آبادی میں ضم ہوتی رہیں۔ 1472 میں شہاب الدین نے کابل سے آکر اس علاقے پر حکومت قائم کی۔ تیمور کے حکم پر ریاست پکھلی (مانسہرہ) قائم ہوئی جس کا دارالحکومت گلی باغ بنا۔ اس طرح بٹگرام کو ایک خاص اہمیت حاصل ہوگئی۔

لیکن 18 ویں صدی میں ترک حکومت کا خاتمہ سواتیوں کی وجہ سے ہوگیا۔ سواتیوں نے جلال بابا سے اتحاد کرکے ترک حکومت کا خاتمہ کیا تھا۔

سید جلال شاہ ترک فرمانروا سلطان محمود خرد کا داماد تھا۔ سلطان کی غیر موجودگی میں سواتیوں سے اتحاد کر کے جلال شاہ (جلال بابا) نے پکھلی سرکار (مانسہرہ) پر حملہ کیا اور ترک حکومت کا خاتمہ کردیا۔ اس نے ہزارہ ضلع کے بجالی، ہنگرائی، گریوال، موہیرہ وغیرہ کے علاوہ مانسہرہ، ایبٹ آباد، ہری پور اور بٹگرام پر مستحکم حکومت قائم کرلی تھی۔

جب احمد شاہ درانی نے اپنی حکومت پنجاب تک بڑھا لی تو ہزارہ بھی اس کے زیرنگیں آگیا۔ 18 ویں صدی میں اس حکومت کا خاتمہ ہوا۔

درانی حکومت کے خاتمے کے بعد بٹ گرام سکھوں کے زیرنگیں آگیا۔ مغلوں کی کمزوری نے ہی بٹ گرام پر سکھوں کی حکومت قائم کرائی تھی۔

سکھوں کی حکومت کا خاتمہ 1818ء میں ہوا اور حکومت برطانیہ نے اس علاقے کو اپنے زیرنگیں کرلیا۔ جب آزادی تحریک چلی تو بٹ گرام کے مسلمانوں کی بڑی تعداد نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا لیکن ذی حیثیت مسلمانوں اور ہندوؤں نے کانگریس کو پسند کیا۔ مسلم لیگ کے حامی زیادہ تھے اس لیے یہ علاقہ بھی پاکستان میں شامل کرلیا گیا۔ پاکستان کے قیام کے ساتھ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوگیا۔ اس کا اثر بٹ گرام پر بھی پڑا اور یہاں بھی فسادات کے شعلے بھڑکے جس کی وجہ سے ایک بڑی تعداد میں ہندو بھارت کی طرف ہجرت کر گئے اور بھارت سے آنے والے مسلمانوں کو ان کی چھوڑی ہوئی جگہ مل گئی۔

1993ء میں بٹ گرام کو تحصیل سے ترقی دے کر مانسہرہ سے الگ کر کے ضلع کا درجہ دے دیا گیا۔ ضلع دو سب ڈویژن یا تحصیلوں پر مشتمل ہے جس میں 20 یونین ہیں۔ الائی میں آٹھ یونین ہیں۔ بنا، بیلہ، پشاور، بیاری، جمبرا، پشتو، رانشنگ اور سکرگزہ۔ جب کہ بٹ گرام تحصیل میں 12 یونین ہیں۔ اجمیرا، بٹمان، بٹ گرام، بنا سوری، ککموری، تھاکوٹ اور ترانڈ۔ ضلع میں دو صوبائی اسمبلی کی نشستیں ہیں۔ PF59 اور PF60۔

18 اکتوبر 2005ء میں جب زلزلہ آیا تھا تو بٹ گرام بھی بہت زیادہ متاثر ہوا تھا۔ تقریباً 4500 افراد مارے گئے تھے۔ ان میں اہل ہنود کی تعداد کم ہے کیونکہ وہ تعداد میں بھی تو کم ہیں مگر جتنے بھی ہیں وہ خوش ہیں۔ سب کے سب وطن سے پیار کرنے والے ہیں۔ ان کے درمیان بیٹھ کر مجھے ہندی کی شدبد آتی جا رہی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کمسن جنگجو

ایک چونکا دینے والی تحریر کہ یورپ والوں نے ہی دہشت گردی شروع کی ہے

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

پوری دنیا میں اس وقت لاکھوں کی تعداد میں ایسے جنگجو بکھرے ہوئے ہیں جن کا بس ایک کام ہے۔ وہ دن رات موت بانٹتے رہتے ہیں۔ گولیاں برساتے رہتے ہیں۔ یہ کام کس طرح اور کہاں کہاں انجام دیا جا رہا ہے۔

دنیا بھر میں کسی نہ کسی جگہ ہر وقت کوئی نہ کوئی تنازعہ سر اٹھاتا رہا ہے اور کسی نہ کسی پیمانے پر جنگ کی سی صورت پیدا ہوتی رہی ہے۔ اب تو بین الاقوامی مبصر، تجزیہ نگار، رپورٹرز اور تجربہ کار اس بات کا بھی انکشاف کرنے لگے ہیں کہ دنیا کو بہت دھیرے دھیرے اور غیر محسوس طریقے سے تیسری عالمی جنگ کی جانب دھکیلا جا رہا ہے۔ اب روایتی جنگوں کی صورت حال بھی بدل گئی ہے اور سرحدوں کے تعین، ان کی رکھوالی اور پاسداری کے اصول بھی وہ نہیں رہے جو بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوتے تھے۔

طریقہ ہائے جنگ میں گوریلا جنگوں کی اہمیت بھی مسلمہ ہو چکی ہے۔ یہ درست ہے کہ ہر جگہ گوریلا لڑائی آسان یا ممکن نہیں ہوتی لیکن ان سے مقابلہ تو بہر حال کرنا ہی ہوتا ہے مگر ان گوریلا لڑائیوں میں نوجوان اور کم عمر جنگجوؤں کی شرکت ایک المیے سے کم نہیں۔

آج تک دنیا کے ان مختلف حصوں میں جہاں جنگیں برپا رہیں، بہت کم ہی لوگوں کو حقیقت کا علم ہوگا کہ ان جنگوں میں آٹھ سال کی عمر تک کے بچے اپنے دشمنوں سے نبرد آزما رہے جو شاید یہ بھی نہیں جانتے کہ جنگ کیا ہوتی ہے۔ ان جنگوں نے ایسے بچوں سے ان کی معصومیت تک چھین کر ان پر بڑا ظلم کیا ہے۔

لفظ انفنٹری فرانسیسی زبان سے ماخوذ ہے اور اس کے معنی بھی "بچہ" کے ہیں۔ عسکری اصطلاح میں پیدل فوج کو انفنٹری کہتے ہیں۔

انفنٹری کہنے کی وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ ایسے بچے ہوتے ہیں جو بالغوں سے نسبتاً کم حریت شناس ہوتے ہیں اور انہیں تربیت دینا نسبتاً آسان ہوتا ہے۔

گو کہ ایک 13 سالہ بچے کے پاس وہ طاقت نہیں ہو سکتی لیکن یہ زمانہ 47C1 اور ایم 16 جیسی ہلکی پھلکی رائفلوں کا زمانہ ہے اور کم عمر لڑکوں کو بالغوں کی طرح ان کے استعمال کی تربیت بڑی آسانی سے دی جا سکتی ہے۔ یوں تو جنگ خود ایک بڑی لعنت ہے۔ جنگ میں کمسن جانبازوں کی شرکت سے جو دہشت ناک تصاویر سامنے آئی ہیں ان سے جنگ کے نام پر ہی ہول آتا ہے۔

اقوام متحدہ کے ایک تخمینے کے مطابق اس وقت دنیا بھر میں 15 سال سے کم عمر کے دو لاکھ بچے ہتھیاروں کا بوجھ اٹھائے اپنے دشمنوں کے مقابل صف آرا ہیں۔

سلواڈور کی فوج میں زبردستی ان نوجوانوں کو بھرتی کیا گیا تھا جو ابھی 18 سال کی عمر کی حد بھی پار نہیں کر پائے تھے۔ 13 سال کے نوجوان لڑکوں نے ایتھوپیا کے لیڈر مینگستو ہیل مریم سے وفاداری نبھانے کی قسم کھائی تھی۔

افغان مجاہدین میں 9 سال تک کے بچے بھی شامل رہے ہیں۔ برما میں کارن قبائل کے سرکردہ افراد نے اپنے جنگلوں کی حفاظت کے لیے 12 سال کے بچوں کو بھرتی کیا تھا اور سلواڈور کے باغی چھاپہ ماروں کو یہ منفرد اعزاز حاصل تھا کہ لڑکوں کے ساتھ کم عمر ہتھیار بند لڑکیاں بھی ان کی صفوں میں شامل تھیں۔

ان جنگوں میں حصہ لینے والے بعض بچوں کے تصور سے ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

کمبوڈیا کے خمیر روج قبائل سے تعلق رکھنے والے بچوں کو اس حد تک احساس سے عاری کر دیا گیا تھا کہ وہ شہریوں حتیٰ کہ خود اپنے والدین کو بھی ذبح کرنے پر آمادہ ہو جاتے تھے۔

یوگنڈا کے عیدی امین کی فوج میں کمسن بچوں کی ایک ایسی جماعت بھی شامل تھی جو گہرے چشمے لگائے رہتی تھی۔ موزمبیق میں رینامو باغی شرپسند حکومت کے خلاف جنگ میں بچوں کا استعمال کر رہی ہے۔

رینامو فوجی بچوں کو اغوا کر کے انہیں نہ صرف لڑائی کی تربیت دیتے ہیں بلکہ جبراً شہریوں کو قتل کرنے اور ان کے اعضا کاٹنے پر بھی مجبور کرتے ہیں۔

یہ ضروری نہیں کہ ہمیشہ بچوں پر جبر کیا جائے۔ بعض اوقات وہ خود ہی رضاکارانہ طور پر اپنی خدمات پیش کرتے ہیں۔ دنیا کے وہ خطے جو آج بھی جنگ زدہ ہیں۔ مثلاً افریقہ جنوبی ایشیا اور مشرق وسطیٰ وغیرہ، وہاں افرادی قوت سب سے اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ان میں سے بعض علاقوں میں افرادی قوت کی شدید قلت ہے اور ان کی نصف آبادی 15 سال کے کم عمر افراد پر مشتمل ہے جو صحیح طریقے سے حوصلہ افزائی کرنے پر بڑے جوش و جذبے کے ساتھ جنگ میں شامل ہونا چاہتے ہیں۔

لڑکوں میں لڑنے بھڑنے کا رجحان ایک فطری تقاضا ہے۔ بڑی عمر کے لوگ سمجھتے ہی ہیں کہ یہ خاصیت کسی طرح بچوں میں سرایت کر جائے کیوں کہ بچوں میں یہ خواہش ہوتی ہے کہ وہ اپنے سے بڑوں کو خوش کریں۔ نوجوانی کی طرف گامزن ان بچوں کو اپنے مفاد کی خاطر ہتھیار تھما دینے والے ظالمین صرف مشرق میں ہی نہیں مغرب کے ترقی یافتہ ممالک میں بھی پائے جاتے ہیں۔

تاریخ کے مطالعے سے پتا چلتا ہے کہ جنگوں میں کمسن جانبازوں کی شرکت کوئی نئی چیز نہیں ہے۔ 13 ویں صدی میں ہونے والی صلیبی جنگ کے موقع پر یورپ سے ہزاروں لڑکوں اور لڑکیوں کو مسلمانوں سے جنگ کرنے کے لیے ارض مقدس فلسطین بھیجا گیا تھا تاکہ دشمن پر بھرپور رعب ڈالا جا سکے لیکن ان میں بیشتر راستے ہی میں بھوک، پیاس اور بیماریوں سے دم توڑ گئے جو بچ گئے انہیں بحری قزاقوں نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

قید کر کے غلام بنا لیا۔

جنگ کا ایک اپنا ہی سحر ہوتا ہے اور کسی جوش اور ولولے میں بڑوں کے ساتھ بچے بھی یکساں طور پر شامل نظر آتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہم جب چھوٹی عمر کے بچوں کو جنگ میں شریک دیکھتے ہیں تو مایوسی اور ناامیدی کے گہرے بادل چھا جاتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ روشن چمکدار ماحول سے ہم کسی انتہائی تنگ و تاریک کمرے میں داخل ہو گئے ہیں لیکن پھر بہت جلد اس تاریکی سے مانوس بھی ہو جاتے ہیں اور آنکھیں ہلکی روشنی میں بھی کام کرنے لگتی ہیں۔

دنیا میں اگرچہ اب بھی بہت سے خطے ایسے ہیں جہاں جنگ کی تباہ کاریاں جاری ہیں لیکن فی الحال افغانستان، برما، آئرلینڈ اور لاس اینجلس کا کچھ ذکر ہو جائے جہاں بچے بھی اس میں شریک ہوئے یا انہیں شریک ہونے پر مجبور کیا گیا۔

افغانستان...... یہ ہے افغان بچہ...... محمد انور، عمر 13 سال۔ اب تک وہ سات جھڑپوں میں حصہ لے چکا ہے۔ آخری بار گاؤں درہ نور کے باہر سرکاری چھاؤنی پر حملے کے دوران میں اس نے بہت قریب سے فائر کر کے ایک فوجی کو ہلاک کیا تھا۔ اس سے پہلے وہ اپنے ساتھی مجاہدین کے ہمراہ سرنگوں سے اٹے میدانوں سے سرپٹ بھاگتے ہوئے دشمن کی چوکی پر قبضہ کرنے کا شرف بھی حاصل کر چکا تھا۔ اس نے اپنے ایک دوست کے ساتھ پہاڑی سے نیچے اترتے ہوئے تین کابل فوجیوں کو گھیرے میں لے لیا تھا۔ اس کے دوست نے ایک فوجی کو گولی ماری باقی دونوں فوجیوں کو اس نے اپنی گولیوں کا نشانہ بنایا۔ بعد میں فوجیوں کے بے جان جسموں کو ٹھوکر مار کر دیکھا بھی کہ وہ زندہ تو نہیں ہیں اور پھر بڑے اطمینان سے ایک مردہ فوجی کے ہولسٹر سے ریوالور کو الگ کر کے اپنے قبضے میں کر لیا۔

محمد انور سے جب اس قتل کے بارے میں پوچھا گیا تو وہ کچھ پریشان سا ہو گیا لیکن اس نے کہا۔ "مجھے انہیں مار کر خوشی ہوئی۔"

اس جھڑپ میں محمد انور کے بڑے بھائی اور کچھ دوسرے مجاہدین نے چار فوجیوں کو پکڑ لیا تھا جنہیں ایک لائن میں کھڑا کر کے گولی سے اڑا دیا گیا۔

محمد انور سے جب اس کے بارے میں تاثرات معلوم کیے گئے تو اس نے بڑے سکون سے کہا۔ "مجھے خوشی ہوئی۔"

محمد انور ایک گڈریے کا بیٹا ہے اور وہ دس سال کی عمر سے لڑائی میں حصہ لے رہا ہے۔ وہ کبھی اسکول نہیں گیا۔ بلوری آنکھوں اور بھورے بالوں والے محمد انور کے چہرے پر اب معصومیت کی بجائے کرختگی آ گئی ہے۔

اگرچہ روس کی فوج کو افغانستان سے گئے ہوئے ایک طویل عرصہ بیت چکا ہے مگر روس اب بھی افغانی بچوں کے ذہنوں پر سوار ہیں اور وہ اپنے ہر دشمن کو "روس" ہی سمجھتے ہیں۔

☆☆☆

برما کے جنوب میں ایک آزاد ریاست کے قیام کا خواب سجائے 1948ء سے برما کے باغی قبائل اپنے حکمرانوں کے خلاف برسرِ پیکار ہیں۔ نصف درجن باغی قبائل میں "کارن" سب سے بڑا قبیلہ ہے۔

برما میں رہائش پذیر 30 لاکھ کارن افراد کی ایک چوتھائی آبادی گھنے جنگلوں میں روپوش ہو چکی ہے اور دنیا سے بالکل کٹی ہوئی ہے۔ ان کے بارے میں اکثر عیسائی مشنری تنظیموں سے کچھ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں۔

روئے زمین پر کارن چھاپا ماروں کو دنیا کا مہذب ترین چھاپا مار گروپ کہا جا سکتا ہے۔ برما کے گھنے جنگلوں میں قائم مانرپلا کے آرمی ہیڈ کوارٹر میں صاف ستھرے پریڈ کے گراؤنڈز ہیں۔ ٹیک کے بنے ہوئے فوجی افسروں کے کوارٹرز میں گیندے اور گلاب کے پھولوں کی سجی ہوئی کیاریاں بھی دیکھنے کو ملتی ہیں۔

صبح سویرے بگل کی آواز کے ساتھ نئے رنگروٹ نشانہ بازی کے لیے میدان میں جمع ہو جاتے ہیں۔ برما اور تھائی لینڈ کی سرحدوں کے بیچ جنگلوں میں اس باغی قبیلے نے زندگی کو بہت منظم رکھا ہے۔ پوری پابندی کے ساتھ گرجے میں حاضری دیتے ہیں۔ اپنے بچوں کو اسکول بھیجتے ہیں اور تعزیری قوانین کی سختی سے پابندی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں زنا کی سزا موت ہے۔ کارن قبیلے میں سیاسی لیڈر ان بھی ہیں جو خیالی دنیا میں رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں۔ ہر شام کو کارن کے آئین پر بحث کی جاتی ہے۔ اس میں ترامیم کی جاتی ہے تاکہ اسے آزادی ملنے کے بعد ان پر عمل کیا جا سکے۔ کارن لوگوں سے بات چیت کی جائے تو بالکل محسوس نہیں ہوتا کہ وہ نفرت کرنا بھی جانتے ہیں اور نہ ہی یہ بات دل کو لگتی ہے کہ جنگجو گوریلے اپنے بچوں کو دشمن سے مقابلے کے لیے اگلے محاذوں پر بھیجتے ہیں لیکن تلخ سہی یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ ایسا کرتے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

☆☆☆

دوپہر کا وقت ہے۔ کوموراؔ میں جہاں پانچ سو کارن نوجوانوں کو برما کی فوج نے اپنے گھیرے میں لے رکھا تھا۔ گولہ باری کا دوسرا دور شروع ہو چکا تھا۔ شیلنگ سے زمین کانپ رہی تھی۔ بانسوں کے گھنے جھنڈ کے قریب ایک مورچے میں لوگ چھپے بیٹھے تھے۔ سب خاموش تھے۔ جب بھی کوئی گولہ خندق کے قریب گر کر پھٹتا لوگوں کے چہرے سختی سے بھنچ جاتے لیکن ساکی مو کے چہرے پر سکون رہتا۔ ساکی مو تقریباً پندرہ سال کا تھا اور اسے نہ جانے کیوں یہ پختہ یقین تھا کہ اس کی موت کسی گولے پر نہیں لکھی ہے۔

گولہ باری کے ختم ہوتے ہی لوگ خندقوں سے باہر نکل کر معمول کے کاموں میں مشغول ہو گئے۔ ان کے معمولات میں سڑکوں پر چھاپہ چھاپنا بھی شامل ہے۔ اگر تمباکو ختم ہو جائے تو بھی ان پر اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ وہ اخبارات کے چھوٹے ٹکڑوں کو رول کر کے سگریٹ بنا کر پیتے ہیں کہ کسی بھی طرح دھواں ان کے اندر تو جائے۔ ساکی مو نے بھی اپنے منہ میں کاغذ کا ایک سگریٹ دبا رکھا تھا لیکن ایک سرے پر آگ نہیں جل رہی تھی شاید بڑوں کے ساتھ جنگ میں شریک یہ بچے ابھی کچھ زیادہ بڑے نہیں ہوئے کہ سگریٹ سلگا سکیں۔

کچھ ہی وقت پہلے کی بات ہے۔ ساکی مو پندرہ آدمیوں کی ایک گشتی پارٹی میں شامل جاسوسی کے مشن پر تھا کہ اچانک جنگل میں چھپی برمی فوج نے ان کو گھیرے میں لے لیا۔ انہیں اتنا موقع بھی نہیں مل سکا کہ کہیں چھپ سکیں۔ ساکی مو اور اس کے ساتھیوں پر جیسے سکتہ طاری ہو گیا تھا لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا کہ ٹریگر پر ان کی انگلیاں دبتی چلی گئیں۔ جنگل گولیوں کی آواز سے لرز اٹھا۔ جو بھی چیز ان کے سامنے نظر آئی آٹومیٹک رائفلوں نے انہیں بھون کر رکھ دیا۔ ساکی مو کو یاد نہیں وہ کتنی دیر تک کھڑا دیوانگی کے عالم میں فائرنگ کرتا رہا لیکن اس کے نتیجے میں یہ ہوا کہ برمی فوجی بھاگ گئے اور اپنے زخمی ساتھیوں کو بھی گھسیٹتے ہوئے اپنے ساتھ لے گئے۔

یہ پہلا موقع تھا کہ جب ساکی مو نے آمنے سامنے دشمن کا مردانہ وار مقابلہ کیا تھا اب بھی وہ ان لمحات کو یاد کر کے کانپ اٹھتا ہے۔

کوموراؔ کا آفیسر انچارج 54 سالہ میجر تھان مونگ بہت زیادہ تنہائی پسند تھا اور اس کی شخصیت میں ایک وقار بھی تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ 15 سال سے کم عمر کے لڑکوں کو فوج میں نہیں لیا جاتا اور اگر یہ بچے کسی پریشانی کا سبب بنتے ہیں تو ان میں سے بیشتر کو واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ جب یہ سوال کیا گیا کہ آخر سب بچوں کو واپس کیوں نہیں بھیجا جاتا تو قدرے توقف کے ساتھ انہوں نے جواب دیا۔

"یہ صورت حال پر منحصر ہے۔"

اور بعض اوقات صورت حال ایسی بھی ہو جاتی ہے کہ ہر جنگ میں لڑنا چاہے اسے لڑنا ہی پڑتا ہے اور جو نہ لڑنا چاہے اس کے ساتھ بھی زبردستی کرنی پڑتی ہے۔

ایک مرتبہ کارن کے ایک بریگیڈ نے رات کے وقت اچانک تھائی لینڈ کے ریفیوجی کیمپ پر دھاوا بول دیا اور 14 سے 40 سال کی عمر کے تمام مردوں کو پکڑ کر اپنے کیمپ میں لے آئے۔ عورتیں اور بچے رہ گئے انہوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ سیونتھ ڈے ایڈونٹسٹ اور بیپٹسٹ مشنری کے افراد کو جب یہ حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے کارن کے صدر جنرل بو میا سے سخت احتجاج کیا۔

دوسرے دن جبری بھرتی کیے گئے افراد واپس کر دیے گئے اور مشنریز کو بریگیڈ کمانڈر کی جانب سے ایک خط بھی ملا جس میں اس حرکت پر معافی طلب کی گئی تھی۔

لیکن جنگ کے روز و شب اگر طویل ہو جائیں تو تہذیب اور شائستگی سب بے کار کی باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اس سال ستمبر میں برمی فوج نے کارن باغیوں پر ایک زبردست حملہ کیا لیکن اس کے جواب میں انہیں اپنے چالیس ساتھیوں کو مردہ حالت میں چھوڑ کر بھاگنا پڑا۔ اس معرکے میں دو کارن بھی مارے گئے لیکن اس کے بعد نہ جانے سنجیدہ اور باوقار میجر تھان مونگ کو کیا ہو گیا کہ وہ بالکل بدل کر رہ گیا۔

اس واقعے کے بعد ایک صحافی نے کوموراؔ کا دورہ کیا تو اسے یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ میجر اپنے مورچے میں بڑے پرسکون انداز میں بیٹھا تھا اور اس کے ارد گرد درجنوں انسانی کھوپڑیاں لکڑیوں میں پروئی کھڑی تھیں اور جب ایک نوجوان کارن فوجی نے مذاق کے طور پر ان میں سے ایک کھوپڑی کے دانتوں میں سگریٹ پھنسانے کی کوشش کی تو میجر اسے مارنے کو دوڑا۔

ان ہی باغی کارنوں کے درمیان کیان بھی رہتا ہے۔ گیارہ سال کی عمر ہے لیکن اس کا قد اتنا چھوٹا ہے کہ کاندھے سے لٹکانے کے بعد اس کی ایم 16 رائفل زمین پر گھسٹتی تھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور اسے یہ ہتھیار لے کر چلنے میں بڑی دشواری ہوتی تھی لیکن اس کا حل یہ نکالا گیا کہ رائفل کے بٹ کو کاٹ کر چھوٹا کر دیا گیا لیکن اب بھی رائفل کا قد اس کے قد کے برابر ہی تھا۔ خود کو بڑا ثابت کرنے کے لیے اس نے اپنے دائیں بازو کو گود کر نقش و نگار بنا رکھے ہیں۔ اس کے دوسرے ساتھیوں کی طرح اسے .... گھنے جنگلوں میں مچھر بہت ستاتے ہیں اور جب اس پر ملیریا کا حملہ ہوتا ہے تو اس کا نمبر بجھ لینے یا سر پر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں رکھنے والا کوئی نہیں ہوتا۔ وہ چپ چاپ اپنے مورچے میں پڑا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ بخار خود ہی رفتہ رفتہ اتر جاتا ہے اور وہ دشمنوں سے مقابلہ کرنے کے لیے ایک بار پھر تیار ہو جاتا ہے۔

کیالن کو وہ دن یاد ہے جب کارن فوجیوں کے ساتھ برمی فوج کے خلاف تھائی لینڈ کے ایک گاؤں میں لڑ رہا تھا۔ اس جنگ میں 12 کارن اور 70 برمی مارے گئے تھے۔ کیالن کو لاشوں پر سے چھلانگ لگانے کا عمل تو یاد ہے لیکن اس سے زیادہ وہ اور کچھ نہیں جانتا اور نہ ہی یاد رکھنا چاہتا ہے۔ اسے تو بس یہ خبط ہے کہ کب اسے دوبارہ محاذ پر بھیجا جائے گا تاکہ اپنے دوستوں کو فارغ کر سکے۔

پہلے بھی وہ اس محاذ پر جا چکا تھا جو 27 میل لمبا تھا اور جہاں بارودی سرنگیں زمین میں چھپی تھیں۔ بانس کی قاتل نوکیلی شاخیں اور خاردار تاروں کی باڑھ ہر طرف پھیلی ہوئی تھی اور پرانی طرز کے پھٹنے والے دستی بموں سے بھی کام چلایا گیا تھا۔

کومورا میں آس پاس کے دیہات کے بچوں اور رضا کاروں کو 38 سالہ لیفٹیننٹ براؤن تربیت دیتا ہے۔ دس سال پہلے اس نے ایک بارودی سرنگ پر پاؤں رکھنے کی غلطی کی تھی جس کے نتیجے میں اس کے پاس صرف ایک پیر رہ گیا تھا اور اس کی وجہ سے وہ گشت پر بھی نہیں جا سکتا۔ مجبوراً بیٹھے بیٹھے ہی وہ تربیتی فرائض انجام دیتا ہے۔ براؤن اس بات پر مصر ہے کہ بچوں کو زبردستی محاذ پر نہیں بھیجا جائے اور اس کی کوشش ہوتی ہے کہ انہیں پیچھے رکھا جائے تاہم کچھ پس و پیش کے بعد اس نے اعتراف کیا کہ کچھ بچے جنگ کے لیے آگے نکل جاتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ زیادہ تر بچے اچھے لڑنے والے ثابت ہوتے ہیں۔ اگر شیلنگ ہو رہی ہو تو وہ خندقوں میں محفوظ مقامات پر پناہ لینے سے کتراتے ہیں۔ شاید وہ ''آتش بازی'' سے لطف اندوز ہونا چاہتے ہیں اور پھر انہیں خندقوں میں لانے کے لیے زبردستی کرنی پڑتی ہے۔

دس سالہ کی بارن بہت پھرتیلا اور پرجوش ہے۔ ٹانگیں پتلی ضرور ہیں لیکن سینہ گٹھا ہوا ہے۔ نیکر اور کی ہاؤس والی نیلی شرٹ میں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے وہ ابھی کھیل کے میدان سے آ رہا ہے یا کھیلنے جا رہا ہے۔ اس نے گشت پر فوجیوں کو دیکھا جو بارودی سرنگوں کے اس پار مٹی اور لکڑیوں سے اپنے مورچوں کو مضبوط کر رہے تھے۔ انہیں مارنے کے لیے جیسے ہی اس نے اپنی کاربائن اٹھائی اسے سختی سے ڈانٹ دیا گیا اور اتنا سنہرا موقع ضائع کرنے پر وہ دل مسوس کر رہ گیا۔ دوسرے بچوں کی طرح بھی اس وقت بہت غصہ آتا ہے جب انہیں ایمونیشن بچانے کی نصیحت کی جاتی ہے۔

کی باون کے پاس جو کاربائن ہے وہ اس کا پورا مالک نہیں ہے۔ بلکہ دو اور لڑکے بھی اس کاربائن کو استعمال کرتے ہیں۔ اس کے پاس اپنی یونیفارم بھی نہیں ہے۔ نہ ہی فلاوی ٹوپی ہے جس سے اس کا فوجی ہونا ظاہر ہو سکے لیکن اس نے بھی اپنے سینے اور بازو کو لکڑی کے کوئلے سے گود کر خود کو ایک فوجی ثابت کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔

کومورا میں نئے فوجیوں کی شدید ضرورت محسوس کی جا رہی ہے۔ شدید گرمی میں جنگل حبس سے بوجھل ہے۔ مانرپلا ہیڈ کوارٹر میں سو سے زائد نوجوانوں کو فوجی تربیت دی جا رہی ہے۔

ان میں سے بیشتر کی عمر 16 سے 18 سال کے درمیان ہے لیکن ان میں سے ایک درجن سے زائد 14 سال سے کم عمر بھی ہیں۔ یہ سارے رنگروٹ بچے مقامی کسانوں کے بچے ہیں اور انہوں نے اپنے اپنے لخت جگر کو جنگ کی آگ میں جھونک دیا ہے کیوں کہ یہ اسے اپنا فریضہ سمجھتے ہیں۔

13 سالہ اتنا بلے فوج میں شامل ہونے کے لیے اس وقت گھر سے بھاگا تھا جب اس کی عمر 12 برس تھی۔ وہ کبھی اسکول نہیں گیا اور نہ ہی جانا چاہتا تھا۔ اس کے دل میں ہمیشہ سے یہی خواہش تھی کہ وہ بھی اپنے باپ اور دو بھائیوں کی طرح فوجی جوان بنے لیکن اسے اب یہ فکر کھائے جا رہی تھی کہ یہ جنگ جو وہ لڑ رہے ہیں آخر کب تک جاری رہے گی۔

''شاید مزید چند سال اور......''

مانرپلا آنے سے قبل اتنا بلے نے نہ تو کبھی ٹیلی وژن دیکھا تھا اور نہ ہی فلم دیکھی تھی لیکن ایک خصوصی موقع پر اسے ان چیزوں سے لطف اندوز ہونے کا موقع ملا۔ افسروں کی بیرک میں وی سی آر پر اس نے ریمبو کا تیسرا حصہ دیکھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

فرش پر آلتی پالتی مار کر وہ بڑے غور سے سولجر اسٹالون کو گھور رہا تھا جو سوویت ٹینکوں کے خلاف ایک جھڑپ میں افغان مجاہدین کے ایک دستے کی قیادت کررہا تھا۔

شمالی آئرلینڈ تیسری دنیا کے ترقی پذیر اور پسماندہ ممالک کے ساتھ ساتھ ترقی یافتہ قومیں بھی جنگ کے شعلوں سے محفوظ نہیں ہیں۔ البتہ جنگ کی شکل مختلف ہے۔ اس میں ایک جنگ برطانیہ جیسے مہذب اور ترقی یافتہ ملک کے پڑوس میں بپا ہے۔

شمالی آئرلینڈ اگرچہ سرکاری طور پر حالت جنگ میں نہیں ہے۔ نہ ہی اس پر کسی دوسرے ملک نے حملہ کیا ہے مگر ایک ہی مذہب..... کے دو فرقوں کے درمیان محاصروں کی کیفیت نے وہاں جنگ جیسی صورت حال پیدا کررکھی ہے۔ پروٹسٹنٹ اور کیتھولک دونوں عیسائی کہلاتے ہیں لیکن ان دو فرقوں کے اختلافات اتنے وسیع ہوچکے ہیں کہ ایک دوسرے کا وجود برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں۔ فسادات، تشدد، مار دھاڑ، ہنگامے روز کا معمول بن چکے ہیں اور افغانستان اور برما کی طرح یہاں بھی بچوں کو اس جھلسنے ماحول سے بچانے کی کوشش کامیاب نہیں ہوسکی۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ بلفاسٹ کے ایک ماہر نفسیات کے بقول یہاں جو بچے پتھراؤ نہیں کرتے انہیں ہم ابنارمل سمجھتے ہیں۔

ہر جنگ میں کچھ قواعد وضوابط ہوتے ہیں۔ بلفاسٹ کی سڑکوں پر جو پرتشدد ہنگامے ہورہے ہیں ان میں بھی ضابطہ اخلاق کا پورا خیال رکھا جاتا ہے۔ گیارہ سالہ جیکی کا کہنا ہے۔ ''اگر اسے سڑک بند کرنے کے لیے کہا جائے تو ہم سرکاری گاڑیوں اور بسوں کی چوری تو جائز سمجھتے ہیں لیکن پرائیویٹ کاروں کو ہاتھ نہیں لگاتے اس لیے کہ یہ ہماری بھی تو ہوسکتی ہیں۔''

ایک سال پہلے جیکی نے اپنے تین ہم عمروں کے ساتھ مل کر ایک ٹمبر کی گاڑی اغوا کی تھی اس واردات کے دوران میں چاروں کے چہرے ماسک میں چھپے تھے۔ جیکی اچھل کر ٹرک کے پچھلے حصے میں سوار ہوگیا جب کہ اس کے ساتھیوں نے ٹرک کو دیوار سے ٹکرانے کے بعد اسے آگ لگادی۔

بہ ظاہر جیکی بھولا بھالا نظر آتا ہے لیکن ذہین اتنا ہے کہ کلاس ٹیچر اگر کسی کام سے کلاس سے باہر جاتا ہے تو وہ جیکی کو ہی قائم مقام ٹیچر بنانا پسند کرتے ہیں لیکن جیکی کا آئرش ری پبلکن آرمی (آئی آر اے) سے قدیم تعلق ہے۔ اس کے دادا 1930ء میں برطانوی حکمرانوں کے خلاف جنگ میں مارے گئے تھے اور پانچ میں سے چار چچا بھی اس جنگ کی نذر ہوچکے ہیں۔ وہ خود بھی آئی آر اے میں شامل ہونا چاہتا ہے۔ ''کیا وہ قتل جیسے گھناؤنے جرم کا ارتکاب کرسکے گا؟''

اس سوال کے جواب میں وہ کہتا ہے۔ ''برٹش کو قتل کرنے کے لیے تو میں ہر دم تیار رہتا ہوں لیکن اپنے لوگوں کو نہیں مار سکتا۔'' اس کی مراد اپنے آئرش اہل وطن سے ہے۔ اسے یاد ہے کہ آئی آر اے میں شامل اس کے ایک چچا کو خود ان کے ساتھیوں نے مخبری کے جرم میں گولی ماردی تھی۔ آئی آر اے کا دعویٰ ہے کہ وہ اب برطانیہ کے خلاف جنگ میں بچوں کو استعمال نہیں کرتی۔ ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو ان کا بیان درست معلوم ہوتا ہے کیونکہ 1970ء کے بعد سے شمالی آئرلینڈ میں جنگ کا نقشہ بدل چکا ہے۔ دن اور رات سڑکوں پر ہونے والی اس جنگ نے اب وہ رخ اختیار کرلیا کہ بچے شاذ ونادر ہی اس میں شامل ہوسکیں۔ بموں کے حملے اور مخالفین کا قتل جو آئی آر اے کے زیر اہتمام ہوتے ان کے لیے مخصوص ماہرین اور زبردست رازداری کی ضرورت ہوتی ہے اور بچوں میں یہ صلاحیت کم ہی ہوتی ہے لیکن 1969ء میں جنگ کی شدت بڑھی تو 16 سال سے کم عمر ایسے بچے جو آئی آر اے کے لیے ناقابل قبول تھے وہ نافیانا نامی تنظیم میں شامل ہوگئے جسے ایک آئرش محب وطن نے بیڈن پاول کے بوائے اسکاؤٹس کے جواب میں تشکیل دیا تھا۔ وہ ایک طرح کے جنگجو گوریلے ہوتے ہیں اور حکام ان میں اور آئی آر اے کے مشتبہ افراد میں کوئی فرق محسوس نہیں کرتے۔ نافیانا کے ارکان کے اپنے یونیفارم ہیں۔

یہاں کے بچوں کے لیے پتھر اور بوتلیں پھینکنا ایک کھیل سے اکتاہٹ اور بوریت کو رفع کرنے کا آسان علاج ہے۔ چھ چھ سال کے بچے پاس سے گزرتی ہوئی پولیس کی گاڑیوں پر بہت اطمینان سے پتھراؤ کرتے ہیں لیکن دوسری طرف پروٹسٹنٹ اکثریتی علاقوں میں بچے فسادات میں ملوث نظر نہیں آتے نہ ہی وہ پتھراؤ کرتے ہوئے دیکھے جاتے ہیں۔ کیتھولک فرقے پر حملوں کی تعداد میں بھی کمی آچکی ہے۔ قتل کی وارداتوں میں بھی بچے شریک نہیں ہوتے۔ یہ کام بڑی عمر کے لوگوں کے ذمے ہے۔

بلفاسٹ میں ''جوائے رائیڈنگ'' کمال کی چیز ہے۔ یہ کھیل بچوں میں بڑا مقبول ہے۔ ایک عجیب وغریب قسم کی نشہ آور تفریح ہے۔ بچے کار چراتے ہیں اور پھر سڑکوں پر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مہمان

مہمانوں کی جان لیوا قسم تو وہ ہوتی ہے جو پرہیزی غذا کھاتی ہے۔ "نہ جی جائے تو میں نہیں پیتا آدھ سیر دہی کی لسی اور دو روٹیاں، بس..... ! گندم کی روٹی تو میرے لیے زہر ہے۔ لقمہ اندر گیا کہ انتڑیاں سوجیں۔ کھچڑی اور دلیے کے سوا کچھ کھا ہی نہیں سکتا..... رات سونے سے پہلے دودھ تو میرے لیے بے حد ضروری ہے ڈاکٹر نے کہا ہے! اور ہر کھانے کے بعد سیب..... نہ نہ میرے لیے کوئی تکلف نہ کیجیے گا۔ میں کہاں یہ مرغن کھانے ہضم کر سکتا ہوں! مہمان تھوڑا ہی ہوں، اپنا گھر ہے۔ آپ تکلف نہ کریں۔ میں تو صرف دو وقت دودھ پیتا ہوں، ناشتے کے ساتھ ڈبل روٹی مکھن اور دو ہاف بوائل انڈے۔ ہاں! البتہ شام کو بکری کے گوشت کی یخنی ضرور پیتا ہوں اور دوپہر کے کھانے کے ساتھ دہی ضروری ہے تو آپ کوئی تکلف نہ کریں ڈاکٹر نے سخت منع کر رکھا ہے۔"

مغلیہ دور میں ایک شہزادی کی پیٹھ یا سینے پر ایک پھوڑا نکلا لیکن ایسی باحیا شہزادی تھی کہ اس نے حکیموں کو پھوڑا دکھانے سے صاف انکار کر دیا۔ اسی زمانے میں کوئی انگریز ڈاکٹر دہلی میں وارد ہوا۔ بادشاہ وقت نے اس سے پھوڑے کا ذکر کیا۔ ڈاکٹر نے کہا کہ بغیر پھوڑا دیکھے اور مرض کی نوعیت سمجھے ہوئے علاج ناممکن ہے۔ دوسری طرف شہزادی نے انکار کر دیا کہ نامحرم کے سامنے ہرگز نہیں جائے گی۔

بالآخر یہ طے ہوا کہ ڈاکٹر کی انگریز بیوی محل میں جا کر پھوڑا دیکھ آئے اور ڈاکٹر کو اس کے متعلق بتا دے لیکن جب وہ عورت محل میں گئی تو شہزادی نے اسے بھی پھوڑا دکھانے سے انکار کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ یہ عورت میرے جسم کے بارے میں اپنے شوہر کو بتائے گی جو مجھے ہرگز گوارا نہیں ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ باحیا شہزادی کا اسی مرض میں انتقال ہو گیا۔ وہ مرنے مر گئی لیکن یہ گوارا نہ کیا کہ غیر مرد اس کے جسم کو دیکھیں یا اس کے جسم کے بارے میں کچھ سنیں۔

حکایات اولیا، از ضیاء تسنیم بلگرامی

اسے بڑی تیز رفتاری سے دوڑاتے ہوئے کبھی کبھی پولیس کی رکاوٹوں کو توڑتے ہیں اور کبھی سامنے سے آنے والی کاروں سے ٹکرا جاتے ہیں۔

پولیس اس قسم کے کار سواروں کو دیکھتے ہی ان پر گولیاں برسانا شروع کر دیتی ہے۔ جس سے بچنے کے لیے یہ کار چور پچھلی کھڑکی پر ایک چار پانچ سال کے بچے کو کھڑا کر دیتے ہیں تاکہ اسے دیکھ کر پولیس والے فائر کرنے کی ہمت نہ کر سکیں۔ بعد میں وہ کار کے ایک ایک پرزے کو نکال کر فروخت کر دیتے ہیں۔

کار چور پروٹسٹنٹ سے زیادہ کیتھولک افراد سے ان کی کاریں چھینتے ہیں اور جو پکڑے جاتے ہیں انہیں آئی آر اے والے گھٹنے میں گولی مار کر بے کار کر دیتے ہیں۔

سڑکوں پر رکاوٹیں کھڑی کر کے انہیں بند کرنا، کاریں جلانا اور پیٹرول بموں کے دھماکے کرنا زیادہ تر گرمیوں کے زمانے کے معمولات ہیں۔ یہ وہ وقت ہوتا ہے جب ہنگامہ آرائی کے لیے ماحول بالکل سازگار ہوتا ہے۔ مائیں دعائیں کرتی ہیں کہ کاش جلد بارش ہو جائے تاکہ ان کے لعل باہر ہنگامہ آرائی کے لیے نہ نکل سکیں۔

33 سالہ جینی کے بقول "بارش ہو رہی ہو تو بچے باہر نہیں نکلتے اور نہ ہی زیادہ دیر تک لڑتے ہیں۔"

جینی کے پانچ میں سے چار بھائی ہنگاموں کی نذر ہو چکے ہیں جب کہ اس کے تین بیٹے پیٹرول بم بنانے کے ماہر ہیں۔ یہاں تک کہ اس کا چھ سالہ بیٹا بھی بم بنا لیتا ہے۔

8 اگست کے واقعے کی 18 ویں برسی منائی جا رہی تھی۔ نیو لاج کے لوگ اس دن کی یاد منا رہے تھے جب برطانوی پولیس کے اہلکاروں نے مشتبہ افراد کی گرفتاری کی ایک بڑی مہم شروع کی تھی اور کیتھولک علاقے گولیوں سے گونج رہے تھے۔ بچے کئی ہفتے سے اس برسی کے لیے لکڑیاں، ٹائر، پرانے فرنیچر، دودھ اور بیئر کی خالی بوتلیں جمع کر رہے تھے تاکہ بعد میں انہیں استعمال کیا جا سکے۔

برسی کی تقریبات کے دوران میں جب شعلے یونین جیک کو چاٹ رہے ہوتے تو لوگوں کی خوشیاں دیکھنے سے تعلق رکھتی تھیں۔ پھر لڑکوں نے پیٹرول بم پھینکنے شروع کیے تاکہ پولیس کو آگے بڑھنے کی ترغیب دی جا سکے۔ جواب میں پولیس نے ربڑ کی گولیاں چلائیں۔ پڑوس میں ارلانڈ پارک کا ایک 15 سالہ نوجوان مکس ڈنی تماشا دیکھنے ضرور آیا تھا لیکن وہ لوٹ کر کبھی واپس نہ جا سکا۔ پولیس کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

طرف سے چلائی گئی پلاسٹک کی گولی ٹھیک اس کے سینے میں آن لگی۔ وہ زمین پر گرا اور اس کے منہ سے خون ابل پڑا اور تھوڑی ہی دیر کے بعد اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی اس نے دم توڑ دیا۔

دانوں رات اس جگہ پر جہاں سمس زنی گولی کا نشانہ بنا تھا ایک یادگار تعمیر کر دی گئی۔ پلاسٹک کے پھول اور اس کی ایک تصویر بھی وہاں رکھ دی گئی۔ اس یادگار پر ایک لوح بھی لگا دی گئی جس پر لکھا تھا۔ ''ایس زنی جو رائل السٹر کانسٹیبلری کے ہاتھوں 19 اگست 1989ء کو قتل ہوا۔''

سپاہیوں کے نزدیک سمس زنی ایک شرپسند تھا اور جو وہ چاہتا تھا اسے مل گیا جب کہ اس کے والدین کی نظروں میں وہ صرف ایک معصوم تماشائی تھا جسے شقی القلب دشمنوں نے جان سے مار دیا۔

زنی کی تدفین کے بعد تین کم سن نوجوانوں نے ڈاک کی دو گاڑیوں کا اغوا کیا۔ انہیں چلاتے ہوئے وہاں تک لے آئے جہاں زنی نے دم توڑا تھا اور پھر انہیں آگ لگا دی۔

☆☆☆

یوں تو سارا امریکا ہی بڑا عجیب و غریب ہے لیکن امریکا کا یہ شہر لاس اینجلس اس لحاظ سے بہت مختلف ہے کہ جہاں کی مائیں اپنے بچوں کو گھر سے دور رکھنا چاہتی ہیں۔ وہ انہیں اپنے گھروں میں رکھنے سے زیادہ یہ پسند کرتی ہیں کہ وہ جیلوں میں نظر بند رہیں تاکہ کم از کم ان کی جان تو محفوظ رہے۔ آزاد رہنے میں جان جانے کا زیادہ خطرہ ہے۔ غالباً یہ اتنی پہیلی ہے جو ذرا مشکل سے سمجھ میں آئے گی۔

قصہ دراصل یہ ہے کہ لاس اینجلس نوجوانوں کی مختلف ٹولیوں میں تقسیم ہے اور یہ ٹولیاں بھی ان دو عفریتوں کا شکار ہیں جس کی لپیٹ میں آج کل ساری دنیا ہے یعنی منشیات اور اسلحہ۔ ان دو چیزوں کے لیے یہاں انسانی جانوں کی قدر و قیمت بالکل ختم کر دی گئی ہے۔

جینیٹ بارانسن چاہتی ہے کہ اس کا 17 سالہ بیٹا اپنے گروہ کو چھوڑ دے۔ وہ بے چاری ستم رسیدہ تو یہ تک چاہتی ہے کہ وہ یہ گھر چھوڑ کر کہیں اور چلا جائے خواہ وہ جیل کا کوئی کونا ہی کیوں نہ ہو۔ ''اس طرح کم از کم دو فصلوں میں مارے جانے سے تو بچا رہے گا۔''

رمونا چوراس چاہتی ہے کہ اس کا 14 سالہ بیٹا جب جیل سے چھوٹ کر آئے تو وہ اسے ساتھ لے کر واپس میکسیکو چلی جائے جہاں سے وہ بہتر زندگی کا خواب لے کر امریکا آئی تھی۔ سلواڈور سے آنے والی زوئیلا فیجیو بھی اپنے 14 سالہ بیٹے کو بدمعاشوں کی ٹولیوں سے دور رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ ایک بار اس نے چیختے ہوئے اپنے بیٹے سے کہا تھا ''میں تمہیں سلواڈور بھیج دوں گی تاکہ تم وہاں اپنی لڑائی جھگڑائی کا شوق پورا کر سکو۔ اصلی بندوقوں سے۔'' لیکن اس کا اس کے بیٹے پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔ ''میں دوسروں کی جنگ کیوں لڑوں؟ لڑنے کے لیے میری اپنی جنگ موجود ہے۔''

لاس اینجلس کے گرد و نواح میں پانچ سو گینگ ہیں اور ان کے ارکان کی تعداد لگ بھگ اسی ہزار ہے۔ دو بڑے مشہور گروہ ہیں بلڈز اور کرپس اور ان گروپوں میں اکثریت سیاہ فام باشندوں کی ہے۔ ضروری نہیں کہ بلڈز اور کرپس ہی آپس میں لڑیں بلکہ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ بلڈز خود اپنے گروپ کے لوگوں سے اور کرپس بھی اپنے ارکان سے لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں۔

1988ء میں قتل کی 462 وارداتیں ہوئیں جن میں کسی نہ کسی طرح ان گروہوں کا گہرا تعلق تھا۔ قتل کی یہ وارداتیں زیادہ تر ساؤتھ سینٹرل کے علاقے میں ہوئیں۔ 111 مربع کلومیٹر کے اس علاقے میں پانچ لاکھ نفوس بستے ہیں۔ اس علاقے میں قتل کی وارداتیں اتنی کثرت سے ہونے لگی ہیں کہ اب یو ایس آرمی نے واٹس کے مارٹن لوتھر کنگ جونیئر جنرل اسپتال کے ایمرجنسی روم میں تربیت حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹروں کو باقاعدگی سے بھیجنا شروع کر دیا ہے کیونکہ وہاں 24 گھنٹے کے دوران میں ہر وقت ایسے زخمی پہنچتے رہتے ہیں جنہیں بندوقوں کے زخم آتے ہیں۔

لاس اینجلس کے مختلف گروہوں کے ارکان کے درمیان نفرت والی بنیاد پر نہیں ہوتی بلکہ نفرت کرنا ایک رویہ بن چکا ہے۔

14 سال کے ڈک سے پوچھیے کہ وہ اپنے مخالف گینگ پر گولی کیوں چلاتا ہے تو اس کا جواب ہو گا۔

''کیوں کہ وہ میرا دشمن ہے۔''

''وہ تمہارا دشمن کیوں ہے؟''

اس سوال کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں لیکن ڈک کو اپنے کیے پر کوئی پشیمانی نہیں۔

❋❋❋

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کائنات

سلیم انور

یہ ایک ایسا سربستہ راز ہے جس کی تہ تک سائنسداں پہنچنے کی سر توڑ کوشش کررہے ہیں لیکن راز سے پردہ اٹھ نہیں پا رہاہے۔ یہ کس طرح الجھا ہوا ہے اس پر ایک طائرانہ نظر

شمسی کے کئی رازوں پر ایک مختصری

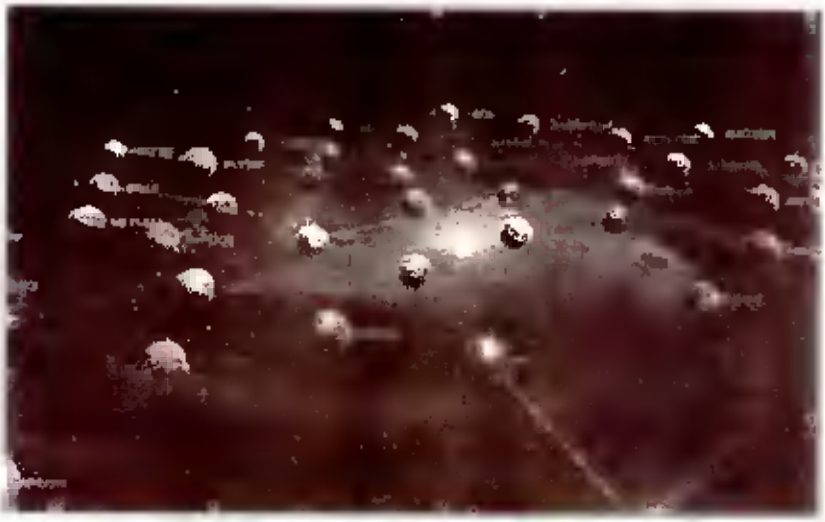

کائنات کے نظام میں اجرام فلکی نہایت ارزاں ہیں۔ صرف ہماری کہکشاں میں ان کی تعداد اربوں سے متجاوز ہے۔ بہت دانوں نے بجث سے یہ نظریہ قائم کیا ہوا ہے کہ کائنات کا اصل حاصل سیارے ہیں۔ صرف ان سیاروں کو جو ہمارے چھوٹے سے سورج کے گرد گردش کررہے ہیں دریافت کرنے میں سائنس دانوں کو ہزاروں سال لگ گئے۔ جب کہ سورج ہمارے نظام شمسی کا مرکزی ستارہ ہے۔ اور جدید ترین حسابات اور مشاہدات کی روشنی میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس کے کروڑوں سیارے گردش کر رہے ہیں۔ دیگر ستاروں کے اطراف سیاروں کا وجود 1995ء تک ایک سربستہ راز تھا۔ 1995ء میں پہلی بار نظام شمسی سے ہٹ کر کوئی اور سیارہ تلاش کیا گیا۔

جب نئے سیاروں کی دریافت کا اعلان کیا گیا تو ماہرین کے ذہنوں میں سب سے بڑا سوال یہ تھا کہ آیا یہ سیارے زندگی کے لیے مددگار ثابت ہو سکتے ہیں۔ جواب نفی میں تھا۔ یہ سیارے بہت بڑے اور اپنے ستاروں سے بے حد نزدیک تھے۔ اس کے بعد سے اب تک ہیئت داں لگ بھگ 500 ایگزو پلینیٹس (شمسی سیاروں سے ہٹ کر سیارے) دریافت کر چکے ہیں لیکن انہیں ابھی تک ایسا کوئی سیارہ نے گولڈی لاکس (Goldilocks) ریجن بھی کہا جاتا ہے، وہ ابھی تک تلاش نہیں کر پائے ہیں۔

گولڈی لاکس ریجن خلا کا وہ حصہ ہے جو بہت زیادہ گرم ہے اور نہ ہی بہت زیادہ سرد، بلکہ زندگی کی نشوونما کے لیے موزوں زمین ماحولیاتی ساخت کا حامل ریجن ہے۔

امریکی ہیئت دانوں کی ایک ٹیم نے Gliese 581g نامی ایک نئے سیارے کی شناخت کا اعلان کیا ہے۔ اس اعلان کے بعد ایک ہلچل سی مچ گئی مگر سائنس دانوں نے اس کے بنیادی معلومات کا مطالعہ کیا۔ پھر نہایت سنجیدہ سوالات اٹھائے ہیں کہ آیا اس سیارے کا کوئی وجود بھی ہے یا نہیں!

ایسی غلطی کا احتمال ہوتا ہے کیونکہ سیاروں کی کھوج کے تکنیک میں غلطیاں متوقع ہیں۔

کئی نوری سال کے فاصلوں پر موجود سب سے بڑے سیارے بھی ٹیلی اسکوپس کی مدد سے نہیں دیکھے جا سکتے۔ سیارے کو دیکھنے کا نظام بہت پیچیدہ ہے۔ کشش ثقل کی تھرتھراہٹ یا ڈبلر ویلوسٹی کے طریقے کو استعمال میں لایا جاتا ہے۔ جب ایک سیارہ اپنے سرچشمہ ستارے پر اپنے وجود کو اشارتاً مسلط کرتا ہے تو اس حرکت کی پیمائش کی جاتی ہے اور اس سیارے کی کمیت دریافت کر لیا جاتا ہے۔

ایک اور طریقہ ٹرانزٹنگ (Transiting) کہلاتا ہے جب کوئی چھوٹا جرم فلکی کسی بڑے سیارے کے سامنے سے ہو کر گزرتا ہے اور اس معمولی سی روشنی کو بلاک کر دیتا ہے جو اس بڑے سیارے سے خارج ہو رہی ہوتی ہے تو مدھم ہونے والی روشنی کی پیمائش کر کے ہیئت داں یہ حساب لگاتے ہیں کہ روشنی کو روکنے والی شے کی جسامت کیا ہے۔ ایک جتنی طریقہ کار کشش ثقل کی مائیکرو لینسنگ کا طریقہ ہے جس میں یہ تجزیہ کیا جاتا ہے کہ ایک ستارے کی روشنی اس وقت کس درجہ ختم ہوتی ہے جب وہ ایک ایسے سیارے کے گرد سفر کرتی ہے جو زمین سے نزدیک ترین ستارے کے محور میں گردش کر رہا ہوتا ہے۔

کیپلر اسپیس ٹیلی اسکوپ جو کہ 2009ء سے سورج کے مدار میں گردش کر رہی ہے وہ ٹرانزٹنگ کی مدد سے ایگزو پلینیٹس (Exoplanets) کی کھوج میں لگی ہوئی ہے۔
اس کے سینسرز سورج کی مانند 100,000 ستاروں پر فوکس ہیں۔ اگر وہ ان میں سے کسی ایک میں روشنی کے بلاک ہونے کا سراغ لگا لیتی ہے اور اگر روشنی کا یہ مدھم پڑنا ہر سال میں ہر مرتبہ ایک بار ہوتا ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس سیارے کا مدار زمین کی مانند ہے اور ہم قابل آباد سیاروں کے زون کے ٹھیک درمیان میں جا پہنچے ہیں۔

کیپلر سائنس داں جلد انکشاف کریں گے اور یہ انکشاف ان سیاروں کے بارے میں ہوگا جو وہ ابھی تک دریافت کر پائے ہیں۔ ستاروں کی محض ایک تعداد کا زمین کی مانند چند دنیاؤں کا بنانا ایک اٹل حقیقت ہے۔ پھر اس کے بعد تلاش یہ ہوگی کہ آیا ان پر زمین کی مانند زندگی ہے یا نہیں!

زمین سے نزدیک ترین ستارے بھی اتنے فاصلے پر ہیں کہ ان کے مدار میں گردش کرنے والے سیاروں کا سراغ لگانا بھی ناممکن ہے اور اگر ہمارے پاس اتنی بڑی ٹیلی اسکوپ بھی ہو جس سے اس فاصلے تک دیکھا جا سکے تب بھی وہ سیارے اپنے اصل ستارے سے اس حد تک قریب ہوں گے کہ ستارے کی اپنی چمک میں دب کر رہ جائیں گے اور اس ستارے کی چمک کم از کم ایک ارب گنا زیادہ ہوگی۔

ان مسائل سے دور رہنے کے لیے ہیئت دانوں کو بالواسطہ سیاروں کو تلاش کرنا ہوتا ہے۔ ایک طریقہ یہ ہے کہ اصل ستارے کی حرکت کو نہایت قریب سے مانیٹر کیا جاتا ہے۔ یہ چیک کیا جاتا ہے کہ آیا بے قاعدگیاں تو نہیں ہو رہی ہیں جن کا سبب مدار میں گردش کرتے ہوئے سیاروں کی کشش ثقل ہے۔

بدقسمتی سے ایسے مشاہدات کرنا مشکل ہیں اور پھر ان کی توضیح کرنا اور بھی مشکل ہے۔ انتہائی قابل اعتماد طریقہ ستارے سے خارج ہونے والی روشنی کے طیف کا تجزیہ کرنا ہے۔ ان کے طول موج میں معمولی تبدیلیوں کی چیکنگ جن

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے کشش ثقل کے بلپس (Blips) معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ یہ قریبی اور فاصلے پر واقع ستاروں دونوں کے لیے کارگر ہو سکتا ہے اور یہ شمسی سیاروں کے علاوہ سیاروں کی حالیہ کھیپ کو دریافت کرنے میں بھی انتہائی کامیاب ثابت ہوتے ہیں۔

جب ہیئت دانوں نے سنجیدگی سے زمین جیسے سیاروں کو تلاش کرنے کے آئیڈیے پر کام شروع کیا تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ کائنات میں موجود تمام اربوں ستاروں میں سے ان ستاروں کو تلاش کرنا معقول ہوگا جو سورج کی مانند ہوں اس طرح تحقیق کی تمام تر توجہ اسی پر مرکوز کر دی گئی لیکن اس راہ میں چند حیران کن باتیں بھی سامنے آئیں۔

سب سے پہلے جو ایکسٹرا سولر سیارے (نظام شمسی کے علاوہ سیارے) دریافت ہوئے وہ ایک Pulsar کے گرد گردش کر رہے تھے۔ Pulsar ایک قسم کا جرم فلکی ہے جسے تیزی سے گردش کرتا ہوا ایک معدلیہ (نیوٹرونی) ستارہ خیال کیا جاتا ہے۔ جس میں سے ریڈیائی اور دوسری برقی مقناطیسی لہریں تنفس کی سی دھڑکن کی طرح لحہ بہ لحہ خارج ہوتی رہتی ہیں)۔ Pulsar PSR 1257+12 کی ریڈیائی لہروں کے اخراج میں معمولی تبدیلیوں کا مطالعہ کرتے ہوئے سائنس دانوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اس کے گرد تین سیارے گردش کر رہے ہیں۔

گو کہ محققین کا دعویٰ ہے کہ انہوں نے ایک درجن سے زیادہ نئے سیارے دریافت کر لیے ہیں لیکن تمام ہیئت دان ان کے دعوے سے قائل نہیں ہوئے ہیں۔ بعض ہیئت دان یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ ریڈیائی لہروں کے اخراج میں تبدیلی یا پلس ریٹ گیس کے ان دھاروں سے متاثر ہوتی ہے جو ہمارا سورج خارج کرتا ہے۔ دیگر کا کہنا ہے کہ تبدیلی کا سبب اس کے اطراف گردش کرنے والے سیاروں کی بجائے ستارے کی سطح کا سست اتار چڑھاؤ ہے۔

یہ شکوک اس وقت تک طے نہیں ہو سکتے جب تک کہ ڈارون پروجیکٹ کی مانند اسپیس ٹیلی اسکوپس کی ایک نئی نسل ایجاد نہیں ہو جاتی جو کہ ایکسٹرا سولر پلینٹس کی براہ راست شبیہ حاصل کر سکے۔

ڈارون پروجیکٹ ایک مطالعہ ہے جس کا بیڑا یورپی اسپیس ایجنسی نے اٹھایا ہوا ہے۔ اس میں چھ ٹیلی اسکوپس کا تصور کیا گیا ہے جس میں ہر ایک ہبل (Hubble) اسپیس ٹیلی اسکوپ کے سائز کی ہے اور جو 100 گز کی دوری پر ہر دوسری ٹیلی اسکوپ سے ایک دیوہیکل ٹیلی اسکوپ کی مانند تنہا کام کرے گی۔ یہ ٹیلی اسکوپس سیارہ مشتری اور سورج کے درمیان خلا میں پوزیشن لیں گی اور سورج کی مانند قریب ترین 300 ستاروں کے ترتیبی ساتھ کے سیاروں کی شبیہ حاصل کرنے کی صلاحیت کی حامل ہوں گی۔ یہ اس بات کا تجزیہ کریں گی کہ اس قسم کے سیاروں سے جو روشنی منعکس ہو رہی ہے وہ زندگی برقرار رکھنے کی اہلیت کے حامل ہیں یا نہیں۔

ڈارون پروجیکٹ میں چھ سیٹلائٹ استعمال ہوں گے جن سے ٹیلی اسکوپس منسلک ہوں گی اور یہ الیکٹرونک کے ذریعے ایک دوسرے سے جوائنٹ ہوں گی۔ یہ بہت دور

☆ چونکہ آکسیجن فوری طور پر جس انداز سے دیگر عناصر کے ساتھ مل جاتی ہے، تو سائنس دانوں کا خیال ہے کہ واحد طریقہ جس کے ذریعے آکسیجن آزادی کے ساتھ دیگر گیسوں کے ساتھ کسی ماحول میں قائم رہ سکتی ہے اگر اسے پودے خارج کر رہے ہوں۔ لہٰذا جب ہم دیگر سیاروں پر گیسوں کا تجزیہ کریں گے تو سب سے پہلا تجزیہ آکسیجن کی موجودگی کا ہوگا۔

☆ اگر کسی دوسری دنیا کی مخلوق زمین پر زندگی کی تلاش کریں گے تو اس کا ایک کلیو ہماری فضا میں میتھین کی غیر معمولی مقدار ہوگی، جو خارج کرتی ہیں۔

☆ 1995ء میں ہیئت دانوں نے سورج کی مانند ایک ستارے کے گرد گردش کرنے والا پہلا سیارہ 51 Pegasi دریافت کر لیا تھا لیکن یہ کسی دوسری دنیا کی مخلوق کا گھر نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ اس کا سطحی درجہ حرارت لگ بھگ 2000 ڈگری فارن ہائٹ تھا۔

☆ سیاروں کی تلاش کی مثال اس طرح دی جاتی ہے جیسے 1000 میل کے فاصلے پر موجود ایک سرچ لائٹ پر کسی مچھر کو تلاش کرنا یا کسی راک کنسرٹ میں پن گرنے کی آواز سنائی دینا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

فاصلے پر موجود چند ایک نظام شمسی کو حقیقت میں دیکھ سکیں گی۔ اگر انسان تب اسے تعبیر کرنے میں کامیاب ہو گئی تو یہ جسامت میں اتنی بڑی ہوگی جتنی کہ یہ ممکن ہے۔

کیا آپ تصور کر سکتے ہیں کہ ایک دن جب آپ نگاہ اٹھا کر آسمان کی سمت دیکھیں گے تو آپ کو ایک دیو پیکر سیٹلائٹ دکھائی دے گا جس سے ٹیلی اسکوپس منسلک ہوں گی؟

تب ہی اس سوال کا جواب ملنے کے امکانات روشن ہو سکیں گے کہ کیا ہم اس کائنات میں تنہا ہیں یا جس طرح زمین سورج کے گرد گردش کر رہی ہے ایسے ہی دیگر سیارے دیگر ستارے کے اطراف میں گھوم رہے ہیں؟

اگر ان نئی دنیاؤں میں جو کہ زمین سے کئی نوری سال کے فاصلوں پر واقع ہیں۔ زندگی کے آثار موجود ہیں تو امید ہے کہ ان کی تلاش کا کام بھی جلد شروع ہو جائے گا۔

☆☆☆

گو کہ زندگی بہت سی اشکال اختیار کر سکتی ہے۔ سائنس دانوں کو یقین ہے کہ زندگی کی شکل کی بنیاد پیچیدہ کاربن بیسڈ سالموں پر مبنی ہے (جیسے کہ نوع بشر ہیں) جس کا امکان کائنات میں کسی اور جگہ بھی ہے۔ وہ دلیل دیتے ہیں کہ ہم ایسے سیاروں کو تلاش کریں گے جو کہ مخلوقات کو پال سکتے ہیں جیسے کہ زمین پال رہی ہے۔ بالفاظ دیگر جہاں پر پانی مائع کی شکل میں دستیاب ہو۔

اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے ہیئت دان ستارے سے اس فاصلے کی پیمائش کر کے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ آیا وہاں کا درجہ حرارت اتنا کافی ہے کہ زندگی کو قائم رکھ سکے۔ وہ اسے Habitable zone کہتے ہیں۔ سیارے کی کمیت بھی اہمیت رکھتی ہے۔ ایسا سیارہ جو کہ زمین سے بہت چھوٹا ہوگا وہ جلد ہی اپنی فضا کھو بیٹھے گا جب کہ ایک بہت بڑا سیارہ ہائیڈروجن کی گھنی فضا کو قائم رکھے گا۔

ابھی تک سورج کی مانند ستاروں کے اطراف میں جو سیارے دریافت کیے گئے ہیں وہ ہماری زمین سے کہیں زیادہ بڑے ہیں اور اپنے اصل ستارے سے قریب تر ہیں۔ وہاں پر زمین کی مانند پہاڑی چٹانوں کی بجائے مشتری کی مانند گیس کے دیو ہیکل بادلوں کا زیادہ امکان ہے۔ ان میں سے بعض جو بہت زیادہ بڑے ہیں ”براؤن بونے“ بھی ہو سکتے ہیں جو کہ مخفی ستارے ہیں اور جن کی چمک بے حد مدھم ہے۔

لیکن آئندہ چند برسوں میں سائنس کی ترقی کے ساتھ اس بات کا امکان ہے کہ ہم ایسے چھوٹے سیاروں کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں جو اپنے اصل ستاروں سے بہت زیادہ فاصلے پر واقع ہیں۔

فرض کریں کہ ہم کسی ستارے کے Habitable zone میں زمین کے سائز کا سیارہ تلاش کر لیتے ہیں تو یہ کس طرح چیک کریں گے کہ اس پر زندگی کے آثار ہیں؟ اس کا ایک طریقہ یہ ہے کہ ریڈیو ٹیلی اسکوپ اس سیارے پر مرکوز کریں اور ریڈیو یا ٹی وی سگنلز سننے کی کوشش کریں لیکن ہم اس مخلوق کو با آسانی مس کر سکتے ہیں جو اس ٹیکنالوجی کی حامل ہی نہ ہو۔

اگر ہم حقیقت میں اس سیارے کو دیکھ سکتے ہوں تو ہم اس کی روشنی کے طیف کا جائزہ لے سکتے ہیں جس سے سائنس دانوں کو اس کے ماحول میں سالموں کی شناخت میں آسانی ہو سکتی ہے۔ ہمارے نظام شمسی میں زمین کا ماحول منفرد ہے جس میں بڑی مقدار آکسیجن کی ہے جسے درخت خارج کرتے ہیں۔ اوزون (آکسیجن کی ایک قسم) کاربن ڈائی آکسائڈ، پانی کے بخارات اور میتھین کی موجودگی اس بات کا مضبوط اشارہ ہوگی کہ اس سیارے پر زندگی موجود ہے۔

ناسا (Nasa) کے ہائیگل ایس کیپلن کہتے ہیں ”چندرہ سال میں ہم 10 یا 20 پارسیکس کے اندر متعدد سیاروں کے ماحول میں آکسیجن اور پانی کا سراغ لگانے میں کامیاب ہو جائیں گے۔“ (ایک پارسیک 3.26 نوری سال، 19 ملین میل کا فاصلہ ہے جو کہ سورج کے گرد گردش کرتی ہوئی زمین کے فاصلے سے 200 گنا زیادہ ہے)

فی الوقت تو زمین کی مانند سیاروں کی تلاش خاصی مشکل دکھائی دے رہی ہے لیکن ہیئت دان اس بات پر متفق ہیں کہ کائنات میں زمین کی مانند سیاروں کی کمی نہیں ہے اور چاہے ان پر زندگی کی موجودگی کا امکان بے حد کم ہی کیوں نہ ہو، ان میں سے چند پر پانی کی موجودگی ہونی چاہیے اور غالباً وہاں زندگی کا وجود بھی ہوگا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نومبر

منظر امام

عیسوی سن کا گیارہواں مہینا، یہ مہینا ہمارے ہاں سردیوں کی ابتدا میں آکر پہنچے گا ز جکا ہوتا ہے۔ یہ مہینا کئی اہم واقعات کی وجہ سے قابل توجہ ہے۔

معلومات جمع کرنے کے شوقینوں کے لیے تحفہ خاص

سال کا گیارہواں مہینا جولین اور جارجین کیلنڈر کے مطابق 30 دنوں کا ہوتا ہے۔ نومبر وہ مہینا ہے جب شمالی خطوں میں خزاں اور جنوب میں بہار ہوتی ہے۔

کچھ خاص خاص واقعات کا ذکر ہو جائے۔

پہلی نومبر کو عیسائیوں کا تہوار۔ آل سینٹ ڈے منایا جاتا ہے۔

بلغاریہ میں لوک ہیروز کا دن مناتے ہیں۔

آئرلینڈ میں سردیوں کی پہلی تاریخ سمجھی جاتی ہے۔

ہندوستان کے پہلے وزیراعظم پنڈت جواہر لعل نہرو 14 نومبر کو پیدا ہوئے تھے۔ اس لیے ہندوستان میں 14 نومبر کو چلڈرن ڈے منایا جاتا ہے۔ 14 نومبر کو ہی عالمی ذیابیطس دن منایا جاتا ہے۔ 28 نومبر البانیہ کی آزادی کی تاریخ ہے۔

اب آجائیے تاریخ کے حوالے سے کہ کس تاریخ کو کون کون سے عالمی واقعات رونما ہوئے تھے:

یکم نومبر 1877ء بجلی کا بلب پیٹنٹ کروایا گیا۔ یعنی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

روشنی 1877ء سے ہو رہی ہے۔ جب کہ شروع شروع میں اس کا استعمال بہت محدود تھا۔

یکم نومبر 1966ء کو امریکن مارس کا ایک مشہور سبز بل ایپل چیک رجسٹرڈ ہوا تھا۔

2 نومبر کو ڈے لائٹ سیونگ ٹائم ختم ہو جاتا ہے (ہمارے یہاں بھی یہ تجربہ کر کے دیکھا جا چکا ہے۔ بعض اوقات کاروں میں بہتری کے لیے ایک گھنٹا آگے یا پیچھے کیا جاتا ہے)

2 نومبر 2000ء میں انٹرنیشنل اسپیس اسٹیشن کا قیام ہوا تھا۔

2 نومبر 1955ء میں جیم ہینسن نے پہلا سوپٹ متعارف کروایا۔ جس کا نام "کرسٹ دے فراگ" تھا۔

3 نومبر کو امریکا میں سینڈوچ ڈے منایا جاتا ہے۔

3 نومبر 1903ء کو لسٹرین ٹریڈ مارک کے طور پر رجسٹر ہوئی تھی۔ آج پوری دنیا لسٹرین سے واقف ہے۔

4 نومبر 1939ء ایک بجلی کی پیدائش کی تاریخ ہے۔

4 نومبر 1841ء گیلی فورنیا والوں کے لیے یہ ایک یادگار تاریخ ہے کہ اس تاریخ کو پہلی امریکن ٹرین گیلی فورنیا پہنچی تھی۔

4 نومبر 1922ء میں فراعین کے سلسلے کے ایک فرعون کنگ توت کے مقبرے کو دریافت کر لیا گیا تھا۔ فراعین بہت سے تھے ان کے نام الگ الگ ہوتے تھے لیکن فرعون ان کا لقب ہوا کرتا تھا۔

4 نومبر 1862ء میں رچرڈ گاٹلنگ نام کے ایک موجد نے مشین گن بنا کر پیش کی۔

5 نومبر 1901ء میں ہنری فورڈ نے ایک گاڑی متعارف کروائی تھی (آپ ذرا اس انداز سے ایجادات پر نظر کریں تو آپ کو اندازہ ہو گا کہ ان ایجادات کی بنیاد برسوں پہلے رکھ دی جاتی ہے۔ پھر یہ ایجادات تجربات کے مراحل سے گزرتی ہوئی موجودہ شکل میں ہمارے سامنے آتی ہیں)۔

6 نومبر 1861ء کو جیمز نیسمتھ پیدا ہوا تھا۔ جب کہ دنیا میں اس شخص کا اعزاز ہے کہ اس نے باسکٹ بال کا کھیل ایجاد کیا تھا۔

6 نومبر 1928ء میں کرنل جیکب نے دنیا کا پہلا الیکٹرک ریزر متعارف کروایا تھا۔

7 نومبر 1867ء سائنس دان میڈم کیوری کی پیدائش کی تاریخ ہے۔

8 نومبر 1895ء کو ایکس رے دریافت ہوا۔ اس کا استعمال امراض کو جاننے کے لیے پوری دنیا میں ہوتا ہے۔

8 نومبر 1938ء میں ہولوکاسٹ کی ابتدا ہوئی (ہولوکاسٹ پر اب تک بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ یہودیوں کا دعویٰ ہے کہ ہٹلر نے بہت بڑی تعداد میں یہودیوں کو موت دی گئی ہے جب کہ بعض مورخین نے اس بات کی مخالفت کی ہے کہ اتنی بڑی تعداد میں لوگوں کو نہیں مارا گیا ہے)

10 نومبر 1969ء میں بچوں کے مشہور پروگرام سیسمی اسٹریٹ کی ابتدائی ہوئی۔ 2001ء میں پہلا آئی پوڈ فروخت کے لیے پیش ہوا۔

11 نومبر۔ پوری دنیا میں سنگ ریڈرز ڈے اور کینیڈا میں ریمبرنس ڈے منایا جاتا ہے۔

پاکستان میں 11 نومبر 1947ء کو دیر اور چترال نے پاکستان سے الحاق کا فیصلہ کیا۔

12 نومبر 1815ء کو الزبتھ کیڈی کی پیدائش ہوئی۔ اس نے حقوق نسواں کے لیے آواز بلند کی تھی اور زندگی اسی جدوجہد میں لگا دی۔

12 نومبر 1940ء کو ٹریڈ مارک "بیٹ مین" رجسٹر ہوا تھا۔

13 نومبر 1982ء میں پہلی بار ویت نام کی جنگ میں مرنے والوں کی یادمنائی گئی۔

پاکستان میں اس تاریخ کو 1948ء کو خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل مقرر ہوئے۔

14 نومبر۔ اپنے ریفریجریٹر کو صاف کرنے کا دن۔

15 نومبر کو 1904ء میں کنگ سی جیلٹ نے اپنا سیفٹی ریزر متعارف کروایا۔ جو اس وقت پوری دنیا میں استعمال ہوتا ہے۔ اس تاریخ کو دنیا بھر میں کئی دن بھی منائے جاتے ہیں۔

16 نومبر 1915ء میں جین فرز کی پیدائش ہوئی۔

1533ء میں انکا سلطنت کو زوال ہوا۔ یہ اپنے وقت کی ایک عظیم تہذیب تھی۔

1977ء میں مشہور فلم ساز ڈائریکٹر اسٹیفن اسپیلبرگ نے اپنی فلم کا پہلی رائٹ کروائی۔

17 نومبر۔ گھر کی روٹی کا دن۔ (ویسے یہ دن تو ہمارے یہاں روزانہ منایا جاتا ہے) اس تاریخ کو 1805ء میں لیوس اور کلارک کے نام کے دو مہم جو پیسفک جا پہنچے۔

17 نومبر 1891ء میں ایلیجی برلانسو نے مشترکہ ٹیلی گراف اور ٹیلی فون پیش کیا۔ یعنی ایسا آلہ جس میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دنوں سہولیات موجود نہیں۔

18 نومبر۔ کی ماؤس کی برتھ ڈے منائی جاتی ہے۔

اسی تاریخ کو 1820ء میں انٹارکٹیکا کی دریافت ہوئی۔

1952ء میں چپکانے والا مادہ گلو ٹریڈ مارک ہوا۔

19 نومبر۔ ہندوستان میں اندرا گاندھی کی پیدائش کا دن منایا جاتا ہے۔

20 نومبر میکسیکو کے انقلاب کی تاریخ ہے۔

اسی تاریخ کو 1923ء میں ٹریفک لائٹ متعارف ہوئی۔ اس ایجاد کا سہرا گاریٹ مورگن کے سر ہے۔

21 نومبر کو ورلڈ ہیلو ڈے منایا جاتا ہے۔

22 نومبر 1963ء امریکا کے پینتیسویں صدر جان کینیڈی کا قتل ہوا تھا۔

23۔24 نومبر 1859ء چارلس ڈارون کی مشہور کتاب "دی اوریجن آف اسپاشیز" کی اشاعت ہوئی۔ یہ وہ کتاب ہے جس نے پوری دنیا میں سوچ اور بحث کے دروازے کھول دیے اس کتاب کی اشاعت کا سال 1859ء ہے۔

اسی تاریخ کو 1963ء میں لی ہاروے اوسوالڈ کا قتل ہوگیا۔

25 نومبر 1946ء میں بچوں کے ادیب مارک براؤن کی پیدائش ہوئی تھی۔

25 نومبر 1975ء کو رابرٹ ایس لیڈ نے اسکینر میں Cat-scan متعارف کروایا۔

26 نومبر 1895ء کو رسل ڈی مان نے ٹرانسپیرنٹ فوٹوگرافک فلم متعارف کروائی۔

27 نومبر شکریہ ادا کرنے کا دن۔ Thanks giving day.

اسی تاریخ کو 1701ء میں مشہور منجم (ستارہ شناس) آندرے سیلسیس کی پیدائش۔

اسی تاریخ کو 1894ء میں ملڈرڈ لارڈ نے واشنگ مشین متعارف کرائی۔

28 نومبر کو بلیک فرائی ڈے۔

29 نومبر 1922ء میں مصر کے فرعون TuTs کے مقبرے کو کھولا گیا۔

30 نومبر 1835ء کو مشہور ادیب مارک ٹوائن کی پیدائش ہوئی تھی۔

نومبر کے حوالے سے پاکستان میں بھی بہت سے واقعات ہوئے۔ چند کی تفصیل کچھ اس طرح ہے۔

یکم نومبر 1989ء، بے نظیر بھٹو کے خلاف عدم اعتماد کی تحریک۔

2 نومبر 1958ء، پاکستان کے صدر اسکندر مرزا کو ہٹا دیا گیا۔

5 نومبر 1996ء، فاروق لغاری نے اسمبلی تحلیل کردی۔ معراج خالد نگران وزیراعظم مقرر ہوئے۔

6 نومبر 1990ء، نواز شریف وزیراعظم منتخب ہوئے۔

7 نومبر 1968ء، پورے ملک میں طلباء کا احتجاج (بالآخر ایوب خان کو جانا پڑا)۔

11 نومبر 1947ء، دیر اور چترال نے پاکستان کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کرلیا۔

13 نومبر 1993ء، فاروق لغاری صدر پاکستان منتخب۔

13 نومبر 1948ء، خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل مقرر ہوئے۔

13 نومبر 1976ء، منٹگمری کو ساہیوال کا نام دیا گیا۔

16 نومبر 1988ء، پاکستان میں الیکشن۔ پی پی پی فاتح قرار پائی۔

18 نومبر 1967ء، مصری مغنیہ ام کلثوم کو ستارہ امتیاز دیا گیا۔

20 نومبر 1984ء، مشہور شاعر فیض احمد فیض کا انتقال۔

22 نومبر 1971ء، ہندوستان نے مشرقی پاکستان پر حملہ کردیا۔

22 نومبر 1953ء، علامہ سید سلیمان ندوی کا کراچی میں انتقال۔

23 نومبر 2002ء، ظفر اللہ جمالی نے وزیراعظم کا حلف اٹھایا۔

24 نومبر 1978ء، لاہور میں پاکستان نے آسٹریلیا کو ہرا کر ہاکی ٹرافی جیت لی۔

25 نومبر 1949ء، کراچی میں پہلی اسلامی اقتصادی کانفرنس منعقد ہوئی۔

25 نومبر 2007ء، نواز شریف کی وطن واپسی۔

26 نومبر 1964ء، ایوب خان نے لاہور ٹی وی اسٹیشن کا افتتاح کیا۔

26 نومبر 1967ء، نواب کالا باغ کا قتل ہوا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط: 01

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند و بالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پکارتی تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکار سی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن و دل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستانِ حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنا دی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہو گیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک پھیلی گئیں۔ فتح خان نے مجھے مجبور کر دیا کہ مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے۔ میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان سے مقابلہ جاری تھا کہ مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آ جائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ وہاں سے میں ہوٹل میں آیا۔ پھر عبداللہ کی کوٹھی پر۔ ہم وہیں تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاشی لینے پہنچا تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کر دیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کی تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات بتا کر نکل بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زوروسنگی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کر کے بھالا اپنے حق میں کر لی۔ میں دوستوں کے درمیان آ کر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جا رہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ مگر شہلا نکل گئی۔ ہم مانسہرہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ شہزی کی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زوروسنگی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کر رہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زوروسنگی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کر دیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے ہم پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر شیبا نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو انٹیلی جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کر دی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کر لیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ہم واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آ گئے۔ سفیر کو دبئی بھیجا تھا اسے ائرپورٹ سے پک اپ کر کے آ رہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست دان کی بیٹی نگی کی تھی جس نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہو چکے ہیں۔ ممتاز حسن ہمیں کسی نے خوار کرانا چاہتا تھا۔ نگی کا چہرہ جو نظر آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ وہ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہو گیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہو گیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہو کر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے جا رہے تھے راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیات اتر کر گیا اور کچھ ایسا کہا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ وہاں اندرونی سازش عروج پر تھی۔ چھوٹے کنور نے سازش کر کے بانو کو اپنے بیڈروم میں بے ہوشی کی حالت میں بلوا لیا۔ میں نے راجن پر حملہ کر دیا۔ وہ مجھ پر قابو پاتا کہ منشی ولی آ گیا اور اس نے راجن کو پستول کے نشانے پر لے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ بانو کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ کئی روز کے بعد مجھے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی جس کا اثر نہیں ہوا۔ نائیک اور راجن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پالیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آ جاؤ۔" میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر ہاتھ مارا پستول نکل کر دور جا گرا پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ راج کنور کو لے کر سرحد پار کر گیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کر لیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جا رہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے ہیلی کاپٹر لانے کو کہا۔ ستکاری جب ہیلی کاپٹر واپس لا رہا تھا کہ میزائل پھٹ گیا اور ہمارا ذہن تاریک ہو گیا۔ دھماکے سے ہیلی کاپٹر پانی پر گرا تھا مگر ہم سب محفوظ رہے۔ میں نے سڑک پر پہنچ کر ایک ٹرک کو روکا اور اس پر سوار ہو کر چلا تو بی ایس ایف کے کچھ سپاہیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کو ٹھکانے لگا کر ہم آگے بڑھے اور ایک طیارہ کرائے پر لے کر نئے سفر پر چل پڑے۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کنور کے محل کی ناکا بندی کرنے جا پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد بائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکیں جو نے سڑک پر کیلیں بچھا دی تھیں۔ گاڑی قریب پہنچی تو دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو جیجو کے شانے میں لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو شوٹ کر دیا۔ گاڑی کی تلاشی لی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مگر وہاں سعدی کی بجائے کنور تھا۔ ہم محل کی طرف دوڑے کہ ایک ہیلی کاپٹر اتر رہا تھا۔ اس سے سعدی اتری اور اندر چلی گئی۔ میں بیٹو کو لے کر ڈاکٹر کپنا کے پاس پہنچا۔ اس نے طبی امداد دے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بہن سیتا کے گھر بھیج دیا۔ سیتا کا شوہر اروِن اسے ہراساں کررہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔ وہ فتح خان تھا اس نے ڈیوڈ شا کے اشارے پر مجھے گھیرا تھا۔ میں اس کے ساتھ ڈیوڈ شا کے پاس پہنچا۔ ڈیوڈ نے نراسرا وادی میں چلنے کی بات کی۔ اس نے ہر کام میں مدد دینے کا وعدہ کیا۔ سعدیہ کو کنور ہیلس سے آزاد کرانے کی بات بھی ہوئی اور اس نے بھرپور مدد دینے کا وعدہ کیا۔ ہماری خدمت کے لیے پوجا نامی نوکرانی کو مقرر کیا گیا تھا۔ وہ کمرے میں آگئی تھی کہ اس کے مائیکروفون سے منشی دل جی کی آواز سنائی دی "شاہ جی، شہباز ملک کسی عورت کو چھڑانے آیا ہے۔" ڈیوڈ شا کا جواب سن نہیں پایا کیونکہ پوجا نے مائک بند کردیا تھا۔ اس دن کے بعد سے پوجا کی ڈیوٹی کہیں اور لگادی گئی۔ میں ایک جھاڑی کی آڑ میں بیٹھ کر موبائل پر باتیں کررہا تھا کہ کسی نے پیچھے سے وار کرکے مجھے بے ہوش کردیا۔ مجھے پتا تھا ہر جگہ ڈیکا فون لگا ہوا ہے۔ تبھی فائرنگ شروع ہوئی اور میں نے چیخ کر کہا "کنور شہباز" ساوی کو لے کر جمیر......" مگر جملہ ادھورا رہ گیا اور ساوی کی چیخ سنائی دی پھر منشی دل نظر آیا۔ اس کے آدمیوں نے بڑے کنور کے وفاداروں کو ختم کرنا شروع کردیا تھا۔ پر منشی جن غنڈوں کو لے کر آیا تھا انہوں نے بغاوت کردی۔ ان سے نمٹ دیا تھا کہ فتح خان نے آکر مجھے اور ساوی کو نشانے پر لے لیا۔ تبھی راج کنور آگیا۔ اس نے گولی چلائی جو بیٹو کی گردن میں لگی۔ میں نے غصے میں پورا پستول راج کنور پر خالی کردیا اور بیٹو کی طرف لپکا۔ بیٹو مر چکا تھا۔ اس کی لاش کو ہم نے چتا کے حوالے کیا اور ایک ہیلی کاپٹر کے ذریعے سرحد تک پہنچے۔ کچھ ہی دور چلا تھا کہ میرا ایک بار دوبارہ سرنگ پر پڑ گیا۔ وسیم نے آکر اسے ناکارہ کیا پھر ہم..... کمال گھوگھر کی حویلی میں پہنچے وہاں سے اپنے شہر۔ وہاں پہنچا ہی تھا کہ زیبو کی کال آگئی اس نے تصفیہ کرانے کی بات کی اور کال کٹ گئی ہم اس مکان کو چھوڑ کر دوسرے مکان میں آگئے خود وہاں پہلے سے ایک لڑکا اور لڑکی چھپے ہوئے تھے اتفاق کہیں کہ وہ مرشد کی بیٹی بھتیجا تھے۔ ان کو قید کرکے میں رات میں چھت پر ٹہل رہا تھا کہ ایک پک اپ آکر گیٹ سے ٹکرائی۔ دھماکا ہوا اور پک اپ اندر آگئی۔ وہ لوگ فاضلی کو رہا کرانے آئے تھے ہم نے بحالت مجبوری اسے رہا کردیا۔ پھر اطلاع ملی کہ مرشد کا داماد پاس جو لڑکا تھا مرشد کی بیٹی کے ساتھ اس کے چچا دلبر کو ختم کرادیا ہے ہم بنگلے میں بیٹھے باتیں کررہے تھے کہ گیس پھینک کر ہمیں بے ہوش کردیا اور جب ہوش آیا تو میں قید میں تھا۔

اب آگے پڑھیں

مجھے دشمن کی قید میں جانے کا اتنا تجربہ ہوگیا تھا کہ اگر اس کی کوئی ڈگری ہوتی تو میں بلاشبہ پی ایچ ڈی کرچکا ہوتا۔ بے ہوش ہونے سے لے کر باہوش تک ہر طرح کا تجربہ تھا۔ عام طور سے ہوش میں آنے کے بعد میں کسی الگ تھلگ اور خاموش جگہ قید ہوتا تھا جہاں مجھے فرار سے روکنے کے تسلی بخش انتظامات کیے جاتے تھے۔ مگر اس بار ذرا منفرد انداز میں ہوش میں آیا۔ اچانک ایک جھٹکے کے ساتھ حواس بیدار ہوئے اور آنکھیں کھلیں تو ڈیوڈ شا میرے سامنے تھا۔ میں ایک صوفے پر تھا اور وہ میرے مقابل دوسرے صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔ یہ بے ہوشی سے ہوش کی طرف آنے کا ایک انوکھا تجربہ تھا۔ میں پورے لباس میں صوفے پر سکون سے بیٹھا ہوا تھا اور میرا ذہن پوری طرح قابو میں تھا۔ بے ہوشی سے واپس آنے کے دوران عام طور سے جو ناگوار اثرات طبیعت پر محسوس ہوتے تھے اس وقت ان کا شائبہ تک نہیں تھا۔ بلکہ ذہن اور جسم بالکل تروتازہ محسوس ہو رہے تھے۔ البتہ نتھنوں میں ایک لطیف اور صندل جیسی خوشبو کا احساس تھا شاید کسی دوا کو سنگھا کر مجھے ہوش میں لایا گیا تھا۔ جھٹکا اسی کا ردعمل تھا۔ ڈیوڈ شا مجھے ہوش میں پا کر زیرلب مسکرایا۔ "شہباز کیسا محسوس کر رہے ہو؟"

"بہترین۔"

اس نے سر ہلایا۔ "تم پر جو گیس استعمال کی گئی تھی وہ صرف بے ہوش کرتی ہے، جان کے لیے خطرہ نہیں بنتی ہے، چاہے اس کی مقدار کتنی زیادہ کیوں نہ ہو۔"

"گیس کی کیا ضرورت تھی تمہارا کورنیا ہی کافی تھا۔" میں نے مسکرا کر کہا لیکن اندر سے میں بہت فکرمند تھا اور یہ فکرمندی عبداللہ اور سفیر کے حوالے سے تھی۔ میں نے غیر محسوس انداز میں اس جگہ کا جائزہ لیا۔ یہ ایک بند اور چھوٹا ہال نما کمرا تھا۔ بہت سفید اور بہت صاف ستھرا۔ فرش دودھیا سفید ٹائلوں کا تھا اور دیواروں پر چمکیلا سا سفید پینٹ تھا۔ البتہ یہاں موجود فرنیچر بالکل سیاہ تھا۔ یہ کنٹراسٹ کچھ زیادہ ہی تھا۔ جیسے کسی حبشی کے بہت سفید دانت نمایاں ہونے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ میرے عقب میں ذرا پیچھے ایک تنومند سفید فام سیاہ سوٹ میں ساکت کھڑا ہوا تھا۔ مجھے ذرا بھی شبہ نہیں ہوا کہ وہ زیبوڈ شا کا باڈی گارڈ نہیں ہے۔ اگر عبداللہ اور سفیر بھی لائے گئے تھے تو وہ کہیں اور تھے۔ یہ پہلا موقع ہوا کہ میرے ساتھ میرے اہم ترین ساتھی بھی دشمن کی قید میں آگئے تھے۔

"باسو عام لوگوں کے لیے ہے۔" زیبوڈ شا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میرا نہیں خیال کہ تم جیسا شخص اس سے مرعوب ہوگا۔"

"باسو غالباً اسی گروہ کا نام ہے۔" میں نے کہا۔ "بہرحال مبارک ہو تم نے بالآخر مجھے قابو کرلیا۔"

"تمہیں باسو کے بارے میں کیسے پتا چلا؟"

"اسی ٹیکسی ڈرائیور سے جو ہماری نگرانی کر رہا تھا۔"

"میرا بھی یہی خیال تھا۔" زیبوڈ شا نے سر ہلایا۔ "وہ پرسوں سے غائب ہے۔"

"پرسوں۔" میں چونکا۔ "کیا تاریخ بدل گئی ہے؟"

زیبوڈ شا نے میری کلائی کی گھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا صبح کے سات بج رہے تھے اور اگلا دن شروع ہوگیا تھا۔ گویا شاید انیس گھنٹے بے ہوش رہا تھا۔ مگر اتنی طویل بے ہوشی کیسے ممکن تھی۔ زیبوڈ شا نے میرا ذہن بھانپ لیا۔ اس نے کہا۔ "اس گیس کی خصوصیت ہے اسے دو یا تین بار استعمال کر کے بے ہوشی کا دورانیہ بڑھایا جا سکتا ہے۔ دلچسپ تم فکر مت کرو اس سے کوئی نقصان نہیں ہوتا۔ اس دوران میں تمہیں نلکی کی مدد سے خوراک بھی دی گئی تھی۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ گویا اسی وجہ سے مجھے بھوک پیاس نہیں لگ رہی تھی۔ زیبوڈ شا میری جان کا دشمن نہیں تھا مگر وہ تمام دشمنوں میں سب سے زیادہ ذہین اور خطرناک ضرور تھا۔ اگر کبھی اسے میری جان لینے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ ایک لمحہ ہچکچائے بغیر نہایت سرد مہری سے مجھے موت کی نیند سلا دیتا۔ وہ کافی عرصے سے کوشش کر رہا تھا کہ میں راضی خوشی اس کے ساتھ چلوں۔ مگر ہر بار اس سے سامنا درمیان میں رہ جاتا اور کوئی نہ کوئی ایسی گڑبڑ ہو جاتی تھی کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو پاتا تھا۔ اب ایسا لگ رہا تھا کہ اس نے براہ راست اقدام کا فیصلہ کرلیا تھا اور مجھے زبردستی اپنے ساتھ لے جانا چاہتا تھا۔ اسی وجہ سے اس نے مجھے قابو کیا تھا۔ ایک وجہ یہ ہو سکتی تھی اور دوسری وجہ شاید یہ تھی کہ میں اس کے پلان میں مداخلت نہ کر سکوں جو وہ مرشد سے نمٹنے کے لیے بروئے کار لا رہا تھا۔

اب ایسا لگ رہا تھا کہ مرشد ناشلی سے کام نہیں لے رہا تھا بلکہ ناشلی کے لیے کام کر رہا تھا۔ وہ نہ صرف مرشد کے خاتمے کی طرف جا رہا تھا بلکہ ساتھ ساتھ اس کی بچا زادوں کا خاتمہ بھی چاہتا تھا۔ اگرچہ ہم بھی یہی چاہتے تھے مگر ہمارے اور زیبوڈ شا کے مقاصد میں بہت زیادہ فرق تھا۔ ہم اس پورے ٹولے کا خاتمہ چاہتے تھے اور ان میں ناشلی بھی شامل تھا جب کہ زیبوڈ شا ناشلی کو مرشد کی جگہ لانا چاہتا تھا۔ مجھے سو فیصد یقین تھا کہ ناشلی گدی نشین ہوتے ہی ہم سے دشمنی پر کمر باندھ لے گا۔ اس کا طاقتور ہونا ہمارے مفاد میں نہیں تھا۔ زیبوڈ شا غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ "تم فکرمند لگ رہے ہو؟"

"کیا مجھے نہیں ہونا چاہیے؟"

"اگر تم ہونا چاہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے لیکن میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ فکر کی کوئی بات نہیں ہے۔"

"اپنے ساتھیوں کے بارے میں بھی نہیں ہونا چاہیے؟"

"ہاں ان کے بارے میں بھی نہیں ہونا چاہیے۔ وہ آزاد ہیں یہاں صرف تم لائے گئے ہو۔"

"میں تمہاری بات پر کس طرح یقین کرلوں۔"

زیبوڈ شا نے اپنے کوٹ سے میرا موبائل نکال کر میری طرف اچھال دیا۔ "تصدیق کرلو۔"

موبائل آف تھا۔ میں نے آن کر کے سفیر کو کال کی۔ اس نے بیل پوری جانے سے پہلے کال ریسیو کرلی اور بے تابی سے بولا۔ "شہباز تو کہاں ہے؟"

"پہلے یہ بتا کہ تو اور عبداللہ کہاں ہو؟"

سفیر تاڑ گیا۔ "ہم محفوظ ہیں۔" اس نے کہا۔

"اس موبائل کو آن رکھ کر خود کو محفوظ سمجھ رہے ہو۔" میں نے تلخ لہجے میں کہا۔ "تمام موبائل فوراً ترک کر دو اور اپنی جگہیں......" اچانک مجھے لگا کہ لائن کٹ گئی ہے۔ موبائل سے ہلکی سی سرسراہٹ کی آواز آ رہی تھی۔ "ہیلو...... ہیلو......"

"بیکار ہے۔" زیبوڈ شا کے باڈی گارڈ نے اچانک عقب سے مجھ سے موبائل اچک لیا۔ "یہاں سگنل کام نہیں کر رہے ہیں۔"

"کام نہیں کر رہے یا تم لوگوں نے بلاک کر رکھے ہیں؟" میں نے سکون سے کہا۔

"تم کچھ پیو گے؟"

"ہاں ایک گلاس ٹھنڈا پانی۔" میں نے کہا۔ زیبوڈ شا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے اپنے کمرے کی طرف دیکھا اور اس نے فوری بڑے اسٹائلش شیشے کے گلاس میں پانی پیش کیا۔ میں نے پہلی بار اسے غور سے دیکھا اس کے چہرے پر چوٹوں کے مندمل ہونے نشان تھے۔ میں نے گلاس لے کر کہا۔ "شاید تم اس گاڑی میں تھے جو دودھ کے ٹرک سے ٹکرائی تھی۔"

اس کی آنکھوں میں سفاک چمک لہرائی۔ "ہاں اس دن تم قسمت سے بچ کر آگئے تھے۔"

"تم بھی قسمت سے بچ کر ہی نکلے تھے ورنہ اظہر اور افراز کو شوٹ کرنے میں دو منٹ لگتے۔"

"یہ اتنا آسان نہیں ہوتا۔"

میں نے پانی پی کر گلاس اسے تھما دیا اور زیبوز شا کی طرف دیکھا۔ "تم مجھ سے کیا چاہتے ہو؟"

"دردانہ اور راشد۔" اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

میں اس غیر متوقع مطالبے پر چونکا۔ "یعنی مرشد کی بیٹی اور اس کا داماد۔"

"وہ تمہارے پاس ہیں۔"

"ہاں لیکن وہ تمہیں نہیں مل سکتے۔"

"کیوں؟"

"وہ میری پناہ میں ہیں اور جو میری پناہ میں ہوں ان کو میں کسی کے حوالے نہیں کرتا۔"

"وہ تمہارے دشمن خاندان سے ہیں۔"

"ہوں گے۔" میں نے بے پروائی سے جواب دیا۔ "میں پورے خاندان سے دشمنی کا قائل نہیں ہوں۔"

زیبوز شا نے نرمی سے کہا۔ "اگر وہ مل جائیں تو میرا کام آسان ہو جائے گا۔"

"آسانیاں تلاش کرنا تمہارے جیسے شخص کو زیب نہیں دیتا ہے۔" میں نے ملامت سے کہا۔ "تم ان دو افراد کے بغیر بھی بہت کچھ کر سکتے ہو بلکہ شاید کر رہے ہو گے؟"

زیبوز شا کا چہرہ سپاٹ ہو گیا۔ "کل رات پولیس اسٹیشن سے واپسی پر اصغر اور اس کے دو بیٹے اور ایک بھتیجا دو گارڈز سمیت نامعلوم قاتلوں کا نشانہ بن گئے۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ میں بھی کسی ایسی ہی خبر کی توقع کر رہا تھا۔ مرشد خاندان بہت تیزی سے ختم ہو رہا تھا۔ مجھے اصغر اینڈ پارٹی سے ہمدردی نہیں تھی مگر نہ جانے کیوں ان کے مارے جانے کا سن کر مجھے دکھ ہوا تھا۔ اب ان بھائیوں میں صرف ایک بچا تھا اور اس کا بچنا بھی محال نظر آرہا تھا۔ مرشد بہت تیزی اور سفاکی سے کام لے رہا تھا۔ میں نے پوچھا۔ "یہ مرشد کا کام ہے؟"

خلاف توقع زیبوز شا نے نفی میں سر ہلایا۔ "نہیں وہ کل دوپہر میں گرفتار ہو گیا تھا۔"

یہ ایسی خبر نہیں تھی کہ میں سکون سے بیٹھا رہتا۔ میں نے اضطرابی لہجے میں پوچھا۔ "تم...... سچ کہہ رہے ہو...... میرا مطلب ہے......؟"

زیبوز شا نے اپنے سامنے تپائی پر پڑا شام کا اخبار اٹھا کر میری طرف بڑھا دیا۔ اس میں مرشد کی گرفتاری کی مکمل خبر تھی۔ ایک تصویر میں اسے پولیس موبائل میں بیٹھتے دکھایا جا رہا تھا۔ اس منظر کو دیکھ کر مجھے ایک ناقابل بیان سی خوشی ہوئی تھی۔ مرشد فرعون بنا ہوا تھا اس نے میرے خلاف جھوٹے مقدمات بنائے اور اس کی پوری کوشش تھی کہ میں کسی طرح اس کے زرخرید پولیس والوں کے ہاتھ آ جاؤں تاکہ وہ تشدد کر کے مجھے پولیس مقابلے میں مار دیں۔ مگر اللہ کو یہ منظور نہیں تھا میں کبھی گرفتار نہیں ہوا مگر آج مرشد گرفتار ہو کر جا رہا تھا۔ یہ اور بات تھی کہ ایک دن میں اس کی ضمانت ہو جاتی۔ بہرحال وہ گرفتاری کی ذلت سے تو گزرا تھا۔ خبر کے مطابق اسے دو روز پہلے ہونے والی قتل و غارت گری کے سلسلے میں درج کرائی جانے والی ایف آئی آر کی بنیاد پر گرفتار کیا گیا تھا۔ یہ ایف آئی آر عدالت کے حکم پر درج کرائی گئی۔ شاید اصغر اپنے بیٹوں اور بھتیجے کے ہمراہ اسی سلسلے میں تھانے سے آ رہا تھا جب انہیں قتل کر دیا گیا۔ مگر زیبوز شا کا کہنا تھا کہ یہ مرشد کا کام نہیں تھا تو پھر کس نے انہیں مارا تھا؟

"یہ تاشقلی کا کام ہے؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں وہ اپنے راستے کے تمام کانٹوں کو صاف کر رہا ہے۔" زیبوز شا نے بلا جھجک اعتراف کر لیا۔

"اور تم اس قتل و غارت گری میں اس کا ساتھ دے رہے ہو؟"

"پرسوں رات تم نے جو کیا......"

"وہ سیلف ڈیفنس تھا۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "وہ حملہ کرنے آئے تھے جو مارے گئے۔"

"اسے بھی سیلف ڈیفنس ہی سمجھو۔" زیبوز شا نے کہا۔ "شہباز مجھے وہ دونوں درکار ہیں اگر تم نہیں دو گے تو میں کسی اور طریقے سے حاصل کر لوں گا اور اگر اس دوران میں کوئی نقصان ہوا تو تم مجھے ذمے دار قرار نہیں دے سکو گے۔"

میرا دل لرز گیا تھا لیکن میں نے اپنے تاثرات سپاٹ رکھے۔ "زیبوز شا اگر تمہارے کسی فعل سے مجھے یا میرے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ساتھیوں کو کوئی نقصان ہوا تو تم کس طرح بری الذمہ ہو سکتے ہو؟''

''کیونکہ میرے کام میں تمہاری وجہ سے رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے۔''

''کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ تم اور فاضلی مرشد اور اس کے کزنز کے خلاف ہر طرح سے آزاد ہو صرف ان دو کے نہ ملنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''پڑے گا لیکن تم نہیں سمجھو گے۔'' زیبوؤشا کا لہجہ سرد ہو گیا۔ ''شہباز! اگر تمہارے دونوں ساتھی بھی یہاں ہوتے تو کیا تم تب بھی انکار کرتے؟''

''شاید نہیں۔'' میں نے سوچ کر کہا۔ ''تم نے دو دن کی بات کی تھی اور اس وقت تم نے مجھ سے راشد اور روبانہ کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔''

''کیونکہ اس وقت فاضلی نے ان کا مطالبہ نہیں کیا تھا۔''

''تو تم فاضلی کے اشاروں پر چل رہے ہو۔'' میں نے اس کی طرف دیکھا۔ ''زیبوؤشا مجھے تم جیسے آدمی سے توقع نہیں تھی کہ تم عام سے لوگوں سے اتنے دھوکے کھا سکتے ہو۔ پہلے مرشد، پھر مکی بل جی اور اب فاضلی۔ کیا تمہیں یقین ہے کہ وہ بعد میں بھی تمہارا تابعدار ثابت ہوگا؟''

زیبوؤشا کا رنگ معمولی سا بدلا مگر اس نے فوراً خود پر قابو پا لیا۔ اس نے چالاکی سے بات بدل دی۔ ''میں نے دو دن کی بات کی تھی ابھی اسے پورا ہونے میں سولہ گھنٹے ہیں۔''

''اس دوران میں فاضلی مرشد اور اس کے گھر والوں کا صفایا کر دے گا۔ ساتھ ہی شاید ارشد کا آخری بھائی بھی اس کا نشانہ بنے گا۔''

''نہیں ان کے ساتھ جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔ اب وہ کسی قابل نہیں رہے۔''

گویا ارشد اینڈ برادران کا کھیل ختم ہو گیا تھا۔ ایک بھائی اکبر بچا تھا جو زیبوؤشا کے خیال میں کسی قابل نہیں تھا مگر انسان کے بارے میں کیا کہا جا سکتا ہے کہ وہ کب کیا کر گزرے۔ ہو سکتا ہے اکبر ہی فاضلی اور مرشد کے لیے وبال بن جائے۔ میں نے مرشد کے بارے میں پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''وہ مرشد ہاؤس سے اپنی درگاہ والی کوٹھی میں منتقل ہو گیا ہے اور تم بھی یہی چاہتے تھے۔''

مرشد ہاؤس شہر میں تھا یہاں کسی بھی قسم کے ہنگامے کی صورت میں پولیس بہت تیزی سے آ جاتی۔ جب کہ درگاہ مرشد پہ شہر سے فاصلے پر تھا وہاں کسی ہنگامے کی صورت میں پولیس اور مدد خاصی دیر سے پہنچتی جیسا کہ پرسوں رات ہوا تھا۔ ہم اپنا کام کر کے اطمینان سے وہاں سے رخصت ہوئے تھے۔ پولیس اس کے بھی خاصی دیر بعد پہنچی تھی۔ میری معلومات کے مطابق درگاہ ہنگامے سے پہلے ہی عام افراد کے لیے بند کر دی گئی تھی اور عام ملازمین بھی اپنے رہائشی حصوں تک محدود کر دیے گئے تھے۔ ناکام حملے کے بعد درگاہ کی سیکورٹی انتہائی سخت کر دی گئی تھی۔ ایسے میں اگر فاضلی وہاں براہ راست کوئی کارروائی کرنا چاہتا تو یہ آسان نہیں ہوتا۔ یقیناً وہ کسی پلان کے تحت چل رہا تھا اور وہ مرشد کو سرپرائز دیتا۔ زیبوؤشا نے میرے ساتھ جس طرح کھل کر بات کی تھی اور بہت سی باتوں کا آسانی سے اقرار کر لیا تھا اس سے لگ رہا تھا کہ حالات اس کے اور فاضلی کے اپنے قابو میں آ گئے تھے کہ میرے کچھ جان لینے سے انہیں فرق نہیں پڑتا۔ اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ میں زیبوؤشا کے قبضے میں تھا۔ اسے اطمینان تھا کہ میں اس قید سے فرار نہیں ہو سکتا تھا۔ مجھے خیال آیا اور میں نے زیبوؤشا سے پوچھا۔

''تمہارے آدمی مجھ تک کیسے پہنچے جب کہ میں بہت محتاط تھا۔''

''تم محتاط تھے لیکن تم ایک غلطی کر گئے۔ بات کرنے کے بعد جب تم لوکیشن بدل رہے تھے تب تم نے موبائل آف نہیں کیا تھا اور میرے آدمی اسے ٹریک کرتے ہوئے اس جگہ پہنچ گئے۔ اگر تم موبائل آف کر دیتے تو ان کے لیے اتنی جلدی تمہیں تلاش کرنا ممکن نہ ہوتا۔''

مجھے یاد آ گیا کہ جب منیر کے اشارے پر میں نے کال کاٹی تھی تو موبائل بند کرنا بھول گیا تھا اور اس سگنلز کی مدد سے زیبوؤشا کے آدمی ہم تک پہنچ گئے اور پھر انہوں نے آرام سے تعاقب کر کے فلیٹ دیکھ لیا۔ میں نے سر ہلایا۔ ''یہی...... واقعی مجھ سے یہ غلطی ہو گئی۔''

''اب تم آرام کرو۔'' زیبوؤشا نے اچانک کہا۔ ''جب تم آمادہ ہو کر روبانہ اور راشد کو میرے حوالے کر دو گے تو بتا دینا۔''

میری سمجھ میں اس کی بات نہیں آئی جب میں انکار کر چکا تھا تو پھر کیونکر راضی ہوتا۔ تنومند شخص نے مجھ سے کہا۔ ''پلیز مسٹر شہباز۔''

میں اس کے ساتھ اٹھ کر کمرے سے باہر آیا تو دروازے پر وہی گوریلا نما شخص موجود تھا اور اس وقت اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے صرف ایک بڑی سی نیکر پہنی ہوئی تھی جو اس کے گھٹنوں تک آ رہی تھی۔ اوپری جسم مکمل طور پر عریاں تھا اور اس کا ایک ایک رگ پٹھا واضح تھا۔ اس کا جسم بہت ٹھوس اور گٹھا ہوا تھا۔ تنومند کے برابر پیٹ اور لمبے بازو اسے عجیب سی ساخت دے رہے تھے۔ کم سے کم میں نے آج تک انسان کی ایسی ہیئت نہیں دیکھی تھی۔ اس کا سر صاف تھا اور پھیلی ہوئی ناک پر چھوٹی چھوٹی سرخ آنکھوں میں درندگی جھلک رہی تھی۔ منہ چوڑا اور جبڑے مضبوط تھے۔ وہ شاید منگول اور وسط ایشیائی نسلوں کا مکسچر تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو اس کی آنکھوں میں سفاکی نمودار ہوئی۔ تنومند شخص نے کہا۔ ”باسو اسے دو نمبر میں لے جاؤ۔“

”چلو۔“ اس نے غرا کر انگریزی کہا۔

”یہ تو بولتا ہے۔“ میں نے تنومند کی طرف دیکھا۔ ”میں تو سمجھتا تھا کہ یہ بھونکتا ہوگا۔ ویسے ڈیوڈ شا نے یہ جانور کہاں سے پکڑا۔“

باسو کا چہرہ سرخ اور آنکھیں سرخ تر ہوگئی تھیں۔ اس نے غرا کر میری طرف دیکھا اور تنومند سے بولا۔ ”مجھے اجازت دو میں اس کا دماغ درست کر دوں؟“

”یہ صرف کاٹنے کے لیے اجازت لیتا ہے۔“ میں ہنسا۔ ”بھونکتا اپنی مرضی سے ہے۔“

”پلیز مسٹر شہباز۔“ تنومند نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ”تم باسو کا مسئلہ مت بنا۔ ابھی تم پر سخت وقت آنے والا ہے۔“

”کیا اس کی صورت میں۔“ میں نے باسو کی طرف اشارہ کیا۔ ”ویسے اس کے لیے مناسب جگہ کوئی چڑیا گھر ہے جہاں یہ پنجرے کے پیچھے رہ کر بچوں کا دل بہلائے۔“

میں باسو کی طرف دیکھ رہا تھا اس لیے میں نہیں دیکھ سکا کہ تنومند نے اسے کیا اشارہ کیا اچانک ہی اس کا رنگ و روپ نارمل ہو گیا اور اس نے غرانا بھی موقوف کر دیا۔ اس نے نرمی سے ہاتھ بڑھا کر میرے شانے پر رکھا اور مجھے لگا جیسے کوئی تناور شانے پر آ گیا ہو اور جب اس نے پکڑ کر کھینچا تو میں آرام سے کھنچا چلا گیا۔ بلاشبہ اس کی گرفت اور قوت دونوں جناتی تھیں۔ وہ اسی طرح مجھے کھینچتا ہوا اگلی راہداری کے کونے میں واقع کمرے تک لایا اور دروازہ کھول کر اندر دھکیل دیا۔ اس دوران میں اس نے قوت کا مظاہرہ کیا تھا مگر اس نے مجھے تکلیف نہیں دی تھی گرفت سخت تھی مگر بہت زیادہ نہیں۔ مجھے اندر دھکیلتے ہی اس نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ کمرے میں سوائے ایک قالین کے اور کچھ نہیں تھا۔ یہاں اے سی کی خنکی تھی مگر بظاہر کوئی ڈکٹ یا خانہ نظر

نہیں آ رہا تھا۔ کمرے میں سوائے ایک دروازے کے اور کچھ نہیں تھا۔ چھت پر چند لائٹس لگی تھیں اور کمرا بہت روشن تھا۔ میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

میں ڈیوڈ شا کے رویے پر غور کر رہا تھا۔ یہ نہ صرف پہلے کے مقابلے میں بدلا ہوا تھا بلکہ کچھ دھمکی آمیز بھی تھا۔ اس نے مجھے میرے ساتھیوں کے حوالے سے دھمکی دی تھی اور پھر روما نہ اور راشد کا مطالبہ کیا تھا۔ یہ مطالبہ اصل میں نا حصلی کا تھا مگر ڈیوڈ شا نے اسے پیش کیا تھا۔ اس کمرے میں بھیجنے سے پہلے اس نے کہا تھا کہ جب میرا ارادہ ہو جائے تو میں اسے مطلع کر دوں۔ بھلا میرا ارادہ کیوں ہونے لگا جب کہ میں اسے پہلے ہی انکار کر چکا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میں بے خیالی میں اپنا بایاں ہاتھ مسل رہا تھا۔ مجھے یوں لگا جیسے اس میں ہلکی سی سوزش ہو رہی ہو۔ اس وقت میں نے توجہ نہیں دی تھی مگر جب میں نے ہاتھ ملا تو سوزش بہت تیزی سے بڑھ گئی تھی اور پھر ایک منٹ میں یہ اتنی بڑھ گئی کہ مجھے لگا جیسے میرے ہاتھ کو آگ میں رکھ دیا ہے۔ اس بار میں دنگ رہ گیا۔ میرے ذہن میں اچھن کی تکلیف کا خیال آیا جب ڈیوڈ شا نے اس کے ہاتھ پر ایک خاص قسم کا زہر لگا دیا تھا جو شدید تکلیف کا باعث بنا تھا اور ڈاکٹر اس کے بارے میں کچھ نہیں کر سکے تھے۔ کیا ڈیوڈ شا نے وہی زہر مجھے بھی لگا دیا تھا؟

تکلیف معمولی نوعیت کی نہیں تھی۔ اگر میں قوت برداشت نہ رکھتا تو چیخنا کراہ رہا ہوتا۔ میں نے ہاتھ اپنی بغل میں دے کر دبایا مگر کوئی فرق نہیں پڑا۔ یہ وہی ہاتھ تھا جو ایک موقع پر میرے جسم سے جدا ہونے والا تھا اور ڈاکٹر اسے کاٹنے کی تیاری بھی کر چکے تھے مگر پھر وسیم امجد پارٹی عین موقع پر مجھے وہاں سے نکال لائے اور پھر جسم آبی نے میرا علاج کر کے اس ہاتھ کو ٹھیک کر دیا۔ لیکن ایسی تکلیف تھی کہ اس کے مقابلے میں ہاتھ کا جسم سے الگ ہونا آسان لگ رہا تھا۔ ڈیوڈ شا نے یقیناً میری بے ہوشی کے دوران زہر لگایا تھا۔ اس کا طریقہ یہ تھا کہ وہ زہر اپنے ہاتھ پر لگا کر مجھ سے ہاتھ ملاتا اور اس سے زہر میری جلد میں سرایت کر جاتا۔ خود ڈیوڈ شا کے پاس توڑ تھا اور وہ تکلیف سے بچ جاتا۔ مگر مجھے زہر لگانے کے لیے اسے زحمت نہیں کرنا پڑی ہوگی اس نے آرام سے بے ہوشی کے دوران مجھے لگایا اور اب اس کے متحرک ہونے کا وقت آ گیا تھا۔

بالآخر میرا ضبط جواب دے گیا اور میں کراہنے پر مجبور ہو گیا۔ زیر لب میں ڈیوڈ شا کی سات پشتوں کو کوس رہا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ کیونکہ ان میں سے ہر پشت اس جیسے خبیث آدمی کی دنیا میں آمد کی ذمے دار تھی۔ تکلیف ایسی تھی کہ ایک جگہ رکنے کی بجائے مسلسل بڑھ رہی تھی۔ کچھ دیر بعد میں باآواز بلند ڈیوڈ شا کو نواز رہا تھا۔ اب مجھے اندازہ ہوا تھا کہ ایمن کس تکلیف سے گزری تھی کیونکہ اسی تکلیف سے میں بھی گزر رہا تھا۔ میں جتنا کتا مرد ہونے کے باوجود برداشت نہیں کر پا رہا تھا اور اس نے نازک عورت ہونے کے باوجود بہت دیر تک یہ تکلیف سہی تھی۔ اچانک کمرے میں ڈیوڈ شا کی آواز گونجی۔ ”میں تمہاری گالیاں سن رہا ہوں اور میں نے برا نہیں مانا۔“

”ذلیل شخص۔“ میں نے دھاڑ کر کہا۔ ”کاش کہ میں نے تجھے قتل کر دیا ہوتا۔“

”ممکن ہے تم ہی مجھے قتل کرو۔“ اس نے سکون سے کہا۔ ”لیکن جب میرا وقت آئے گا تب مروں گا۔“

”ڈیوڈ شا تم نے...... وہی زہر لگایا ہے جو ایمن کو لگایا تھا؟“ میں نے قالین پر دوہرے ہوتے ہوئے کہا۔ کمرے کی خنکی کے باوجود میرے مساموں سے پسینا پھوٹنے لگا تھا۔

”ہاں یہ وہی زہر ہے۔ شہباز تم روحانہ اور راشد کو میرے حوالے کر دو میں ایک منٹ میں تمہیں اس تکلیف سے نجات دلا دوں گا۔“

”لعنت ہو تم پر۔“ میں نے جواب دیا۔ اس سے آگے جو کہا وہ سب ناقابل اشاعت ہے۔ میں نے زندگی میں کبھی اتنی تھوڑی سی دیر میں کسی کو اتنی گالیاں نہیں دی تھیں۔ اس پر بھی ڈیوڈ شا بے مزہ نہیں ہوا تھا اس نے آرام سے کہا۔

”ٹھیک ہے جب تم آمادہ ہو تو مجھے آواز دے لینا۔“

میں نے پھر اپنی زبان گندی کی اور اسے بتایا کہ میں اسے کیا دوں گا۔ تکلیف کی شدت نے مجھے پاگل کر دیا تھا۔ میں قالین پر باقاعدہ لوٹ رہا تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ ہاتھ کو دیواروں پر ماروں۔ نہ جانے کیسے میں نے خود کو اس حرکت سے روکا ورنہ میرے ہی ہاتھ کو نقصان پہنچتا۔ ورنہ ڈیوڈ شا کا کچھ نہیں بگڑتا۔ نہ جانے کتنی دیر گزر گئی۔ درد سے توجہ ہٹانے کے لیے میں ذہن میں الٹی گنتی دہرانے لگا مگر یہ گنتی چند بار گنتے ہی گڈمڈ ہو جاتی کہ میں بھول جاتا کہ میں اس سے پہلے کیا آ رہا ہے اور ستر کے بعد کیا تھا؟ جب لوٹنے سے بھی مسئلہ حل نہیں ہوا تو میں اوندھے منہ لیٹ گیا اور گہرے سانس لینے لگا۔ میری زبان خاموش تھی مگر میرا دل رواں

اللہ کے حضور گڑگڑا رہا تھا کہ مجھے اس تکلیف سے نجات دے۔ شاید اس وقت میں نجات کے بدلے مرنے کو بھی تیار ہو جاتا۔

پھر تکلیف نے میرے ذہن پر غشی سے طاری کر دی۔ میں کب کراہتے کراہتے آس پاس سے خود سے غافل ہو گیا مجھے پتا نہیں چلا تھا۔ پھر ہوش آیا تو سکون تھا۔ صرف ہاتھ میں نہیں بلکہ ذہن و قلب میں بھی سکون تھا۔ جسم پسینے میں شرابور ہو کر خشک ہو گیا تھا البتہ گلے میں پیاس سے کانٹے پڑ رہے تھے۔ میں نے اٹھ کر ڈرتے ڈرتے اپنے ہاتھ کو چیک کیا۔ اسے چھوا مگر ذرا بھی تکلیف نہیں تھی۔ ہاتھ بالکل نارمل تھا۔ میں نے اسے دبایا پھر کھینچ کر دیکھا۔ کچھ نہیں ہوا۔ مجھے خیال آیا کہ بے ہوشی کے دوران ڈیوڈ شا نے مجھے اس کا توڑ تو نہیں دے دیا تھا۔ توڑ ایک انجکشن تھا جو ایمن کو بھی لگایا گیا تھا۔ میں نے اپنے بازو چیک کیا پھر جسم کو محسوس کر کے دیکھا مگر نہ تو کہیں انجکشن کا نشان تھا اور نہ ہی اس کی تکلیف تھی۔ پھر تکلیف کیسے ختم ہوئی۔ میں نے گھڑی کی طرف دیکھا تو دنگ رہ گیا۔

ابھی نو بجے تھے اور میں سوا آٹھ بجے اس کمرے میں آیا تھا گویا مجھے پینتیس پالیس منٹ سے زیادہ یہ تکلیف برداشت نہیں کرنی پڑی تھی۔ ڈیوڈ شا اتنا اچھا نہیں تھا کہ اتنی جلدی مجھے اس تکلیف سے نجات دلا دیتا۔ میرا ذہن اب ٹھیک کام کر رہا تھا اور میں سوچ رہا تھا کہ تکلیف خود بخود کیسے ختم ہو گئی۔ کیا زہر نے ٹھیک سے کام نہیں کیا تھا یا پھر یہاں بھی حکیم تاؤس کی معجزہ صفت دواؤں نے اپنا کرشمہ دکھایا تھا۔ ان دواؤں کی بدولت میرے زخم بہت تیزی سے بھر جاتے تھے۔ جان لیوا سانپ کا زہر بھی مجھے مارنے سے قاصر رہا تھا تو کیا اسی وجہ سے یہ زہر بھی بیکار ثابت ہوا تھا۔ میں دوبارہ لیٹ گیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب ڈیوڈ شا کی طرف سے ردعمل کا انتظار کروں گا۔ مجھے زیادہ دیر انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔ چند منٹ بعد ڈیوڈ شا کی آواز آئی۔ ”شہباز تم میری آواز سن رہے ہو؟“

ظاہر ہے میں خاموش رہا۔ وہ وقفے وقفے سے مجھے پکارتا رہا اور میں نے ایک بار بھی جواب نہیں دیا تھا۔ آخر میں اس کے لہجے میں کسی قدر جھنجلاہٹ آ گئی تھی۔ پھر وہ چپ ہوا اور اس کے چند منٹ بعد دروازہ کھلا اور کوئی اندر آیا۔ میں نے اس موقع پر بھی ساکت رہنا مناسب سمجھا۔ کسی نے میرے پاس بیٹھ کر میری نبض دیکھی، پھر دل کی دھڑکن چیک کیا اور آخر میں آنکھ کھول کر پتلی کا معائنہ کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے آنکھ کو مرکوز کرنے کی بجائے ڈھیلا چھوڑ دیا۔ میرے سامنے جو چہرہ تھا اس کے نقوش مشرق بعید کے باشندوں جیسے تھے۔ وہ چینی، جاپانی، کوریائی یا ویت نامی اور تھائی تک کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ اس نے سفید کوٹ پہن رکھا تھا گویا وہ ڈاکٹر تھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔ ''وائٹل سائن نارمل ہیں۔''

''یہ کیسے ممکن ہے اسے شدید تکلیف میں ہونا چاہیے۔'' ڈیوڈ شا بولا وہ بدستور اسپیکر سے بول رہا تھا۔

''میں نے چیک کیا ہے جناب...... آپ تکلیف کی وجہ بتا سکتے ہیں۔''

''ایک زہر جو اس کے بائیں ہاتھ میں انجکٹ کیا گیا ہے۔''

اس نے میرا بایاں ہاتھ اٹھا کر دیکھا اور بولا۔ ''اس پر زہر کی کوئی علامت نہیں ہے۔''

''وہ علامت والا زہر نہیں ہے اور نہ ہی جان لیوا ہوتا ہے لیکن یہ بہت شدید تکلیف کا باعث بنتا ہے۔ تکلیف ایسی ہوتی ہے کہ انسان مرنے کی آرزو کرتا ہے کیا اس صورت میں وائٹل سائن درست ہو سکتے ہیں؟''

''بالکل نہیں...... معمولی سی تکلیف بھی دل کی دھڑکن، نبض کی رفتار بدل دیتی ہے، آنکھ کی پتلی چھلتی اور سکڑتی ہے۔ جب کہ اس کی تمام چیزیں بالکل نارمل ہیں۔''

یہ صورت حال غالباً ڈیوڈ شا کے لیے غیر متوقع تھی۔ اس نے ڈاکٹر سے پوچھا۔ ''اگر اس کے وائٹل سائن نارمل ہیں تو اسے ہوش میں ہونا چاہیے۔''

''بالکل ہونا چاہیے جناب۔'' ڈاکٹر نے اس سے اتفاق کیا۔

''پھر یہ بے ہوش کیوں ہے؟''

''اس کے لیے اسے لیب لے جا کر چیک کرنا ہوگا۔'' ڈاکٹر نے کہا۔

''ٹھیک ہے اسے لیب منتقل کرو۔'' ڈیوڈ شا نے کہا۔ ''اسے فوری ٹریٹ کرو اور پتا چلاؤ کہ یہ کیوں بے ہوش ہوا ہے۔''

''دیا جانے والا زہر اعصاب کو متاثر کرتا ہے؟''

''نہیں وہ صرف تکلیف پیدا کرتا ہے۔''

''اس صورت میں اس کا معائنہ بہتر رہے گا۔''

''باسو سے کہو اسے لیب لے جائے۔ پوری طرح محتاط رہنا یہ بہت خطرناک آدمی ہے۔''

باسو کو ہدایت مل گئی تھی وہ اندر آیا اور اس نے میرا ہاتھ پکڑا تو میں سمجھا کہ وہ مجھے اٹھانے لگا ہے مگر اس نے اچانک ہی میرے سیدھے ہاتھ میں ہتھکڑی پہنا دی۔ کم سے کم اس وقت مجھے لگا تھا کہ وہ ہتھکڑی ہے۔ مگر جب اس نے دوسرے ہاتھ میں کچھ نہیں پہنایا اور مجھے کھینچ کر اپنے وسیع و عریض شانے پر ڈالا تب میں نے موقع پا کر اپنے ہاتھ میں ڈالی جانے والی شے کو دیکھا۔ یہ ہتھکڑی نہیں تھی بلکہ خاصا موٹا چاندی جیسے رنگ کا دھاتی کڑا تھا۔ یہ تقریباً دو انچ چوڑا اور ایک انچ موٹا تھا۔ یہ میری کلائی میں اس طرح فٹ آیا تھا کہ اس نے کلائی کو پکڑ لیا تھا مگر دبا نہیں رہا تھا۔ بالکل مناسب سائز تھا۔ میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجنے لگی یہ کڑا مجھے ایسے ہی نہیں پہنایا گیا تھا۔ باسو مجھے شانے پر لادے آرام سے چلا جا رہا تھا۔ ڈاکٹر آگے تھا اور پیچھے کوئی نہیں تھا اس لیے میں نے ہاتھ اوپر کر کے کڑے کا معائنہ کیا۔ یہ ہموار اور میٹ فنشنگ کے ساتھ تھا۔ مگر اس پر نہ کوئی نشان تھا اور نہ ہی کوئی ابھار صرف جہاں سے مل کر بند ہوا تھا وہاں باریک سی لکیر تھی۔ ایسی ہی باریک لکیر دوسری سمت بھی تھی جہاں سے یہ کھلتا ہوگا۔ میں نے غیر محسوس انداز میں دوسرے ہاتھ سے اسے کھولنے کی کوشش کی مگر وہ ایک پیس کی طرح ٹھوس تھا۔

اس کے ساتھ ساتھ میں راستے پر بھی توجہ دے رہا تھا مجھے لگا کہ میں جس عمارت میں تھا وہ خاصی بڑی تھی۔ یہ کم سے کم وہ کوٹھی نہیں ہو سکتی تھی جہاں قاضی ڈیوڈ شا سے ملنے گیا تھا۔ دو راہداریاں مڑنے کے بعد ہم ایک ہال میں داخل ہوئے۔ وہاں چاروں طرف طبی مقاصد کے لیے مخصوص جدید ترین مشینری لگی ہوئی تھی۔ ڈاکٹر کے اشارے پر باسو نے مجھے ایک کاؤچ نما بیڈ پر لٹا دیا۔ پھر اس نے ایک اسٹرپ میرے سینے سے باندھی اور ایسی ہی دو اسٹرپس رانوں اور پنڈلیوں پر بھی باندھ دیں۔ البتہ میرے ہاتھ آزاد تھے مگر وہ سینے والی اسٹرپ کی وجہ سے کہنیوں سے اوپر حرکت نہیں کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر نے آ کر دیکھا اور بولا۔ ''اس کی شرٹ اتارو۔''

باسو نے سینے والی اسٹرپ کھول کر ایک ہی جھٹکے میں میری شرٹ پھاڑ کر اتار دی۔ دوسرے جھٹکے میں بنیان کا بھی یہی حشر ہوا۔ اوپری جسم عریاں کر کے اس نے اسٹرپ دوبارہ باندھ دی تھی۔ ڈاکٹر نزدیک آیا اور میرے سینے، بازو اور سر سے الیکٹروڈ چپکانے لگا۔ وہ مشینوں کی مدد سے میرا جائزہ لینے جا رہا تھا میں نے محسوس کیا کہ اب ڈراما پکڑا جائے گا۔ اس لیے میں نے ہوش میں آنے کی اداکاری شروع کر دی۔ پہلے کراہا اور پھر تقریباً چیخنے کے انداز میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کراہنے لگا۔ ڈاکٹر تیزی سے میرے پاس آیا۔ اس نے میرا گال تھپتھپایا۔ ”اب کیسا محسوس کر رہے ہو۔“ اس نے انگریزی میں پوچھا۔ وہ انگریزی ہی بول رہا تھا مگر صاف لگ رہا تھا کہ یہ اس کی مادری زبان نہیں تھی۔ ”اب ہوش میں آؤ۔“

میں فرمانبرداری سے ہوش میں آ گیا مگر چیخنا اور کراہنا جاری رکھا۔ ”میرا ہاتھ پلیز کچھ کرو۔“

”کیا ہوا ہے ہاتھ میں؟“ اس نے مکاری سے پوچھا۔ حالانکہ زیوزشا اسے بتا چکا تھا۔

”شدید...... شدید تکلیف ہے۔ مجھے کوئی دوا دو۔“

”کیسی تکلیف ہے؟“ اس نے پوچھا ویسے وہ میرے لیے ذرا بھی فکرمند نظر نہیں آ رہا تھا۔ اس سوال کا جواب میں نے گالیوں کی صورت میں دیا اور حلق پھاڑ کر چلایا۔

”مجھے دو تو پتا چلے کہ کیسی ہو رہی ہے اپنے باپ کو۔ اس نے مجھے زہر دیا ہے۔ میں اسے......“ اس سے آگے بھی جو تھا وہ ناقابل بیان تھا۔ یہ اداکاری ضروری تھی۔ ایک تو میں زیوزشا کو بتانا چاہتا تھا کہ میں تکلیف میں تھا مگر اس کے آگے جھکنے کو تیار نہیں تھا۔ دوسرے مجھے خطرہ تھا کہ اسے پتا چل گیا کہ مجھے اب تکلیف نہیں ہے تو وہ مجھ پر کوئی دوسرا حربہ آزمائے گا وہ اس کے لیے بالکل تیار اور آزاد تھا۔ اس لیے اسے تکلیف کا تاثر دینا ضروری تھا۔ میں چلا رہا تھا اور ساتھ میں کسمسا رہا تھا۔ میری پوری کوشش تھی کہ اداکاری کو اصلی بنا دوں اس کے لیے خود پر جبر کر کے میں زیوزشا کو وہ گالیاں دے رہا تھا جو میں نے زندگی میں نہیں دی تھیں۔ ساتھ ہی اسے بے معنی دھمکیاں بھی دے رہا تھا۔ ڈاکٹر میری کیفیت سے لطف اندوز ہو رہا تھا اور یاسو کسی جن کی طرح ایک طرف ساکت کھڑا تھا۔ بالآخر میں چیخنے چلانے اور گالیاں دینے سے ”تھک“ گیا اور یوں ہانپنے کے انداز میں کراہنے لگا جیسے مجھ میں اب بولنے اور چلانے کی سکت نہ ہو۔ میرا خیال تھا کہ وہاں بس وہی دو ہیں مگر اچانک تالی بجنے کی آواز آئی اور پھر فاضلی اپنے مخصوص زہریلے انداز میں بولا۔

”ویل ڈن شہباز...... تم اداکاری اچھی کر رہے ہو۔“

اس پر میں نے فاضلی کو بھی نواز کر رکھ دیا اور آخر میں بولا۔ ”کتے کے بچے...... اپنے باپ نمبر دو سے بول...... تجھے بھی یہ زہر دے...... تب تو بھی اداکاری کر سکے گا۔“

فاضلی میرے سامنے آیا۔ ”شہباز تم مجھے بے وقوف نہیں بنا سکتے۔ میں جانتا ہوں تم کتنے اعلیٰ درجے کے اداکار ہو۔“

میں نے ایک بار پھر اس کی ایسی کم تیسی کی اور مزید جواب دینے سے گریز کیا۔ وہ بدبخت پہلے بھی میری اداکاری بھانپ چکا تھا۔ جب مرشد باد میں اس نے مجھے عقل ماؤف کر دینے والا انجکشن لگایا تھا۔ میری خوش قسمتی کہ انجکشن ایکسپائر ہو گیا تھا۔ اسی طرح فاضلی بھی بچ گیا تھا۔ جس طرح اسے یقین تھا کہ میں اداکاری کر رہا ہوں اسی طرح مجھے بھی یقین تھا کہ وہ اداکاری کر رہا ہے۔ پاگل نہ ہوتے ہوئے بھی پاگل ہونے کی اداکاری زیادہ مشکل نہیں ہے۔ کیونکہ اس میں انسان سب کرنے کے لیے آزاد ہوتا ہے لیکن تکلیف نہ ہوتے ہوئے تکلیف میں ہونے کی اداکاری یقیناً مشکل کام ہے۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کر رہا تھا مگر فاضلی منحوس بھانپ گیا تھا۔ اب پتا نہیں میری اداکاری میں خامی تھی یا اس کا ذہن میری طرف سے پہلے ہی مشکوک تھا۔ زیوزشا کی آواز گونجی۔ ”یہ اداکاری نہیں کر رہا ہے۔ اسے سچ مچ شدید اذیت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔“

دشمنی کے باوجود اس حسن ظن پر میں نے دل ہی دل میں زیوزشا کا شکریہ ادا کیا اور اس کے مزید احمق بننے کی دعا مانگی۔ پھر کراہتے ہوئے بولا۔ ”تم نے دیکھ لیا ہے میں نے تکلیف برداشت کر لی ہے۔ زیوزشا اب تم کیا کرو گے مجھے مزید اذیت دو گے مگر میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ اس سے تمہیں کچھ نہیں ملے گا۔“

”تمہیں آزمانے میں کیا حرج ہے؟“

”زیوزشا بہت بڑا حرج ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”تم میرے نزدیک مرشد اور فاضلی جیسے دشمن ہو جاؤ گے اور ان کے بارے میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ موقع ملتے ہی انہیں جہنم رسید کر دوں گا۔“

فاضلی کے تاثرات بگڑ گئے تھے اور اس نے مجھے خوفناک نظروں سے دیکھا تھا مگر منہ سے کچھ نہیں کہا۔ ڈاکٹر میرا معائنہ کر رہا تھا۔ اس نے الیکٹروڈ چپکا دیے تھے اور اب ایک طرف رکھے کمپیوٹر پر کچھ کر رہا تھا۔ تقریباً دس پندرہ منٹ وہ اس کے ساتھ لگا رہا پھر اس نے اعلان کیا۔ ”کسی قسم کی تکلیف یا اندرونی زخم کا نشان نہیں ہے۔ تمام وائٹل سائن نارمل ہیں۔“

میں نے دل میں اسے برا بھلا کہا اور منہ سے بولا۔ ”وائٹل سائن کی اولاد...... میں تکلیف سے مر رہا ہوں۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"تم فراڈ کر رہے ہو۔" فاضلی نے کہا اور میں نے گالیوں کا نیا دائرہ شروع کیا۔ اس پر ڈاکٹر ہنسنے لگا ایسا لگ رہا تھا کہ اسے اردو سمجھ آتی تھی۔ فاضلی نے اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھا اور دھاڑ کر بولا۔

"اپنا منہ بند کرو۔"

اس پر ڈاکٹر کا موڈ خراب ہو گیا اور اس نے فاضلی کے سے لہجے میں کہا۔ "تم یہاں کیوں آئے ہو؟"

"میں ہر جگہ جا سکتا ہوں۔" فاضلی نے دعویٰ کیا۔

ڈاکٹر اس کے پاس آیا اور ذرا جھک کر اس کی ناک سے تقریباً ناک ملا کر بولا۔ "یہ جگہ اس میں شامل نہیں ہے۔ ناؤ گیٹ آؤٹ۔"

فاضلی کا چہرہ بگڑا تھا مگر جب اس نے باسو کی طرف دیکھا تو ٹھنڈا پڑ گیا۔ اس نے زیرِ لب کہا۔ "حرامی دیکھ لوں گا تجھے۔"

فاضلی وہاں سے چلا گیا اور جاتے جاتے ڈاکٹر سے بھی زیرِ لب بہت کچھ سن گیا تھا۔ دونوں ڈیوڈ سنا کے لیے کام کر رہے تھے اور ظاہر ہے وہ اپنا جھگڑا ایک حد سے زیادہ نہیں بڑھا سکتے تھے جہاں ڈیوڈ سنا کو مداخلت کرنی پڑے لیکن مجھے بہت خوشی ہوئی تھی ایک تو فاضلی کی بے عزتی ہوئی تھی جس میں میں نے بھی اپنا حصہ ڈالا تھا دوسرے ڈاکٹر کے رویے نے ثابت کیا تھا کہ ڈیوڈ سنا کے دوسرے آدمی فاضلی سے نفرت کرتے تھے۔ میں اس چیز سے بھی فائدہ اٹھا سکتا تھا۔ فاضلی کے جانے کے بعد ڈاکٹر نے ڈیوڈ سنا سے پوچھا۔ "سر اس کا کیا کرنا ہے..... میرے آلات اس کی تکلیف کی نشان دہی سے قاصر ہیں۔"

"یہ زہر ایسا ہی ہے۔" ڈیوڈ سنا نے کسی قدر فخر سے کہا۔ "میری ایجاد ہے اور اس کا توڑ بھی میں نے ایجاد کیا ہے۔ باسو کو بھیج دو، میں انجکشن بھیجتا ہوں۔"

باسو چلا گیا اور میں نے سکون کا سانس لیا۔ وہ پانچ منٹ بعد آیا اور ڈاکٹر نے چھوٹے سے سلور سلنڈر میں موجود انجکشن نکالا۔ یہ کیس کی مدد سے ٹھنڈا رکھا گیا تھا۔ سلنڈر کھولتے ہی اندر سے بھاپ سی نکلی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے میرے بازو میں انجیکٹ کر دیا۔ اگرچہ میری تکلیف پہلے ہی ٹھیک ہو چکی تھی۔ مگر میں نے خوشی خوشی توڑ لگوا لیا۔ اس کے تجربے سے مجھے معلوم تھا کہ تکلیف کتنی دیر میں کم ہوتی ہے میں نے اسی لحاظ سے رد عمل دیا اور تقریباً دس منٹ میں "نارمل" ہو گیا۔ ڈاکٹر نے ایک بار پھر میرا معائنہ کیا اور ڈیوڈ سنا کو بتایا۔ "جسمانی حالت اور داخلی ساخت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔"

"گڈ، اسے میرے پاس بھیج دو۔" ڈیوڈ سنا نے حکم دیا۔

باسو نے ڈاکٹر کے اشارے پر اسٹریپس کھول کر مجھے آزاد کر دیا۔ میں نیچے اترا اور گویا پہلی بار اپنے ہاتھ پر دھاتی کڑا دیکھ کر چونکا۔ "یہ کیا ہے؟"

"چلو۔" باسو غرایا۔

"شہباز اس کے ساتھ آ جاؤ میں وضاحت کرتا ہوں یہ کیا ہے؟" ڈیوڈ سنا نے کہا۔

"غالباً تم نے مجھے باضابطہ اپنے غلاموں میں شامل کر لیا ہے۔" میں نے طنزاً کہا۔ "یہ کڑا اسی سلسلے میں ہے۔ سنا ہے تمہارے آباؤ اجداد امریکا میں سیاہ فام غلاموں کو ایسی ہی چیز پہناتے تھے۔"

ڈیوڈ سنا نے جواب نہیں دیا اور میں باسو کے ساتھ روانہ ہوا۔ وہ مجھے اسی کمرے میں لایا۔ اس جگہ گھومتے پھرتے کے دوران میں نے محسوس کیا کہ یہ ساؤنڈ پروف تھی۔ سناٹا اتنا مکمل تھا کہ میں اپنی سانس کی آواز بھی سن سکتا تھا۔ یہ کوئی عام جگہ نہیں تھی یقیناً اسے خاص مقاصد کے لیے خاص انداز میں تعمیر کیا گیا تھا۔ ڈیوڈ سنا اسی صوفے پر براجمان تھا اور اس کے ہاتھ میں اسکاچ وہسکی کا گلاس تھا۔ البتہ اس کا تنومند محافظ غائب تھا اس کی جگہ باسو نے لے لی اور میرے عقب میں کھڑا ہو گیا۔ ڈیوڈ سنا نے مجھے سامنے صوفے پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں نے بیٹھتے ہوئے کہا۔ "ڈیوڈ سنا میں تمہارا کھیل پہلے ہی سمجھ گیا تھا مگر اس پر بات کرنے سے پہلے اس کے بارے میں جاننا چاہوں گا۔" میں نے ہاتھ بلند کر کے کڑا دکھایا۔

"تم نے ایک حد تک درست کہا کہ یہ تمہیں قابو میں رکھنے کے لیے ہے۔" ڈیوڈ سنا نے کہا۔ "یہ ملٹی فنکشن ڈیوائس ہے۔ اگر تم میرے پاس آنے کی کوشش کرو گے تو تمہیں شدید قسم کا برقی جھٹکا لگے گا جو تمہارے اعصاب شل کر دے گا۔ کم سے کم آدھا گھنٹہ تم کسی حرکت کے قابل نہیں رہو گے۔"

"ٹھیک ہے یہ اور مزید کیا کام کرتا ہے؟"

"اس میں دو گرام پوٹاشیم سائنائیڈ خالص حالت میں موجود ہے۔" ڈیوڈ سنا نے کہا تو میرے جسم میں خوف کی سرد لہر دوڑ گئی تھی۔ اس خوفناک زہر کی ہلاکت خیزی سے میں اچھی طرح واقف تھا۔ خالص حالت میں زبان پر رکھتے ہی یہ انسان کی جان لے لیتا ہے۔ انسان کو اتنی مہلت بھی نہیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ملتی ہے کہ وہ ایک لفظ ادا کر سکے۔ عجیب بات ہے کہ اس زہر کا ذائقہ آج تک معلوم نہیں ہو سکا۔ امریکا میں سزائے موت کے مجرموں کو یہ زہر سانس کے راستے دیا جاتا ہے یا انجکٹ کیا جاتا ہے دونوں صورتوں میں یہ دس سے تیس سیکنڈ میں آدمی کی جان لے لیتا ہے۔ یہ جان کر میرا خوفزدہ ہونا فطری امر تھا کہ میرے ہاتھ سے منسلک اس کڑے میں یہ زہر موجود تھا۔ میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے پوچھا۔ "یہ زہر کس صورت میں میرے جسم میں داخل ہو جائے گا۔"

زبوز شا نے ہاتھ آگے کیا۔ اس کے ہاتھ میں چاندی جیسے رنگ کا کسی قدر موٹا چھلا تھا۔ "یہ اس کا کنٹرولر ہے۔ اگر تم اس سے ایک گز کی دوری پر آ جاؤ تو تمہیں برقی جھٹکا لگے اور اگر تم اس سے سو گز دور چلے جاؤ تو زہر انجکٹ کرنے والا فنکشن حرکت میں آ جائے گا۔"

میں مسکرایا۔ "میری غلام والی بات درست ثابت ہوئی نا۔ اب دیکھو میں آزاد ہونے کے باوجود تمہارا غلام ہوں۔ تم مجھے آزاد کر دو تب بھی تم سے دور نہیں جا سکتا۔ کسی بھی ارادے سے تمہارے پاس نہیں آ سکتا۔ باقی رہی دے جب میں مکمل طور پر تمہارے قابو میں ہوں تو اس کی کیا ضرورت تھی۔"

"یہ صورت حال عارضی ہے۔" اس نے روکھے لہجے میں کہا۔

"تم نے میرے سوال کا جواب نہیں دیا۔ خیر تم اس کے پابند بھی نہیں ہو۔ اب میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"تم آرام کرو۔ ابھی تمہارے پاس چند گھنٹے ہیں۔"

"چند گھنٹے کس چیز میں؟"

"باسو۔" زبوز شا نے میرے سوال پر دھیان دیے بغیر کہا۔ اس کا اشارہ واضح تھا۔ لیکن اس سے پہلے کہ وہ مجھے پکڑ کر اٹھاتا تو میں خود ہی کھڑا ہو گیا۔ باسو مجھے اسی کمرے میں لے آیا۔ وہاں پہلے سے ایک ٹرے میں دو عدد ابلے ہوئے انڈے، مکھن لگے سلائس، اورنج جوس کا ایک گلاس اور چائے کا کپ تھا اس میں رکھی چائے تا دیر گرم رہتی تھی۔ اس کے ساتھ ایک منرل واٹر کی بوتل تھی۔ یہ شاید میرا ناشتا تھا۔ میں قالین پر بیٹھا اور ناشتے سے استفادہ کرنے لگا۔ میں نے آخری بار دس گھنٹے پہلے سری پائے کا ناشتا کیا تھا۔ لیکن مجھے نلکی سے خوراک دی گئی تھی اس لیے مجھے معمول کی بھوک لگ رہی تھی۔ ناشتا کر کے میں نے چائے کے کپ کی سیل کھولی۔ ایک مشکل مرحلے سے گزرنے کے بعد میں خود کو پرسکون محسوس کر رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ زبوز شا نے رومانہ اور راشد کا مطالبہ فی الحال مجھ سے ترک کر دیا تھا لیکن وہ انہیں میرے ساتھیوں سے حاصل کرنے کی کوشش ضرور کرتا۔

میں سمجھنے سے قاصر تھا کہ رومانہ اور راشد سے فاضلی کو کیا غرض ہو سکتی تھی ورنہ انہیں دنیا سے رخصت کر سکتا تھا مگر وہ اس کے لیے بہت معمولی سا خطرہ تھے اور ان کے لیے اس حد تک جانا کہ مجھ پر تشدد کرنا، یہ سب میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ یقیناً اس کے پیچھے کوئی نہ کوئی چکر تھا۔ اسی طرح مجھے یہ خطرناک کڑا پہنانے کے پیچھے بھی کوئی چکر تھا میں یہ ماننے کے لیے تیار نہیں تھا کہ زبوز شا نے ذاتی تحفظ یا مجھے فرار سے روکنے کے لیے پہنایا تھا۔ پھر اس نے چند گھنٹے کی بات کی تھی۔ اس کا کیا مطلب ہو سکتا تھا؟ جب بہت دیر سوچنے پر کوئی واضح بات ذہن میں نہیں آئی تو میں نے اسے ذہن سے جھٹک دیا اور اپنے ساتھیوں کے بارے میں سوچنے لگا۔ زبوز شا نے مجھے جس طرح سے اغوا کرایا تھا اس کے بعد ان کا محتاط ہونا لازمی تھا مجھے حیرت تھی کہ سفیر اب تک موبائل استعمال کر رہا تھا۔ حالانکہ اسے فوری طور پر موبائل ترک کر دینا چاہیے تھا۔ ہم موبائل کی وجہ سے مارے گئے تھے۔

امید ہے وہ لوگ اس صورت حال میں حفاظتی تدابیر کر رہے ہوں گے کیونکہ میرے بعد ان لوگوں کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ انہوں نے یقیناً وہ تمام جگہیں چھوڑ دی ہوں گی جن کے بارے میں ذرا بھی شبہ ہو کہ دشمن ان سے واقف ہیں۔ مجھے رومانہ اور راشد سے زیادہ اپنے ساتھیوں کی فکر تھی۔ اگر زبوز شا چند گھنٹے حویلی کا پتا چلا لیتے تو وہ وہاں حملہ کر سکتے تھے۔ کھلی جنگ ہوتی تو اس میں دونوں فریقوں کو نقصان ہو سکتا تھا۔ جیسے جیسے میں اس بارے میں سوچ رہا تھا میرا دل مضطرب ہوتا جا رہا تھا۔ مجھے خیال آ رہا تھا کہ میں نے اپنے بچوں کی خاطر اپنے دوستوں کو مشکل میں ڈال دیا تھا۔ مگر یہاں میری ذات فیصلہ کن ہو رہی تھی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ رومانہ میری بدترین دشمن کی بیٹی سہی لیکن میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ اسے ان لوگوں کے حوالے کر دوں جن کے نزدیک عورت صرف ایک جسم ہوتی ہے۔

میں بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اٹھ کر ٹہلنے لگا۔ وقت دھیرے دھیرے گزر رہا تھا۔ بارہ بج گئے تھے اور مجھے یہاں سوتے ہوئے دو گھنٹے سے اوپر وقت ہو گیا تھا۔ اب مجھے واش روم جانے کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی اس لیے میں نے دروازہ بجایا اور اس وقت تک بجاتا رہا جب تک

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

باہر سے باسو کی غراہٹ نہیں سنائی دی۔ ''کیا ہے؟''

''مجھے واش روم جانا ہے۔''

جواب میں خاموشی چھا گئی اور جب ایک منٹ گزرنے پر بھی کچھ نہیں ہوا تو میں نے دوبارہ دروازہ بجانے کے لیے ہاتھ بلند کیا مگر اسی لمحے دروازہ کھل گیا میں پیچھے ہٹا تھا۔ سامنے باسو کھڑا ہوا تھا اس نے ہٹ کر مجھے راستہ دیا۔ میں باہر آیا تو اس نے اشارے سے ایک طرف چلنے کو کہا۔ دوسری راہداری میں اس بار مخالف سمت میں مڑ کر ہم واش روم اور باتھ تک پہنچے۔ وہاں ایک ہی بڑے کمرے میں کئی ٹوائلٹس تھے جیسے کہ عوامی مقامات پر ہوتے ہیں۔ مگر یہ عوامی بہت الخلا کے مقابلے میں نہایت چمکتے دمکتے اور صاف تھے۔ ان میں حفظان صحت کی جدید ترین سہولتیں مع واش بیسن کلینرز اور گرم ہوا کے موجود تھیں۔ میں صاف ستھرا ہی تھا مگر ٹوائلٹ سے فارغ ہو کر میں نے منہ ہاتھ دھو لیا۔ اس دوران میں باسو واش روم کے دروازے پر کسی ناقابل شکست چٹان کی طرح ایستادہ رہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ زیوز شاید اسے لایا ہی میرے لیے تھا۔ میں نے ڈرائیر کے نیچے ہاتھ خشک کرتے ہوئے باسو سے کہا۔

''تم پیدائشی طور پر ایسے ہو؟''

جواب میں وہ بدستور مجھے پلک جھپکائے بغیر گھورتا رہا۔ میں نے شانے اچکائے۔ ''مرضی تمہاری اگر تم جواب نہیں دینا چاہتے۔''

''بس چلو۔''

میرا خیال تھا کہ وہ مجھے کمرے کی طرف لے جائے گا مگر اس نے راہداری میں سیدھا چلنے کا اشارہ کیا۔ پھر ایک دروازے کے آگے رکا اور بولا۔ ''اندر جاؤ۔''

''اندر کون ہے؟''

''جاؤ۔'' وہ غرایا۔ میں نے ہینڈل گھمایا اور اندر داخل ہوا تو اندر سے آراستہ پیراستہ کمرے میں فاضلی خاصے جشن و عشرت کے عالم میں نظر آیا۔ اس کے ایک ہاتھ میں جام تھا تو دوسرے میں ساقی۔ لڑکی خاصی خوب صورت اور شستہ حلیے میں تھی اس نے بہت مہین کپڑے کا جسمانی ناپ جیسا ڈھیلا لباس پہنا ہوا تھا جو جسم کے تمام قاتل خطوط کی نمائش کا فریضہ بخوبی انجام دے رہا تھا۔ میں نے غور کیا یہ وہی لڑکی تھی جو اس رات فراری میں فاضلی کے ساتھ تھی جب ہم اسے اغوا کر کے لے گئے تھے۔ میں نے اسے بھی بے ہوشی والی دوا کا نشانہ بنایا تھا۔ میری توجہ سے فاضلی غلط سمجھا اور اس نے مسکرا کر کہا۔

''لگتا ہے تمہیں پسند آگئی ہے۔''

''مجھے سونٹ چیزوں میں سب سے پسند اجل ہے۔'' میں نے مسکرا کر کہا۔ ''دشمنوں کے لیے۔''

یہ کہہ کر میں اس کی طرف بڑھا تھا کہ اس نے جلدی سے ہاتھ بلند کیا۔ ''آں..... آں۔''

میں ٹھٹک گیا اس کے ہاتھ میں وہی رنگ تھا جو زیوز نے دکھایا تھا۔ میں رکا تو فاضلی مسکرانے لگا۔ ''تم سمجھ گئے ہو گے اب تمہاری ڈور میرے ہاتھ میں ہے۔''

''بہت سے لوگ یہی سمجھتے ہوئے اس دنیا سے رخصت ہوئے۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا اور اس سے پوچھے بغیر اس کے سامنے دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ میں نے لڑکی کو قطعی نظر انداز کر دیا تھا اور اس نے اس بات کا خاصا برا منایا تھا۔ وہ کینہ توز نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔ فاضلی نے استہزائیہ انداز میں لڑکی کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیا تم نے یہی دکھانے کے لیے بلایا ہے۔ تمہاری اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس قسم کی عورت نما مخلوق میں بہت دیکھ چکا ہوں۔ میرے نزدیک ان کی اہمیت کسی دیہات کی دیوار پر چپکے گوبر کے اپلے سے بھی کم ہے۔''

لڑکی ایک جھٹکے سے اٹھی تھی اس نے برہمی سے کہا۔ ''یہ شخص مسلسل میری انسلٹ کر رہا ہے اور تم سن رہے ہو۔''

میں ہنسا۔ ''تمہارا کیا خیال ہے فاضلی جیسے لوگ تمہیں عزت کا مستحق سمجھ کر اپنے پہلو میں جگہ دیتے ہیں اور باقی رکی رہے جو چیز تم اس سے چاہ رہی ہو وہ تو خود اس کے پاس.....''

اس سے آگے میرے حلق سے جو آواز نکلی تھی وہ قطعی بے معنی تھی کیونکہ فاضلی نے اچانک ہی انگوٹھی والا ہاتھ آگے کیا اور مجھے سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ جھٹکا اتنا شدید تھا کہ میرے ہوش ہی گم ہو گئے۔ گہرا اندھیرا نظروں کے سامنے گھومنے لگا تھا اور ایک عجیب سی کھرچتی سی آواز میرے کانوں میں آ رہی تھی۔ یہ چیختی آواز جیسے میرے دماغ میں سوراخ کر رہی تھی۔ اس سے پہلے مجھے کئی بار کرنٹ کھانے کا اتفاق ہوا تھا جب دشمنوں نے بجلی کو ٹارچر کے لیے استعمال کیا۔ کسی کپڑے کی طرح بے ضرر ہو جانے والے اکرم چشتی نے تو اس معاملے میں حد کر دی تھی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ میں کرنٹ کھانے کے معاملے میں ناتجربے کار نہیں ہوں۔ لیکن یہ تجربہ بالکل نیا اور انوکھا تھا۔ جسم میں ایسی عجیب سی سنسنی دوڑ گئی تھی جیسے بنا کسی وجہ کے نارمل اٹھے اور زہر کھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی نہ سکے۔ دماغ سوچنے سے معذور ہو گیا تھا۔ اسے ماؤف ہونے والی کیفیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ سننے اور دیکھنے کی حس کام کر رہی تھی مگر بہت ہی نرالے انداز میں۔ میرے ساتھ جو ہوا تھا اس کی وضاحت مشکل ہے۔

نہ جانے کتنی دیر یہ کیفیت رہی پھر کمرے نے گھومنا بند کر دیا اور آواز نے سمع خراشی بھی بند کر دی۔ بالآخر میری نظر نرگس ہوئی تو لڑکی دوبارہ فاضلی کی بغل میں بیٹھی ہنس رہی تھی۔ یہ اس کی ہنسی تھی جو عجیب انداز میں سمع خراشی کر رہی تھی۔ غالباً وہ میری کیفیت سے مسلسل محظوظ ہوتی رہی تھی۔ میں نارمل ہوا اور میں نے غیر محسوس انداز میں گھڑی کی طرف دیکھا تو چند منٹ گزرے تھے۔ گویا میں زیبو شا کے اندازے سے نصف وقت میں نارمل ہو گیا تھا اس نے کہا تھا اس ہوائی صدمے کا شکار دس منٹ سے پہلے کسی قابل نہیں ہوتا۔ لیکن میں اسی طرح بے سدھ انداز میں بیٹھا رہا۔ فاضلی غور سے مجھے دیکھ رہا تھا۔ میری آنکھیں قابو میں آنے سے اسے اندازہ ہو گیا کہ میں اب بہتر ہو رہا ہوں۔ ”شہباز کیا محسوس کر رہے ہو؟“

”تم سے نفرت۔“ میں نے نحیف سی آواز میں کہا۔ ”پہلے سے کئی گنا زیادہ۔“

”میں تمہارے دلی تاثرات کی بات نہیں کر رہا ہوں۔“ اس نے کسی قدر جھنجلا کر کہا۔ ”میری بلا سے تم جو چاہے سوچتے رہو جسمانی طور پر کیسا محسوس کر رہے ہو۔“

”کاش کہ میرے ہاتھوں میں جان ہوتی تو میں اس انگوٹھی کی پروا کیے بغیر تمہاری گردن مروڑنے کی کوشش کرتا۔“

”کوشش کر کے دیکھ لو۔“ اس نے مذاق اڑانے والے انداز میں کہا۔ میں جواب میں خاموش رہا۔ کچھ دیر بعد میں کوشش کر کے یوں ذرا سیدھا ہوا جیسے میرے لیے یہ کام بھی مشکل ہو۔ فاضلی نے شک سے کہا۔ ”کیا تم سچ مچ ابھی تک شاک میں ہو۔“

”ہاں میرا جسم پوری طرح قابو میں نہیں ہے۔“ میں نے جواب دیا۔ دس منٹ سے زیادہ وقت گزر چکا تھا اور میری کوشش تھی کہ پورا آدھا گھنٹہ کر کے ہی ٹھیک ہوں۔ دس منٹ بھی کسی نہ کسی طرح گزار لیے۔ ”اب میں ٹھیک ہوں اور اگر تم یہ انگوٹھی اتار دو تو زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ میں تم اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہو گے۔“

یک دم فاضلی سنجیدہ ہو گیا اور اس نے سیدھے ہوتے لڑکی سے کہا۔ ”ہنی لیو اس الون۔“

ہنی چہرا مسکرائی، ہیرا کر اٹھی اور بل کھاتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد فاضلی نے اپنے خالی ہونے والے گلاس کو دوبارہ بھرا اور میرے سامنے آ بیٹھا۔ ”مجھے تم سے کام ہے؟“

”کیا کام ہے؟“ میں نے براہ راست انکار کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

”آج رات میری زندگی کی سب سے اہم مہم درپیش ہے۔“

میں سوالیہ نظروں سے اسے دیکھ رہا جب وہ خاموش رہا تو میں نے پوچھ لیا۔ ”کیا تم نے اس سے شادی کا فیصلہ کر لیا جو ابھی تمہارے پہلو میں بیٹھی تھی؟“

فاضلی نے یوں منہ بنایا جیسے وہ خود کوئی بہت پاکباز اور شریف آدمی ہو جو کسی طوائف سے شادی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ ”کیا وہ تمہارے دماغ میں گھس گئی ہے۔“

”نہیں یہ خیال تو ابھی آیا ہے کہ تم دونوں کا بہت پرفیکٹ میچ ہو گا۔ تم دونوں ہی حیا اور شرم کے نام سے بھی ناواقف ہو۔“

”شہباز سنجیدہ ہو جاؤ۔“ اس نے بدمزگی سے کہا۔ ”اس مہم میں تمہیں بھی اہم کردار ادا کرنا ہو گا۔“

”سوری میں اس کا قائل ہوں کہ آدمی اپنی سہاگ رات خود منائے۔ میری طرف سے معذرت ہے ویسے تم زیبو شا کو کیوں شامل نہیں کر لیتے۔“

اس بار میں ہوشیار تھا۔ جیسے ہی فاضلی نے ہاتھ آگے کیا میں نے اپنا کرنٹ والا ہاتھ پیچھے کیا اور آگے آ کے فاضلی کے سینے پر لات ماری۔ میں نے جان بوجھ کر زیادہ قوت استعمال نہیں کی تھی اس کے باوجود فاضلی صوفے سمیت الٹ کر پیچھے گرا میں اسے لات مار کر واپس اپنی جگہ بیٹھ گیا اور سکون سے بولا۔ ”اگر تمہیں میری بات اچھی نہیں لگی تو زبان سے جواب دو۔ امید ہے تم اب سمجھداری سے کام لو گے۔“

فاضلی اٹھا تو اس کا چہرہ بگڑ کر سور جیسا ہو گیا تھا۔ اس نے اپنی بیلٹ سے پسٹول نکال کر میری طرف کیا۔ میں ایک ٹک اسے دیکھ رہا تھا۔ اس کا اشتعال دیکھتے ہوئے ایک لمحے کو مجھے لگا کہ وہ گولی چلا دے گا۔ مگر پھر اس کے جوش پر ہوش غالب آ گیا۔ اگر اس کے اختیار میں ہوتا تو وہ اسی وقت مجھے شوٹ کر دیتا مگر زیبو شا نے مجھے ایسے ہی اس کے حوالے نہیں کیا تھا۔ اسے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ مجھے کوئی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔ اس نے گہری سانسیں لیتے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئے پستول واپس رکھا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”پھر کبھی۔“
میں نے سر ہلایا۔ ”تمہاری مجبوری سمجھ رہا ہوں۔“

اس نے صوفہ سیدھا کیا اور اس پر بیٹھ گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ مجھ سے جتنا الجھے گا اسے اتنی ہی ذلت کا سامنا کرنا پڑے گا اس لیے وہ فوری مطلب کی بات پر آ گیا۔ ”آج رات ہم دوبارہ مرشد پر حملہ کریں گے اور یہ مرشد کی آخری رات بھی ہوگی۔“

میں پہلے ہی توقع کر رہا تھا کہ اس کی اہم مہم کا تعلق مرشد سے ہوگا لیکن یہ تازہ خبر تھی کہ آج مرشد کی زندگی کی آخری رات ہوگی۔ ”ڈیوڈ شا نے بتایا تھا کہ اسے پولیس نے گرفتار کر لیا ہے؟“

”ہاں لیکن اعلیٰ حکام کی مداخلت پر اسے ضمانت پر رہا کر دیا گیا ہے۔“ فاضلی نے جواب دیا۔ ”یہ ایک گھنٹے پہلے کی بات ہے۔“

میں نے سوال کیا۔ ”تمہارا خیال ہے یہ مہم اتنی آسان ہوگی۔ ہو سکتا ہے مرشد کے بجائے یہ تمہاری زندگی کی آخری رات ہو؟“

”ہو سکتا ہے۔“ اس نے بے پروائی سے کہا۔ ”لیکن میرا پلان مکمل ہے۔ مرشد کے بیشتر وفادار میرے ساتھ شامل ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی حفاظت کے لیے ان ہی پر انحصار کرتا ہے۔“

یہ اطلاع بھی نئی تھی کہ فاضلی مرشد کے بیشتر وفاداروں کو خرید چکا تھا۔ اتنا تو مجھے بھی معلوم تھا کہ درگاہ پر تباہ ہونے والے اسلحہ خانے کی تباہی میں فاضلی کے وفاداروں کا ہاتھ تھا اور ہم کے جاسوسوں نے ہی اس کا پتا چلایا تھا۔ ان کی دی ہوئی معلومات کی بنیاد پر ہم نہ صرف فاضلی تک رسائی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے تھے بلکہ ہمیں ڈیوڈ شا اور فاضلی کے گٹھ جوڑ کا بھی پتا چلا تھا۔ اب مجھے پتا چلا کہ ڈیوڈ شا مرشد کے آدمیوں کے مرنے پر اتنا دکھی کیوں تھا کیونکہ وہ وفاداریاں بدل کر اس کے اور فاضلی کے ساتھ مل چکے تھے۔ میں نے سوچتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارے پلان میں میرا کردار کس خوشی میں ہے؟“

”کیونکہ مرشد تمہارا دشمن بھی ہے۔“

”اگر وہ میرا دشمن ہے تو اس سے نمٹنے کا فیصلہ میرا ہوگا میں کسی دوسرے کو بندوق چلانے کے لیے اپنا کندھا پیش نہیں کر سکتا۔“

”تم راضی خوشی کچھ نہیں کرو گے۔ لیکن مجبوراً کرو گے۔“

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ہم سفر کی ابتدائی جھلکیں
نومبر 2014ء کے شمارے کی دلچسپ تحریریں

جزوی گمشدگی ● کسی شخص کا پراسرار ماجرا... وہ اپنی ذات، ماحول ہر شے کو فراموش کر بیٹھا تھا۔ ایچ اقبال کے قلم سے ہنگامہ خیز داستان

آوارہ گرد ● مشرقی ساتھیوں کی ایک نرالی اور انوکھی دنیا کی جھلک... ڈاکٹر عبدالرب بھٹی کا شاہکار

جواری ● احمد اقبال کے تجربہ کار قلم سے ایک جواری کے کھیل کے نئے انداز

مغرب کے نرالے انداز ● مغربی دنیا کی ہنگامہ خیز ماحول کی عکاسی... اقبال مرزا کی شاہکار

سرورق کی کہانیاں

پہلی کہانی ● روبینہ رشید کی ایک

دوسری کہانی ● کاشف زبیر کے قلم کا شاہکار

آپ کے ہنر... شوق... تجربات... اور نئی دلچسپ باتیں... کہانیاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

''میں کس لیے مجبور ہوں گا؟'' میں نے پوچھا۔ ''اس کرنے کی وجہ ہے؟''

''نہیں اس کی ایک وجہ اور بھی ہے۔'' فاضلی کا لہجہ معنی خیز ہو گیا۔ ''تمہیں یقیناً بھگوال میں موجود اپنے ساتھیوں کی زندگی کا خیال ہو گا۔''

مجھے جھٹکا لگا تھا۔ ان لوگوں نے بھگوال کی حویلی کا سراغ بھی لگا لیا تھا۔ میں نے بے یقینی سے کہا۔ ''تم جھوٹ بول رہے ہو بلف کر رہے ہو کیونکہ میرے موبائل کا سراغ اسی علاقے سے لگا تھا۔''

''چلو تم دل خوش کر لو مگر ان تصویروں کے بارے میں کیا کہو گے؟'' فاضلی نے اپنے ساتھ رکھا ٹیب لی سی اٹھایا اور اس پر چند بار انگلیاں چلا کر اسے میری طرف بڑھا دیا۔ ''لو دیکھو۔''

پہلی تصویر ہی حویلی کے سامنے والے حصے کی تھی۔ پھر حویلی کی تصویر پھر زوم کر کے لی گئی کسی بلند جگہ سے حویلی کے اندر کی تصاویر تھیں اور کئی تصویروں میں وسیم کے آدمی بھی نظر آ رہے تھے۔ اب میرے لیے فاضلی کو جھٹلانا ممکن نہیں رہا تھا۔ میں نے نیپ کھینچ کر ایک دیوار پر دے مارا اور سرد لہجے میں پوچھا۔ ''تو تم میرے ساتھیوں کے نام پر مجھے بلیک میل کرو گے؟''

''اس میں حرج کیا ہے۔'' فاضلی مسکرایا۔ ''افسوس کہ تم نے آخری تصویر تک نہیں دیکھا۔ آخری تصویر میں تمہیں ایک فکس میزائل نظر آتا جو ایک قریبی پہاڑ پر نصب ہے اور صرف ایک بٹن دبانے سے یہ حویلی کے اندر گھس کر پھٹے گا اور ایک ہی میزائل پوری حویلی کو ملبے کا ڈھیر بنانے کے لیے کافی ہو گا۔ تم سوچ سکتے ہو کہ حویلی میں موجود افراد پر کیا گزرے گی؟''

مجھے لگا کہ فاضلی نے مجھے چاروں طرف سے جکڑ لیا تھا۔ یہ تصور ہی اذیت ناک تھا کہ میرے ساتھی میری وجہ سے یوں بے خبری میں نشانہ بنیں کہ ان کو آنے والی موت کا پتا بھی نہ چلے اور وہ مدافعت نہ کر سکیں۔ اگرچہ میں نے میزائل کی تصویر نہیں دیکھی تھی مگر میں فاضلی کی اس بات کو بلف قرار نہیں دے سکتا تھا۔ فاضلی ایسے ہتھیاروں کا ماہر تھا اس سے پہلے اسی نے پہاڑی پر خودکار بھاری مشین گن نصب کر کے اس حویلی کا پھر کو نشانہ بنایا تھا جس میں منیر، سونا، ساری اور دوسرے لوگ میانوالی جا رہے تھے۔ یہ گن ہمارے پاس موجود تھی۔ وسیم نے بھی ایسی ہی ایک جدید کمپیوٹر سے کنٹرول ہونے والی گن

حاصل کی تھی جس کی مدد سے انہوں نے ہمیں بہ حفاظت انڈیا کی سرحد سے پاکستان آنے میں مدد دی تھی۔ فاضلی نے کچھ دیر بعد کہا۔

''شہباز کیا کہتے ہو؟''

''تم نے کہنے کو کچھ چھوڑا ہے؟'' میرا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ وہ مسکرانے لگا۔ ''اس کا مطلب ہے تم راضی ہو۔''

''مجھے کیا کرنا ہو گا؟'' میں نے مناسب سمجھا کہ جلد از جلد اس کا پلان سمجھ لوں، کم سے کم اپنے بارے میں۔

''تم ایک دستے کو لیڈ کرو گے کیونکہ تم بہت اچھے لیڈر ہو۔'' فاضلی بولا۔ ''تمہارا حصہ اس مشن کی کامیابی میں بنیادی کردار ادا کرے گا۔ اس لیے تمہیں لازمی کامیاب ہونا ہے۔''

''لازمی سے کیا مراد ہے؟''

''اگر تم ناکام رہے تو اس کا خمیازہ تمہارے ساتھیوں کو بھگتنا پڑے گا۔''

میں نے بے یقینی سے کہا۔ ''تم ایسا نہیں کر سکتے کیونکہ جنگ میں ناکامی بھی ہو سکتی ہے۔''

''شہباز میں تمہیں جانتا ہوں۔'' فاضلی نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔ ''تم بہت شارپ ہو، بہت لکی ہو اور بہت پُرعزم ہو۔ کامیابی کے لیے ان تینوں چیزوں کو استعمال کرو۔''

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ''میں پوری کوشش کروں گا لیکن کامیابی یا ناکامی مقدر سے ہوتی ہے۔''

''شہباز بحث مت کرو، میں نے تمہیں بتا دیا ہے اگر ہم درگاہ کو فتح کرنے میں ناکام رہے اور مرشد ہمارے ہاتھ نہیں آیا تو میزائل چلانے والا بٹن دبا دیا جائے۔ یوں سمجھ لو تمہارے ساتھیوں کی زندگی اور موت تمہارے ہاتھ میں ہے۔''

''نعوذ باللہ۔'' میں کانپ اٹھا تھا۔ ''ہر انسان کی موت و زندگی سے لے کر معمولی سے معمولی بات بھی صرف ایک ہستی کے ہاتھ میں ہے۔''

''وعظ نہیں۔'' فاضلی نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''یہ سب میرا نام نہاد باپ مجھے بہت کہتا تھا۔ ایک دن میں نے اس کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔''

اب وہ اپنے اصل باپ کا منہ ہمیشہ کے لیے بند کرنا چاہتا تھا۔ مرشد سے نیکی کے وعظ کی توقع ایسے ہی تھی جیسے شیطان سے کی جا سکے۔ اگر فاضلی اس کا تربیت یافتہ تھا تو اس میں کوئی تعجب نہیں تھا کہ وہ اس سے بڑھ کر شیطان ثابت ہو رہا تھا۔ مرشد آج تک مجھے کسی کام پر مجبور نہیں کر سکا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نوبیل انعام حاصل کرنے والوں میں جواں سال

عمر	نام	شعبہ	تاریخ پیدائش
17 سال	ملالہ یوسف زئی	امن 2014	12 جولائی 1997
25 سال	لارنس برگ	طبیعات 1915	31 مارچ 1890
31 سال	وارنر ہیسنبرگ	طبیعات 1932	5 دسمبر 1901
31 سال	شانگ داؤلی	طبیعات 1957	24 نومبر 1926
31 سال	کیرل ڈی اینڈرسن	طبیعات 1936	3 ستمبر 1905
31 سال	پال اے ایم ڈائرک	طبیعات 1933	8 اگست 1902
32 سال	فیڈرک جی بانٹنگ	علم الادویات 1923	14 نومبر 1891
32 سال	توکل کرمان	امن 2011	7 فروری 1979
32 سال	روڈلف موسبر	طبیعات 1961	31 جنوری 1929
32 سال	میریڈ کوریگن	امن 1976	27 جنوری 1944
33 سال	جوشالیڈربرگ	علم الادویات 1958	23 مئی 1925

اور نہ ہی کبھی اپنی مرشد پر چل سکا تھا مگر فاضلی نے یہ کام کر دکھایا۔ انکار یا مزاحمت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بیٹو کے بعد میں نے سوچ لیا تھا کہ اس جنگ میں میری اور کسی ساتھی کی جان نہیں جانی چاہیے۔ کم سے کم میری پوری کوشش یہی ہوتی۔ ''اوکے میں پوری کوشش کروں گا مگر مجھے معلوم ہونا چاہیے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ اس کے لیے مجھے کتنے افراد اور اسلحہ فراہم کیا جائے گا۔''

''گڈ یہ کی تم نے عقل کی بات۔'' فاضلی خوش ہو گیا۔ ''میرے ساتھ آؤ۔''

وہ مجھے ساتھ والے کمرے میں لایا جہاں ایک بڑی اسکرین والا ٹی وی نصب تھا۔ لیکن درحقیقت وہ کمپیوٹر مانیٹر تھا۔ فاضلی نے کہا۔ ''آن۔''

اسکرین آن ہو گئی اور اس پر آپریٹنگ سسٹم کی کمانڈز آنے لگیں۔ فاضلی نے ٹچ اسکرین پر تیزی سے ہاتھ چلائے اور چند لمحے بعد اسکرین پر ایک نقشہ ابھرا۔ میں نے ذرا غور کیا اور شناخت کر لیا۔ ''میرا خیال ہے یہ درگاہ مرشد ہے؟''

''بالکل درست پہچانا تم نے۔'' فاضلی نے کہا اور نقشے کو حرکت دی۔ وہ ٹو ڈی سے تھری ڈی میں بدل گیا۔ اب درگاہ کا سامنے والا حصہ آ گیا۔ اس نے نقشے کو آگے بڑھایا اور گویا ہم مین گیٹ سے اندر چلے گئے۔ ''یہ ہم اندر آ گئے۔ اب سامنے ساع ہال ہے۔ یہ قبا ساع ہال ہے جو درگاہ کی اصل عمارت کے سامنے بنا ہے۔'' فاضلی بات کرنے کے ساتھ ساتھ ہاتھوں کو حرکت دے رہا تھا اور اس کے ساتھ ہی نقشہ بدل رہا تھا۔ نئے ساع ہال کے پیچھے درگاہ کی عمارت تک آئے جس میں مرشد کے دادا اور باپ کی قبریں تھیں۔ مرکزی گنبد تلے دونوں قبریں آنے والے زائرین کے لیے صرف مخصوص دنوں میں کھولی جاتی تھیں ورنہ لوگ صرف باہری جالیوں سے زیارت کر کے چلے جاتے تھے۔ اس گنبد کے دائیں بائیں درگاہ کی عمارت تھی۔ اس میں تین فلورز پر بے شمار کمرے تھے۔ درگاہ کے اصل دھندے ان ہی کمروں میں ہوتے تھے۔ یہاں خاص مہمانوں کو ٹھہرایا جاتا تھا اور ان کی خاطر مدارت کے لیے غیر ملکی شراب سے لے کر غیر ملکی لڑکیوں تک سب دستیاب ہوتا تھا۔ لڑکیاں اس بازار اور مرید گھرانوں سے آتی تھیں۔ ان کی آمد و رفت نہایت خفیہ انداز میں ایسے راستوں سے ہوتی تھی جن سے عام لوگ بے خبر تھے۔ یہ سب کچھ مجھے فاضلی بتا رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ایسی جگہوں پر یکجا سب ہوتا ہے۔" میں نے کہا۔ "مرشد جیسے شیطانوں کو کوئی فرق نہیں پڑتا کہ وہ کہاں بیٹھے ہیں۔ یہ بتاؤ کہ مجھے کیا کرنا ہے؟"

"وہی بتا رہا ہوں۔" فاضلی نے کہا اور ہاتھوں کی جنبش سے نقشے کو آگے بڑھایا۔ "دائیں طرف جاؤ تو مرشد کی کوٹھی اور ملازموں کی رہائش ہے اور سیدھے جاؤ تو آخری حصے میں پرانے سماع ہال کی عمارت ہے۔"

"جو دھماکوں میں تباہ ہو گئی تھی۔"

"مکمل نہیں جزوی طور پر۔" فاضلی نے انکشاف کیا۔ "مرشد کے آدمیوں نے چند دنوں میں اس کی پھر سے مرمت کر کے قابل استعمال بنا لیا۔"

"لیکن میں نے تو سنا تھا کہ وہاں سے غیر ملکی ساخت کا اسلحہ اور گولہ بارود ملا تھا۔ اتنی جلدی حکومت نے وہ جگہ مرشد کے حوالے بھی کر دی؟"

فاضلی مسکرایا۔ "کیا تم مرشد کے اثر و رسوخ سے ناواقف ہو۔ یہی نہیں چند دنوں میں اسے اس معاملے سے بری الذمہ قرار دے دیا جائے گا اور طالبان افراد پر ڈالا جائے گا جو اس دھماکے میں مارے گئے۔"

"یہ تمہارے آدمیوں کا کام تھا؟"

اس نے سر ہلایا۔ "ہاں مگر وہ مکمل طور پر ٹھیک سے نہیں کر سکے تھے۔ ان کی ناتجربے کاری آڑے آئی۔ یہی وجہ ہے کہ میں چاہتا ہوں کہ اب تمہارے جیسا تجربے کار شخص میرے آدمیوں کو لیڈ کرے۔"

"تجربے میں تم بھی کم نہیں ہو۔"

"میں اس وقت تک اور رہوں گا جب تم فرمت کرو میں تم سے زیادہ دور نہیں رہوں گا۔ مجھے سوئز والی حد معلوم ہے۔"

بظاہر ایسا لگ رہا تھا کہ فاضلی مجھے قربانی کے بکرے کی طرح آگے کر کے اپنا کام نکلوانا چاہتا تھا۔ میں کامیاب ہوتا یا ناکام دونوں صورتوں میں وہ خسارے میں نہیں رہتا۔ اس نے نقشہ پرانے سماع ہال کے عقب میں لا کر روک دیا۔ "یہ چھوٹی سی عمارت رکھی ہے جو بظاہر کباڑ خانہ ہے۔ لیکن حقیقت میں پہاڑوں سے نکالی جانے والی ایک بہت بڑی سرنگ آ کر اس عمارت میں نکلتی ہے۔ سرنگ اتنی بڑی ہے کہ اس میں آرام سے ایک درمیانہ ٹرک سفر کر سکتا ہے۔ دھماکوں کے بعد بظاہر سرنگ بند کر دی گئی تھی مگر اب میری اطلاع کے مطابق اسے دوبارہ کھولا جا رہا ہے۔"

"کھولا جا رہا ہے؟" میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ "ابھی کھولا نہیں گیا ہے۔"

"سمجھ لو یہ کام آخری مراحل میں ہے۔" فاضلی نے کہا۔ "ہمیں اسی سرنگ کے راستے اندر جانا ہے۔"

"فاضلی میرا ایک سوال ہے جب تم اکثر آدمیوں کو خرید چکے ہو تو تمہیں یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے تم ان سے بغاوت کرا لو۔"

فاضلی نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ مشکوک ہو گئے ہیں اور مرشد نے انہیں پرانے سماع ہال میں قید کیا ہوا ہے میرے زرخرید کچھ ہی لوگ آزاد ہیں مگر وہ اپنے طور پر کوئی کارروائی نہیں کر سکتے کیونکہ ان سے اسلحہ لے لیا گیا ہے۔ مرشد نے اپنے انتہائی وفادار مریدوں کو اسلحہ دیا ہوا ہے جو تربیت یافتہ تو نہیں ہیں مگر وہ مرشد کے حکم پر اپنی جان قربان کرنا سعادت سمجھتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے۔ آگے چلو۔"

"ہم اس سرنگ کو مرشد کے آدمیوں سے صاف کرتے ہوئے پرانے سماع ہال تک رسائی حاصل کریں گے اور پھر وہاں قید لوگوں کو آزاد کرائیں گے انہیں اسلحہ دیا جائے گا اور آخری مرحلے میں ہم مرشد کی کوٹھی پر دھاوا بولیں گے۔"

"میرا خیال ہے سب سے زیادہ حفاظت اسی جگہ کی کی جا رہی ہوگی۔"

"بالکل مگر میں نے بتایا ہے کہ جن لوگوں کے پاس اسلحہ ہے وہ اناڑی ہیں۔"

"میدان جنگ میں بعض اوقات تجربے سے زیادہ جذبہ کام آتا ہے۔"

"ایک بار میرے وفادار آزاد ہو گئے تو ان سب کو دیکھ لیں گے۔"

فاضلی سے پلان پر بات کرتے ہوئے میرا ذہن کچھ اور باتوں پر غور کر رہا تھا۔ "ٹھیک ہے ہم اندر گھس جاتے ہیں اور تمہارے ساتھیوں کو آزاد کرا لیا جاتا ہے مگر اس دوران میں مرشد کو اتنی مہلت یقیناً مل جائے گی کہ وہ پولیس یا باہر موجود اپنے حمایتوں کو طلب کر سکے۔"

"حملے کے آغاز میں سب سے پہلے علاقے میں موجود تین موبائل ٹاورز اڑا دیے جائیں گے۔ تمام ٹیلی فون لائنیں کاٹ دی جائیں گی اور درگاہ کے باہر ایک طاقتور جامر اس وقت تک علاقے کی تمام رینج کی نشریات کو جام رکھے گا جب تک ہم مرشد کو قابو نہیں کر لیتے۔"

"ٹھیک ہے تم یہ سب کر لو گے مگر ہنگامہ آرائی کی جو آوازیں باہر تک جائیں گی اور آس پاس مرشد کے وفادار ہیں کیا وہ دوڑے نہیں آئیں گے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

''نہیں پہلا مرحلہ بہت خاموشی سے طے کرنا ہے۔ البتہ جب مرشد کی کوٹھی پر حملہ کریں گے تب شور ہوگا مگر اس سے پہلے کہ باہر سے کوئی مدد آئے ہم مرشد کو قابو کرلیں گے اور اسے قابو کرنے ہی درگاہ کے تمام معاملات میرے ہاتھ میں آجائیں گے۔'' فاضلی نے مٹھی بند کرکے سب اپنی مٹھی میں کرنے کا اشارہ کیا۔

''درگاہ میں رات کے وقت کتنے لوگ ہوتے ہیں؟''

''آج کل تو سب کا داخلہ بند ہے سالانہ مرمت کے نام پر۔ اس لیے صرف بہت خاص لوگ ہی اندر موجود ہوتے ہیں۔ ان کی تعداد سو کے آس پاس سمجھو۔ ان میں سے ستر کے قریب ملازمین ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جن کی آنکھیں سب دیکھتی ہیں مگر یہ راز اپنے سینے سے آگے جانے نہیں دیتے۔ اس طرح جو سنتے ہیں وہ بھی ان کے لبوں پر نہیں آتا۔ میں راز دار محرم راز ہیں جو مرشد کے کرتوتوں میں برابر کے شریک ہوتے ہیں۔''

''کچھ عرصے پہلے تک تم ان میں سرفہرست تھے۔''

''میں اسلم کا بیٹا ہوں اس کا ملازم نہیں ہوں۔'' فاضلی نے تلخی سے کہا۔ ''لیکن کچھ عرصے سے اس نے مجھے ایسا ہی سمجھنا شروع کردیا تھا۔''

''لڑنے مرنے والے ان ستر کے علاوہ ہیں؟''

''ہتھیاروں کا استعمال تو سب جانتے ہیں مگر یہ لڑنے والے لوگ نہیں ہیں۔ یوں سمجھ لو یہ درگاہ کی انتظامیہ ہیں سارا کام یہی لوگ چلاتے ہیں۔ لڑنے مرنے والے ان کے علاوہ ہیں میری معلومات کے مطابق اس وقت ان کی تعداد ساٹھ سے ستر ہے۔''

میں تشویش زدہ ہوگیا۔ ''یہ تو خاصی تعداد ہے۔''

''اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ آسانی سے مارے جائیں گے۔''

فاضلی جیسے انسان دوسرے انسانوں کی جان کو بے وقعت سمجھتے ہیں۔ مگر میرے نزدیک ہر انسانی جان کی اہمیت تھی۔ البتہ میں اس کا اظہار کرتا تو فاضلی کی سمجھ میں نہیں آتا۔ ''میرا مطلب ہے کہ ناتجربے کار افراد بھی اگر اتنی بڑی تعداد میں ہوں تو ان سے لڑنا آسان نہیں ہوتا ہے۔ یقیناً تمہیں بھی نقصان برداشت کرنا پڑے گا۔''

''ظاہری بات ہے۔'' فاضلی نے سرسری انداز میں کہا۔ ''جنگ میں دونوں طرف کا نقصان ہوتا ہے۔ میرے آدمی اس کے لیے تیار ہوکر جائیں گے۔''

میں نے گہری سانس لی۔ ''تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہوں گے اور ان میں سے مجھے کتنے ملیں گے؟''

''میرے پاس زیادہ آدمی نہیں ہیں یوں سمجھ لو کہ کل ڈیڑھ درجن ہوں گے ان میں سے چھ تم کو ملیں گے۔''

''باقی بارہ افراد؟''

''کچھ باہر کے کام نمٹائیں گے جیسے موبائل ٹاور کی تباہی، کمیونیکیشن لائنز کاٹنا اور پھر جیمر لگانا۔ ان میں سے کچھ میرے ساتھ ہوں گے۔''

''اندر کتنے وفادار قید ہیں؟''

''ان کی تعداد ایک درجن سے زیادہ ہے لیکن قید گارڈز کی تعداد دو درجن ہے۔ اب تک میرے وفادار ان میں سے جن کو ساتھ ملا چکے ہوں گے ان کو چھوڑ باقیوں کو وہیں قید رکھنا ہوگا۔''

''اگر اندر سے بھی ایک درجن افراد مل جاتے ہیں تب بھی تمہارے پاس ڈھائی درجن یعنی تیس سے زیادہ افراد نہیں ہوں گے۔ جب کہ مقابلہ ڈھائی گنا فورس سے ہوگا۔ اگر مرشد کا خاص فورس بھی مسلح ہوکر آگیا تو یہ تعداد تین گنا ہوجائے گی۔''

''مرشد کی کوٹھی پر تیس افراد ہوں گے اور باقی درگاہ میں مختلف جگہ ہوں گے۔ ہمیں ان کو ایک جگہ جمع ہونے سے روکنا ہوگا۔ ان سے الگ الگ نمٹنا آسان ہوگا۔''

''وہ کیسے؟ پہلی گولی چلتے ہی سب جان جائیں گے۔''

''ہمارے ہتھیار بے آواز ہوں گے اور حتی الامکان خاموشی سے کام کرنا ہوگا۔ مجھے امید ہے ہم پہلے مرحلے میں ہی پچیس افراد کا خاتمہ کردیں گے اور پھر باقیوں پر قابو پانا اتنا مشکل نہیں ہوگا۔''

''تمہارا منصوبہ بہت سے مفروضات پر مشتمل ہے؟'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ اب تم ڈبو ڈشا کے ساتھ ہو اس لیے تمہیں یقیناً علم ہوگیا ہوگا کہ ایسا ہی ایک پلان سرحد پار تیار کیا گیا تھا اور اس میں حصہ لینے والے بین الاقوامی قسم کے کرائے کے نہایت تربیت یافتہ فوجی تھے۔ اس میں جدید ترین ہتھیار اور آلات استعمال ہوئے تھے۔ نہایت خطرناک جنگی اسلحہ تھا۔ جن میں اینٹی ٹینک گن میزائل تک تھے۔ میں بل وبان سے اس پلان میں شامل تھا کیونکہ مجھے کنور بیلی سے ساوری کو چھڑانا تھا۔ پلان کی ہر حرکت نوک پلک درست کی گئی تھی۔ اس مشن کا سربراہ ایک برٹش کرنل تھا جو دو جنگیں لڑنے کا تجربہ رکھتا تھا۔ ہمیں کنور بیلی کی ایک ایک چیز کا علم تھا۔ اس کے باوجود جب اس پلان پر عمل کا وقت آیا تو سب الٹ گیا۔ جو جو ہم نے سوچا اور چاہا تھا وہ نہیں ہوا۔ بلکہ کچھ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور ہی ہوا۔ وہاں جانے والا کوئی فرد زندہ نہیں بچا۔"

"سوائے تمہارے اور گرگل کے۔" فاضلی نے سر ہلایا۔ "مگر تم جس مقصد کے لیے گئے تھے اس میں کامیاب رہے اور یہی اصل چیز ہے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ کتنے لوگ مرے اور کتنے باقی بچے۔"

"میرے کہنے کا مطلب ہے کہ ہو سکتا ہے اس بار کہانی سرے سے الٹ جائے اور مرنے والوں میں مرشد کی بجائے تمہارا نام شامل ہو۔"

"ہو سکتا ہے۔" فاضلی کا لہجہ سرد ہو گیا۔ "وعظ کی طرح مجھے نصیحتیں بھی پسند نہیں ہیں۔ اس لیے اب کام کی بات کی جائے۔" اس نے کہا اور ہاتھ سے نقشہ گھمایا۔ اسکرین زرا سی دیر میں درگاہ سے باہر نکل آئی اور اب ان کا نشانہ پہاڑی حصہ تھا۔ یہاں پہاڑ تھے جن کے اوپر سے سڑک گزر رہی تھی۔ وہیں ایک جگہ سے سرنگ درگاہ کے اندر تک آتی تھی۔ سرنگ ایک غار سے شروع ہوتی تھی۔ مگر اس غار کا دہانہ خفیہ تھا۔ جب دھماکے کے بعد اسلحہ پکڑا گیا تو یہ سرنگ بھی دریافت ہو گئی تھی اور مرشد نے اسے بند کروا دیا تھا مگر صرف لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے، جیسے ہی معاملہ ٹھنڈا ہوا اس نے سرنگ کو از سرِ نو بنوانا شروع کر دیا۔ "سرنگ کا آخری حصہ باقی رہ گیا ہے اور شاید وہ بھی آج رات تک کھل جائے۔"

"اگر یہ نہ کھلی تو؟"

"تب ہم اسے ڈائنامائٹ کر دیں گے۔"

"دھماکے کی آواز دوسری طرف نہیں جائے گی؟"

"جائے گی مگر مرشد کے آدمی بھی ڈائنامائٹ استعمال کر رہے ہیں۔ اس لیے کوئی نہیں چونکے گا۔"

"ڈائنامائٹ کا استعمال قانونی ہے؟"

میرے سوال پر فاضلی مسکرایا تو میں جھینپ گیا۔ سوال ہی احمقانہ تھا۔ مرشد اور فاضلی جیسے لوگ بھولے سے بھی کوئی قانونی کام کر سکتے تھے۔ یہ ان کی سرشت میں ہی نہیں تھا۔ فاضلی کا منصوبہ اچھا تھا مگر اس کی اصلیت عمل کے وقت سامنے آتی۔ اس میں بہت سے مفروضات تھے۔ اگر مگر تھے اور ان سے کوئی ایک بھی توقع کے مطابق نہیں ہوتا تو منصوبہ ناکام ہو سکتا تھا۔ فاضلی کا منصوبہ کامیاب ہوتا یا ناکام، میری بلا سے۔ اور اس کا باپ مرشد دوزخ میں جائے مگر فاضلی نے میرے ساتھیوں کو گن پوائنٹ پر رکھ لیا تھا۔ اگرچہ اس کے پس پشت اس کی فطری خباثت بھی کارفرما تھی مگر اس طرح اس نے اپنے منصوبے کی انشورنس

مجھ سے کروائی تھی اور میں نے کانی کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس صورت حال سے مجھے ایک ہی فرد نکال سکتا تھا اور وہ وڈیوڈ شا تھا۔ میں فاضلی کے سامنے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔

"ہمیں کب روانہ ہونا ہے؟"

"سورج ڈوبتے ہی۔" فاضلی نے کہا۔ "لیکن یہ کارروائی نصف رات کے بعد شروع ہو گی۔"

میرے حساب سے نصف رات کا وقت بہت نامناسب ہوتا ہے۔ خاص طور سے جب کسی خاص سیکیورٹی والی جگہ حملہ کیا جائے۔ اس وقت سیکیورٹی سب سے الرٹ ہوتی ہے۔ یہی سیکیورٹی سورج غروب ہونے کے فوراً بعد اور صبح کے قریب ذہنی طور پر پرسکون حالت میں ہوتی ہے کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت خطرہ نہیں ہے۔ عام طور سے ان ہی اوقات میں سیکیورٹی بدلی جاتی ہے۔ جانے والے اپنی ڈیوٹی ختم ہونے کا انتظار کر رہے ہوتے ہیں اور آنے والے اتنے چوکس نہیں ہوتے۔ مگر یہ فاضلی کا پلان تھا اور اسے فیصلہ کرنا تھا۔ مجھے خیال آیا۔ "تم نے روبانہ اور راشد کا مطالبہ کیوں کیا؟"

فاضلی چونکا مگر پھر اس نے جلدی سے خود پر قابو پا کر کہا۔ "مرشد سے مجھے کچھ حساب برابر کرنے ہیں۔"

"تو تم مرشد سے کرو، روبانہ اور راشد سے کیا تعلق بنتا ہے؟"

"کیونکہ وہ مرشد کی بیٹی اور بھتیجا ہے۔"

"اس طرح تو تم بھی بھتیجے ہوئے۔" میں نے اسے یاد دلایا تو اس کا منہ بن گیا۔

"فضول باتیں مت کرو بہرحال ان کا معاملہ بعد میں دیکھا جائے گا۔ تم ساری عمر تو انہیں چھپا کر نہیں رکھ سکتے۔"

"تمہاری باتوں سے لگ رہا ہے تمہارے پلان خاصے لمبے چوڑے ہیں۔" میں نے معنی خیز انداز میں کہا۔ "تم مکمل طور پر مرشد کی جگہ لینے کی تیاری کر رہے ہو۔"

"ہاں اس گدی کا حق دار میں ہوں۔" اس نے غرور سے کہا۔ "مرشد سمیت کوئی بھی شخص ذہانت اور لڑنے مرنے میں میرا مقابلہ نہیں کر سکتا ہے۔"

میں مسکرا رہا تھا۔ چار بج گئے تھے فاضلی نے مجھے آرام کرنے کو کہا۔ "تمہارے پاس تین گھنٹے ہیں آرام کر لو۔"

"میں کام کے وقت آرام کا قائل نہیں ہوں۔" میں نے کہا۔

فاضلی نے دروازہ کھول کر یاسو کو آواز دی۔ وہ اندر آیا اور مجھے لے کر روانہ ہوا۔ میں نے راستے میں اس سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تو میں نے کہا۔ ”مجھے زیوزنا سے بات کرنی ہے۔“

”وہ نہیں ہے۔“ باسو نے کہا۔

”تم اسے میرا پیغام دے سکتے ہو یہ بہت ضروری ہے۔ اگر اسے پیغام نہ ملا تو اسے بہت بڑا نقصان ہو سکتا ہے۔“

جواب میں اس نے مجھے کمرے میں دھکیل دیا اور دروازہ بند کر دیا۔ میں ٹھنڈی سانس لے کر بستر پر دراز ہو گیا۔ میں نے اس اُمید پر باسو سے بات کی تھی کہ زیوزنا سن رہا ہو گا مگر ایک گھنٹا گزرنے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ وہ یہاں نہیں ہے ورنہ مجھے ضرور طلب کر لیتا۔ شاید وہ مجھے ناضلی کے حوالے کر کے چلا گیا تھا۔ چند منٹ بعد دروازہ کھلا تو میں سیدھا ہو گیا اور فوراً ہی مرجھا گیا کیونکہ باسو نے ایک ٹرے اندر رکھ کر دروازہ بند کر دیا۔ اس میں لنچ تھا یا شاید ڈنر تھا۔ میں نے اس سے استفادہ کیا۔ روانگی سے پہلے یہ آخری طعام بھی ہو سکتا تھا۔ اب زیادہ وقت بھی نہیں رہا تھا۔ جیسے جیسے گھڑی کی سوئی سات کی طرف بڑھ رہی تھی میری رگوں میں خون کی گردش بھی تیز ہو رہی تھی۔ خود کو وارم اپ کرنے کے لیے میں نے ٹہلنا شروع کر دیا تھا۔ اچانک مجھے خیال آیا کہ جب مجھے اس حملے میں لیڈ کر رہا تھا تو یقیناً مجھے میری مرضی کا اسلحہ بھی فراہم کیا جاتا اور کیا ناضلی اتنی آسانی سے مجھے مسلح کرنے کو تیار ہو جاتا جب کہ وہ جانتا تھا کہ اب میں اس کے خون کا پیاسا ہو گیا تھا۔

جیسے جیسے میں اس پر غور کر رہا تھا ناضلی کی میرے ساتھیوں کو یرغمال بنانے کی حکمتِ عملی کا جواز سمجھ میں آ رہا تھا۔ انہیں گن پوائنٹ پر ناضلی نے اپنی حفاظت کے لیے رکھا تھا کہ میں اسے نقصان پہنچانے کا خیال ذہن میں نہ لاؤں۔ اس خیال سے مجھے ذرا تقویت ہوئی تھی کہ ناضلی ایسی حماقت نہیں کرے گا کہ اپنے پلان کی ناکامی کی سزا میرے ساتھیوں کو دے۔ میں ٹہلتا اور سوچتا رہا حتیٰ کہ وقت ہو گیا اور دروازہ کھلا اور باسو کی صورت نظر آئی تو میں اس کے ساتھ کمرے سے نکل آیا۔ ناضلی اپنے کمرے میں موجود تھا۔ میں نے جاتے ہی اس سے مطالبہ کیا۔ ”میری زیوزنا سے ملاقات کراؤ۔“

”وہ یہاں نہیں ہے۔“

”جہاں بھی ہے تم سرہانگی یا فون پر بات کرو سکتے ہو۔“

”فی الحال یہ بھی ممکن نہیں ہے۔“ ناضلی نے چالاکی سے کہا۔ ”ہاں واپسی پر تمہاری بات ہو سکے گی۔“

”اگر واپسی ہوئی تو۔“ میں نے تلخ لہجے میں کہا۔

”تم پریشان مت ہو۔“ اس نے گویا مجھے تسلی دی۔

”چلنے کی تیاری کرو سب سے پہلے کپڑے بدلنا ہوں گے۔“ ناضلی مجھے برابر والے کمرے میں لایا جہاں میز پر مکمل لباس اور ایک عدد بلٹ پروف جیکٹ رکھی تھی۔ میں نے یہ وردی نما سیاہ لباس پہنا جو رات کی تاریکی میں بہتر پردہ پوشی کرتا۔ اس کے اوپر بلٹ پروف پہنا۔ لباس کے ساتھ جوتے بھی تھے اور سب میرے ناپ کا تھا۔ ناضلی خود بھی اسی قسم کے لباس میں تھا اور اس نے بھی بلٹ پروف پہن رکھا تھا۔ ہم باسو کے ساتھ اسی عمارت کے ایک حصے میں واقع گیراج میں آئے وہاں ایک وین کھڑی تھی۔ میں اور باسو اس کے عقبی حصے میں آئے۔ یہ مکمل طور پر بند تھی۔ ناضلی نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی۔ کچھ دیر بعد وین اسٹارٹ ہوئی اور روانہ ہو گئی۔ بند خانے میں حبس تھا مگر جیسے ہی وین وسٹارٹ ہوئی اے سی نے کام شروع کر دیا۔ یہاں فرشی نشست تھی میں ایک طرف دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔

سامنے باسو بیٹھا تھا۔ اس نے گھٹنوں تک بیہودہ سے اوپر مختصر سے بنیان پہن رکھی تھی اور اس لباس میں اس کا جسم بہت نمایاں تھا۔ اس سے بات کرنا بیکار تھا کیونکہ وہ تو وی پوائنٹ کرتا تھا اور کسی سوال کا جواب نہیں دیتا تھا۔ وہ خاموشی سے مجھے گھور رہا تھا مگر اس وقت اس کی آنکھوں میں عداوت نہیں تھی۔ اس کے تاثرات عام طور سے حیوانی ہوتے تھے۔ جب کہ نارمل حالات میں وہ بنا تاثر کے سپاٹ چہرہ رکھتا تھا۔ میری طرح وہ بھی خالی ہاتھ تھا مگر اسے ہتھیار کی ضرورت نہیں تھی اس کا جسم بذاتِ خود مہلک ہتھیار تھا۔ اپنی جناتی قوت اور بیلچے نما ہاتھوں سے وہ منٹوں میں کسی مضبوط ترین شخص کو بھی توڑ مروڑ کر رکھ سکتا تھا۔ اگر وہ اس مہم میں شامل تھا تو وہ اکیلا ہی چار کے برابر تھا۔ میں اندازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ ہم کہاں سے روانہ ہوئے تھے اور سڑک یاد کرنے کی کوشش کی مگر ناضلی نے اتنی جلدی جلدی سڑک کاٹنے کہ میں بھول گیا۔

پھر وین اندر سے ساؤنڈ پروف تھی۔ باہر کی کوئی آواز اندر نہیں آ رہی تھی جب کہ باہر ٹریفک کی موجودگی لازمی تھی۔ ایک زمانہ تھا کہ اسلام آباد بہت خاموش شہر تھا۔ مرکزی شاہراہوں پر بھی اکا دکا گاڑیاں چلتی نظر آتی تھیں۔ مگر چند دہائیوں میں ٹریفک کا یہ عالم ہو گیا کہ اب عام سڑکوں پر بھی گاڑیوں کا اژدہام ہونے لگا تھا۔ رش کے اوقات میں ٹریفک جام بھی ہو جاتا تھا۔ یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ اتنی دیر مسلسل باہر خاموشی رہتی۔ یقیناً اسے خاموش رکھنے کا خاص انتظام کیا گیا تھا۔ وین پونا گھنٹے بعد رکی اور عقبی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دروازہ کھلا تو باہر تاریکی چھا چکی تھی۔ آج آسمان پر بادل تھے اور حبس بتا رہا تھا کہ بارش کا امکان ہے۔ کئی دن کی گرمی کے بعد آج بادل آئے تھے۔ فاضلی نے دروازہ کھولا تھا۔

"نیچے آجاؤ۔"

پہلے باسو اترا اور پھر میں نیچے آیا۔ ہم ایک سڑک کے کنارے ٹیلے میں موجود تھے۔ یہ ایک چھوٹی سی پہاڑی تھی۔ بلکہ اسے ٹیلا کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ اس کے اوپر گھنی جھاڑیاں تھیں۔ کچھ دیر بعد ان جھاڑیوں سے ایک سایا نکل کر ہمارے پاس آیا۔ یہ ایک مسلح شخص تھا اور اس نے فاضلی سے کہا۔ "تیاری مکمل ہے۔"

"دوسری طرف کی کیا پوزیشن ہے؟"

"ہم نے ڈرل کرکے گیس چھوڑ دی ہے۔" آدمی نے کہا۔ "اندر موجود ہر فرد بے ہوش ہو گیا ہوگا۔"

"گڈ۔" فاضلی نے کہا اور اس آدمی کے ہمراہ ٹیلے کے اوپر چلا گیا۔ میں اور باسو وہیں رہے تھے۔ ٹیلا یہاں سے سو فٹ سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن فاضلی اگر ٹیلے کے دوسری طرف جاتا تو میرے اور اس کے درمیان فاصلہ سو گز سے بڑھ سکتا تھا اور یہ فاصلہ میرے لیے پیغام اجل لاتا۔ میں کسی قدر مضطرب ہو گیا اور ٹیلے کی طرف بڑھا۔ باسو نے عقب سے تنبیہ کی۔

"آگے مت جاؤ۔"

"میں اوپر نہیں جا رہا۔" میں نے جواب دیا۔

باسو نے ایسے ہی کہا تھا کیونکہ اسے پروا نہیں تھی۔ وہ جانتا تھا کہ میں بھاگ نہیں سکتا تھا۔ اس نے وین کا دروازہ کھولا اور اسے ایک جی ہوشیل کر مزید کچھ سامان لے آیا۔ یہ سڑک خاصی خستہ حال تھی۔ اب تک اس پر مزید کسی گاڑی کے آثار نظر نہیں آئے تھے اور نہ ہی کوئی پیدل فرد گزرا تھا۔ آخر پانچ گز رس منٹ ہونے تھے اور فاضلی کو گئے ہوئے بھی منٹ ہونے کو آئے تھے۔ اس کی واپسی آدھے گھنٹے بعد ہوئی تھی۔ وہ تاریکی میں نمودار ہوا اور اس نے وین کا معائنہ کیا۔ مطمئن ہو کر اس نے ہم دونوں سے ساتھ چلنے کو کہا۔ ہم ٹیلے کے اوپری حصے تک آئے اور یہاں سے فوراً ہی تقریباً ایک کلومیٹر دور درگاہ کی روشنیاں نظر آئیں۔ درمیان میں خاصی ناہموار زمین تھی۔ بائیں طرف سڑک سے تقریباً سو فٹ دور ایک ٹیلے کے ساتھ غار نما ساتھ تھا اور اس کے آس پاس ہلکی سی روشنی تھی۔ اسی وجہ سے وہ نظر آرہا تھا۔ غالباً یہی خفیہ راستے کا دروازہ تھا۔

غار کے آس پاس تقریباً ڈیڑھ درجن مسلح افراد موجود تھے اور یہ سب مقامی تھے۔ لیکن ان میں ڈیوڈ شا کا کوئی ساتھی شامل نہیں تھا سوائے باسو کے۔ اس نے فاضلی کو اپنے آدمی دینا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ اس کے باوجود وہ پوری طرح اس کی مدد اور حمایت کر رہا تھا۔ حد یہ کہ اس نے مجھے فاضلی کے حوالے کر دیا تھا یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ میرے خون کا پیاسا تھا اور موقع ملتے ہی مجھے مارنے سے گریز نہیں کرے گا۔ اس کے بعد ڈیوڈ شا فاضلی کا جو چاہے کچھ بھی کر لیتا وہ مجھے زندہ نہیں کر سکتا تھا۔ مجھے نہیں اس نے میری کلائی میں کڑا پہنا کر ایک طرح سے فاضلی کو اختیار دے دیا تھا کہ وہ غلطی سے بھی مجھے مار سکتا تھا اور بعد میں کوئی ایسی وضاحت بھی پیش کر سکتا تھا جسے جھٹلانا ڈیوڈ شا کے لیے بہت مشکل ہوتا۔ ڈیوڈ شا کا یہ رویہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ فاضلی نے چند افراد کو اشارے سے بلایا اور وہ آئے تو اس نے میرا تعارف کرایا اور بولا۔

"اب تم لوگ شہباز کے ماتحت ہو گے۔ اس کے ہر حکم کی تعمیل کرو گے۔"

"جو حکم جناب عالی۔" ایک لمبے بالوں والا ملنگ نما شخص بولا۔ اس کی آنکھوں سے لگ رہا تھا کہ وہ کوئی سستا نشہ بکثرت استعمال کرتا تھا۔ یہ سب عام جرائم پیشہ تھے ان کا واحد وصف مرنا مارنا تھا اور یہ کام وہ پیسے کے لیے کرتے تھے۔ میں نے ان سے سوال کیے۔ ان سب کو خود کار ہتھیار

جبار رضی اللہ عنہ بن صخر

(30ھ/650ء)

صحابی۔ ابو عبداللہ کنیت، قبیلہ خزرج کے خاندان مسلمہ سے تھے۔ بیعت عقبہ ثانیہ کے وقت مشرف بااسلام ہوئے۔ غزوہ بدر اور اس کے بعد کے تمام غزوات میں شریک رہے۔ آپ حساب میں بہت زیادہ مہارت رکھتے تھے۔ اسی وجہ سے محاسب اور خازن کا عہدہ آپ کے سپرد کیا گیا۔ فتح خیبر کے بعد عبداللہ بن رواحہ کی جگہ آپ ہی کو خازن مقرر کیا گیا۔ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں آپ اسی عہدے پر فائز رہے آپ سے چند احادیث مروی ہیں۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں 62 سال کی عمر میں وفات پائی۔

مرسلہ: اشعر ممتاز۔ بہاولپور

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

استعمال کرنے آتے تھے اور نشانہ بھی ان کے دعوے کے مطابق اچھا تھا۔ خاص بات یہ تھی کہ خود کار رد انقلاب پر سائلنسر لگے ہوئے تھے۔ یہ چیک ساختہ جوزی گن تھیں۔ سب مشین گنوں میں ان کا شمار بہترین ہتھیاروں میں ہوتا ہے۔ میں نے ان کا امتحان لیا اور نشانہ لگوا کر دیکھا۔ جلد پتا چل گیا کہ سنگل شاٹ میں صرف... دو ہی بہتر نشانے باز تھے۔ باقی سب صرف برسٹ مارنے کے ماہر تھے جس میں نشانے بازی کی خاص ضرورت نہیں پڑتی ہے۔ ان کے پاس پستول بھی تھے مگر یہ مناسب نہیں تھے اور ان کا استعمال اسی وقت کرنا تھا جب رائفل کا ایمونیشن ختم ہو جائے اور دستی جنگ چھڑے۔ ان سے فارغ ہونے پر فاضلی مجھے ایک طرف لے گیا۔

"تمہیں اپنے دستے کے ساتھ آگے رہنا ہوگا۔"

"اور تم کہاں ہوگے؟"

"ٹھیک تمہارے پیچھے، میں تم سے سوگز سے زیادہ دور نہیں جاؤں گا۔"

"سوگز کی حد ختم ہو سکتی ہے۔"

"تم فکر مت کرو، یہ ڈیجیٹل آلہ ہے اس کا پروگرام ری سیٹ کیا جا سکتا ہے اور اب حد بڑھا کر پانچ سوگز کر دی ہے۔ یعنی تم اور میں درگاہ کی حدود میں کہیں بھی ایک دوسرے سے خطرناک فاصلے پر نہیں ہوں گے۔"

"تمہیں یقین ہے کہ یہ حد بڑھ چکی ہے؟"

"سو فیصد۔" اس نے یقین سے کہا۔ "اس میں غلطی کا کوئی امکان نہیں ہے۔"

میرے پاس سوائے اس کی بات پر یقین کرنے کے اور کوئی راستہ نہیں تھا۔ اس لیے میں نے بات آگے بڑھائی۔ "ٹھیک ہے میں آگے ہوں گا۔"

"تم راستہ کلیئر کرتے ہوئے پرانے سماع ہال کی عمارت تک رسائی حاصل کرو گے اور وہاں موجود میرے وفاداروں کو آزاد کراؤ گے۔"

"ٹھیک ہے یہ کام ہو گیا پھر؟"

"پھر تم درگاہ کی مرکزی عمارت کی طرف بڑھو گے۔ اس میں داخل ہونے کے دو ہی راستے ہیں ایک آگے سے ایک پیچھے سے۔ رات نو بجے کے بعد یہ دونوں دروازے بند کر دیے جاتے ہیں۔ ان دنوں تو یہ مستقل بند ہوں گے۔ تمہیں وہاں مرشد کے خاص گرگوں کا سامنا کرنا ہے۔"

"میں کسی کو بلا مقصد قتل نہیں کر سکتا۔" میں نے انکار کیا۔

"تم مت کرنا یہ کام میرے آدمی کریں گے۔" اس نے اصرار نہیں کیا۔

"تم کیا کرو گے؟"

"میں اپنے آدمیوں سمیت کوٹھی کا محاصرہ کروں گا تاکہ وہاں سے کوئی مدد کے لیے باہر نہ آ سکے۔ جب تم لوگ اپنا کام مکمل کر لو گے تو میری طرف آؤ گے اور پھر ہم کوٹھی پر حملہ کریں گے۔"

"یہ بھی ممکن ہے کہ حملہ ہونے کے بعد جب مرشد کسی سے رابطہ نہیں کر پائے گا تو فرار کی کوشش کرے۔"

"فرار کے تمام راستوں پر میرے آدمی ہوں گے۔"

"مرشد نے یقیناً کوئی خفیہ راستہ رکھا ہوگا۔"

"وہ خفیہ راستہ بھی میری نظر میں ہے کارروائی کے آغاز میں ہی اس کا بیرونی حصہ تباہ کر دیا جائے گا اور پھر کوئی اس راستے سے فرار نہیں ہو سکے گا۔"

فاضلی نے ہر پہلو پر نظر رکھی تھی۔ مجھے افرادی قوت کی کمی کھٹک رہی تھی۔ یہ لوگ نہ صرف تعداد میں کم تھے بلکہ ان میں باہمی ہم آہنگی بھی کم تھی کیونکہ یہ ساتھی نہیں تھے۔ اس قسم کے حملوں میں ذہنی ہم آہنگی کی بہت اہمیت ہوتی ہے۔ اگر حملہ کرنے والے منظم اور ایک دوسرے سے اچھی طرح واقف ہوں اور انہیں پتا ہو کہ کس صورت حال میں کیا ردعمل رہنا ہے تو تھوڑے افراد سے بھی کام چل جاتا ہے۔ وہ غیر منظم انداز میں بکھر کر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے انداز میں بے پروائی نمایاں تھی۔ میں نے ان کی طرف اشارہ کیا۔ "تمہارا کیا خیال ہے یہ لوگ اس طرح سے عمل کریں گے جیسے ان سے کہا جائے گا۔"

"اندر گھستے ہی انہیں زندگی اور موت کی کشمکش سے واسطہ پڑے گا اور انسان سب سے بہترین تدبیر اپنی جان بچانے کے لیے کرتا ہے۔"

"مسئلہ جان بچانے کا نہیں ہوگا وہ فرار سے بھی بچ سکتی ہے مسئلہ کامیابی کا ہے۔ اگر انہوں نے ٹھیک سے کام نہیں کیا تو کامیابی مشکوک ہو جائے گی۔"

"شہباز اسی لیے میں نے تمہیں ان کا لیڈر بنایا ہے۔ اگر تم انہیں ہینڈل کر لو گے تو ان سے بہتر کام لے سکتے ہو۔ یہ سب لڑنے مرنے والے لوگ ہیں کوئی گھبرائے گا نہیں۔"

"تمہارے آدمی نے بتایا تھا کہ انہوں نے اندر گیس چھوڑنی ہے۔ تو کیا اندر والوں کو پتا نہیں چلا ہوگا؟"

"سرنگ صاف کرنے والے شفٹوں میں کام کر رہے ہیں اور اس شفٹ کو بارہ بجے جانا تھا اس سے پہلے کوئی یہاں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں آئے گا اور آنے کی کوشش کرے گا تو مجھے فوراً پتا چل جائے گا۔"

فاضلی کا مطلب تھا کہ اندر موجود اس کے افراد دقا فوقتاً نظر رکھے ہوئے تھے اور کسی قسم کی صورت حال میں وہ فوری اسے اطلاع دیتے۔ میں نے بجلی کے بارے میں پوچھا۔ "کیا اسے منقطع نہیں کیا جائے گا؟"

"جب تک پراپرٹی ساتھ بال اور درگاہ کلیئر نہیں ہو جاتی لائٹ آن رہے گی اس کے بعد میرے آدمی باہر سے لائن کاٹ دیں گے۔"

"پہلے کیوں نہیں؟"

"ایک تو ان لوگوں کو اندھیرے میں کارروائی کی عادت نہیں ہے یہ گھبرا جائیں گے۔ دوسرے جنریٹر درگاہ کے پاس ہی ہے لائٹ جانے ہی وہ اسٹارٹ ہو جائے گا۔ جب تم درگاہ کلیئر کر لو گے تو جنریٹر اڑا دو گے اور اس کے بعد باہر کی لائٹ بھی کاٹ دی جائے گی۔"

"اس صورت میں اندھیرا ہونے پر یہ نہیں گھبرائیں گے؟"

"نہیں یہ بیک اپ میں ہوں گے ہم نائٹ ویژن استعمال کر کے مرشد کے آدمیوں کو باآسانی شکار کر لیں گے اس کے بعد باہر سے لائٹ بحال کر دی جائے گی۔"

ساڑھے نو بج گئے تھے۔ میں نے گھڑی دیکھی۔ "اندر کب داخل ہونا ہے؟"

"ساڑھے گیارہ بجے۔"

"ابھی اس میں دو گھنٹے ہیں۔"

"آرام کرو۔ کھاؤ پیو۔" اس نے اپنے آدمیوں کی طرف اشارہ کیا۔ وہ کھانے کے ہلکے پھلکے سامان سے استفادہ کر رہے تھے ان کے پاس منرل واٹر کی بوتلیں اور جوس کے ڈبے بھی تھے۔ آسمان پر ہلکی ہلکی بجلی چمکنے لگی تھی۔ اگر بارش ہو جاتی تو یہ زیادہ اچھا تھا کیونکہ مرشد کے آدمی بارش سے بچنے کے لیے اپنی جگہوں پر محدود ہو جاتے۔ میں ایک طرف پتھر سے ٹک گیا۔ غار کا دہانہ اس قسم کا تھا کہ فاصلے سے یہ نظر نہیں آتا تھا۔ قریب آنے پر بھی یہ مٹی کے کٹاؤ جیسا لگتا تھا۔ اس قسم کے کٹاؤ سارے پوٹھوہار ریجن میں عام ملتے ہیں کیونکہ کثرت سے بارش مٹی بہا لے جاتی ہے۔ بالکل سامنے آنے پر پتا چلتا تھا کہ یہ غار ہے۔ میں نے ذرا دور بیٹھے فاضلی سے پوچھا۔ "اس طرف سے غار کی حفاظت کا کیا بندوبست تھا؟"

"اندر ایک فولادی دروازہ فٹ ہوا تھا اور گارڈز ہوتے تھے۔ باہر ایک ملنگ رہتا تھا جو درحقیقت یہاں کا چوکیدار تھا۔"

میں حیران تھا کہ ہمارے قانون نافذ کرنے والے اداروں نے مرشد کو کیسے بری الذمہ قرار دے دیا اور سارا الزام ان مرحوم ملازمین پر رکھ دیا گیا جو حملے میں مارے گئے تھے۔ اس ملک میں اثر و رسوخ اور مفادات اتنی بڑی بلا بن گئے ہیں کہ آدمی سنگین ترین جرم کر کے بھی تمام شواہد اور گواہیوں کے باوجود یوں بچ نکلتا ہے۔ میں سوچ رہا تھا کہ پہلے چند سوئی بوندیں گریں اور اس کے بعد اچانک ہی تیز بوچھاڑ آئی۔ بارش سرد اور خوشگوار تھا۔ حبس آلود گرمی کے بعد یہ اچھا لگ رہا تھا اس لیے میں نے اٹھ کر بھاگنے کی کوشش نہیں کی۔ ورنہ اکثر تو پڑ ہوا کر غار میں چلے گئے تھے۔ بارش میں بھیگنا مجھے بچپن سے پسند ہے۔ جب بارش ہوتی تو میں ماں جی کی نظر بچا کر باہر نکل جاتا تھا۔ ماں جی جانے نہیں دیتی تھیں کیونکہ بارش کے وقت ہمارے علاقے میں سانپ نکلتے ہیں۔ شاید ان کے بلوں میں پانی بھر جاتا ہے اور وہ باہر آنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ سانپوں کے ڈسنے کے سب سے زیادہ واقعات بھی بارش کے موسم میں ہوتے ہیں۔ مجھے سانپ سے ڈر لگتا تھا مگر بارش میں بھیگنے کا لطف اس خوف کو دبا دیتا تھا۔ اس وقت بھی ہنگامی صورت حال کے باوجود میں بارش سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ فاضلی مجھ سے کچھ دور بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے بلند آواز سے کہا۔

"شہباز تم مجھے ہمیشہ حیران کرتے ہو۔"

"کیسے؟"

"تم بالکل بھی پریشان نہیں ہو۔"

"اس کے برعکس میں بہت پریشان ہوں۔"

"تب تمہارے ظاہر سے کیوں پتا نہیں چل رہا۔"

"جب میں کسی مسئلے کا حل نہیں نکال پاتا تو اسے اوپر والے کے سپرد کر دیتا ہوں۔ اس کے بعد میری پریشانی صرف نتیجے کی رہ جاتی ہے۔ ویسے آج تک نتیجہ میرے حق میں نکلا ہے۔"

"لیکن اس بار ایسا نہیں ہوگا۔"

"مجھے معلوم ہے ہر بار ایسا نہیں ہوتا ہے۔ دنیا کا کوئی شخص مکمل کامیابی حاصل نہیں کر سکتا اسی طرح کوئی شخص مکمل ناکام بھی نہیں ہوتا ہے۔ سب کو کچھ نہ کچھ ملتا ہے۔"

"لگتا ہے تم تقدیر پر بھروسا کرتے ہو؟"

"میں تقدیر پر ایمان رکھتا ہوں۔" میں نے تصحیح کی۔ "ہر گزرتے دن میرا ایمان پختہ ہوتا جا رہا ہے کہ کاتب

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تقدیر نے میرے لیے جو لکھا ہے، وہی سب سے بہتر ہے۔"

"میرے بارے میں کیا خیال ہے؟"

"تم خود پر بھی یقین نہیں رکھتے۔"

"غلط مجھے خود پر ہی یقین ہے۔"

"یقین ہونا ہی بے یقینی کی نشانی ہے۔ یہ میرے سامنے پانی کی بوتل رکھی ہے۔ میں یقین نہیں رکھوں گا کہ اس کا پانی میری دسترس سے باہر ہے۔ کیونکہ یہ میرے سامنے ہے۔ یقین اور بے یقینی وہاں ہوتی ہے جہاں معاملات آدمی کی دسترس سے باہر ہوں۔ اسی لیے میرے نزدیک یقین ہونا اصل میں بے یقینی کی ایک صورت ہے۔"

"تم بہت عجیب باتیں کرتے ہو فلسفیوں جیسی۔"

میں ہنسا۔ "حالانکہ مجھے سب سے زیادہ چڑ اسی علم سے ہے۔ میرے نزدیک فلسفہ اپنی خواہشات اور اپنے نقطۂ نظر کو دلیل دینے کا نام ہے۔"

"اس کے برعکس مجھے فلسفہ پسند ہے۔"

"مجھے قطعی تعجب نہیں ہے کیونکہ دنیا کے جتنے بڑے سفاک اور قاتل حکمران گزرے ہیں وہ سب فلسفے کے شیدائی تھے اور انہوں نے اپنے کرتوتوں کے جواز کسی فلسفی کے افکار سے ہی حاصل کیے۔"

"تم تو کہہ رہے تھے کہ تمہیں فلسفہ پسند نہیں ہے۔"

"ہاں لیکن اس کا مطلب یہ تھوڑی ہے کہ میں نے کچھ پڑھا نہیں ہو، میں نے سب پڑھا ہے۔"

بارش کے شور میں ہمیں اونچی آواز میں بات کرنی پڑ رہی تھی۔ باسو ہم سے کچھ دور ساکت کھڑا تھا۔ یہ اس کا مخصوص پوز تھا اور میں نے تقریباً ہمیشہ اسے اسی حالت میں دیکھا تھا۔ وہ دونوں بازو نیچے لٹکائے کسی دیو کی طرح البتہ دور رہتا تھا۔ میں نے باسو کے بارے میں پوچھا۔ "کیا یہ قدرتی ہے؟"

"نہیں یہ اسی چینی ڈاکٹر کا بنایا ہوا ہے۔" قاضلی نے جواب دیا تو میں چونکا۔

"کیا مطلب؟"

قاضلی نے وضاحت کی۔ "ڈاکٹر لینگ نہ صرف جدید میڈیکل کا ماہر ہے بلکہ وہ قدیم چینی طب کا بھی ماہر ہے۔ باسو کو اسی نے بنایا ہے۔"

"تمہارا مطلب ہے یہ عام سا انسان تھا پھر ڈاکٹر لینگ نے اسے کسی دوا یا طریقے سے اسے گرانڈیل بنا دیا۔"

"بالکل، ڈاکٹر لینگ نے اس وقت اس کے تھائی

رائڈ گلینڈز کے ساتھ کچھ کیا جب یہ صرف بارہ برس کا تھا۔ اس کے نتیجے میں باسو کے بازو لمبے اور جسم تنومند ہو گیا۔"

میں نے اس بارے میں سنا تھا کہ قدیم چینی ماہرین اتنے ماہر ہوتے تھے کہ وہ انسان کی نشوونما پر اثر انداز ہونے والے ان غدود کو چھیڑ کر اپنی مرضی کے نتائج حاصل کر لیتے تھے۔ وہ قدیم چینی شہنشاہوں کے لیے خاص جسم والے غلام تیار کرتے تھے۔ مگر میرا خیال تھا کہ یہ سب داستانیں ہیں۔ جیسی ہمارے ہاں الف لیلہ اور سند باد جیسی کہانیاں ہیں۔ مگر اب میرے سامنے اس قدیم روایت کا ایک جیتا جاگتا نمونہ موجود تھا۔ اگر وہ بارہ سال کی عمر سے ڈاکٹر لینگ کے تجربے میں تھا تو اسے خاصا عرصہ ہو گیا تھا۔ میں نے قاضلی سے اس کی عمر پوچھی۔ اس نے جواب دیا۔ "یہ ابھی اٹھارہ سال کا ہو جائے گا۔"

میں نے باسو کو حیرت سے دیکھا۔ "صرف اٹھارہ برس کا!"

"ہاں اور یہ زیادہ سے زیادہ بائیس برس تک زندہ رہے گا۔" قاضلی نے ایک اور انکشاف کیا۔ "اس وقت تک اس کا جسم اتنا بڑھ جائے گا کہ اس کا دل پورے جسم کو خون پمپ نہیں کر سکے گا۔ بائیس سال تک کبھی بھی اسے ہارٹ اٹیک ہوگا اور یہ ختم ہو جائے گا۔"

"یہ زیادتی ہے۔" میں نے کہا۔ "ڈاکٹر لینگ نے اسے اپنے لیے تیار کیا ہے؟"

"نہیں وہ ڈیوڈ سنا کے لیے کام کرتا ہے اور یہ تو صرف ایک نمونہ ہے۔" قاضلی نے کہا۔ "ڈاکٹر لینگ ایسے کتنے ہی انسانوں پر تجربات کر چکا ہے۔"

میں گہری سانس لے کر رہ گیا۔ جب سے میرا واسطہ مرشد، ڈیوڈ سنا اور کنور سنا خاندان جیسے ابلیس صفت لوگوں سے پڑا تھا تب سے میں ہر بار ان کی کسی نئی شیطانیت سے واقف ہوتا تھا۔ ہر بار وہ مجھے پہلے سے زیادہ شیطان صفت لگتے تھے۔ یہ انسانوں کو کس بے دردی سے استعمال کرتے ہیں کہ ان کے سامنے چنگیز اور ہلاکو بھی رحم دل لگتے ہیں۔ وہ صرف لاشوں اور کھوپڑیوں کے مینار بنانے تھے یہ جیتے جاگتے انسانوں کو نمونۂ عبرت بنا کر رکھ دیتے تھے۔

"ڈاکٹر لینگ چینی ہے۔"

"تائیوان کا۔" قاضلی نے کہا۔ "ایک نمبر کا حرامزادہ اور سفاک شخص ہے اس کی نرم صورت پر مت جاؤ، یہ انسانوں کے ساتھ کیا کر سکتا ہے اس کا اندازہ تمہیں باسو کو دیکھ کر ہو جانا چاہیے۔ میں نے اسی سے سنا ہے کہ باسو جیسی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مخلوق بنانے میں سات بچے ضائع ہوئے تھے یہ آٹھواں تھا۔"

"کیا یہ منگول ہے؟" میں نے پوچھا۔

"نہیں باسو کا تعلق تھائی لینڈ سے ہے۔"

فاضلی ان لوگوں کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ "آج کی مہم میں اس کا کیا کردار ہے؟"

"تمام مشکل اور جوکھم والے کام اس کے سپرد ہوں گے۔ ویسے یہ ماہر لڑاکا ہے۔ ہر قسم کے ہتھیار استعمال کرنا جانتا ہے۔ خالی ہاتھوں سے بھی لڑ سکتا۔ طاقتور اتنا ہے کہ ٹکر مار کر دیوار گرا سکتا ہے۔ ٹرک کو پکڑ لیتا ہے تو وہ آگے نہیں بڑھ سکتا۔"

"یہ کتنا ہی طاقتور سہی لیکن ایک گولی اسے ہمیشہ کی نیند سلا سکتی ہے۔"

"ایسا تو کسی کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ اپنا دفاع کرنا جانتا ہے۔"

باسو جواب تک ساکت کھڑا تھا اچانک حرکت میں آیا۔ وہ غار کی طرف گیا اور وہاں سے ایک بڑا بیگ گھسیٹ کر غار کے دہانے تک لے آیا جہاں وہ بارش سے محفوظ تھا۔ اس نے زپ کھولی اور ایک جیکٹ نما چیز نکالی اور پہننے لگا۔ لیکن یہ جیکٹ نہیں بلکہ بلٹ پروف تھا۔ جس نے اسے گردن سے رانوں تک کور کر لیا تھا۔ پھر اس نے دھاتی آرمر نکال کر کلائیوں اور بازوؤں پر پہنے اور ایسے ہی دھاتی خول اپنی پنڈلیوں پر باندھے۔ اس نے ایک بڑے سائز کی بھاری مشین گن نکالی جس کے ساتھ گولیوں کا بکس منسلک تھا۔ دو بڑے پستول بلٹ پروف کی سائیڈوں پر ہولسٹرز میں لگائے اور ان کے اضافی میگزین مخصوص خانوں میں رکھ لیے۔ پھر مشین گن کے اضافی بکس سینے پر لگائے۔ ایک کرپان سائز کا خنجر اس نے اپنی نیام سمیت ران پر باندھا۔ وہ کسی دیو جیسا بڑا تھا اور موویز کے کامک کریکٹر کی طرح دکھائی دے رہا تھا مگر یہ سب حقیقت اور بہت خوفناک تھا۔ آخر میں اس نے اپنے سر پر ایسا دھاتی اور شیشے کا بنا ہوا ہیلمٹ پہنا جس نے اس کا سر مکمل طور پر ڈھانپ لیا تھا۔ یہ بھی یقیناً بلٹ پروف تھا۔ فاضلی نے مجھ سے کہا۔

"یہ میرے ساتھ ہوگا۔"

بارش ڈیڑھ گھنٹے تک مسلسل برستی رہی تھی اور تقریباً گیارہ بجے رک گئی۔ میں اور فاضلی آدھے گھنٹے بعد اندر آ گئے تھے۔ اس وقت بھیگا لباس گراں گزر رہا تھا مگر گیارہ بجے تک یہ خاصا سوکھ گیا تھا۔ فاضلی کا ایک آدمی اس طرف مٹی میں ڈائنامائٹ لگا رہا تھا۔ اس نے وسط میں تھنا ڈائنامائٹ اسٹکس لگائیں اور پھر ان سے منسلک تاریں لے کر باہر آیا۔ ہم سب باہر نکل آئے تھے۔ ساڑھے گیارہ بجے تاریں بیٹری سے منسلک کی گئیں اور بٹن دبانے ہی اندر ایک زبا ہوا دھماکہ ہوا اور گرد و غبار کا طوفان باہر آیا تھا۔ یہ پہاڑ تھی زیادہ مٹی کی بنی ہوئی تھی اور مجھے لگ رہا تھا کہ کہیں پہاڑی نہ بیٹھ جائے۔ شاید اسی خوف سے یہ لوگ محدود دھماکے کر رہے تھے۔ اس طرح آواز بھی کم ہوئی۔ مجھے یقین تھا کہ ورگا تک دھماکے کی آواز نہیں گئی ہوگی۔ جب گرد چھٹی تو فاضلی اپنے آدمی کے ساتھ اندر گیا اور پھر اس نے دوسروں کو طلب کیا۔ چند لمحے بعد اندر سے کھدائی کی آوازیں آنے لگی تھیں۔

شاید اب فاصلہ کم رہ گیا تھا اس لیے فاضلی نے دھماکے کی بجائے کھدائی کے اوزاروں سے راستہ صاف کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ نصف درجن افراد لگے ہوئے تھے اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ گیارہ بج کر پچاس منٹ تک رستہ بن گیا تھا۔ سب سے آگے مجھے اور میرے دستے کو جانا تھا۔ راستہ بنتے ہی فاضلی باہر آیا اور اس نے مجھ سے کہا۔ "اپنے آدمیوں کے ساتھ اندر جاؤ۔ دوسری شفٹ والے آنے والے ہوں گے۔"

میں نے پوچھا۔ "پہلی شفٹ والے بے ہوش ہیں۔"

"وہ مر چکے ہیں۔" فاضلی نے بے پروائی سے کہا۔ "گیس کی مقدار زیادہ ہو گئی تھی۔"

میرا خون رگوں میں تیز ہوا تھا مگر یہ موقع نہیں تھا کہ فاضلی سے ان لوگوں کے خون کا حساب لیتا۔ "میرا اسلحہ کہاں ہے؟"

جواب میں فاضلی نے مجھے ایک بیگ تھما دیا۔ "اس میں سب ہے۔ تم اندر جاتے ہوئے چیک کر لو۔"

تمام تر احتیاطوں اور میرے ساتھیوں کو گن پوائنٹ پر رکھنے کے باوجود فاضلی اپنے سامنے مجھے مسلح کرنے کا خطرہ مول لینے کو تیار نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے مجھے بیگ دیا تھا۔ میں اپنے چھ آدمیوں کے ہمراہ بنائے گئے تنگ راستے سے اندر آیا جہاں فاضلی کے آدمی پہلے ہی پہنچ گئے تھے۔ یہاں سرنگ میں روشنی اور ہوا کی آمد و رفت کا مکمل انتظام تھا۔ ذرا بھی گھٹن نہیں تھی۔ سرنگ واقعی خاصی چوڑی اور پختہ تھی۔ فرش کنکریٹ کا اور ہموار تھا۔ ایک طرف ان چار افراد کی لاشیں تھیں جو کھدائی کا کام کر رہے تھے اور مر جانے کس گیس کا شکار ہوئے تھے۔ گیس انہوں نے ایک ورل پائپ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی مدد سے اندر چھوڑی تھی۔ میں اور ملنگ کے پانچ ساتھی تیزی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ جب ہم سرنگ کے دوسری طرف پاس پہنچے تو ملنگ کے ایک آدمی نے روشنی کے لیے جانے والی تار کاٹ دی اور سوائے آخری چند بلبوں کے تمام سرنگ تاریکی میں ڈوب گئی تھی۔ باقی رہ جانے والے چند بلب بے آواز فائر کرکے توڑ دیے۔ اب صرف اس طرف سے ہلکی سی روشنی آرہی تھی جس طرف سرنگ کا دہانہ کھل رہا تھا۔ ہم وہیں مورچہ لگا کر بیٹھ گئے۔ میں نے ملنگ سے کہا۔ ”آنے والوں کو شوٹ نہیں کرنا ہے ان کو چند زندہ رہنا ہے۔“

”تم باس ہو لیکن وہ مسلح ہوں گے اور اگر ایک فائر بھی ہو گیا تو گڑبڑ ہو جائے گی۔ آگے کا کام خود سوچ لو۔“ اس کے لہجے میں ہلکی سی دھمکی آگئی۔ پھر اس نے کہا۔ ”ان لوگوں کی فکر مت کرو..... یہ سب ہماری طرح چھٹے ہوئے بدمعاش ہیں جب ہی تو مرشد نے انہیں اس کام پر لگایا ہے کسی عام بندے کو وہ اس کام پر نہیں لگا سکتا ہے۔“

میں نے گہری سانس لی۔ ”ٹھیک ہے تب اس معاملے میں تم انچارج ہو جو مناسب سمجھو کرو۔“

ملنگ نے سر ہلایا اور آگے بڑھ گیا وہ اور اس کے ساتھی دیواروں کے ساتھ چپکے کھڑے تھے ان کے سیاہ لباس دیوار کا حصہ بن گئے تھے کیونکہ دیوار کھردرے سرمئی سیمنٹ کی تھی اس پر چونا تک نہیں کیا گیا تھا۔ بارہ بجنے میں دو منٹ پر اندر سے آوازیں آنے لگیں اور چند سائے نمودار ہوئے پھر کسی نے کہا۔ ”یہاں اندھیرا کیوں ہے؟“

”حرامخور کام بند کرکے تو نہیں چلے گئے؟“ دوسرا بولا۔

”فائر۔“ ملنگ نے دبی آواز میں کہا اور فوراً ہی اس کی اور اس کے چار ساتھیوں کی رائفلیں بے آواز شعلے اگلنے لگی تھیں۔ آنے والے چار افراد کو آواز نکالنے کا موقع بھی نہیں ملا تھا اور وہ چھلنی ہو کر رہ گئے۔ وہ جیسے ہی گرے ملنگ کے تین آدمی تیزی سے دوڑتے ہوئے دہانے سے باہر چلے گئے اور میرے کانوں نے پھر دبی فائرنگ کی آواز سنی۔ اس دوران میں ہم تین پوزیشن سنبھال کر بیٹھے رہے تھے۔ ایک منٹ بعد ان میں سے ایک واپس آیا اور اس نے کہا۔ ”دو اور تھے ان کو بھی اڑا دیا ہے۔“

گویا اس مہم کا آغاز ہی دس افراد کی جانوں سے ہوا تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ کتور چیلس والی مہم کا ایکشن ری پلے تھا۔ ہم اس چھوٹی سی عمارت میں داخل ہوئے جو بس ایک ہال پر مشتمل تھی اور اس کے ایک طرف لوہے کا اتنا بڑا گیٹ لگا ہوا تھا جس سے ایک درمیانہ ٹرک آرام سے گزر سکتا تھا۔ سرنگ تقریباً ایک کلومیٹر لمبی تھی اور آگے بڑھتے ہوئے مجھے دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں فاصلہ مجھ سے پانچ سو گز دور نہ رہ جائے مگر وہ پیچھے تھا۔ اس مہم میں ہمارے پاس مواصلاتی آلات نہیں تھے جن سے آپس میں رابطہ کیا جاتا۔ لیکن یہ میرا خیال تھا۔ جب میں گیٹ کا معائنہ کر رہا تھا تو ملنگ نے اپنے لمبے بالوں میں چھپے کان پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ”گیٹ تک کلیئر ہے ہم باہر جا رہے ہیں۔“

”تم کس سے بات کر رہے ہو؟“ میں نے پوچھا۔

”استاد سے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”میرے پاس ریڈیو ہے۔“

بڑا گیٹ کھولنے کی بجائے اس میں لگا ہوا چھوٹا دروازہ کھولا گیا اور ملنگ نے باہر جھانکا۔ باہر بہت تیز روشنی تھی۔ اس نے اطلاع دی۔ ”سامنے ہی چار مسلح بندے نظر آرہے ہیں۔“

اس کباڑ خانے نما عمارت سے پرانے ساتھ ہال کا فاصلہ کوئی پچاس گز تھا۔ اس کے دائیں طرف ایک اونچی دیوار تھی۔ جس پر تار دار کے ساتھ ساتھ تیز پول لائٹس بھی لگی ہوئی تھیں۔ چاروں مسلح افراد مختلف جگہوں پر تھے۔ ملنگ نے کہا۔ ”ان کو الگ الگ اڑانا ہوگا۔“

”کیسے..... باہر جاتے ہی ہم ان کی نظروں میں آجائیں گے۔“

ملنگ نے آس پاس دیکھا اور پھر لوہے کے گیٹ کے اوپر نما حصے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہاں سے نشانہ بنا سکتے ہیں۔“

یہ فرش سے کوئی نوفٹ اونچے تھے۔ یہاں گیٹ اور چھت کے درمیان دو فٹ کا فاصلہ تھا۔ ملنگ اسی خلا کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔ ایک طرف لوہے کے خالی ڈرم پڑے تھے۔ وہ خاموشی کے ساتھ ڈرم اٹھا کر لاتے اور گیٹ کے ساتھ رکھے۔ ان کی اونچائی ساڑھے چار فٹ تھی اور اس پر چڑھ کر کوئی بھی شخص آرام سے باہر موجود افراد کو نشانہ بنا سکتا تھا۔ ملنگ اور اس کے تین ساتھی ان ڈرموں پر چڑھ گئے۔ ایک میرے ساتھ تھا۔ وہ جیسے ہی فائرنگ کرتے ہم دونوں باہر نکل جاتے اور اگر کوئی بچ جاتا تو اسے ختم کر دیتے۔ ملنگ نے آہستہ سے ایک دو تین کہا اور سب نے بیک وقت فائر کھول دیے سب کا نشانہ الگ الگ افراد تھے۔ گیٹ کے رخنے سے مجھے دو نظر آرہے تھے اور دو

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دونوں گولیوں کا نشانہ بن کر ہاتھ لہراتے ہوئے زمین پر ڈھیر ہو گئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ہم دو باہر آئے۔ باقی دو بھی زمین پر پڑے تھے مگر وہ حرکت کر رہے تھے۔ میرے ساتھ ملنگ کا ساتھی تیزی سے ان کی طرف گیا اور باری باری انہیں شوٹ کر دیا۔

ملنگ اور اس کے ساتھی باہر آگئے تھے اور ہم پرانے سماع ہال کی عمارت کی طرف بڑھے۔ عمارت کی کھڑکیاں تاریک تھیں۔ اسی لیے ملنگ رکا اور اس نے کان پر ہاتھ لگا کر سنا پھر بولا۔ "یہ دروازہ اس کے ساتھ ہمارا ایک آدمی موجود ہے۔"

اس نے ایک چھوٹے لکڑی کے دروازے کی طرف اشارہ کیا۔ ویسے ایک بڑا اجازی ساز گیٹ اس عمارت میں بھی تھا اور ظاہر ہے وہ ٹرک اندر لے جانے کے لیے تھا۔ ہم چھوٹے دروازے تک آئے اور ملنگ نے درمیانی انگلی موڑ کر اس سے دروازے پر ایک ایک سیکنڈ کے وقفے سے تین بار دستک دی۔ جواب میں ویسی ہی دستک سنائی دی۔ اس بار ملنگ نے دو بار دستک دی جواب میں چار بار سنائی دی اور آخر میں ملنگ نے چھ بار اسی طرح دروازہ بجایا۔ اس کے ساتھ ہی دستک باری اختتام کو پہنچی اور دروازہ کھل گیا۔ ہم خاموشی سے اندر داخل ہوئے۔ یہ ایک چھوٹا کمرا تھا اور یہاں ایک آدمی منتظر تھا اس نے آہستہ سے کہا۔ "ناٹسلی۔"

ملنگ نے سر ہلایا اور پوچھا۔ "ہمارے آدمی کہاں قید ہیں؟"

"نیچے تہہ خانے میں۔" آدمی نے کہا۔ "لیکن وہاں تین پہرے دار ہیں۔"

"تم ان سے نمٹے نہیں؟" ملنگ نے بدمزگی سے کہا۔ "تم سے کہا تھا ان کو شراب میں دوا دے دینا۔"

"موقع نہیں ملا...... میں انہیں شراب میں دوا دیتا مگر وہ پہلے ہی بوتل لے جا چکے تھے۔"

"لعنت ہو۔" ملنگ غرایا۔ "اس عمارت میں اور کتنے لوگ ہیں؟"

"بس یہی تین ہیں۔"

"ٹھیک ہے ہم ان سے نمٹتے ہیں تم باہر کا خیال رکھو۔ پیچھے چار لاشیں ہیں اگر کسی نے دیکھ لیں اور کوئی ہنگامہ ہو تو تم سب سے پہلے ہمیں خبردار کرو گے۔"

یہاں تک میں تماشائی بنا تھا اور سارا کام ملنگ کر رہا تھا ایسا لگ رہا تھا کہ سارا پلان اس کے علم میں تھا۔ اس نے ایک بار بھی مجھ سے نہیں پوچھا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ ملنگ یہاں کے چپے چپے سے واقف تھا کیونکہ وہ پورے اعتماد سے تہہ خانے کی طرف بڑھا۔ تہہ خانہ ایک چھوٹے کمرے کے نیچے تھا۔ یعنی اس کا دروازہ یہاں تھا۔ فرش میں چوکور خلا تھا جس سے سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ ملنگ نے نیچے دیکھا اور اپنے ایک ساتھی سے کہا۔ "نیچے کی روشنی بند کرنا ہوگی۔"

اس نے فوری طور پر اپنے اوزار نکالے اور کمرے میں موجود سوئچ بورڈ کھول لیا۔ اس نے تصدیق کی۔ "یہاں سے انسانی لائن نیچے جا رہی ہے۔"

"کاٹ کر دو جلدی۔" ملنگ نے حکم دیا اور اس نے کٹر سے تار کاٹ دیے۔ فوراً ہی نیچے اندھیرا ہو گیا اور ملنگ آنکھوں پر نائٹ وژن عینک لگاتے ہوئے سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا تھا۔ بہ مشکل دس سیکنڈ بعد اندر سے برسٹ چلنے کی معمولی سی آواز آئی۔ یہ طویل اور بھرپور برسٹ تھا جو اس وقت خاموش ہوا جب میگزین خالی ہو گیا تھا۔ پھر ملنگ کی آواز آئی۔ "شوگی اور ہاگ نیچے آئیں۔"

شوگی اور ہاگ نیچے گئے میں نے پہلی بار دیکھا ان کی پشتوں پر خاصے بڑے بیگ بندھے ہوئے تھے۔ ایسا لگ رہا تھا کہ ملنگ نے نیچے موجود مرشد کے آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا تھا۔ اب اندر موجود وفادار اپنے افراد کو چھڑا رہا تھا۔ ہم انتظار کر رہے تھے کہ ملنگ نے سر باہر نکال کر مجھ سے کہا۔ "تم آگے جاؤ...... جب تک میں ان لوگوں کو آزاد کرا کے لاتا ہوں۔"

"اوکے باس۔" میں نے کسی قدر استہزائیہ لہجے میں کہا لیکن وہ سنے بغیر واپس اندر جا چکا تھا۔ میں باقی تین دو افراد کے ہمراہ سماع ہال کے اگلے حصے کی طرف بڑھا۔ یہاں سے باہر راستہ مرکزی ہال سے نکلتا تھا۔ ہم نے کھڑکیوں سے باہر دیکھا تو درگاہ کی عمارت کا عقبی حصہ نظر آیا۔ یہ سماع ہال سے خاصا بڑا تھا اور دونوں عمارتوں کے درمیان کوئی سو گز کا فاصلہ تھا۔ یہاں نصف درجن سے زیادہ پہرے دار تھے۔ ان لوگوں نے چار افراد کو تو خاموشی سے ہلاک کر دیا تھا مگر سات افراد کو ٹھکانے لگانا آسان نہیں تھا اور خاموشی سے یہ کام تو بہت ہی مشکل تھا۔ اصل لوگ درگاہ کی عمارت میں تھے۔ کھڑکیوں سے ممکنہ حد تک جاسوسی کر کے میں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اندر رہ کر ان لوگوں کو نشانہ بنانا بہت مشکل تھا۔ یہاں زاویے نہیں تھے اور ایک بھی بچ جاتا تو گڑبڑ ہو جاتی اس لیے جب ملنگ آیا تو میں نے اس سے کہا۔

"اس طرح کام نہیں چلے گا۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"پھر کیا کیا جائے؟"

"ان کی خدا کو کم کرنی ہوگی۔"

"کیسے؟"

"وہ شخص کہاں ہے جس نے ہمیں رسیو کیا تھا۔"

"وہ پیچھے ہے۔"

"اسے بلاؤ۔" میں نے کہا تو ملنگ نے ایک آدمی روانہ کر دیا اور مجھ سے پوچھا۔

"تمہارے ذہن میں کیا ہے؟"

"ان میں سے کچھ کو اندر بلا کر قابو کرنا ہے۔ کیسے کرنا ہے یہ تم اچھی طرح جانتے ہو۔"

"اور جو باہر رہ جائیں گے۔"

"ان کے بارے میں بعد میں سوچیں گے۔" میں نے جواب دیا۔ اس دوران میں وہ آدمی آ گیا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تمہارا نام کیا ہے؟"

"منظور جی۔"

"منظور باہر سات افراد ہیں تم باہر جاؤ اور ان کو بتاؤ کہ تہہ خانے میں کوئی مسئلہ ہوا ہے۔ وہاں موجود پہرے داروں کی آپس میں لڑائی ہو رہی ہے۔ چل کر معاملہ سلجھائیں۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "وہ اپنی جگہ نہیں چھوڑ سکتے وہ اندر والوں کو بتا دیں گے۔"

میں نے سوچا اور کہا۔ "تم لڑائی کی وجہ دو عورتوں کو قرار دے سکتے ہو جنہیں وہ کہیں سے عیاشی کے لیے لائے ہیں اور اب ان پر لڑائی ہو رہی ہے۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" ملنگ نے مداخلت کی۔ "میں ان حرامزدوں کو جانتا ہوں عورتوں کا سن کر دوڑے آئیں گے۔ باہر جا کر سب سے مت کہنا جو آگے وہ گن مین ہیں ان کو بتانا۔"

منظور نے سر ہلایا اور روانہ ہو گیا۔ ہم ہال سے ہٹ کر عقبی حصے میں آئے اور وہاں دو کمروں میں مورچے سنبھال لیے۔ ملنگ کا حساب ہوتا تو آنے والے یہیں سے گزرتے۔ چند منٹ بعد آوازیں آنے لگیں۔ بولنے والے منظور کے ساتھ تھے۔ وہ اس سے سوالات کر رہے تھے اور سوالات جھگڑے کی بجائے عورتوں کے بارے میں تھے۔ ان کو لڑائی سے کوئی دل چسپی نہیں تھی ان کی بلا سے اندر والے آپس میں لڑ مرتے، وہ تو عورتوں کے چکر میں جا رہے تھے۔ وہ چار تھے اور منظور سے آگے تھے جب کہ اس... کے ساتھ ایک چل رہا تھا۔ جیسے ہی وہ آگے

نکلے ملنگ اور اس کے ساتھیوں نے اچانک راہداری میں نکل کر ان پر فائر کھول دیا۔ میں کمرے میں رہا تھا۔ منظور کو بچانے کے چکر میں وہ کھل کر فائرنگ نہیں کر سکے تھے اس لیے نشانہ بننے والے فوراً اجل کا نشانہ نہیں بنے تھے۔ فائرنگ کی آواز معمولی سی تھی مگر ان کی چیخیں خاصی بلند تھیں۔ پھر ملنگ اور اس کے ساتھیوں نے گرے ہوئے زخمیوں کو شوٹ کیا۔ منظور جواب تک ساکت کھڑا تھا اچانک گرا اور تڑپنے لگا۔ ملنگ جھکا۔ "اوئے تجھے کیا ہوا ہے۔"

تب میں نے دیکھا اس کے بائیں پہلو سے خون پھوٹ رہا تھا۔ وہ اندھا دھند فائرنگ کی زد میں آ گیا تھا ان لوگوں نے عجلت میں اسے ہٹنے کا موقع نہیں دیا اور کوئی گولی اس کا دل والا پہلو چھید گئی تھی۔ وہ ایک منٹ سے بھی پہلے ٹھنڈا ہو گیا تھا۔ ملنگ نے جھک کر اسے دیکھا اور زخمی آدمیوں سے غصے میں بولا۔ "دیکھ کر فائر نہیں کر سکتے تھے۔"

"اب کیا ہو سکتا ہے استاد۔" ایک نے بے پروائی سے کہا۔

ان پانچ انسانوں کی موت بھی مجھے بوجھ کی طرح محسوس ہو رہی تھی۔ مگر یہ موقع ایسا نہیں تھا کہ میں ان کے بارے میں بات کرتا۔ بارہ بج کر تین منٹ ہو چکے تھے اور ہمیں درگاہ کی عمارت میں گھسا تھا۔ میں نے ملنگ سے پوچھا۔ "آزاد ہونے والے کہاں ہیں؟"

"وہ سرنگ کی طرف گئے ہیں، تیار ہو کر آ رہے ہیں۔" ملنگ نے جواب دیا۔ "ان کے لیے بھی لباس، اسلحہ اور بلٹ پروف لائے تھے۔"

اسی لمحے راہداری میں قدموں کی آہٹیں گونجنے لگیں اور ایک درجن کے قریب افراد نمودار ہوئے۔ انہوں نے ہماری طرح وردیاں اور بلٹ پروف پہن رکھا تھا اور اسلحہ بھی تھا۔ ان سب کے بال اور شیو بڑھی ہوئی تھی اور ان کے پاس سے نہایت گندگی قسم کی بدبو آ رہی تھی یقیناً انہیں نہائے دھوئے ہفتے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ ان میں سے ایک آگے آیا اور اس نے ملنگ سے کہا۔ "یہ کیا ہے؟"

"سامنے والے چار بندے۔" ملنگ نے جواب دیا۔ "لیکن غلطی سے منظور بھی مارا گیا ہے۔"

آنے والوں نے سرسری سے انداز میں منظور کی لاش دیکھی اور ملنگ سے بات کرنے والا بولا۔ "انتظار کس بات کا ہے اب چلو، کھلی جنگ ہوگی۔"

"کوئی کھلی جنگ نہیں ہوگی۔" میں نے سرد اور تحکمانہ انداز میں کہا۔ "ہمیں خاموشی سے درگاہ میں گھسنا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوگا۔ بلاوجہ شور کی غلطی ضرورت نہیں ہے جب تک ہم جتر جتر تک نہ پہنچ جائیں۔''

''یہ کون ہے۔'' ملنگ سے بات کرنے والے نے مسخرانہ انداز میں پوچھا تو میں آگے آیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔

''تم نے مجھے پہچانا نہیں، میں شہباز ملک ہوں...... جس سے تمہارے سابق آقا مرشد اور موجودہ آقا فاضلی کی...... ہے۔'' خالی جگہوں میں میں نے روانی سے ناقابل بیان الفاظ فٹ کیے۔ میرا نام سن کر اس کا تاثر بدل گیا تھا۔ اس نے ناقابل یقین نظروں سے ملنگ کی طرف دیکھا تو اس نے کہا۔

''استاد نے ساتھ کیا ہے۔ اب یہ ہمارا لیڈر ہے۔ اس کی ہر بات ماننی ہے۔''

''میرا پہلا حکم ہے کہ میری اجازت کے بغیر کوئی کولی نہیں چلائے گا اور میں جو پلان کروں اس پر عمل ہوگا۔ اگر کسی کو اعتراض ہے تو وہ فاضلی سے بات کرلے۔''

مگر ان میں سے کسی میں اتنی جرأت نہیں تھی کہ فاضلی سے بات کرتا۔ میں پلٹ کر ہال کی طرف آیا۔ یہاں آنے والے کے پیچھے دوسرے بھی جلد باہر آگئے۔ عورتوں کے لفظ نے ان پر جادو جیسا کام کیا تھا اور وہ نہایت آسانی سے دام اجل میں چلے آئے تھے۔ اب باہر تین تھے۔ ہم نے ہال کی کھڑکیوں سے باہر دیکھا تو وہ تینوں اب دستی صحن میں تھے اور ان کی نظریں سامنے ہال کی عمارت پر مرکوز تھیں۔ وہ تینوں پاس پاس تھے اور آپس میں گفتگو کر رہے تھے۔ اب تک کے آثار سے ایسا نہیں لگ رہا تھا کہ درگاہ میں کسی کو اس معاملے کے بارے میں علم ہوا تھا۔ میں نے ملنگ سے کہا۔ ''وقت نہیں ہے...... یا تو انہیں اندر لانا ہوگا یا پھر ہمیں اچانک دھاوا بولنا ہوگا۔''

میری ایک کامیاب حکمت عملی نے ملنگ کو مرعوب کر دیا تھا اور اس نے کہا۔ ''جیسا تم کہو۔''

میں نے سوچا اور بولا۔ ''یہاں تاریکی ہے...... اگر ہم میں سے کوئی دروازے کے اندر رہتے ہوئے انہیں اشارے سے یہاں بلائے تو یقیناً ان میں سے کوئی نہ کوئی آئے گا۔''

''تاریکی میں حلیہ نظر نہیں آئے گا مگر بلٹ پروف اور ہتھیار نظر میں آسکتے ہیں۔'' ملنگ بولا۔ ''یہ کام کون کرے گا؟''

''میں۔'' میں نے کہا اور ہتھیار اور بلٹ پروف اتارنے لگا۔ ان کی وجہ سے میں الگ نظر آرہا تھا۔ ورنہ ٹک کھنکے تھے جب کہ جینز اور سادہ سی شرٹ میں کوئی خاص بات نہیں تھی۔ یہ سب کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ یہ وہ جگہ ہے جس کے بارے میں ہم لوگوں نے کتنی بار سوچا کہ یہاں کارروائی کی جائے۔ مرشد کے اس اڈے کو تباہ کر دیا جائے مگر ہم سوچ کر رہ گئے کبھی موقع نہیں ملا کہ یہ کام کیا جائے اور آج میں اپنے لیے نہیں بلکہ اپنے ایک بدترین دشمن کے لیے یہ کام کر رہا تھا۔ اپنے پیاروں اور اپنے ساتھیوں کے لیے۔ میں یوں جان لڑا رہا تھا اور اپنی ساری کوشش کر رہا تھا جیسے میں اپنے لیے کر رہا ہوں حالانکہ مجھے اپنا انجام معلوم نہیں تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ فاضلی کام نکلتے ہی مجھے بھی مرشد کے ساتھ دنیا سے رخصت کر دیتا۔ میں پہلے ہی کہہ چکا ہوں اس کے لیے کوئی بھی بہانہ بنانا بہت مشکل نہیں تھا۔ وہ روز بوز شاہ سے کہہ سکتا تھا کہ میں غلطی سے اس سے دور چلا گیا۔ اس کے باوجود میں فاضلی کے لیے کام کر رہا تھا۔ صرف اس لیے کہ میرے ساتھی محفوظ رہیں۔ میں سب اتار کر کھلے دروازے تک آیا اور روشنی سے دور رہتے ہوئے ہلکی سی سیٹی بجائی اور جب انہوں نے میری طرف دیکھا تو میں نے ہاتھ سے یوں اشارہ کیا کہ جیسے انہیں جلدی سے آنے کو کہہ رہا تھا۔ شاید میرے اشارے کی اتنی وضعت نہ ہوتی لیکن اس چکر کے پیچھے جو حسینہ خواتین تھیں انہوں نے ان تینوں کو مجبور کر دیا اور وہ ہال کی طرف آنے لگے۔

''وہ آرہے ہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔ ''سب پوزیشن لے لیں اور جب میں کہوں تو انہیں شوٹ کر دینا مگر اس بار دھیان سے ان کے ساتھ مجھے بھی مت شوٹ کر دینا۔''

ہال میں بے شمار کاٹھ کباڑ پڑا تھا ملنگ کے چار ساتھیوں نے جگت میں اس کے پیچھے پوزیشن لے لی اور باقی سب دیواروں سے لگ کر کھڑے ہو گئے۔ میں دروازے کے سامنے تھا اس لیے آنے والے بے فکری سے آرہے تھے۔ ان کے نزدیک آنے پر میں مزید تاریکی کی طرف سرکا تاکہ وہ میری شناخت نہ کرسکیں۔ وہ تینوں اندر آگئے میں خاصا پیچھے ہٹ گیا تھا اور شاید اسی سے انہیں خطرے کا احساس ہوا۔ ایک نے کہا۔ ''ارے کون ہے تو؟''

''میں شیدا ہوں جی۔'' میں نے ناک سے آواز نکالی۔ ''اندر جھگڑا بہت بڑھ گیا ہے جی وہ ایک دوسرے کو مار رہے ہیں۔''

میری بات کے دوران وہ دروازے سے کئی فٹ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اندر آگئے تھے اور ان کے ہتھیار ان کے شانوں پر تھے۔ اسی لمحے ایک نے دیواروں کے ساتھ کھڑے افراد کو دیکھ لیا۔ اس نے گالی دی۔ "...... یہ کون ہیں۔"

"فائر۔" میں نے آہستہ سے کہا اور ملنگ کے چاروں ساتھیوں نے ان پر فائر کھول دیا۔ حنظلہ اعظم میں مڑ کر پیچھے ہو گیا تھا۔ وہ تینوں نمایاں تھے اور بچنے کی کوئی جگہ نہیں تھی چند سیکنڈ میں وہ چھلنی ہو گئے اور جب گرے تو ان کی روح ان کے جسم سے ناطہ توڑ چکی تھی۔ "ہالٹ۔" میں نے کہا تو فائرنگ رک گئی اور ملنگ نے سب سے پہلے ہال کا دروازہ اندر سے بند کیا۔ اس کے آدمی مرنے والوں کو چیک کر رہے تھے۔ میں باہر جھانک رہا تھا اور درگاہ کی عمارت بدستور تاریکی میں تھی۔ مرشد کو پتا بھی نہیں چلا تھا اور اس کے اکیس پہریدار مر چکے تھے۔ بائیسواں منظور تھا جو قریب ہی فائرنگ کا نشانہ بنا تھا۔ میں نے ملنگ سے پوچھا۔ "درگاہ میں کوئی وفادار ہے؟"

"نہیں اب وہ وہی ہیں جن وہ کوٹھی میں آیا۔"

میں نے تہہ خانے سے آزاد کرائے جانے والوں سے پوچھا۔ "تم میں سے کوئی درگاہ کے اندرونی حالات کے بارے میں جانتا ہے؟"

دو آگے آئے۔ "ہم جانتے ہیں۔"

"وہاں اس وقت کتنے آدمی ہوتے ہیں؟"

"تقریباً پچاس سے ساٹھ۔" ان نے جواب دیا۔ "اگر عورتیں آئی ہوں تو سو بھی ہو جاتے ہیں۔"

"یعنی شام کے بعد وہاں عیاشی ہوتی ہے۔"

"سوائے جمعے کی رات۔" ملنگ نے کہا۔ "جمعے کی رات یہاں اسلحے اور منشیات کی آمد و رفت ہوتی ہے اس وقت ایک بھی غیر متعلقہ فرد یہاں نہیں ہوتا ہے۔"

میں نے سوچا۔ "پچاس سے ساٹھ وہ افراد ہیں جو لڑنا اور ہتھیار چلانا جانتے ہیں؟"

"نہیں ان کی تعداد چالیس کے قریب ہوگی۔" ان دونوں میں سے ایک نے جواب دیا۔ "باقی عام ملازمین ہیں۔"

"درگاہ کا اندرونی نقشہ کیا ہے؟" میں نے پوچھا تو بولنے والے نے فرش کی خاک پر عمارت کا خاکہ کھینچا۔

"یہ مرکزی ہال ہے یہاں قبریں ہیں اور یہیں محفل ہوتی ہے۔ ذرا پیچھے مرشد کا خاص کمرا ہے جہاں خاص لوگ اس سے ملتے ہیں۔ عام لوگوں سے وہ اس سامنے والے حصے میں ملتا ہے۔" اس نے گنبد کے نیچے والے حصے میں آگے انگلی رکھی۔ "یہاں فرش سے چھت تک ایک ہی کمرا ہے۔ اوپری منزلوں کے حصے اس طرف کھلتے ہیں۔ گنبد کے دائیں بائیں راہداری ہے جس کے دونوں طرف کمرے ہیں۔" وہ انگلی سے نقشے میں اضافہ کر کے وضاحت کر رہا تھا۔

"سیڑھیاں کس طرف ہیں؟"

"گنبد کے دونوں طرف سے سیڑھیاں اوپر جا رہی ہیں۔" اس نے سیڑھیوں کی لوکیشن واضح کی۔ میں سمجھ گیا تھا۔ یہ عمارت کوئی سو گز لمبی اور کوئی تیس گز چوڑی تھی۔ گنبد والا حصہ آگے پیچھے دونوں طرف سے دائرے میں باہر نکلا ہوا تھا۔ پوری عمارت سفید سنگ مرمر سے ڈھکی ہوئی تھی اور آگے پیچھے کمروں کی ابھری کھڑکیاں اس کی خوب صورتی میں مزید اضافہ کر رہی تھیں مگر یہاں رہنے والے اور آنے والے ہی جانتے تھے کہ اس خوب صورت عمارت میں کتنی بدصورتیاں چھپی ہوئی تھیں۔ تین فلورز پر ہر منزل پر بیس بیس کمرے تھے جو ایک راہداری میں پانچ پانچ کی قطار میں تھے۔ یعنی آمنے سامنے پانچ پانچ کمرے تھے۔ اس طرح ان تین فلورز پر ساٹھ کمرے بنتے تھے۔ سرونٹس کے لیے تہ خانہ تھا۔ وہیں کچن تھا اور ملازمین بھی وہیں رہتے تھے۔ عام طور سے تہ خانہ خفیہ سرگرمیوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے لیکن یہاں ایسا نہیں تھا۔

اب ہمارے حامی کل سترہ افراد تھے۔ چھ ہم اور گیارہ قید سے نکل کر آنے والے تھے۔ یہ سب لڑائی اور ہتھیاروں کے استعمال میں ماہر تھے۔ سترہ افراد کافی ہو سکتے تھے اگر ہم خاموشی سے کارروائی کرتے۔ خاص طور سے اس صورت میں جب کہ یہاں بجلی، واحد لائن ختم کی جا چکی تھی۔ میں نے ان سب کو جمع کیا اور اپنی حکمت عملی سامنے رکھی۔ "گنبد والے ہال کے عقبی حصے سے اندر داخل ہو کر ہم دو حصوں میں دائیں بائیں تقسیم ہو جائیں گے۔ دو افراد ہال کے سامنے والے دروازے کو کور کریں گے اور ایک پیچھے والے دروازے کو کور کرے گا۔ باقی بچے چودہ افراد، سات سات کر کے دائیں بائیں باری باری تینوں منزلیں کلیئر کریں گے۔ سات میں سے دو سیڑھیوں کو کور کریں گے تاکہ اوپر والے نیچے نہ آ سکیں اور پانچ کمروں کو دیکھیں گے۔" سب سمجھ گئے۔

انہوں نے سر ہلایا تو میں نے ملنگ سے کہا۔ "انہیں دو گروپس بنا دو۔"

ایک گروپ ملنگ کا تھا اور دوسرا اس کے سپرد کیا جس

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بُک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابنِ صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بُک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بُک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے میرے بارے میں پوچھا تھا۔ دو افراد کے ساتھ میں نیچے ہال میں رہتا۔ میں اگلے حصے کی نگرانی کرتا۔ میرا اسلحہ اور بلٹ پروف بدستور اترا ہوا تھا اس لیے میں نے صحن میں آ کر درگاہ کی عمارت کا رخ کیا۔ اگر کوئی دیکھ رہا ہوتا تو اسے کوئی مشکوک بات نظر نہیں آتی۔ میں نپے تلے قدموں سے دروازے تک پہنچا اور اسے چیک کیا تو خلاف توقع وہ اندر سے کھلا پایا گیا۔ میں نے اسے آہستہ سے اندر دھکیلا اور جھانک کر دیکھا۔ مرکزی ہال تاریک تھا اور کہیں گنبد کے اوپری حصے میں روشنی تھی جو یہاں تک بھی آ رہی تھی۔ مگر بس گزارے لائق تھی۔ میں نے پلٹ کر اشارہ کیا اور ملنگ کے آدمیوں میں سے دو افراد تیز قدمی سے عمارت کی طرف آئے۔ جیسے ہی وہ اندر گھسے مزید دو افراد اسی طرح دوڑتے ہوئے آئے۔ چھ افراد کے بعد باقی سب قطار میں آئے۔ کیونکہ دو دو کر کے آنے میں دیر لگتی اور دیکھ لیے جانے کا امکان زیادہ تھا۔ مسلح فرد ایک ہو یا زیادہ، سب ایک سے مشکوک ہوتے۔ اس بار بھی قسمت نے ہمارا ساتھ دیا اور کوئی اتنے مسلح افراد کو درگاہ کی عمارت میں گھسے نہیں دیکھ سکا۔ یہاں آتے ہی سب اپنے اپنے طے کیے ہوئے حصوں کی طرف بڑھ گئے۔

میں ایک آدمی کے ساتھ سامنے والے حصے میں آیا۔ یہ بیس بائیس سال کا نوجوان تھا مگر اس نے اپنی جوانی کا کل اثر وقت سے پہلے غرق کر لیا تھا۔ یقیناً اس کی غیر نفسانی سرگرمیاں اوائل جوانی میں شروع ہو گئی تھیں۔ پچکے گالوں اور اندر دھنسی آنکھوں کے ساتھ وہ خراب صحت کا مثالی نمونہ پیش کر رہا تھا۔ رنگ اگر کبھی سانولا تھا تو اب جل کر سیاہ ہو گیا تھا۔ دیگر کرتوت بھی دانتوں اور مہاسوں کی صورت میں واضح تھے۔ ذرا سا بھاگنے سے اس کی سانس پھولی ہوئی تھی اور وہ کسی قدر مشکل کے ساتھ اپنی رائفل کا بوجھ اٹھائے ہوئے تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اسے بھرتی کیسے کر لیا گیا تھا شاید وہ اچھا نشانے باز تھا۔ سامنے لکڑی کی جالی اور اس کے درمیان رنگین شیشوں سے بنا ہوا مرکزی دروازہ اندر سے بند تھا۔

یہ تہہ در تہہ چھ پٹوں میں کھلنے والا دروازہ تھا۔ پوری طرح کھلنے پر دروازے کی چوڑائی تقریباً دس فٹ ہو جاتی۔ یہ اسی صورت میں کھولا جاتا جب لوگ بڑی تعداد میں آ رہے ہوتے ہوں گے۔ عام حالات میں اس کے دو پٹ کھولنا بھی کافی ہوتے۔ اس کا لاک اندر یا باہر دونوں طرف سے صرف چابی سے کھولا جا سکتا تھا۔ شیشے منقش اور مرشد کے مریدوں کی طرح اندھے تھے ان سے باہر کچھ نظر نہیں آ رہا تھا اسی طرح باہر سے بھی اندر کچھ نظر نہیں آتا۔ البتہ ایک طرف ایک چھوٹی کھڑکی تھی اس کے شیشے بھی اندھے تھے مگر پٹ کھول کر باہر کا جائزہ لیا جا سکتا تھا میں نے ایسا ہی کیا۔ یہاں درگاہ اور نئے سماع ہال کے درمیان بڑا خوب صورت اور ہرا بھرا باغ تھا۔ متعدد بڑے درخت تھے جن کے نیچے سیمنٹ کی بنچیں لگی تھیں۔ یہ آنے والے زائرین اور حاجت مندوں کے لیے تھیں۔ نئے سماع ہال کے سامنے چند فٹ باتھ پر کم سے کم تین مسلح افراد موجود تھے۔ درگاہ کی عمارت کے ساتھ کتنے تھے یہ کہنا مشکل تھا مگر یقیناً اس جگہ کی سیکیورٹی زیادہ ہوگی۔

اچانک عقب سے بے آواز رائفل چلنے کی گنگناہٹ سنائی دی اور کوئی بھیانک انداز میں ڈکرایا۔ آواز میں موت کا تاثر نمایاں تھا۔ اس کے فوراً بعد دو، گریں رائفلیں گنگنانے لگیں۔ مرنے اور نشانہ بننے والے ہلکی پھلکی چیخ و پکار کر رہے تھے مگر ان کی آوازیں اتنی نہیں تھیں کہ باہر تک جا سکتیں۔ میں نے کھڑکی بند کر دی۔ میں جہاں تھا یہاں سے دونوں طرف اوپر جانے والی سیڑھیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کے نیچے سیڑھیاں تہہ خانے کی طرف جا رہی تھیں اور میں نے ایک سیڑھی سے ایک شخص کو سر ابھارتے دیکھا۔ نیم تاریکی میں وہ بہ مشکل نظر آیا تھا۔ میرے پاس سے ہلکی سی فائرنگ کی آواز آئی اور سر غائب ہو گیا۔ میں نے مدقوق نوجوان کو دیکھا۔ گولی اس نے چلائی تھی۔ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میری اجازت کے بغیر فائر کیوں کیا؟“

”وہ مسلح ہو سکتا تھا۔“ نوجوان نے جواز پیش کیا۔ ”اس کی طرف سے حملے کا انتظار نہیں کیا جا سکتا تھا۔“

بائیں طرف جانے والی ٹیم پہلے فلور سے ہٹ کر واپس آ رہی تھی کہ اوپری منزل سے کسی نے فائر کیا۔ یہ شاٹ گن کا فائر تھا۔ اگرچہ نشانہ کوئی نہیں بنا تھا مگر اس فائر نے اعلان جنگ کر دیا اور اب تک جن لوگوں تک حملے کی اطلاع نہیں پہنچی تھی وہ بھی جان گئے کہ درگاہ میں گڑبڑ ہے۔ فوراً ہی باہر سے کسی کے چلّانے کی آواز آئی۔ میں اور مدقوق نوجوان تیزی سے پیچھے ہٹے اور مزار کی جالیوں تک آ گئے۔ یہاں زمین سے تین فٹ اوپر تک لکڑی کی نفیس جالی لگی تھی۔ میں نے رائفل کا بٹ مار کر اسے توڑا اور پھر کھینچ کر الگ کر دیا۔ میں اور نوجوان بروقت احاطے میں اترے تھے کیونکہ فوراً ہی سامنے سے کسی نے دروازے پر برسٹ مارا اور گولیاں ہمارے اوپر سے گزری تھیں۔ نوجوان نے جوابی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

برسٹ مارا تو باہر سے حملہ آور کی آخری چیخ سنائی دی۔

پھر باہر والوں نے اتنی شدت سے فائرنگ کی کہ دروازے کے پرخچے اڑ گئے تھے۔ لکڑی اور شیشے بکھر گئے تھے۔ لیکن مارٹل کی دیوار نے مجھے اور نوجوان کو محفوظ رکھا تھا۔ ایک منٹ سے بھی پہلے عقب سے بھی فائرنگ شروع ہو گئی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ جب باہر والوں کو اندر کی صورت حال کا علم نہیں تھا تو وہ اس طرح اندھا دھند فائرنگ کیوں کر رہے تھے جس میں ان کے اپنے آدمی بھی نشانہ بن سکتے تھے۔ وہ یقیناً ناتجربے کار افراد تھے۔ ہم محفوظ تھے پیچھے کی نگرانی کرنے والے کے بارے میں کہہ نہیں سکتا تھا کہ وہ محفوظ ہے یا نہیں۔ اب عمارت کے اندر سے بھی کئی اقسام کا اسلحہ چلنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ ظاہر ہے یہ سب مرشد کے لوگ استعمال کر رہے تھے کیونکہ ہمارا اسلحہ بے آواز تھا۔ میں نے نوجوان سے کہا۔ ”تم سامنے کا خیال رکھو۔“

میں احاطے سے گزر کر باہر آیا اور دائیں طرف موجود سیڑھیوں تک آیا۔ میں نے احتیاط سے تہہ خانے کی طرف جھانکا۔ سیڑھیوں کی نگرانی کرنے والا اب دوسرے فلور پر جا چکا تھا اور دوسرے فلور پر موجود افراد کو نیچے آنے سے روک رہا تھا۔ میرا اچھا لگنا بروقت کام آیا کیونکہ سیڑھیوں پر کم سے کم تین مسلح افراد تھے۔ انہوں نے میری موجودگی بھانپتے ہی اپنے ہتھیاروں کا رخ اوپر کر کے بے دریغ فائرنگ شروع کر دی۔ شور سے میرے کان کے پردے بج رہے تھے۔ پھر جیسے ہی ان کی طرف سے فائرنگ رکی میں نے رائفل کی نال اندر کر کے برسٹ مارا۔ چیخوں کے ساتھ بھگدڑ مچی تھی۔ دوسرے برسٹ تک سیڑھیاں صاف ہو چکی تھیں۔ میں نے جھانک کر دیکھا ایک آدمی اوندھے منہ پڑا تھا اور باقی دو غائب تھے۔ وہ بچ نکلے تھے۔ اندازے کے برعکس تہہ خانے میں بھی مسلح افراد موجود تھے۔ شاید مرشد نے حالات کی وجہ سے عام ملازموں کو بھی مسلح کر رکھا تھا۔ غیر قانونی اور قانونی اسلحے کی اس کے پاس کمی نہیں تھی۔ میں نے عقب کی طرف نگرانی کرنے والے کو آواز دے کر بلایا اور اسے تہہ خانے کی نگرانی پر لگا کر دوسری سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔ یہاں سیڑھیاں خالی تھیں۔ میں دبے قدموں زرا نیچے کی طرف آیا تو مجھے کسی کے بولنے کی ہلکی سی آواز آئی۔ وہ کوئی عورت تھی جو دبی آواز میں کہہ رہی تھی۔

”مجھے جانے دو وہ سب کو مار دیں گے...... مجھے بھی مار دیں گے۔“

”چپ کر......“ ایک پھنکارتی مردانہ آواز نے کہا۔ ”اوپر گئی تو ماری جائے گی۔ ابھی یہیں رہ...... یا اندر جا۔“

اس گفتگو کے دوران میں سیڑھیوں سے تقریباً نیچے آ چکا تھا اور اندر سے آتی روشنی میں سامنے دیوار پر ایک مرد اور ایک عورت کا سایا واضح تھا۔ عورت کو پیچھے دھکیل کر مرد سیڑھیوں کی طرف آیا تو میں اس کے استقبال کے لیے تیار تھا۔ جیسے ہی وہ نمودار ہوا۔ میں نے اس کے منہ پر رائفل کا بٹ مارا اور چیخ کے ساتھ اس کے کئی دانت بھی حلق میں اتر گئے تھے۔ دوسری ضرب پر وہ اوندھے منہ گرا اور ساکت ہو گیا۔ میں اندر داخل ہوا تو عورت ایک طرف دیوار سے لگی کانپ رہی تھی۔ وہ تقریباً پچیس برس کی جوان اور خوب صورت عورت تھی۔ یہاں اس کی موجودگی کی وجہ اس کے کسی قدر بگڑے کاجل اور لپ اسٹک اور بے ترتیب لباس سے واضح تھی۔ اس نے کرتے کے بٹن غلط لگائے ہوئے تھے جو یقیناً عجلت میں لگائے گئے تھے۔ میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور پھر دھیمی آواز میں پوچھا۔

”درست میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ یہ جھوٹ بول رہا تھا۔“

اس نے سر ہلایا مگر منہ سے کچھ نہیں بولی، اس کے ردعمل سے مطمئن ہو کر میں نے سوال کیا۔ ”یہاں اور کتنے لوگ ہیں؟“

”بارہ ہیں جی۔“ اس نے دبی آواز میں کہا۔ ”دو ادھر مر گئے ہیں ایک زخمی ہے اور ایک یہ ہے۔“

”باقی آٹھ کہاں ہیں؟“

”دو تو کچھ عورتیں ہیں۔ یہاں کام کرتی ہیں۔“

”تم بھی یہاں کام کرتی ہو؟“

”نہیں۔“ اس نے میرے شبہے کی تصدیق کرتے ہوئے کہا اس کا رنگ سرخ ہو گیا تھا۔ لیکن فی الحال اس سے سوال جواب کا وقت نہیں تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

”یہیں رکو...... اوپر مت جانا...... نہ ہی اندر جانا میں واپس آ کر تمہیں یہاں سے نکال دوں گا۔ میری بات نہ مانی تو نتیجے کی ذمے دار خود ہو گی۔“

”میں نہیں ہلوں گی۔“ اس نے کہا اور میں آگے بڑھ گیا۔ اوپری ہال کی نسبت نیچے تہہ خانہ چھوٹے چھوٹے حصوں میں بنا ہوا تھا۔ یہیں کچن تھا البتہ لنگر خانہ سماع ہال کے پاس تھا۔ دوسری سیڑھیوں کی طرف جاتے ہوئے مجھے کسی کے کراہنے کی آواز آئی اور وہ کسی کو پکار رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

''سننے کیوں نہیں ہو......سب عیاشی میں لگے ہوں گے۔''

میں نے ایک دیوار کے پیچھے جھانکا تو اس چھوٹے سے لاؤنج میں ایک آدمی کی لاش تھی اور ایک زخمی حالت میں موجود تھا۔ یہ یقیناً وہی سیڑھیوں کی طرف آنے والے تھے جنہیں ہم نشانہ بنے تھے مگر وہ وہاں سے نکلنے میں کامیاب رہے تھے ایک یہاں آ کر مارا گیا تھا اور دوسرا زخمی تھا۔ وہ ایک بڑے سائز کے واکی ٹاکی پر کسی کو پکار رہا تھا اور جواب نہ ملنے پر اسے گالیاں دے رہا تھا۔ میں دبے قدموں اس کے سر پر آیا اور پھر رائفل کی نال اس کے سر سے لگا دی۔ وہ ساکت ہوا تو میں نے ہاتھ بڑھا کر اس سے واکی ٹاکی لے لیا اور اسے فرش پر دے مارا۔ اس کے پرزے بکھر گئے تھے۔ اس نے گھگیانا شروع کر دیا۔ ''مجھے مت مارو میرے بیوی بچوں کا اور کوئی نہیں ہے۔''

میں نے طنز کیا۔ ''بیوی بچوں کا خیال ہوتا تو یہاں نہ ہوتے کسی شریفانہ جگہ پائے جاتے اور یہ اسلحہ لے کر تم بیوی بچوں کا خیال کرنے آ رہے تھے۔''

''مجھ سے غلطی ہو گئی۔''

''یہاں اور کتنے لوگ ہیں۔''

''بس ایک مجیدا ہے لیکن وہ پتا نہیں کہاں ہے۔ باقی عورتیں ہیں جو یہاں کام کرتی ہیں۔''

''کیا کام کرتی ہیں؟''

''کھانا بنانا صفائی ستھرائی۔'' اس نے جواب دیا۔

''یہاں ایک عورت باہر کی ہے۔''

''روشنا ہو گی اسے مجید لاتا ہے ساری رات دونوں عیاشی کرتے ہیں۔''

''معلومات کا شکریہ۔'' میں نے کہا اور اس کے سر پر رائفل کا دستہ مارا وہ بے ہوش ہو کر وہیں لڑھک گیا۔ اس کے بازو پر گولی لگی تھی اور خون روکنے کے لیے اس نے کپڑا باندھ لیا تھا اس لیے اس زخم سے اس کے مرنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں واپس روشنا کی طرف آیا۔ وہ اسی جگہ کھڑی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔ ''اوپر مار دھاڑ چل رہی ہے اور وہاں کسی کا محفوظ رہنا مشکل ہے اس لیے تم یہاں موجود کام کرنے والی عورتوں کے پاس چلی جاؤ۔''

وہ ہراساں ہو گئی۔ ''اگر میں روشنی تک نہ گئی تو......''

''تم گھر والوں سے چھپ کر یہاں آئی ان کی عزت روندنے؟'' میرا لہجہ تلخ ہو گیا۔ ''ایسے کاموں کا انجام یہی تو ہوتا ہے۔''

''گھر والوں نہیں گھر والا تھا۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''اسے معلوم ہے میں یہاں آئی ہوں مجید کے ساتھ۔''

میں دنگ رہ گیا تھا۔ ''تمہارے شوہر کو پتا ہوتا ہے وہ بے غیرت کچھ نہیں کہتا۔''

''اسی کی وجہ سے تو میں اس حال کو پہنچی ہوں۔ شادی کے قابل نہیں تھا مگر میری زندگی برباد کر دی۔ اب میں گناہ کرتی ہوں۔'' اس کا لہجہ بھی تلخ ہو گیا۔

''گناہ کرنے سے بہتر تھا کہ تم اس سے طلاق لے لیتیں۔''

''وہ میرا پھوپھی زاد ہے تب میں اس سے محبت کرتی تھی اب طلاق لے کر اسے بدنام نہیں کر سکتی۔ شادی کے شروع کے دنوں میں لوگوں نے بہت باتیں بنائیں۔ مگر جب میرا بچہ ہوا تو سب کے منہ بند ہو گئے۔''

''تمہارے کتنے بچے ہیں؟''

''تین بچے ہیں۔'' اس نے کہا۔

میں نے گہری سانس لی۔ ''اس وقت تمہاری مدد نہیں کر سکتا۔ البتہ تم ان عورتوں میں جا کر چھپ جاؤ تو بعد میں تم یہاں سے نکل سکتی ہو۔ تم کہہ سکتی ہو کہ زیارت کے لیے آئی تھی اور ہنگامے کے بعد یہاں پھنس گئیں۔ اب جاؤ کیونکہ میرے علاوہ کوئی یہاں آیا تو کسی کو زندہ نہیں چھوڑے گا چاہے وہ ملازم ہو یا باہر سے آئی ہوئی کوئی عورت ہو۔''

وہ سہم کر اندر کی طرف بڑھی تو میں سیڑھیوں سے اوپر آیا۔ درگاہ کی عمارت کی فائرنگ رک گئی تھی مگر باہر فائرنگ کا ہنگامہ جاری تھا۔ ملنگ اور اس کے ساتھی تینوں فلور کلیئر کر کے نیچے آ چکے تھے میں نے نوٹ کیا کہ ان کی تعداد کم تھی چھ بندے غائب تھے۔ میں نے ملنگ سے ان کے بارے میں پوچھا تو اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ ''مارے گئے...... ہم نے بھی یہاں موجود چالیس کے قریب بندوں کو اڑا دیا ہے۔''

''چالیس؟'' میں چونکا۔ ''زیادہ لوگ تھے؟''

''عورتیں بھی تھیں کچھ کے ساتھ۔'' ملنگ نے جواب دیا۔ ''شدید فائرنگ کی وجہ سے سب ماری گئیں۔''

ان لوگوں کو کچھ کہنا بیکار تھا۔ وہ یہاں قتل و غارت گری کا پروگرام لے کر آئے تھے اور اب اس پر عمل پیرا تھے۔ ان سے کچھ کہنے کی بجائے اگلے مرحلے پر توجہ مرکوز رکھنے کی ضرورت تھی۔ ملنگ نے اپنے ساتھیوں کو تہہ خانے میں جانے کو کہا تو میں نے منع کر دیا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے وہاں چار تھے ان کو مار دیا ہے باقی ملازم عورتیں ہیں ان

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کو ان کے حصے میں بند کر دیا ہے۔“

”ہمیں حکم ہے یہاں موجود کسی فرد کو نہ چھوڑیں۔“ ملنگ نے کہا۔

”فی الحال تم میرا حکم مانو گے۔“ میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ”ہمیں فوری طور پر جنریٹر پر قبضہ کرنا ہے اور اسے تباہ کرنا ہے۔“

”جنریٹر سامنے باغ میں دائیں طرف جانی والی عمارت میں ہے۔“

سامنے کئی مسلح افراد تھے اور وہ مزاحمت کرتے۔ میں نے سوچا اور ملنگ سے کہا۔ ”اپنے چھ آدمی اوپری فلورز پر بھیجو وہ کھڑکیوں سے انہیں نشانہ بنائیں۔ یہاں سے ان پر حملہ کرنا مشکل ہے۔“

ملنگ کی سمجھ میں بات آگئی اور اس نے فوری اپنے چھ آدمی اوپر بھیج دیے۔ کچھ نے یہاں مورچے لگا لیے تھے۔ ہال میں لڑائی مشکل ہو گئی تھی کیونکہ یہاں زیادہ تر شیشے تھے اور گولیوں کی آمد و رفت آزادانہ جاری تھی۔ اس لیے قبروں والے احاطے میں مورچہ لگایا گیا اور کمروں میں کھڑکیوں سے جوابی کارروائی شروع کی گئی۔ ہمارا زیادہ زور باغ والی سمت تھا کیونکہ ہمیں جنریٹر تک پہنچنا تھا۔ ملنگ کے آدمیوں نے بلندی سے مرشد کے آدمیوں کو نشانہ بنانا شروع کیا۔ اس حکمت عملی نے باہر موجود مسلح افراد کو سماع ہال کی طرف جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ راستہ صاف ہو گیا تھا۔ اب ہمیں باہر جانا تھا میں نے کہا۔ ”میرے ساتھ تین آدمی چلیں۔“

باہر موت منتظر تھی اور ان میں سے کوئی رضاکارانہ طور پر مرنے کے لیے تیار نہیں تھا اس لیے ملنگ کے اشارے پر تین افراد با دلِ ناخواستہ الگ ہو کر میرے ساتھ درگاہ کے سامنے والے حصے سے نکلے اور ہم تقریباً زمین سے لگے ہوئے روش کے ساتھ کرانا کی باڑ کے عقب میں آ گئے۔ دشمن نے سماع ہال کی عمارت میں موجود تھا اور ہمیں دیکھ لیا گیا تھا کیونکہ فوراً ہی سماع ہال کی طرف سے ہم پر فائرنگ کی گئی تھی مگر کرانا باڑ کے پیچھے آنے کے بعد ہم نظروں سے محفوظ تھے۔ اگرچہ یہ باڑ گولیوں سے نہیں بچا سکتی تھی۔ دشمن بھی یہ بات سمجھ رہا تھا اس لیے ان کی طرف سے پوری باڑ پر فائرنگ کی جانے لگی۔ ایک گولی میرے پیچھے چلنے والے کے لیے پیغامِ اجل لے کر آئی۔ وہ ہلکی سی آواز کے ساتھ گرا اور ساکت ہو گیا۔ گولی نے اس کے سر میں سوراخ کر دیا تھا۔ گھٹنے رہ کر آگے بڑھنا بہت مشکل

تھا۔ میں نے پیچھے کرتے ہوئے کہا۔ ”سب لیٹ جاؤ۔“

باقی دو بھی لیٹ گئے اور ہم رینگ کر آگے جانے لگے۔ گولیاں رو در کر برس رہی تھیں۔ درگاہ کی طرف سے برابر کا جواب دیا جا رہا تھا۔ پھر سے سماع ہال کی جانب سے کچھ چیخوں کی آوازیں آئیں۔ ایسا لگ رہا تھا کہ مرشد کے کچھ آدمی اور نشانہ بن گئے تھے۔ اس کے بعد اس طرف سے فائرنگ کی شدت میں خاصی کمی آ گئی تھی۔ اب جنریٹر والا کمرہ ہم سے چند گز کے فاصلے پر تھا مگر یہ چند گز کھلی جگہ سے گزرتے تھے۔ یہاں نشانہ بننے کا شدید خطرہ تھا۔ مگر جنریٹر تک پہنچنا لازمی تھا۔ میں نے ان دونوں سے کہا۔ ”مجھے کور دو میں جنریٹر روم تک جا رہا ہوں۔“

”ٹھیک استاد۔“ ایک نے جواب دیا۔ وہ دونوں باڑ میں سے بنی ایک فٹ کی دیوار کے پیچھے مورچہ زن ہو گئے اور میں اچانک ہی اٹھ کر دوڑا۔ جب تک کسی طرف سے فائر ہوتا میں جالیوں والے کمرے کے دروازے تک پہنچ گیا تھا یہ لاک تھا مگر ایک جھٹکے برسٹ نے لاک والے حصے کے پرخچے اڑا دیے اور میں اندر گھس گیا۔ اس کے بعد عقب سے فائرنگ ہوئی تو مجھ پر اس کا اثر نہیں ہوا تھا۔ جنریٹر روم کو ہوا دار رکھنے کے لیے اس کی دیواریں جالی والی اینٹوں سے بنائی گئی تھیں۔ جنریٹر خاصا بھاری بھرکم تھا اور اسے چاروں طرف سے دھاتی چادر سے محفوظ کیا گیا تھا۔ میں نے اس کا معائنہ کیا اور پھر اس میں جانے والی ہیوی ڈیوٹی وائرز کو کھینچ کر توڑ دیا۔ مگر وائر بدلنا چند منٹ کا کام ہوتا ہے۔ جنریٹر کو مکمل طور پر ناکارہ بنانا تھا۔ پھر مجھے اس کے ایندھن کے ٹینک کا خیال آیا۔ یہ بیک وقت گیس اور پیٹرول سے چلنے والا جنریٹر تھا۔

اس کا ٹینک اوپری حصے میں تھا اس کا ڈھکن کھولا تو اس میں سے پیٹرول کی تیز مہک آئی۔ میں اس کا وہ پائپ تلاش کرنے لگا جو جنریٹر کو آئل سپلائی کرتا تھا۔ یہ پائپ خاصی مشکل سے ایک کونے میں ملا اور یہ دھات کا ثابت ہوا۔ میں نے پستول نکالا اور اس کی ضرب سے پائپ توڑنے کی کوشش کرنے لگا۔ اس دوران میں باہر ایک بار پھر فائرنگ کا سلسلہ تیز ہو گیا جو پہلے سست پڑ گیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ سماع ہال میں مرشد کے مزید دو بندے پہنچ گئے تھے۔ پستول کے دستے کی لگاتار ضربوں کے آگے دھاتی پائپ نے بالآخر شکست تسلیم کر لی اور وہ ٹوٹ گیا مگر اس سے پیٹرول نہیں نکلا تھا۔ میں پریشان ہو گیا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا؟ یہ لائن ٹینک سے آ رہی تھی۔ میں نے اپنے پاس موجود چھوٹی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نوبیل انعام یافتگان حاصل کرنے والے بزرگ حضرات

عمر	نام	شعبہ	تاریخ پیدائش
90 سال	لیونیڈ ہروچ	طبیعات 2007	21 اگست 1917
89 سال	لائیڈ شیپلے	معاشیات 2012	2 جون 1923
88 سال	ریمنڈ ڈیوس جونیئر	طبیعات 2012	14 اکتوبر 1914
88 سال	ڈورس لیسنگ	ادب 2007	22 اکتوبر 1919
87 سال	یوچیرو نامبو	طبیعات 2008	18 جنوری 1921
87 سال	وٹلے ایل گنزبرگ	طبیعات 2003	4 اکتوبر 1916
87 سال	پیٹن روس	علم الادویات 1966	5 اکتوبر 1879
87 سال	جوزف روٹبلٹ	امن 1995	4 نومبر 1908
87 سال	کارل وون فرش	علم الادویات 1973	20 نومبر 1886
85 سال	فرڈینڈ بیسن	امن 1927	20 دسمبر 1841
85 سال	جون بی فین	علم کیمیا 2002	15 جون 1917
85 سال	تھیوڈور ممسن	ادب 1902	30 نومبر 1817

ٹارچ سے لائٹ کے اوپری حصے میں روشنی ڈالی تو مجھے ایک چھوٹا سا والو نظر آیا۔

اسے گھمانے ہی تیل کی پتلی سی دھار تیزی سے بہنے لگی تھی۔ فی الحال یہ جنریٹر جنریٹر کے اندر جمع ہو رہا تھا مگر جلد یہ بہتے ہوئے باہر بھی آ جاتا۔ اب مجھے یہاں سے نکلنا تھا اور دروازے سے نکلنا آسان نہیں تھا مجھے یقین تھا وہاں کئی ہتھیار بردار میرے انتظار میں مستعد ہوں گے۔ ان کے ہونے ہوئے رسک بہت زیادہ تھا۔ میں نے کمرے کا جائزہ لیا اور پھر ایک طرف .... لوہے کی بھاری راڈ رکھی تھی۔ جو اصل میں جنریٹر کو اٹھانے والے جیک کا لیور تھی۔ اسے اٹھا کر تولا اور پھر ایک طرف جالیوں پر مارا۔ اس کا خاطر خواہ اثر ہوا اور جالی کا ایک حصہ ٹوٹ کر گر گیا تھا۔ میں نے فوری اس حصے پر طبع آزمائی شروع کر دی جہاں سے یہ کمرا ساتھ ہال کی طرف سے کی جانے والی فائرنگ سے محفوظ تھا۔ بھاری راڈ اور میری قوت کے آگے سیمنٹ سے بنی ہوئی جالیاں ٹھہر نہ سکیں اور مشکل سے دو منٹ میں اتنا بڑا سوراخ کر لیا جس سے میں باہر جا سکتا تھا۔ لیکن باہر جانے سے پہلے میں نے اپنے ساتھیوں کو آواز دی۔

"میں باہر آ رہا ہوں مجھے کور دو۔"

"آ جاؤ استاد۔" ان میں سے ایک بولا۔ میں باہر نکلا اور پھر پلٹ کر فرش پر پھیلے پٹرول پر پستول سے فائر کیا۔ گولی کی حدت نے پٹرول کو آگ دکھا دی اور میں بھاگا۔ کمرا کی باڑ کے دوسری طرف چھلانگ لگائی اور جیسے ہی زمین پر گرا جنریٹر میں دھماکا ہوا۔ کمرے نے دھماکے کی شدت کو کم کیا تھا مگر پھر بھی اس کے اثرات ملبے کے ٹکڑوں کی صورت میں باہر تک آئے تھے۔ اب کمرے میں آگ بھڑک رہی تھی۔ جنریٹر ناکارہ ہو گیا تھا۔ سے ہال کی جانب سے فائرنگ میں شدت آئی تھی مگر ایک منٹ بعد اچانک ہی درگاہ کی ساری روشنیاں غائب ہو گئیں۔ داخلی کے باہر موجود آدمیوں نے کام شروع کر دیا تھا انہوں نے بجلی کاٹ دی تھی۔ ہم تینوں اب واپس درگاہ کے مرکزی دروازے کی طرف رینگ رہے تھے۔ تاریکی میں گولیوں کے شعلے نظر آ رہے تھے۔ ان میں سے بعض ہمارے سروں کے اوپر سے بھی گزر رہے تھے۔ ایسا ہی ایک شعلہ مجھ سے آگے آدمی کے سر میں آ کر بجھ گیا اور وہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ درگاہ کا دروازہ ابھی کوئی بیس گز دور تھا۔ اپنے ساتھی کو مرتے دیکھ کر دوسرا اشخص خوف زدہ ہو گیا۔ اس کا حوصلہ جواب دے گیا اور وہ یک دم اٹھ کر بھاگا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"اے رک جاؤ۔" میں نے کہا لیکن اس سے پہلے ہی ایک برسٹ آ کر اس کی ٹانگوں کو چھلنی کر گیا۔ وہ نیچے گرا اور چیخنے دھاڑنے لگا۔ نئے سماع ہال کی جانب سے توقع سے زیادہ مزاحمت ہو رہی تھی۔ میرے ساتھ آنے والے متعدد افراد اس طرف سے فائرنگ کا نشانہ بن چکے تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب کیا کروں۔ مشکل سے ایک فٹ اونچی یہ منڈیر مجھے کب تک بچاتی جب کہ فائرنگ خاصی بلندی سے بھی کی جا رہی تھی۔ چند گولیاں میری طرف آئیں تو مجھے منڈیر کے ساتھ دبکنا پڑا تھا۔ میری طرف سے فائرنگ کا مطلب ہوتا کہ میں خود دشمن کو اپنی لوکیشن سے آگاہ کر دیتا۔ میں اسی طرح خاموشی سے چھپ کر آگے بڑھ سکتا تھا۔ اس دوران میں آس پاس اِکا دُکا روشنیاں نظر آنے لگی تھیں۔ سیاہ ابر جیسی لائٹس تھیں یا پھر کچھ جگہوں پر بوتلیاں ایسی لگے ہوئے تھے۔ کہیں کہیں ٹارچ کی روشنی بھی لہراتی تھی مگر مشکل سے چند سیکنڈ کے لیے کیونکہ میں کوئی ٹارچ روشن کر کے موت کو دعوت دینا نہیں چاہتا تھا۔

نئے سماع ہال کی جانب سے درگاہ کے دروازے پر فائرنگ کا زور تھا پھر اندر سے بھی جوابی فائرنگ جاری تھی اور ایسے میں دروازے سے گزرنے کا مطلب دنیا سے بھی گزرنا ہو سکتا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اب پیچھے کی طرف کھسکوں ورنہ آگے بہت مشکل لگ رہا تھا۔ پیچھے کھسکتا تو اس چار دیواری کی طرف جاتا جس کے پار مرشد کی رہائش گاہ تھی۔ پتا نہیں فاضلی اپنے گرگوں کے ساتھ کہاں تھا۔ اگرچہ اس طرف سے بھی فائرنگ کی آوازیں آ رہی تھیں مگر وہ بہت زیادہ نہیں تھیں۔ زیادہ زور درگاہ اور نئے سماع ہال کے درمیان فائرنگ کا تھا۔ غیبی سمت بھی شاید فاضلی کے ساتھ آنے والے صاف کر چکے تھے کیونکہ اس سمت سے فائرنگ کی آواز نہیں آ رہی تھی۔ میں سوچ رہا تھا۔ کیا کروں کہ اچانک شوں کی تیز آواز آئی اور نئے سماع ہال کے اوپر سے ایک شعلہ لپکا اور ماحول یک دم روشن ہو گیا۔ میں جو منڈیر سے ذرا اوپر تھا اور جھانکتا دشمن کو نظر آ سکتا تھا تیزی سے دوبارہ منڈیر تلے دبک گیا۔

"لعنت ہو۔" میرے منہ سے نکلا کسی نے یہ روشنی کا گرنیڈ فائر کیا تھا جو بہت تیز سرخ روشنی دے رہا تھا اور اس نے باغ کو دن کی طرح روشن کر دیا تھا۔ فوراً سماع ہال کی طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور منڈیر کو ادھیڑنے لگی جس کے پیچھے میں چھپا ہوا تھا۔ گولیاں تقریباً چھو کر جا رہی تھیں۔ پتا نہیں میں کیسے بچا ہوا تھا؟ پھر دوسرا گرنیڈ کونسی کی طرف سے فائر ہوا اور اس طرف کا حصہ بھی روشن ہو گیا۔ مرشد اتنی آسانی سے ہتھیار ڈالنے والوں میں سے نہیں تھا حالانکہ ہم اس کی سپاہ کا بڑا حصہ موت کے گھاٹ اتار چکے تھے۔ مگر اس کے پاس شاید ہمارے اندازے سے زیادہ افراد تھے۔ فاضلی بے خبر تھا کہ اس کے پاس یہ فوجی استعمال کے روشنی والے گرنیڈ بھی تھے۔ یہ کئی منٹ تک مسلسل بہت تیز روشنی دے سکتے تھے۔ پانچ منٹ بعد اس کی روشنی ہلکی پڑنے لگی۔ تو میں تیزی سے واپس جنریٹر روم کی طرف گیا میں اس کی آڑ لے لیتا تو سماع ہال کی طرف سے کی جانے والی فائرنگ سے خاصی حد تک محفوظ ہو جاتا۔

ملنگ اور اس کے ساتھی درگاہ کی عمارت میں تھے۔ ان کی کوشش تھی کہ سماع ہال والوں کو وہیں تک محدود رکھیں اور انہیں کوٹھی کی طرف نہ جانے دیں۔ انہیں میری قطعی پروا نہیں تھی کہ میں دونوں طرف کی فائرنگ کے بیچ میں پھنسا ہوا تھا اور کسی لمحے ایک گولی میری زندگی کا خاتمہ کر سکتی تھی۔ میں سرکنے میں مصروف تھا کہ اگلا گرنیڈ فضا میں بلند ہوا اور اس بار یہ درگاہ والی عمارت کے عین اوپر تھا اس لیے پوری عمارت اور آس پاس کی جگہ روشنی میں نہا گئی تھی۔ اس بار بھی میری پوزیشن دیکھ لی گئی اور نئے سرے سے گولیوں نے میرا رخ کیا تھا۔ یہ بڑے نازک لمحات تھے اگر میں ذرا بھی بے صبری کا مظاہرہ کرتا تو ملنگ کے ساتھیوں کی طرح مارا جاتا۔ میری بچت دبکے رہنے میں تھی۔ پھر کسی نے اوپر سے دستی بم اچھالا اور وہ مجھ سے کچھ دور گرا تھا۔ میں نے بروقت اسے گرتے دیکھ لیا اور منڈیر کے ساتھ چپک کر کانوں پر ہاتھ رکھ لیا۔ بم زیادہ دور نہیں تھا وہ منڈیر بھی اڑا سکتا تھا مگر میرے پاس بچنے کا موقع ہی نہیں تھا دھماکے نے جیسے مجھے جھنجوڑ کر رکھ دیا اور سناک ویوز مجھے دھکیل کر روش میں کھلی جگہ لے آئی تھیں۔ میں نے سر پہ ہاتھ رکھ لیے تھے اس لیے سر بچ گیا تھا مگر دونوں ہاتھوں پر اڑتے سنگریزوں نے زخم ڈال دیے تھے۔ منڈیر کا اوپری حصہ اکھڑا تھا اسی لیے میں ادھڑنے سے بچ گیا تھا۔ مگر اب موت سامنے تھی۔ میں سماع ہال میں موجود افراد کے لیے کھلا نشانہ تھا۔ اٹھ کر بھاگنے کا فائدہ بھی نہیں تھا کیونکہ کہیں پناہ نہیں تھی۔

دو گولیاں آ کر میرے سینے پر لگیں اور میں دھچکے سے پیچھے گیا۔ ایک لمحے کو میرا سانس رک گیا تھا اور درد کی لہر نے مجھے تڑپا دیا تھا مگر بلٹ پروف نے میری جان بچا لی تھی۔ میں بے تابی سے اپنی طرف آنے والی نامعلوم گولی تلاش کر رہا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا۔ جب کہ اس دوران میں میرے آس پاس گولیاں برس رہی تھیں۔ رائفل نہ جانے کہاں چلی گئی تھی؟ ساغ بال کی طرف سے کم و بیش درجن بھر خودکار ہتھیار حرکت میں تھے۔ ان میں سے کم سے کم دو تو میری طرف مرکوز تھے۔ میں نے آخری کوشش کے طور پر اٹھ کر بھاگنے کی کوشش کی مگر ملبے کے ٹکڑوں سے پاؤں پھسلا اور میں بے ڈھنگے پن سے زمین بوس ہو گیا۔ مگر اس ڈھیر ہونے نے ایک بار پھر میری جان بچائی کیونکہ اگلا برسٹ میرے سر کے اوپر سے گزر کر دیوار پر لگا تھا اگر میں کھڑا ہوتا تو اس کا نشانہ بن گیا ہوتا۔ جب قدرت میری حفاظت کر رہی تھی تو اس مورچے سے فائدہ نہ اٹھانا حماقت ہی ہوتی۔

اس بار میں نے بھاگنے کی کوشش کی بجائے خود کو رول کیا اور قلابازیاں کھاتا ہوا جنریٹر کے جلتے کمرے کی طرف آیا۔ آخر کے چار پانچ گز میں نے کیسے طے کیے مجھے خود سمجھ میں نہیں آیا۔ میں دریچے سے کمرے کی دیوار سے ٹکرایا اور فوراً ہی دوسرا دستی بم آ کر کمرے کے دوسری طرف گرا تھا۔ دھماکے نے میرے عقب کے ساتھ کمرے کا ایک حصہ بھی اڑا دیا تھا۔ میرے حواس ٹھکانے آئے تو میں فاضلی کو سنا رہا تھا۔ وہ خبیث آدمی مجھے اس مشکل میں پھنسا کر خود نہ جانے کہاں غائب تھا؟ مجھے لگ رہا تھا کہ میں نہ جانے کب سے یہاں پھنسا ہوا تھا؟ میرے چاروں طرف آگ و خون کا یہ کھیل نہ جانے کب سے کھیلا جا رہا تھا؟ مگر جب آڑ میں آنے کے بعد میں نے گھڑی دیکھی تو ابھی صرف ایک بجا تھا مجھے باہر آئے ہوئے بیس منٹ سے زیادہ کا وقت نہیں گزرا تھا۔ رائفل گر جانے کے بعد اب میرے پاس صرف ایک پسٹول تھا میں نے اسے نکال کر چیک کیا اور پھر اپنا جائزہ لیا کہ کہاں کہاں زخم تھے؟

میرے بازو معمولی زخمی تھے ایک زخم سر کے اوپری حصے میں آیا تھا اور کچھ خون نکلا تھا باقی جسم صحیح سلامت تھا۔ بلٹ پروف پر لگنے والی گولیاں جیسے جیک کی تھیں اور یہ پسٹول کا فائر تھا اس لیے میری پسلیوں کی بچت ہو گئی اگر رائفل کی گولی ہوتی تو اس کا زور پسلی توڑ سکتا تھا۔ اپنی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد میں نے یہاں سے نکلنے کے امکانات کا جائزہ لیا۔ جنریٹر روم اور درگاہ کی عمارت کے درمیان تقریباً بیس گز کا فاصلہ تھا اور یہ جگہ عمارت کے کونے سے کوئی چالیس گز کے فاصلے پر تھی۔ عمارت کی طرف جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر میں کونے کی طرف جاتا تو مجھے با آسانی ساغ بال کی طرف سے نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ اب ایک طریقہ تو یہ تھا کہ میں اسی جگہ دبک کر انتظار کرتا کہ فاضلی کے آدمی ساغ بال کی مزاحمت کا خاتمہ کر دیں۔ مگر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گے یا نہیں۔ پھر مجھے بڑا خطرہ اب دستی بم سے تھا۔ میں گولیوں کی آڑ میں تھا مگر یہاں میرے سامنے کوئی دستی بم آ کر گرتا تو اس سے بچنے کے لیے کوئی آڑ نہیں تھی۔

ایسا لگا کہ ساغ بال میں بیٹھا ہوا کوئی شخص میری طرح سوچ رہا تھا اور اس نے دستی بم استعمال کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میری بے خبری میں ایک دستی بم آ کر جنریٹر روم کی جلتی چھت پر گرا اور دھماکے کے ساتھ چھت بھی بیٹھ گئی۔ مجھ پر ملبے کی بارش ہوئی تھی لیکن میں دھماکے کے براہ راست اثرات سے محفوظ رہا تھا۔ جب ملبا گر تا رکا تو میں نے کمرے کا جائزہ لیا اس کی بلندی جو پہلے بارہ فٹ تھی یک دم کم ہو کر سات آٹھ فٹ رہ گئی تھی اور یہ بھی دیواروں کی بلندی تھی کیونکہ چھت تو گر چکی تھی۔ چھت گرنے سے آگ بجھ گئی تھی اور اب اندر سے گاڑھا دھواں نکل رہا تھا۔ میں نے چلا کر ملنگ کو آواز دی۔ ”کہاں مر گئے ہو...... تم لوگوں سے یہ چند آدمی نہیں نمٹ رہے؟“

مگر ملنگ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آیا اس نے اگر سنا تو جواب دینا ضروری نہیں سمجھا وہ اس سے زیادہ ضروری کام کر رہا تھا یعنی ساغ بال میں موجود افراد کا مقابلہ اور ان کو کسی کی طرف جانے سے روکنے کا کام۔ دونوں طرف کے لوگ تقریباً محفوظ تھے بس میں درمیان میں پھنسا ہوا تھا۔ مجھے اپنے ساتھیوں کا خیال آیا ان کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہو گا کہ اس وقت میں کیسی صورت حال سے دوچار تھا۔ میرے چاروں طرف آگ و آہن کی بارش جاری تھی اور یہ سب میں ان کی خاطر برداشت کر رہا تھا۔ یہ سوچتے ہوئے میں چند لمحے کے لیے غافل ہوا تھا اور تیسرے دستی بم کو ذرا تاخیر سے دیکھا وہ جنریٹر روم کے ساتھ گرا اور لڑھکتا ہوا اس طرف آ گیا جہاں میں موجود تھا۔ اسے دیکھتے ہی میں حرکت میں آیا اور بہت تیزی سے سرک کر جنریٹر روم کی عقبی سمت گیا تھا کہ دھماکا ہوا اور میں بال بال بچا۔ فوراً ہی مجھے واپس آنا پڑا تھا کیونکہ اس طرف میں ساغ بال سے کی جانے والی فائرنگ کی زد میں تھا اور کچھ فائر ز بھی ہوئے تھے مگر وہ عجلت میں بلانشانہ لیے کیے گئے تھے۔

جہاں دستی بم گرا تھا وہاں اب گڑھا پڑا ہوا تھا۔ آدھے گھنٹے کی مختصر جنگ نے اس خوب صورت باغ کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا جسے بنانے میں برسوں لگے تھے۔ جگہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جگہ گڑھے پڑ گئے تھے چند درخت جڑوں سے اکھڑ گئے تھے اور پودے اور باڑیں تباہ ہو گئی تھیں۔ دونوں طرف کی عمارتوں کی خوب صورتی کا الگ ستیاناس ہو گیا تھا خاص طور سے درگاہ کی عمارت کا حشر ہو گیا تھا۔ میں اب جنگ اور اس کے ساتھیوں کو برا بھلا کہہ رہا تھا جو دستی بم استعمال کرنے والے کو کچھ نہیں کہہ رہے تھے اور وہ پوری آزادی سے مجھ پر دستی بم پھینک رہا تھا۔ ایک دو بار تو مجھ میں آ جاتا لیکن اس کے بعد اسے تاک کر نشانہ بنایا جا سکتا تھا۔ اس کے باوجود ملنگ اور اس کے ساتھیوں کی طرف سے ایسی کوئی کوشش نہیں کی گئی تھی۔ اب میں پوری طرح چوکنا تھا اگلا بم کسی طرف سے بھی آ سکتا تھا۔ ایسے میں تقدیر کے بعد صرف میری پھرتی ہی مجھے بچا سکتی تھی۔

جزیٹر روم سے سماع ہال کی عمارت تقریباً تیس گز کے فاصلے پر تھی میں نے اس کے دائیں طرف سے ایک لمحے کو جھانک کر دیکھا اور مجھے دوسری منزل کی ایک کھڑکی میں رائفل بردار شخص کا ہیولا دکھائی دیا۔ وہ درگاہ کی عمارت پر گولیاں برسا رہا تھا میں نے اچانک آڑ سے نکل کر اس پر پستول فائر کیے۔ میں نے تین گولیاں چلائیں اور واپس آڑ میں آ گیا لیکن اس دوران میں وہ ایک جھٹکے سے پیچھے گیا تھا اور اس کی رائفل خاموش ہو گئی۔ اب پتا نہیں اسے گولی لگی تھی یا وہ بچنے کے لیے پیچھے گیا تھا۔ لیکن اس کے بعد اس کی طرف سے فائرنگ نہیں ہوئی۔ اس طرف سے بس وہی فائرنگ کر رہا تھا باقی سب یا تو سماع ہال کی پچھلی کھڑکیوں سے فائرنگ کر رہے تھے یا پھر دوبائیں طرف کونے میں تھے۔ میں سوچ رہا تھا کہ اگر وہ میری گولی کا نشانہ بن گیا ہے اور اب یہاں کوئی نہیں ہے تو میرے پاس ایک موقع تھا کہ میں درگاہ کی عمارت کے کونے تک جا سکتا تھا اس کے بعد میں سماع ہال کی طرف سے محفوظ ہو جاتا۔ مگر یہ ایک مفروضہ بھی ہو سکتا تھا عین ممکن تھا کہ مرشد کا مرید کوئی آدمی یہاں موجود ہوتا تو اس صورت میں وہ مجھے آرام سے شوٹ کر سکتا تھا۔ یہ جاننے کے لیے کہ اس طرف کوئی تھا یا نہیں میں نے ایک سر کے سائز کا اینٹ کا ٹکڑا اٹھا کر اسے دیوار کی اوٹ سے باہر کیا اور فوراً ایک گولی آ کر اس پر لگی تھی۔ میرا ہاتھ بچ گیا تھا مگر دھچکے سے اینٹ گر گئی۔ اس طرف کوئی تھا اور وہ بڑی چالاکی سے خود کو چھپائے ہوئے تھا۔

دوسرا گرنیڈ بھی اب پھٹنے کے قریب تھا۔ یہ پیراشوٹ سے ہوا میں معلق ہو جاتا تھا اور شعلے کی گرمائش اسے نیچے آنے سے روکتی تھی۔ جیسے گرم ہوا کے غبارے میں بھری ہوا اسے نیچے آنے سے روکتی ہے۔ اگر یہ بجھ جاتا اور اس کے بعد مزید کوئی گرنیڈ فائر نہ کیا جاتا تو امکان تھا کہ میں بچ کر درگاہ کی عمارت کے بہاؤ تک پہنچ سکوں۔ مگر میری یہ آرزو دل میں ہی رہ گئی اس بار سماع ہال کی چھت سے دو گرنیڈ فائر کیے گئے اور ان کی مشترکہ روشنی نے اس جگہ کو بقعۂ نور بنا دیا تھا۔ پتا نہیں ان کے پاس کتنے گرنیڈ تھے۔ لیکن اس سے یہ فائدہ بھی تھا کہ اب کوئی دستی بم آتا تو میں اسے دیکھ سکتا تھا اگر روشنی نہ ہوتی تو دستی بم چپکے سے میرا کام تمام کر سکتا تھا۔ مسلسل فائرنگ نے جنریٹر روم کی اوپری جالی دار دیواروں کو بھی توڑ کر چھلنی کر دیا تھا اور اب صرف تین فٹ کی موٹی کنکریٹ کی دیوار ہی مجھے تحفظ دے رہی تھی۔ چھت گر جانے سے ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ کوئی دستی بم اندر گرا تو وہ یہ دیوار بھی گرا دے گا۔ اگرچہ اس دیوار تلے دب کر میرا مرنے کا امکان کم تھا مگر یہ مجھے شدید زخمی یا ناکارہ کر سکتی تھی۔

زندگی میں بہت کم ایسی سچویشن آئی تھیں جب میں اتنی بری طرح پھنسا تھا اور نکلنے کی کوئی راہ سجھ میں نہیں آ رہی تھی۔ ایک طرف سے دشمن گولیاں برسا رہے تھے اور دوسری طرف وہ دستی بم بھی استعمال کر رہے تھے۔ مجھے اصل خطرہ دستی بموں سے ہی تھا ورنہ گولیوں سے بچنا اتنا مسئلہ نہیں تھا۔ یہ بات دشمن بھی سمجھ رہا تھا اس لیے اس نے اس بار چالاکی سے کام لیا اور پہلے اس نے جنریٹر روم کے بائیں طرف باغ والے حصے میں ایک دستی بم پھینکا اور وہ لڑھکتا ہوا مجھ سے کوئی دس گز دور آ کر رکا تھا۔ میں کمرے کے دوسری طرف بھی نہیں جا سکتا تھا جہاں سماع ہال کا نشانے باز تاک میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس لیے میں منطقی طور پر جان ہتھیلی پر رکھ کر روش کی طرف لپکا اور چھلانگ لگا کر منڈیر کی دوسری طرف گرا اور اسی لمحے دھماکا ہوا۔ ایک بار پھر ملبے کی برسات ہوئی مگر میں بم کی براہِ راست ضرب سے محفوظ رہا تھا۔ ابھی ملبے کی برسات کم بھی نہیں ہوئی تھی کہ دوسرا دستی بم مجھ سے ذرا آگے روش کے ساتھ کیاری میں گرا۔ میں نے اٹھنے کی کوشش کی تو گھٹنے میں اٹھنے والی تیز ٹیس نے مجھے گرا دیا۔ گرتے ہوئے اس پر چوٹ آئی تھی۔ اس چوٹ نے مجھے معذور کر دیا تھا اور اب بم سے بچنے کا کوئی امکان نظر نہیں آ رہا تھا۔ میں نے بے ساختہ کلمہ شریف پڑھا۔ پھر ایک عظیم الشان دھماکا ہوا اور ساتھ ہی ایک دھماکا ہوا تھا۔

جاری ہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

بیت بازی

فارس

(سعید احمد چاند کراچی کا جواب)

فاروق شاہد.........کراچی

یا رب ترے کرم کی کوئی انتہا بھی ہے
جلنا ابھی کیا ہے شب نادار کا

اصغر تکلم.........شجاع آباد

یہ زنگ، جوہر دانش کو کاٹ جائے گا
مری لغت میں کچھ الفاظ معتبر ہیں ابھی

(طاہر گلزار پشاور کا جواب)

منشی محمد عزیز ے.........لندن

یہ جلوہ لب و رخسار یہ فسوں، یہ ادا
متاع حسن نظر ہے کہ دلفریبی شب

محمد سعید احمد چوہان.........نئی آبادی لندن

یہ مسکراتی آنکھیں یہ پنکھڑیوں سے لب
چومنے کے لیے دوپٹا بھی سرک آیا

(قاضی مشرف معروف حیدی کا جواب)

نیاز احمد.........لاہور

یہ زمانہ اس نے تو مجھ کو بدل کر رکھ دیا
اس کے بدلے کچھ زمانے کو بدلنا چاہوں میں

شیخ ریاض.........چیچوٹ

کبھی ہے رموز مسرت کبھی ہے شام نشاط
بجھی بجھی ہوئی کرنیں اڑا اڑا ہوا رنگ

انجل کمار دیوانی.........سکھر

یہ کیا طلسم ہے کیسی کشش ہے یارو
کوئی یہاں کا نہ ٹھہرا کبھی وہاں کے ہوئے

(طالب حسین عظمی ملتان کا جواب)

گلزار احمد زرانیں.........لندن

اٹھتی نہیں ہے آنکھ کسی اور کی طرف
پابند کر گئی ہے کسی کی نظر مجھے

(نوشین اکرم لاہور کا جواب)

شاہد جہانگیر شاہد.........پشاور

یہ کوچہ جاناں ہے سنبھلنا نہیں اچھا
آئی بہت کام یہاں لغزش پا بھی

(قاضی مشرف معروف حیدی کا جواب)

اقرم انعام.........لاہور

ان راستوں نے جن پہ ہم کامزن تھے دونوں
مجھے روک روک پوچھا تیرا ہم سفر کہاں ہے

(اکبر خان جتوئی جھنگ بہاولپور کا جواب)

مرزا ہادی بیگ.........حیدر آباد

تخلیق کائنات کے دلچسپ جرم پر
ہنستا ہو گا آپ بھی یزداں کبھی کبھی

(محمد عمران جوڑبلی کراچی کا جواب)

جبید خان.........کراچی

آخری شمع جھلملائی ہے
اور تصور سحر خدا معلوم

عنایت شیخ.........کراچی

اس کی کیا فکر کہ پروانے جلیں گے کہ نہیں
شمع سا آپ ہی جلنا ہے مرا کام وہی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ابرار قیس........حیدر آباد

اک بگولے کے سوا کچھ بھی نہ تھا
جس کو طوفاں کی ادا سمجھے تھے ہم

نصیر اشرف........لاہور

آنکھیں ہیں وسیلہ نہ ملاقات وسیلہ
اس تک مرا احساس بہ عنوان غزل جائے

(منشی خورشید احمد کنول لندن کا جواب)

ارشاد حسین........ملتان

یہ سمجھ لینا کوئی مشکل نہ تھا میرے لیے
درد کی پہچان کا رشتہ ہے کیا میرے لیے

واصف علی........رحیم یار خان

یہ کس زمانے کا بدلہ فلک تھا ہم سے کہ ہم
حریف کرب زدے دورِ ستم نشاں کے ہوئے

نصرت جاوید........شادی پور

یوں کسی سا بچا رہتا ہے احساب خام
جیسے گھر سے کہیں ہمسائے چلے جاتے ہیں

(رانا حبیب الرحمٰن کا جواب)

محمد عمران جونانی........کراچی

نہ تھی اپنے حال کی جب ہمیں خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر

(مرزا ہادی بیگ حیدر آباد کا جواب)

ایاز یاسین بھٹ........میرپور آزاد کشمیر

وہ روشنی ہے کہ ہر شے نظر سے اوجھل ہے
یہی روشنی ہے تو پھر اور تیرگی کیا ہے

اختر وفا........شیخوپورہ

وابستہ کیا ہم سے حصیر اس نے کسی کو
خمیازہ مگر ہم ہی یہاں جھیل رہے ہیں

ملک نوشین........حاصل پور

وہ نرا دشمن ہے، مارِ آستیں ہے، خنجر ہے
جس کے پیکر میں محبت کو نہاں سمجھا ہے

بلقیس نفر........جھنگ

وہ رضا جس کو غزل میں تھی آپ ہی کی پھبن
واقعہ تھا اک زمانے میں اب افسانہ ہوا

(سعید احمد چوہان لندن کا جواب)

عرفان کھوسو........کوئٹہ

اغیار کو گل پیرہنی ہم نے عطا کی
اپنے لیے پھولوں کا کفن ہم نے بنایا

احمد سعید........سکھر

اف وہ بیگانہ نگاہوں کی کرم فرمائی
نظرتِ عشق بہ انداز جنوں نفرائی

نصرت جاوید خان........کراچی

آؤ کچھ دیر اندھیرے سے یوں ہی جی بہلے
رنگ پھیکا ہے چراغوں کا سحر ہو شاید

(پہاڑ ملکانی لاہور کا جواب)

بتول اصغر........جھنگ

زندگی تشنہ بھی ہے بے رنگ بھی لیکن سرور
جب تلک چہرہ فروغ سے تابندہ نہ ہو

(ناہید صفدر حیدر آباد کا جواب)

محمد بشر........لنڈن وبازی

ان کے ہونٹوں پہ ہے اس طرح تبسم کی اُمید
جیسے کھلتی ہے کلی جیسے سحر ہوتی ہے

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدِنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے

کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 نومبر 2014 تک علمی آزمائش 108 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ "بیت بازی" شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کرسکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شامل اشاعت کرلیں

(شعر الگ کاغذ پر ہے)

68

مقابلہ بیت بازی

پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

اگر آپ کو

ماہنامہ جاسوسی ڈائجسٹ

ماہنامہ سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ پاکیزہ، ماہنامہ سرگزشت

کے حصول میں دقت پیش آرہی ہے یا آپ کو اپنے علاقے کے بک اسٹال سے کوئی شکایت ہے اور آپ کے علاقے میں بروقت پرچہ نہیں پہنچ رہا تو

شکایت فیکس کریں

مندرجہ ذیل ٹیلی فون نمبروں پر بھی رابطہ کرسکتے ہیں

ثمر عباس 0301-2454188

سرکولیشن منیجر 35802552-35386783-35804200

فیکس نمبر 35802551

جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز

63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی

فون: 35895313 فیکس: 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

علمی آزمائش 108

ادارہ

[illegible]

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر بار اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجنا ہے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قارئین "یک سطری سرگزشت" کے عنوان سے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سے پوسٹ کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 دسمبر 2014ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

1930ء میں بھمبر کرن میں پیدا ہوئے۔ قیام پاکستان کے بعد ہجرت کر کے اوکاڑہ آ گئے۔ مولانا غلام علی اوکاڑوی کے شاگرد رہے۔ 1965ء کی جنگ کے وقت علامہ عبدالحامد بدایونی کے ساتھ مختلف محاذوں پر تشریف لے گئے۔ 1970ء کے انتخابات کے وقت کراچی سے قومی اسمبلی کا انتخاب لڑا۔

علمی آزمائش 105 جواب

قرآن پاک میں نہر سوئز کے قریب واقع بحر نامی سمندر کا ذکر آیا ہے۔ سورہ اعراف آیت 16، یونس 5-4-2، القصص 4-1 میں مذکور ہے۔ اس وقت کے لوگوں کے لیے یہ نام حیرت انگیز تھا مگر آج سائنس کہتی ہے کہ دنیا بھر کے سمندر میں سب سے ٹھہرا ہوا پانی یہاں ہے اور اسی وجہ سے اس کا یہی نام ہونا چاہیے۔

انعام یافتگان

1۔ سید ناصر جارچوی۔ کراچی
2۔ تہمینہ بٹ۔ میرپور آزاد کشمیر
3۔ زاہد خان۔ سکھر
4۔ نعمان سونگی۔ بہاولپور
5۔ زیشان اکمل۔ ٹھٹھہ

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے شمائل ناظمی عابدی، زینت اکرام، تہمینہ یاسمین، اکبر خان، کنول زہرا، امداد علی خان، محسن صدیقی، ابرار احمد، ثنا اللہ، کاشف زیدی، زبیر اختر قادری، امداد رضا عطاری قادری، نیاز برکھیو، فخر زین، محمد خالد، اظہر حسین، نیاز احمد، فرحت عدنان، اسلم ملک، جعفر بتول، سعد بیگ، صوبے دار ملک ریاض، کوثر پروین، فخ

WWW.PAKSOCIETY.COM

محمد خان۔ لاہور سے یوسف رحمانی، فرحت عدنان، کلیم اللہ وٹو، احمد جان، محمد افضل، خوشی طلعت، اسلم ملک، نور علی شاہ، ملک خورشید، ثناء اللہ بخاری، شاد علی، میاں احتشام، زاہد سلیم عرف گلو بٹ، احسان خان، شاہد و بتول۔ حیدرآباد سے افروز جہاں، کوکب جمیل، مہوش جان، نوید کاچوری، نوشین اختر، منیر حسن، نعمان انصاری، وحید خان، نیاز کھوسو۔ رحیم یار خان سے اجمل خان، جمال اختر، سرفراز مغل، امتیاز شیخ، مظہر بٹ، قیصرہ شاہ، عرفان محبوب، مظفر ریاض، افروز جہاں۔ سکھر سے نورین جمالی، شبیر شاہ، رضا خان، احسن ضیا، طاہر میر۔ میرپورخاص سے تانیہ فرید، نوید بھٹو، طاہر شاہ، گل نوخیز، اظفر تابم خانی، دوست محمد۔ ساہیوال سے ملک نور، خرم چودھری، نسین کھتیات، فوزیہ شیخ۔ بھکر سے طوبیٰ اسلم۔ اسلام آباد سے خالد آفریدی، زیب النسائی، فرحت رحمن، انور یوسف، راشد خان، فرحان احمد، باز خان آفریدی، کلیم الحسن، فریحہ مرتضیٰ، سید زاہد حسین زیدی، الواسطی شہزادہ اکبر، نعمان عباس، میثم عابدی، جعفر سعید انصاری، شمینہ گل عباس، ذیشان مصطفیٰ۔ راولپنڈی سے عرفان اللہ قادری، ظفر میثم، محمد حیات خان، نسیم صدیقی، شگفتہ گل، فیصل اقبال، ظفر ڈڈیال، سہیل احمد، یاسمین اختر، سلیم اللہ خان، نوید اقبال چشتی نظامی، نوید اسلم، حافظ محمد جہانگیر، ثناء ممتاز، شاہد خان، نسیم اللہ وسایا۔ چنیوٹ سے رباب زیدی، اختر شیخ، اقبال فریدی، سلمان کاظمی، وفا بروہی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے محمد کامل، ظہیر الدین، ایاز احمد۔ کمالیہ سے نعمان احمد۔ گوجرہ سے نعیم الدین۔ ملتان سے منیر مرزا، محمد منیب، خلیق الزماں، حسین کاظمی، ذیشان احمد، نعیم الدین، جام محمد مظفر، محمد فراز مغل، تہمینہ فراست علی۔ فیصل آباد سے فہیم الدین، محمد ذکا، فرحت ممتاز، قاری فصیح الدین قادری، محمد سراج، حکیم محمد فدا حسین، عالمگیر خان، محمد اظہر، مسرور قیصر، عنایت اللہ خان۔ ایبٹ آباد سے یاسمین فرحت۔ راجن پور سے غلام دستگیر، نعیم اللہ خان۔ مظفر گڑھ سے سکینہ ترین، مسرور حسین زیدی، فراز شیخ۔ کوٹ ادو سے وقاص علی (نواں شہر جمال) اظہر جمیل خان (رکن پور)۔ وہاڑی سے محمد سعید احمد (کرم پور روڈ لندن) نگر ارا احمد آرائیں، منشی عزیز بٹ (لندن)۔ امام بخش ملک، درویش شاہ، نعمت خان، دلنواز خان، اکرم حسین شیخ، اکرم جہاں، خواجہ محمد حسین، نسیم اللہ خان گنڈ، میاں (اسماعیل آباد) انصار حسین، سبط حسن گردیزی، فیکا کھلو، شہباز تسلیم، کلثوم ترین، کوثر پروین، اسد عمران، سعید احمد، طاہر پنڈی بھٹیاں سے مشیر احمد۔ بہاولنگر سے ارشد خان، حکیم اصغر، محبت باری، وزو حبیب خان۔ پشاور سے مظہر حسین (فقیر آباد) کامل حسن (حیات آباد) زر ولی خان، شیر گل خان، فدا حسین، رحیم اللہ داد۔ داود سے فہد علی بروہی۔ اٹک سے جانباز علی، اشرف الدین، ملک شفیق اعوان، عبداللہ خٹک، صداقت حسین، صالحہ منہاس۔ واہ کینٹ سے اقتدار حسین زبیری۔ حسین فرحت الاسلام محمد عاقل، ارشد سلیم، شاہد اسلام خان، نزاکت شاہین، عبدالقیوم، شہزادہ کمال مسرور، جویریہ فرحت اللہ، جنجوعہ خورشید، فاضل جتوئی، نعمت جوکھیو، محمد حافظ، یاسمین نسرین، اشرف، نزہت پروین، زینب فرید اصفہانی، کوکب نسیم۔ سوئی بلوچستان سے محمد اکمل قمر۔ فیصل آباد سے شفیق اسلم، منور سلیم، نصرت جہاں، عباس علی اصفہانی، خاقان خان، ڈرائیور، دلاور حسن، دلدار بخش، کاشف، شفیق خاقان، عرفان مروت، افشین اختر، زیب علی ملک، شفیق نعمان حسن، شازیہ احسن۔ سیالکوٹ سے بابر باسط، کائنات مرزا۔ سرگودھا سے ملک نوشین، اصغر سیدہ بانو صدیقی۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے اصغر حسین سید۔ ڈیرہ غازی خان سے اشفاق علی، کاجل، فرحت، نیاز اکبر حسین۔ نوشہرہ سے خیال زمان، شریف گل، فیصل آفاق۔ گجرانوالہ سے سید اعظم قادری، سکینہ امتیاز، عمیرا اکرم، عمر خان اچکزئی۔ ظہور الامین بنالوی، زینو کاشان، لاشاری، فاطمہ فرحت، نصرت اسماعیل، شبیر حسین، شیری، اسماعیل اچانک، امتیاز احمد، دانش عمار، یاسر محمد عابد، کیف سرمدی، گل باز خان، زیب النساء۔ قصور سے سکندر بخش، ملک صفدر، انعام اسلم شیخ، جاوید ترمذی۔ میانوالی سے انعام مہدی، اشرف چوکی۔ خانیوال سے اللہ وسایا، نعمت شاہ، ملک توقیر، عالمگیر حیدر بٹ۔ شجاع آباد سے سید محمد نقوی، اشرف ترین، زوبیہ اشرف۔ جہلم سے فرح حیدر پاشا۔ سبی سے اکبر شاہ۔ وہاڑی سے عباس اقبال حسن۔ لیہ سے خلیل احمد۔ میاری سے احمر جعفری۔

بیرون ملک پاکستان سے اقبال حیدر شیخ، عمر اسلم (العین۔ یو اے ای)، شفیع خان (دبئی یو اے ای)، محمد شہباز (ٹوکیو، جاپان)، سیدہ ممتاز مریم یوشی (جاپان)، ابریز حیدر (عمان، سعودی عرب)، صنوبر جمیل (ٹورنٹو، کینیڈا)، اجمل چشتی (تافتان، ایران)

☆☆☆

WWW.PAKSOCIETY.COM

احسان

محترم ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم!

لوگوں نے طوائف کو صرف طنز نشتر چبھانے کے لیے منتخب کرلیا ہے اسے بے وفا، پیسوں کی پجارن جیسے القاب سے نوازتے ہیں۔ کھلم کھلا اعلان کرتے ہیں کہ طوائف کبھی کسی کی نہیں ہوتی مگر میں آج خود اپنی حالاتِ زندگی بیان کررہی ہوں۔ فیصلہ آپ کو کرنا ہے کہ طوائف غلط ہوتی ہے کہ یہ معاشرہ۔

شادو

(لاہور)

میں ڈائجسٹ اور رسالے شوق سے پڑھتی ہوں اور ایک مصنف کے جملے نے مجھے مجبور کیا کہ میں اپنی زندگی کی کہانی سرگزشت کے قیمتی صفحات پر پیش کروں۔ ہمارے ہاں بہت سی کہانیوں میں طوائف کو موضوع بنایا جاتا ہے۔ میں نے ایسی بیشمار کہانیاں پڑھی ہیں لیکن میں نے محسوس کیا کہ لکھنے والے طوائف کو چاہے برا بنا کر پیش کریں یا اچھا بنا کر مگر وہ ہمیشہ اسے ایک خاص انداز میں پیش کرتے ہیں۔ وہ اسے انسان سے ماورا کوئی مخلوق سمجھتے ہیں۔ جیسے طوائف ہو جانا انسانوں کے قبیلے سے نکل جانے کے مترادف ہو۔ اکثر تو اس کردار کو بہ طور لطف کے پیش کرتے ہیں۔ جو ان سے ہمدردی رکھتے ہیں وہ بھی طوائف کو بہرحال عام انسان نہیں سمجھتے اور اس کا، اس کے احساسات اور جذبات کو صرف اسی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ مذکورہ مصنف نے طوائف کو سراسر زر پسند قرار دے دیا اور لکھا کہ اگر کسی طوائف کو شادی کرکے شریفانہ زندگی گزارنے کا شوق ہو تو وہ کسی امیر بوڑھے یا کسی جاگیرزادے کا انتخاب ہی کیوں کرتی کیا وہ کسی غریب آدمی کے ساتھ شریفانہ اور باعزت زندگی نہیں گزار سکتی؟

غالباً مصنف صاحب نے محض تخیل کے زور پر مذکورہ کہانی لکھ دی جس میں یہ جملہ بھی شامل تھا۔ انہوں نے کبھی اس طبقے کو نزدیک سے نہیں دیکھا یا دیکھا تو بس خاص رنگ میں دیکھا۔ ان کا یہ جملہ میرے دل پر لگا اور اسی وجہ سے میں نے آج بیس سال بعد فیصلہ کیا کہ اپنی کہانی دنیا کے سامنے پیش کروں۔ میری کہانی ایک طوائف کی کہانی ہے۔ مگر میں وہ سب بیان نہیں کروں گی جو عام طور سے اس موضوع پر لکھی جانے والی کہانیوں میں شامل ہوتا ہے۔ میں وہ بتاؤں گی جو مجھ پر اس وقت گزری جب میں نے توبہ کرلی اور شریفانہ زندگی گزارنے کا فیصلہ کیا۔

☆☆☆

میرے ساتھ کی لڑکیاں اور عورتیں کپ شپ میں یا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

خالص زنانہ مشاغل میں وقت گزارتیں اس وقت میں کسی کونے میں ڈائجسٹ لے کر بیٹھی ہوتی۔ ایک دن میں نے ایک ولی اللہ کی کہانی پڑھی وہ ڈاکو تھے اور ایک رات ڈاکا مارنے جا رہے تھے کہ ان کے کانوں میں اللہ کی کتاب کی ایک آیت پڑی جس کا مفہوم کچھ یوں ہے۔ ''ابھی گناہ گاروں کے لیے وقت نہیں آیا کہ وہ توبہ کرلیں۔''

وہ ولی اللہ یہ سن کر کانپ گئے اور رونے لگے توبہ کرلی۔ یہ قصہ پڑھ کر میری عجیب سی حالت ہوگئی۔ میں ڈاکو نہیں ہوں میں نے کسی کو لوٹا نہیں لیکن کیا میں گناہ کی زندگی بسر نہیں کر رہی ہوں۔ بے اختیار میرے آنسو بہنے لگے اور میں نے اللہ سے کہا۔ ''تیری یہ بندی ایسی گناہ گار ہے کہ اپنے طور پر توبہ بھی نہیں کرسکتی۔ ہاں احساس گناہ ضرور رکھتی ہے۔ اب تو ہی اسے گناہوں سے بچا۔''

دوسروں کو ذرا دیر سے احساس ہوا کہ میں رو رہی ہوں اور پھر سب میرے گرد جمع ہوگئیں۔ بات امیر بیگم تک پہنچ گئی۔ امیر بیگم اس کوٹھے کی مالکن تھی اور ہم اسی کے لیے کام کرتے تھے۔ اس نے مجھے بلالیا۔ ''شادو کیا بات ہے کیوں رو رہی ہے؟''

''میں نہیں جانتی تھی۔''

امیر بیگم بہت سخت عورت تھی جیسا کہ اس جیسی عورت کو ہونا چاہیے۔ اگر کوئی لڑکی یا عورت دھندے سے انکار کرتی تو وہ اس کی کھال ادھڑوا دیا کرتی تھی۔ اسے کسی پر ذرا بھی ترس نہیں آتا تھا اس لیے میں بتا بھی نہیں سکتی کہ میرے اندر کی کیا حالت تھی؟ خلاف توقع وہ نرم ہوگئی۔

''کسی نے کچھ کہا ہے مجھے بتا میں اس کی کھال کھنچوا دوں گی۔''

''کسی نے کچھ نہیں کہا ہے۔''

''ادھر آنے والے کسی آدمی نے کچھ کہا ہے؟''

''نہیں۔''

''تب یہ رونا دھونا۔'' اس نے کسی قدر چڑ کر کہا۔

''میں نہیں جانتی بس بیٹھے بیٹھے رونا آگیا۔''

''جا جا کر آرام کر، آج تیری چھٹی ہے، آرام کرے گی تو طبیعت ٹھیک ہوجائے گی۔''

یہاں چھٹی کا کوئی تصور نہیں تھا۔ ہم کمانے والی مشینیں تھیں اور ایک دن آرام کا مطلب تھا ہزاروں کا نقصان۔ امیر بیگم نے ہم سب کو بھاری قیمت پر خریدا ہوا تھا اور پھر اچھا خاصا خرچ کرتی تھی۔ اسے یہ سارا خرچ مع نفع کے وصول کرنا تھا اس لیے چھٹی نہیں ملتی تھی۔ ہاں کوئی بیمار ہو جاتی تو چھٹی ملتی تھی۔ میرا ابھی یہی خیال تھا کہ ایک دن کے آرام سے ٹھیک ہو جاؤں گی۔ مگر اگلے دن بھی یہی حالت رہی۔ بیٹھے بیٹھے اچانک خود بہ خود آنسو بہنے لگتے تھے۔ یہ کیفیت مستقل ہوگئی تو میں بھی پریشان ہوگئی۔ بات امیر بیگم تک جاتی تو وہ جلاد بن جاتی اور یہی بات ہے مجھے اس سے بہت ڈر لگتا تھا اس نے دوسری بار بلایا تو اس کے تیور خطرناک تھے۔ ''شادو یہ کیا ڈراما ہے؟''

''میں نہیں جانتی باجی۔'' میں نے سہم کر کہا۔ ''قسم سے میرا قصور نہیں ہے۔''

اس نے چڑ کر کہا۔ ''تو روتی ہے تو قصور کیا میرا ہے؟''

میں پھر رونے لگی۔ ''میں نے کہا، میں نہیں جانتی۔''

امیر بیگم کے تیور ذرا نرم ہوئے تھے۔ وہ اٹھ کر میرے پاس آئی۔ ''شادو سچ سچ بتا کیا بات ہے، ورنہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں تجھے کچھ نہیں کہوں گی۔“

تب میرے دل میں خیال آیا کہ شاید اللہ نے میرے لیے کوئی راستہ نکالا ہے اور جب ہی امیر بیگم نرم ہوئی ہے ورنہ وہ اس جذبے سے نا آشنا تھی۔ میں نے ہمت کر کے اسے سب بتا دیا کہ میں نے ڈائجسٹ میں کیا پڑھا تھا اور اس کا مجھ پر کیا اثر ہوا؟ امیر بیگم غور سے سن رہی تھی اور اس کے تاثرات عجیب سے ہو رہے تھے۔ وہ خاصی دیر خاموش رہی اور ٹہلتی رہی۔ میں پھر ڈر گئی کہ نہ جانے اس کا کیا ردعمل ہو؟ کہیں وہ اچانک بھولا کو بلا کر مجھے اس کے حوالے نہ کر دے۔ بھولا امیر بیگم کا خاص آدمی تھا اور تمام عورتوں اور لڑکیوں کی اس سے روح فنا ہوتی تھی۔ وہ تھا بھی پورا جلاد۔ میں سر جھکائے بیٹھی تھی کہ اچانک امیر بیگم نے پوچھا۔ ”تو کیا چاہتی ہے؟“

میں اچھل پڑی۔ ”کک......کچھ نہیں جی۔“

”دیکھ تیرے اندر کچھ ہے تبھی تو روتی ہے میں چاہتی ہوں تو رونا دھونا بند کر دے۔ یہ بھولے والا کام نہیں ہے ورنہ تجھے ابھی اس کے حوالے کر دیتی۔“

”میں سچ کہہ رہی ہوں۔“

”تو جا کر سوچ لے کہ تیرے آنسو کس طرح رک سکتے ہیں اور پھر مجھے بتا اگر ماننے والی بات ہوئی تو میں مان لوں گی ورنہ تجھے آگے کسی کو بیچ دوں گی میں مسئلے نہیں پالتی۔“ امیر بیگم نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ ”اب جا، اور جا کر سوچ۔“

میں سچ کہہ رہی تھی میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میرے آنسو کیسے رکیں گے۔ میں سوچتی رہی اور ہراساں ہوتی رہی کہ نہ جانے امیر بیگم مجھے آگے کہاں فروخت کر دے۔ آنسو رونا میرے اختیار میں نہیں تھا اور یہ بھی سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ آنسو کیسے روکوں، اس رات میں دیر تک جاگتی رہی حتیٰ کہ صبح ہو گئی اور اذانوں کی آوازیں آنے لگیں۔ اذان کے بعد کسی نے باہر اونچی آواز میں ریڈیو لگا دیا جس سے قرآن پاک کی تلاوت اور پھر ترجمہ و تفسیر آ رہی تھی۔ ترجمہ اور تفسیر پیش کرنے والے نے ایک حصے کی تفسیر یوں پیش کی کہ قرآن کریم پڑھنے اور اسے سمجھنے کی بڑی فضیلت ہے اور ہر مسلمان مرد و عورت پر فرض ہے کہ وہ قرآن پڑھے اور اسے سمجھنے کی کوشش کرے۔ تب مجھے خیال آیا کہ جب اللہ میرے لیے آسانی کر رہا ہے تو میں اس کی اتاری ہوئی آخری کتاب کیوں نہ پڑھوں۔

جب یہ خیال مجھے آیا تو مجھے بہت عجیب سا لگا کیونکہ یہ کوٹھا تھا یہاں قرآن پڑھنا تو دور کی بات ہے کوئی نماز بھی نہیں پڑھتا تھا۔ شاید ہمیں ٹھیک سے کلمہ بھی نہیں آتا تھا۔ یہاں دین اور اس کی باتوں کا کوئی گزر نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ کیا امیر بیگم میری یہ بات مانے گی، مگر میں نے سوچا کہ وہ مانے یا نہ مانے میں تو اپنی بات کر سکتی ہوں۔ ہو سکتا ہے اس سے مجھے سکون مل جائے اور میرے وقت بے وقت بہنے والے آنسو رک جائیں۔ صبح جیسے ہی امیر بیگم اپنے کمرے سے نکلی تو میں اس کے پاس پہنچ گئی۔ ”باجی آپ سے بات کرنی ہے۔“

وہ سمجھ گئی۔ ”ناشتے کے بعد آ جا۔“ اس نے حکم دیا اور جیسے ہی ناشتا کیا میں اس کے پاس پہنچ گئی۔ وہ بھی منتظر تھی اور جب میں نے اسے بتایا کہ میں کیا چاہتی ہوں تو اس کا منہ کھلا رہ گیا تھا۔

”تو قرآن پاک پڑھے گی یہاں؟“

”باجی میری سمجھ میں یہی آیا ہے شاید اللہ کا کلام پڑھنے سے مجھے سکون مل جائے اور میرے آنسو رک جائیں۔“

امیر بیگم سوچ میں پڑ گئی اور میری جان پر بن گئی کیونکہ اس نے کہا تھا کہ اگر بات نہ ماننے والی ہوئی تو وہ مجھے آگے فروخت کر دے گی اور مجھ سے جان چھڑا لے گی۔ وہ کچھ دیر سوچتی رہی پھر اس نے مجھ سے کہا۔ ”تو جا بعد میں بتاؤں گی۔“

میں اس کے کمرے سے نکل آئی اور اب مجھے انتظار تھا کہ وہ میرے لیے کیا فیصلہ کرتی ہے۔ عجیب بات ہے کہ اس کے سامنے میں خوف زدہ اور خدشوں سے مر رہی تھی مگر جب باہر آئی تو میرے اندر سکون سا آ گیا، مجھے لگا کہ میرے لیے جو بہتر ہوگا وہی ہوگا۔ اگلے دن جب فجر کے بعد سب پڑے سو رہے تھے تو بھولا نے مجھے بیدار کیا۔ بھولا پہلوان جیسی جسامت کا، صورت سے احمق اور سادہ نظر آنے والا شخص تھا مگر وہ ایسا بالکل بھی نہیں تھا۔ اسے دیکھ کر میں لرز اٹھی تھی اور جب اس نے حکم دیا۔ ”میرے ساتھ چل۔“

تو میں کانپتی ہوئی بستر سے اٹھی اور بہ مشکل چپل پہن کر اس کے ساتھ چل پڑی، اس نے مجھے روکا۔ ”کوئی چادر لے لے۔“

یہاں تو ہم دوپٹا بھی نہیں لیتے تھے ہاں کہیں باہر جانا ہوتا تو چادر لے لیتے تھے مگر اس کا مقصد بھی پردے سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

زیادہ خود کو چھپاتا تھا اور نہ جان پہچان والے تو ہر جگہ مل جاتے تھے۔ میں نے الماری سے چادر نکالی اور اس کے ساتھ جانے لگی تھی کہ اس نے پھر روک کر حکم دیا۔ ''اوڑھ لے اسے۔''

میں نے چادر اوڑھی۔ مجھے لگ رہا تھا کہ امیر بیگم نے شاید میرا فیصلہ یوں کر دیا تھا کہ مجھے کسی کے ہاتھ بیچ دیا تھا اور اب بھولا مجھے اس کے حوالے کرنے لے جا رہا تھا۔ مجھے میرے کپڑے اور دوسرا سامان لینے کی مہلت بھی نہیں دی گئی تھی۔ شاید مجھے کسی جانور کی طرح ایسے ہی بیچ دیا گیا تھا۔ میں غائب دماغی کی کیفیت میں اس کے ساتھ چلتی رہی اور اس وقت چونکی جب وہ مجھے خاص نشست گاہ میں لایا۔ یہ نشست گاہ کوٹھے کے باہر سے آنے والے ان لوگوں کے لیے مخصوص تھی جو تماش بینی یا عیاشی کی بجائے کسی اور مقصد کے تحت آتے تھے اور ہم عورتوں اور لڑکیوں کو وہاں جانے کی اجازت نہیں تھی۔ وہاں ایک شخص موجود تھا جو حلیے سے مولوی لگ رہا تھا۔ بادامی کرتا شلوار، شانے پر چارخانے والا کپڑا اور سر پر گول ٹوپی تھی۔ وہ نظریں جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔ بھولا نے کرخت لہجے میں کہا۔ ''مولوی یہ شادو ہے اسے پڑھانا ہے۔''

مجھے لگا جیسے مجھے شادی مرگ ہو جائے گا۔ میں کیا سوچ کر آئی تھی اور یہاں کیا نکلا تھا۔ امیر بیگم نے میری بات مان لی تھی اور اب یہ مولوی مجھے قرآن پاک پڑھانے آیا تھا۔ بھولا کہہ کر دہن کونے میں صوفے پر جا کر بیٹھ گیا۔ مولوی جوان تھا شاید ستائیس اٹھائیس برس عمر تھی، رنگ سانولا اور عام سے نقوش تھے جسم چھریرا اور قد درمیانہ تھا۔ وہ ایک طرف صوفے پر بیٹھا ہوا تھا اور درمیان میں چھوٹی سی میز پر قرآن پاک رکھا ہوا تھا دوسری طرف میرے لیے کرسی تھی۔ اس نے مجھے سامنے بیٹھنے کو کہا اور میں اسے سلام کر کے جلدی سے بیٹھ گئی۔ اس نے دھیمے لہجے میں پوچھا۔

''تمہارا وضو ہے؟''

''نہیں۔'' میں نے جھجک کر کہا۔

''وضو کرنا آتا ہے؟''

سچی بات یہ ہے کہ مجھے وضو بھی کرنا نہیں آتا تھا میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔ ''ٹھیک سے نہیں آتا۔''

''کوئی بات نہیں میں سمجھاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور پوری وضاحت سے مجھے بتایا کہ وضو کیسے کرتے ہیں۔ جب میں نے سمجھ لیا اور اسے بتا دیا تو اس نے سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے اب پہلے اس طرح سے وضو کر کے آؤ۔''

میں گئی اور اسی طرح وضو کر کے آ گئی۔ اس نے پہلے مجھے صحیح طریقے سے بسم اللہ پڑھنا سکھائی۔ مجھے پتا چلا کہ مجھے تو بسم اللہ بھی ٹھیک سے نہیں آتی ہے۔ آدھا گھنٹا مجھے اسی میں لگ گیا تھا اس نے مجھ سے کہا کہ میں دن بھر بار بار بسم اللہ دہراتی رہوں اس طرح میری بسم اللہ ٹھیک ہو جائے گی۔ پھر اس نے مجھے ٹھیک سے کلمہ طیبہ پڑھنا سکھایا۔ پہلا دن تو ان ہی دو چیزوں کی درستی میں گزر گیا۔ قرآن پاک کے لیے میری بے تابی محسوس کرتے ہوئے اس نے مجھے تسلی دی۔ ''مسلمان کو یہ دو چیزیں بالکل درست آنا ہیں تو اس کے لیے یہ بھی بڑی بات ہے۔ سمجھو کہ یہ بنیاد ہے اس کے بغیر کوئی عمارت نہیں بن سکتی۔''

''تو کل سے میں قرآن پاک پڑھوں گی۔''

''نہیں، ابھی نہیں نورانی قاعدہ پڑھنا ہوگا اس سے تلفظ ٹھیک ہوگا اور اس کے بعد قرآن پاک شروع کیا جائے گا۔ آج کے لیے اتنا ہی کافی ہے۔'' وہ کہتے ہوئے کھڑا ہو گیا۔ ''میرا نام عبدالصمد ہے تم مجھے قاری صاحب کہہ سکتی ہو۔''

''میرا نام شادواں ہے۔'' میں نے جھجک کر کہا۔

''ایک بات اور کل سے چادر کے ساتھ نقاب بھی لینا۔'' اس نے آہستہ سے کہا اور سلام کر کے چلا گیا۔ پہلے دن میں نے صرف چادر لی تھی اور میرا چہرہ کھلا ہوا تھا۔ وہ میرے سامنے تھا مگر اس نے ایک دو بار اچٹتی ہوئی نظر کے سوا میری طرف نہیں دیکھا تھا۔ مجھے بے پناہ خوشی تھی کہ میری خواہش پوری ہو گئی تھی مگر میں حیران تھی کہ عبدالصمد نے اس بدنام کوچے میں آنے کی جرأت کیسے کی۔ ٹھیک ہے وہ بالکل صبح سویرے آیا تھا اور اس وقت یہ پورا بازار سنسان اور سویا ہوا ہوتا ہے لیکن اس کی آمد و رفت چھپی تو نہیں رہ سکتی تھی۔ کسی ایک کو پتا چلتا تو سب کو علم ہو جاتا کہ وہ مجھے قرآن پاک پڑھانے آ رہا ہے اور رفتہ رفتہ یہ بات اس کے متعلق لوگوں تک بھی پہنچ جاتی۔ کسی مولوی کا یہاں آنا اتنا ہی عجیب سمجھا جاتا جتنا ایک بدنام عورت کا کسی مدرسے میں جانا عجیب ہو سکتا ہے۔

بھولا ہمارے ساتھ موجود رہا تھا اور اس کی موجودگی مجھے عجیب لگی تھی۔ وہ بھلا یہاں کس لیے بیٹھ رہا تھا اور اسے کیا خطرہ تھا؟ یقیناً اسے امیر بیگم نے کہا تھا کیونکہ بھولا بھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اس وقت سونے کا عادی تھا اور وہ بہت بیزاری صورت بنا کر بیٹھا ہوا تھا۔ میں یہاں سے باہر نہیں جا سکتی تھی۔ بازار والوں کے اپنے چوکیدار تھے جو ہر طرف پوری نظر رکھتے تھے۔ دوسرے دن بھی بھولا آیا اور تیسرے دن وہ کچھ دیر کے لیے باہر چلا گیا اس دوران میں وہ مجھ سے عبدالصمد سے کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ عبدالصمد مجھے پڑھاتا اور ایک گھنٹے بعد چلا جاتا۔ ایک ہفتے بعد بھولا نے مجھ سے کہا۔ ''میں ذرا کام سے جا رہا ہوں باجی پوچھے تو کہنا میں یہیں تھا۔''

میں نے سر ہلایا۔ انکار کی مجال نہیں تھی اس کے باوجود اس نے دھمکایا۔ ''اگر باجی کو پتا چلا تو تیری خیر نہیں ہو گی۔''

''میں نہیں کہوں گی جی۔'' میں نے اسے یقین دلایا۔

اس کے بعد سے میں اور عبدالصمد اکیلے ہی ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود اس کے انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ اس کی ہدایت پر میں دوسرے دن سے چہرہ بھی نقاب میں چھپانے لگی تھی اگرچہ اس سے مجھے بہت مشکل ہوتی تھی کیونکہ میں عادی نہیں تھی۔ اب عبدالصمد مجھے نورانی قاعدہ پڑھا رہا تھا۔ میں اتنی تیزی سے سیکھ رہی تھی کہ تقریباً ہر روز ایک تختی ختم کر دیتی تھی۔ دوسرے ہفتے میں نے سبق ختم کیا اور قاعدہ بند کیا تو عبدالصمد کھڑے ہونے کی بجائے خلافِ توقع بیٹھا رہا۔ اس نے کہا۔

''میں تم سے کچھ پوچھنا چاہتا ہوں۔''

مجھے کئی دن سے احساس ہو رہا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتا ہے اس لیے جب اس نے یہ کہا تو مجھے تعجب نہیں ہوا تھا۔ میں نے سر ہلایا۔ ''جی قاری صاحب۔''

میرا خیال تھا کہ وہ مجھ سے میرے یا میرے پیشے کے بارے میں پوچھے گا مگر اس نے غیر متوقع سوال کیا۔ ''تم قرآن کریم کیوں پڑھنا چاہتی ہو؟''

میں چند لمحے کے لیے خاموش رہی پھر میں نے کہا۔ ''میں نہیں جانتی۔''

اس نے تعجب سے کہا۔ ''ایسا کیسے ہو سکتا ہے انسان معمولی سے معمولی کام بھی کرتا ہے تو اسے پتا ہوتا ہے کہ وہ کیوں کر رہا ہے یہ تو دنیا کا سب سے بڑا کام ہے۔''

''پتا نہیں مجھے کیوں اندر سے تحریک ہوئی۔'' میں نے کہا اور پھر اسے بتایا کہ میں نے کیوں قرآن پاک پڑھنے کا سوچا۔ وہ سنتا رہا پھر اس نے کہا۔

''میرا اندازہ درست نکلا۔ اللہ نے تمہارے دل میں خیال ڈالا ہے۔ تم قرآن پڑھنا چاہتی ہو اور اب پڑھو گی۔ لیکن تم نے سوچا ہے کہ قرآن پڑھنا ہی کافی نہیں ہوتا بلکہ اس پر عمل کر کے انسان کو اپنی زندگی اللہ کے بتائے ہوئے اصولوں کے تحت گزارنا بھی لازمی ہے۔''

''میں سمجھتی ہوں۔''

''تب اس بارے میں سوچنا ضرور۔''

''بیکار ہے۔'' میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''میں ایک قیدی ہوں اپنی مرضی سے کچھ نہیں کر سکتی، یہ بھی ان لوگوں کی مہربانی ہے جو مجھے آپ سے قرآن پاک پڑھنے کی اجازت دی ہے۔''

''تب اللہ سے دعا کرو جس نے یہ آسانی کی ہے وہی آگے بھی آسانی کرے گا۔'' عبدالصمد نے کہا اور کھڑا ہو گیا۔ ''مگر اس پر سوچ ضرور، تمہیں خود کو بھی بدلنا ہو گا اور اپنی زندگی کو بھی۔''

عبدالصمد کے کہنے کی ضرورت نہیں تھی، میں اس پر سوچ رہی تھی مگر جتنا سوچتی اتنا ہی خیال آتا کہ میں بیچ بیچ بے بس ہوں۔ میں اپنی مرضی سے اس زندگی میں نہ تو آئی تھی اور نہ ہی اپنی مرضی سے اسے چھوڑ سکتی تھی۔ اس کے باوجود اس کی بات نے میرے ذہن میں ایک کھڑکی سی کھول دی۔ امیر بیگم نے مجھے قرآن پاک پڑھنے کی اجازت دی اور میرے لیے استاد کا بندوبست بھی کر دیا تھا مگر اس سے ہٹ کر اس نے مجھے کوئی رعایت نہیں دی۔ میرے شب و روز اسی طرح گزر رہے تھے جیسے ایک طوائف کے گزرتے ہیں۔ راتیں آنکھوں میں گزرتیں اور مجھے صبح سویرے ہی پڑھنے کی تیاری بھی کرنا پڑتی تھی۔ بس مہینے میں چند دن ہوتے تھے جب فطری مجبوری کی وجہ سے میں قرآن پاک نہیں پڑھ سکتی تھی اور مجھے ڈیوٹی سے بھی نجات مل جاتی تھی۔

لیکن اس روز عبدالصمد کی بات نے میرے ذہن میں ایسی کھڑکی کھول دی جس سے میں آشنا ضرور تھی لیکن میں نے اسے کبھی کھولا نہیں تھا۔ اس بند کھڑکی کے پیچھے سے باہر روشنی تھی۔ اب ایسا لگا جیسے یہ کھڑکی کھل گئی ہو میں سب محسوس کر سکتی تھی۔ تازہ ہوا اور دھوپ کی طرح جو بند کھڑکیوں سے بھی محسوس نہیں ہوتی ہیں۔ اگلے دن میں نے عبدالصمد سے پوچھا۔ ''اگر میں عمل کرنا چاہوں تو میں کیا کروں؟''

''یہ تمہیں سوچنا ہے کہ کیا صحیح ہے اور کیا غلط، پھر اس پر فیصلہ کرنا ہے کہ اب تم کیا کر سکتی ہو۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے التجا کی۔ ”آپ میری مدد نہیں کر سکتے۔“

عبدالصمد نے شاید پہلی بار غور سے مجھے دیکھا۔ ”میں اور کیا کر رہا ہوں، میں تمہاری مدد کے لیے تو آیا ہوں۔ لوگوں کو چھوڑو اگر میرے ساتھیوں کو پتا چل جائے کہ میں یہاں آرہا ہوں تو وہ مجھ سے ملنا چھوڑ دیں گے۔ محلے والے مجھے محلے سے نکال دیں گے۔ مجھے یہاں سے کچھ مل نہیں رہا ہے۔“

یہ میرے لیے انکشاف تھا کہ عبدالصمد بنا کسی فیس کے مجھے پڑھانے آیا تھا۔ واقعی وہ میری مدد کر رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ”تم یہ مت سمجھنا کہ میں جتا رہا ہوں۔ آدمی اچھا یا برا سب اپنے لیے کرتا ہے، میں بھی اپنے لیے کر رہا ہوں۔ میں تمہیں صرف پڑھا سکتا ہوں اور بتا سکتا ہوں کہ کیا ٹھیک ہے اور کیا ٹھیک نہیں ہے، فیصلہ کرنا اور اس پر عمل کرنا تمہارا کام ہے اور یہ تمہیں ہی کرنا ہوگا۔“

”مجھے ڈر لگتا ہے۔“

”انسان کو صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے کیونکہ تمام آسانیاں اور مشکلات اسی کی طرف سے آتی ہیں۔ کوئی انسان آپ کو نہ آسانی دے سکتا ہے اور نہ کسی مشکل میں ڈال سکتا ہے جب تک اس میں اللہ کی رضامندی شامل نہ ہو۔“

عبدالصمد کی یہ بات بھی میرے دل پر لگی تھی۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ ”میں یہ زندگی چھوڑنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ میری مدد کر سکتے ہیں؟“

عبدالصمد نے گہری سانس لی۔ ”میں کیسے انکار کر سکتا ہوں، میرے بس میں جو ہوا میں ضرور کروں گا۔“

ابھی عبدالصمد کے منہ سے جملہ پورا بھی نہیں نکلا تھا کہ اچانک بھولا اندر آیا۔ اس کے تیور خطرناک تھے اور اس نے شاید ہماری گفتگو سن لی تھی۔ اس نے گردن سے پکڑ کر عبدالصمد کو اٹھایا اور دھاڑ کر بولا۔ ”مولوی تجھے کہا گیا تھا اپنے کام سے کام رکھنا۔“

”میں اپنا کام ہی کر رہا ہوں۔“ اس نے خوف زدہ ہوئے بغیر کہا۔ ”یہی تو میرا کام ہے۔ لوگوں کو دین کے حوالے سے اچھا اور برا بتانا۔“

”تو نے اچھا دیکھ لیا ہے اب برا بھی دیکھ۔“ بھولے نے کہا اور میری طرف دیکھ کر غرایا۔ ”دفع ہو جا تجھ سے بعد میں پوچھوں گا پہلے اس مولوی کا دماغ درست کر دوں۔“

”ان کا کوئی قصور نہیں ہے۔“ میں نے گڑگڑا کر کہا۔“ میں نے پوچھا تھا تو یہ.....“

”تو جانی ہے باہر۔“ بھولا اتنی زور سے دھاڑا کہ میں ڈر کر وہاں سے نکل آئی۔ اوپر آتے ہوئے میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔ میں کمرے میں آئی اور بستر پر ڈھیر ہو گئی۔ میں سوچ سکتی تھی کہ بھولا جیسے ظالم نے عام سے عبدالصمد کا کیا حشر کیا ہوگا؟ اب اس کے بعد میرا کیا حشر ہوگا؟ میں یہ بھی جانتی تھی مگر اس وقت مجھے اپنی نہیں بلکہ عبدالصمد کی فکر تھی۔ وہ بے چارہ میری وجہ سے ان خطرناک لوگوں کے چکر میں آیا اور عتاب میں پکڑ گیا۔ دو گھنٹے بعد مجھے امیر بیگم نے طلب کر لیا اور اس کے تیور بھی خطرناک تھے اس نے مجھے دیکھ کر طنزیہ لہجے میں کہا۔ ”بن گئی ملانی، تیرا کیا خیال ہے میں بے وقوف ہوں۔“

”نہیں باجی.....“ میں نے کہنا چاہا۔

”چپ کر۔“ امیر بیگم نے پھنکار کر کہا۔ ”میری مہربانی کا غلط فائدہ اٹھایا ہے تو نے..... یہ سب چھوڑنا چاہتی ہے تو..... تجھے پتا نہیں کہ ایسی بات کرنے والیوں کا یہاں کیا حشر ہوتا ہے؟“

”سب پتا ہے۔“ میں نے سر جھکا کر کہا۔

”تب تجھے جرأت کیسے ہوئی مولوی سے یہ بات کرنے کی، یہاں سے بھاگنا چاہتی ہے۔ بھاگ بھی جائی تو تجھے پاتال سے نکال لانے۔ نہیں جانتی کہ ہمارے چنگل سے کوئی نہیں نکل سکتا ہے۔“

”جانتی ہوں سب جانتی ہوں۔“ اس بار میں نے ذرا حوصلے سے کہا۔ ”لیکن میں بھاگ نہیں رہی تھی اور نہ بھاگوں گی، لیکن اب یہ سب بھی نہیں کروں گی۔“

امیر بیگم کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ اس نے غرا کر کہا۔ ”تو پھر بھگتنے کے لیے تیار ہو جا۔“

میں تیار تھی مگر مجھے جو بھگتنا پڑا وہ میری سوچ سے بھی زیادہ تھا۔ دوسروں کو عذاب سے گزرتے دیکھنا اور پھر خود اسی عذاب سے گزرنے میں جو فرق ہے اسی فرق سے میں گزر رہی تھی۔ جسمانی تشدد، بھوک پیاس، ایک تنگ کوٹھری میں قید تنہائی اور رات کو اسی کوٹھری میں تین چار درندے آجاتے تھے۔ تکلیف اور اذیت کا ایسا سمندر تھا جو میرے چاروں طرف تھا اور اس سے کہیں نجات نہیں تھی۔ تین دن رات ... اسی طرح گزرے تو میں مرنے والی ہو گئی تھی۔ جتنے زخم جسم پر تھے اتنے ہی روح پر بھی لگے تھے۔ نہ ہونے کے برابر پانی ملا تھا اور خوراک کا ایک ذرہ بھی میرے منہ میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہیں گیا تھا۔ امیر بیگم ہر صبح آتی اور مجھ سے ایک ہی سوال کرتی تھی۔ جب میں خاموش رہتی تو وہ چلی جاتی اور اذیت کا نیا دور شروع ہو جاتا۔ چوتھے دن صبح میں نیم بے ہوشی کی کیفیت میں تھی کہ مجھے لگا جیسے کوئی میرے منہ میں دودھ ٹپکا رہا ہے۔ بھوک اور پیاس کی بے تابی مجھے ہوش میں لے آئی اور میں نے پلانے والے سے پیالا چھیننے کی کوشش کی مگر اس نے پیچھے کرلیا۔

"آرام سے..... آرام سے کہیں بھاگا نہیں جا رہا۔"

یہ رضیہ تھی اس جگہ کی سب سے پرانی عورت وہ بیس سال سے یہاں تھی اور اب چالیس کی ہو رہی تھی۔ بیس سالوں نے اسے کھنڈر کر دیا تھا اور اب اسے کوئی طلب نہیں کرتا تھا اس لیے وہ دوسرے کام کرنے لگی تھی اور اپنی جان چھوٹنے پر خوش تھی۔ میں نے ہاتھ روکا تو اس نے دوبارہ پیالا میرے منہ سے لگایا۔ "آہستہ پیا، تو نے تین دن سے کچھ کھایا نہیں ہے پیٹ برداشت نہیں کرے گا۔"

اس نے ایک پیالا مجھے خاصی دیر میں پلایا تو میں اس قابل ہوئی کہ اپنے پیروں پر کھڑی ہو سکوں لیکن میرے پاؤں کانپ رہے تھے۔ رضیہ مجھے سہارا دے کر امیر بیگم کے کمرے تک لائی۔ میں کھڑی نہیں رہ سکی تھی قالین پر ڈھیر ہو گئی۔ وہ اٹھ کر میرے پاس آئی اور جھک کر ذرا طنزیہ انداز میں کہا۔ "کیوں بی بی، دماغ درست ہوا؟"

"باجی بات دماغ کی نہیں دل کی ہے۔" میں نے ہمت کر کے کہا۔ "دماغ کب کا مان جاتا پر دل نہیں مان رہا۔"

"لگتا ہے تجھے تین چار دن کا ٹھکا اور لگانا پڑے گا۔"

"آپ مالکن ہو باجی، میرے بس میں ہوتا تو ایک دن میں مان جاتی پر یہ میرے بس میں نہیں ہے۔"

میرے جواب پر امیر بیگم کی پیشانی پر شکنیں آگئیں پھر اس نے کچھ کہا نہیں اور رضیہ کو حکم دیا۔ "اسے لے جا اور اس کا خیال رکھ۔"

رضیہ مجھے اپنے ساتھ اپنے کمرے میں لے آئی۔ اس نے پہلے گرم پانی سے میری ٹکور کی اور پھر جہاں جہاں زخم تھے وہاں مرہم لگا کر اس نے مجھے دوا دی تھی۔ دودھ کے ساتھ دوا لے کر میں سو گئی اور جب جاگی تو حالت بہت بہتر ہو رہی تھی۔ رضیہ نے بتایا کہ میں چوبیس گھنٹے سوتی رہی تھی۔ وہ بار بار دیکھتی تھی کہ میں مر تو نہیں گئی۔ مجھے خیال آیا کہ مر جاتی تو اس عذاب سے جان چھوٹ جاتی، مگر ابھی

مجھے بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ امیر بیگم نے جتنی مہربانی کرنی تھی کرلی اور اب وہ اپنے اصل روپ میں آگئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ چوبیس گھنٹے کے آرام کے بعد مجھے دوبارہ اسی کوٹھری میں ڈال دیا جائے گا مگر دوسرا دن بھی گزر گیا۔ زخم بھر رہے تھے مگر جسمانی کمزوری اور تکلیف تقریباً ختم ہو گئی تھی۔ تیسرے دن امیر بیگم نے طلب کیا تو مجھے خیال آیا کہ اب آرام ختم اور تکلیفیں شروع۔

امیر بیگم سنجیدہ تھی اس نے مجھ سے کہا۔ "تو نے کیا سوچا؟"

"کچھ نہیں باجی۔" میں نے بے بسی سے کہا۔ "میرے پاس سوچنے کو کیا ہے؟"

"فلسفہ نہ جھاڑ، یہ بتا تو مان رہی ہے یا نہیں؟" اس نے جھڑکا۔

مجھے ان تین دنوں کی اذیتوں کا خیال آیا تو میری روح تک لرز گئی تھی مگر جب میں نے سوچا کہ امیر بیگم کی بات ماننے کے بعد مجھے یہی سب کرنا ہوگا جو میں چھوڑ چکی ہوں تو میرے اندر حوصلہ آگیا۔ "نہیں جی میں کسی صورت اب یہ کام نہیں کر سکتی۔"

امیر بیگم نے مجھے غور سے دیکھا۔ "کام کا مسئلہ نہیں ہے تو جاتی ہے یہاں ایسے شوقین بھی آتے ہیں جو مزاحمت چاہتے ہیں اور اس کی زیادہ قیمت دیتے ہیں تجھے ان کے پاس بھی بھیج سکتی ہوں۔"

"میں نے کہا نا آپ مالکن ہیں، جو چاہیں کر سکتی ہیں پر میں راضی خوشی یہ کام نہیں کر سکتی۔"

امیر بیگم نے سگریٹ نکال کر سلگائی۔ "اچھا اگر یہ نہیں کرے گی تو پھر کیا کرے گی؟"

"پتا نہیں جی۔"

"یہاں سے نکل کر کہاں جائے گی۔"

"پتا نہیں۔"

"کس کے سہارے زندگی گزارے گی؟"

میرے پاس یہی جواب تھا کہ پتا نہیں۔ اس نے طنزیہ انداز میں کہا۔ "جب تجھے کچھ پتا ہی نہیں ہے تو اتنا بڑا فیصلہ کیسے کرلیا؟"

"باجی اللہ گواہ ہے میں کچھ نہیں جانتی اور نہ سوچا ہے۔"

"یہ بھی نہیں سوچا کہ تجھے کون اپنائے گا۔ یوں منہ اٹھا کر یہاں سے جائے گی تو دوسری نسریوں کے ہاتھ لگ جائے گی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور وہ تجھے ایک مہینے میں ہی مار دیں گے۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں۔"

"تب یہاں کیا کر رہی ہے؟"

"میں نے یہ نہیں کہا کہ مجھے یہاں تکلیف ہے بس اب میں اپنی مرضی سے یہ سب نہیں کر سکتی۔" میں نے جواب دیا۔ "اگر کسی اور کے ہاتھ لگی تب بھی اپنی مرضی سے نہیں کروں گی۔"

امیر بیگم ٹہلتی اور سوچتی رہی اور پھر مجھے جانے کا حکم دیا۔ دو دن سے میں رضیہ کے پاس تھی مگر کوئی مجھ سے میرا حال پوچھنے نہیں آیا تھا۔ صاف لگ رہا تھا کہ امیر بیگم کے حکم اور خوف سے کوئی میرے پاس بھی نہیں پھٹکے گا اور مجھے کسی کی پروا بھی نہیں تھی۔ میرے ذہن میں کوئی سوچ بھی نہیں تھی بس ایک خیال تھا کہ اب مجھے یہ زندگی نہیں گزارنی ہے اس کے علاوہ جو بھی ہو مجھے قبول ہوگا۔ دو دن اور گزر گئے۔ بس رضیہ تھی جو میری ذرا دیکھ بھال کر رہی تھی اور مجھ سے بات کر رہی تھی مگر اسے بھی زیادہ موقع نہیں ملتا تھا کیونکہ اسے بہت سے کام نمٹانے ہوتے تھے۔ دو دن بعد رضیہ نے مجھے صبح دو بجے جگایا اور امیر بیگم کا حکم دیا۔ میں جیسی ہوئی اس کے کمرے میں پہنچی تو خلاف توقع وہاں عبدالصمد کو پا کر حیران ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر مندمل ہوتے زخموں کے نشانات تھے۔ یقیناً اسے بھولا نے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ امیر بیگم نے بلا تمہید کہا۔

"شاداں اسے جانتی ہے؟"

"جی جانتی ہوں۔" میں ذرا حیران ہوئی۔

"یہ کیسا آدمی ہے؟"

"اچھے آدمی ہیں۔"

"اگر اس کے ساتھ ساری عمر رہنا پڑے تو رہ لے گی۔" امیر بیگم نے کہا تو میں منہ کھول کر رہ گئی۔

"جی بائی؟"

"میں کوئی پہیلی نہیں بوجھ رہی سیدھا سا سوال ہے۔" اس نے بیزاری سے کہا۔ "اس سے شادی کرے گی۔"

"شاداں کے جواب سے پہلے میں کچھ کہنا چاہوں گا۔" عبدالصمد نے مداخلت کی۔

"تو بھی کہہ دے۔" امیر بیگم نے مسخرانہ لہجے میں کہا۔

"میں بہت غریب آدمی ہوں ایک کمرے کی کوٹھری میں رہتا ہوں ایک وقت کھاتا ہوں تو دوسرے وقت کا پتا نہیں ہوتا۔ میری گزر اوقات بچوں کو قرآن پاک پڑھا کر ہوتی ہے۔ اس کی فیس بھی نہیں مانگتا جو دیتا ہے لے لیتا ہوں۔"

"اب بول۔" امیر بیگم نے مجھ سے کہا۔

"مجھے منظور ہے۔" میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ "مجھے بھوکا رہنا بھی منظور ہے اور کھلے آسمان تلے سونا بھی۔ پر آپ بھی جانتے ہیں میں کیا تھی اب نہیں ہوں لیکن میرا ماضی......"

"مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" عبدالصمد نے آہستہ سے کہا۔ "شاید میں ہی یہاں سب سے زیادہ گناہ گار ہوں۔ دوسروں کے بارے میں سوچنے والا میں کون ہوتا ہوں۔"

امیر بیگم نے اسی وقت ایک نکاح خواں بلوایا۔ میرا اور عبدالصمد کا نکاح پڑھوا دیا۔ اس کے بعد اس نے مجھے اکیلے میں بلوایا۔ اس نے کہا۔ "تو یہاں سے صرف ان تین کپڑوں میں جائے گی۔ باقی سب یہیں رہے گا۔"

"میں خود بھی کچھ نہیں لے جا رہی۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ مت سمجھنا کہ میں نے تجھے معاف کر دیا ہے۔" امیر بیگم غرائی۔ "یہ تیری سزا ہے اور جلد تجھے پتا چل جائے گا۔"

مجھے ہر سزا قبول تھی لیکن امیر بیگم کا مطلب کیا تھا اس کا پتا مجھے چند دن بعد ہی چل گیا جب ایک شام محلے والے ہمارے دروازے پر جمع ہوئے اور انہوں نے عبدالصمد کو گھیر لیا۔ کسی نے کہا۔ "اوئے مولوی تجھے شریف سمجھ کر محلے میں جگہ دی تھی اور تو یہ گند اٹھا لایا ہے۔"

"میں نے کیا کیا؟"

کسی اور نے فحش گالی دی۔ "چکلے کی گندگی گھر میں رکھی ہے اور کہتا ہے۔"

"وہ میری بیوی ہے۔" عبدالصمد نے تیز لہجے میں جواب دیا۔ "اس کے متعلق کسی کو بات کرنے کا حق نہیں ہے۔"

ایک چسکے لینے والے نے کہا۔ "مولوی ناراض کیوں ہوتا ہے تیری بیوی صحیح لیکن اس سے پہلے اس بازار کا مال نہیں تھی نہ جانے کتنوں کی بن بیاہی بیوی رہی ہے۔"

کوئی شوہر اپنی بیوی کے بارے میں ایسی بات نہیں سن سکتا چاہے بیوی میرے جیسا ماضی رکھنے والی کیوں نہ ہو۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

عبدالصمد اس سے الجھ گیا اور فوراً ہی چار پانچ افراد اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ میں باہر آئی اور اسے بچانے کی کوشش کی تو ان لوگوں نے مجھے بھی مارا۔ پھر ہمیں ایک دن میں محلہ چھوڑ کر جانے کی وارننگ دے کر چلے گئے۔ عبدالصمد کے کپڑے پھٹ گئے تھے اور ناک سے خون آرہا تھا میں اسے اندر لائی۔ اس نے کراہتے ہوئے کہا۔ ”شاہدہ تو باہر کیوں آئی؟“

”وہ تو تجھے مار رہے تھے۔“ میں نے روہانسے لہجے میں کہا اور کپڑے سے اس کے زخم صاف کرنے لگی۔ اگلی صبح محلے والے مسجد کے پیش امام کے ساتھ آئے اور پھر محلہ چھوڑ کر جانے کو کہا۔ عبدالصمد انہیں بتاتا رہ گیا کہ اس کی بیوی کا ماضی جو بھی تھا مگر اب وہ تائب ہو گئی ہے اور شریف عورتوں جیسی زندگی گزار رہی ہے۔ مگر وہ سننے کے لیے تیار نہیں تھے۔ پیش امام صاحب نے فرمایا۔ ”میاں نالی کا کیڑا کبھی بھی اپنی اصلیت بدلتا ہے۔“

”امام صاحب یہ آپ کہہ رہے ہیں جب کہ آپ دین کی سمجھ سب سے زیادہ رکھتے ہیں اور آپ اچھی طرح جانتے ہیں کہ گناہ گار کے بارے میں ہمارا دین کیا کہتا ہے؟“

امام صاحب شرمندہ ہو گئے تھے۔ ”وہ تو ٹھیک ہے میاں لیکن انسان کو اپنے آس پاس بھی دیکھنا پڑتا ہے۔“

”میں دو سال سے یہاں رہ رہا ہوں اور مجھے معلوم ہے میرے آس پاس کیا ہو رہا ہے۔“ عبدالصمد نے ذرا سخت لہجے میں کہا۔ ”میں گھروں میں جاتا ہوں بچوں کو قرآن پاک پڑھاتا ہوں مجھ سے زیادہ کون جان سکتا ہے کہ آج کل گھروں میں کیا ہو رہا ہے۔ اللہ کا شکر ہے میں اپنی بیوی سے مطمئن ہوں وہ اتنی ہی شریف اور باحیا ہے جتنی کہ کوئی دوسری بیوی ہو سکتی ہے۔ وہ میری عزت ہے اگر کسی نے اس کے بارے میں ایک لفظ کہا تو میں لڑوں گا مروں گا یا ماروں گا۔“

عبدالصمد کے لہجے سے مجھے خوشی ہوئی تھی کہ وہ کس طرح میرا تحفظ کر رہا تھا حالانکہ وہ کمزور تھا۔ پھر دوسرے بھی اس کے لہجے سے دب گئے۔ کل تک غرانے والے اب شرافت سے بات کرنے لگے۔ ”ٹھیک ہے تم نے اسے شریف بنالیا ہے مگر ہم برداشت نہیں کر سکتے کہ ہمارے محلے میں ایسی کوئی عورت رہے تم یہاں سے چلے جاؤ۔“

”میں یہاں سے صرف ایک صورت میں جاؤں گا جب مالک مکان مجھ سے مکان خالی کرنے کو کہے ورنہ کسی کو یہ اختیار نہیں ہے۔“

”وہ بھی کہہ دے گا۔“ کسی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”اپنا بوریا بستر تیار رکھو۔“

عبدالصمد اندر آیا تو فکرمند تھا اس نے مجھ سے کہا۔ ”شاہدہ مالک مکان بھی ان کی بات مانے گا وہ ہم سے یہ کوٹھری خالی کرالے گا۔“

”اللہ مالک ہے جس نے یہ جگہ دی ہے وہ آگے بھی جگہ دے گا اور میں نے کہا تھا تیرے ساتھ میں بھوکی بھی رہ سکتی ہوں اور آسمان تلے بھی رہ سکتی ہوں۔“

عبدالصمد نے محبت سے میری طرف دیکھا۔ ”میں جانتا ہوں پر میں تجھے مشکل میں نہیں دیکھ سکتا۔“

پھر نہ جانے کیا ہوا محلے والوں کا رویہ کسی قدر بدل گیا اور وہ اب ہمارے دروازے پر نہیں آتے تھے۔ ملنا جلنا تو پہلے بھی نہیں تھا مگر اب انہوں نے بالکل قطع تعلق کر لیا۔ پھر یہ ہوا کہ عبدالصمد جہاں جہاں بچوں کو قرآن پاک پڑھانے جاتا تھا وہاں سے اسے جواب ملنے لگا۔ وہ زیادہ جگہوں پر جاتا تھا اور محلے میں سب جگہوں سے اسے جواب مل گیا تھا اب صرف چار جگہوں پر جاتا تھا اور وہ کیونکہ محلے سے باہر تھے اس لیے ان کو پتا نہیں تھا ورنہ شاید وہ بھی جواب دے دیتے۔ آمدنی کا بڑا حصہ کم ہوا تو ہمیں کھانے کے لالے پڑ گئے۔ اب تک ہم کم ترین حالات میں بھی خوش تھے۔ اس دس بائی بارہ کی کوٹھری کے ساتھ چھوٹا سا صحن تھا جس میں ایک طرف لیٹرین سے متصل نلکا اور ایک طرف باورچی خانہ تھا۔ صحن کچا اور کمرے کا فرش سیمنٹ کا تھا۔ اس پر لکڑی کی ایک کھاٹ پر ہمارا بستر تھا۔ ہماری کل کائنات ایک ٹین کے صندوق میں تھی۔

کھانا نہایت سادہ ہوتا تھا معمولی دال سبزی بنا لیتی تھی جو دو دن چلتا تھا۔ چائے پینے کی عادت تھی اور نہ استطاعت۔ ہمارے تینوں وقت کے کھانے میں کوئی فرق نہیں تھا۔ اگر عبدالصمد کا کوئی جاننے والا آجاتا تو اس کے سامنے بھی رکھ دیتے تھے۔ کرایہ اور بل وغیرہ دے کر جو بچتا تھا اس میں یہ بھی مشکل سے ہوتا تھا۔ عبدالصمد کے پاس تین جوڑے تھے انہیں ہی بدل بدل کر پہنتا تھا۔ میں جن پھٹے ہوئے کپڑوں میں اس کے گھر آئی تھی اور اس نے مجھے تین چار معمولی سے سوٹ دلا دیے تھے ان میں بھی اس کی سادگی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جمع پونجی ختم ہوگئی۔ مگر میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ ہم اس میں بھی بہت خوش تھے ہمیں اس سے زیادہ کی خواہش نہیں تھی مگر لوگوں سے ہمارا سکون برداشت نہیں ہوا اور اب نوبت بچ بچ فاقوں تک آگئی تھی کیونکہ بچی ہوئی آمدنی سے تو مکان کا کرایہ بھی بہ مشکل دیا جاتا۔

شادی کے پہلے ہی دن عبدالصمد نے میرا سبق وہیں سے شروع کیا جہاں سے چھوٹا تھا۔ جب بھولا اسے ذبح کر لے گیا تھا اس نے عبدالصمد کو خود بھی مارا تھا بلکہ بازار کے چوکیداروں سے بھی پٹوایا تھا۔ اس کی زبانی یہ سب سن کر میرا دل دکھ رہا تھا۔ اس کا کوئی قصور نہیں تھا اور اسے بلاوجہ کی سزا ملی تھی۔ قصوروار تو میں تھی۔ تین دن میں امیر بیگم کے زیر عتاب رہی تھی اور اس نے دھمکی دی تھی کہ وہ عبدالصمد سے شادی کر کے بھی مجھے سزا دے رہی تھی۔ مگر یہ سزا مجھے قبول تھی البتہ عبدالصمد کی پریشانی نہیں دیکھی جاتی تھی پھر وہ اپنے لیے پریشان نہیں تھا اسے تو میری فکر تھی۔ وہ بہانے سے مجھے کھلا دیتا اور خود بھوکا رہ جاتا۔ وہ میری وجہ سے مشکل میں آیا لیکن اس نے ایک بار بھی مجھے طعنہ نہیں دیا شکوہ نہیں کیا۔ میرے ماضی کو اس نے یوں بھلا دیا جیسے وہ کبھی تھا ہی نہیں۔ مگر لوگ نہیں بھولے تھے۔

عبدالصمد کا تعلق جنوبی پنجاب کے ایک چھوٹے سے دیہات سے تھا۔ سیلاب میں اس کا پورا گھر بہ گیا اور وہ اپنے بھرے پرے گھر کا بچنے والا واحد فرد تھا۔ اس کے رشتے داروں نے اس کی زمین اور مکان پر قبضہ کر لیا اور اسے ایک یتیم خانے کے حوالے کر دیا۔ دس سال کی عمر میں وہ وہاں کے منتظموں کے ظلم و ستم سے تنگ کر فرار ہوا اور اس نے ایک مدرسے میں پناہ لے لی۔ خوش قسمتی سے مدرسے کے منتظمین کو اس پر ترس آگیا اور انہوں نے عبدالصمد کو مدرسے میں رکھ لیا۔ لازمی بات تھی کہ اس نے وہاں دینی تعلیم حاصل کی اور عالم کی سند لی گئی۔ مگر اس کی گزر اوقات قرآن پاک پڑھانے سے ہوتی تھی۔ ایک جاننے والے نے اسے لاہور بلا لیا۔ وہ چار سال سے لاہور میں تھا۔ جب تک مجھ سے شادی نہیں ہوئی تھی وہ سکون سے رہ رہا تھا اور گزر اوقات بھی ٹھیک سے ہو جاتی تھی۔ شادی کے بعد اس مشکلیں آنے لگی تھیں۔ ایک مہینے بعد ایک دن ایسا آیا کہ گزشتہ چوبیس گھنٹے سے ہم دونوں نے کچھ نہیں کھایا تھا اور میں رو رہی تھی۔ میں نے عبدالصمد سے کہا۔

''یہ میری وجہ سے ہوا ہے۔''

''اللہ کسی کی وجہ سے کسی پر مشکل نہیں لاتا۔'' اس نے مجھے تسلی دی۔ ''یہ اس کا احسان ہے کہ انسان اور مسلمان بنایا، جس حال میں چاہے رکھے۔''

''تو ٹھیک کہہ رہا ہے پر میرا دل بیٹھ رہا ہے۔''

''میں تو تیرے لیے پریشان ہوں میں نے بہت فاقے دیکھے ہیں پر تو تو آرام سے رہی ہے۔''

میں نے بلبلا کر کہا۔ ''لعنت ہو اس آرام پر اس سے تو فاقے کر کے مر جانا بہتر ہے۔''

''پر مجھے یقین ہے اوپر والا ہمیں یوں ضائع نہیں کرے گا۔''

عبدالصمد شام کے وقت کہیں باہر گیا۔ پانی پی کر گزارہ ہو رہا تھا اور اب پیٹ میں جیسے بل پڑنے لگے تھے۔ کچھ دیر بعد وہ خوش خوش آیا اس نے ہاتھ میں آٹا اور سبزی کے تھیلے پکڑ رکھے تھے۔ میں خوش ہو گئی۔ ''یہ کہاں سے ملا؟''

''ایک دوست مل گیا تھا پرانا اس سے ادھار لیا ہے۔''

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا اور جلدی سے کھانا بنانے لگی۔ عبدالصمد نے بتایا کہ وہ ایک جگہ کام کی بات بھی کر کے آیا ہے۔ آٹھ گھنٹے کی ملازمت تھی اور چار ہزار روپے مل رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ وہ جو قرآن پاک پڑھاتا ہے تو اس نے کہا۔ ''یہی بات ہے مجھے اچھا نہیں لگتا کہ قرآن پڑھا کر لوگوں سے فیس لوں۔ ملازمت سے جو وقت بچے گا اس میں تجھے اور دوسروں کو اللہ کے لیے پڑھاؤں گا۔''

میں اس سے متفق نہیں تھی مگر میں نے سر ہلایا۔ ''جیسے تو مناسب سمجھے۔''

اگلے دن سے عبدالصمد نے کام پر جانا شروع کر دیا۔ مجھے ایسا لگا کہ ہمارے مشکل دن شاید ختم ہو گئے تھے۔ محلے والے بھی اب خاموش تھے جیسے ہمیں ہمارے حال پر چھوڑ دیا ہو۔ میں گھر سے باہر نہیں جاتی تھی۔ شادی کے بعد سے ایک بار ہی عبدالصمد کے ساتھ گئی تھی اور پوری طرح پردے میں تھی۔ محلے میں کسی کے ہاں آنا جانا نہیں تھا۔ جب عبدالصمد نے ملازمت کی تو اس کے جانے کے بعد گھر کے کام کر لیتی اور پھر قرآن کا سبق دہراتی۔ نورانی قاعدہ ایک مہینے میں ختم کر لیا تھا۔ نماز سیکھ لی تھی اور مخصوص دعائیں یاد کر لی تھیں۔ چھ کلمے اور چاروں قل یاد کر لیے تھے اور اب تیسواں پارہ شروع کر دیا تھا۔ عبدالصمد جو سبق دیتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھا اسے دن بھر دہرانی اور شام کو جب وہ آتا اور کھانا وغیرہ کھا کر چاق و چوبند ہو جاتا تو اسے سناتی تھی۔ وہ میری سیکھنے کی رفتار سے خوش تھا اس نے ایک دن کہا۔

"شادو تو ذہین ہے۔ وہ سب جو میں نے سال میں جا کر سیکھا تھا جو تو نے دو مہینے سے بھی پہلے سیکھ لیا ہے اور میں نے استادوں کی بہت مار کھائی تھی۔"

"پھر بھی مجھے تو تو نے ہی سکھایا ہے نا۔"

"ہاں یہ میرا اجر ہے؟"

"اور مجھ سے جو شادی کی ہے؟"

"یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تجھے دیا۔" عبدالصمد نے کہا تو میں حیران رہ گئی۔

"تو سچ کہہ رہا ہے؟"

"ہاں جب شادی ہوئی تب مجھ سے میں بس اللہ واسطے نباہ رہا تھا مگر جب تو میری زندگی میں آئی تب پتا چلا کہ یہ تو اللہ کا انعام تھا۔"

اس روز میری طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ عبدالصمد کو کام پر بھیج کر آرام کر رہی تھی کہ کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ میں دروازے تک آئی اور پوچھا۔ "کون ہے؟"

"شادو جی ہم ہیں۔" کسی نے اوباشانہ انداز میں کہا۔

"یہاں کوئی شادو نہیں رہتی ہے۔" میں نے جواب دیا۔

"ارے دروازہ تو کھولو، ہم تمہارے پرانے پرستار ہیں۔ بہت وقت گزارا ہے تمہارے ساتھ......" اس نے کہا اور آگے بکواس کرنے لگا۔ وہ سب ناقابل بیان باتیں تھیں جو کوئی عورت برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ ممکن ہے میں اس جہنم کے کیچڑ میں پلی تو مجھ پر اثر بھی نہ ہوتا مگر اس وقت میں روتی ہوئی اندر چلی گئی اور کوٹھری کا دروازہ بند کر لیا۔ مگر اس کی منحوس آواز میرے کانوں تک آ رہی تھی۔ وہ بلند آواز سے چیخ چیخ کر بتا رہا تھا کہ ماضی میں وہ کیا کرتا رہا ہے۔ میں روتی رہی اور اللہ کو پکارتی رہی۔ وہی میرا محافظ تھا۔ پتا نہیں کس وقت مجھ پر غشی طاری ہو گئی اور جب مجھے ہوش آیا تو کوئی دروازہ پیٹ رہا تھا میں بہ مشکل اٹھ کر باہر آئی تو عبدالصمد آ گیا تھا۔ وہ بے چارہ بہت دیر سے دروازہ بجا رہا تھا اور فکرمند تھا۔ اس کے پیچھے محلے والے بھی تھے۔ اسے دیکھ کر میں پھر رو دی۔ وہ مجھے اندر لے کر آیا۔

"کیا ہوا شادو؟"

میں نے اسے بتایا کہ صبح کوئی آیا تھا اور اس نے دروازے کے سامنے اتنی بکواس کی تھی۔ عبدالصمد کا چہرہ غصے سے سرخ ہو گیا تھا مگر وہ کیا کر سکتا تھا الٹا محلے والوں نے اسے اور مجھے قصوروار ٹھہرایا تھا کہ ہم محلے کا ماحول خراب کر رہے تھے اور ہماری وجہ سے یہاں ایسے اوباش آ رہے تھے۔ عبدالصمد نے بھی محلے والوں کو سنا دیں کہ کیا وہ مر گئے تھے جو ایک شخص آ کر محلے کا ماحول خراب کر گیا اور وہ چپ کر کے سنتے رہے۔ اس پر کچھ فساد کرنے والوں نے عبدالصمد کو پھر میرا طعنہ دیا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔ "ہمیں یہاں نہیں رہنا ہے تو کہیں اور مکان دیکھ لے۔"

"مکان آسانی سے نہیں ملتا ہے۔" اس نے کہا۔ "تو کیا سمجھتی ہے میں نے تلاش نہیں کر دیا۔ میں کون سا خوشی سے یہاں رہ رہا ہوں جہاں لوگ مجھے یوں دیکھتے ہیں جیسے میں کوئی اچھوت ہوں۔"

"یہ سب میری وجہ سے ہے۔"

"نہیں شادو اس ملک اور معاشرے میں سب اسیر جہنم ہیں، یہاں کوئی اچھا کام نہیں کر سکتا اور جو کرتا ہے یہ لوگ اس کا جینا حرام کر دیتے ہیں۔" اس نے تلخی سے کہا۔ "ان کے اپنے گھروں میں کتنی گند ہے یہ مجھ سے پوچھو مگر یہ دوسروں پر کیچڑ اچھالتے ہیں۔ صرف اللہ کا خوف میری زبان روکتا ہے۔"

میں اس کے لیے کھانا لینے اٹھی تو مجھے چکر آ گیا اگر عبدالصمد نہ پکڑ لیتا تو میں گر پڑتی۔ وہ فکرمند ہو گیا۔ "شادو تجھے ڈاکٹر کے پاس لے چلتا ہوں۔"

"تیرے پاس پیسے کہاں ہیں؟"

"یہاں ایک اسپتال ہے وہاں ڈاکٹر فیس نہیں لیتا ہے۔" اس نے بتایا۔ "میں کھانا کھا لوں پھر تجھے لے چلتا ہوں۔"

چند انسانیت رکھنے والے ڈاکٹر یہ اسپتال چلا رہے تھے۔ مجھے لیڈی ڈاکٹر نے دیکھا اور کیفیت سن کر بولی۔ "میرا خیال ہے تم ماں بننے والی ہو۔"

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس خبر پر کیا ردعمل دوں۔ صبح سے رو رو کر میری خراب طبیعت مزید خراب ہو گئی تھی۔ گھر کے حالات سامنے تھے ایسے میں ایک اور فرد کی آمد آسان نہیں تھی۔ میں نے عبدالصمد کو بتایا تو وہ خوش ہو گیا۔ "سچ کہہ رہی ہے شادو؟"

"ہاں ڈاکٹر نے شبہ ظاہر کیا ہے کل پھر بلایا ہے مگر ان حالات میں بچہ؟"

"تو بالکل فکر نہ کر جو اوپر...... بیٹھا ہے وہ اس کا رزق

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

پہلے ہی بھیج دے گا۔"

مجھے عبدالصمد کی استقامت پر رشک آیا۔ ساری مشکلیں وہ برداشت کر رہا تھا۔ دنیا والوں کی باتیں اور طعنے سن رہا تھا مگر اس میں ذرا بھی کمزوری نہیں آئی تھی بلکہ وہ دنیا سے لڑ رہا تھا۔ اس نے کہا تو میں بھی مطمئن ہو گئی۔ مگر اس سے مشکلات ختم نہیں ہوئی تھیں بس ان سے لڑنے کا حوصلہ پیدا ہوا تھا۔ اگلے مہینے مالک مکان کرایہ لینے آیا تو اس نے عبدالصمد سے مکان خالی کرنے کو کہا۔ عبدالصمد نے احتجاج کیا۔ "کیوں خالی کر دوں کیا میں کرایہ وقت پر نہیں دیتا۔"

"بات کرائے کی نہیں ہے آدمی کو کچھ اور بھی دیکھنا پڑتا ہے۔" اس نے رکھائی سے کہا۔ "میں نے تمہیں شریف آدمی سمجھ کر مکان دیا تھا اور تم نے یہاں......"

"بس اور کچھ مت کہنا۔" عبدالصمد نے اسے ٹوک دیا۔ "تم نے مکان خالی کرنے کو کہہ دیا ہے۔ مجھے جیسے ہی دوسرا مکان ملا میں اسے خالی کر دوں گا۔"

"میں ایک مہینے کا وقت......"

"مجھے کل ملا میں کل خالی کر دوں گا۔" عبدالصمد نے اس کی بات اس کے منہ پر ماری اور پھر واقعی ایسا ہی ہوا۔ دو دن بعد عبدالصمد کو اس جگہ ایک کمرا مل گیا جہاں وہ کام کرتا تھا۔ اس نے مکان خالی کر دیا۔ وہ بس کرایہ دیتا تھا اور اس نے مزید دو دن کا کرایہ دے کر مکان خالی کر دیا۔ اب ہم جہاں گئے وہ دوسری منزل کا ایک کمرا تھا۔ کمرا اچھا بڑا اور صاف ستھرا تھا۔ اس میں ساتھ چھوٹا سا باورچی خانہ بھی تھا لیکن لیٹرین اور غسل خانے چھت پر اور مشترک تھے۔ ہمیں دو منزل کی سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جانا پڑتا تھا۔ ڈاکٹر نے تصدیق کر دی کہ میں امید سے تھی اور اس نے جو احتیاطیں بتائی تھیں ان میں سیڑھیاں چڑھنے اترنے سے گریز بھی شامل تھا۔

مگر یہاں تو دن میں چار پانچ بار اوپر جانا پڑتا تھا۔ میری کوشش ہوتی کہ اوپر کم سے کم جاؤں۔ کپڑے دھونے کا انتظام بھی اوپر ہی تھا۔ میں صبح ایک ہی بار جا کر سب نمٹا آتی تھی۔ عبدالصمد کی دکان جہاں وہ ملازم کی حیثیت سے کام کرتا تھا اسی عمارت کے نیچے تھی۔ یہ جگہ اس علاقے سے دور تھی اور یہاں کوئی جان پہچان والا نہیں تھا۔ لوگ ویسے ہی تھے جیسے پرانے محلے میں تھے مگر ہمیں کسی سے مطلب نہیں تھا۔ میں آس پاس کی عورتوں سے بہت کم ملتی تھی اور کسی کے گھر نہیں جاتی تھی۔ کچھ عورتیں میرے پاس آئیں مگر جب میں

یروون

شام میں ایک دریا بحر طبریہ اور بحر جلیل سے گزرتا ہوا بحر مردہ میں جا گرتا ہے۔ اس کا براہ راست طول 65 میل ہے لیکن پیچ و خم کی وجہ سے 200 میل بنتا ہے۔ عرض دو میل سے پندرہ میل ہے۔ سطح سمندر سے 1200 فٹ نیچے ہے۔ شمال سے جنوب کی جانب بہتا ہے اور فلسطین کا سب سے بڑا دریا ہے۔ اس کا ذکر قرآن شریف کی سورۃ البقرہ کے 33 ویں رکوع میں آیا ہے جب طالوت فوج لے کر بڑھا تو اللہ تعالیٰ نے اس دریا کے ذریعے امتحان لینا چاہا۔ متی (13:3) اور مرقس (9:1) سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یحییٰ اسی دریا سے بپتسما دیا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس کا ذکر زبور، ریشع، سلاطین وغیرہ میں بھی آیا ہے۔

مرسلہ: ایوب مسیح، فیصل آباد

نہیں گئی تو انہوں نے بھی آنا چھوڑ دیا۔ چھ مہینے ہم بہت سکون سے یہاں رہے۔ پھر ایک دن دکان پر آنے والے پرانے محلے کے ایک آدمی نے عبدالصمد کو پہچان لیا اور صرف پہچانا نہیں اس نے سب کے سامنے عبدالصمد سے کہا۔

"اوئے مولوی تو یہاں آ گیا ہے اب ان لوگوں کو

تیرے بارے میں پتا نہیں چلا کیا؟"

یہ سن کر دکان کا مالک اور دوسرے لوگ چونک گئے۔ مالک نے پوچھا۔ "کیا نہیں پتا ہے ہمیں؟"

"او جی اس نے شاہی محلے کی عورت گھر میں ڈالی ہوئی ہے۔"

"وہ میری بیوی ہے۔" عبدالصمد نے غصے سے کہا۔ "اس کے بارے میں ایک لفظ بھی مت کہنا۔"

"یہ صوفی ادھر ہمارے محلے میں بھی سب سے لڑتا جھگڑتا تھا۔" اس آدمی نے اشتعال انگیزی جاری رکھی۔ عبدالصمد غصے سے بے قابو ہونے لگا تو دکان کے مالک نے موقع کی نزاکت سمجھتے ہوئے اس شخص کو وہاں سے بھگا دیا مگر وہ شخص جو کچھ بول گیا تھا وہ دسیوں لوگوں نے سنا تھا اور شام تک ساری بلڈنگ ہمارے بارے میں جان چکی تھی۔ رات عبدالصمد گھر آیا تو میں اس کی صورت دیکھ کر سمجھ گئی۔

"کیا ہوا ہے؟"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"کچھ نہیں کھاتا لالہ۔" اس نے مجھے بتایا۔ میں اس کے لیے کھانا لے آئی اس نے بے دلی سے کھانا کھایا اور پھر خود مجھے بتا دیا۔ اس نے جو ذلت سہی تھی اسے بتاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔ "میرا دل چاہ رہا تھا کہ زمین پھٹ جائے اور مجھے اپنے اندر سما لے۔"

میں اس کے آنسو صاف کرنے لگی۔ "تو تو مجھے حوصلہ دیتا ہے اگر تو رونے لگا تو میں کیا کروں گی؟"

اس نے اپنے آنسو صاف کیے۔ "تو ٹھیک کہہ رہی ہے پر انسان ہوں کوئی پتھر نہیں ہوں کبھی کبھی ٹوٹ جاتا ہوں۔"

میں آنے والے وقت کا سوچ کر ہراساں ہونے لگی۔ "کیا اب ہمیں یہاں سے بھی جانا پڑے گا؟"

"اللہ بہتر جانتا ہے۔" اس نے آزردہ لہجے میں کہا۔ "پتا نہیں اس نے ہماری قسمت میں کیا لکھا ہے۔"

"جو بھی لکھا ہے ہم اس پر راضی بہ رضا ہیں۔" میں نے کہا۔ "دیکھ ہمیں مشکل ہوئی لیکن پہلے سے اچھا گھر مل گیا۔ مجھے قرآن پاک پڑھانے کا معاوضہ لینا اچھا نہیں لگتا تھا۔ اللہ نے مجھے دوسرا روزگار دے دیا۔"

"ہاں یہ تو ہے اور اب وہ ادارہ بھی رہنے والا ہے۔" عبدالصمد بھی ذرا مطمئن ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر بعد سو گیا۔ سارا دن کام کر کے تھک جاتا تھا مگر میں جاگتی رہی اور سوچتی رہی کہ اب کیا ہوگا۔ توقع کے عین مطابق اگلے دن محلے کی عورتیں آئی تھیں اور وہ پوری تیاری کے ساتھ آئی تھیں۔ میں ان کی باتیں سنتی رہی جن میں سوائے تکلیف دینے کے اور کچھ نہیں تھا اور اسے اللہ کی مرضی سمجھ کر برداشت کرتی رہی۔ جب وہ مجھ سے کچھ پوچھتیں تو میں یہی کہتی کہ اللہ کے لیے اپنی زندگی بدلی ہے۔ مجھے اس کا اجر اسی سے چاہیے۔ انسانوں سے سوائے تکلیف کے اور کچھ نہیں ملتا ہے۔ وہ یہ سوچ کر آئی تھیں کہ میں ان سے لڑوں جھگڑوں گی ان کی دل آزاری پر ان کو اپنے گھر سے نکل جانے کو کہوں گی مگر میں پرسکون رہی۔ اندر سے میرا دل رو رہا تھا مگر اوپر سے ایک آنسو نہیں نکلا۔ بس میں اللہ کو یاد کرتی رہی اور اسی سے مجھے حوصلہ ملا میں نے وہ سب برداشت کر لیا جو عام حالات میں بالکل برداشت نہ کرتی۔

اگر میں ان سے لڑتی تو ان کی توقع پوری ہو جاتی اور پھر ہمارے ساتھ یہاں بھی وہی ہوتا جو اس سے پہلے ہو چکا تھا۔ مجھے اپنی پروا نہیں تھی مگر عبدالصمد ابھی ملازمت سے لگا تھا، ذرا سکون میں آیا تھا اور ہمیں پھر سب چھوڑ کر جانا پڑتا تو وہ ایک بار پھر مصیبت میں پڑ جاتا۔ میں چاہتی تھی کہ لوگ ہمیں ناپسندیدہ سمجھ کر سہی لیکن اس جگہ قبول تو کر لیں۔ مگر میں بھول گئی تھی کہ انسان کو کسی حال میں چین نہیں ہوتا ہے۔ خاص طور سے اوباش فطرت لوگوں کو کسی انسان کی کمزوری کا پتا چل جائے تو وہ اسے اچھالے بغیر نہیں رہتے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ عبدالصمد دکان پر کام کرتا تھا اور ملازم تھا سارا دن لوگ آتے تھے اور بلڈنگ والے بھی سودا اسی دکان سے لیتے تھے۔ وہ باتوں باتوں میں عبدالصمد کو یوں سنا کر چلے جاتے تھے کہ وہ کچھ کہہ بھی نہیں سکتا تھا۔ اگر کسی سے الجھتا تو دکان کے مالک کو اچھا نہیں لگتا۔ ظاہر ہے اسے اپنی دکانداری عزیز تھی۔ عبدالصمد بے چارہ خون کے گھونٹ پی کر رہ جاتا تھا۔

بلڈنگ میں کئی چھڑے چھانٹ بھی رہتے تھے۔ وہ جب ہمارے دروازے کے سامنے سے گزرتے تو جان بوجھ کر اونچی آواز میں فحش گوئی کرتے یا گندی گالیاں دیتے ہوئے جاتے۔ میں اپنی بے بسی پر کڑھ کر رہ جاتی تھی۔ میں نے برائی کی راہ چھوڑ دی تھی میں بھول کر بھی اس زندگی کو یاد نہیں کرتی تھی اور کبھی کوئی بات یاد بھی آتی تو تکلیف کے ساتھ یاد آتی تھی۔ میں کراہیت محسوس کرتی تھی۔ اللہ گواہ ہے میں اس زندگی سے بہت خوش تھی مگر لوگ خوش نہیں تھے، وہ ہمیں بخشنے کو تیار نہیں تھے۔ کبھی کبھی جب برداشت سے باہر ہو جاتا تو اللہ سے دعا کرتی تھی کہ وہی ہماری مدد کرنے والا ہے۔ ان دنوں میری طبیعت ویسے بھی خراب تھی۔ کوئی دیکھ بھال کرنے والا اور بتانے والا نہیں تھا اتنی استطاعت نہیں تھی کہ ہر ہفتے باہر جیسے ڈاکٹر کو دکھایا جائے اور اس سے مشورہ لیا جائے۔ اس لیے جیسے تیسے خود ہی سب کرتی تھی اور اس حالت میں گھر بھی دیکھتی تھی۔

اگرچہ کام زیادہ نہیں تھا۔ صبح کا ناشتا چائے پاپے سے کر لیتے تھے۔ عبدالصمد مجھے زبردستی ابلا ہوا انڈا کھلاتا تھا۔ رات کو دودھ لے آتا۔ مجھے دونوں پسند نہیں تھے۔ مگر مجبوری میں لینا پڑتا تھا۔ دوپہر میں رات کا بنایا ہوا سالن چل جاتا تھا اور رات میں وہ باہر سے روٹی لے آتا۔ صفائی ستھرائی دو دن بعد کر دو تب بھی کام چل جاتا تھا کیونکہ گھر ہی کتنا تھا اور گندہ کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ اکثر تو عبدالصمد ہی صفائی کر دیتا تھا۔ مجھے بار بار اوپر جانے سے بچانے کے لیے وہ پانی نیچے لا رکھتا تھا۔ زندگی آسان نہیں تو بہت مشکل

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بھی نہیں تھی۔ چند مہینے گزرے تو میرا خوف کم ہو گیا کہ ہمیں یہاں سے نکالا نہیں جائے گا۔ لوگ بھی ذرا خاموش ہو گئے تھے کیونکہ ہماری طرف سے ان کو جواب نہیں دیا جاتا تھا۔ لوگوں نے معاف نہیں کیا تھا بس یوں سمجھ لیں کہ ذرا تھک گئے تھے اس لیے پیچھے ہٹ گئے تھے کیونکہ کچھ عرصے بعد بھی لوگ پھر ہم پر چڑھ دوڑے تھے۔

ہماری بدقسمتی اوپر ایک جوڑے کی صورت میں آئی۔ انہوں نے میاں بیوی بن کر یہاں کمرا کرائے پر لیا تھا مگر کچھ عرصے بعد پتا چلا کہ وہ بس نام کے میاں بیوی تھے۔ عورت دھندا کرتی تھی اور آدمی اس کے لیے گاہک لاتا تھا۔ ایسی باتیں چھپتی نہیں ہیں۔ اس پر بلڈنگ والوں نے ہنگامہ کیا اور پولیس آ گئی۔ مقامی پولیس جوڑے کی طرف دار نکلی کیونکہ ان کی طرف سے انہیں رقم ملتی تھی۔ مگر معاملے میں بلڈنگ میں رہنے والا ایک دونمبر صحافی بھی ملوث ہو گیا اور اس نے اپنے مطلب کی خاطر ان کی خبر بنا دی۔ ستم اس نے یہ کیا کہ خبر میں ان میاں بیوی کے ساتھ میرا اور عبدالصمد کا ذکر بھی نام لیے بغیر کر دیا۔ اس پر عورت نے بلڈنگ سے نکالے جانے پر ہنگامہ کیا۔ وہ خود کو اسٹیج اداکارہ قرار دے رہی تھی۔ اس نے کہا۔ "تم لوگوں نے شاہی محلے والی تو یہاں بٹھائی ہوئی ہے اور مجھے نکال رہے ہو۔"

اس پر سب کی توپوں کا رخ ہماری طرف ہو گیا اور وہ لوگ بھی جو ہماری شرافت کے قائل ہو گئے تھے۔ ان کے ہمنوا بن گئے جو ہمیں ہر صورت یہاں سے نکالنا چاہتے تھے۔ یہی نہیں ان لوگوں نے دباؤ ڈلوا کر عبدالصمد کو نوکری سے نکلوا دیا۔ یوں مالی مشکلات کے ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔ اللہ اللہ کر کے ابھی ہمیں دو وقت روٹی نصیب ہوئی تھی کہ پھر وہی فاقہ کشی کا دور آ گیا۔ بلڈنگ والے ہمیں یہاں سے نکالنا چاہتے تھے مگر اس موقع پر ہمارے فلیٹ کا مالک آڑے آیا اور اس نے انکار کر دیا۔ اس نے بلڈنگ والوں سے کہا۔ "اگر یہ ابھی کوئی غلط کام کر رہے ہیں تو بتاؤ ایک منٹ میں سامان اٹھا کر باہر پھینک دوں گا مگر ایسے نہیں نکالوں گا۔ جب تک یہ کرایہ دے رہے ہیں یہاں رہ سکتے ہیں۔ کوئی پہلے کیا تھا اس سے مجھے کوئی مطلب نہیں ہے۔"

مالک مکان ذرا مضبوط بندہ تھا اس لیے بلڈنگ والے اس پر ایک حد سے زیادہ دباؤ نہیں ڈال سکتے تھے۔ چند مہینے کام کر کے عبدالصمد نے کچھ رقم بچائی تھی اس مشکل وقت میں وہی ہمارے کام آئی۔ اس نے دوسری نوکری تلاش کرنی شروع کر دی۔ مگر دو مہینے گزر گئے اور اسے کہیں جگہ نہیں ملی۔ اب ہمارے پاس کرائے کے کیا کھانے کے بھی پیسے نہیں تھے۔ تیسرے مہینے مالک کرایہ لینے آیا اور عبدالصمد نے عذر کیا تو اس نے کہا۔ "دیکھو صوفی، میں نے بلڈنگ والوں کے کہنے میں آ کر تجھے نہیں نکالا۔ گناہ ثواب بندے اور اوپر والے کا معاملہ ہے۔ ہم کون ہوتے ہیں کسی کو گناہگار بنانے والے، پر یہ معاملہ دوسرا ہے۔ اگر کرایہ نہیں دے سکتے تو مکان خالی کر دو۔"

"یہ آپ کا احسان ہے۔" عبدالصمد نے عاجزی سے کہا۔ "دیکھیں میں ہاتھ پاؤں والا آدمی ہوں، ملازمت تلاش کر رہا ہوں جیسے ہی ملے گی سب سے پہلے آپ کا کرایہ ادا کروں گا۔ مجھے ایک مہینے کی مہلت اور دے دیں۔"

مالک مکان سچ مچ شریف آدمی تھا مان گیا۔ "ٹھیک ہے ایک مہینا اور رہ لے پر ایک مہینے بعد تو نے پھر خالی ہاتھ دکھا دیا تو میرا دو مہینے کا نقصان ہو جائے گا۔"

"اگر میں دو مہینے بعد کرایہ نہ دے سکا اور آپ نے مجھے نکال دیا تب بھی جب میرے پاس رقم آئے گی میں آپ کا کرایہ ضرور ادا کروں گا۔ اگر کرایہ نہ ادا کر سکا تو خود ہی مکان خالی کر دوں گا آپ کو کہنا نہیں پڑے گا۔"

فلیٹ کا مالک مان گیا اور ہم مزید ایک مہینا اس فلیٹ میں رہے۔ عبدالصمد نے ہر ممکن کوشش کر لی مگر اسے نوکری نہیں ملی۔ اس نے مزدوری بھی کر لی مگر اس میں بھی اسے چند دن سے زیادہ کام نہیں ملا اور جو ملا اس سے بہ مشکل جسم و جان کا ناطہ برقرار رہ سکا تھا۔ ان چار مہینوں میں ہم دونوں کمزور ہو گئے تھے خاص طور سے عبدالصمد ہڈیوں کا ڈھانچا ہو رہا تھا کیونکہ اگر کھانے کی کوئی چیز ہوتی تو وہ اصرار کر کے مجھے کھلا رہا تھا اور میں بھی اپنے بچے کی خاطر مان جاتی۔ پہلی تاریخ آئی اور عبدالصمد نے فلیٹ کے مالک کے آنے سے پہلے سامان سمیٹا اور مجھ سے کہا۔ "چل شادو، تو نے کہا تھا کہ اگر میرے ساتھ کھلے آسمان تلے رہنا پڑے تو رہ لے گی۔"

"ہاں مجھے یاد ہے۔" میں نے حوصلے سے کہا۔ "تو جہاں لے جائے گا چلوں گی جو کہے گا کروں گی۔"

ہم اپنا مختصر سا سامان سمیٹ کر وہاں سے نکل آئے اور ہمیں نہیں معلوم تھا کہ کہاں جانا ہے۔ میں ساتویں مہینے سے تھی، اس حالت میں میرے لیے چلنا پھرنا بھی مشکل ہو رہا تھا۔ سیڑھیاں اتر کر عبدالصمد نے سڑک پر کھڑے ہو کر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بلند آواز سے بلڈنگ والوں سے کہا۔ "خوش ہو جاؤ ہم یہاں سے جا رہے ہیں۔ تم نے جو کہا اس پر اللہ تمہیں معاف کرے اور کبھی تمہیں ایسی آزمائش سے دوچار نہ کرے۔"

میں نے دبی زبان میں کہا۔ "تو انہیں دعا دے رہا ہے۔"

"ہاں اپنے نبی ﷺ کی ایک سنت ادا کرنے کی کوشش کر رہا ہوں جو تکلیف اٹھا کر بھی تکلیف دینے والوں کو دعا دیتے تھے اور یہ تو ہمارے نصیب میں تھا۔"

میں شرمندہ ہو گئی۔ "تو ٹھیک کہہ رہا ہے۔"

ذرا دور ایک پارک تھا۔ کسی زمانے میں پارک تھا اب وہاں گھنے درخت، جھاڑیاں اور گھاس پھونس تھی۔ ہم وہاں چلے آئے اور درختوں کے درمیان بیٹھ گئے۔ کچھ ہی دیر گزری تھی کہ باغ کا چوکیدار آ گیا۔ "کون ہے تم اس عورت کے ساتھ ادھر کیا کرتا ہے؟"

"بھائی میں بے گھر ہوں اور یہ میری بیوی ہے۔" عبدالصمد نے کہا۔ "ہمارے پاس رہنے کو کوئی جگہ نہیں ہے۔"

"تو ادھر کیا کرتا ہے۔ یہ پارک ہے کسی کو ادھر رکنے کا اجازت نہیں۔"

"میری بیوی ماں بننے والی ہے میں اسے لے کر کہاں دربدر پھروں۔" عبدالصمد نے پھر عاجزی سے کہا۔ "تمہاری مہربانی ہوگی اگر تم ہمیں یہاں رہنے دو۔"

پٹھان چوکیدار کا دل پسیجا۔ "یارا ادھر کوئی آرام نہیں ہے۔ تم اور تمہارا بی بی کیسے رہے گا؟"

"پتا نہیں۔" عبدالصمد نے سرد آہ بھری۔ "دربدر بے بس کے ہوتے ہیں پر اللہ جس حال میں چاہے رکھے۔"

"تم ادھر درختوں کے درمیان رہے گا۔" چوکیدار نے خبردار کیا۔ "ادھر سے باہر مت آنا کسی نے دیکھ لیا تو میں مشکل میں پڑ جائے گی۔ میری نوکری جائے گی۔"

"ہم اسی جگہ رہیں گے۔" عبدالصمد نے اسے یقین دلایا۔ اس نے تین نزدیکی درختوں کے تنوں سے چادر کی باندھ کر ایک کمرے جیسا بنا لیا اور زمین جھاڑ اور دوسری چیزوں سے صاف کر کے اس پر دری اور بستر بچھا دیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "شاداں تو آرام کر میں ذرا کھانے کا اور رہائش کا کچھ کر آتا ہوں۔"

"کہاں سے دیکھے گا۔" میں نے دکھ سے کہا۔ "ہمارے پاس ہے ہی کیا جو مکان لے سکیں۔"

"میں آتا ہوں نماز کا وقت بھی ہو رہا ہے۔"

"میں اکیلی رہوں گی۔" میں نے سہم کر کہا۔

"اللہ ہے نا۔" وہ کہہ کر چلا گیا اور میں بیٹھی رہ گئی۔

کچھ دیر بعد پردے کے پیچھے سے چوکیدار کی آواز آئی۔

"مولوی صاحب۔"

"وہ نماز پڑھنے گئے ہیں۔" میں نے جواب دیا۔

"یہ ہم یہ پانی کا کین لایا ہے ادھر ضرورت ہو گا۔"

واقعی مجھے وضو کرنے کے لیے پانی کی ضرورت تھی میں نے ممنون ہو کر کہا۔ "بھائی اللہ تم کو جزائے خیر دے۔"

وہ کین رکھ کر چلا گیا اور میں نے وضو کر کے نماز پڑھی۔ کچھ دیر بعد عبدالصمد آیا۔ وہ ہوٹل سے دو روٹی دال لایا تھا جسے ہم نے پانی سے بھگو کر کھایا اور اللہ کا شکر ادا کیا۔ اگلا دن آیا اور وہ بھی گزر گیا۔ جو لوگ بے گھر اور بے چھت ہوں اور انہیں اس کی بھی عادت نہ رہی ہو ان کے لیے ایسے رہنا کس قدر مشکل کام ہے یہ وہی بیان کر سکتے ہیں جن پر گزری ہو۔ میں آج سوچتی ہوں تو مجھے تعجب ہوتا ہے وہ وقت ہم نے کیسے گزارا تھا۔ صبح فجر میں عبدالصمد مجھے اکیلا چھوڑ کر نماز پڑھنے جاتا تھا اور میں اس کھلی جگہ بنا کسی خوف کے آرام سے سوئی رہتی۔ چند دن بعد آخری روپیا بھی خرچ ہو گیا تو اب کھانے کے لیے بھی کچھ نہیں تھا۔ دو دن فاقے کیے پھر چوکیدار نے ہمیں کھانا بھی دیا مگر وہ خود غریب آدمی تھا۔ عیال والا تھا ہمارے ساتھ اس سے زیادہ نہیں کر سکتا تھا۔ دو دن معمولی سا ملا اور پھر فاقے شروع ہو گئے۔

عبدالصمد مزدوری کرنے جاتا تو اس کی صحت دیکھ کر کوئی مزدوری نہیں دیتا تھا۔ بہت تکلیف دہ اور مایوس کرنے والے دن تھے۔ مگر ہم مایوس نہیں تھے۔ ان ہی دنوں میں نے قرآن پاک کا ناظرہ مکمل کیا۔ ہم دونوں کے پاس وقت ہی وقت تھا اور عبدالصمد مجھے قرآن پڑھا رہا تھا۔ میں نے درست تلفظ اور کسی قدر قرأت کے ساتھ قرآن پاک پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ عبدالصمد بہت خوش تھا۔ ہمارے پاس اس خوشی کے موقع پر کچھ نہیں تھا تو عبدالصمد جا کر اپنا واحد جوتا فروخت کر کے اس کی شیرینی لے آیا اور وہی ہم نے کھائی اور آس پاس جو لوگ تھے انہیں بھی کھلائی۔ ہمارے پاس جو چند چیزیں تھیں وہ ایک ایک کر کے فروخت ہوتی رہیں اور یہ کوئی قیمت والی چیزیں نہیں تھیں بس ایسی چیزیں تھیں جو دس بیس سو پچاس روپے میں بک جاتیں اور ہمیں ایک دو وقت کے کھانے کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

آسرا ہو جاتا۔ کئی وقت کے کئی بار فاقوں کے بعد یہ تو دل میں بیٹھ گیا تھا کہ ہمارے حصے کا رزق ہم تک پہنچے گا۔

مگر اب ہونے والے بچے کی فکر تھی۔ وہ اس جگہ دنیا میں کیسے آتا۔ اسے تو چھت اور تحفظ کی ضرورت تھی۔ میں اور عبدالصمد دونوں اس بارے میں فکر مند تھے۔ ایک دن وہ فجر کے لیے گیا تو بہت دیر ہو گئی وہ واپس نہیں آیا۔ میں پریشان ہو گئی اور جب سورج بھی بلند ہو گیا تو میں خود اسے دیکھنے کے لیے جا رہی تھی کہ وہ آ گیا۔ اس کا چہرہ ستا ہوا اور رو دھلا ہوا تھا۔ "کہاں رہ گیا تھا میں تیری تلاش میں نکلنے والی تھی۔"

"کمزور بندہ ہوں اپنے رب سے شکوے کر رہا تھا۔"

اس نے کہا۔ "مسجد میں تھا۔ فجر کے بعد وہیں لیٹا تو اٹھا نہیں گیا۔ پھر رونا آ گیا اور میں نے اللہ سے کہا کہ اب مجھ میں تاب نہیں ہے اس آزمائش کو ختم کرے۔"

"وہ ختم کرے گا۔" میں نے اوپر سے کہا ورنہ میرے اندر بھی جیسے حوصلہ باقی نہیں رہا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ سب پہلے جیسا ہو جائے ہمیں سر چھپانے کی جگہ مل جائے اور دو وقت پیٹ بھرنے کے لیے کسی کی طرف دیکھنا نہ پڑے۔ میری تسلی پر عبدالصمد رو پڑا۔

"کب؟"

"بہت جلد۔" میں نے ایک بار پھر اسے اوپری دل سے تسلی دی۔ اس وقت میں نے سوچا نہیں تھا کہ بہت جلد یہ تسلی حقیقت بن جائے گی۔ کچھ دیر بعد عبدالصمد کے دل کا بوجھ ہلکا ہوا تو وہ نادم ہو گیا۔

"آج میں بہت ناشکرا بن گیا۔"

"نہیں تو نے اللہ سے کہا نا۔ آدمی اسی سے کہہ سکتا ہے اور کون ہے جس سے فریاد کی جائے۔"

اس روز ہمارے ہاں کھانے کو کچھ نہیں تھا۔ دوپہر میں، میں لیٹی ہوئی تھی۔ باہر شدت کی گرمی تھی مگر درختوں تلے اس کا اتنا پتا نہیں چل رہا تھا بس حبس تھا۔ اچانک باہر سے کسی نے عبدالصمد کو پکارا۔ وہ سو رہا تھا میں نے اسے اٹھایا۔ "تجھے کوئی بلا رہا ہے باہر۔"

"یہاں کون آ گیا۔" وہ حیران ہوا۔ "اس جگہ کا تو کسی کو پتا نہیں ہے۔"

عبدالصمد باہر گیا تو اس کی آواز آئی۔ "رحیم شاہ جی آپ۔"

میرا دل ڈوب گیا۔ رحیم شاہ ہمارا سابق مالک مکان تھا اس کا دو مہینے کا کرایہ ہم پر تھا اور وہ ہمیں ڈھونڈتا ہوا یہاں آ گیا تھا۔ یہی خیال عبدالصمد کو آیا۔ اس نے کہا۔ "شاہ جی مجھے آپ کا قرض یاد ہے مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ میں کس حال میں ہوں۔"

"قرض کو چھوڑو یار۔" اس نے کہا۔ "مجھے تو افسوس ہے کہ تم بتائے بغیر چلے گئے تب سے تمہیں تلاش کر رہا ہوں۔ آج اتفاق سے مسجد میں دیکھا مگر جب نماز پڑھ چکا تو تم جا چکے تھے آس پاس تلاش کیا تو اللہ کے ایک بندے نے یہاں کا بتایا۔"

"میرے لیے کیا حکم ہے؟"

"عبدالصمد سامان اٹھاؤ اور میرے ساتھ چلو۔ میں تم سے فلیٹ خالی کرانا نہیں چاہتا تھا مگر تم بتائے بغیر نکل گئے۔"

"شاہ جی میں یہاں ٹھیک ہوں، وہاں میں کیسے رہوں جب لوگ مجھے رہنے نہیں دیں گے۔"

"لوگوں کو چھوڑو۔" اس نے کہا۔ "اگر تم وہاں نہیں رہنا چاہتے تو میرے پاس اور جگہیں بھی ہیں اور تمہارے لیے کام بھی ہے۔"

مجھے یوں لگا جیسے میں خواب دیکھ رہی ہوں۔ اس شام تک ہم ایک کمرے کے دوسرے مکان میں منتقل ہو گئے۔ یہ مغل پورہ میں تھا اور وہیں رحیم شاہ جی کی ورکشاپ تھی۔ اس میں گاڑیوں کی ڈینٹنگ پینٹنگ کا کام ہوتا تھا۔ اس نے عبدالصمد کو اپنے پاس ملازم رکھ لیا۔ وہ اچھے دل کا انسان تھا اسی وجہ سے اس نے ہمارے ساتھ ہونے والی زیادتی کو محسوس کیا۔ شاہ جی نے صرف گھر نہیں دیا بلکہ بہت سا سامان بھی دیا جو ہمارے پاس نہیں تھا۔ کتنے دنوں بعد ہم ڈھنگ سے رہے اور سوئے تھے مگر جب دربدر تھے تب بھی اوپر والے کے شکر گزار تھے اور جب اس نے ٹھکانا دیا تب بھی اس کا شکر یہ ادا کرتے رہے۔ عبدالصمد کو شاہ جی نے ایک تنخواہ پیشگی دے دی تھی۔ حالانکہ ابھی وہ کام سیکھ رہا تھا۔ یہ نیا اور مشکل کام تھا مگر عبدالصمد نے بے پناہ محنت کی۔ دوسرے کاریگر جب چھٹی کر کے چلے جاتے تب بھی وہ کام میں لگا رہتا تھا۔ اس کی محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ چند مہینے بعد وہ سب سے بہترین کاریگر بن گیا اور شاہ جی نے اس کی تنخواہ سب سے زیادہ کر دی۔

ایک مہینے بعد اللہ نے ہمیں بیٹا دیا۔ ہم اس نعمت پر بہت خوش تھے۔ مالی مشکل بھی کیونکہ ہمیں قرض اتارنا تھا اور پھر بچے کے خرچے الگ سے تھے۔ مگر ایک سال میں ہم نے سارا قرض اتار دیا۔ گھر میں ضرورت کا سامان آ گیا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

عبدالصمد کام سیکھ گیا تھا اور وہ جو کماتا تھا وہ ہمارے گزارے لائق کافی تھا بلکہ اس میں سے کچھ بچت کر لیتے تھے۔ شاید ہمارے دلوں میں خوف تھا کہ یہاں بھی میری پرانی شہرت پہنچ گئی تو شاید ہمیں یہاں سے بھی جانا پڑے۔ میں محلے کی عورتوں سے بہت کم ملتی جلتی تھی۔ پھر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ پہلے ہم دو تھے اب ہمارا بیٹا تھا اور اللہ آگے بھی اولاد دیتا۔ اگر ان کے سامنے یہ سب ہوتا تو ان کی نظروں میں میری کیا عزت رہ جاتی اور خود وہ عزتِ نفس سے محروم ہو جاتے۔ اس لیے یہاں سیٹ ہو جانے کے باوجود میرے دل میں تھا کہ ہمیں یہاں سے بھی جانا ہے۔ ایک رات میں نے عبدالصمد سے کہا تو اس نے بے ساختہ کہا۔

"اللہ کی قسم، مجھے بھی یہی خیال آتا ہے۔ شاید میں اسی لیے زیادہ محنت کر رہا ہوں کہ کچھ رقم جمع ہو جائے اور پھر ہم یہاں سے کہیں اور چلے جائیں ہمیشہ کے لیے، جہاں سوائے اللہ کے اور کوئی ہمیں جاننے والا نہ ہو۔"

عبدالصمد کو اپنا ہم خیال پا کر میں خوش ہو گئی تھی ورنہ اس سے پہلے میں ڈر رہی تھی کہ کہیں وہ راضی نہ ہو جائے کہ بار بار کہیں جا کر سیٹ ہونا آسان کام نہیں تھا۔ اکیلا آدمی پھر بھی گزارا کر لیتا ہے مگر پورے گھر کے ساتھ یہ بہت مشکل کام ہے مگر ہمیں اپنے اور اپنے بچوں کے لیے یہ کام کرنا ہی تھا۔ ابھی عبدالاحد سات مہینے کا تھا کہ میں پھر امید سے ہوئی اور اس بار بھی اللہ نے بیٹا دیا۔ اگرچہ میری اور عبدالصمد دونوں کی خواہش تھی کہ بیٹی ہو مگر ہم اوپر والے کی اس عطا پر بھی راضی تھے۔ ان دنوں عبدالصمد کو باہر جانے کا موقع ملا۔ دبئی میں ایک ورکشاپ میں ڈینٹنگ پینٹنگ کے ماہر کی ضرورت تھی مگر تنخواہ زیادہ نہیں تھی۔ عبدالصمد نے کہا۔ "میں تجھے بلا نہیں سکوں گا۔"

"میں یہاں رہ لوں گی۔" میں نے حوصلے سے کہا۔ "پر ہم بچت تو کر سکیں گے تو اتنا بھیج دینا جتنا اب دے رہا ہے۔"

عبدالصمد راضی نہیں تھا مگر میرے زور دینے پر مان گیا۔ پاسپورٹ بنوا لیا تھا اس کا ویزا لگ کر آ گیا۔ نوکری شاہ جی کے توسط سے ملی تھی اور اس نے ذرا بھی اعتراض نہیں کیا کہ عبدالصمد اسے چھوڑ کر کیوں جا رہا ہے؟ میں اندر سے فکر مند تھی مگر اوپر سے حوصلہ دکھائی رہی اور اسی وجہ سے عبدالصمد جانے پر راضی ہوا۔ اس کے جانے کے بعد چند دن تو میں نے یوں گزارے جیسے مجھے جیتے جی قبر میں ڈال دیا ہو۔ ایسی تنہائی اور وحشت محسوس ہوتی تھی پھر رفتہ رفتہ صبر آ گیا۔ میں تین سال اکیلی رہی۔ اکیلی یوں کہ عبدالصمد سال میں بس چند روز کے لیے آتا تھا۔ دو سال بعد اللہ نے بیٹی بھی دی اور تب بھی میں اکیلی تھی۔ مالی مشکلات نہیں تھیں مگر تین بچوں کے ساتھ اکیلے رہنا آسان نہیں تھا۔ جیسے تیسے میں اس مرحلے سے بھی گزر گئی تھی۔ تین سال بعد عبدالصمد آیا تو اس نے خوشخبری سنائی۔

"بس چند مہینے اور صبر کر لے پھر تجھے اور بچوں کو لے جاؤں گا۔"

"سچ کہہ رہا ہے؟"

"ہاں، میں جس ورکشاپ میں کام کرتا ہوں اس کے ساتھ ایک چھوٹی ورکشاپ بک رہی ہے، میں نے جو جمع کیا ہے اس سے خرید لوں گا۔ جیسے ہی آمدنی اس قابل ہوئی کہ تجھے اور بچوں کو بلا سکوں تو ایک لمحے کی بھی دیر نہیں کروں گا۔"

عبدالصمد نے میرا پاسپورٹ بنوا دیا۔ اس وقت بارہ سال سے چھوٹے بچوں کا اندراج ماں کے پاسپورٹ میں ہوتا تھا۔ اللہ نے کرم کیا اور عبدالصمد کے جانے کے چار مہینے بعد میں اور بچے اس کے پاس تھے۔ اس نے وہاں گھر لے لیا تھا۔ یہ دو بیڈ روم والا فلیٹ تھا جو وہاں کے لحاظ سے عام سا تھا مگر ہمارے لیے کسی محل سے کم نہیں تھا۔ عبدالصمد کا کام اچھا چل نکلا تھا اور اسی وجہ سے وہ ہمیں بلانے کے قابل ہوا۔ عبدالاحد اور عبداللہ اسکول کی عمر کو پہنچ رہے تھے اس لیے عبدالصمد نے انہیں اسکول میں داخل کرا دیا۔ اس کی اور میری خواہش تھی کہ ہمارے بچے دینی تعلیم حاصل کریں مگر وہاں پاکستان والا سسٹم نہیں تھا۔ اس کے باوجود عبدالصمد نے بچوں کو گھر میں خود پڑھانا شروع کر دیا۔ کام سے تھکے ہارے آنے کے باوجود وہ اس معاملے میں سخت رہا تھا۔ اس کی محنت سے میرے دونوں بیٹوں اور پھر بیٹی فاطمہ نے بھی حفظ کر لیا۔

اب میرے بیٹے باپ کے ساتھ ورکشاپ بھی جاتے ہیں۔ اسکول سے آنے کے بعد وہ شام کو وہاں ہوتے ہیں اور کام سیکھتے ہیں۔ بچوں کے بڑے ہونے کے بعد ہم نے ذرا بڑا گھر لے لیا کیونکہ اب ہم لے سکتے ہیں۔ اللہ کے پہلے ہی احسان کم نہیں ہیں مگر اس کے احسانوں میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔ اپنی کہانی قارئین کی نظر کرنے کا مقصد انسان پر اللہ کی مہربانیاں بتانا ہے بہ شرط کہ وہ اسی سے مانگے اور اسی سے لو لگائے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بیٹی

محترمہ عذرا رسول صاحبہ

السلام علیکم

ہر ماہ سرگزشت میں دوسروں کی آپ بیتیاں پڑھتی رہتی ہوں۔ اس بار میں نے بھی مصنفین کی صف میں شامل ہونے کی کوشش کی ہے لیکن میری سرگزشت کا مرکزی کردار کوئی اور ہے پھر بھی یہ سرگزشت آپ کو پسند آئے گی۔

عظمیٰ خورشید

(کوئٹہ)

فلیٹ کا دروازہ بند تھا۔

میرے پاس چابی بھی نہیں تھی۔ شوہر گاڑی پارک کرکے اوپر آرہے تھے۔ میری گود میں میری بچی اندھیرے سے گھبرا کر زور زور سے رونے لگی تھی۔

اچانک برابر کے فلیٹ والوں نے نہ صرف اپنے دروازے کے باہر لگا ہوا بلب آن کر دیا بلکہ اپنے فلیٹ کا دروازہ بھی کھول دیا۔

دروازہ کھولنے والی ایک عورت تھی۔ میں اس کو نہیں جانتی تھی۔

دراصل ہمیں اس فلیٹ میں شفٹ ہوئے کچھ ہی دن ہوئے تھے اسی لیے ہم ایک دوسرے سے واقف نہیں تھے۔ اس عورت نے میری گود میں بچی کو دیکھا تو اطمینان کی ایک گہری سانس لی۔ اور مجھ سے پوچھا۔ "آپ کیا اس فلیٹ میں رہتی ہیں؟"

"جی ہاں۔" میں نے جواب دیا۔ "ہمیں یہاں آئے ہوئے کچھ ہی دن ہوئے ہیں۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

''اور یہ بچی۔''

''ظاہر ہے یہ میری ہی بچی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''میرے شوہر گاڑی پارک کر کے آ رہے ہیں۔''

''خدا کا شکر ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی اور دروازہ بند کر لیا۔

اسی دوران میں میرے شوہر خورشید بھی آ گئے تھے۔

اس عورت کا رویہ پُراسرار اور حیران کر دینے والا تھا۔ بچی کی آواز سے پریشان ہو کر پہلے تو لائٹ کھولنا، پھر دروازہ کھولنا اور مشکوک انداز سے میری طرف دیکھنا۔

بہرحال جب میں نے خورشید سے یہ ذکر کیا تو انہوں نے کوئی خاص نوٹس نہیں لیا تھا۔ لیکن میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ میں اس سے کسی دن ضرور معلوم کروں گی۔

اس کا موقع بھی جلد ہی مل گیا۔ ایک شام زینہ اترتے ہوئے اس سے ملاقات ہو گئی۔ اس وقت اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

''نام کیا ہے تمہارا؟'' اس نے پوچھا۔

''جی۔ میرا نام عظمیٰ ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اور آپ۔''

''میں حمیدہ ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''میرا خیال ہے کہ اکیلی ہی رہتی ہو۔''

''جی ہاں۔ صرف میں ہوں۔ شوہر ہیں اور میری بچی ہے۔'' میں نے بتایا۔

''دل گھبرایا کرے تو آ جایا کرو میرے پاس۔'' اس نے کہا۔ ''ہم ایک دوسرے کے پڑوسی ہیں۔''

''ضرور، ضرور آؤں گی۔''

یہ اس عورت سے پہلی باضابطہ ملاقات تھی۔ اس کے بعد بھی ایک دو بار ملاقات ہوئی اور ایک شام جب خورشید دیر تک واپس نہیں آئے تھے تو میں واقعی بور ہو رہی تھی۔ بچی کو لے کر اس کے پاس چلی گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ بہت خوش ہوئی تھی۔ ''آؤ۔ آؤ۔ میں تو یہ سوچ ہی رہی تھی کہ میں خود تمہارے پاس آ جاؤں گی۔''

''چلیں کوئی بات نہیں۔ میں خود آ گئی۔''

''بیٹھو۔ میں تمہارے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔''

میرے منع کرنے کے باوجود وہ چائے لے آئی تھی۔ اس کے ساتھ اور چیزیں بھی تھیں۔ جب تک میں چائے پیتی رہی وہ میری بچی کے ساتھ کھیلتی رہی تھی۔

پھر ہمارے درمیان اِدھر اُدھر کی باتیں شروع ہو گئیں۔ اس نے اپنے بارے میں بتایا کہ اس کے شوہر کا انتقال ہو چکا ہے۔ دو بیٹے ہیں۔ دونوں جاب کرتے ہیں۔ ابھی کسی کی شادی نہیں ہوئی۔ لیکن بات چیت چل رہی ہے اور وہ خود ایک سینٹر میں دست کاری سکھایا کرتی ہے۔

''یہ تو میں آپ کے فلیٹ میں داخل ہوتے ہی سمجھ گئی تھی کہ یہ ڈیکوریشن کی چیزیں بازار کی نہیں ہیں۔'' میں نے کہا۔

''ہاں۔ تم نے ٹھیک سمجھا۔ یہ سب میں خود بناتی ہوں اور یہی ہنر دوسری بچیوں کو ٹرانسفر کر رہی ہوں۔''

''بہت بڑا کام کر رہی ہیں آپ۔'' میں نے تعریف کی۔

''بس۔ اس قسم کی سجاوٹ کا بچپن ہی سے شوق تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''بڑی ہو کر میں نے خود کلاسز لیں۔ یہ سب سیکھتی رہی اور اب دوسروں کو سکھا رہی ہوں۔''

''دل تو یہ چاہ رہا ہے کہ میں بھی آپ کی شاگرد بن جاؤں۔'' میں نے کہا۔

''کیوں نہیں۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''جب دل چاہے آ جایا کرو۔ کچھ نہ کچھ تو سکھا ہی دوں گی۔''

''ایک بات تو بتائیں۔ اس رات کیا ہوا تھا جب میں بچی کو گود میں لیے دروازے پر کھڑی تھی۔'' میں نے پوچھا۔

''ہاں۔ مجھے یقین تھا کہ تم ضرور یہ پوچھو گی۔ دراصل بچی کی آواز نے مجھے خوفزدہ کر دیا تھا۔'' اس نے کہا۔

''خوفزدہ؟ وہ کیوں؟''

''بتاتی ہوں۔ یہ اب سے چند سال پہلے کی بات ہے۔'' اس نے کہا۔ ''یہی فلیٹ تھا۔ شاید یہی وقت ہو رہا ہوگا۔ تم جس فلیٹ میں رہ رہی ہو۔ وہ فلیٹ دو چار مہینوں سے خالی تھا۔ پرانے کرائے دار جا چکے تھے۔ ابھی تک نئے کرائے دار نہیں آئے تھے۔ میں کسی کام میں مصروف تھی کہ میں نے کسی بچی کے رونے کی آوازیں سنیں۔ وہ بچی دروازے ہی پر رو رہی تھی۔ میں نے جلدی سے دروازہ کھولا تو تین چار ماہ کی ایک بچی کپڑوں میں لپٹی ہوئی دروازے پر پڑی تھی۔''

''عجیب سی بات ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں بہت عجیب۔ میں تو خوفزدہ ہو گئی تھی۔ خدا جانے کون ہے۔ کون اسے میرے دروازے پر چھوڑ گیا ہے۔ طرح طرح کے خیالات ذہن میں آ رہے تھے۔ بچی کچھ اس طرح رو رہی تھی کہ مجھ سے رہا نہیں گیا۔ اسے اٹھا کر اندر لے آئی۔ گھر میں دودھ کا ڈبا پڑا ہوا تھا۔ دودھ بنا کر اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بچی کو پالا۔ اسی دوران میرے شوہر بھی آگئے۔ وہ اس زمانے میں زندہ تھے اور خوش قسمتی سے ان کا مزاج بھی میرے ہی جیسا تھا۔ اسی لیے وہ پریشان تو ہوئے لیکن ناراض نہیں ہوئے۔ انہوں نے مجھ سے کہا ذرا آس پاس کے فلیٹس میں معلوم کرو۔ شاید کوئی اس کے بارے میں جانتا ہو۔''

میں نے آس پاس معلوم کیا۔ لیکن کوئی بھی اس کے بارے میں کچھ نہیں بتا سکا۔ لوگوں نے مشورہ دیا کہ ہمیں پولیس میں رپورٹ کر دینی چاہیے تاکہ بعد میں ہم پر کوئی مصیبت نہ آئے۔

''اور آپ کے دونوں بیٹے۔ وہ کیا کہہ رہے تھے۔'' میں نے پوچھا۔

''وہ دونوں تو اس صورت حال سے بہت خوش تھے کیونکہ گھر میں ایک بچی آگئی تھی۔ انہیں بچی کا شوق تھا۔ خدا نے اس بچی کی صورت میں ایک بچی ہمیں دی تھی۔''

''کیا اس بچی کے والدین کا پتا نہیں چلا؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں۔ کچھ نہیں معلوم ہوا۔ پولیس والے بھی اپنی کوشش کرتے رہے۔ پھر عدالت نے باضابطہ طور پر وہ بچی میرے حوالے کر دی کہ میں اس کی پرورش کرتی رہوں۔''

''یہ تو بہت عجیب سی بات ہے۔''

''ہاں بہت عجیب۔ پتا نہیں کیسے لوگ ہوتے ہیں جو اپنے جگر کے ٹکڑوں کو اس طرح کہیں پھینک آتے ہیں۔'' اس نے کہا۔ ''بہرحال وہ بچی ہمارے یہاں پرورش پاتی رہی۔ ہم نے اس کا نام عالیہ رکھا تھا۔ وہ بہت خوبصورت اور ذہین بچی تھی۔ میرے دونوں بیٹے بہت خوش تھے۔ وہ اس کی ناز برداری میں لگے رہتے۔''

''اب وہ بچی کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''میں وہی بتا رہی ہوں۔ ہوا یہ کہ میری ایک دوست ایک طویل عرصے کے بعد مجھ سے ملنے آگئی۔ وہ پہلے بہت آیا کرتی تھی۔ اس کے بعد اس کی شادی ہو گئی اور وہ ملک سے باہر چلی گئی۔ مجھے بعد میں پتا چلا کہ وہاں جا کر وہ کچھ بیمار ہو گئی ہے اور بیماری بھی پیچیدہ قسم کی ہے۔ یعنی وہ ماں بننے کے قابل نہیں رہی تھی۔ لیکن اس کا شوہر ہر حال میں اس کا ساتھ دینے والا تھا۔ اس نے کہا کہ خدا کی یہی مرضی ہے۔ مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ وہ پاکستان واپس آچکی ہے اور جب وہ اچانک ہم سے ملنے آگئی تو میں حیران رہ گئی۔ عالیہ کو دیکھ کر وہ بھی حیرت زدہ ہوئی تھی۔

''ارے۔ یہ کب ہوئی تھی۔ تم نے تو اس کے بارے میں کچھ بتایا تک نہیں تھا۔''

''ارے بھائی۔ اس کی ایک الگ کہانی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اللہ نے اسے ہمارے گھر بھیجا تھا۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔ اللہ تو سب کو اسی طرح بھیجتے ہیں۔''

''لیکن اسے ذرا دوسرے انداز سے بھیجا ہے۔''

''یار۔ معما مت بناؤ۔ صاف صاف کہو۔''

پھر میں نے اسے عالیہ کی آمد کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا۔ ''تو یہ محترمہ اس طرح تشریف لائی ہیں اور اب یہ ہماری بچی بنی ہیں۔''

''کتنی پیاری بچی ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''خدا جانے لوگ اتنے بے رحم کیوں ہوتے ہیں۔''

''میں بھی یہی سوچا کرتی ہوں کہ لوگ ایسے کیوں ہوا کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ وہ اکثر ہمارے یہاں آنے لگی اور جب آتی تو بچی کے لیے کچھ نہ کچھ لے کر ہی آتی۔ میں اس کی توجہ کی وجہ سمجھ رہی تھی۔

وہ بے اولاد تھی اور اس کے یہاں اولاد ہونے کا کوئی امکان بھی نہیں تھا۔ اسی لیے اس نے ہماری عالیہ سے دل لگا لیا تھا اور ایک دن وہی ہوا جس کا ہمیں اندیشہ تھا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''سنو۔ اگر میں تم سے ایک درخواست کروں۔ ایک التجا کروں تو تم مان لوگی نا۔''

میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ کیا کہنے والی ہے۔

''بتاؤ۔ کیا کہنا ہے تمہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''تم عالیہ کو مجھے دے دو۔'' اس نے آخر وہ کہہ ہی دیا جس کا اندیشہ تھا۔

''عالیہ تمہیں دے دوں؟''

''ہاں۔ تم کو میرے دکھ اور میرے کرب کا اندازہ تو ہوگا۔'' اس نے کہا۔ ''میں بے اولاد ہوں اور کسی اولاد کے ہونے کی کوئی امید بھی نہیں ہے۔ تمہارے پاس ماشاءاللہ دو بیٹے ہیں۔ جبکہ میرا آنگن خالی ہے۔ اس کے آنے سے میرے گھر میں بھی بہار آ جائے گی۔''

''لیکن یہ تو سوچو کہ ہم نے اسے اپنے سینے سے لگا کر رکھا ہے۔'' میں جلدی سے بولی۔

''ہم بھی اسے سینے سے لگا کر ہی رکھیں گے۔'' اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے کہا۔ ”میں نے اپنے شوہر سے بھی اپنی اس خواہش کا اظہار کیا تھا۔ وہ بھی بہت خوش ہیں بلکہ انہوں نے تو آنے والے مہمان کے استقبال کی تیاریاں بھی شروع کر دی تھیں۔ نہ جانے کہاں سے ڈھیروں کھلونے اٹھا کر لے آئے ہیں۔ پلیز۔ میری بات رکھ لو۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے۔

اس کی حالت پر دکھ بھی ہو رہا تھا۔ بے اولادوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا کرتا ہے۔ سب کچھ ہونے کے باوجود ان کے پاس کچھ بھی نہیں ہوتا۔

میری دوست کے پاس سب کچھ تھا۔ اپنا گھر، محبت کرنے اور قربانی دینے والا شوہر۔ اپنی گاڑی۔ کپڑے زیور، بینک بیلنس سب کچھ، لیکن وہ اندر سے کتنی خالی تھی۔ اولاد کی نعمت سے محروم۔

”چلو ٹھیک ہے۔“ میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ”اب میرے شوہر تو اس دنیا میں نہیں رہے لیکن دونوں بیٹے ہیں۔ میں ان سے مشورہ کر لیتی ہوں۔“

”پلیز۔ انہیں میری طرف سے سمجھا دینا۔“ اس نے کہا۔ ”ان کو میری حالت بتا دو۔ یہ تمہارا ایسا احسان ہو گا کہ میں زندگی بھر تمہاری احسان مند رہوں گی۔“

مختصر یہ کہ میرے دونوں بیٹے یہ سنتے ہی بھڑک اٹھے تھے۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم اپنی زندگی ان کے حوالے کیسے کر دیں۔“

میں بہت دیر تک انہیں سمجھاتی رہی۔ انہیں بتایا کہ اللہ کے ہاں اس نیکی کا کتنا بڑا اجر ہے۔ خیر بڑی مشکلوں سے دونوں مان گئے اور میرے گھر کی رونق میری دوست کے گھر چلی گئی۔

”اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ بچی اب ان دونوں کے پاس ہی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ہاں۔ وہ وہیں رہتی ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ ان دونوں نے اس کی پرورش کا حق ادا کر دیا ہے۔ دنیا بھر کی نعمتیں اس کے سامنے لا کر رکھ دی ہیں۔ کیا نہیں ہے اس کے پاس اور اب تو وہ خیر سے سترہ اٹھارہ برس کی جوان لڑکی ہو چکی ہے۔“

”کبھی وہ آپ کے پاس بھی آتی ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”کیوں نہیں۔ ہفتے میں ایک دو دنوں کے لیے ضرور آتی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”ان دونوں نے ہم سے رشتہ ختم نہیں کیا ہے۔ بلکہ ہم ابھی تک اس کے لیے وہی ہیں۔“

”چلیں۔ یہ تو بہت اچھی بات ہوئی۔ دونوں گھر خوش اور مطمئن ہیں۔“

”ہاں۔“ اس کے ہونٹوں پر بڑی آسودہ سی مسکراہٹ تھی۔

”پلیز۔ اب وہ بچی آئے تو مجھ سے ضرور ملوایئے گا۔“ میں نے کہا۔

”ضرور۔ شاید وہ پرسوں آئے گی۔“ اس نے بتایا۔

”اب میں سمجھ گئی ہوں کہ میری بچی کے رونے کی آواز سن کر آپ کیوں پریشان ہو گئی تھیں۔“

”ہاں۔“ وہ ہنس پڑی۔ ”میں نے سمجھا تھا کہ شاید ہمارے لیے پھر کوئی امتحان آ گیا ہے۔“

میں نے یہ کہانی اپنے شوہر کو بھی سنائی۔ وہ بھی یہ سن کر حیران رہ گئے تھے۔ ”واقعی۔ خدا کی مصلحت وہی جان سکتا ہے۔ کسے معلوم تھا کہ وہ بے چاری بے سہارا لڑکی ان کی آنکھوں کا تارا بن جائے گی۔“

دو چار دن گزرے تھے کہ دروازے پر دستک ہوئی۔

میں نے دروازہ کھولا۔ میری پڑوسن حمیدہ ایک جوان اور خوبصورت لڑکی کے ساتھ کھڑی تھی۔ ”عظمیٰ۔ یہ ہے میری بچی عالیہ۔“ پڑوسن نے اس لڑکی کا تعارف کروایا۔

”جی ہاں۔ دو دن سے میں ان کو دیکھنے کی منتظر تھی۔“ میں نے کہا۔ ”آئیں اندر آ جائیں۔“

دونوں اندر آ گئیں۔ وہ لڑکی واقعی بہت پیاری بچی تھی۔ چہرے کے نقوش بہت دل کش تھے اور ایک خاص قسم کی تہذیب بھی تھی اس میں جو صرف اچھی تربیت کے نتیجے میں ہوتی ہے۔

اس لڑکی نے بتایا کہ اس نے انٹر کر لیا ہے اور اب وہ بی کام میں داخلہ لے رہی ہے۔

اس دوران میں حمیدہ نے مجھ سے کہا۔ ”عظمیٰ۔ تم نے اپنے کچن کا کیبنٹ کیسا بنا رکھا ہے۔“

”وہی جو عام طور پر ہوتا ہے۔“

”میں ذرا ایک نظر دیکھ لوں۔“ اس نے پوچھا۔ ”مجھے بھی بنوانا ہے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں۔“ میں نے کہا۔ ”آئیں میرے ساتھ۔“

میں اسے لے کر کچن میں آ گئی۔ یہاں آ کر اس نے کہا۔ ”کچن دیکھنے کا تو ایک بہانہ تھا۔ میں یہ بتانا چاہ رہی تھی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہ تم عالیہ کو مت بتانا کہ وہ کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے۔"

"کیا مطلب؟"

"مطلب یہ کہ وہ بے چاری صرف اتنا جانتی ہے کہ وہ میری بیٹی ہے۔ میں اس کی اصل ماں ہوں اور بابا نے اسے اپنی بے اولاد دوست کو دے دیا ہے۔ جو اس کی پرورش کر رہی ہے۔ یعنی عالیہ کو یہ نہیں معلوم کہ وہ کن حالات میں میرے فلیٹ کے دروازے پر ملی تھی۔ سمجھ گئیں نا۔"

"ہاں سمجھ گئی۔ ویسے اول تو میں اس سے ایسی فضول باتیں ہی نہیں کرتی۔ پھر بھی اچھا ہوا کہ آپ نے خبردار کر دیا۔ ہو سکتا تھا گفتگو میں کوئی ایسی بات منہ سے نکل جاتی۔"

"ہاں۔ بس یہی کہنا تھا۔ آ گئیں۔ اب واپس چلتے ہیں۔"

ہم دوبارہ ڈرائنگ روم میں آ گئے۔ تو عالیہ سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ اس کے بعد بھی وہ کئی بار میرے گھر آئی۔ بہت مہذب لڑکی تھی۔

ایک بار اس نے خود ہی بتایا۔ "آنٹی۔ میں شاہینہ ای کے یہاں بہت خوش ہوں۔ وہ مجھ سے اتنا پیار کرتی ہیں کہ کچھ نہ پوچھیں۔ میری ذرا سی تکلیف ان سے نہیں دیکھی جاتی۔"

"اور تمہاری اپنی ماں۔" میرا اشارہ حمیدہ کی طرف تھا۔

"ظاہر ہے وہ میری ماں ہیں۔" اس نے کہا۔ "ماں تو پیار کرتی ہی ہے۔ لیکن شاہینہ ای کا تو کوئی جواب ہی نہیں ہے۔"

"اور ان کے شوہر۔"

"بابا بھی بے انتہا پیار کرتے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "اگر اپنا باپ بھی ہوتا تو شاید اتنا پیار نہیں دیتا۔"

"چلو۔ یہ تو بہت اچھی بات ہے۔ تمہاری زندگی اچھی گزر رہی ہے۔"

"بہت اچھی۔" اس نے کہا۔ "ہر طرف سے پیار ہی پیار ملا ہے مجھے۔"

ایک بار میری ملاقات شاہینہ سے بھی ہو گئی۔ وہ حمیدہ سے ملنے آئی تھی۔ اور حمیدہ اسے میرے پاس لے آئی تھی۔ مجھے تو وہ بھی بہت اچھی لگی۔ بہت ملنسار۔ خوش اخلاق۔

ہم دونوں کے درمیان ذرا سی دیر میں اچھی خاصی انڈر اسٹینڈنگ ہو گئی تھی۔

دن اسی طرح گزرتے رہے۔ ابھی تک کوئی خاص بات نہیں ہوئی تھی۔ مجھے پھر ڈاکٹر بلقیس کے پاس جانا پڑ گیا۔ میرے گھر میں دوسری بے بی کی آمد تھی۔

ڈاکٹر بلقیس ایک ڈاکٹر ہونے کے علاوہ میری فرسٹ کزن بھی تھی اور اس سے بڑھ کر ہم ایک دوسرے کے بہت گہرے دوست تھے۔

خورشید بھی میرے ساتھ تھے۔ وہ مجھے کلینک ڈراپ کر کے کسی کام سے چلے گئے تھے۔ میں نے اس کلینک سے شاہینہ کو نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ بلقیس کی کلینک سے نکل کر تیزی سے ایک طرف چل دی۔ وہ مجھے نہیں دیکھ سکی تھی۔ مجھے بلقیس کے کلینک میں اسے دیکھ کر حیرت ہوئی تھی کیونکہ بلقیس ایک گائنا کالوجسٹ تھی اور گائنا کالوجسٹ کے یہاں شاہینہ کا کیا کام ہو سکتا تھا کیونکہ وہ تو بے بی پیدا کرنے کے قابل ہی نہیں تھی۔

بہر حال یہی سب سوچتی ہوئی میں بلقیس کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ وہ مجھے دیکھ کر خوش ہو گئی تھی۔ "آؤ۔ آؤ۔ میں جانتی تھی کہ تم آج کل میں میرے پاس آنے ہی والی ہو۔"

"تجھ بل۔ میں تیرے علاوہ اور جا بھی کہاں سکتی ہوں۔"

میں اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔ "یار۔ ایک بات بتا۔ ابھی ابھی تیرے کلینک سے ایک عورت نکل کر گئی ہے۔ تو تو نے بتایا کہ اس کا علاج تو کوئی نہیں ہے پھر وہ کیوں آئی تھی۔"

"ہاں شاہینہ نام ہے اس کا۔ کچھ دنوں پہلے وہ میری منتظر ہوئی ہے۔" اس نے بتایا پھر پوچھا۔ "تجھے اتنا تجسس کیوں ہے؟"

"پہلے یہ بتاؤ۔ کیا ہوا ہے اس کو؟" میں نے پوچھا۔

"جہالت کہہ لو۔ یا پکڑے جانے کا خوف کہہ لو۔ اس نے اپنا اندرونی سسٹم بالکل برباد کر ڈالا ہے۔ شروع شروع میں تو اندازہ نہیں ہو سکا تھا لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پیچیدگیاں ہوتی چلی گئیں۔"

"میں نہیں سمجھی۔ کیا سسٹم تباہ ہوا ہے۔"

"یار۔ اصل کہانی یہ ہے کہ میں اس عورت کو گزشتہ سات آٹھ برسوں سے جانتی ہوں۔" بلقیس نے بتایا۔ "مریضہ کی حیثیت سے میرے پاس آئی تھی پھر آہستہ آہستہ اس سے دوستی سی ہو گئی۔ میں خود پریشان تھی کہ آخر اس میں ایسی خرابی کیوں پیدا ہوئی۔ یہ تو مس ہینڈلنگ کی وجہ سے ہوئی ہے۔ پھر میرے کریدنے پر اس نے مجھے اپنے بارے میں سب کچھ بتا دیا تھا۔"

"میرے خدا۔" میں نے ایک گہری سانس لی۔ "کیا اس کے ساتھ کوئی کہانی وابستہ ہے۔"

"ہاں۔ بہت عجیب کہانی۔" بلقیس نے بتایا۔ "یہ کہانی اب سے سترہ اٹھارہ برس پہلے کی ہے۔ موصوفہ اس زمانے میں ایک لڑکے سے محبت کرتی تھیں۔ دونوں ایک

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دوسرے کو بہت پسند کرنے تھے۔ وہی تمام حماقت بھری باتیں جو ایسی محبتوں کے درمیان ہوا کرتی ہیں۔"

"اچھا اچھا۔ آگے سناؤ۔" میں جل کر بولی۔ "تم تو جنم جنم سے محبت کی دشمن چلی آرہی ہو۔"

"یار۔ میں محبت کی دشمن نہیں ہوں۔ بلکہ محبت میں آنکھیں بند کر لینے کے خلاف ہوں۔ جیسے ان موصوف نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اور اس کے نتیجے میں ایک عدد بچی دنیا میں آگئی۔"

"کیا؟" اب مجھے جھٹکا سا لگا تھا۔ "یعنی شادی کے بغیر۔"

"جی ہاں۔ شادی کے بغیر اور اس وقت چونکہ کچھ ایسی تھی کہ دونوں کی ایک دوسرے سے شادی بھی نہیں ہوسکتی تھی۔ کچھ خاندان والے، دونوں طرف سے خلاف تھے۔ خود سوچو ایک لڑکی نے آخر کس طرح نو مہینوں تک اپنے اس گناہ کو چھپایا ہوگا۔"

"اور تو کیا اس نے ضائع کروانے کی کوشش نہیں کی۔"

"کئی بار۔" بلقیس نے بتایا۔ "لیکن نہیں ایسا تھا کہ کسی نے ہاتھ نہیں لگایا۔ اب اولاد کو جنم دینا اس کی مجبوری ہوگئی تھی اسی لیے وہ ایک ان پڑھ قسم کی مڈوائف کے ہتھے چڑھ گئی۔ ولادت تو ہوگئی۔ لیکن اسی دن سے اس کے جسمانی نظام میں خرابیاں پیدا ہوگئیں۔"

"بلقیس تم تو عجیب کہانی سنا رہی ہو اور بچی، وہ کہاں ہے۔"

"سنتی تو رہو۔ کیسی حیرت انگیز کہانی ہے۔" بلقیس نے کہا۔ "اس بچی کو اس نے اپنی ایک سہیلی کے فلیٹ کے دروازے پر چھوڑ دیا تھا۔"

"کیا؟" یہ مجھے دوسرا جھٹکا لگا تھا۔

"تمہیں کیا ہو رہا ہے۔" بلقیس نے پوچھا۔ "تم کیوں اتنی حیران ہو رہی ہو۔"

"یہ میں تمہیں بعد میں بتاؤں گی۔" میں نے کہا۔ "تم سناتی رہو۔ آگے کیا ہوا۔"

"اسے یقین تھا کہ وہ سہیلی اس لاوارث بچی کی ضرور پرورش کرے گی کیونکہ وہ بہت ہی ہمدرد قسم کی عورت ہے اور ہوا بھی یہی۔ اس سہیلی نے اس بچی کی دو تین سال تک پرورش کی۔ اسے اپنے سینے سے لگا کر رکھا۔ اور......"

"اور اب میں سناتی ہوں۔" میں اچانک بول پڑی۔ "اس کے بعد یہ ہوا کہ وہ عورت ایک دن اپنی پرانی سہیلی کے پاس پہنچ گئی۔ اس سہیلی کے جس کے دروازے پر وہ بچی کو چھوڑ کر گئی تھی۔ اور اس نے بچی کو دیکھ کر اپنی محبت اور دلچسپی ظاہر کی۔ اسے یہ اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ اسی کی بچی ہے۔ اس نے اپنی سہیلی کے سامنے اپنی بے اولادی کا رونا رویا اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اس بچی کو گود لینا چاہتی ہے۔ وہ اس کی پرورش کرے گی۔ اس سہیلی نے اس پر ترس کھا کر بچی اس کے حوالے کردی اور اب وہ بچی اس کے پاس ہے۔ جوان ہوچکی ہے۔"

"ارے۔ تجھے یہ سب کیسے معلوم۔"

"اس لیے کہ میں اس بچی سے مل چکی ہوں۔" میں نے بتایا۔ پھر ساری کہانی سنا دی۔

اب حیران ہونے کی باری بلقیس کی تھی۔ "میرے خدا یہ قدرت بھی کیسے کیسے تماشے دکھاتی ہے۔ چلو۔ اب میں تمہیں ایک خبر سنا رہی ہوں۔"

"وہ کیا۔"

"وہ یہ ہے کہ بعد میں حالات کچھ ایسے ہوگئے کہ اس کی شادی اسی شخص سے ہوگئی۔ جس سے وہ بچی پیدا ہوئی تھی۔" اس نے بتایا۔

"کیا؟" میں اچھل پڑی تھی۔

"ہاں۔ اس کا شوہر وہی ہے اور تمہاری کہانی کے مطابق وہ بچی اپنے اصل ماں باپ کے ساتھ ہی رہ رہی ہے۔"

"کیسی حیرت انگیز بات ہے۔ وہ ان کی اپنی بچی ہے۔ خود ان ہی کے گھر میں ہے۔ اس کے باوجود وہ اسے اپنا نہیں کہہ سکتے۔"

"دیکھو۔ وہ بچی ان کی قسمت میں لکھی ہوئی تھی لیکن وہ ناجائز طور پر اسے دنیا میں لائے۔ اگر نکاح کے بعد آجاتی تو اپنا تو کہہ سکتے تھے۔"

"میرے خدا۔ انسان ایسے بھید کو سمجھنے کے قابل ہی نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "جو چیز انہیں جائز طور پر ملنے والی تھی، وہی انہوں نے ناجائز طور پر حاصل کرلی۔"

بہرحال اب یہ بھید ظاہر ہوچکا ہے۔ تم اپنی پڑوسن سے اس کا ذکر مت کردینا۔ جب خدا نے ان کے راز کو چھپائے رکھا تو ہم کون ہوتے ہیں ظاہر کرنے والے۔"

میں نے کسی کو نہیں بتایا۔ یہ راز آج تک میرے سینے میں تھا۔ لیکن اب نام اور مقام بدل کر یہ کہانی اس لیے لکھ رہی ہوں کہ پڑھنے والوں کو اندازہ ہوجائے کہ خدا کے کام کیسے ہوتے ہیں۔ وہ کس طرح بظاہر بے سہارا کو سہارا دے دیتا ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بلاوا

محترم ایڈیٹر

السلام علیکم

میں عرصہ دراز سے سرگزشت کا مطالعہ کررہا ہوں۔ اس بار ایک سچ بیانی کے ساتھ حاضر ہوا ہوں تاکہ لوگ سبق حاصل کریں۔ بعض باتیں عقل سے ماوری ہوتی ہیں مگر انہیں جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ اس اُمید پر یہ واقعہ بھیج رہا ہوں کہ آپ بھی اسی نکتے کو مدنظر رکھیں گے۔

اسلم بٹ

(سرگودھا)

زندگی اس قسم کے واقعات سے بھری رہتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ بہت کچھ ہماری سمجھ میں آجاتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ کچھ بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ آخر کیوں! ایسا کیوں ہوا؟

کون سی طاقت تھی جس نے کسی کو کھینچ کر بلا رکھا ہے اور وہ کون سی کشش ہے جو کسی کو اپنی طرف کھینچتی چلی جاتی ہے۔

میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں۔ لیکن یہ واقعہ ابھی تک

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میرے ذہن میں اسی طرح محفوظ ہے جیسے کل ہی گزرا ہو۔ حالانکہ اس کو برسوں بیت چکے ہیں۔

ہم مرزاپور میں رہتے تھے۔ یہ ایک چھوٹا سا قصبہ تھا۔ صرف ایک مرکزی سڑک تھی۔ جس کے دو رویہ دکانیں بنی ہوئی تھیں اور جہاں ضرورت کا ہر سامان مل جایا کرتا۔

ہمارے قصبے میں ایک لڑکیوں کا اسکول تھا اور ایک لڑکوں کا۔ میٹرک کے بعد جس کو زیادہ تعلیم حاصل کرنا ہوتی وہ شہر کی طرف نکل جاتا۔

پورے قصبے میں صرف ایک بڑی مسجد تھی۔ میرے والد صاحب اس مسجد کے امام بھی تھے اور قصبے میں ان کی کریانے کی دکان بھی تھی۔

جب نماز کا وقت ہوتا تو دکان بند کر کے مسجد چلے جاتے۔ اذان دینے کے لیے کوئی خاص آدمی مقرر نہیں تھا۔ جس کو موقع ملتا وہ اذان دے لیا کرتا۔ البتہ امامت والد صاحب ہی کیا کرتے تھے۔

قصبے میں ان کی بہت عزت تھی۔ قصبے کے رئیس کا نام وقار تھا۔ ایک شریف اور نیک انسان۔ وہ اذان سنتے ہی مسجد میں آجاتا اور نماز کے بعد بھی بہت دیر تک مسجد میں بیٹھا لوگوں کی خیریت معلوم کیا کرتا۔

میں اسکول میں پڑھا کرتا تھا۔

لوکیشن ایسی تھی کہ لڑکے اور لڑکیوں کے اسکول ذرا سے فاصلے پر تھے۔ یعنی ہم لڑکے اسکول آنے جانے کے لیے اس راستے سے گزرتے تھے جس پر لڑکیوں کا اسکول واقع تھا۔

میں ساتویں میں پڑھا کرتا تھا۔ حالانکہ تعلیم کا ماحول ایسا نہیں تھا کہ حسن اور عشق کے روایتی جذبے جنم لے سکیں۔ اس کے باوجود غزالہ مجھے بہت اچھی لگنے لگی تھی۔

وہ قصبے کے ایک دکاندار رحیم اللہ کی اکلوتی بیٹی تھی۔ بہت خوبصورت اور چنچل سی۔ اس کا گھر ہمارے گھر سے بہت فاصلے پر تھا۔

یہ اتفاق تھا کہ اسکول آنے جانے ہوئے اس سے ٹکراؤ ہو جایا کرتا۔ اس وقت وہ بھی اپنے اسکول کی طرف یا تو آ رہی ہوتی یا پھر اسکول جا رہی ہوتی۔

میرے ساتھ اور بھی کئی لڑکے ہوا کرتے تھے۔ ان میں ایک افضل بھی تھا۔ قصبے کے رئیس وقار کا بیٹا۔ وقار صاحب جتنے شریف اور نیک انسان تھے افضل ان کے برعکس تھا۔

ایک نمبر کا شرارتی اور جھگڑالو۔ خود سر قسم کا لڑکا۔ اس کو اس بات کا غرور تھا کہ اس کا باپ اس قصبے کا سب سے دولت مند انسان ہے۔

کبھی کبھی اس کی حرکتیں بہت نازیبا ہو جاتیں۔ وہ اشاروں سے بھی بدتمیزی کرنے لگتا تھا۔

تو بات ہو رہی تھی غزالہ کی۔ وہ لڑکی مجھے اچھی لگتی تھی اور میں یہ محسوس کرنے لگا تھا کہ اگرچہ میرے ساتھ دوسرے لڑکے بھی ہوا کرتے تھے لیکن وہ بس مجھے ہی دیکھا کرتی تھی۔

اس کے دیکھنے کا انداز یہ بتا دیتا تھا کہ اس کو بھی مجھ سے دلچسپی ہے۔ میرے ساتھ چلنے والے دوسرے لڑکوں نے بھی اس بات کو محسوس کر لیا تھا۔ وہ مجھے کبھی مار دیا کرتے۔ ''دیکھو یار تیری والی آ رہی ہے۔''

''اچھا بس نا چپ رہو۔'' میں بظاہر تو انہیں ڈانٹ دیتا۔ لیکن اندر سے لڈو پھوٹ رہے ہوتے۔

البتہ افضل منہ بنائے رکھتا جیسے اسے مجھ سے یا غزالہ سے چڑ محسوس ہو رہی ہو۔ ایک بار تو اس نے حد ہی کر دی۔ اس نے کلاس ٹیچر سے شکایت کر دی۔ ''ماسٹر صاحب! یہ اسلم کس چکر میں پڑ گیا ہے۔''

''چکر میں پڑ گیا ہے! کس چکر میں پڑ گیا ہے۔''

''یہ آپ اسی سے معلوم کر لیں سر۔''

''کیوں بھائی اسلم کس چکر میں پڑ گئے ہو۔'' ماسٹر صاحب نے مجھ سے پوچھا۔

''پتا نہیں سر۔ میں تو کچھ نہیں جانتا۔'' میں نے کہا۔

''آپ تو دا افضل سے پوچھ لیں۔''

ماسٹر صاحب نے اس کے بعد کسی سے کچھ نہیں پوچھا۔ میں بتا چکا ہوں کہ قصبے کا ماحول ایسا تھا کہ اس قسم کے چکر نہیں چلائے جاتے تھے۔ سب ایک دوسرے کو جانتے تھے۔ ایک دوسرے کے گھروں میں آنا جانا تھا لیکن ان کم بخت دل کو کیا کیا جائے۔

یہ کسی کو بھی پسند کر سکتا ہے۔ بہرحال اس دن کلاس روم میں افضل نے جو حرکت کی تھی وہ مجھے بہت بری لگی تھی۔ چھٹی کے بعد جب ہم واپس جانے لگے تو میں نے افضل کو پکڑ لیا۔ ''اب بتاؤ میں کس چکر میں ہوں۔''

''یہ تم خود ہی بتاؤ۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔

''بکواس مت کرو۔'' میں غصے سے دہاڑا۔ ''اگر تم نے آئندہ کوئی ایسی بات کی تو میں تمہارا دانت توڑ دوں گا۔''

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

''اچھا۔'' وہ کینہ توز نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگا۔ ''واہ بیٹا پول کھلنے لگی تو بکواس کرنے لگے۔''

''اب کیسا پول۔ کس کا پول۔''

''سب جانتا ہوں میں۔ وہ لڑکی تجھے یوں ہی تو نہیں دیکھتی۔ کوئی نہ کوئی گڑبڑ ضرور ہے۔''

حیرت کی بات ہے کہ ہماری عمریں بھی زیادہ نہیں تھیں۔ ہم ساتویں، آٹھویں کے طالب علم تھے۔ ہمارا ماحول بھی ایسا کھلا ڈھلا نہیں تھا۔ اس کے باوجود ہم اس قسم کی باتیں کرنے لگے تھے۔

میں اس کمینے کو مارنا چاہتا تھا لیکن دوسروں نے مجھے پکڑ لیا۔ اس طرح اس دن کے بعد سے میرے اور اس کے درمیان اس لڑکی کے حوالے سے ایک طرح کی دشمنی کا شروع ہو گئی تھی۔ حالانکہ غزالہ سے میری بات چیت بھی نہیں تھی۔ ہم ایک دوسرے کو بس دیکھ لیا کرتے تھے۔ اس سے زیادہ کیا تھا۔

خیر اس دن کے بعد سے ہم ایک دوسرے سے کھنچے کھنچے رہنے لگے۔ اس نے ہمارے گروپ کے ساتھ اسکول آنا جانا بھی چھوڑ دیا تھا۔ بلکہ وہ دوسرے گروپ کے ساتھ آیا جایا کرتا۔

بہت سے لڑکے تھے اس قصبے میں اور وہ سب اسی اسکول میں پڑھا کرتے تھے۔ ایک دن ایک عجیب بات ہوئی۔

ایک شام میں گھر سے باہر کھیلنے کے لیے نکلا تو وہی لڑکی غزالہ میرے گھر کے سامنے کھڑی تھی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گیا تھا کیوں کہ اس کا گھر میرے گھر سے فاصلے پر تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ تیزی سے میرے پاس آگئی۔ ''سنو تم میرے لیے جھگڑا نہ کیا کرو۔'' اس نے کہا۔

''کس نے کہا کہ میں تمہارے لیے جھگڑا کرتا ہوں۔''

''اسی کمینے افضل نے۔'' اس نے بتایا۔ ''وہ کل اپنی ممی کو لے کر ہمارے گھر آ گیا تھا اور پتا نہیں کیا کیا بول کر گیا ہے۔ میں تم کو یہی بتانے آئی تھی۔''

''تم یہ بتانے کے لیے اتنی دور چلی آئیں۔''

''نہیں تو سامنے میری خالہ بھی تو رہتی ہیں۔'' اس نے ایک گھر کی طرف اشارہ کیا۔ ''میں پہلے تو ان کے پاس آئی پھر چپکے سے نکل کر تمہارے پاس آگئی۔''

واثق باللہ

صحت مند، حسین و جمیل انسان۔ عباسی عہد کا خلیفہ۔ نام ابوجعفر ہارون، لقب واثق باللہ۔ ایک صاحب عقل انسان، صاحب ذوق شاعر۔ 20 شعبان 196ھ کو قراطیس نامی رومی کنیز کے بطن سے پیدا ہوا۔ اپنے باپ معتصم باللہ کے عہد خلافت میں ہی ولی عہد مقرر ہو گیا تھا۔ ربیع الاول 227ھ میں والد کی وفات کے بعد عنان حکومت سنبھالی۔ خلاف معمول ترکوں کی مخالفت مول لینے کی بجائے اس نے ان پر لطف و کرم کی بارش کر دی۔ ان کو بڑے بڑے مناصب دیے۔ مراد اشناس نامی ترک کو نائب السلطنت کا عہدہ جلیلہ دیا۔ اس سے قبل کسی خلیفہ نے اپنا نائب مقرر نہ کیا تھا۔ اس کے عہد کی ابتدا میں قیسیوں نے فتنہ و شر کی آگ بھڑکائی۔ اس نے رجاء بن ایوب کو فوج کا کمانڈر بنا کر بھیجا جس نے ڈیڑھ ہزار قیسیوں کو موت کے گھاٹ اتار کر امن قائم کیا۔ اسی دوران میرقع نامی تخریب پسند کو بھی گرفتار کیا۔

مرسلہ: عاطف حسین، شیخوپورہ

''لیکن تمہیں کیسے پتا کہ میں گھر سے باہر نکلوں گا۔''

''پتا ہے مجھے۔ تم سب شام کو میدان میں فٹ بال کھیلتے ہو۔ اس لیے پتا ہے۔''

اس کا اس طرح باتیں کرنا مجھے بہت اچھا لگ رہا تھا۔ ''اچھا! یہ بتاؤ کہ تم مجھے کیوں دیکھا کرتی ہو۔''

''نہیں پہلے تم بتاؤ کہ تم کیوں دیکھتے ہو۔''

ان دونوں ہی کے پاس اس سیدھے سادے سوال کا کوئی جواب نہیں تھا پھر ہم وہاں سے ہٹ کر ایک کنوئیں کے پاس آ کر بیٹھ گئے۔ یہ کنواں بہت پرانا تھا۔ اس میں اب پانی نہیں تھا۔ اس لیے کوئی اس کی طرف نہیں آیا کرتا۔ وہ کنواں اونچے اونچے پودوں کے درمیان چھپا ہوا تھا۔

ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ یہ میری پہلی محبت کا پہلا دن تھا۔ ایسی سرشاری تھی کہ میں بتا نہیں سکتا۔ آسمان اور زمین اپنی گرفت میں محسوس ہو رہے تھے۔

ہم نے کوئی خاص باتیں نہیں کیں۔ بس ایک دوسرے کو دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے رہے۔ میں نے ایک بار اس کا ہاتھ بھی تھام لیا اور بہت دیر تک اپنے ہاتھ میں لیے بیٹھا رہا۔

پھر وہ دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔ ویسے بھی ہمیں باتیں کرتے ہوئے بہت دیر ہو چکی تھی۔ میں اس شام

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کھیلنے بھی نہیں گیا۔ ایسی رنگین کیفیت میں کھیل کی طرف کون دھیان دیتا۔

ساری رات میں خوشی سے سو نہیں سکا۔ اس کے باوجود میں جلدی اٹھ گیا۔ کیونکہ اسکول جانا تھا اور اسکول کے راستے میں اس سے ملاقات ہوتی تھی۔

میں لڑکوں کے ساتھ اسکول روانہ ہو گیا۔ میں اتنا خوش تھا کہ میرے ساتھ چلنے والے لڑکوں نے بھی میری یہ خوشی محسوس کر لی تھی۔

وہ بار بار پوچھ رہے تھے اور میں ان کو ٹال رہا تھا۔

پھر مجھے غزالہ دکھائی دے گئی۔ وہ لڑکیوں کے ساتھ اسکول کی طرف آ رہی تھی۔

ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا اور دھیرے سے مسکرا دیے۔ شاید یہ مسکراہٹ کسی نے بھی نہیں دیکھی ہو گی جو ہمارے ہونٹوں پر مچل گئی تھی۔

اسکول بھی آج نیا نیا سا لگ رہا تھا۔ شاید پہلی بار محبت حاصل ہو تو ایسا ہی احساس ہوا کرتا ہے۔

اس کے بعد یہ ہمارا معمول بن گیا۔ ہر دوسرے تیسرے دن ہم بہت خاموشی کے ساتھ ایک دوسرے سے مل لیا کرتے۔ اسی کنویں کے پاس۔

شاید برسوں کے بعد ہیر رانجھا اور لیلیٰ مجنوں وغیرہ کی محبت پھر دہرائی جا رہی تھی۔ ایسا ہی سب کچھ اس زمانے میں بھی ہوتا ہو گا۔

اور جب محبت پروان چڑھ رہی ہو گی تو اس وقت کوئی رقیب درمیان میں آ جاتا ہو گا۔ جس طرح افضل ہمارے درمیان آ گیا تھا۔ اس کم بخت کو نہ جانے ہماری ملاقاتوں کا پتا کیسے چل گیا۔ ایک دن اس نے مجھ سے اس وقت بات کی جب ہم اسکول سے گھر جا رہے تھے۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ وہ اب ہمارے ساتھ نہیں چلتا تھا بلکہ اس نے ایک دوسرا گروپ بنا لیا تھا۔ وہ اپنے گروپ کے لڑکوں کو چھوڑ کر ہماری طرف آیا اور مجھ سے بولا۔ ''سنو! مجھے تم سے ایک بات کرنی ہے۔''

''کیا بات کرنی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''ادھر آ جاؤ۔'' اس نے ایک طرف اشارہ کیا۔

مجھے کیا ڈر ہو سکتا تھا۔ میں اس کے ساتھ ایک طرف آ گیا۔ ''ہاں اب بتاؤ کیا بات ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''دیکھو تم اس لڑکی کا پیچھا چھوڑ دو۔'' اس نے کہا۔

''مجھے پتا چل گیا ہے کہ تم دونوں چھپ چھپ کر ملتے رہتے ہو۔''

''تو پھر تم کو کیا تکلیف ہے۔ تم کون ہوتے ہو اس کے۔''

''اس کو میں بھی پسند کرنے لگا ہوں۔'' وہ ڈھٹائی سے بولا۔ ''اس کو تم چھوڑ دو۔''

''کیوں، کیا تمہاری کوئی دھونس ہے۔''

''ٹھیک ہے۔ دیکھ لوں گا۔'' وہ غصے سے بولا اور اپنے دوستوں کے پاس چلا گیا۔ جب کہ میں اپنے دوستوں کے ساتھ آ کر مل گیا تھا۔

میرے ساتھیوں نے کوشش کی کہ افضل کسی طرح اس قسم کی حرکتوں سے باز آ جائے لیکن اس پر تو گویا جنون سا سوار ہو چکا تھا۔

اس کا سبب اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ وہ اس زمانے سے خود کو بہت اعلیٰ سمجھتا ہو گا۔ اس کا باپ پورے قصبے کا سب سے امیر آدمی تھا۔ افضل کے پاس بہت اچھے کپڑے ہوا کرتے تھے۔ اس کے جوتے بہت مہنگے ہوا کرتے۔ اس کے پاس ہر دو مہینوں کے بعد کتابوں کے لیے نیا بستہ آ جاتا۔ جب کہ میرے پاس ایسا کچھ بھی نہیں تھا۔ پھر وہ لڑکی اس کی طرف متوجہ کیوں نہیں ہوئی۔ میری طرف کیوں دھیان دے رہی تھی۔

اور اب تو معاملہ دھیان سے بھی آگے جا چکا تھا۔ غزالہ تو مجھ سے باقاعدہ ملاقاتیں کرنے لگی تھی۔ یہ سب افضل کو کیسے گوارا ہو سکتا تھا۔ اس لیے وہ خوا مخواہ کا رقیب بن کر میرے راستے میں آنے لگا تھا۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ قصبے میں ایک بڑا سا میدان تھا۔ ہم لڑکے شام کے وقت اس میدان میں فٹ بال کھیلا کرتے۔ فٹ بال ہمارا پسندیدہ کھیل تھا۔ کیوں کہ اس میں اچھی خاصی ورزش ہو جاتی تھی۔

افضل تو اب ہمارے گروپ سے الگ ہی ہو چکا تھا۔ اس کے باوجود وہ فٹ بال کھیلنے کے لیے ضرور آیا کرتا۔ میدان کے دوسری طرف ایک کچا راستہ تھا جس پر اونچے اونچے درخت تھے۔

اس راستے پر ٹریکٹرز اور دوسری گاڑیوں کا آنا جانا ہوا کرتا۔ یہی راستہ آگے جا کر پکی سڑک سے مل جاتا تھا۔

ایک دن نہ جانے کس طرح غزالہ اور افضل اس راستے پر ایک دوسرے کے آمنے سامنے آ گئے۔ یہ سب بعد میں معلوم ہوا تھا کیونکہ اپنی خالہ کے بہانے ہی وہ مجھ سے ملنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

آ رہی تھی۔ اس قصبے میں لڑکیوں کا اس طرح آنا جانا کوئی خاص بات نہیں تھی۔

اس زمانے میں غنڈہ گردی وغیرہ نہیں ہوا کرتی تھی اور نہ ہی قصبے میں کسی قسم کی واردات سننے میں آتی تھی۔

بہرحال وہ دونوں ایک دوسرے کے سامنے آگئے۔ افضل کے لیے یہ بہت اچھا موقع تھا۔ اس نے نہ جانے غزالہ سے کیا بدتمیزی کی کہ وہ بری طرح بھڑک اٹھی۔ اس نے افضل کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ افضل بھی نہ جانے کس جنون میں تھا کہ اس نے غزالہ کو ایک زوردار تھپڑ مار دیا۔

وہ نازک سی لڑکی اس کا تھپڑ کھا کر ایک طرف جا گری۔ اس کا سر ایک درخت سے ٹکرا کر پھٹ گیا۔ وہ لہولہان ہو گئی تھی۔

اگرچہ اسے زیادہ نقصان نہیں ہوا تھا۔ سوائے سر پھٹ جانے کے۔ لیکن افضل نے جب اس کا خون آلود چہرہ دیکھا تو ڈر کر فرار ہو گیا۔

غزالہ خود ہی کسی طرح گھر واپس چلی گئی تھی۔ اس نے افضل کا نام نہیں لیا۔ بلکہ یہ کہا کہ وہ گر گئی تھی اور درخت سے ٹکرا کر سر پھٹ گیا۔

اس کے سر پر کئی دنوں تک پٹی بندھی رہی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد ٹھیک ہو گئی۔ وہ تو مجھ سے بھی چھپانا چاہ رہی تھی اور اس نے بتایا بھی نہیں کہ اس کے ساتھ کیا ہوا ہے۔

شاید اسے یہ خوف تھا کہ میں افضل سے جھگڑا نہ شروع کر دوں۔ اس لیے اس نے مجھے کچھ نہیں بتایا۔ پھر کئی دن گزر گئے۔

اور وہ شام آگئی جب وہ پراسرار واقعہ پیش آیا جس کے گواہ ہم سب ہیں اور شاید میری طرح بہت سوں کو آج بھی یاد ہوگا۔

ہم سب معمول کی طرح فٹ بال کھیلنے کے لیے میدان میں جمع ہوئے۔ اس بار ہم نے آپس میں میچ کھیلنا تھا۔ دو ٹیمیں بن گئی تھیں۔

افضل مخالف ٹیم میں تھا۔ جو بہت کینہ توز نگاہوں سے مجھے دیکھے جا رہا تھا۔

میچ شروع ہوا۔ فٹ بال میدان میں لڑھکتا رہا کبھی ادھر کبھی اُدھر۔ میں بہت اچھا کھلاڑی سمجھا جاتا تھا۔ جب بال میرے پاس آئی تو میں عام طور پر گول کرنے میں کامیاب ہی ہو جاتا تھا۔ اس دن بھی پہلا گول میں نے ہی کیا تھا۔

پھر بال افضل کے پاس آگئی۔ وہ بال لے کر ہمارے گول پوسٹ کی طرف بڑھا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا کہ فٹ بال کا رخ میدان سے باہر کی طرف ہو گیا۔

افضل فٹ بال کے پیچھے تھا۔ اس نے فٹ بال کے پیچھے دوڑ لگا دی لیکن فٹ بال حیرت انگیز طور پر میدان سے باہر اسی طرح لڑھکتی رہی جیسے کوئی طاقت اسے کھینچ کر لے جا رہی تھی۔

ہم سب کھڑے ہو کر دیکھ رہے تھے۔ لڑھکتے لڑھکتے وہ فٹ بال رک جاتا تھا اور جب افضل دوڑتا ہوا اس کے پاس پہنچتا تو وہ پھر آگے کی طرف لڑھکنے لگتی۔

ہم لڑکے یہ تماشا دیکھ کر پیچھے پیچھے آنے لگے۔ فٹ بال لڑھکتا جا رہا تھا۔ افضل اس کے پیچھے تھا۔ میدان کی حد ختم ہو گئی۔ وہ کچا راستہ آگیا لیکن فٹ بال کا لڑھکنا جاری رہا۔ جب کہ افضل بھی ایک جنونی کیفیت میں اس کے پیچھے دوڑتا رہا۔

جیسے وہ فٹ بال اسے چیلنج کر رہی ہو۔ اسے اپنے پاس بلا رہی ہو اور جب افضل اس کے پاس پہنچتا تھا تو وہ پھر لڑھکنے لگتی۔

کوئی نہ کوئی غیر معمولی بات ضرور تھی۔ خود میں نے چاہا کہ آواز دے کر افضل کو روک لوں لیکن وہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

اور اچانک کسی طرف سے ایک جیپ نمودار ہوئی اور افضل کی طرف آنے لگی۔ افضل کا دھیان فٹ بال کی طرف تھا۔ ہم سب شور کرنے لگے لیکن اس کی قضا ہی آچکی تھی۔

جیپ والے نے اسے بچانے کی بہت کوشش کی تھی لیکن بچا نہیں سکا۔ افضل کو جیپ کی ٹکر لگی اور وہ اچھل کر ایک درخت سے ٹکرا کر ساکت ہو گیا۔ وہ مر چکا تھا۔

تو یہ تھا وہ واقعہ جو آج بھی میرے حافظے میں محفوظ ہے۔ کئی برسوں کے بعد غزالہ ہی سے میری شادی ہوئی۔ شادی کے بعد اس نے بتایا کہ افضل نے اس کے ساتھ کیا کیا تھا اور وہ درخت سے ٹکرا کر زخمی ہو گئی تھی۔

اور یہ وہی درخت تھا جس سے ٹکرا کر افضل کی موت ہوئی تھی۔

تو زندگی ایسے واقعات سے بھری رہتی ہے اور ہم نظر انداز کر کے بازو آگے بڑھ جاتے ہیں یا ہمیشہ کے لیے انہیں یادوں میں محفوظ کر لیتے ہیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

چڑیل

محترم مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
گوکہ یہ سرگزشت اس دور کی ہے جب آتش جوان تھا۔ یہ بڈھا کھوسٹ خود کو سورما تصور کیا کرتا تھا کیونکہ جوانی کا اپنا زعم ہوتا ہے۔ اسی دور کا ایک واقعہ ارسال کررہا ہوں امید ہے پسند آئے گا۔
فقط
احمد حسن
(حیدر آباد)

میں رسول پور پہلی دفعہ گیا تھا مگر یہاں کے بارے میں کہانیاں بہت سن رکھی تھیں، یہ کہانیاں رسول پور میں واقع میری ننھیال کی تھیں۔ ان کی شاندار قدیم حویلی کی تھیں۔ ان کی طرز رہائش کی تھیں۔

میرا ننھیال مخدوموں کا تھا۔ بہت سے نامور اس خاندان میں پیدا ہوئے تھے۔ وہ سب اپنی اپنی جگہ بہت مشہور لوگ تھے۔ میرے تین ماموں تھے۔ وہ بھی اسی شاندار حویلی میں ایک ساتھ رہا کرتے۔ پھر ان کی اولادیں تھیں۔ یعنی لمبا چوڑا کنبہ تھا۔

یہ قدیم حویلی میری ننھیال کی شان و شوکت کی امین تھی۔ میں بہت پہلے بچپن میں یہاں آیا تھا اور اب برسوں بعد اپنے ایک ماموں زاد کی شادی میں شرکت کے لیے اپنے گھر والوں یعنی امی اور بہنوں کے ساتھ جا رہا تھا جب کہ ابو تو شادی سے ایک دو دن پہلے آتا تھا اور ابھی شادی میں پندرہ دن باقی تھے۔ ہم پندرہ دن پہلے آگئے تھے۔

صرف ہم ہی نہیں بلکہ خاندان کے اور بھی بہت سے لوگ اس حویلی میں پہنچ چکے تھے۔

ہمارا بہت گرم جوشی اور پیار سے استقبال ہوا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ماموں، ممانیاں وغیرہ ہم سے گلے مل کر بہت دیر تک روتے رہے تھے۔ بہت جذباتی ماحول ہو گیا تھا۔

مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میرے کتنے کزنز ہیں۔ یعنی تینوں ماموں کے بیٹے اور بیٹیاں۔ لہٰذا سب سے تعارف کروایا گیا۔

بڑے ماموں کی چار اولادیں تھیں۔ دو بیٹے اور دو بیٹیاں۔ ان سے چھوٹے کی تین بیٹیاں تھیں۔ سب سے چھوٹے کی بھی چار اولادیں تھیں ایک بیٹا اور تین بیٹیاں۔

وہ سب کے سب جوان، خوب صورت اور پڑھے لکھے تھے۔ شادی بڑے ماموں کے بڑے بیٹے خورشید کی ہو رہی تھی۔

ہمیں ایک دوسرے سے مل کر ایک دوسرے کو دیکھ کر بے انتہا خوشی ہو رہی تھی۔ یہ خیال آ رہا تھا کہ ہمارا بھی خاندان کتنا پڑھا لکھا اور جدید ہے۔

چونکہ وہ ایک بڑی حویلی تھی اس لیے رہائش وغیرہ کا کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ سب ہی ایڈجسٹ ہو گئے تھے بلکہ میرے لیے اوپر کی منزل پر ایک کمرہ مخصوص کر دیا گیا تھا۔

میرے کمرے میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی جو کسی ماڈرن گھر میں ہو سکتی ہے۔ اٹیچڈ باتھ روم بھی تھا۔

کمرے کے سامنے ایک کھلی ہوئی چھت تھی جس کے آخری سرے پر دو بڑے بڑے کمرے بنے ہوئے تھے۔ جن کے بارے میں بعد میں پتا چلا کہ وہ کمرے اسٹور روم کے طور پر استعمال ہوا کرتے تھے اور مدتوں سے انہیں کھولا نہیں گیا تھا۔

میں نہا کر تازہ دم ہوا تو ایک ملازم چائے لے کر آ گیا۔ چائے پی لینے کے بعد میں نے حویلی کی چھت کا جائزہ لیا۔

بہت بڑی چھت تھی لیکن ایک عجیب طرح کی اداسی چھپ رہی تھی۔ قدیم حویلیوں میں کچھ اسی قسم کی اداسی ہوا کرتی ہے کہ ہر طرف [illegible] چلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

حویلی کی چھت سے دور دور تک پھیلے کھیتوں کو دیکھا جا سکتا تھا۔ میں نے جن دو کمروں کا ذکر کیا ہے۔ ان کے دیوار میں دو سیڑھیاں تھیں۔ جن سے نیچے جا سکتے تھے یا اوپر آ سکتے تھے۔

یہ پوری حویلی قدیم طرز کی سرخ اینٹوں سے بنی ہوئی تھی۔ خود میرے کمرے میں طاقچے سے بنے ہوئے تھے۔ جن پر کسی زمانے میں شمعیں یا چراغ وغیرہ رکھے جاتے ہوں تھے لیکن اب تو بجلی کے بلب تھے۔

مغرب ہوئی تو اس کے ساتھ ہی ایک عجیب سی بے کلی کا احساس ہونے لگا۔ کھیتوں کے کناروں پر بڑ اور پیپل کے اونچے اونچے درخت تھے۔ جن پر پرندے منڈلا رہے تھے اور اس کے ساتھ ہی کسی مسجد سے آتی ہوئی اذان کی صدائیں تھیں۔

یہ اداس ماحول نہ جانے کس قسم کے احساس کو جگا گیا تھا۔ نہ جانے کیا کیا بے نام یادیں میرے ذہن میں بیدار ہونے لگی تھیں۔

حالانکہ میں یہاں پہلی بار آیا تھا۔ اس کے باوجود ایسا لگ رہا تھا جیسے یہ پورا ماحول میرے وجود ہی کا حصہ ہو۔

میں اس ماحول کا حصہ بن کر نہ جانے کہاں گم ہو کر رہ گیا تھا۔

حویلی سے لوگوں کے بولنے اور ہنسنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔ اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میں نے کمرے کا بلب روشن کر دیا۔ اسی وقت میرا ماموں زاد خورشید میرے کمرے میں آ گیا۔

"یار! تم بہت بور قسم کے انسان ہو۔" اس نے بہت بے تکلفی سے کہا۔

"کیوں، کیا بات ہو گئی۔"

"جب سے آئے ہو یہیں بیٹھے ہو۔" اس نے کہا۔ "دیکھو نیچے کتنا ہلا گلا ہو رہا ہے۔"

"یار میں ذرا ایسی باتوں سے دور بھاگتا ہوں۔"

"جانتا ہوں میں۔ کہانیاں لکھتے ہو نا، میں نے بھی تمہاری کئی کہانیاں پڑھی ہیں۔" اس نے بتایا۔

"اوہ، خوشی ہوئی سن کر۔"

"فکر مت کرو، اس حویلی کی فضاؤں میں بھی بے شمار کہانیاں ہیں۔" اس نے بتایا۔ "جب تم یہاں سے جاؤ گے تو کہانیوں کا اسٹاک ساتھ لے جاؤ گے۔"

"بہت خوب۔" میری آنکھیں چمک اٹھیں۔ "کون سی کہانیاں؟"

"یار! اب کیا ایک ہی دن میں سب جان لو گے۔" اس نے کہا۔ "ویسے نیلم چڑیل کی کہانی تم کو بہت پسند آئے گی۔"

"نیلم چڑیل؟ یہ کون ہے؟"

"اب نیچے چلو یار۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "سب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ باتیں کھانے کے بعد

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے لیے بھی جاتا ہے۔"

"سیر کے لیے۔ یہاں سیر کے لیے کون سی جگہ ہے!" میں نے پوچھا۔

"ہر جگہ کا اپنا ایک حسن ہوا کرتا ہے۔" اس نے کہا۔

"ہوسکتا ہے کہ یہاں شہروں والی تفریح گاہیں نہ ہوں مگر یہاں کے مناظر بہت اچھے اور پیارے ہیں۔ دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کا اپنا الگ حسن ہے اور جب ان کھیتوں پر چاند اپنی چادر پھیلا رہا ہے تو انسان اپنا آپ تک ہو کر رہ جاتا ہے۔"

"یار! تم بھی اچھی خاصی رومانٹک اور ادبی باتیں کرلیتے ہو۔" میں نے تعریف کی۔

"کچھ نہ کچھ پڑھتا رہتا ہوں نا۔" اس نے کہا۔ "کتابیں انسان کو بہت کچھ سکھا دیتی ہیں۔"

میں خورشید کے ساتھ نیچے آگیا۔ سارے لڑکے اور لڑکیاں بہت بڑے صحن میں جمع تھے۔ ایک لمبا چوڑا دسترخوان بچھا دیا گیا تھا۔ ملازمین بڑی مستعدی کے ساتھ کھانے لگا رہے تھے۔

ہمارے شہر کے ماحول سے بہت مختلف ماحول تھا یہاں کا۔ سب کچھ بہت اجنبی بھی تھا اور بہت اچھا بھی لگ رہا تھا۔

کھانے کے بعد ہمارا یہ قافلہ سیر کے لیے نکل پڑا۔ دس کے قریب لڑکے اور لڑکیاں تھیں۔ میں یہ محسوس کر رہا تھا کہ ان میں سے ایک لڑکی دانستہ طور پر میرے ساتھ ساتھ چلنے کی کوشش کر رہی تھی۔ وہ میرے درمیان والے ماموں کی بیٹی تھی۔ جب وہ میرے ساتھ چل رہی تھی تو میں نے اس سے پوچھ لیا۔ "تم اپنا نام تو بتاؤ۔"

"کیا مطلب۔" وہ چونک اٹھی۔ "کیا آپ کو اپنی ماموں زاد کا نام بھی نہیں معلوم؟"

"میری ماموں زاد اور زرا بھی تو دیکھو کہ ماشاء اللہ پورا قبیلہ ہے۔ اب میں کس کس کو یاد رکھوں اور ویسے بھی آج پہلا دن ہے۔ آہستہ آہستہ سارے چہرے آشنا ہوتے چلے جائیں گے۔"

"ہاں یہ بات تو ہے۔" وہ ہنس پڑی۔ "چلیں آپ بھی کیا یاد کریں گے ایک بار پھر بتا رہی ہوں میرا نام ثریا ہے۔"

"ثریا۔" میں نے زیر لب کہا۔ "خوب صورت نام ہے۔"

"اور خود میں کیسی ہوں۔"

"تم بھی خوب صورت ہو۔"

"آداب، نوازش، کرم۔" اس نے باقاعدہ آداب کرتے ہوئے کہا۔ "ذرا نوازی ہے آپ کی۔" وہ مجھے دل چسپ لڑکی معلوم ہوئی تھی۔ اس کے لہجے اور اس کی باتوں میں زندگی کی کھنک تھی۔

چاندنی دور تک پھیلی ہوئی تھی۔ ہم بھیگی ہوئی پگڈنڈیوں پر سنبھل سنبھل کر قدم اٹھاتے چلے جارہے تھے۔ دور تک فصلیں چاندنی کی چادر اوڑھے بہت پُراسرار اور رومانٹک لگ رہی تھیں۔ جب ایسا ماحول ہو تو اس ماحول میں تحلیل ہو جانے کو دل چاہتا ہے۔

میرے ساتھ چلتی ہوئی وہ سفید لباس میں ملبوس چاندنی میں بھٹکتی ہوئی کسی روح کی طرح معلوم ہو رہی تھی۔

"آپ کہانیاں کیوں لکھتے ہیں؟" اس نے اچانک پوچھ لیا۔

"بس یوں ہی۔ اپنے اظہار کے لیے۔" میں نے بتایا۔ "دیکھیے ثریا! احساسات اور جذبات تو ہر ایک کے پاس ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ شاعر اور ادیب کو سلیقے سے اظہار کرنا آتا ہے۔"

"میں بھی بہت سی کہانیاں جانتی ہوں۔" اس نے بتایا۔ "خاص طور پر......" وہ بولتے بولتے رک گئی۔

"ہاں رک کیوں گئیں۔"

"خاص طور پر نیلم چڑیل کی کہانی۔" اس نے اپنی بات مکمل کی۔

"نیلم چڑیل، میں یہ ذکر آج دوسری دفعہ سن رہا ہوں۔" میں نے کہا۔ "پہلی دفعہ خورشید نے بتایا تھا اور اب تم بتا رہی ہو۔"

"ہونہہ۔" اس نے ہنکارا بھرا۔ "بے چارے خورشید بھائی کو اس کے بارے میں کیا معلوم۔ انہوں نے تو صرف اس کا ذکر سنا ہوگا۔ جب کہ میں......" وہ کچھ کہتے کہتے پھر رک گئی۔

"ہاں ہاں کہو۔"

لیکن اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی کسی نے اسے آواز دی اور وہ تیز تیز قدموں سے آگے چلی گئی۔ اس نے مجھے الجھن میں ڈال دیا تھا۔ وہ کیا بتانا چاہ رہی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ خورشید نے تو صرف ذکر ہی سنا ہوگا جب کہ وہ...... وہ کیا، کیا وہ نیلم چڑیل کو دیکھ چکی تھی۔ اس سے مل چکی تھی!!

اس حویلی کے سحر زدہ ماحول میں اس قسم کی کہانیاں جنم لے سکتی تھیں۔ پُراسرار ادھ کھلے جذبوں اور ادھوری ملاقاتوں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی کہانیاں۔

اس قدیم حویلی کے در و دیوار بے شمار رازوں کے امین ہو سکتے تھے۔ اس پورے علاقے میں آ کر زندگی بہت سست رفتار ہو گئی تھی۔ جیسے سلو موشن میں چل رہے ہیں۔ نیم خوابیدہ سی زندگی۔

ثریا پھر میرے سامنے نہیں آئی۔ وہ لڑکیوں کے ایک گروپ کے ساتھ چہکتی رہی تھی۔ بہت دیر کے بعد کسی نے اعلان کیا کہ ہمیں واپس چلنا چاہیے۔ بہت دیر ہو رہی ہے اور ہم واپس آ گئے۔

میری وہ رات کچھ بے چینی میں گزری تھی۔ ثریا کی ادھوری بات نے میرے اندر کے کہانی نگار کو بیدار کر دیا تھا جو ہر بات بہت جلد جان لینے کی خواہش رکھتا ہے تا کہ جلد سے جلد کوئی خوب صورت کہانی مکمل کر سکے۔

اس حویلی کی پہلی ہی رات بہت دل چسپ اور پُراسرار تھی۔ ویسے رات بھر میں آرام سے سوتا رہا تھا۔ کوئی بے چینی یا پریشانی نہیں تھی۔

دوسری صبح بہت خوب صورت تھی۔ چھت سے جب میں نے دور تک پھیلے ہوئے کھیتوں کو دیکھا تو روح میں ایک تازگی سی اتر آئی۔ صبح کی بھیگی بھیگی ہوا، دور تک لہلہاتے ہرے کھیت اور ان سے بھی پرے کچے پکے مکانوں سے اٹھتا ہوا دھواں۔ شاید گاؤں والے جاگ کر ناشتے وغیرہ کی تیاریوں میں مصروف ہو گئے تھے۔ حویلی میں بھی صبح کی تیاریاں شروع ہو چکی تھیں۔

ناشتے کے لیے نیچے جانا پڑا تھا۔ جہاں پر پورا خاندان جمع تھا۔ میری امی اور بہنیں بہت پُرجوش اور خوش ہو رہی تھیں۔ تینوں ماموں مہمانوں کی فہرست وغیرہ بنانے میں مصروف تھے۔

ہر طرف ایک خوش گوار اطمینان بخش قسم کی سرگرمیاں تھیں۔ خورشید نے میری طرف دیکھ کر کہا۔ ”میں قصبے کے بازار تک جا رہا ہوں کچھ چیزیں لینا ہیں، کیا تم ساتھ چلنا پسند کرو گے؟ یا آرام کرو گے۔“

”آرام کس بات کا، میں تمہارے ساتھ ہی چلوں گا۔“ میں نے بتایا۔ ”اس علاقے کا بازار بھی دیکھ لوں گا اور تم سے گپ شپ بھی ہوتی رہے گی۔“

”تو جلدی سے تیار ہو کر آ جاؤ۔“

میں دس پندرہ منٹ میں تیار ہو کر نیچے آ گیا۔ ہم وہاں سے پیدل ہی روانہ ہوئے تھے۔ خورشید نے بتایا۔ ”یار! گاڑی بھی کھڑی ہے لیکن میں نے سوچا کیوں نہ پیدل ہی چلا جائے۔ اس طرح تم گاؤں کو اور قریب سے دیکھ لو گے۔“

”چلو۔“ میں نے کہا۔ ”میں تیار ہوں۔“

ہم حویلی سے باہر آ گئے۔ خورشید بہت دل چسپ باتیں کرنے والا ثابت ہو رہا تھا۔ وہ مجھے اس علاقے کی کہانیاں سناتا رہا۔ اس علاقے کے خاص خاص لوگوں کے بارے میں بتاتا رہا۔

میں نے دیکھا کہ راستے میں ملنے والے لوگ بہت احترام سے اسے سلام کر رہے تھے۔ شاید حویلی والوں کی پورے علاقے میں عزت کی جاتی تھی۔

”یار خورشید تم نے کل ایک چڑیل کی بات کی تھی؟“ میں نے اس کے ساتھ چلتے ہوئے پوچھا۔

”کیوں؟“ اس نے رک کر میری طرف دیکھا۔ ”تم کو کہاں سے یاد آ گئی۔“

”یوں ہی پوچھ رہا ہوں۔ ثریا نے بھی اس کا ذکر کیا تھا۔ لیکن پوری بات نہیں بتائی۔“

”ارے وہ ثریا ایک نمبر کی شرارتی ہے۔ اس نے نہ جانے کیا الٹا سیدھا بتا رہا ہو گا۔“

”نہیں، اس نے کچھ نہیں بتایا۔ اسے کچھ بتانے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”تم تو جانتے ہو کہ میں کہانیاں لکھتا ہوں اس طرح ایک کہانی ہاتھ آ جائے گی۔“

”یار اس لڑکی کا نام نیلم تھا۔“ اس نے بتایا۔ ”اس گاؤں کی تھی۔ بہت خوب صورت لڑکی تھی۔ کبھی کبھی ہماری حویلی کی طرف آیا کرتی تھی۔ ایک صبح اس کی لاش حویلی کی دیوار کے ساتھ ملی تھی۔“

”اوہ! مرڈر ہوا تھا اس کا!“

”کچھ نہیں کہا جا سکتا کیوں کہ اس کی موت بلندی سے گرنے سے ہوئی تھی۔“ اس نے بتایا۔ ”شاید وہ حویلی کی چھت سے نیچے گر پڑی تھی یا کسی نے دھکا دے دیا تھا۔ کچھ نہیں کہہ سکتے۔“

”پولیس نے تو کھوج لگانے کی کوشش کی ہو گی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں بہت دنوں تک تفتیش چلتی رہی تھی لیکن کچھ بھی پتا نہیں چلا۔ اس کی موت معمہ ہی رہی۔ پتا نہیں۔ اسے حویلی میں بلایا گیا تھا یا اسے مار کر حویلی کی دیوار کے پاس پھینک دیا گیا تھا۔“

”بہت دکھ ہوا سن کر۔“

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

"ہاں یار، کچھ کہانیاں ایسی ہی ہوتی ہیں، اداس کر دینے والی۔"

"اور وہ چڑیل والا کیا قصہ ہے؟" میں نے پوچھا۔

"کئی مہینوں کے بعد وہ حویلی میں اور چھت پر بھٹکتی ہوئی دیکھی جاتی رہی ہے۔" اس نے بتایا۔ "شاید اس کی روح بے تاب ہے۔ جن لوگوں نے اسے دیکھا انہوں نے اسے فوراً پہچان لیا تھا اور مارے خوف کے اسے چڑیل مشہور کر دیا۔ حالانکہ وہ بے چاری چڑیل وڑیل نہیں ہے۔"

"تم نے بھی اسے دیکھا؟" میں نے پوچھا۔

"ہاں، چار پانچ بار۔" اس نے بتایا۔ "بالکل ایسی ہی تو بس دولہن بنی ہے۔ اس کا اچانک دکھائی دے جانا، پھر غائب ہو جانا۔"

"بہت دلچسپ کہانی ہے۔" میں نے تبصرہ کیا۔

"ہاں، دلچسپ کے ساتھ ساتھ ڈرا دینے والی بھی ہے۔ جانتے ہو یہاں کے لوگوں نے مجھے کیا مشورہ دیا ہے؟"

"تم ہی بتاؤ۔"

"وہ یہ کہتے ہیں کہ جب وہ چڑیل نظر آئے تو اسے بالوں سے پکڑ لوں۔ اس طرح وہ قابو میں آ جائے گی۔"

"ہاں، میں نے بھی اس قسم کی باتیں تو سنی ہیں لیکن کبھی آزمانے کا موقع نہیں ملا اور ویسے بھی کسی چڑیل کو قابو میں کر کے کیا کرنا ہے۔ وہ کس کام آ سکتی ہے؟"

"یہ تو خود میں بھی نہیں جانتا۔" وہ ہنس پڑا۔ پھر رک کر بولا۔ "یار! مجھے تمہاری طرف سے تھوڑی سی پریشانی ہے۔"

"وہ کیوں؟"

"اس لیے کہ تمہیں اوپر کا کمرا دیا گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "میں نے دو بار اس کو اسی چھت پر ٹہلتے ہوئے دیکھا ہے۔"

"کوئی بات نہیں اگر دکھائی دے گئی تو اس بہانے کسی چڑیل سے ملاقات ہی ہو جائے گی۔"

"یار! اس دنیا میں یہ سب کیا ہوتا رہتا ہے؟"

"ہاں، سب کچھ بہت عجیب ہے۔" میں نے کہا۔ "وہم اور حقیقت کی سرحدیں ایسی جگہ آ کر مل جاتی ہیں کہ جہاں اندازہ نہیں ہوتا کہ وہم و گمان کے درمیان میں کیا سچائی ہمارے سامنے ہے۔"

کھیتوں میں ایک عجیب طرح کی اداسی پھیلنے لگی تھی۔ تیز ہوا میں جب فصلوں کو ہلکورے دیتی تو ایسا لگتا جیسے بہت سی روحیں بین کر ماتم کر رہی ہوں۔ حالانکہ ہر طرف سورج کی تیز روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ اس کے باوجود ایک سناٹے کا احساس ہو رہا تھا۔

ہم کھیتوں اور چھوٹے چھوٹے گھروں کے درمیان گزرتے ہوئے بازار کی طرف آ گئے۔ بازار کیا ایک بڑی سی گلی تھی جس کے دونوں طرف چھوٹی چھوٹی دکانیں بنی ہوئی تھیں۔ یہاں روزمرہ ضرورت کی ہر چیز مل جاتی تھی۔ مجھے یہ دیکھ کر خوشی بھی ہو رہی تھی اور حیرت بھی کہ ہر شخص خورشید کو جانتا تھا۔

چھوٹی جگہوں کا یہی ایک بہت بڑا فائدہ ہوا کرتا ہے۔ سب ایک دوسرے سے واقف ہوتے ہیں جب کہ بڑے شہر میں ایسی کوئی بات دیکھنے میں نہیں آتی۔

خورشید نے دکانداروں کو صرف آرڈرز لکھوا دیے تھے۔ اس نے بتایا کہ سامان حویلی تک یہی لوگ پہنچا دیتے ہیں۔ ابھی ہم ایک دکان سے آگے ہی بڑھے تھے کہ ایک آدمی ہمارے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ ایک ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ کپڑے پھٹے ہوئے، الجھے ہوئے بال اور اس کے چہرے پر ایسے دیکھ رہے تھے کہ اس کی طرف دیکھ کر افسوس ہی ہو رہا تھا۔

"لاؤ ایک روپیا دے دو۔" اس نے اپنا ہاتھ خورشید کے آگے پھیلا دیا۔

خورشید نے میری طرف دیکھتے ہوئے دھیرے سے کہا۔ "اب تم ایک تماشا دیکھنا۔"

پھر اس نے دس کا ایک نوٹ اس بوڑھے کی طرف بڑھا دیا۔ "یہ لو یہ رکھ لو۔"

"نہیں۔" بوڑھا جلدی سے دو قدم پیچھے ہٹ گیا۔ "صرف ایک روپیا، مجھے صرف ایک روپیا چاہیے۔ میں اس کو بھی ایک روپیا دیتا تھا۔ اس نے کچھ زیادہ نہیں مانگا۔ کبھی نہیں۔"

"اچھا چلو یہ لو۔" خورشید نے ایک روپے کا ایک سکہ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیا۔

وہ ایک روپے کا سکہ لے کر ایک طرف چلا گیا تھا۔ خورشید بہت دیر تک اس کی طرف دیکھتا رہا تھا۔

"خورشید کون تھا یہ؟" میں نے پوچھا۔

"اس بدنصیب کا باپ۔" خورشید نے بتایا۔ "اس نیلم کا باپ جس کی لاش حویلی کی دیوار کے پاس ملی تھی اور جو چڑیل بن کر بھٹکتی پھر رہی ہے۔"

"اوہ!!" میں صرف اتنا ہی کہہ سکا تھا۔

"بیٹی کی موت کے بعد اس کی یہ حالت ہو گئی ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

خورشید نے کہا۔ "یہ بدنصیب اپنی بیٹی سے بہت پیار کرتا تھا۔ وہ روزانہ اس سے ایک روپیہ لیا کرتی۔ صرف ایک روپیہ اور جب یہ زیادہ دینے لگتا تو وہ ناراض ہو جاتی۔ تو اس کے ذہن میں نہ جانے کس طرح یہ آ گیا ہے کہ اسے بھی صرف ایک روپیہ ہی ملنا چاہیے۔"

"یار تمہارے گاؤں میں تو بہت دکھ دینے والی کہانیاں ہیں۔" میں نے کہا۔

"ہاں! اسی لیے تو میں نے کہا تھا کہ جب تم یہاں سے جاؤ گے تو تمہارے پاس بہت سی کہانیاں ہوں گی۔ چلو اب واپس چلتے ہیں۔ حویلی میں ہمارا انتظار ہو رہا ہوگا۔"

ہم حویلی واپس آ گئے۔

وہ رات میرے لیے بہت پریشان کرنے والی تھی۔ بدنصیب نیلم کی کہانی یاد آ رہی تھی۔ اس کے ساتھ اس کے باپ کا چہرہ بار بار میرے سامنے آ رہا تھا جو بے چارہ اپنی بیٹی کی یاد میں صرف ایک روپیہ مانگا کرتا تھا۔ صرف ایک روپیہ۔

بہت دیر تک میں یہی سب سوچتا رہا پھر سوچتے سوچتے سو گیا۔

معلوم نہیں یہ کس احساس کے تحت میں جاگ رہا تھا۔ شاید کوئی آہٹ ہوئی تھی یا شاید میری چھٹی حس نے مجھے خبردار کر دیا تھا۔ کچھ بھی تھا میں جاگ گیا تھا اور میرے کمرے میں کوئی موجود تھا۔

میں رات کے وقت روشنیاں بند کر کے سونے کا عادی ہوں۔ اس لیے کمرے میں گہری تاریکی تھی جب کہ کھڑکی کے باہر چاندنی چٹکی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

کمرے میں کوئی تھا۔ واضح طور پر کسی کے لباس کی ہلکی سی سرسراہٹ کمرے میں گونج رہی تھی۔ جیسے کوئی اِدھر سے اُدھر چکر لگا رہا ہو۔

نیلم کے حوالے سے سنا ہوا قصہ مجھے یاد آ رہا تھا۔ خورشید نے تو یہ بھی بتایا تھا کہ وہ کبھی کبھی نیچے پر بھٹکتی ہوئی دکھائی دے جاتی ہے۔ تو ہو سکتا ہے کہ وہی ہو۔ لیکن یہ سب کیسے ہو سکتا تھا؟ لیکن کوئی نہ کوئی ضرور تھا۔

میں نے خود پر قابو پاتے ہوئے آواز دی۔ "کون ہے؟"

فوری طور پر کوئی جواب نہیں ملا۔ میں نے دوبارہ آواز دی۔ "کون ہے؟"

اور اس بار کسی لڑکی کی ہلکی سرسراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ "ایک روپیہ چاہیے۔ ایک روپیہ۔" میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ خورشید نے آج ہی تو بتایا تھا کہ نیلم اپنے باپ سے روزانہ صرف ایک روپیہ مانگا کرتی تھی۔ یہ تو وہی

اسپنسر کو رنگ برنگے کاغذ پر لکھنے کا شوق تھا۔ اس کے پاس ہر رنگ کے کاغذ تھے۔ جن کے اس نے رائٹنگ پیڈز بنا رکھے تھے۔ اور وہ اپنی یادداشتیں رنگین کاغذوں پر تحریر کیا کرتا۔

ایک بار وہ ایک ایسا گوند بنانے کی کوشش کر رہا تھا جس سے چیزوں کو بہت مضبوطی کے ساتھ جوڑا جا سکے۔ اس کی میز پر نہ جانے کیسی کیسی اشیا پھیلی ہوئی تھیں۔ طرح طرح کے کیمیکلز اور نہ جانے کیا کیا۔ وہ گوند بنانے کے مرحلے میں تھا۔ اس کی انگلیاں گوند سے لتھڑی ہوئی تھیں۔

اس کیفیت میں اس کی انگلیاں قریب رکھے ہوئے رنگین کاغذوں سے مس ہو گئیں۔ اور ان خوبصورت رنگین کاغذات پر گوند لگ گئے۔

اسے اپنی اس غلطی پر بہت افسوس ہوا اور غصہ بھی آیا۔ کیونکہ وہ ان کاغذات کو بہت عزیز رکھتا تھا۔ اس نے جب ان کاغذات کی طرف دھیان دیا تو گوند لگے ہوئے کاغذات آسانی سے الگ بھی ہو گئے۔ پھر اس کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ اس نے ان رنگین کاغذات کی پرچیاں بنا لیں اور ان کے کناروں پر وہی گوند لگا کر ایک دوسرے کے ساتھ چپکا تا چلا گیا۔ اور اس طرح جو ایجاد سامنے آئی وہ آپ کے سامنے ہے۔ جی ہاں اسے پوسٹ اٹ نوٹ کہتے ہیں۔ ہر اسٹیشنری کی دکان پر مل جائے گی۔ رنگین کاغذات کی بے شمار پرچیاں۔ ایک دوسرے کے ساتھ چپکی ہوئی۔

کسی کو اپنا فون نمبر یا کچھ اور لکھ کر دینا ہو تو ایک ایک پرچی الگ کرتے جائیں اور اپنا کام کرتے رہیں۔ بظاہر معمولی سی ایجاد لیکن کتنی اہم ہے۔

مرسلہ: زاہد خان، دوبئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سلسلہ تھا۔

آدمی چاہے خود پر لاکھ قابو پانے کی کوشش کرے، اپنے آپ کو سنبھال لے، لیکن اس قسم کے غیر انسانی کردار اسے خوف زدہ کرتے رہتے ہیں اور میں بھی بری طرح خوف زدہ تھا۔

"سنا نہیں تم نے، ایک دولہا چاہیے۔" وہی آواز پھر سنائی دی۔

یہ کسی لڑکی کی سی آواز تھی۔ دبی دبی سی سرسراتی ہوئی۔

"کوئی نہیں رہتا، کوئی نہیں رہتا۔" اس بار اس آواز میں دکھ بھی تھا۔ جیسے چپکے چپکے رو رہی ہو۔ کچھ دیر بعد اس کی سسکیاں کمرے میں گونجنے لگی تھیں۔

اچانک میرا دل جذبۂ ہمدردی سے بھر آیا تھا۔ اس ایک لمحے میں میرا سارا خوف ختم ہو گیا تھا۔

"سنو! میری بات سنو، تم رو کیوں رہی ہو؟ یہ بتاؤ میں تمہارے لیے کیا کر سکتا ہوں؟ کیا چاہیے تمہیں؟"

"زندگی!" اس کی آواز آئی۔ "میں تمہاری دنیا میں واپس آنا چاہتی ہوں۔"

"لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"میں اسی لیے تمہارے پاس آئی ہوں۔" اس نے کہا۔ "تم اگر چاہو تو ہو سکتا ہے۔"

"بتاؤ مجھے، میں کیا کروں۔"

"دیکھو میں کئی برسوں سے یہاں بھٹک رہی ہوں۔ سب کو دیکھتی ہوں کہ شاید ان میں سے کوئی ایسا ہو جو میرے کام آ سکے لیکن کوئی بھی ایسا نہیں ملا۔ اب تم ملے ہو تو میں تمہارے ساتھ زندگی گزارنا چاہتی ہوں۔"

"میرے ساتھ آخر کیسے!"

"میری دنیا میں آ کر۔" اس نے کہا۔ "بہت سکون ہے میری دنیا میں۔ یہاں زندگی کا کوئی غم نہیں ہے۔ یہاں کوئی موت نہیں ہے۔ ہم ہمیشہ ہمیشہ یہاں کے کھیتوں اور حویلیوں میں گھومتے رہیں گے۔ ہمیں کوئی روکنے والا نہیں ہوگا۔"

"دیکھو میں...... میں تمہاری دنیا میں نہیں آ سکتا۔"

"آ سکتے ہو۔" اس کی آواز سرگوشیوں میں تھی۔ "اس دنیا کو چھوڑ دو تو میرے پاس آ سکتے ہو۔" اس نے کہا۔ "تم یقین کرو میں بہت خوب صورت ہوں۔ تم کو اپنی دنیا چھوڑنے کا افسوس نہیں ہوگا۔ تم میرے محبوب ہو، آؤ میرے محبوب میرا ہاتھ تھام لو۔ آؤ حویلی کی چھت سے چھلانگ لگاؤ میرے پاس آ جاؤ۔ میں تمہارے لیے پھولوں کے ہار لیے کھڑی ہوں۔ تمہارے استقبال کے لیے بے چین ہو رہی ہوں۔ آؤ چھت سے چھلانگ لگا دو۔"

اس وقت میرا جسم بہت ہلکا ہو کر جیسے پرواز کرنے لگا تھا۔ اس کی آواز مجھے اپنی طرف کھینچ رہی تھی۔ ٹرانس میں لے رہی تھی۔

میں نے محسوس کیا کہ کسی نرم ہاتھ نے میرا ہاتھ تھام لیا ہے۔ عجیب طرح کی سنسنی پورے بدن میں پیدا ہو رہی تھی۔ میں اپنے ہوش میں نہیں رہا تھا۔

"میرا ہاتھ تھام لو محبوب۔" اس کی آواز آئی۔

میں نے ایک بے خودی کے عالم میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے کچھ نہیں معلوم تھا کہ میں کیا کر رہا ہوں۔ کہاں جا رہا ہوں، وہ مجھے کمرے سے باہر لے آئی تھی۔ کمرے کے اندھیرے سے باہر آ کر اس کا خاکہ واضح ہونے لگا تھا۔ اس نے اپنا چہرہ چھپا رکھا تھا۔ وہ سفید لباس میں تھی اور اسی وقت مجھے وہ روایت یاد آ گئی کہ اگر چڑیل کو بالوں سے پکڑ لو تو وہ قابو میں آ جاتی ہے۔

اس نے میرا ایک ہاتھ تھام رکھا تھا۔ جب کہ دوسرا ہاتھ آزاد تھا۔ اس وقت مجھ میں ہمت بھی آ گئی تھی میں نے ایک جھٹکے سے اس کے بال پکڑ لیے اور زور زور سے جھٹکے دینے لگا۔

اچانک اس نے چیخنا شروع کر دیا۔ "ارے کیا کر رہے ہو چھوڑیں، ہائے اللہ۔"

میں نے بوکھلا کر اس کے بال چھوڑ دیے۔ اب وہ پوری طرح میرے سامنے تھی۔ وہ تنزیلا تھی۔ جو کہہ رہی تھی۔

"بے رحم انسان، میں تو مذاق کر رہی تھی اور آپ نے میرے بال ہی اکھاڑ دیے۔"

"کسی چڑیل کو قابو کرنے کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔" میں نے پھر اس کے بالوں کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

"نہیں...... نہیں اب نہیں۔" وہ دو قدم پیچھے ہٹ گئی۔

☆☆☆

کئی برس بیت چکے وہ شرارتی چڑیل اب پوری طرح میرے قابو میں ہے۔ یعنی اب وہ میری بیوی ہے اور ہم ایک خوب صورت زندگی گزار رہے ہیں۔

اب بھی جب ہم حویلی کی طرف جاتے ہیں تو چاندنی رات میں کھیتوں کی سیر کرتے ہوئے وہ مجھے کسی بھٹکی ہوئی اداس روح ہی کی طرح معلوم ہوتی ہے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جھوٹی

جناب معراج رسول
سلام تہنیت!
اس بار میں ایک دوست کے چشم کشا واقعہ کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ واقعہ یقیناً قارئین کو پسند آئے گا۔

سلیم اختر
(راولپنڈی)

کبھی کبھی انسان کی زندگی میں ایک دن یا ایک رات یا چند گھنٹے بہت بھاری ہو جاتے ہیں۔ ان کا بوجھ انسان نہ سہار سکتا ہے اور نہ پھینک سکتا ہے۔ یہ لمحے ساری عمر اپنے اشاروں پر نچاتے رہتے ہیں۔ میری زندگی میں بھی ایک رات ایسی ہی آئی تھی جس کو میں اب تک بھلا نہ سکی ہوں مگر ٹھہریں پہلے میں اپنا تعارف کرا دوں۔

میرا جنم پنجاب کے ایک ایسے خاندان میں ہوا جہاں عورت کو کسی قسم کی آزادی میسر نہیں ہے۔ دولت اور جائیداد کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

گوارا نہ ہو جائے اس وجہ سے خاندان سے باہر کسی لڑکی کی شادی نہیں کی جاتی ہے اور یہ خاندانی روایت برسوں سے چلی آرہی ہے۔ میرے ابا جان نہ صرف اپنی برادری کے سربراہ بلکہ علاقے کے سردار بھی تھے۔ ان کا رعب اور دبدبا اس قدر تھا کہ کوئی بھی ان کے سامنے اونچی آواز میں بات کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ ان کا ہر فیصلہ حرفِ آخر ہوتا تھا۔ ہم عورتوں کے لیے پردے کی سخت پابندی تھی۔ قیدیوں کی سی زندگی گزاری پڑ رہی تھی۔ میں تین بھائیوں کی اکلوتی بہن تھی اس لیے لاڈلی بھی تھی۔ میری ہر خواہش پل بھر میں پوری کر دی جاتی تھی مگر ایک خواہش وہ لوگ پوری نہ کر سکے۔ وہ یہ کہ مجھے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ میں نے پانچویں کا امتحان گاؤں کے پرائمری اسکول سے پاس کیا تھا پھر بھی مجھے حویلی کی اونچی دیواروں میں بند کر دیا گیا تھا اور میری تعلیم نامکمل رہ گئی تھی۔ میں ابا جان کے سامنے خوب روئی گڑگڑائی تھی کہ میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں مگر میری کسی نے نہ سنی تھی اور یوں میری پڑھائی کا سلسلہ منقطع ہو گیا تھا۔ میں مجبور تھی اس لیے باپ اور بھائیوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا تھا مگر میرے دل میں ان کے خلاف ایک گرہ سی پڑ گئی۔ میں یہ محسوس کرنے لگی تھی کہ یہ لوگ میرے خیر خواہ نہیں میرے دشمن ہیں جو میری خواہشوں اور امنگوں کا خون کر رہے ہیں۔

☆☆☆

گلزار، ابا جان کے ملازم خاص اکبر علی کا بیٹا تھا۔ ابا جان اس پر اندھا اعتبار کرتے تھے۔ اس کی ماں بھی حویلی میں ہی کام کاج کرتی تھی۔ وہ میرا ہم عمر تھا اور اپنے باپ کے ہمراہ اکثر حویلی میں آیا کرتا تھا۔ اکبر علی کے خاندان کو ہماری حویلی میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا کیونکہ وہ بہت ایماندار اور نمک خوار تھا۔ گلزار اسکول میں پڑھتا تھا۔ اسے پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ بچپن میں جب بھی وہ حویلی آتا تو میں اسے کھینچ کر آنگن میں لے جاتی تھی پھر میں اور گلزار حویلی کے اندر خوب کھیلا کرتے تھے۔ جانے کیوں مجھے اس کے ساتھ کھیلنا اور باتیں کرنا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ بڑی پیاری باتیں کرتا تھا۔ جس دن وہ حویلی میں نہ آتا میں افسردہ اور بے چین سی ہو جاتی۔ یوں ہی بچپن بیت گیا۔ میں اور گلزار کچھ بڑے ہو گئے تو گلزار کا حویلی میں داخلہ بند کر دیا گیا۔ کچھ اور وقت گزرا تو معلوم ہوا کہ اس نے میٹرک کے بعد پی ٹی سی کا کورس کرنے کے لیے شہر میں داخلہ لے لیا ہے۔ دو سال بعد اس نے کورس مکمل کر لیا پھر وہ قریب کے گاؤں والے اسکول میں پڑھانے لگا۔

میں کوشش کرتی کہ گلزار کو بھلا دوں مگر میں اس کو بھلا نہ سکی۔ شروع میں تو میں اپنے احساسات اور جذبات کو کوئی نام نہ دے سکی تھی لیکن پھر احساس ہونے لگا تھا کہ میں گلزار کو چاہنے لگی ہوں۔ گلزار کی یاد مجھے بے چین کر دیتی اور میں اس کی ایک جھلک دیکھنے کی تمنا کرنے لگی کیونکہ محبت پر کسی کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ یہ تو دل کی گہرائیوں سے جنم لیتی ہے اور رفتہ رفتہ پورے وجود کو گرفت میں لے لیتی ہے۔ محبت نہ کبھی کسی کو کچھ دیتی ہے اور نہ ہی لیتی ہے سوائے محبت کے۔ حویلی کی اونچی دیواریں کاٹ کھانے کو دوڑتی تھیں۔ جی چاہتا تھا ان کو توڑ کر گلزار کے پاس چلی جاؤں۔ گلزار تو میری اس چاہت سے لاعلم تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ میں اس کی محبت کی آگ میں سلگ رہی ہوں۔ جوں جوں وقت گزر رہا تھا میری گلزار سے یک طرفہ محبت میں شدت پیدا ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن گلزار کسی کام سے حویلی میں اپنے باپ سے ملنے آیا۔ میں نے اسے دیکھا تو دیکھتی ہی رہ گئی۔ اس نے خوب قد کاٹھ نکالا تھا۔ وہ کسی یونانی شہزادے کی طرح لگ رہا تھا۔ وہ مردانہ حسن کا نادر نمونہ لگ رہا تھا۔ پہاڑ جیسی قد و قامت، بھرے بھرے مضبوط بازو اور کشادہ سینہ جس پر سر رکھ دینے کو دل مچل جائے۔

میرا دل پسلیوں سے ٹکراتا ہوا محسوس ہوا میرا جی چاہا کہ دوڑ کر جاؤں اور اس کے چوڑے سینے پر سر رکھ دوں۔ برسوں بعد گلزار کو اپنے مقابل دیکھ کر میں خوشی سے بے تاب ہوئی جا رہی تھی۔ میں تیزی کے ساتھ اس کی طرف بڑھی تھی۔ قریب پہنچ کر میں نے گلزار کے باپ کو سلام کیا اور ندیدوں کی طرح گلزار کو دیکھنے لگی۔ میں خود پر ضبط نہیں کر پا رہی تھی۔ شاید محبت پر کسی کا کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ یہ تو خود بخود دل کی گہرائیوں سے جنم لیتا ہے۔ میں واپس چلی اور اپنے کمرے میں آ گئی۔ میرا اضطراب بڑھ گیا تھا۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا تھا کہ میں نے گلزار سے کوئی بات کیوں نہ کی۔ میں اس کا احوال پوچھ لیتی۔ پھر اچانک ہی مجھے خیال آیا کہ اگر میرے باپ اور بھائیوں کو علم ہو جاتا کہ میں گلزار سے بات کر رہی ہوں تو... ! مجھے خوف سے جھرجھری آ گئی۔ میں نے باپ اور بھائیوں کے ظلم و ستم اپنی آنکھوں سے اس قدر دیکھے تھے کہ میرے دل میں ان کی دہشت بیٹھ گئی تھی۔ اگر اتفاق سے کوئی میرے کمرے میں آ جاتا یا میرا کسی سے سامنا ہو جاتا تو میں خوف سے پیلی پڑ جاتی تھی۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں کئی دن گلزار کی محبت اور باپ بھائیوں کے خوف کی صلیب پر لٹکی رہی۔ بالآخر میں نے گلزار کو حاصل کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ اپنے اس مقصد کی تکمیل کے لیے میں نے حویلی کی ایک خاص نوکرانی رضیہ کو اعتماد میں لیا اور ایک خط گلزار کے نام لکھ دیا جس میں، میں نے گلزار کو بچپن کی باتیں یاد دلائیں اور یہ واضح کردیا کہ میں اس سے محبت کرتی ہوں۔

میں خوف زدہ بھی تھی کہ کہیں میری محبت کا راز فاش نہ ہوجائے اور یہ بھی اندیشہ تھا کہ گلزار نے میری محبت کو قبول نہ کیا تو پھر کیا ہوگا۔ میں کیسے یہ برداشت کر پاؤں گی۔

میں نے گلزار کو یکے بعد دیگرے کئی خطوط لکھے۔ بالآخر گلزار نے میری محبت کا اقرار کرلیا مگر اسے اپنی حیثیت معلوم تھی۔ اس لیے وہ دل کی بات زبان پر نہیں لا سکا مگر اب میری بے قراریوں نے اسے زبان دے دی تھی۔ محبت کے اقرار کے باوجود وہ اب بھی ڈرتا تھا کہ کہیں کسی کو معلوم نہ ہوجائے۔

خوف زدہ تو میں بھی تھی مگر اس خوف پر محبت غالب آگئی تھی۔

میری اور گلزار کی محبت کا سلسلہ چل نکلا۔ کچھ عرصہ تو رضیہ ہمارے مابین پیغام رسانی کرتی رہی۔ پھر دل کچھ طلب کرنے لگا۔ ملاقات کرنے کو جی چاہنے لگا۔ حویلی سے قدم باہر نکالنا میرے لیے ناممکن تھا اس لیے میں نے گلزار کو حویلی کے اندر بلانے کا ارادہ کرلیا۔ رضیہ میری ہم راز تھی۔ اس نے ہر معاملے میں میرا ساتھ دیا۔ حویلی کے عقب میں ایک چھوٹا سا دروازہ تھا جو عموماً بند رہتا تھا اور کبھی کبھی ہی کھولا جاتا تھا۔ میں نے اس پر لگے تالے کی چابی حاصل کر کے رضیہ کے حوالے کردی۔ جس رات گلزار مجھ سے ملنے کے لیے آتا رضیہ شام کو ہی تالا کھول دیتی۔ اس دروازے پر کوئی بھی پہرے دار نہیں تھا۔ اس لیے گلزار آسانی سے میرے کمرے تک پہنچ جاتا۔ میرا کمرا حویلی کے عقبی حصے میں تھا لہٰذا کسی کو شک ہی نہیں گزرتا کہ کوئی میرے کمرے تک آتا جاتا ہے۔

ہم دیر تک پیار محبت کی باتیں کرتے۔ وعدے کرتے اور ایک دوسرے کی محبت میں کھوئے رہتے۔ پھر گلزار حویلی سے نکل جاتا۔ اس میں خطرہ بہت تھا مگر ہماری محبت نے ہمیں بہادر بنا دیا تھا۔ ایک دوسرے کی جدائی اب ہمیں بالکل گوارا نہ تھی۔

گلزار میری خاطر خطرہ مول لے بیٹھا تھا۔

ہمیں نظر آرہا تھا کہ میری اس محبت کا انجام کیا ہوگا۔ یہ تو طے تھا کہ حویلی میں رہ کر میری اور گلزار کی شادی کبھی نہیں ہو سکتی جب کہ محبت کا راز فاش ہونے کے بعد گلزار کی زندگی خطرے میں پڑ جائے گی اور شاید میں بھی زندہ نہ بچوں۔ بالآخر میں نے فیصلہ کیا کہ میں گلزار کے ہمراہ حویلی سے بھاگ جاؤں گی لیکن گلزار ایسا کرنے پر آمادہ نہ تھا مگر میری بے پناہ ضد کے آگے اس نے ہتھیار ڈال دیے۔

میں نے مختلف طریقوں سے کافی ساری رقم اکٹھی کرلی اور اپنا وہ زیور جو میری ماں نے میری شادی کے لیے بنوایا ہوا تھا وہ بھی اپنے پاس رکھ لیا۔ پھر ایک رات ہم نے گاؤں سے بھاگ کر کراچی جانے کا پروگرام بنالیا۔ ہم نے یہ پروگرام بنایا تھا کہ کراچی جاکر گلزار ملازمت تلاش کرے گا اور پھر ہم شادی کرلیں گے۔

اس رات طے شدہ پروگرام کے مطابق گلزار حویلی میں آیا۔ میں نے ساری رقم اور زیور اس کے حوالے کیا اور کہا کہ پہلے تم حویلی سے باہر نکلو اور تالاب کے بڑے درخت کے نیچے میرا انتظار کرو۔ میں وہاں پہنچ جاؤں گی۔

گلزار نقدی اور زیور لے کر پچھلے دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ چوکیدار کی نظروں میں آگیا۔ اس نے چوکیدار کو دیکھ کر بھاگنا چاہا تو چوکیدار نے چور چور کا شور مچا دیا۔ شور کی آواز سن کر کچھ دیگر ملازم بھی جاگ گئے۔ گلزار حویلی سے تو باہر نکل گیا مگر بدقسمتی کہ وہ پکڑا گیا۔ اس کے پاس سے رقم اور زیور برآمد ہوگیا اور یہ ثبوت بہت بڑا تھا کہ وہ حویلی سے رقم اور زیور چوری کر کے لے جارہا تھا۔

چوکیدار اسے پکڑ کر حویلی کے اندر لے آیا تب تک حویلی کے سب افراد جاگ اٹھے تھے۔ میں نے بھی شور کی آوازیں سنی تھیں مگر اپنے کمرے میں ہی دبکی رہی۔ جب بھی کسی کے قدموں کی چاپ ابھرتی میں اندر سے لرز کر رہ جاتی کہ ابھی کوئی میرے کمرے میں آئے گا اور مجھے بالوں سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا سب کے سامنے لے جائے گا۔

حویلی کے بڑے کمرے میں سب جمع تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے بھی ہمت کی اور دروازہ کھول کر لاؤنج میں آگئی۔ میں نے دیکھا ہر کوئی گلزار کو ٹھڈے مار رہا تھا۔ میرے ابا جان خاموش کھڑے حیرت سے گلزار کو دیکھ رہے تھے۔ گلزار کا باپ بھی ہاتھ جوڑے وہاں کھڑا تھا۔ اس کے چہرے پر ندامت کے آثار تھے۔ وہ چوری چوری چھپتے ہوئے اپنے بیٹے کی طرف بھی دیکھ لیتا تھا۔ ہر کوئی یہ جاننے کی جستجو میں تھا کہ گلزار نے یہ حرکت کیوں کی مگر وہ چپ چاپ مار کھائے جارہا تھا اور کچھ بھی بول نہیں رہا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں حیران، پریشان اور خوف زدہ سی ہو کر گلزار کو دیکھنے لگی۔ مجھے یہ اندیشہ سا ہونے لگا کہ کہیں گلزار اپنی جان بچانے کی خاطر میری محبت کا بھانڈا نہ پھوڑ دے اور اگر ایسا ہو گیا تو پھر میرا بھی وہی حشر ہوگا جو گلزار کا ہو رہا ہے۔ باپ اور بھائی تو مجھے زندہ نہ چھوڑیں گے۔ ایک لمحے کو میرا جی چاہا کہ میں اپنی محبت کا بھرم رکھوں اور گلزار کو پٹنے سے بچانے کے لیے سچ بول دوں مگر باپ اور بھائیوں کے ظلم اور خوف نے مجھے جکڑ لیا اور میری زبان حرکت نہ کر سکی۔ پھر خود کو بچانے کے لیے میں بھی حویلی کا ایک فرد بن گئی۔ میں نے سوچا اس سے قبل کہ گلزار حقیقت اُگل دے میں بھی مجرم بن جاؤں۔ میں آگے بڑھی اور پاؤں سے اسے ایک ٹھوکر مارتے ہوئے کہا۔ ''چور، ڈاکو، لٹیرے تو میری شادی کا زیور چرا کر بھاگ رہا تھا۔''

میرے الفاظ شاید برچھیوں کی مانند گلزار کے سینے میں اتر گئے تھے۔ اس نے شکایت بھرے لہجے میں کہا۔ ''ہاں میں چوری کی غرض سے حویلی میں آیا تھا۔ میں اس غربت کی زندگی سے تنگ آ گیا ہوں۔ میں کراچی جا کر کوئی کاروبار کرنا چاہتا تھا۔''

گلزار کا اقرار جرم جان کر میرے بھائیوں نے اس پر لاتوں اور گھونسوں کی مزید بارش کر دی جس اسے پٹتا ہوا دیکھ نہ سکی اور اپنے کمرے میں لوٹ آئی پھر بستر پر گر کر رونے لگی کہ میں گلزار کی مجرم ہوں۔ میں محبت کا بھرم نہیں رکھ سکی مگر یہ اس وقت کا تقاضا تھا۔ گلزار ہار کھا کر بھی محبت کی بازی جیت گیا اور میں جیت کر بھی ہار گئی۔

بقیہ تمام رات میں نے سسکتے ہوئے گزاری۔ مجھے اپنے کیے کا دکھ بھی تھا کہ میں نے گلزار کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ میں بے وفا ہوں مگر میں اور کیا کرتی مجھے اپنی زندگی عزیز تھی۔

اگلی صبح گلزار کو پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ وردی والوں نے بھی اس کی خوب مرمت کی تھی۔ پھر تایا ابا نے اکرم کی خدمات کا خیال کرتے ہوئے گلزار کو پولیس سے نجات دلا دی اور اسے حکم دیا ہے کہ وہ یہ گاؤں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دے اور کبھی بھول کر بھی ادھر نہ آئے۔

گلزار نے ایسا ہی کیا۔ اس نے گاؤں ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ میری محبت کی ادھوری کہانی یہیں ختم ہو گئی۔ کچھ عرصے تک میں گلزار کے ساتھ ہونے والی زیادتی، ظلم اور بے وفائی کی کسک محسوس کرتی رہی۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں سب کچھ بھول گئی اور یوں ہی پانچ برس بیت گئے۔

اس عرصے میں میری شادی سلیمان سے ہو گئی۔ سلیمان سرکاری ادارے میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ شادی سے کچھ ہی عرصہ بعد میں اپنے شوہر کے ہمراہ شہر آ گئی۔ جہاں ان دنوں وہ ملازمت کرتے تھے۔ سلیمان عموماً دوسرے شہروں کے دوروں پر رہتے تھے اور کبھی کبھی دو تین دن گھر نہ آتے تھے۔ میں گھر میں اکثر اکیلی ہی ہوتی تھی۔ کبھی کبھار گاؤں سے نندیں آ جاتی تھیں مگر وہ دو چار دن رہ کر لوٹ جاتی تھیں۔ ان دنوں سلیمان کی تعیناتی ہمارے اپنے ہی ضلع کے ہیڈ کوارٹر میں تھی۔ اس روز بھی وہ سرکاری کام کے سلسلے میں لاہور گئے تھے۔ تین دن بعد لوٹ کر آنا تھا۔ انہوں نے گاؤں پیغام بھیج دیا تھا کہ میری کوئی نند میرے پاس رہنے کے لیے آ جائے مگر کسی مجبوری کی وجہ سے گاؤں سے کوئی بھی نہ آ سکا۔ میں اتنے بڑے گھر میں اکیلی تھی۔ اپنے بیٹے زیشان کو سلانے کے بعد میں نے ملازمہ سے کہا کہ وہ میرے لیے کافی بنا لائے۔ میں ایک کتاب لے کر پڑھنے لگی۔ مجھے اب بھی پڑھنے کا بہت شوق تھا۔ بلکہ شادی کے بعد تو میرا مطالعہ کافی وسیع ہو گیا تھا۔ کتاب پڑھتے ہوئے مجھے نیند آ گئی اور میں سو گئی۔

آدھی رات کا وقت تھا کہ گھر میں ڈاکو گھس آئے۔ ان میں سے دو نے مجھے اور نوکرانی کو ایک کمرے میں بند کیا اور گھر کی تلاشی لینے لگے۔ انہوں نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے شور مچایا تو وہ مجھے جان سے مار ڈالیں گے۔ پھر انہوں نے زیشان کو اٹھا لیا اور دھمکی دی کہ اگر میری آواز نکلی تو وہ میرے بچے کو ختم کر دیں گے۔

ہم دونوں چپ ہو گئے تھے اور وہ دونوں گھر کی تلاشی لینے لگے۔ ساری الماریاں کھنگال ڈالیں۔ میرے ہاتھوں میں انگوٹھیاں، کانوں میں جھمکے اور گلے میں لاکٹ تھا۔ ڈاکوؤں کے ایک ساتھی کی نظر ان پر پڑی تو اس نے مجھے یہ سب زیور اتار کر اس کے حوالے کرنے کا حکم دیا۔ میں ڈر کے مارے وہ زیور اتار کر اس کے حوالے کرنے لگی۔ تبھی ان کا تیسرا ساتھی بھی وہاں آ گیا۔ وہ ان کا سردار لگ رہا تھا۔ اس نے بھی اپنا چہرہ نقاب سے ڈھانپ رکھا تھا۔ اس نے بڑے غور سے میری طرف دیکھا۔ پھر اس نے ایک نظر مال و زر پر ڈالی اور میری طرف گہری نظروں سے دیکھنے لگا۔ میں خوف زدہ ہو گئی کہ کہیں یہ میری عزت کے درپے نہ ہو جائے۔ چند لمحوں بعد وہ اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا اور بولا۔ ''اسے چھوڑ دو اور جو کچھ یہاں سے لوٹا ہے وہ سب

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

واپس کر دو۔"

اس کے ساتھی ٹھٹک گئے اور پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ ساتھیوں کو شش و پنج میں دیکھ کر وہ غصیلے ..... بھرے انداز میں بولا۔ "جو میرا حکم ہے اس پر عمل کرو۔"

انہوں نے فوراً اس کے حکم کی تعمیل کی اور تمام مال و زر میرے سامنے لا کر رکھ دیے۔ اس کے ساتھی تو حیران تھے ہی خود میں بھی حیران تھی کہ یہ کیسا ڈاکو ہے جو ڈھیروں مالیت کا زیور اور نقدی لوٹنے کے بعد لوٹا رہا ہے۔ میں حیرت سے گنگ کھڑی تھی۔ اس نے اپنے ساتھیوں کو اس کمرے سے باہر جانے کو کہا تو وہ باہر نکل گئے۔ پھر اس نے نوکرانی کو بھی کمرے سے باہر نکال کر اندر سے کنڈی لگائی تو میں خوف زدہ ہو گئی کہ اب یہ میرا دامنِ عصمت تار تار کرے گا۔

"یہ کیا کر رہے ہو تم؟" میں نے لرزتے ہوئے لہجے میں کہا۔

"بے فکر رہو نرگس صاحبہ! میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچاؤں گا۔" یہ کہہ کر اس نے اپنے چہرے سے نقاب اتار دیا۔

"گلزار! تم اور اس روپ میں؟" میں نے حیرت زدہ ہو کر کہا۔

"اب میں گلزار نہیں گلو ڈکیت ہوں۔ ڈاکوؤں کا سردار۔ لیکن تم حیران کیوں ہو رہی ہو۔ مجھے ڈکیت بنانے والی تم ہی تو ہو۔ پولیس والوں اور حویلی والوں کی مار پیٹ اور طعنوں نے ہی تو مجھے اس راہ پر ڈالا ہے۔ مجھ پر ایک داغ لگ گیا تھا اس لیے پولیس والوں نے "بھتے" کا تقاضا شروع کر دیا۔ ان کا منہ بند کرنے کے لیے مجھے یہ راہ اختیار کرنی پڑی۔"

اس کا لہجہ انتہائی تلخ تھا۔ اس کے چہرے پر میرے لیے حقارت کے تاثرات تھے۔ اس کی آنکھوں میں شکوے شکایتیں تھیں۔ پھر وہ بولا۔ "میں نے تو یہ عہد کر لیا تھا کہ زندگی بھر تمہاری شکل نہیں دیکھوں گا مگر اتفاق دیکھو کہ تقدیر مجھے تمہارے سامنے لے ہی آئی۔ یاد رکھو میں نے تمہاری محبت نہیں بلکہ تمہاری زبان کا بھرم رکھا اور ڈکیت بن گیا ہوں۔ میں نے ایک بار سوچا تھا کہ تم سے اپنی رسوائی کا اور تمہاری بے وفائی کا بدلہ لوں گا۔ بھیانک انتقام لوں گا لیکن پھر میں نے تمہیں معاف کر دیا کہ تم اپنے ظرف سے بڑھ کر کسی کو کیا دے سکتی تھی۔ جو کچھ تم نے اس رات حویلی میں میرے ساتھ کیا وہ تمہارا ظرف تھا اور آج میں نے جو کچھ کیا ہے وہ میرا ظرف ہے۔ میں چاہوں تو اپنی بربادی کا بدلہ لے سکتا ہوں مگر میں ایسا نہیں کروں گا کیونکہ میں نے تم سے محبت کی ہے سچی اور بے لوث محبت۔ تم نے سوچا ہوگا کہ کہیں میں مار پیٹ سے بچنے کے لیے تمہاری محبت کا راز افشا نہ کر دوں۔ اسی لیے تم نے مجھ پر الزام لگا دیا تو میں نے قبول کر لیا میں چاہتا تو تمہارے محبت نامے پیش کر کے بے قصور بن جاتا۔" وہ سانس لینے کو رکا اور پھر بولا۔ "محبت میں ایک دوسرے کا بھرم رکھنا پڑتا ہے۔ ایثار کرنا پڑتا ہے مگر تم ان باتوں کو بھلا کہاں سمجھتیں۔" اس نے حقارت سے کہا اور پھر تیزی سے واپس مڑا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

میں نڈھال سی ہو کر بستر پر گر گئی۔ میں اسے روک کر اس سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگنا چاہتی تھی مگر میں ایسا نہ کر سکی۔ مجھے اپنے آپ سے نفرت سی ہو گئی کہ میں ماسٹر گلزار کو گلو ڈکیت بنانے کی ذمہ دار ہوں۔ میں اپنی محبت کی قاتلہ ہوں۔ میں گلزار کی مجرم ہوں میں سسکنے لگی اور یہ اندیشے بھی ڈسنے لگے کہ اگر میرے شوہر کو اس واردات اور باتوں کی ہوا لگ گئی تو میری خوشگوار ازدواجی زندگی میں بھونچال آ جائے گا۔ میں نے بقیہ رات سسکتے اور تڑپتے ہوئے گزار دی۔ گلزار کا چہرہ میری نگاہوں سے نہ ہٹ رہا تھا۔ میں اپنے آپ کو اس کا مجرم سمجھ رہی تھی۔ اگلا دن بھی اسی الجھن اور پریشانی میں گزر گیا۔

اگلے دن میں نے اخبار میں پڑھا۔ "گلو ڈکیت اپنے ساتھیوں کے ہاتھوں مارا گیا۔"

میں وہ خبر پڑھ کر افسردہ ہو گئی تھی کہ اس کے ساتھیوں نے اسے اسی وجہ سے مار ڈالا کہ اس نے میرے گھر سے لوٹا ہوا مال و زر واپس کیوں لوٹا دیا تھا۔ میری آنکھوں میں آنسو بھر آئے تھے۔ میں کئی دن افسردہ رہی اور پھر آہستہ آہستہ اس واقعے کو بھلانے کی کوشش کرنے لگی۔

کئی برس بیت گئے ہیں مگر میں گلزار کو نہیں بھلا سکی ہوں۔ میرے سینے میں اس کی عظمت اور وفا کے نشان کندہ ہیں۔ میں اس کی عظمت اور ایثار کے آگے خود کو انتہائی قابلِ نفرت محسوس کرنے لگی ہوں۔ میں خود ذہنی اذیت میں مبتلا ہوں اور بیٹھے بیٹھے گلزار کے تصور میں گم ہو جاتی ہوں۔ سلیمان سے میں بات کرتی ہوں تو ایسے لگتا ہے کہ میں انہیں دھوکا دے رہی ہوں۔ میں خوابوں اور خیالوں میں گلزار سے معافی مانگتی ہوں کیوں کہ مجھے یہ احساس ہر پل ستاتا رہتا ہے کہ میں بے وفا ہوں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

رئیس

جناب ایڈیٹر سرگزشت

السلام علیکم

میں نے وقت گزاری کے لیے اپنی زندگی کا ایک دلچسپ واقعہ لکھنے کی کوشش شروع کی تھی لیکن جب تحریر مکمل ہوئی تو مجھے لگا کہ یہ سرگزشت کے قارئین کو پسند آسکتی ہے۔ اسی لیے بھیج رہا ہوں کہ اسے پڑھ کر اندازہ لگائیں کہ ہمارے سرکاری دفاتر میں کام کی رفتار سست کیوں ہے۔ میں ریٹائر ہو چکا ہوں اسی لیے پردہ اٹھانے کی ہمت کی ہے۔

فیض الدین انصاری

(کراچی)

بندہ اس بہت بڑی دنیا میں تین طرف سے بہت عاجز ہے۔ ویسے اللہ کا بہت کرم ہے اس نے اپنے اس بندے کو ہر اس نعمت سے نوازا ہوا ہے جس سے اس کے دوسرے بندے بھی شادوکام ہورہے ہیں۔ جیسے ایک نوکری ہے اور سرکاری ہے۔ سولہ گریڈ کا افسر ہونے کے جو جائز مراعات ہیں وہ مجھے بھی میسر ہیں اور ناجائز کی کبھی خواہش یا کوشش نہیں کی۔ سرکار کی طرف سے ایک گھر بھی ملا ہوا ہے اور امید ہے کہ ریٹائرمنٹ تک اپنا گھر بھی ہو جائے گا۔ گھر والی اور اس کے توسط سے تین عدد خوب صورت اور ذہین بچے بھی ہیں۔ ایک عدد چار پہیوں والی سواری بھی ہے۔ مگر اتفاق سے اس عاجز کی عاجزی کا تعلق بھی ان تینوں چیزوں سے ہے۔ عاجز کرنے میں پہلا نمبر میرے اعلیٰ افسر رئیس الدین صاحب کا ہے۔ وہ گریڈ میں تو مجھ سے صرف ایک عدد زیادہ ہیں یعنی سترہ گریڈ کے افسر ہیں لیکن کروفر اور دنیاوی مال و متاع میں وہ اس عاجز سے بہت آگے ہیں۔ اس کا اظہار ان کے رکھ رکھاؤ اور رویے سے بخوبی ہوتا ہے۔ وہ اسے جتانے کا اور خاص طور سے اس عاجز کو جتانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ہیں۔

اسلام آباد کے اسی سیکٹر میں جہاں میرا چھ مرلے کا چھوٹا سا سرکاری بنگلا ہے وہیں کچھ ہی دور رئیس الدین کا ایک کنال پر ذاتی بنگلا ہے۔ سننے میں آیا ہے کہ صرف یہی نہیں بلکہ ان کے دارالحکومت اور اس کے آس پاس اور بھی بہت ساری جائداد ہے۔ ظاہر ہے اسی لحاظ سے بینک بیلنس ہے اور مزید ظاہر ہے کہ اسی لحاظ سے بفضل ربی بھی ہے۔ رئیس الدین کمانے کے معاملے میں جائز ناجائز کی کبھی پروا نہیں کرتے ہیں۔ جیسی زندگی اور ٹھاٹ باٹ ہیں اسی معیار کی بیوی بھی ہے جو بذات خود ایک اعلیٰ بیوروکریٹ خاندان سے ہے اور رئیس الدین کی اس پوسٹ پر پوسٹنگ میں ان کے سسرالی عزیزوں کا بہت زیادہ ہاتھ تھا۔ اس سیٹ پر بہت سے افسروں کی نظر رہی ہے کیونکہ یہاں کمائی کے مواقع بہت ہیں مگر رئیس الدین صاحب گزشتہ چھ برس سے اس پر یوں قبضہ جمائے ہوئے ہیں کہ ہٹنے کا نام بھی نہیں لے رہے۔

رئیس الدین صرف کمانے کے نہیں بلکہ اکیلے کھانے کے قائل ہیں اور انہوں نے دفتر میں اپنے نیچے موجود افراد کے لیے کچھ زیادہ مواقع نہیں چھوڑے۔ یہی وجہ ہے کہ سوائے میرے باقی سب اس معاملے میں ان سے نالاں رہتے ہیں۔ میرے عاجز ہونے کی وجوہات دوسری تھیں۔ جیسا کہ ہر دفتر میں رواج ہے صاحب اختیار کسی ایک فرد کو چاند ماری کے لیے منتخب کر لیتا ہے۔ ہر معاملے میں اسی کو نشانہ بناتا ہے اور اسے ہی قصوروار ٹھہراتا ہے، چاہے معاملہ گھر کا ہی کیوں نہ ہو تو رئیس الدین صاحب نے اس عاجز کو منتخب کیا ہوا تھا۔ جب کوئی کام ہو اور بہت مشکل ہو اور اس میں غلطیوں کا بہت امکان ہو تو وہ فوراً مجھے یاد کرتے تھے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور کام ادا دیتے۔ ظاہر ہے مجھے کرنا پڑتا تھا اور غلطیوں پر سننا بھی پڑتی تھیں حالانکہ اپنی طرف سے میں کوشش کرتا تھا کہ کم سے کم غلطیاں ہوں یعنی کم سے کم بے عزتی ہو مگر بندہ بشر ہوں تو غلطیاں ہو ہی جاتی تھیں۔ خاص طور سے جب بندہ سرکاری ملازم ہو تو غلطی کا امکان بھی بڑھ جاتا ہے۔

رئیس الدین کو منفی کر دیا جائے تو اس ملازمت میں اتنا ہی مزہ تھا جتنا سول گریڈ کی سرکاری ملازمت میں ہوتا ہے۔ دوسری عاجزی کا تعلق گھر سے ہے۔ بیگم صاحبہ ایک پڑھے لکھے اور ذرا دانشور گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے وہ دانشوری جہیز میں لے کر آئیں۔ ان کے نزدیک ان کے ابا سے بڑا دانشور یونان و خطہ عرب نے مل کر بھی پیدا نہیں کیا۔ مجھے اس دعوے پر کوئی اعتراض نہیں تھا بشرطیکہ ان کی دانشوری میرے ازدواجی معاملات میں دخل اندازی نہ کرتی۔ مسئلہ یہ تھا کہ بیگم سے اس دانشوری کو الگ کرنا اتنا ہی مشکل تھا جتنا کچے دودھ سے چکنائی الگ کرنا۔ حالانکہ میں نے بہت کوشش کی مگر بچوں میں بھی یہ دانشوری پہنچ ہی گئی تھی اور اب ان سب کی نظر میں، میں صرف ایک ذرا سرکاری افسر تھا اور اس سے زیادہ میری کوئی اوقات نہیں تھی۔ میں اس پر بھی راضی تھا بشرطیکہ وہ مجھے بار بار یہ بات یاد دلانے کے انداز میں نہ جتاتے۔ مثال کے طور پر رات کے کھانے کے بعد ٹی وی دیکھتے ہوئے میں غلطی سے کسی جغادری اینکر پرسن کے پروگرام پر تبصرہ کرتا تو بیوی بچے مجھے یوں دیکھتے جیسے میں نے کوئی سنگین غلطی کر دی ہو۔ بیوی تو منہ پر دوپٹے مارتی تھی مگر بچے ذرا ادب لحاظ سے یاد دلاتے کہ پاپا آپ کا ان چیزوں سے کیا تعلق؟

اگر اتوار کی چھٹی والے دن غلطی سے کسی چیز کا بھاؤ بھول جاتا تو طنز کیا جاتا کہ ہاں جی سرکاری افسر جو ٹھہرے ان چیزوں سے بھلا کیا تعلق اور تو اور ایک دن جب میں ایک چھوٹے برخوردار کی سائیکل چلانے کی کوشش کر رہا تھا تو وہ اچانک آگئے اور انہوں نے بھی سیدھا افسری پر ہاتھ ڈالا تھا۔ "پاپا آپ اتنے بڑے سرکاری افسر ہو کر اتنی سی سائیکل چلا رہے ہیں۔"

"بیٹا آپ کا یہ پاپا کبھی بچہ بھی رہا ہے۔" میں نے ملائمت سے کہا۔ "میں ان ہی دنوں کی یاد تازہ کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔"

"نانا جان کہتے ہیں کہ گئے دن کبھی واپس نہیں آتے اور یہ صرف خود فریبی ہے۔"

نانا جان یعنی میرے سسر محترم خود بھی وقت ماضی کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ان دھندلکوں میں کھوئے رہتے تھے جن کے پار صرف ان کی ہی نگاہ خاص پہنچتی تھی اور وہ ہمیں وہاں کے صرف چیدہ چیدہ واقعات سناتے تھے جن کے راوی اور تصدیق کنندہ وہی تھے۔ تیسری چیز جس سے میں عاجز ہوں وہ ان کی ہی یادگار اور بدقسمتی سے ان کی وراثت میں مجھے ملنے والی واحد چیز تھی۔ یہ غالباً ساٹھ کی دہائی کی ملٹری ماڈل کی جیپ ہے جس کا ہر پرزہ کئی بار تبدیل ہو چکا ہے۔ الٹریشن اتنی زیادہ ہے کہ اگر ان انجینئر صاحبان کے سامنے رکھ دیا جو اس کی پیدائش کے ذمے دار تھے تو وہ یقیناً اپنی ولدیت سے انکار کر دیں گے کیونکہ اس کی ظاہری اور باطنی صورت میں خاصی سے بھی بہت زیادہ تبدیلیاں آچکی ہیں۔ یہ سسر محترم کی طرف سے منتقل ہو کر میری تحویل میں آئی تو جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ بھی پوری ہو گئی۔

سسر محترم کے ناگہانی انتقال کی وجہ صرف عمر تھی۔ وہ نوّے برس کی عمر میں بادل نخواستہ دنیا سے گئے تھے مگر ان کی آل اولاد کے رونے دھونے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ بھری جوانی میں دنیا سے گزر گئے ہوں۔ ان کے سوم کے تیسرے دن مجھے اصل صدمے سے گزرنا پڑا جب پتا چلا کہ انہوں نے اپنے اکلوتے داماد کے لیے وراثت میں صرف اپنی پیاری جیپ چھوڑی تھی۔ یہ جیپ جو گزشتہ دس بارہ سال سے ان کے عالی شان بنگلے کے پچھلی گیراج میں کھڑی تھی کیونکہ سسر محترم اتنے ہی عرصے سے صاحب فراش تھے۔ کوئی دوسرا فرد اسے ہاتھ لگانے کا بھی روادار نہیں تھا۔ جیپ پر مٹی کی اتنی موٹی تہ تھی جسے صرف جھاڑ کر ہٹایا نہیں جا سکتا تھا اس لیے میں نے فوری طور جیپ سے نکالا دکھنے کو کہا اور اپنے سالوں سے وعدہ کیا کہ جلد میں اپنے بنگلے کے پورچ میں اس کے لیے جگہ بنا لوں گا جہاں فی الحال میری بائیک اور میرے صاحبزادوں کی سائیکلیں پارک ہوتی تھیں۔ اس کے برعکس دل میں، میں ارادہ کر چکا تھا کہ یہ جیپ کبھی میرے گھر نہیں آئے گی مگر میری بیگم کا ارادہ کچھ اور تھا۔ ایک دن میں شام کو گھر آیا تو گھر کے سامنے ہی جیپ اپنی تمام تر بیت کذائی کے ساتھ موجود تھی اور اہل محلہ اس کا تماشا دیکھ رہے تھے۔ ان کو خبر پہنچ چکی تھی کہ سسر محترم کی طرف سے یہ داماد کے لیے گفٹ ہے۔ یہاں تک لانے میں صرف اس کی گرد اتری تھی اور باقی یہ مجبوراً کنڈیشن میں تھی۔ یہی وجہ تھی کہ لوگ ہنس رہے تھے۔ میں جھنجلایا ہوا اندر آیا تو بیگم اطمینان سے بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے پوچھا۔

”یہ کیا تماشا ہے؟“

”کیسا تماشا؟“

”یہ جیپ نما چیز ہمارے گھر کے باہر کیا کر رہی ہے؟“

بیگم کے تیور بدل گئے۔ ”آپ بھول رہے ہیں یہ میرے ڈیڈی نے آپ کے لیے چھوڑی ہے۔“

”وراثت میں تم کافی تھیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”مجھے یہ بالکل نہیں چاہیے، مہربانی کر کے کل جو پہلا کباڑیا گلی میں آئے اسے کہنا کہ اسے لے جائے۔“

میرے لہجے کی قطعیت سے بیگم نے اندازہ کر لیا کہ جیپ مجھے کسی صورت قبول نہیں تھی اس لیے انہوں نے پینترا بدلا۔ ”آپ کتنے عرصے سے کوشش کر رہے تھے مگر اپنی گاڑی لے ہی نہیں سکے اب گاڑی ملی ہے تو منع کر رہے ہیں۔“

”جس قسم کی یہ گاڑی ہے اس سے میں بغیر گاڑی کا ہی بھلا ہوں۔“ میں نے کہا اور اندر چلا گیا۔ بیگم کا منہ پھولا ہوا تھا مگر میں نے پروا نہیں کی۔ میں سولہ گریڈ کا افسر تھا لیکن میری کچھ عزت تو تھی اور یہ چیز سراسر بے عزتی کے مترادف تھی۔ اگلے دن میں دفتر سے آیا تو جیپ غائب تھی۔ میں نے سکون کا سانس لیا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ زندگی میں پہلی بار میں بیوی سے کوئی بات منوانے میں کامیاب رہا تھا مگر میری یہ غلط فہمی آنے والے اتوار کو دور ہو گئی جب میں گھر کا سودا سلف لینے گیا اور مارکیٹ سے پہلے مجھے میر آٹوز کے فضل بھائی نے روک لیا۔

”کہاں ہیں فیاض صاحب نظر ہی نہیں آ رہے۔ جیپ آئی تو میں نے سوچا کہ آپ کا دیدار بھی ہو جائے گا۔“

میں چونکا۔ ”جیپ...... کون سی جیپ؟“

”ابھی آپ کی جیپ یہ رہی۔“ فضل بھائی نے ایک ڈھانچا دکھایا جس پر سے تمام اضافی سامان مع انجن کے اتار لیا گیا تھا اور ایک لڑکا اس کی گل جانے والی باڈی کو ریگ مال مار رہا تھا۔ میں نے انکار کیا۔

”یہ میری جیپ نہیں ہے میرے پاس کوئی جیپ نہیں ہے۔“

فضل بھائی نے دانت نکالے۔ ”کیوں مذاق کر رہے ہو فیض بھائی، بھابی نے خود بلایا تھا اور یہ جیپ میرے حوالے کی تھی۔ ایک ہفتے بعد دیکھنا پہچانی نہیں جائے گی۔“

تو بیگم صاحبہ نے یہ کیا تھا۔ اب گھر جا کر جھگڑا بیکار تھا

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اور میں نے جھینپ کر فضل بھائی سے کہا۔ "سوری میں بھول گیا تھا۔"

اس نے ٹھنڈی سانس لی۔ "ہاں بھیا بڑے افسروں کی بڑی باتیں۔"

میں نے ڈرتے ڈرتے خرچے کا پوچھا کیونکہ وہ مجھے ہی بڑا افسر قرار دے چکا تھا۔ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔ "زیادہ نہیں فضل بھائی اور آپ کے لیے تو کچھ بھی نہیں ہے۔"

"بھائی یہ کچھ بھی نہیں... تو کچھ نہ کچھ ہوگا۔"

"صرف ستاون ہزار روپے۔" اس نے جواب دیا۔

"ستاون ہزار روپے۔" میں نے اعتراض کیا۔ "اتنے میں کوئی دوسری چلتی پھرتی گاڑی نہ لے لوں۔"

"یہ بھی چلتی پھرتی ہو جائے گی۔" فضل بھائی نے مسکرا کر کہا۔ "چیز اچھی ہے ایک بار بن گئی تو مزے کرو گے۔"

یہ آج سے کوئی سترہ سال پہلے کی بات ہے۔ اس وقت ستاون ہزار خاصی بڑی رقم تھی۔ جب میری کل تنخواہ پانچ فگرز میں نہیں آتی تھی۔ اس لیے مجھے فکر لاحق ہوئی کہ یہ خرچ کون کرے گا اور یہی سوال جب میں نے بیگم سے کیا تو انہوں نے مجھے اطمینان دلایا۔ "ڈیڈی کی طرف سے جو رقم میرے حصے میں آئی ہے اس میں سے دوں گی لیکن اس کے بعد جو خرچا ہوگا وہ آپ کو کرنا ہوگا۔"

میرا ارادہ تو نہیں تھا مگر جب ایک بار گاڑی ہاتھ میں آئی اور اس کے مزے لگے تو خرچا بھی خود ہونے لگا۔ فضل بھائی نے جیپ واقعی نئی جیسی کر دی تھی۔ نیا انجن، نیا سسپنشن، اندر کی نئی ڈیکوریشن، نئی وائرنگ اور لائٹس، نئے ربڑ بل ٹائرز اور نیا کلر، واقعی اس کی صورت نکل آئی تھی۔ اس کے عقبی حصے کو دھاتی کیبن سے بند کر کے اندر بہت اچھی والی سیٹ لگائی تھی۔ اس صورت گری کے بعد جیپ چلنے کے قابل تو ہو گئی تھی مگر وہ بہرحال فیکٹری سے بن کر نہیں آئی تھی اس لیے ہر دوسرے تیسرے مہینے اس میں کوئی نہ کوئی کام نکلتا رہتا تھا۔ بیگم کی وارننگ کے مطابق وہ مجھے کرانا ہوتا تھا۔ اس زمانے میں ڈیزل سستا تھا اس لیے میں بائیک کی بجائے جیپ پر دفتر جانے لگا اور ایک دن میں پارکنگ میں گاڑی روک رہا تھا کہ رئیس الدین کی نئی چمچاتی ہوئی ہونڈا اکارڈ آ کر رکی۔ انہوں نے نیچے اتر کر جیپ کا معائنہ کیا اور طنزیہ لہجے میں بولے۔

"مبارک ہو دو سے چار پہیوں پر آ گئے تم۔"

"شکریہ سر۔" میں نے صرف انہیں جتانے کے پیار سے جیپ کے بونٹ پر ہاتھ پھیرا۔ "یہ نایاب ماڈل ہے۔ کسی زمانے میں نوجوان آرمی کے لیے صرف پانچ سو جیپ بنائی گئی تھیں اب پورے ملک میں شاید ایک درجن بھی نہیں ہوں گی۔ ان میں سے ایک یہ ہے۔"

رئیس الدین صاحب کا چہرہ بجھ گیا تھا اور انہوں نے یوں جیپ کی طرف دیکھا جیسے وہی ان کی بے عزتی کی ذمے دار ہو۔ ایک ہفتے بعد میں بائیک پر دفتر پہنچا (جیپ فضل بھائی کی ورکشاپ میں تھی)۔ رئیس الدین ایک نئی چمکتی ہوئی پجارو سے اتر رہے تھے۔ میں نے کہا۔ "مبارک ہو سر نئی لی ہے؟"

"ہاں بچے فرمائش کر رہے تھے۔" وہ بے پروائی سے بولے۔ "اب ان کی بات تو نہیں ٹال سکتا۔"

"آپ نے ٹھیک کہا، ویسے یہ ماڈل آج کل بہت عام ہے۔ ہر دوسرا آدمی سڑک پر یہی لے جا رہا ہوتا ہے۔"

میری اس بات پر اور اپنی پجارو کی اہمیت گھٹنے پر رئیس الدین صاحب نے مجھے کڑی نظروں سے دیکھا اور بولے۔ "میں دو دن سے آپ سے الف فائل کا پوچھ رہا ہوں۔"

"سر میں نے ریکارڈ کیپر سے کہا ہے مگر اس کا کہنا ہے کہ فائل شمشیر خان صاحب کے پاس ہے اور اب تک واپس نہیں آئی ہے۔"

شمشیر خان محکمے میں رئیس الدین کے سب سے بڑے حریف اور سترہ گریڈ کے افسر تھے مگر ان کی پوسٹ کچھ اور تھی۔ رئیس الدین نے غرا کر کہا۔ "تو یہ تمہاری ذمے داری ہے فائل لے کر دو۔"

"سر میں نے تحریری درخواست دے دی ہے۔ شاید کل تک اس کا جواب آ جائے۔" میں نے اطمینان سے کہا۔

سرکاری دفتروں میں ہر کام تحریر پر چلتا ہے یہاں کوئی اس سے ہٹ کر کچھ کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا یہی وجہ ہے کہ جو کام پرائیویٹ اداروں میں ایک منٹ میں ہوتا ہے یہاں ایک دن میں بھی نہیں ہو پاتا۔ رئیس الدین صاحب کی طلب کردہ فائل پورے تین دن بعد ان کی میز پر پہنچی تھی اور مزے کی بات تھی کہ انہیں کوئی خاص کام نہیں تھا صرف فائل دبا کر رکھنی تھی کیونکہ یہ ایک سڑک کی تعمیر نو سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

متعلق تھی اور اس کا ٹھیکا دیا جانے والا تھا۔ یقیناً رئیس الدین صاحب نائکل مجبور نے کا بھاری نذرانہ وصول کرتے اور اسی لیے وہ اسے بے تاب تھے۔ ہر راشی کی طرح ان میں حرص بہت تھی۔ انہیں گوارا نہیں تھا کہ کوئی ان سے آگے نکل جائے۔ جب انہوں نے پجارو لی تو میرے گمان میں بھی نہیں آیا تھا کہ انہوں نے مجھ سے مقابلے میں یہ گاڑی لی ہے۔ اس وقت یہ اسٹیٹس سمبل تھی۔ ہر امیر آدمی اسے شوق سے رکھتا تھا۔ چند دن بعد میرے ایک ساتھی افسر شباب احمد نے بتایا کہ رئیس الدین صاحب اپنے کسی خاص چمچے سے فرمارہے تھے۔

''یہ فیض کمار اجیپ لے کر سمجھتا ہے اس نے کوئی تیر مارا ہے میں نے پجارو دکھائی تو منہ پر جوتا پڑا۔''

''کیسا جوتا کہاں کا جوتا۔'' میں ہنسا۔ ''کہاں رئیس الدین صاحب اور کہاں میں۔''

''ایک گریڈ ہی تو کم ہے۔'' شباب احمد نے کہا۔ ''ویسے بھی یہ ان کا آخری سال ہے۔''

''مشکل ہے ان کو ایکس ٹینشن مل جائے گی۔''

ایسا ہی ہوا۔ ایک سال بعد رئیس الدین صاحب کو محکمے کے لیے ناگزیر سمجھتے ہوئے انہیں دو سال کی ایکس ٹینشن دے دی گئی اور اس سیٹ پر آس لگائے بیٹھے بہت سے افراد کی اُمیدوں پر اوس پڑ گئی۔ ان میں ایک یہ عاجز بھی تھا مگر میری اُمیدیں بہت زیادہ نہیں تھیں، کیونکہ مجھے اس سیٹ سے کمانا نہیں تھا۔ بس ذرا اہمیت بڑھ جاتی اور تنخواہ میں اضافہ ہو جاتا مگر یہ اُمید بھی اُمید ہی رہی۔ چودہ سولہ گریڈ کے افسران کی کم بختی آئی رہتی ہے اس لیے اکثر افسران کوشش کرتے ہیں کہ ان درجوں سے جلد از جلد نکل جائیں۔ فطری طور پر میری بھی خواہش تھی۔

رئیس الدین صاحب بھی تیزرفتار لیٹ چڑھنے والوں میں سے تھے اور ماشااللہ سے وہ بار اتنی ترقی کر چکے تھے اس لیے ساٹھ سال کی عمر میں بھی سترہ گریڈ سے آگے نہیں بڑھے تھے اور یہ بھی ان کے سسرال والوں کی مہربانی تھی۔ اسٹیٹس میں زمین آسمان کے فرق کے باوجود کیونکہ گریڈ میں صرف ایک درجے کا فرق تھا اس لیے ہماری بیگمات آپس میں ملتی رہتی تھیں اور تقریبات میں پروٹوکول کے لحاظ سے آس پاس ہی ہوتی تھیں۔ جب رئیس الدین صاحب نے پجارو لی تو بیگم صاحبہ نے رشک سے بتایا۔ ''آپ نے دیکھا رئیس صاحب نے کتنی شاندار جیپ لی ہے۔''

''ہاں ہم جانتی ہو رئیس صاحب لے سکتے ہیں۔''

''کاش کہ ہم بھی لے سکتے۔'' بیگم نے سرد آہ بھری۔

میں نے نرمی سے کہا۔ ''آپ جانتی ہیں میں اپنے بچوں کو حرام نہیں کھلا سکتا۔''

''ہاں یہ تو ہے۔'' وہ بے دلی سے بولیں۔ ''بس اسی وجہ سے خاموش رہ جاتی ہوں۔''

''ویسے بھی خدا کا دیا سب کچھ تو ہے۔''

''مسز رئیس الدین ابھی دبئی سے آئی ہیں۔'' بیگم نے حسرت سے کہا۔ ''ایک ہم ہیں اپنے ہی ملک میں کہیں نہیں جاسکتے۔''

''بالکل جاسکتے ہیں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بہ شرط کہ تم اور بچے اپنی چادر کے مطابق چلنے پر آمادہ ہو۔''

''ہماری چادر؟''

''ہاں ہم ذرا سستے ہوٹلوں میں قیام کریں، ذرا سستا کھائیں اور شاپنگ سے گریز کریں تو کہیں بھی جانا زیادہ مشکل نہیں ہے۔ اصل مقصد تو گھومنا پھرنا اور مناظر فطرت سے لطف اندوز ہونا ہے۔ آپ کے ابا نے ایک بار بتایا تھا کہ یونان کے کسی دیو دانشور نے سکندر اعظم کی پیشکش حقارت سے ٹھکرا کر اس سے دھوپ کے راستے سے ہٹ جانے کی فرمائش کی تھی۔''

''دیو نہیں دیو جانس کلبی۔'' بیگم نے تصحیح فرمائی اور اصل موضوع پر رہیں۔ ''بچوں کی گرمائی چھٹیاں بھی آرہی ہیں اور وہ کہہ رہے تھے کہ اس بار کہیں چلیں۔''

''میری رنج کا نہیں چاہے اس حساب سے پروگرام بنالو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا بلکہ خوشی ہوگی۔''

بیگم نے فوری طور پر بچوں تک یہ اطلاع پہنچائی اور انہوں نے ابھی سے منصوبہ بندی شروع کر دی حالانکہ چھٹیوں میں ابھی پورا ایک مہینا باقی تھا۔ چند دن بعد بیگم نے کہا۔ ''آپ ابھی سے چھٹیوں کے لیے اپلائی کر دیں، عین موقع پر مشکل ہوگی۔''

میں عین موقع پر کرتا یا ایک مہینا پہلے کرتا، میرے لیے مشکل ہی مشکل ہوتی کیونکہ چھٹی رئیس الدین صاحب اپروو کرتے تھے اور وہ اپروو نہیں کرتے مگر میں نے بیگم کو یہ بات نہیں بتائی۔ ''میں اپلائی کر دیتا ہوں۔''

''چھٹیاں جون کے آخری دو ہفتوں کی ہوں تو بہتر ہے۔''

میں چونکا۔ ''وہ کیوں ان دنوں موسم بہت گرم اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

خشک ہوتا ہے۔"

"ہم شمالی علاقے جائیں گے۔"

"میں بھی وہیں کی بات کر رہا ہوں۔ جون میں ہم اور کہاں جا سکتے ہیں۔ میرے خیال میں تو جولائی بہتر رہے گا جب بارش ہوتی ہے اور موسم اچھا ہو جاتا ہے۔"

بیگم ہچکچائیں پھر انہوں نے اصل بات اگل دی۔ "اصل میں بچے ٹریکنگ کا پروگرام بنا رہے ہیں۔"

میں چونکا۔ "ٹریکنگ لیکن کہاں؟"

"نانگا پربت کے آس پاس۔"

میں نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔ "بہت خطرناک ہے۔ سترہ، پندرہ اور چودہ سال کے بچوں کے لیے بالکل مناسب نہیں ہے۔"

یہ عمریں میرے تینوں بچوں کی تھیں۔ سب سے بڑے برخوردار معیز احمد سترہ کے تھے اور اس سال انہوں نے او لیول کا امتحان بہت اعلیٰ نمبروں سے پاس کیا تھا۔ ان سے چھوٹے معیز احمد نے اے لیول پاس کیا تھا نمبر تو ان کے بھی بہت اچھے تھے مگر بھائی جیسی پوزیشن حاصل نہیں کی تھی۔ سب سے چھوٹی عمیرہ ابھی اے لیول میں آئی تھیں۔ تینوں کا رزلٹ اچھا تھا اس لیے وہ انعام کے طلب گار بن گئے تھے۔ مگر یہ میں نے نہیں سوچا تھا کہ وہ انعام میں ٹریکنگ ٹور مانگ لیں گے۔ بیگم نے میرے انکار پر آگاہ کیا۔ "یہ ان کی فرمائش ہے۔ وہ پاس ہونے پر انعام مانگ رہے تھے۔"

"بیگم آپ خود سمجھتی ہیں ٹریکنگ آسان کام نہیں ہے۔"

"ان بچوں کے کلاس فیلوز جا چکے ہیں اور وہ ان کی ایج کے ہیں جب وہ جا سکتے ہیں تو یہ بھی جا سکتے ہیں اور یہ میں نہیں وہ تینوں فرما رہے ہیں۔ دیسے وہ آج رات آپ سے بات کریں گے۔"

میں نے بتایا کہ وہ دستوری بچوں کے ننھیال سے آئی تھی اور اس کا مقابلہ میرے بس سے باہر تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔ "اس کی ضرورت نہیں ہے۔ تم نے کہہ دیا کافی ہے۔ میں آج ہی چھٹی کے لیے اپلائی کر دیتا ہوں۔"

بیگم خوش ہو گئیں اور یہ بات تو تمام شادی شدہ حضرات جانتے ہیں کہ جب بیوی خوش ہو تو آدمی کی زندگی کتنی حسین ہو جاتی ہے۔ دفتر پہنچا تو پتا چلا کہ خوش قسمتی سے رئیس الدین صاحب کسی کام سے کراچی گئے ہیں اور ان کی واپسی ایک ہفتے بعد ہونی تھی۔ محکمے کے رول کے مطابق اگر

دنیا کے کسی بھی گوشے میں اردو رسائل منگوائیں
گھر بیٹھے
رسالے حاصل کیجیے
جاسوسی ڈائجسٹ سسپنس ڈائجسٹ
ماہنامہ پاکیزہ ماہنامہ سرگزشت
باقاعدگی سے ہر ماہ حاصل کریں اپنے دروازے پر
ایک رسالے کے لیے 12 ماہ کا زر سالانہ
(بشمول رجسٹرڈ ڈاک خرچ)
پاکستان کے کسی بھی شہر یا گاؤں کے لیے 700 روپے
امریکا کینیڈا آسٹریلیا اور نیوزی لینڈ کے لیے 8,000 روپے
بقیہ ممالک کے لیے 7,000 روپے
آپ ایک وقت میں کئی سال کے لیے ایک سے زائد رسائل کے خریدار بن سکتے ہیں۔ رقم اسی حساب سے ارسال کریں۔ ہم فوراً آپ کے دیے ہوئے پتے پر رجسٹرڈ ڈاک سے رسائل بھیجنا شروع کر دیں گے۔
یہ آپ کی طرف سے اپنے پیاروں کے لیے بہترین تحفہ بھی ہو سکتا ہے
بیرون ملک سے قارئین صرف ویسٹرن یونین یا منی گرام کے ذریعے رقم ارسال کریں۔ کسی اور ذریعے سے رقم بھیجنے پر ہماری بینک فیس زیادہ ہوتی ہے۔ اس سے گریز فرمائیں۔
رابطہ: ثمر عباس (فون نمبر: 0301-2454188)
جاسوسی ڈائجسٹ پبلی کیشنز
63-C فیز II ایکسٹینشن ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی مین کورنگی روڈ کراچی
فون: 35895313 فیکس: 35802551

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کوئی اعلیٰ افسر ایک ہفتے سے زیادہ کی چھٹی پر ہوتو اس کی جگہ ایڈیشنل افسر کام کرتا تھا۔ سرکاری محکموں میں اسی لیے تھوک کے حساب سے ایڈیشنل بھرتی کیے جاتے ہیں جو سروس میں چار پانچ بار کام بھی آجاتے ہیں اور باقی سروس مزے کرکے گزارتے ہیں۔ رئیس الدین صاحب کے قائم مقام ظفر صاحب نہایت مرنجان مرنج قسم کے افسر تھے انکار کرنا تو انہیں آتا ہی نہیں تھا اس لیے میں نے موقع غنیمت سمجھتے ہوئے ان سے جون اور جولائی کے مہینوں میں انیس دن کی چھٹیاں منظور کرالیں۔ پیر سے آغاز ہوکر جمعے پر ختم ہونے کی وجہ سے مجھے اضافی چار دن خود بہ خود مل گئے تھے۔ رئیس الدین ایک ہفتے بعد واپس آگئے اور ظفر صاحب اپنی سیٹ پر چلے گئے۔

اب مجھے خدشہ لاحق ہوا کہ کہیں میری چھٹیاں منسوخ نہ ہوجائیں کیونکہ رئیس الدین اس کا اختیار رکھتے تھے مگر خوش قسمتی سے وہ آتے ہی بیمار پڑ گئے۔ انہیں السر کا پرانا مرض تھا اور اس میں شدت آگئی تھی۔ وہ میڈیکل لیو پر مزید ایک ہفتہ اسپتال میں رہے۔ اس دوران میں جون کا آغاز ہوگیا۔ میں دل ہی دل میں دعا کررہا تھا کہ باقی دن بھی خیروعافیت سے گزر جائیں اور میں چھٹی پر جاسکوں ورنہ میرے بیوی بچوں نے مجھے بخشنا نہیں تھا مگر انسان جو سوچتا ہے ویسا ہوتا نہیں ہے۔ رئیس الدین صاحب نے چھٹی سے آتے ہی اپنی غیر حاضری کے دوران میں ہونے والے تمام فیصلوں کی فائلیں طلب کرلیں۔ چھٹی کی فائل میں سب سے اوپر میرا نام تھا اور ابھی چودہ جون میں کئی دن باقی تھے۔ رئیس الدین صاحب نے مجھے طلب کیا اور کڑے تیوروں کے ساتھ پوچھا۔ ”آپ کو چھٹی کی کیا ضرورت ہے؟“

”سر ایک تو میں بھی انسان ہوں دوسرے میں نے دو سال سے اپنی سالانہ چھٹیاں نہیں لی ہیں اور تیسرے میرے بچے شمالی علاقہ میں ٹریکنگ کا پروگرام بنا چکے ہیں۔“

”ٹریکنگ۔“ وہ حقارت سے بولے۔ ”تم جانتے بھی ہو یہ کس قدر مشکل اور مہنگا ہوتا ہے۔“

”نہیں سر پہلی بار اتفاق ہورہا ہے اس لیے اب پتا چل جائے گا۔“

”ان دنوں کام بہت زیادہ ہے۔“ انہوں نے گویا چھٹی منسوخ کرنے کی تمہید باندھی۔

”سر میں اپنے حصے کا تمام کام نمٹا کر جاؤں گا۔“

”اور جو کام چھٹیوں کے دوران میں ہوگا۔“

”وہ لوگ کریں گے جن کی چھٹیوں میں، میں کام کرتا ہوں۔“ میں نے جواب دیا۔

”تین افسران نے اور چھٹیوں کی درخواست دی ہوئی ہے۔“

”سر میں دے چکا ہوں اور ظفر صاحب منظور کرچکے ہیں۔ اگر ان کو چھٹی درکار ہوتیں تو وہ پہلے درخواست دیتے۔“

ان کا بس نہیں چل رہا تھا کہ کسی طرح ابھی میری چھٹیاں منسوخ کردیں۔ مگر مسئلہ یہ تھا اگر وہ منسوخ کرتے تو میں محکمے کے سیکریٹری کے پاس چلا جاتا اور سیکریٹری سے ان کے تعلقات اچھے نہیں تھے۔ اگرچہ ایسا کرنے سے خود میرے تعلقات رئیس الدین سے خراب ہوجاتے۔ مگر میں نے سوچ لیا تھا کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو میں سیکریٹری کے پاس چلا جاؤں گا اور انہوں نے بھی میرے تاثرات سے بھانپ لیا۔ اس لیے بادل ناخواستہ سر ہلایا۔ ”ٹھیک ہے اگر کوئی ایمرجنسی نہ ہوئی تو تمہاری چھٹیاں برقرار رہیں گی۔ ویسے تم اور تمہاری فیملی کہاں جارہی ہے؟“

”سر ناگا پربت کے آس پاس کہیں ٹریک ہے۔ مجھے ٹھیک سے نہیں معلوم اصل پروگرام میرے بچوں کا ہے۔“

”ویری انٹرسٹنگ۔“ وہ خلاف توقع خوش ہوگئے۔ ”مجھے بچوں کی ایسی ایکٹی ویٹیز اچھی لگتی ہیں۔ ایک ہمارے بچے ہیں ان کو ویڈیو گیمز اور تفریح کے سوا کوئی کام نہیں ہے۔“

سروس کی طرح رئیس الدین صاحب نے شادی کی زین بھی ذرا تاخیر سے پکڑی تھی اس لیے ان کے بچے بھی تقریباً اتنی ہی عمر کے تھے جتنے کہ میرے بچے تھے۔ تعداد کی تین کی فرق اتنا تھا کہ ان کے ایک بیٹا پھر ایک بیٹی اور پھر بیٹا تھا۔ بیگم کی عمر بھی تقریباً میری بیگم جتنی تھی۔ رئیس الدین صاحب کی خوشی سے قطع نظر ان کی آخری بات نے میرے اندر خطرے کی گھنٹی بجادی تھی کہ کوئی ایمرجنسی نہ ہوئی تو۔ اس کا مطلب تھا کسی ایمرجنسی کی صورت میں میری چھٹی منسوخ بھی ہوسکتی تھی۔ ایمرجنسی پیدا کرنا ان کے لیے کوئی مشکل نہیں تھا۔ اگر ان کے منظور نظر افسران میں سے اچانک کوئی ”بیمار“ پڑ جاتا تو وہ نہایت آسانی سے میری چھٹی منسوخ کرسکتے تھے اس لیے میں نے پہلے پھونک مارنے کا فیصلہ کیا۔ آپ نے گھوڑے والا واقعہ سنا ہوگا جسے مالک نے نلکی میں دوا ڈال کر پلانے کی کوشش کی اور گھوڑے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نے پہلے پھونک ماردی۔

میں شام کو سرکاری جیپ کے ڈاکٹر کے پاس گیا اس سے میری بہت اچھی سلام دعا تھی اور اس نے یہ خوشی زندگی میں پہلی بار مجھے میڈیکل سرٹیفکیٹ دیا جس کے مطابق مجھے شدید قسم کا فلو تھا اور مجھے چار دن بیڈ ریسٹ کی ضرورت تھی۔ اگلے دن میں نے یہ سرٹیفکیٹ ایک ساتھی کے ہاتھ بھجوا دیا جو میرے آفس میں ہی کام کرتا تھا۔ بیوی بچوں کو منع کر دیا تھا کہ اگر میرے دفتر کا نمبر ہو تو فون ریسیو نہ کریں۔ کوئی دفتر کی طرف سے گھر آئے تو کہہ دیں کہ طبیعت زیادہ خراب ہوگئی تھی اس لیے ڈاکٹر کے پاس گیا ہوں۔ ان احتیاطی تدابیر کے ساتھ میں نے یہ چار دن سکون سے گزار لیے اور میری چھٹیوں کا آغاز ہو گیا۔ جمعے والے دن بیگم کسی سے بات کر رہی تھیں اور اسے بڑے جوش و خروش سے اپنے ٹور پروگرام کے بارے میں بتا رہی تھیں اس وقت میں نے توجہ نہیں دی اور سمجھا کہ ان کی کوئی جاننے والی بار سنتے رہی ہوں گی۔

روانگی سے پہلے میں نے جیپ کی سروس کرائی تھی تاکہ یہ راستے میں کوئی مسئلہ نہ کرے۔ بچوں کا پروگرام تھا کہ ہمیں پہلے ناران تک جانا تھا اور جھیل سیف الملوک دیکھنے کے بعد نانگا پربت کے دامن میں واقع فیری میڈو تک جانا تھا۔ یہ پروگرام انہوں نے مجھے کئی بار ساتھ بٹھا کر سبق کی طرح یاد کرایا تھا۔ انہوں نے نقشے بھی حاصل کر لیے تھے۔ یہ طے کیا تھا کہ سامان کہاں سے لینا ہے اور کہاں کہاں کتنے دن رکنا ہے۔ جب انہوں نے اپنا پروگرام بتا دیا تو میں نے ان کے سامنے اپنا پروگرام رکھا کہ ہمیں یہ سب کرنا ہے۔ پہلے وہ مان نہیں رہے تھے اور سمجھ رہے تھے کہ مجھے بھلا کیا معلوم مگر جب میں نے ان کے پروگرام میں خامیاں نکالنا شروع کیں اور آنے والے مسائل اور ان کے حل کے بارے میں پوچھا تو بادل ناخواستہ میرے بتائے پروگرام پر راضی ہو گئے تھے۔

فیری میڈو جانے کے لیے پہلے وہاں سڑک نہیں تھی اور بہت دشوار پیدل کا راستہ تھا مگر اب سڑک بن گئی تھی اور ہم آسانی سے جیپ سمیت وہاں جا سکتے تھے۔ جیپ پرانی لیکن اچھی حالت میں تھی اس لیے امید تھی کہ راستے میں مسئلہ نہیں کرے گی۔ ہماری روانگی بائیس جون کو تھی۔ تیاریاں مکمل تھیں اور جو سامان رہ گیا تھا وہ ہم بالاکوٹ سے لیتے۔ بالاکوٹ ایک پر فضا ہل اسٹیشن اور پر رونق شہر ہے۔ اس کی تاریخی حیثیت ہے کیونکہ مجاہدین نے یہاں سکھوں سے جنگ لڑی جس میں سید احمد شہید اپنے رفقا کے ساتھ شہید ہوئے تھے۔ اسلام آباد سے بالاکوٹ تک کا فاصلہ کل سو کلومیٹرز ہے مگر بل کھاتے پہاڑی راستوں پر یہ چار گنا ہو جاتا ہے اور اس سفر میں گاڑی کی اوسط رفتار پچیس کلومیٹرز سے زیادہ نہیں ہوتی ہے اس لیے بالاکوٹ تک ہی سارے دن کا سفر تھا۔ راستہ نہ صرف خراب اور دشوار بلکہ ایک جگہ سے سڑک ہی غائب تھی۔ آرمی بلڈوزر نے ایک کچا راستہ بنا رکھا تھا جس پر سے ٹریفک گزر رہا تھا۔

بچے جو سفر کے آغاز میں بہت پرجوش تھے۔ اس طویل سفر نے ان کا جوش و خروش مدھم کر دیا اور شام تک وہ خاصے بیزار ہو گئے تھے۔ مجھے اندازہ تھا کہ سفر طویل اور دشوار ہوگا۔ میں ذہنی طور پر اس کے لیے تیار ہو کر آیا تھا اور میں نے ذہن بنا لیا تھا کہ ہمیں آج کے دن ہی بالاکوٹ پہنچنا ہے اس لیے میں نے راستے میں سفر دو رکنے اور ٹانگیں سیدھی کرنے کی اپیلیں نظر انداز کر دیں۔ اگر ہم وقت ضائع کرتے اور رکتے ہوئے سفر کرتے تو آج کے دن بالاکوٹ نہیں پہنچ پاتے اور جو رات ہم نے آرام دہ بستروں پر بسر کی وہ ہمیں جیپ کی تنگ سیٹوں پر یا پھر کسی گئے گزرے ہوٹل میں گزارنی پڑتی اس لیے جب ہم ہوٹل میں اترے تو رات کے دس بج رہے تھے اور ہوٹل والوں سمیت کسی کا موڈ ٹھیک نہیں تھا۔ بہرحال ہمیں دو کمرے اور بچا کچا کھانا مل گیا تھا۔ البتہ صبح جب سب تازہ دم اٹھے تو ان کے موڈ خود بہ خود خوشگوار ہو گئے تھے۔ بیگم نے اعتراف کیا۔

”آپ نے کل ہی یہاں پہنچ کر ٹھیک کیا سفر طویل تھا مگر ہمیں رات سکون سے گزارنے کا موقع مل گیا۔“

میں بھی خوش تھا اور خوشی کی وجہ اس سیزن میں ایک معقول قسم کے ہوٹل میں پورے دو کمرے معقول کرائے پر مل گئے تھے جب کہ ان دنوں بہ قول شخصے یہاں درخت کی شاخیں بھی بکنگ پر ہوتی ہیں۔ ہمارے ہوٹل کے سامنے ہی ایک بڑا عالی شان اور فائیو اسٹار قسم کا ہوٹل تھا۔ بیگم کا ارادہ اسی کی طرف تھا مگر مجھے معلوم تھا وہاں دو دن کے کرائے میں ہمارا سارا زاد راہ صاف ہو جائے گا اور ہمیں یہیں سے واپس جانا پڑے گا۔ ویسے بھی ہمیں یہاں دو دن ہی رکنا تھا اور فیری میڈو تک سفر کے انتظامات کرنے تھے۔ ہمارے پاس دو عدد الگونما سنگل خیمے تھے۔ یہ مراد اور معیز کے تھے۔ مجھے اپنے، بیگم اور جبیرہ کے لیے ایک بڑا خیمہ لینا تھا جس میں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے مل سکتا تھا۔ ڈبا بند کھانے ہم ساتھ لائے تھے البتہ تازہ سامان یہیں سے لینا تھا۔ اس کے علاوہ بھی چھوٹا موٹا سامان تھا۔ مگر یہ سب مجھے ہی لینا تھا کیونکہ باقی سب نے صاف انکار کر دیا تھا کسی قسم کی خریداری سے۔

اس لیے بیگم اور بچے گھومنے کے لیے نکل گئے۔ میں سامان کی تلاش میں نکلا اور سب سے پہلے کوہ پیمائی سے متعلق دکانوں کی چھان بین کی جہاں سے خیمے دستیاب ہو سکتے تھے۔ وہاں انکشاف ہوا کہ ہر قسم کے خیمے نایاب تھے اور جو چند ایک دستیاب تھے وہ بہت غیر مناسب اور بہت ہی غیر مناسب قیمت یا کرائے پر دستیاب تھے۔ اسلام آباد سے اکلوتے خیمے با آسانی مل رہے تھے کیونکہ اس قسم کے سامان کا سرکاری انتظام جس محکمے کے پاس ہے وہاں میری اچھی سلام دعا تھی اور بیٹوں کے لیے خیمے وہیں سے لیے تھے۔ میں چاہتا تو دو کے بجائے پانچ خیمے لے سکتا تھا۔ مگر بیگم نے ان خیموں میں خود رہنے یا عیرو کو رہنے کی اجازت دینے سے صاف انکار کر دیا۔ انہوں نے کہا۔ ''ہم تینوں ایک ساتھ رہیں گے۔ نہ میں اکیلی رہ سکتی ہوں اور نہ اپنی بچی کو اکیلا سونے دوں گی۔''

مگر بیک وقت تین افراد کے لیے کوئی خیمہ نہیں تھا یا تو ننھے منا خیمے تھے یا پھر اسی طرح سنگل خیمے۔ بڑی مشکل سے دوپہر کے وقت ایک کونے کھدرے میں دبی دکان سے ایک خیمہ ملا تو وہ مکمل نہیں تھا۔ اس کی ایک شیٹ جو اسے واٹر پروف بناتی تھی وہ غائب تھی اور اس کے بغیر یہ بیکار تھا کیونکہ جہاں ہم جا رہے تھے ایک اطلاع کے مطابق وہاں روز رات کو بارش یا کم سے کم بوندا باندی ضرور ہوتی تھی۔ خیمہ تو مناسب قیمت پر مل گیا مگر اس کی واٹر پروف شیٹ بنوانے پر ناصا خرچ آ گیا۔ بہرحال ایک مرحلہ سر ہوا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔ واپس آخری خیمہ بیگم اور بچوں کے سپرد کیا کہ وہ ہوٹل والوں کی مدد سے اسے دھلوا لیں۔ اتنی دیر میں، میں باقی سامان لے آؤں۔ میں دوبارہ باہر آیا تو سامنے والے لگژری ہوٹل سے رئیس الدین برآمد ہوتے دکھائی دیے۔ میں حیران ہوا۔ انہوں نے دیکھ لیا تھا اس لیے نظر بچا کر جا بھی نہیں سکتا تھا۔ مجبوراً ان کے پاس جانا پڑا۔ سلام دعا کے بعد میں نے پوچھا۔

''سر آپ کا ارادہ بھی تھا یہاں آنے کا؟''

''کیوں کیا صرف تم اور تمہارا خاندان آ سکتا ہے؟'' وہ کڑے لہجے میں بولے اور مجھے بہت خوشی ہوئی کہ ہم بس کل تک یہاں تھے اور اس کے بعد شمالی علاقے میں ان کی صورت دیکھنے کو نہیں ملتی کیونکہ ہم یہاں سے روانہ ہو جاتے۔

''کیوں نہیں سر آپ بھی پاکستان کے شہری ہیں بغیر پاسپورٹ اور ویزے کے کہیں بھی جا سکتے ہیں۔'' میں نے کہا تو ان کے چہرے کے زاویے مزید بگڑ گئے وہ سمجھے کہ میں شاید ان کی امریکی ویزے کی درخواست مسترد ہونے پر طنز کر رہا ہوں۔ ویسے مجھے اس کا خیال بھی آیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ مزید بدزبانی کا مظاہرہ کرتے میں نے جلدی سے کہا۔ ''سر مجھے اجازت ابھی مجھے کچھ کام ہے۔''

مگر وہ میری بات مکمل ہونے سے پہلے اندر جا چکے تھے۔ ہوٹل کی پارکنگ میں ان کی جہازی سائز گاڑی کھڑی تھی۔ میں شام کو سامان سے لدا پھندا اور ہانپتا ہوا واپس ہوٹل پہنچا تو بچے خیمہ دھو کر اسے سکھانے کے لیے چھت پر ڈال چکے تھے۔ میں نے سکون کا سانس لیا کہ اب کرنے کو کچھ رہا نہیں تھا اس لیے میں نے کچھ دیر آرام کیا اور پھر بیگم کو اشارہ کیا۔ وہ سمجھ گئیں اور کچھ دیر بعد ہم خاموشی سے ہوٹل سے نکل آئے تھے۔ بچے اپنے مشغلوں میں لگے تھے اس لیے انہیں خبر نہیں ہوئی۔ بیگم ان کے لیے نوٹ چھوڑ آئی تھیں کہ وہ پریشان نہ ہوں ہم ذرا گھومنے پھرنے گئے تھے۔ ڈوبتے سورج کی روشنی میں ہم نے بالاکوٹ شہر کی سیر کی۔ اس وقت میں نے سوچا نہیں تھا کہ ایک زلزلہ اس خوب صورت شہر کو مٹی کا ڈھیر بنا دے گا۔ ایک معروف طعام گاہ میں ہم نے ڈنر کیا اور پھر ہم ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے شہر کی اونچی نیچی سڑکوں اور بعض جگہوں پر پہاڑوں پگ ڈنڈیوں سے ہوتے ہوئے پیدل واپس ہوٹل آئے تو بچے ڈنر کر کے سو چکے تھے۔ ہم بھی سونے جا رہے تھے کہ مجھے خیال آیا۔

''بیگم ایک بات تو بتانا بھول ہی گیا۔''

وہ بال برش کرتے ہوئے چونکیں۔ ''کون سی بات؟''

''رئیس الدین صاحب بھی یہاں موجود ہیں۔''

بیگم پلٹ کر آئیں۔ ''فیملی کے ساتھ؟''

''یہ تو نہیں معلوم کیونکہ ان ہی کو دیکھا ہے وہ سامنے والے ہوٹل میں ٹھہرے ہیں۔''

بیگم نے گہری سانس لی۔ ''اب بھی کہ ان کی بیگم مجھ سے اتنا کرید کرید کر کیوں پوچھ رہی تھیں کہ ہمارا کیا پروگرام ہے اور کہاں کہاں جائیں گے؟ کیا آپ نے آفس میں ذکر کیا تھا؟''

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

”براہ راست رئیس الدین صاحب کو ہی بتایا تھا کہ ٹریکنگ کا پروگرام ہے۔“

”بس تو باقی انہوں نے بیگم سے معلوم کروالیا۔“ بیگم بولیں۔ ”لکھ کر رکھ لیں یہ ہمارے پیچھے آئے ہیں اور شاید جھیل سیف الملوک اور فیری میڈو بھی جائیں گے۔“

میں فکر مند ہو گیا۔ ”اس کا مطلب ہے کہ ان سے بار بار سامنا ہوگا اور کم سے کم میری تفریح تو غارت ہو جائے گی۔“

”ضروری تھوڑی ہے کہ وہ بالکل ہمارے ساتھ رہیں۔“ بیگم نے تسلی دی۔ ”وہاں ہوٹل تو ہیں نہیں اس لیے جس کی جہاں مرضی ہوگی وہاں رکے گا۔ ہم کہیں دور ٹھہر جائیں گے۔“

پروگرام کے مطابق ہم ایک دن ناران میں رک کر اگلے دن سیف الملوک کی طرف جاتے۔ ایک دن جانے میں ایک دن رکنے میں اور ایک دن آنے میں لگتا۔ اس کے بعد ہم نانگا پربت کی طرف روانہ ہوتے۔ ضروری نہیں تھا کہ وہ اس سفر میں ہمارے ساتھ ہی ہوتے، مگر میری فکر دور نہیں ہوئی۔ مجھے رئیس الدین صاحب پر شدت سے غصہ آ رہا تھا۔ آخر انہیں کیا ضرورت تھی میرے پیچھے دوڑے آنے کی۔ شمالی علاقے میں تفریح گاہیں کم ہیں کیا؟ مگر پھر یہ سوچ کر غصہ کم ہونے لگا کہ جب وہ وہاں پہنچیں گے تو انہیں پتا چلے گا کہ وہاں ان کی افسری نہیں چلے گی اور بہت کچھ انہیں خود بھی کرنا ہوگا۔ خاص طور سے ٹریکنگ آسان کام نہیں تھا۔ میں نے روانگی سے پہلے اس سلسلے میں کچھ معلومات حاصل کی تھیں۔ جھیل سیف الملوک کا راستہ دشوار تھا مگر خطرناک نہیں تھا البتہ نانگا پربت کے آس پاس کے علاقے اور گلیشیر بھی اس کی چوٹی سے کم خطرناک نہیں ہیں۔ آدمی ہزاروں فٹ کی بلندی سے گرے یا سو فٹ کی بلندی سے نتیجہ ایک ہی نکلتا ہے اس لیے میں نے سب کو خبردار کر دیا تھا کہ کوئی ایڈونچر نہیں ہوگا اور جہاں کوئی خطرناک مقام آیا وہیں سے واپسی ہوگی۔ لڑکوں نے اتفاق کیا تھا۔

کیونکہ اب کہیں رکنے یا سامان لینے کے لیے کوئی جگہ نہیں ملتی اس لیے سب کچھ یہاں سے لے لیا تھا جس کی وجہ سے سامان زیادہ ہو گیا تھا اور اسے جیپ کے اوپر بھی رکھنا پڑا تھا۔ عقبی حصہ پہلے ہی بھر گیا تھا۔ بیٹھنے کی جگہوں پر کچھ رکھنے کی گنجائش نہیں تھی یہاں ہم ہی آسانی سے آ جاتے تو غنیمت تھا۔ میں خوش تھا کہ سارے کام ہو گئے تھے مشکل تو ہوئی تھی مگر پھر دور بھی ہو گئی۔ جس وقت میں رمیز اور معیز کے ساتھ جیپ پر سامان باندھ رہا تھا سامنے ہوٹل کی پارکنگ میں دو پورٹر رئیس الدین صاحب کی جیپ پر ”نوے نکور“ بیگز اور رسوں کو لاد رہے تھے۔ یہ سارے انتظامات بتا رہے تھے کہ بیگم کا خدشہ درست تھا اور رئیس الدین صاحب بھی شاید ہمارے تعاقب میں جھیل سیف الملوک اور فیری میڈو جا رہے تھے۔ البتہ وہ خود یا ان کے اہل خانہ آس پاس نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ پورٹر بھی ساتھ لے جا رہے تھے ظاہر ہے انہیں یا ان کے بچوں کو خود سے کام کرنے کی عادت نہیں تھی اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی۔

میں نے فیصلہ کیا کہ ہم فوری نکل رہے ہیں۔ اندر بیگم اور عبیرہ تیار ہو رہی تھیں اور ایسے تیار ہو رہی تھیں جیسے کسی تقریب میں جا رہی ہوں۔ میں اور لڑکے انہیں تقریباً زبردستی باہر لائے۔ دیٹروں کی برات بھی ٹپ لینے کے لیے ساتھ تھی اور وہ جیپ کے آگے لیٹے جا رہے تھے۔ بہ مشکل ان سے پیچھا چھڑا کر ہم وہاں سے نکلنے لگے تو میں نے ہوٹل سے رئیس الدین صاحب اور ان کے بیوی بچوں کو بھی نکلتے دیکھا۔ اس دوران میں رمیز نے اپنا ہینڈی کیم نکالا اور مووی بنانے لگا اور باقی اس کی طرف متوجہ تھے۔ اس نے روانگی سے بھی پہلے سب کے تعارفی کلپس لیے تھے۔ اس کے بعد اس سفر میں رمیز کا ہینڈی کیم مسلسل مصروف رہا۔ میں جتنی عجلت کر رہا تھا اتنی ہی تاخیر ہو رہی تھی۔ ہم بہ مشکل ہی نکلے تھے اور اس تاخیر پر مجھے طیش آ رہا تھا جو رئیس الدین اینڈ پارٹی کو دیکھ کر بڑھ گیا۔ میں نے جیپ کی رفتار بڑھاتے ہوئے سوچا کہ اگر وہ لوگ بھی اسی طرف جا رہے ہیں تو میں کم سے کم انہیں آگے نکلنے نہیں دوں گا۔

”رفتار ذرا کم کریں۔“ برابر میں بیٹھی بیگم نے ذرا تیکھے لہجے میں کہا تب مجھے احساس ہوا کہ اس تنگی سی پہاڑی سڑک پر میں چالیس کی رفتار سے جیپ چلا رہا تھا۔ ہم بالاکوٹ شہر سے نکل آئے تھے اور اب نانگا پربت کی طرف جا رہے تھے۔ میں نے بادل ناخواستہ رفتار ذرا کم کر لی مگر وقفے وقفے سے وہ بڑھ جاتی تھی اور بیگم کو پھر مجھے بریک لگانی پڑتی تھی۔ اب ہم شاہراہ قراقرم والے راستے پر آ رہے تھے۔ ان پہاڑوں کے درمیان یہ بل کھاتی سڑک بل کھاتی اور لہراتی چین تک چلی جاتی ہے۔ مگر ہم مانسہرہ سے الگ ہو کر بالاکوٹ جانے والی بائی وے پر آ گئے اور اب بالاکوٹ سے اسی بائی وے پر آگے جا رہے تھے۔ یہ سڑک بہت حسین مناظر کے درمیان سے گزرتی ہے۔ بے اختیار

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دل چاہا کہ رکا جائے درمیان میں جا بجا جھٹے والے جھرنوں اور آبشاروں کے ساتھ رکا جائے اور ہم ایک دو جگہ رکے بھی کیونکہ آج سفر زیادہ نہیں تھا۔ ناران تک چند گھنٹے کا سفر ہے۔ لنچ ہم نے ایک آبشار کے ساتھ بیٹھ کر کیا۔ بس ان ایک دو جگہوں کے رکنے کی وجہ سے کب رئیس الدین کی پجارو ہم سے آگے نکل گئی ہمیں پتا ہی نہیں چلا۔ جب ہم ناران میں داخل ہوئے اور ایک ہوٹل تک پہنچے تو وہاں ان کی پجارو پہلے سے موجود تھی۔ اگر میں پہلے دیکھ لیتا تو جیپ آگے بڑھا دیتا مگر وہ اترنے کے بعد دکھائی دی اور بچے اس دوران میں اندر جا چکے تھے۔ کاؤنٹر پر پتا چلا کہ صرف ایک کمرا دستیاب ہے جس میں پہلے ہی تین بیڈز ہیں لیکن اگر پانچ سو اضافی دیا جائے تو مزید دو بیڈز لگائے جا سکتے تھے۔ بیگم نے کہا۔

"لے لیں آگے پتا نہیں نہ ملے۔"

پتا چلا کہ کمرا رئیس الدین کے حاصل کیے ہوئے دو کمروں کے ساتھ ہی تھا اور جب ہم کمرے میں جا رہے تھے تو وہ باہر نکل آئے۔ مجھے دیکھ کر حسب معمول طنزیہ لہجے میں بولے۔ "کیا ہوا آج دیر سے پہنچے۔"

"سر میں کون سا ریس کر رہا ہوں جو پہلے یا بعد میں پہنچنے کی فکر کرتا۔" میں نے جواب دیا۔ "ویسے راستے میں رکتے اور نظاروں سے لطف اندوز ہوتے آرہے تھے۔ سر آپ بھی رک کر دیکھتے کیا حسن ہے یہاں فطرت کا۔"

"میں تو کہہ رہی تھی۔" بیگم رئیس الدین بھی باہر آگئیں اور خاصی برہمی سے آئیں۔ "مگر یہ کسی کی سنتے ہی نہیں بس یہاں پہنچنے کی پڑی تھی۔"

رئیس الدین کھسیا گئے۔ "میں نے سوچا کہ یہاں پہنچ کر گھوم لیں گے۔"

"تو اب نکلیں آپ تو آ کر بیٹھ گئے ہیں۔" بیگم صاحبہ نے مزید کہا تو رئیس الدین نے عافیت اسی میں سمجھی کہ انہیں اندر لے جائیں مگر ان کی آواز باہر تک آرہی تھی میں مسکراتے ہوئے کمرے میں آگیا۔ بیوی اور بچے خوش تھے مگر بچوں نے وارننگ دی کہ اب اگر ہم نے انہیں اکیلا چھوڑ کر جانے کی کوشش کی تو اچھا نہیں ہوگا۔

"یار کبھی ہمیں اکیلے گھومنے دیا کرو۔ ویسے بھی اب تم سب بڑے ہو گئے ہو اپنا دیکھ بھال خود کر سکتے ہو۔" میں نے جوتے اتارتے ہوئے کہا۔ آج تھکن زیادہ تھی اس لیے باہر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا۔ ویسے بھی کچھ دیر میں اندھیرا چھا جاتا اور پھر کل صبح منہ اندھیرے نکلنا تھا اس لیے آج جلدی ڈنر کر کے جلدی سو جانا لازمی تھا۔ ہم نے جلدی ڈنر کیا۔ صبح کے ناشتے اور راستے کے لنچ کے لیے پیشگی بکنگ کرائی ورنہ صبح جلدی نہیں ملتا۔ جس وقت ہم ناشتا کر رہے تھے رئیس الدین اینڈ فیملی خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی اس لیے مجھے امید تھی کہ وہ آج ہمیں کراس نہیں کر سکے گی بہ شرطیکہ ان کا رخ بھی جھیل سیف الملوک کی طرف ہوا تو کیونکہ ہمیں واپس نہیں آنا تھا اس لیے ہوٹل کا حساب بے باق کیا اور روانہ ہو گئے۔ ناران سے جھیل کا فاصلہ بیس کلومیٹر بھی نہیں ہے لیکن یہ بہت دشوار راستہ ہے اور کئی پر شور ندیوں سے گزرتا ہے۔ صبح ان ندیوں میں پانی کم ہوتا ہے لیکن جیسے جیسے دن چڑھتا ہے تو گرمی سے پہاڑوں کی برف پگھلتی ہے اور زیادہ پانی آ جاتا ہے اس لیے ہم صبح سویرے نکل گئے تھے کیونکہ مجھے ان راستوں پر جیپ چلانے کا کوئی تجربہ نہیں تھا اور نہ ہی میری جیپ کو یہاں کا تجربہ تھا اس لیے اسے ایک جگہ چھوڑا جہاں سڑک کا اینڈ تھا۔ وہاں ایک ریسٹوران کے مالک کو سو روپے کے عوض جیپ کا نگران بنایا اور ہم سامان سمیت روانہ ہوئے۔ مقامی لوگ اپنی گاڑیوں سمیت تھے جو سیف الملوک تک جاتی تھیں مگر ہم نے ندیاں کراس کرنے کے لیے دو گھوڑے لیے۔ ان پر خواتین اور سامان لادا گیا اور باقی ہم پیدل چلتے رہے۔ صبح جلدی نکلنے کی وجہ سے ہمیں زیادہ دشواری نہیں ہوئی اور ہم جلد ہی جھیل کے کنارے پہنچ گئے تھے۔

ایک مناسب جگہ اپنا کیمپ لگایا اور خیمے نصب کیے۔ ان میں سامان رکھ کر لنچ کیا اور جھیل کے کنارے تفریح کے لیے پہنچ گئے۔ اس وقت ٹریکنگ کا رواج اتنا زیادہ نہیں تھا اس کے باوجود خاصے لوگ آئے ہوئے تھے۔ پھر بھی یہاں پہاڑوں کے درمیان اتنی وسعت تھی کہ ہجوم محسوس نہیں ہو رہا تھا البتہ جب چار بجے رئیس الدین معہ فیملی کے نصف درجن گھوڑوں پر سوار وہاں پہنچے تو مجھے گھٹن کا احساس ہوا تھا جسے دور کرنے کے لیے میں نے رمیز اور معیز کے ساتھ جھیل کے دوسرے کنارے جانے کا پروگرام بنایا۔ ہم سورج ڈوبنے سے پہلے جھیل کا چکر لگا کر آگئے تھے۔ جب ہم واپس آئے تو رئیس الدین صاحب کی بیگم اور بچے، میری بیگم اور عیرہ سے گپ شپ کر رہے تھے۔ البتہ خود رئیس الدین صاحب غائب تھے۔ پتا چلا کہ وہ ٹراؤٹ مچھلی کا شکار کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ میں نے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کہا۔ "مچھلی کا شکار تو دن میں ہوتا ہے جب مچھلی پیٹ کی چمک دیکھ کر آتی ہے۔"

رمیز حیران ہوا۔ "پاپا آپ کو پتا ہے؟"

"ہاں میں پہلے بھی یہاں آچکا ہوں اور ٹراؤٹ کا شکار بھی کیا ہے۔ تم لوگ غالباً بھول رہے ہو ہمارے سامان میں مچھلی پکڑنے والی چھڑیاں اور ڈوری کانٹے بھی ہیں۔"

بچے خوش ہو گئے تھے۔ رئیس الدین صاحب نے ایک شاندار بڑا سا خیمہ رہائش کے لیے لیا تھا اور ایک خیمہ ان کے کچن کے لیے تھا۔ وہ دو پورٹر ساتھ لائے تھے جوان کے سارے کام کر رہے تھے۔ ان کی آمد سے پہلے میں تھکن کا بہانہ کر کے اپنے خیمے میں چلا گیا۔ ذرکی نانی بیگم کے نرے تھی انہوں نے اسٹوو جلایا اور کھانا تیار کرنے لگیں۔ ہمارے پاس خاصے ڈبا بند کھانے بھی تھے لیکن وہ بعد میں ٹریک کے لیے تھے۔ ابھی بیگم نے تازہ آلو قیمہ بنایا جو ہم نے وہیں سے نان خرید کر کھایا اور بہت مزے سے کھایا۔ رات سارا سامان سمیٹ کر خیموں میں رکھا کیونکہ یہاں جانور نہیں تھے مگر انسان تھے جو بعض اوقات چور بھی ہوتے ہیں۔ ہم متحمل نہیں ہو سکتے تھے کہ کوئی چیز چوری ہو جائے۔ ہر چیز ضرورت کی تھی جس کے بغیر یہ سفر مشکل ہو جاتا۔ اس لیے ہم ایک ایک چیز خیمے میں رکھ کر سوئے تھے۔

صبح شور سے آنکھ کھلی۔ شور میں رئیس الدین صاحب کی آواز نمایاں تھی اور وہ کسی نامعلوم چور پر گرج برس رہے تھے جو ان کی اعلیٰ درجے کی پیک خوراک کا ایک پورا ڈرم چرا کر لے گیا تھا۔ میں نے یہ ڈرم دیکھا تھا اور یہاں اس کی تک سمجھ میں نہیں آئی تھی کیونکہ ان کی جیپ تو پیچھے کھڑی تھی جہاں ہم اپنی جیپ بھی چھوڑ کر آئے تھے۔ یہاں ایک دو دن کا قیام تھا اور اس کے لیے خوراک کا پورا ڈرم لانے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں نے خود جانا مناسب نہیں سمجھا، بیگم گئیں اور احوال لے کر آئیں۔ ان کے مطابق مسز رئیس الدین اور پورٹرز نے منع کیا تھا کہ یہ ڈرم ساتھ لانے کی ضرورت نہیں ہے مگر رئیس الدین صاحب کو خطرہ تھا کہ ان کے پیچھے کوئی اسے چرا کر نہ لے جائے۔ وہاں تو نہیں لیکن یہاں چور اپنا کام دکھا گئے تھے۔

جب وہ بک جھک کر اپنے خیمے میں واپس چلے گئے تو میں باہر نکلا۔ ناشتے کے بعد ہم سب جھیل کے کنارے آئے یہاں کنارے پر پانی کسی قدر گہرا تھا اور اس میں تیرتی ٹراؤٹ مچھلیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ سیزن کی وجہ سے لوگوں نے بے دریغ شکار کیا تھا اس لیے اب بڑی ٹراؤٹ کم نظر آ رہی تھیں مگر دوپہر تک ہم نے دو ٹراؤٹ شکار کر لیں۔ یہ دو اور ڈھائی کلوگرام وزنی تھیں۔ عبیرہ نے چند چھوٹی ٹراؤٹ پکڑیں مگر وہ بیکار تھیں میں نے دوبارہ پانی میں ڈلوا دیں۔ بیگم نے لنچ میں ٹراؤٹ تلی اور ایک پلیٹ رئیس الدین اینڈ فیملی کو بھی بھجوائی کیونکہ خوراک چوری ہونے کے بعد وہ مقامی ریسٹورانز پر گزارا کر رہے تھے اور شاید وہ آج شام ہی واپس چلے جاتے کیونکہ انہیں مزید خوراک لینی تھی۔ یہ اطلاع بیگم نے دی اور بولیں۔

"بہت چالاک ہے مسز رئیس مجال ہے جو چھوٹ کر دیا ہو کہ وہ بھی فیری میڈو جا رہے ہیں۔"

"کوئی بات نہیں انہیں بھی آنے دو۔" میں نے کہا۔ کھانے کے بعد بچے آرام کے موڈ میں تھے لیکن میں انہیں لے کر جھیل کے ایک راؤنڈ پر روانہ ہو گیا۔ "ٹراؤٹ بہت گرم اور طاقتور مچھلی ہوتی ہے اسے کھا کر آرام کرو گے تو پیٹ گڑبڑ ہو جائے گا۔ اس لیے چلو پھرو۔"

میں نے بیگم سے بھی کہا تھا مگر وہ نہیں مانیں اور جب ہم واپس آئے تو ان کے پیٹ میں تکلیف ہو رہی تھی پھر دوا دی اور واک سے یہ تکلیف کم ہو گئی۔ ان کی خاطر مجھے جھیل کے کنارے مزید ٹہلنا پڑا تھا اس کا اچھا اثر ہوا اور ہم نے رات میں بھی بچی ہوئی ٹراؤٹ کھائی تھی۔ یہ بونس تھا جو اس سفر میں ہمیں ملا۔ اگلے دن صبح سویرے واپسی تھی اس لیے ہم جلدی سوئے اور جلدی اٹھ گئے۔ ابھی سورج نہیں نکلا تھا ہم نے آخری بار اس فسوں خیز جھیل کے کنارے واک کی اور پھر ناشتا کر کے سامان پیک کیا۔ مگر عین موقع پر پتا چلا کہ گھوڑے نایاب تھے۔ ان کے بغیر شوگرلی تک جانا اس کر: ایک مسئلہ تھا پتا چلا کہ سارے گھوڑے رئیس الدین صاحب نے بک کرا لیے تھے اور یہ گھوڑے زیادہ ہی تھے کیونکہ ہر گھوڑے پر دو فرد بیٹھ سکتے تھے۔ جب دالے دن میں واپس چلے جانے تھے اس لیے صبح صرف گھوڑے دستیاب تھے اور اب وہ بھی نہیں تھے۔ میں نے بادل ناخواستہ ان سے درخواست کی کہ وہ دو گھوڑے ہمارے لیے چھوڑ دیں۔ انہوں نے رکھائی سے جواب دیا۔

"یہ دوپہر تک آ جائیں گے تب آ جانا۔"

"تب تک دیر ہو جائے گی۔"

انہوں نے بے پروائی سے شانے اچکائے اور ایک کمینی مسکراہٹ کے ساتھ بولے۔ "یہ تمہارا مسئلہ ہے۔"

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مجھے غصہ آرہا تھا۔ مجھے لگا کہ انہوں نے جان بوجھ کر سارے گھوڑے بک کرا لیے تھے انہیں اتنے گھوڑوں کی ضرورت نہیں تھی۔ یہ بات گھوڑوں کے مالکان نے بھی محسوس کی اور انہوں نے رئیس الدین سے کہا کہ وہ دو گھوڑے چھوڑ دیں مگر وہ نہیں مانے اور ان بے چاروں پر غرانا شروع کر دیا تھا۔ ایک گھوڑے والے نے مجھ سے چپکے سے کہا۔ "صاحب آپ سامان لے کر چلنا شروع کرو ہم ان کو پہنچا کر جلدی آتا ہے آپ ندی کے کنارے انتظار کرنا۔"

میرے پاس اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا مگر جواب کے ان کے روانہ ہوتے ہی ایک طرف سے دو تنومند گھوڑے نمودار ہوئے اور میں نے فوراً انہیں بک کر لیا۔ یہ تیز رفتار اور طاقتور گھوڑے تھے اور انہوں نے بہت جلد ہمیں اس جگہ پہنچا دیا جہاں ہماری جیپ موجود تھی۔ وہاں رئیس الدین صاحب کی پجارو کھڑی تھی اور ان کا فی الحال کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ میں حیران تھا کہ وہ ہم سے آدھے گھنٹے پہلے نکلے تھے اور اب تک نہیں پہنچے تھے۔ وہ اس وقت نمودار ہوئے جب ہم اپنا سامان جیپ کے اوپر باندھ رہے تھے۔ رئیس الدین صاحب ہمیں پہلے سے دیکھ کر دنگ رہ گئے۔ "تم لوگ اتنی جلدی کیسے آگئے؟"

"یہ جلدی نہیں آیا آپ دیر سے آیا۔" ان کے ساتھ آنے والے ایک گھوڑے کے مالک نے خفگی سے کہا۔ "آپ بلاوجہ اتنا لمبا راستہ اختیار کیا۔"

میں سمجھ گیا کہ انہوں نے لمبا راستہ کیوں اختیار کیا تھا، وہ چاہتے تھے کہ گھوڑے زیادہ سے زیادہ دیر سے واپس جائیں۔ میں نے کہا۔ "خوش قسمتی سے ہمیں دو گھوڑے مل گئے اور ہم یہاں پہنچ گئے۔ اب آگے روانگی ہے۔"

"کہاں کا ارادہ ہے؟"

"میں نے بتایا تھا کہ نانگا پربت میں کیمپنگ کا ارادہ ہے۔"

"وہاں کا راستہ بہت دشوار ہے۔" وہ حسب معمول حقارت سے بولے۔ "تمہاری جیپ اس قابل نہیں ہے کہ استور سے آگے جاسکے۔"

"اب تک تو اس نے ساتھ دیا ہے آگے اللہ مالک ہے۔" میں نے کہا اور پوچھا۔ "ویسے کیا آپ کا ارادہ بھی وہیں جانے کا ہے؟"

"ہاں وہ بچے بضد ہوگئے کہ وہاں جانا ہے۔" وہ عیاری سے بولے تو میں نے ان کے بچوں کو دیکھا جو اتنے خوب صورت مناظر والی جگہ بھی اپنی چیزوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ بیٹی راک میوزک سن رہی تھی اور چھوٹے صاحبزادے ہینڈی گیم کھیل رہے تھے۔ "تم سے وہاں ملاقات ہوگی مگر یہ جیپ......" انہوں نے کسی قدر حقارت سے میری جیپ کی طرف دیکھا۔ "اس کے ہوتے ہوئے مشکل ہے کہ یہ استور سے آگے جاسکے۔"

"میں نے کہا نا اللہ مالک ہے۔" میں نے جواب دیا۔ "اب اجازت دیں سفر طویل ہے اور جلد پہنچنا ہے۔"

یہ سفر بھی خاصا طویل تھا۔ اگرچہ نانگا پربت یہاں سے ساٹھ کلومیٹرز کے فاصلے پر تھی لیکن جو سڑک گھوم کر اوپر سے واپس آکر نانگا پربت کی طرف جا رہی تھی اس پر تقریباً تین سو کلومیٹرز کا سفر بنتا تھا اور یہ سفر بھی بہت مشکل اور نازک سی سڑک پر تھا۔ اس کا صرف کچھ حصہ جو قراقرم ہائی وے سے گزر رہا تھا ٹھیک تھا باقی تمام راستہ مشکل اور تنگ تھا۔ یہاں بہت احتیاط سے ڈرائیو کی ضرورت تھی خاص طور سے مجھ جیسے ڈرائیور تو ان راستوں کا زیادہ عادی نہیں تھا۔ میں بہت سالوں پہلے شمالی علاقوں میں آتا رہا تھا اور تقریباً پورا شمالی علاقہ دیکھا ہوا ہے۔ روانگی سے پہلے بیگم نے بھی مجھ سے یہی پوچھا تھا کہ کیا میں اس سڑک پر ڈرائیو کر لوں گا؟ میں نے اثبات میں جواب دیا۔ بچے جو اس سفر سے پہلے میری کسی بات پر مشکل سے کان دھرتے تھے اب وہ سننے لگے تھے۔ جبرہ پہلے ہی بھائیوں سے جھگڑتی رہتی تھی کہ پاپا کو سب معلوم ہے۔ اب بیٹے بھی ماننے لگے تھے۔

ناران میں کچھ دیر کے لیے رک کر ہم نے سالن، تازہ روٹیاں اور پانی لیا۔ استور تک ہمیں اسی سے کام چلانا تھا۔ راستے میں پانی مشکل سے ملتا اور ندیوں کا پانی خطرناک ہوتا ہے۔ پیٹ گڑبڑ کر سکتا ہے۔ جیپ کا ٹینک فل کرایا اور بیس لیٹرز کے دو جیری کین بھی ڈیزل سے بھر لیے تھے۔ جیپ چھوٹی تھی لیکن اس کا طاقتور انجن وزن اٹھانے اور مشکل چڑھائی چڑھنے کے قابل تھا۔ ہر دو گھنٹے بعد ہم آدھے گھنٹے کے لیے رکتے تھے تاکہ جیپ کا انجن ٹھنڈا ہو جائے۔ دوسرے میں بھی تازہ دم ہو جاؤں۔ مسلسل ڈرائیونگ جس میں ایک لمحے کے لیے غفلت ممکن نہیں تھی خاصا مشکل کام تھا۔ بیگم اور بچوں نے بھی یہ بات محسوس کر لی تھی اس لیے وہ مجھے ڈسٹرب نہیں کر رہے تھے۔ دوپہر تک ہم لالہ زار ودی پت سر نیشنل پارک پہنچ گئے تھے۔ اس کا شمار شمال کے حسین ترین قدرتی پارکس میں ہوتا ہے۔ مناظر ایسے تھے کہ دل چاہا ہمیں رک جائیں مگر یہاں رک جاتے تو

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

آگے سفر میں دیر ہوئی اس لیے صرف لنچ کے لیے یہاں رکے اور پھر آگے روانہ ہوگئے۔ شام کے قریب ہم قراقرم ہائی وے پر آچکے تھے۔

یہاں سے ایک راستہ چلاس سے بھی نانگا پربت کی طرف جاتا تھا مگر ہمیں تیری مبذ و جاتا تھا اور وہاں تک راستہ اسنور سے جاتا تھا اس لیے ہمیں تقریباً دوسو کلو میٹرز کا سفر مزید کرکے اور ایک نیم دائرے میں گھوم کر اسنور تک جانا تھا۔ اس سفر نے میرے کس بل نکال دیے تھے اور میں نے محسوس کیا کہ اب مزید ڈرائیو مشکل تھی۔ اس جگہ رکنے کے لیے کوئی قابلِ ذکر جگہ نہیں تھی اس لیے ہم نے منزل کی الٹی سمت یعنی چلاس کا رخ کیا۔ وہاں ہم رات رک سکتے تھے اور ہمیں رکنے کے لیے ایک اسکول کے احاطے میں جگہ مل گئی۔

میرا فیصلہ درست ثابت ہوا جب چلاس پہنچنے پر ہمیں پتا چلا کہ آگے قراقرام کا ایک حصہ زیرِ مرمت ہے اور رات کے وقت بند کردیا جاتا ہے۔ نیز وہاں جگہ اتنی تنگ ہے کہ خیمے لگانے کی جگہ بھی نہیں ملتی۔ اب ہم رات یہاں گزارنے اور اگلے دن جب سڑک کھول دی جاتی تو ہم آگے جاسکتے تھے۔ مجھے رئیس الدین کا خیال آیا کہ شاید انہیں پتا نہ ہو اور وہ قراقرام ہائی وے پر مشرق کی سمت مڑ گئے ہوں۔ اس صورت میں ان کی رات یقیناً سڑک پر پجارو میں گزر رہی۔

اگلے دن راستے کی خرابی کے پیشِ نظر ہم علی الصبح روانہ ہوئے۔ دو گھنٹے بعد قراقرم ہائی وے کا وہ حصہ آگیا جو خراب تھا اور جب ہم پہنچے تو اس سے آدھا گھنٹہ پہلے ہی کھولا گیا تھا۔ جمع شدہ ٹریفک کی نکاسی جاری تھی اور وہیں رئیس الدین اور ان کی فیملی موجود تھی۔ ان کی پجارو کا نمبر آنے والا تھا۔ یہاں ان کی پجارو کوئی اور ڈرائیو کررہا تھا۔ وہ خود ان سڑکوں پر گاڑی نہیں چلا سکتے تھے۔ ان کے تھکے ماندے چہرے دیکھ کر بیگم نے کہا۔ ”لگتا ہے انہوں نے رات یہیں گزاری ہے؟“

”بالکل۔“ میں نے جیپ ایک جگہ پارک کردی۔ ایک تو ابھی رکا ہوا ٹریفک نکل رہا تھا دوسرے انہیں سفر کرتے ہوئے دو گھنٹے ہونے کو آرہے تھے۔ میں ٹانگیں سیدھی کرنے کے بہانے جاکر وہاں موجود آرمی کے لوگوں سے آگے کی معلومات لے آیا۔ ان علاقوں میں آرمی سب سے زیادہ با خبر ہوتی ہے اور وہ عام لوگوں سے پورا تعاون کرتی ہے۔ ان سے پتا چلتا ہے کہ کہاں راستہ اور موسم خراب ہے اور آگے کیا مسئلہ درپیش آسکتا ہے۔ یہاں سے اطلاع ملی کہ اسنور روڈ بھی ٹھیک نہیں ہے مگر گاڑیاں گزر رہی ہیں۔ اگر اسنور تک روڈ ٹھیک نہ ہوئی تو ہمیں جیپ چھوڑ کر باقی راستہ پیدل طے کرنا پڑے گا مگر اس صورت میں یہ تین دن کا ٹریک بن جائے گا۔

میں نے دل سے دعا کی کہ سڑک ٹھیک ہو ورنہ یہ ٹریک یہیں ختم ہو جائے گا کیونکہ ہم تین دن پیدل نہیں چل سکتے تھے۔ کسی کی جسمانی حالت ایسی نہیں تھی اور خاص طور سے بیگم تو بالکل بھی اتنا مشکل سفر نہیں کرسکتی تھیں۔ اسنور روڈ پر مڑنے سے پہلے میں نے بیگم اور بچوں سے بات کرلی اور ان پر واضح کر دیا کہ اگر سڑک خراب ہوئی تو ہم واپس جائیں گے۔ وہ مان گئے اور طے ہوا کہ اس صورت میں ہم اسکردو جاکر آس پاس ٹریک کرلیں گے۔ بچے اداس ہوئے تھے مگر وہ مان گئے۔ ان کے چہرے دیکھ کر میں نے ایک بار دل سے دعا کی کہ سڑک ٹھیک ہو، کہ میں اپنے بچوں کی خوشی پوری کرسکوں۔

رئیس الدین صاحب کی پجارو راستے میں ہی ہم سے آگے نکل گئی تھی۔ اسنور سڑک تک وہ نظر نہیں آئی۔ جب ہم نے آگے سفر شروع کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ اس سڑک پر ڈرائیونگ کتنا مشکل کام ہے۔ بالآخر ہم اس مقام تک آئے جس کے بارے میں اطلاع تھی کہ یہاں سڑک خراب ہے اور صرف فٹ گاڑی اور ماہر ڈرائیور ہی آگے جاسکتا ہے۔ یہاں بجری اور چھوٹے کنکروں پر مشتمل سڑک تھی کیونکہ پختہ سڑک کا بڑا حصہ اسنور نالے میں گر چکا تھا۔ میں نے ذرا پیدل جاکر سڑک کا معائنہ کیا اور مجھے لگا کہ میں اس پر جیپ چلالوں گا مگر میں نے پہلے بیگم اور بچوں سے مشورہ کیا۔ رمیز نے کہا۔ ”پاپا رئیس صاحب کی پجارو جاچکی ہے اس کا مطلب ہے ہم بھی جاسکتے ہیں۔“

بیگم کا ووٹ حق میں نہیں تھا مگر معیز اور عمیرہ جانے پر اصرار کررہے تھے۔ اس لیے میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے لیکن میں اس شرط پر یہاں سے آگے جاؤں گا کہ آپ سب پیدل چلیں گے اور میں پیچھے جیپ ڈرائیو کروں گا۔“

”آپ اکیلے۔“ بیگم بے چین ہوگئیں۔ ”نہیں میں بھی ساتھ بیٹھوں گی، یہ تینوں پیدل چلیں گے۔“

”آپ کا وزن بھی ہے اور فرنٹ سیٹ کیا وجہ سے یہ نالے کی طرف ہوگا۔ میرا وزن اس طرف ہوگا، اس لیے میں اکیلا ڈرائیو کروں گا۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ بیگم مجبوراً مان گئیں۔ ہم روانہ ہوئے بیگم اور بچے آگے چل رہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تھے اور میں پیچھے پیدل کی رفتار سے جیپ چلا رہا تھا۔ یہاں اسٹ پھسل رہا تھا اور جیپ کو راستے پر رکھنے کے لیے مجھے باقاعدہ اسٹیئرنگ سے لڑنا پڑ رہا تھا۔ رمیز اور معیز راستے میں جہاں جہاں خلا آ رہے تھے وہاں پتھر اور کنکر ڈال رہے تھے۔ دو کلومیٹر کا یہ سفر تقریباً گھنٹے بھر میں جا کر طے ہوا تھا اور جب ٹھیک سڑک آ گئی تو میں بھی جیپ روک کر نیچے اتر آیا اور گہرے سانس لے کر اپنی حالت ٹھیک کرنے لگا۔ اس مختصر سفر نے مجھے نچوڑ دیا تھا۔ بیگم نے فلاسک اور جاگ نکال کر اس کا جگ تیار کیا اور میں نے دو گلاس پیے تو میرے حواس ٹھکانے آئے۔ بچے خوش تھے کہ ان کا ایڈونچر ہو گیا تھا۔ وہ مجھ سے لپٹ گئے۔ رمیز اور معیز مجھ سے زیادہ فرق نہیں تھے مگر اس دن وہ بھی لپٹے جا رہے تھے۔ نمیرہ کی آنکھیں فخر سے چمک رہی تھیں اور بیگم یوں دیکھ رہی تھیں جیسے نظروں ہی نظروں میں قربان ہو رہی ہوں۔

کچھ دیر ہانپ لے کر ہم آگے روانہ ہوئے تھے کہ ایک کلومیٹر بعد رئیس الدین صاحب معہ اپنی پجارو اور فیملی کے سڑک کنارے نظر آئے۔ ان کا ڈرائیور بونٹ کھول کر اندر گھسا ہوا تھا اور وہ بزرگ زلالتفتی سے ایک طرف ڈھلان پر لیٹے ہوئے تھے۔ ہماری جیپ دیکھ کر رئیس الدین صاحب درمیان سڑک میں آ گئے اور مجھے رکنا پڑا ورنہ میرا رکنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ میں نے کھڑکی سے سر نکال کر خوشگوار لہجے میں کہا۔ ”کیا حال ہیں سر، لگتا ہے آپ لوگ ستا رہے ہیں۔“

”نہیں گاڑی کے انجن میں مسئلہ ہو گیا ہے۔“

”اوہو۔“ میں نے مصنوعی تاسف سے کہا۔ ”حالانکہ آپ کی گاڑی نئی ہے اور کل تک تو ٹھیک حالت میں تھی۔“

”اس سفر نے بیڑا غرق کر دیا۔“ انہوں نے پیچھے سڑک کے گر جانے والے حصے کی طرف اشارہ کیا۔ ”انجن میں کچھ ہوا ہے۔“

اسی اثنا میں ڈرائیور ہاتھ صاف کرتا ہوا آیا۔ ”صاحب انجن مسئلہ کر گیا ہے مکینک لانا ہوگا۔“

”مکینک کہاں سے؟“

”ادھر اسکردو میں ملے گا۔“ ڈرائیور نے کہا۔ ”آپ پورٹر بھیج کر بلا لیں تو آ جائے گا۔“

”زیادہ آسان یہ ہے کہ آپ ان ہی پورٹرز کے ہمراہ فیری میڈو چلے جائیں صرف تین دن کا سفر ہے۔“ میں نے مشورہ دیا جس پر پہلے رئیس صاحب نے مجھے ناپسندیدہ نظروں سے دیکھا پھر انہیں خیال آیا۔ پھر ان کے چہرے پر ذرا خاص تاثرات نمودار ہوئے اور میں چوکنا ہو گیا کیونکہ جب ایسے تاثرات آتے تھے تو اس کا مطلب ہوتا تھا کہ ان کے ذہن میں کسی کے حوالے سے کوئی خیال آ گیا ہے۔ وہ بولے تو ان کا لہجہ بدلا ہوا تھا انہوں نے شرافت سے مجھ سے کہا۔ ”فیض ذرا نیچے آ کر میری بات سنو۔“

بادل ناخواستہ میں نیچے اترا۔ ”سر ہمیں آج ہی فیری میڈو کے پاس پہنچنا ہے اس لیے بات ذرا......“

”او کے او کے۔“ وہ مجھے ہاتھ سے پکڑ کر ایک طرف لے آئے اور سرگوشی میں بولے۔ ”تم جانتے ہو میں بوڑھا آدمی ہوں اس علاقے میں پیدل سفر نہیں کر سکتا۔ بیگم بھی ہارٹ پیشنٹ ہیں۔“

”میں جانتا ہوں سر۔“

”تب تم مجھ سے ایک سودا کر لو۔“ وہ بولے۔ ”اپنی جیپ مجھے دے دو۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”سوری سر، جیپ آپ کو دے دی تو میں اور میرے بچے کیسے جائیں گے۔“

”تم لوگ پیدل جا سکتے ہو تم لوگ فٹ ہو۔“

”سر اس میں تین دن لگ جائیں گے اور ہم نے یہ وقت فیری میڈو میں گزارنا ہے ہمیں وہاں ایک ہفتہ گزارنا ہے تو یہ ہفتہ آنے جانے میں ہی لگ جائے گا۔ سوری سر میں جیپ نہیں دے سکتا۔“

رئیس الدین صاحب کو اس صاف صاف انکار کی توقع نہیں تھی ان کے چہرے پر پہلے غیض و غضب کے اور پھر وہی سوچ والا تاثر آیا۔ ”او کے تم مجھے جیپ ایسے مت دو مجھے سیل کر دو۔ کتنے کی ہے یہ ایک لاکھ، دو لاکھ، تین لاکھ۔“

”سر پانچ یا دس لاکھ میں بھی نہیں۔“ میں نے اپنی جیپ سے جھانکتے بچوں کے چہرے دیکھ کر کہا۔ ”میرے لیے اپنے بچوں کی ترقی دنیا کی ہر دولت سے بڑھ کر ہے۔“

ان کا منہ لٹک گیا اور پھر وہ اپنی اوقات پر آ گئے۔ انہوں نے غرا کر کہا۔ ”تم اچھا نہیں کر رہے ہو۔“

میں ہنسا۔ ”سر آپ ایسے بولتے اچھے لگتے ہیں، اچھا اب اجازت دیں ہمیں دیر ہو رہی ہے۔“

رئیس الدین صاحب کے بکنے جھکنے کی آواز کچھ دور آئی رہی اور جب ہم موڑ سے مڑ رہے تھے تو وہ اپنے ایک پورٹر کو روانہ کر رہے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سوال ہے

مکرمی معراج رسول

السلام علیکم

میں ڈرتے ڈرتے اور ایک بناوٹی نام سے اپنی کہانی بھیج رہا ہوں۔ مجھے مشورہ چاہیے کہ اب میں کیا کروں۔ اس عورت سے اب میرا کیا رشتہ ہے؟ اسے کیا کہہ کر مخاطب کروں۔ کیا آپ کے پاس اس کا جواب ہے۔

احمد جہانگیر

(بہاولپور)

ہم سب ابا کی طرف سے بہت پریشان تھے۔

چار پانچ دنوں سے ان کا کوئی پتا نہیں چل رہا تھا۔ وہ نہ جانے کہاں غائب ہو گئے تھے۔ ہم سب کا بہت برا حال تھا۔ لیکن وہ نہیں ملے۔

ویسے بھی پچھلے کئی دنوں سے ان کے ساتھ عجیب وغریب واقعات ہونے لگے تھے۔ ان کا رویہ حیرت انگیز ہو گیا تھا۔

ایک بار وہ اپنے سر پر اماں کا دوپٹا ڈال کر بیٹھ گئے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کمرے میں مٹکتے پھر رہے تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ جھینپ گئے۔ ایک بار اماں کی چوڑیاں پہن لی تھیں۔

ایک صاحب نے مشورہ دیا کہ ہمیں فوری طور پر کسی عامل کامل سے رجوع کرنا چاہیے کیونکہ یہ معاملہ کچھ اور معلوم ہوتا ہے۔

انہوں نے ازراہ کرم ایک عامل کامل کا نام اور پتا بھی بتا دیا۔ وہ درخت والے بابا تھے۔ اس نام کی وجہ یہ تھی کہ ان کے گھر کے آنگن میں ایک بڑا سا درخت تھا اور وہ بابا اس درخت کی ایک شاخ پر بیٹھے رہتے اور حاضرین و معتقدین اس درخت کے چاروں طرف بیٹھتے اور جب بابا سے بات کرنی ہوتی تو گردن اٹھا کر بات کی جاتی تھی۔

بابا کسی ضرورت مند سے کچھ نہیں لیتے تھے۔ سوائے دو بوری چاول کے اور لوگ یہ کہا کرتے تھے کہ بابا ان چاولوں کو صومالیہ جا کر بانٹ آتے ہیں۔ واللہ عالم بالصواب۔

بہر حال میں بابا کی خدمت میں حاضر ہو گیا۔ دو بوری چاول اپنے ساتھ ٹیکسی میں لے گیا تھا۔ جب بابا کے مرید خاص نے وصول کر لیے تو اس کے بعد مجھے اس درخت کے نیچے بیٹھنے کی اجازت دے دی گئی جہاں پہلے سے کچھ لوگ موجود تھے۔

سب اپنی اپنی درخواست پیش کرتے رہے اور جب میری باری آئی تو میں نے کہا۔ ”جناب میں آپ کے پاس اپنے ابا کے لیے حاضر ہوا ہوں۔“

”کیوں۔ کیا ہوا ہے تیرے ابا کو؟“ بابا نے پوچھا۔ ”دوسری شادی کر لی ہے کیا؟“

”نہیں جناب۔ ان کی حرکتیں کچھ عجیب ہو گئی ہیں۔“ میں نے بتایا۔ ”عورتوں جیسی حرکتیں، چوڑیاں پہنتے ہیں، دوپٹا اوڑھتے ہیں۔“

یہ بتاتے ہوئے میں سبکی محسوس کر رہا تھا۔ ایسا کون سا باپ ہوگا جو اس قسم کی حرکتیں کرتا ہوگا لیکن میرا اباپ ایسا ہی ہو گیا تھا۔

درخت کے پاس بیٹھے ہوئے لوگ میری بات سن کر ہنسنے لگے تھے۔

”خاموش۔“ اوپر سے بابا کی گرجدار آواز آئی۔ ”بدبخت۔ ہنس رہے ہو۔ تمہیں یہ نہیں معلوم کہ اس بے چارے کے باپ پر مدھوبالا کی روح نے قبضہ کر لیا ہے۔“

یہ سن کر میرے تو ہوش اڑ گئے تھے۔ ”کیا فرما رہے ہیں حضرت؟ مدھوبالا کی روح؟“

”ہاں۔ تم یہ بتاؤ تمہارا باپ مدھوبالا کی فلمیں دیکھتا ہے یا نہیں۔“

”جی ہاں حضرت۔ بہت شوق سے دیکھتے ہیں۔“

”تو بس۔ اسی کی روح نے تمہارے بابا کے ذہن پر قبضہ کر لیا ہے اور وہی ایسی حرکتیں کروا رہی ہے۔“

”تو حضرت یہ مدھوبالا کی روح میرے ابا کی جان کیسے چھوڑے گی؟“ میں نے پوچھا۔

”وہ خود سے تو نہیں چھوڑے گی۔ چھڑوانی ہو گی۔ دو بوری چاولوں کے ساتھ۔“

”وہ تو دو رات میں، میں حاضر کر چکا ہوں۔“ میں نے بتایا۔

”بے وقوف۔ وہ تو پہلی حاضری کے دو بورے ہوئے۔“ بابا نے کہا۔ ”ہر حاضری میں دو بوریاں ہوں گی۔ اگر یہ شرط منظور ہے تو ٹھیک۔ ورنہ کہیں اور جا۔“

”بابا۔ ایک بات بتا دیں مدھوبالا کی روح پیچھا تو چھوڑ دے گی نا؟“ میں نے پوچھا۔

”تو اس کی فکر مت کر۔ میں پران کی روح کو مدھوبالا کی روح سے بھڑا دوں گا۔“ بابا نے بتایا۔

”ٹھیک ہے بابا۔ میں کل ہی حاضر ہوتا ہوں۔“

گھر پہنچا تو ابا پر ایک اور رنگ سوار تھا۔ وہ دوپٹا لیے گا رہے تھے۔ ”ہوا میں اڑتا جائے میرا لال دوپٹا ململ کا۔“

یعنی مدھوبالا ان کے سر چڑھ کر بول رہی تھی۔ اب کہیں سے بھی ہو۔ دو بوریاں چاول بابا کو ہر حال میں پہنچانے تھے۔

دوسرے دن میں نے ایسا ہی کیا۔ جب دو بوریاں چاول پہنچا دیں تو درخت والے بابا بہت خوش اور مطمئن ہو گئے۔ حالانکہ وہ درخت پر تھے اور میں ان کا چہرہ نہیں دیکھ پا رہا تھا لیکن ان کی آواز بتا رہی تھی کہ وہ خوش اور مطمئن ہیں۔

”بس اب تو گھر جا۔ دو چار دنوں میں تیرا کام ہو جائے گا۔“ بابا نے کہا۔

اب نہیں معلوم کہ کام ہوتا یا نہیں ہوتا لیکن ابا ہی غائب ہو گئے۔ ان کا کوئی پتا نہیں چل رہا تھا۔ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔

ہم نے ہر جگہ تلاش کر کے دیکھ لیا لیکن معلوم ہی نہیں ہو سکا۔ وہ نہ جانے کہاں چلے گئے تھے۔ اب یہ تو سوچا نہیں جا سکتا تھا کہ کسی نے ابا کو تاوان کے لیے اغوا کیا ہے۔ ہمارے پاس تھا ہی کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

چار دنوں کے بعد ایک عجیب واقعہ ہوا۔

میں اس وقت گھر ہی میں تھا جب دروازے پر دستک ہوئی۔ اس وقت گھر میں میرے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ اماں اور میری بہن کو پڑوسن اپنے گھر لے گئی تھی۔ تاکہ ان کے ساتھ دل بہل سکیں۔

خیر۔ میں نے دروازہ کھولا تو ایک خاتون دروازے پر تھیں۔

چہرے پر حجاب۔ دیکھنے سے باوقار اور معزز خاندان سے تعلق رکھنے والی معلوم ہوتی تھیں۔

''جی فرمائیں۔ کس سے ملنا ہے آپ کو؟''

خاتون نے اپنا حجاب ہٹا دیا۔ ایک معزز خاتون کا معزز چہرہ میرے سامنے تھا۔ ''بیٹے۔ تم نے مجھے پہچانا نہیں۔'' خاتون نے کہا۔

''نہیں محترمہ میں آپ کو نہیں پہچان سکا ہوں۔''

''بیٹے میں تمہارا باپ ہوں۔'' اس نے کہا۔

''باپ؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ ''کیا مذاق ہے۔ کیسی باتیں کر رہی ہیں آپ۔''

''ہاں بیٹے۔ سچ کہہ رہا ہوں میں باپ ہوں تمہارا۔ تمہارا ابا ہوں۔ صفدر خان۔ اور اب صنف خاتون ہو گئی ہوں۔''

''کیا آپ پاگل ہو گئی ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''کیسی الٹی سیدھی باتیں کر رہی ہیں۔''

''ابے کم بخت پہچانتا کیوں نہیں۔'' اس نے غصے سے پھنکاری لی۔ ''آنکھوں پر چربی چڑھتی جا رہی ہے۔''

بالکل وہی انداز۔ ابا جیسا۔ ابا بھی کبھی کبھی غصے میں یہی بولا کرتے تھے۔ کم بخت کیا آنکھوں پہ چربی چڑھتی جا رہی ہے۔

لیکن پھر بھی میں اس خاتون کو اپنا باپ کیسے مان سکتا تھا اور وہ باپ تھا بھی کہاں۔ وہ تو ایک صحت مند عورت تھی جو میرے پاس آ کر مجھے بتا رہی تھی کہ وہ میرا باپ ہے۔

''پلیز خاتون۔ آپ یہاں سے تشریف لے جائیں۔'' میں نے کہا۔ ''ہم لوگ آج کل ویسے ہی پریشان ہیں اور آپ مزید پریشان کرنے چلی آئی ہیں۔''

''ابے سمجھتا کیوں نہیں۔ میں تیرا باپ ہوں۔ تیرا ابا جان۔ اور اب صنف خاتون بن کر واپس آئی ہوں۔ ماں کہاں ہے تیری۔ وہ مجھے پہچان لے گی۔''

''دیکھیں خاتون۔ اب بہت ہو گئی۔'' مجھے اب غصہ آنے لگا تھا۔ ''اس قسم کے تماشے فلموں اور کہانیوں میں ہوتے ہیں۔ زندگی میں نہیں ہوتے۔ خدا کے لیے چلی جائیں یہاں سے۔''

اسی دوران میں اماں اور بہن بھی آ گئیں۔

اماں مجھے کسی عورت کے ساتھ باتیں کرتے دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ ''کون ہیں یہ؟'' اماں نے پوچھا۔

''اماں۔ یہ ابا ہیں۔''

اماں ٹھٹک اٹھیں۔

''ان ہی سے پوچھ لو۔'' میں نے کہا۔

اس دوران میں اس خاتون نے میری بہن عزیزہ کو زبردستی اپنے سینے سے لگا کر رونا شروع کر دیا تھا۔

''میری بچی۔ میری جان۔ تو تو اپنے باپ کو پہچان لے۔ بچپن میں تیری کیا لاڈ اٹھاتا تھا۔''

میری بہن عزیزہ ابا کے ساتھ بچوں والا ایک کھیل تقریباً روزانہ ہی کھیلا کرتی تھی اور ابا بھی اس کے ساتھ لگے رہتے تھے۔ چھپن چھپائی۔ اور اس وقت وہ عورت عزیزہ کو وہی یاد دلا کر اس کو مستقل بلیک میلنگ کر رہی تھی۔

''اماں۔ جلدی سے پولیس کو فون کرو۔'' میں نے کہا۔ ''میں جب تک اس بہروپیے کو پکڑ کر رکھتا ہوں۔''

''ارے کیا ہو گیا ہے تم سب کو۔'' وہ عورت غصے سے بولی۔ ''اب مجھے پہچاننے سے انکار کر رہے ہو۔''

عزیزہ ایک سمجھدار لڑکی تھی، اس نے مجھ سے کہا۔ ''بھائی۔ اس طرح دروازے پر تماشا بنانے سے بہتر

شمارہ اکتوبر 2014ء کی منتخب سچ بیانیاں

ادارتی مجلس..... آپ کا انتخاب

☆ اول: آئینہ..... رضیہ رمیز (کراچی)

☆ دوم: قدر..... طالب المولیٰ (حیدرآباد)

☆ سوم: فن کار..... ثاقب احمد (کراچی)

پہلی، دوسری اور تیسری سچ بیانی کے لیے آپ بھی منتخب کیجیے آپ کی رائے کا احترام کریں گے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہے کہ اس کو گھر کے اندر لے آؤ۔ یہ بھاگ تو سکتی نہیں۔ اطمینان سے بات کریں گے۔"

"ہاں ہاں چلو اندر۔ میں تمہیں سب بتاتی ہوں۔ میرا مطلب ہے سب بتاتا ہوں۔" اس عورت نے کہا۔ ہم اسے اندر لے آئے۔ آنگن کا دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔

وہ خاتون آنگن کی چوکی پر آ کر بیٹھ گئی۔ "ہاں بھئی رضیہ، تم نے کھٹلوں والی دوا ڈالی یا نہیں ڈالی۔ میں اسی دن دوا دے کر گیا تھا۔"

یہ بات تو بہت کم لوگوں کو معلوم تھی کہ گھر میں کھٹمل بہت تھے۔ اور ابا خاص دوائی بنوا کر لائے تھے لیکن عقل ماننے کو تیار نہیں تھی۔

ابا گھر سے مرد بن کر گئے تھے اور عورت بن کر واپس آ گئے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔

"بھائی۔ پولیس کو تو بلانا چاہیے لیکن پہلے اس عورت سے اس کی کہانی تو سن لو۔ یہ کیا کہہ رہی ہے۔" عزیز نے مشورہ دیا۔ حسب معمول اس کا یہ مشورہ بھی بہت معقول تھا۔

"ہاں خاتون۔ چلو بتاؤ۔ تم میرے ابا کیسے ہو گئیں۔" میں نے پوچھا۔

"کم بختو۔ تم لوگوں کو یہ احساس تو ہونے لگا تھا کہ مجھ میں کچھ تبدیلیاں ہو رہی ہیں۔" اس نے کہا۔ "میں کبھی دوپٹا پہن لیتا۔ یا کبھی چوڑیاں۔"

"ہاں۔ ہاں۔ ابا ایسا ہی کر رہے تھے۔"

"تو میرے بچے۔ یہ میرے ہارمونز میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔" اس نے کہا۔ "میرا مردانہ پن ختم ہوتا جا رہا تھا اور مجھ میں زنانہ رجحانات پرورش پانے لگے تھے۔ میں جو بھی کر رہا تھا یا کر رہی تھی۔ وہ میرے ہارمونز کی مجبوری تھی۔"

ہم سب حیرت سے اس کی باتیں سن رہے تھے۔

"پھر یہ ہوا کہ میں ایک دن بہت پریشان ہو کر گھر سے نکلا یا نکلی اور اچانک ایک جگہ راستے میں بے ہوش ہو کر گر پڑا یا گر پڑی۔ کچھ بھلے لوگ مجھے اٹھا کر اسپتال لے گئے۔ میرے پاس میری جیب میں اس اسپتال کی پوری رپورٹ موجود ہے۔" اس نے اپنی جیب سے کچھ کاغذات نکال کر میری طرف بڑھا دیے۔

وہ ایک مشہور اسپتال کی رپورٹ تھی۔

"اس میں یہ لکھا تھا کہ اس شخص میں اب تک کسی جنسی تبدیلی کی وجہ سے ہارمونز میں انقلابی تبدیلیاں ہونے لگی ہیں اور شدید ذہنی اور جسمانی دباؤ کی وجہ سے اس کو غش آنے لگے ہیں۔ اس کی وجہ سے یہ ضروری ہو گیا تھا کہ میڈیکل بورڈ کے مشورے کے بعد اس کو مکمل عورت بنا دیا جائے۔"

یہ تو ایک رپورٹ تھی۔ اس کے ساتھ دوسری ٹیسٹ کی رپورٹس تھیں جن سے یہ ثابت ہو رہا تھا کہ یہی خاتون میرے ابا ہیں۔ کئی ٹیسٹوں اور قابل ڈاکٹرز کے دستخط بھی موجود تھے۔

"پڑھ لیا۔" اس نے کہا۔ "ابھی تو اطمینان ہو گیا نا کہ میں کون ہوں۔"

"سمجھ میں نہیں آ رہا کہ میں کیا کہوں۔"

"رقیہ۔ تم ذرا میرے ساتھ آؤ۔" اس نے اماں سے کہا۔ "میں تمہیں کچھ بتانا چاہتا ہوں۔"

اماں جھجکتی ہوئی اس کے ساتھ دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ کچھ دیر بعد دونوں واپس آئے تو اماں بری طرح رو ئے جا رہی تھیں۔

"ہاں۔ یہی ہیں تمہارے ابا۔" اماں نے مجھ سے اور عزیز سے کہا۔

اب تو خود ہم نے بھی انہیں اپنا گم شدہ باپ سمجھنا شروع کر دیا تھا۔ یہ وہی تھے۔ لیکن کون تھے۔ میرا خیال ہے کہ ایسی پچویشن کم ہی گھرانوں کے ساتھ ہوئی ہو گی۔

اب میرے پاس کئی سوالات ہیں۔ کیا آپ میں سے کوئی ان سوالوں کے جواب دے سکے گا۔ پلیز۔

سوال نمبر ایک۔ اب ابا اور اماں کے درمیان کیا رشتہ تھا؟ ابا اب اماں کے شوہر تو نہیں کہلا سکتے تھے۔ پھر کون تھے؟ دونوں کے درمیان طلاق وغیرہ بھی نہیں ہوئی تھی۔ یا ہو چکی تھی؟

سوال نمبر دو۔ اب میرا اور میری بہن کا ان سے کیا رشتہ تھا؟ وہ ہمارے باپ تو نہیں ہو سکتے تھے۔ باپ ایسا تو نہیں ہوتا۔

پھر انہیں کیا کہہ کر پکارا جائے۔ ابا۔ پھوپی یا اماں۔

سوال نمبر تین: اگر میری یا عزیزہ کی شادی ہو جاتی ہے تو ہمارے بچوں کے وہ کون ہوں گے۔ دادی۔ دادا، نانی یا نانا کیا ہوں گے۔

سوال نمبر چار۔ جو سب سے اہم ہے کہ ہم خاندان اور محلے والوں کو کیسے فیس کریں۔ کیا کہیں ان سے کہ جو خاتون ہمارے گھر میں رو رہی ہیں۔ وہ دراصل ہمارے ابا ہیں۔

کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جذبہ

محترم ایڈیٹر
سلام شوق!
لوگ ادھر ادھر کی کہانیاں بھیجتے ہیں، سنی سنائی کہانیاں مگر میں آپ کو اپنے دوست کی سرگزشت بھیج رہا ہوں گو کہ تمام نام میں نے بدل دیے ہیں۔ امید ہے پسند آئے گی۔

محمد حنیف قادری
(پنڈی بھٹیاں، حافظ آباد)

انڈین آرمی نے چاروں طرف سے مجھے گھیر لیا تھا۔ ان کے بوٹوں کی دھمک میرے کانوں تک پہنچ رہی تھی۔ میں اس وقت انکل شیام کی کٹیا کی دو چھتی کے درمیان سے ایک چھوٹے سے خلا میں دبکا ہوا ساری کارروائی کو محسوس کر رہا تھا۔ انڈین فوجی بے خوفی سے گھر کی چیزیں ادھر ادھر پھینک رہے تھے اور انکل شیام ان کے پاؤں پڑ رہے تھے مگر وہ جوں جوں ان کی منت کر رہے تھے وہ لوگ انہیں اور بھی زیادہ ذلیل کر رہے تھے۔ لاتوں جسے میں پیار سے لاجو کہتا

WWW.PAKSOCIETY.COM

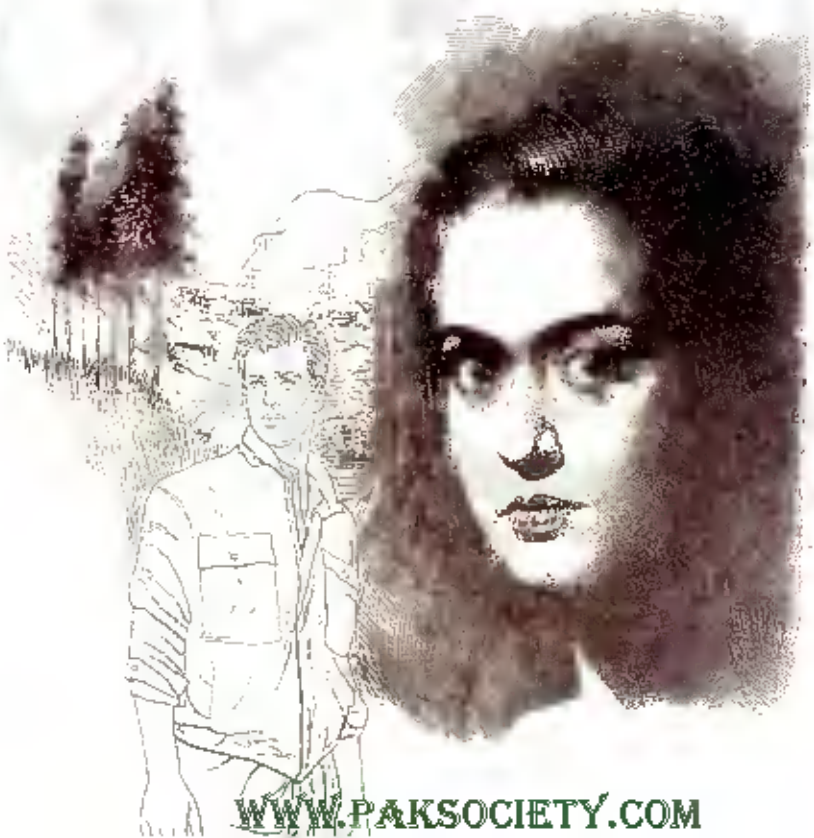

WWW.PAKSOCIETY.COM

کرتا تھا وہ میرے ساتھ ہی موجود تھی۔ اس جگہ انکل شیام اکیلے ہی اپنی بیٹی لاجونتی کے ساتھ رہائش پذیر تھے۔ ان کا بیٹی کے سوا دنیا میں اور کوئی نہیں تھا۔ ان کی پتنی عرصہ ہوا سورگ باش ہو چکی تھی۔ میں یہاں کافی عرصہ بعد وارد ہوا تھا۔ لاجو مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی تھی۔ یہ کٹیا گاؤں سے کافی ہٹ کر ویرانے میں بنی ہوئی تھی۔ گاؤں دور تھا اس وجہ سے انہیں کھیتوں کی رکھوالی کے لیے آنے جانے میں مسئلہ ہوتا تھا۔ اسی لیے انہوں نے گاؤں کی رہائش کو خیرباد کہہ کے کھیتوں میں ہی مٹی اور گارے سے ایک چھوٹا سا گھر بنا لیا تھا اور اس میں وہ دونوں باپ بیٹی سکون سے رہ رہے تھے۔ بنیادی طور پر وہ ایک شریف آدمی تھے۔

گارے اور مٹی سے بنے اس چھوٹے سے گھر کے سامنے تھوڑی سی دوری پر انکل شیام اور میں نے ایک چھوٹی سی کٹیا بنا رکھی تھی۔ جسے وہ گرمیوں کے دنوں میں کھلی ہوا کے لیے استعمال کرتے تھے۔ اس کٹیا کی چھت پر انہوں نے درمیان میں مضبوطی کے لیے دو شہتیر رکھے ہوئے تھے۔ یہ لکڑی کے کافی بڑے اور موٹے شہتیر تھے۔ ان دو شہتیروں کے درمیانی حصے کے خلا کو میں نے مضبوط لیکن باریک نائیلون کی ڈوری سے کس کر باندھ دیا تھا اور اس کے نیچے اور اوپر ساری کٹیا کی چھت کو پولی تھین شیٹ سے بند کر دیا تھا۔ دو شہتیروں کے درمیان ایک اچھا بھلا خلا موجود تھا اور اسی خلا میں میں اس وقت موجود تھا۔ مجھے امید تھی کہ نیچے سے کوئی بھی چیک کرتا تو وہ اس راز سے واقف نہیں ہو سکتا تھا اور یہی میں نے اس کٹیا کو بناتے وقت سوچا تھا۔

انڈین آرمی کے لوگ کتوں کی طرح میری بو سونگھتے پھر رہے تھے۔ وہ سارے گھر کی تلاشی لے چکے تھے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ کٹیا کو انہوں نے سرسری سی نظر سے دیکھا اور اسے کوئی اہمیت ہی نہ دی۔ حالانکہ اگر وہ تھوڑا سا غور کرتے تو اس راز تک پہنچ سکتے تھے مگر یہ انسانی نفسیات ہے کہ وہ سامنے پڑی چیز کو اتنی اہمیت نہیں دیتا۔ آج جب وہ لوگ اس طرف آ رہے تھے تو میں اس وقت چھت پر بیٹھا سورج کی آخری کرنوں کا خوبصورت منظر دیکھ رہا تھا۔ میں نے جلدی سے نیچے اتر کر انکل شیام کو خبر دے دی۔ کیونکہ میں نے انہیں یہ نہیں بتایا تھا کہ ہم دونوں کہاں چھپیں گے اور سچ تو یہ ہے کہ میں انتہائی مجبوری کے علاوہ انہیں کچھ بتانا بھی نہیں چاہتا تھا۔ لاجو کو میں نے اس لیے اپنے ساتھ رکھا تھا کہ انڈین آرمی کے لوگ کسی لاچار اور مجبور لڑکی کو دیکھ کر اندھے ہو جاتے تھے اور پھر یہاں اس ویرانے میں تو اس باپ بیٹی کی فریاد سننے والا بھی کوئی نہیں تھا۔

ان لوگوں کی انکل شیام سے پوچھ گچھ جاری تھی اور مجھے لگتا تھا کہ وہ تشدد پر اتر آئیں گے اور یہی ہوا۔ انکل شیام سے مطلب کی معلومات نہ ملنے کی وجہ سے ان لوگوں نے انکل کی خوب پٹائی کی۔ مگر حیرت کی بات تھی کہ وہ لوگ میرے بارے میں تو پوچھ ہی نہیں رہے تھے۔ لگتا تھا کہ یہ کوئی اور ہی معاملہ ہے۔ وہ انکل شیام سے ان کے دوستوں کے بارے میں پوچھ رہے تھے۔ میں جانتا تھا کہ انکل شیام کے تعلقات کمیونسٹ تنظیم سے تھے اور اس سلسلے کو خفیہ رکھنے کے لیے ہی وہ اس جگہ رہ رہے تھے اور اسی لیے انہوں نے کچے مکان کے نیچے ایک چھوٹا سا تہ خانہ بھی بنوا رکھا تھا۔

شاید کسی نے ان کے بارے میں مخبری کر دی تھی اور انڈین آرمی کے لوگ اسی لیے یہاں موجود تھے۔ اب یہ ایک اتفاق ہی تھا کہ میں بھی یہاں موجود تھا۔ لاجونتی کے بارے میں بھی وہ لوگ انتہائی غلیظ زبان میں بات کر رہے تھے اور بار بار پوچھ رہے تھے کہ اس نے لاجونتی کو کہاں چھپایا ہے۔

انکل نے کہا کہ لاجو آج صبح ہی قریبی گاؤں میں اپنی سہیلی کاننا کی شادی میں گئی ہے۔ شاید وہ اب صبح ہی آئے گی۔

ایک فوجی انہیں اپنی بیلٹ کے ذریعے بے دردی سے مار رہا تھا اور انکل شیام بے چارے منت سماجت کر کے ان لوگوں سے جان چھڑانے کی کوشش میں تھے۔ آخر کار ان لوگوں کو شیام جی پر ترس آ گیا اور انہوں نے انہیں چھوڑتے ہوئے کہا۔

"جونہی تمہاری چھوری واپس آئے تم اسے لے کر بڑے صاحب کے بنگلے پر پہنچ جانا۔ ورنہ تو جانتا ہے کہ ہم تمہارے ساتھ کیا کر سکتے ہیں۔ تیری اس چھمک چھلو کو اٹھا کے لے جائیں گے۔" اس نے انکل شیام کو گالی سے نوازتے ہوئے کہا......

"جی سر جی! میں سمجھ گیا جی۔ میں خود آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا سر جی۔ یہ بھلا کیسے ہو سکتا ہے کہ ہم آپ کی بات کو بھلا دیں۔" انکل شیام نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔

"اور ہاں ان لوگوں کے نام اور پتے سن لو جو کہ وقتاً فوقتاً تمہارے مہمان بنتے رہتے ہیں۔ ہم جلد ہی تم سے رابطہ کریں گے۔"

ان لوگوں کے جاتے ہی انکل شیام گھر چلے گئے۔ مگر میں اور لاجو کم از کم ایک گھنٹے بعد وہاں سے نکلے۔ ہمارے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

چہرے اور ہاتھوں پر کئی جگہ چھت کے سرکنڈے لگ جانے کی وجہ سے زخمی تھے اور ان سے ہلکا ہلکا خون رس کر خود ہی بند ہو گیا تھا۔ میں اب بھی محتاط تھا کیونکہ مجھے شک تھا کہ وہ لوگ اتنی جلدی پیچھا چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ان کے کچھ بندے اب بھی کہیں چھپ کر نگرانی کر رہے ہوں اور موقع ملتے ہی مجھ پر ٹوٹ پڑیں مگر یہ رسک تو مجھے لینا ہی تھا۔ میں آخر کب تک یہاں چھپ کر پڑا رہتا۔ مجھے ہر حال میں یہاں سے نکلنا تھا۔

ہم گھر میں داخل ہوئے تو میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ میں نے دیکھا انکل شیام خون میں لت پت صحن میں پڑے تھے۔ مگر یہ سب کیسے ہو گیا؟! انکل شیام کو تو میں نے اپنی آنکھوں سے صحیح سلامت گھر میں داخل ہوتے ہوئے دیکھا تھا؟ پھر ان کی یہ حالت کون کر گیا؟! انڈین آرمی تو واپس چلی گئی تھی تو پھر انکل شیام کے ساتھ یہ سب کس نے کیا؟! اتنے میں لاجو کی نظر اپنے چاچا پر پڑی تو بے اختیاری میں اس کے منہ سے چیخ نکل گئی اور اس سے پہلے کہ میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش رہنے کی تلقین کرتا ایک عجب واقعہ رونما ہوا۔ جانے کہاں سے انڈین آرمی کے سپاہی نکلے اور مجھ پر ٹوٹ پڑے۔ اب وقت ہاتھ سے گزر چکا تھا۔ یہ پانچ سپاہی تھے۔ میں ان کے نرغے میں بری طرح پھنس چکا تھا۔ دو سپاہیوں نے لاجو کو اپنے قابو میں کر لیا تھا اور بقیہ تین مجھ سے چمٹ چکے تھے۔ وہ مجھے قابو کر کے ہتھ کڑی لگانا چاہتے تھے مگر میں ان کے نرغے میں پھنسنے کا مطلب بہت اچھی طرح جانتا تھا۔ خطرہ بھانپتے ہی میں نے پنڈلی سے اپنا خنجر نکال کر اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ ایک آدمی مجھے پیچھے سے پکڑ کر میرے ہاتھ میری پشت پر لے جانے کی بھرپور سعی کر رہا تھا۔ دوسرا سپاہی مجھے گردن سے دبوچ کر بے بس کرنے کی کوشش کر رہا تھا جبکہ تیسرا سپاہی نیچے بیٹھا میرے پاؤں میں نائیلون کی ڈوری ڈال کر مجھے باندھنا چاہتا تھا۔ شاید وہ لوگ مجھے زندہ گرفتار کرنے کے چکر میں تھے۔ مگر وہ نہیں جانتے تھے کہ ان کا واسطہ کس شخص سے پڑا ہے۔ وہ شخص جو میرے ہاتھ پیچھے لے جانے کی کوشش کر رہا تھا وہ میرے لیے سب سے زیادہ خطرناک تھا۔ اسے ابھی تک یہ معلوم نہیں ہوا تھا کہ میرے ایک ہاتھ میں خنجر دبا ہوا ہے۔ میں نے برق سرعت سے نیچے بیٹھے شخص کے منہ پر ایک زوردار ٹکر جڑ دی۔ وہ اوغ کی آواز نکالتا ہوا پیچھے گرا۔ اسی لمحے میرے ہاتھ میں موجود خنجر میری پشت پر موجود شخص کے پیٹ میں گھستا چلا گیا۔ وہ سپاہی چیخ مارتا ہوا پیچھے کی طرف گرا۔ اسی اثنا میں جس شخص نے میری گردن پکڑ رکھی تھی اس نے میرے منہ پر ایک زبردست مکا جڑ دیا۔ میں قدرتی طور پر پیچھے کی طرف ہوا مگر میں نے فوراً ہی ایک زبردست قلابازی لگائی اور پیچھے کھڑے ان دو بندوں پر جا پڑا جنہوں نے لاجو کو پکڑ رکھا تھا۔ میں نے فوراً ہی انتہائی برق رفتاری سے خنجر کو بلند کیا اور یکے بعد دیگرے دونوں بندوں کے حلقوم پر پھیر دیا۔ یہ سب اتنی تیزی سے ہوا کہ مرنے والوں کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اسی جنون میں، میں پیچھے کی طرف مڑا۔ میں نے دیکھا کہ میرے پیچھے کھڑا شخص گن کو دستے کی طرف سے پکڑے میرے سر پر مارنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں نے بچنے کی کوشش میں جست لگائی اس سے یہ ہوا کہ اس کی گن کا دستہ میرے کندھے سے ٹکرایا۔ ایک بار تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ جیسے میرے کندھے کو کسی نے جڑ سے ہی اکھاڑ دیا ہے۔ مگر اس وقت یہ سب سوچنے کا وقت نہیں تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ بندہ دوبارہ مجھے ہٹ کرنے کی کوشش کرتا، میں نے نیچے لیٹے لیٹے ہی اس کی ٹانگوں میں اڑنگا لگا کر اسے ایک زبردست دھکا دیا پھر میں نے خنجر والا ہاتھ بلند کیا اور اس کے سینے میں خنجر گھونپ دیا۔ اس نے ایک زبردست چیخ ماری۔ اب میدان میں صرف ایک بندہ ہی زندہ رہ گیا تھا۔ مگر وہ اپنے ساتھیوں کا حشر دیکھ چکا تھا۔ میں جو نہی جست بھرتے ہوئے اوپر اٹھا تو میں نے اسے بھاگتے ہوئے دیکھا۔ میں حیران تھا کہ اس کے ہاتھ میں رائفل بھی موجود تھی مگر پھر بھی وہ بھاگ گیا۔ وہ اگر چاہتا تو مجھے رائفل سے ہٹ کر سکتا تھا۔ اس کے پاس بہترین موقع تھا۔ بہر حال اس کا بھاگ جانا میرے لیے انتہائی نقصان دہ تھا میں جنون کی حالت میں اس کے پیچھے بھاگا۔ وہ صحن سے ابھی دروازے تک ہی پہنچا تھا۔ وہ مخبوط الحواس ہو کر چیخیں مارتا ہوا بھاگا جا رہا تھا۔ میں نے اس کی پسلیوں کا نشانہ لیتے ہوئے خنجر اس کی طرف پھینکا۔ پسلیوں میں خنجر کے لگتے ہی وہ شخص نیچے گر کے تڑپنے لگا۔

☆☆☆

انڈین فوجیوں کا قصہ پاک ہو چکا تھا۔ میں واپس مڑا تو دیکھا، لاجو سکتے کی سی کیفیت میں اپنے چاچا کی لاش کے پاس بیٹھی عجب سی نظروں سے ارد گرد پڑی لاشوں کو تک رہی تھی۔ میں اس کے پاس پہنچا اور اسے سکتے سے نکالنے کی خاطر جھنجھوڑا۔ میری تھوڑی سی تگ و دو سے اسے کچھ ہوش آیا۔ میرے پاس وقت بالکل نہیں تھا۔ اگر لاجو کو یہاں کوئی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نہ ہوتا تو میں کب کا یہاں سے جا چکا ہوتا مگر میں جانتا تھا کہ وحشی بھیڑیوں کا بدمست غول کسی بھی وقت واپس آسکتا تھا اور اگر اس وقت انہیں لاجو یہاں ملی تو اس کی خیر نہیں تھی۔

جیسے ہی لاجو کی طبیعت کچھ بہتر ہوئی تو اس نے باپو کی طرف دیکھا۔ وہ شاید آخری سانسیں لے رہے تھے۔ لاجو نے ان کا سر اپنی گود میں لے لیا اور روتے ہوئے بولی۔

"تمہیں کیا ہو گیا ہے باپو! دیکھو ناں سرحد پار سے خرم تمہارے کہنے پر یہاں آیا ہے۔" وہ اپنے باپو سے باتیں کر رہی تھی کہ میں بھاگ کر نلکے سے پانی لے آیا مگر شیام انکل اس وقت اٹک اٹک کر سانسیں لے رہے تھے۔ انہوں نے بڑی مشکل سے میرا ہاتھ تھاما اور لاجو کے ہاتھوں میں دے دیا پھر اٹکتے ہوئے بولے۔

"بیٹا! میری لاجو اب تیرے حوالے۔ اس کا خیال رکھنا .... اور ...... اور......"

اور اس کے بعد ان کی گردن ڈھلک گئی۔

☆☆☆

میں نے جلدی سے ایک ایک کرکے تمام لاشوں کو کندھوں پر لادا اور گھر سے باہر بڑے تالاب میں پھینک دیا۔ ادھر سے فارغ ہوتے ہی میں نے انکل شیام کی لاش لکڑیوں کے درمیان رکھی، کیونکہ اس وقت تک لاجو اندر کمرے سے لکڑیاں لاکر صحن میں رکھ چکی تھی۔ میں نے جلدی سے لکڑیوں کو آگ دی۔ اس وقت لاجو پاس ہی کھڑی رونے کے ساتھ ساتھ کوئی اشلوک بھی پڑھ رہی تھی۔ اسی دوران میں مجھے محسوس ہوا کہ جیسے کوئی گھر کی طرف دیوار پھلانگ کر اندر آیا ہو۔ میں نے جلدی سے مرنے والے انڈین فوجیوں کے اسلحے سے ایک گن اٹھائی اور اس طرف بڑھا جس طرف سے آواز آئی تھی، مگر میں ابھی ادھر جا ہی رہا تھا کہ دیکھا قریبی گاؤں کے ٹھاکر چند چلے آرہے تھے۔ وہ شیام انکل کے گہرے دوست تھے۔ اس وقت ان کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ مجھے دیکھتے ہی کہنے لگے۔

"راجا! تم کب آئے؟ تم ابھی کے ابھی جلد از جلد یہاں سے نکل جاؤ۔ فوجی ابھی پہنچنے ہی والے ہوں گے اور اگر انہوں نے تمہیں یہاں دیکھ لیا تو ایک نئی انکوائری شروع ہو جائے گی۔ وہ لوگ گاؤں سے ابھی نکلے ہیں۔ مجھے جوں ہی یہ پتا چلا کہ وہ لاجو کو تلاش کر رہے ہیں تو میں پہاڑیوں والے شارٹ کٹ سے آگیا۔" اتنے میں اس نے میرے عقب میں جلتی چتا کو دیکھا تو کہا۔

"یہ کیا ہو رہا ہے راجو؟ یہ آگ کیوں روشن ہے؟ باپو کہاں ہے؟"

میں خاموش رہا۔ اتنے میں ہمارے کانوں میں فوجی بوٹوں کے شور کی آواز آئی تو ٹھاکر چند نے میرے اور لاجو کی طرف دیکھا اور ایک بار اپنے دوست کی جلتی ہوئی چتا کی طرف نظر ڈالی۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ جانے کیا کرتا مگر وہ بھی فوجیوں کے لحہ بہ لحہ قریب آتے شور کو سن رہا تھا۔ اس نے لاجو کا ہاتھ پکڑا اور میرے ہاتھ میں تھما کر بولا۔

"راجو بیٹے بحث کا وقت نہیں۔ لاجو تمہاری امانت ہے۔ اپنی امانت لے کر اس جگہ سے کہیں دور چلے جاؤ۔ زندگی رہی تو دوبارہ پھر ملیں گے۔"

میں نے لاجو کے ساتھ ان سے آشیرباد لیا اور وہاں سے ہم نکل آئے۔ ضرورت کا تھوڑا بہت سامان لاجو پہلے ہی ایک شاپر میں ڈال چکی تھی اور میں تو پہلے ہی اپنے کپڑے تبدیل کر چکا تھا۔ ہمارے پیچھے ہی ٹھاکر چند انکل بھی نکلے۔

☆☆☆

میں اور لاجو بگٹٹ بھاگے جا رہے تھے۔ اس مقام سے تقریباً دو کلومیٹر کی دوری پر امرودوں کا ایک بہت بڑا باغ تھا۔ ہم اس میں داخل ہوئے اور پھر اس سے آگے نکلتے چلے گئے۔ یہاں سے پکی سڑک کافی دور تھی اور ہمیں اس تک پہنچنے کے لیے ابھی کافی تگ و دو کرنا تھی اور کوئی بعید نہیں تھا کہ انڈین آرمی وہاں پہلے سے موجود ہو۔ یہ دسمبر کی یخ بستہ رات تھی۔ چاندنی بھی آخری راتیں تھیں۔ ہم نے سردی سے بچاؤ کے لیے گرم چادریں لے رکھی تھیں۔ کماد کی فصل شروع ہو گئی تو ہم دونوں ایک کھال میں داخل ہو گئے۔ یہ پکا کھال تھا اور اس میں چلتے ہوئے ہمیں کوئی زیادہ مسئلہ نہیں ہو رہا تھا۔ کماد کی فصل کی کٹائی ہو رہی تھی اور بڑے زمیندار ٹرالیوں پر گنا لاد کر ملوں میں لے جاتے تھے۔ یہ ان دنوں کی بات ہے جب انڈیا اور پاکستان میں شوگر ملز اتنی زیادہ نہیں تھیں۔ اس لیے زمیندار لوگ دور دراز کا سفر کر کے بھی گنا شوگر ملز کو بیچتے تھے۔ اس وقت گنے کا ریٹ بھی مناسب تھا اور یہ گڑ بنا کر بیچنے سے زیادہ آمدنی دے جاتا تھا۔ زمیندار گڑ بنانے کے طویل اور تھکا دینے والے عمل سے بھی بچ جاتے تھے اور گڑ کی نسبت منافع بھی زیادہ کما لیتے تھے۔ مگر یہ صرف ان زمینداروں کو سوٹ کرتا تھا جن کا ٹریکٹر اپنا تھا اور ظاہر ہے یہ سہولت صرف بڑے زمینداروں

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کے پاس ہی تھی۔ چھوٹے زمیندار بے چارے اب بھی گڑھا کرنے پہنچنے پر مجبور تھے۔

کماد کے دوسرے سرے پر سنگل لنک روڈ تھا۔ ہم اس لنک روڈ سے ابھی تھوڑا سا پیچھے ہی تھے کہ ہمیں سنگل روڈ سے کسی ٹرالی ٹریکٹر کی آواز سنائی دی۔ جی ٹی روڈ ابھی کافی دور تھا اور اس تک پیدل جانا تو ویسے بھی خطرے سے خالی نہ تھا۔ اس ٹرالی میں ہم اگر سفر کر سکتے تو نہ صرف جلد جی ٹی روڈ تک پہنچ جاتے بلکہ یہ طریقہ ہمیں ملٹری والوں سے بھی محفوظ رکھتا۔ میں نے لاجونتی کو سمجھایا کہ ہمیں کیا کرنا ہے۔ اس نے میری بات سنتے ہی کہا۔

"اگر ایسے ہو سکتا ہے تو پھر ہمیں دیر نہیں کرنی چاہیے۔"

اس کے بعد ہم نے حتی المقدور اپنی رفتار تیز کر دی اور جلد ہی ٹرالی تک کا فاصلہ طے کر لیا۔ یہ کام کافی خطرناک اور رسکی بھی تھا مگر ان حالات میں جب ہماری زندگی داؤ پر لگی تھی تو یہ رسک لیے بنا کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ میں رکی ہوئی ٹرالی کے پیچھے گھس گیا۔ وہ اسٹارٹ تھی مگر ڈرائیور شاید اتر کر نزدیکی کھیت میں گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ وہاں میرا مطلوبہ سامان موجود تھا۔ ان لوگوں نے چھوٹی سی... چارپائی مضبوط لوہے کی زنجیر سے باندھ رکھی تھی اور یہی وہ چیز تھی جس کی میں اللہ پاک سے دعا کر رہا تھا۔ میں نے جلدی سے ٹرالی کے پیچھے سے نکل کر لاجونتی کو چارپائی کی موجودگی کے بارے میں بتایا۔ پھر ہم دونوں اس چارپائی پر جا کر لیٹ گئے۔ یہ لنک روڈ نیا بنا تھا اور ابھی ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہونے... سے بچا ہوا تھا۔ اگر یہ کہیں سے ٹوٹا ہوتا تو یہ ہمارے لیے انتہائی نقصان دہ تھا۔ مگر خدا کا شکر ہے کہ ہم جلد ہی جی ٹی روڈ تک بخیریت پہنچ گئے۔

اب کچھ سویرا ہو چلا تھا۔ ٹریکٹر اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا اور اس کے ساتھ ہی ہم بھی خطرے کے مقام سے دور ہوتے جا رہے تھے۔ ہمارے پیچھے جانے لاجونتی کے گھر میں کیا پیش آیا تھا۔ بہرحال اب ہماری وہاں واپسی ناممکن تھی۔ انڈین انٹیلی جنس یقیناً ہماری تلاش میں متحرک ہو چکی ہوگی اور اب تک تو وہ کئی جگہوں پر ناکے بھی لگا چکے ہوں گے۔ ان کے پانچ بندے مر چکے تھے۔ انہوں نے اپنی فورسز کو میری خطرناکی سے بھی آگاہ کر دیا ہوگا۔

اب دن نکلنا شروع ہو گیا تھا۔ ہلکی سی دھند کے بعد سورج کی سنہری کرنیں ہر سو پھیلتی جا رہی تھیں۔ موسم یقیناً بہت اچھا تھا۔ سردیوں کے موسم میں صبح کی دھوپ انسان کو بہت بھلی معلوم ہوتی ہے مگر میں اس موسم کا مزہ نہیں لے سکتا تھا۔ ٹریکٹر ٹرالی کے نیچے لٹکی اس چارپائی پر لیٹ کر سفر کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ تمام اعضا شل کر رہ جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا کہ جیسے تھوڑی ہی دیر میں ہمارے جسم کے تمام پارٹس ٹکڑوں سے الگ الگ ہو جائیں گے۔ لاجو اور میں ایک دوسرے سے ٹکرانے پر مجبور تھے۔ لاجو اب بھی اس سانحے میں گم تھی جو رات پیش آیا تھا اور جس نے اس کے باپو کی جان لے لی تھی۔ ویسے اس کا پیار بھی تو مجھ سے مثالی تھا۔

جب میں نے پہلی بار اسے اپنی حقیقت بتائی تھی تو وہ مغموم تو ضرور ہو گئی تھی مگر اس نے میرا ساتھ نہیں چھوڑا تھا اور نہ ہی مجھ سے اس کے پیار میں کمی آئی تھی بلکہ وہ مجھ پر کچھ اور بھی بھروسا کرنے لگی تھی۔

یہ وہی تھی جس نے ضد کر کے مجھے اپنے باپو سے ملوایا تھا ورنہ میں کب اس کے باپو سے ملنا چاہتا تھا۔ یہ دشمنوں کا دیس تھا اور میں جانے کیوں لاجو کے پاس اپنا دل کھول بیٹھا تھا اور یہ یونہی بے وجہ تو نہیں تھا۔ اس دن جب میری اس سے پہلی ملاقات ہوئی تھی، مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اس دن کیا سچویشن تھی۔ اس دن اگر وہ میری مدد نہ کرتی تو میں بروقت اپنے ملک تک وہ معلومات نہ پہنچا پاتا جن کی اس وقت مجاہدین کو ضرورت تھی۔ وہ وقت گزر جاتا اور ہم جانے کتنے نقصان کے بعد بھی وہ سب کچھ حاصل نہ کر پاتے جو کہ مجاہدین نے میری انفارمیشن کو دیکھتے ہوئے چند شہیدوں کے لہو سے حاصل کر لیا تھا۔ میرے پاس انڈین آرمی کے اسلحے کے ذخیرے سے متعلق کچھ مصدقہ خبریں تھیں جو کہ میں مجاہدین تک پہنچانا چاہتا تھا مگر اس دن میرے پیچھے انڈین انٹیلی جنس لگی ہوئی تھی۔ میری ایک ٹانگ میں گولی لگ چکی تھی اور میں زخمی حالت میں تھا گو کہ میں نے اپنی اس زخمی ٹانگ کو ایک رومال سے کس کر باندھ لیا تھا اور خون کا اخراج بھی نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر اس سے پہلے جب میری ٹانگ میں یہ گولی دھنسی تھی تو اس کے بعد کافی دیر تک خون بہتا رہا تھا۔ خون کی کمی نے مجھے نقاہت کا شکار کر دیا تھا۔ وہ تو خدا کا شکر ہے کہ جب مجھے گولی لگی تو اس کے فوراً بعد مجھے انڈین آرمی کی فوجی جیپ میں فرار ہونے کا موقع مل گیا تھا۔

وہ لوگ بھی میرے پیچھے جیپ پر ضرور آتے مگر اسی وقت ان کے اسلحہ خانے میں دھماکے شروع ہو گئے۔ ان دھماکوں کا سبب بھی میری ذات ہی تھی۔ جب گولی لگنے کے بعد میں ان کی جیپ میں فرار ہو رہا تھا تو دھماکے شروع ہو گئے اور

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ایک بم کا ٹکڑا ان زخمیوں کے درمیان آ کر گرا جو میرے پیچھے آنے کی کوشش کر رہے تھے۔ یہ اللہ کی طرف سے امداد نہیں کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔

بہر حال میں ان کے دفاعی امور سے متعلقہ کچھ راز چرا کر وہاں سے نکلنے میں کامیاب رہا تھا۔ یہ الگ بات کہ وہاں سے نکلتے ہوئے میری ایک ٹانگ میں دشمن کی گولی آن گھسی تھی۔ اس طرح کے کاموں میں ایسا تو ہوتا ہی رہتا ہے۔ وہ لوگ میرے پیچھے نکلے ضرور مگر اتنی دیر میں، میں ان سے کافی دور نکل چکا تھا۔ مناسب فاصلے پر پہنچتے ہی میں نے جیپ درختوں کے ایک بڑے جھنڈ میں کھڑی کی اور پیدل ہی پاکستانی سرحد کی طرف بڑھا۔ ان دنوں سرحد کے قریب قریب ہر جگہ فوجی پھیلے ہوئے تھے۔ یہ سارا ایک ریڈ زون تھا۔ خطرہ ہر جگہ گھات لگائے بیٹھا تھا۔ ایک پلس پوائنٹ یہ تھا کہ میں اس وقت انڈین فوج کی وردی میں ملبوس تھا مگر میں جانتا تھا کہ اگلے مورچوں تک میرے بارے میں خبر پہنچ چکی ہوگی مگر یہ خطرے میرا راستہ نہیں روک سکتے تھے۔ آج میرے اندر اتنا جنون بھرا ہوا تھا کہ جو بھی میرے آگے آتا جل کر خاک ہو جاتا۔ مجھے ہر قیمت پر پاکستان میں موجود دشمن کے خلاف مورچہ زن اپنے دوستوں تک پہنچنا تھا۔ مگر پاکستانی سرحد ابھی کافی دور تھی، اور ہر گزرتے لمحے کے ساتھ میری توانائیاں جواب دیتی جا رہی تھیں۔ یہ میرا جذبہ ہی تھا جو کہ مجھے زندہ رکھے ہوئے تھا ورنہ میری حالت انتہائی نازک تھی۔

میں جانے کب تک اپنے بے جان وجود کو گھسیٹتا ہوا اپنی منزل کی طرف رواں دواں رہا۔ میرے اندر ایک ہی دھن سوار تھی کہ جان جاتی ہے تو چلی جائے مگر مجھے ایک بار مجاہدین تک ضرور پہنچنا ہے۔ میرا وجود ہوش اور بے ہوشی کے درمیان لٹکا ہوا تھا۔ میرے سر میں دھماکے سے ہو رہے تھے۔ یوں لگ رہا تھا کہ میں کسی بھی لمحے گر جاؤں گا مگر مجھے آج تک سمجھ نہیں آئی کہ جانے وہ کون سی طاقت تھی جس کے سہارے میرا وجود اپنی منزل کی طرف بڑھتا جا رہا تھا۔ یقیناً یہ وہی طاقت ہے جو ہمیشہ سے حق پرستوں کا ساتھ دیتی رہی ہے۔ اچانک میں نے دیکھا کہ کھیتوں کے درمیان ایک لڑکی چارا کاٹ رہی تھی۔ وہ عجیب سی نظروں سے مجھے دیکھنے لگی۔ پھر جانے کیسے میرے وجود کو ایک ٹھوکر لگی اور میں جس کمال پر چل رہا تھا اس کی منڈیر پر بیٹھتا چلا گیا۔ آخری احساس جو مجھے ہوا وہ یہ تھا کہ وہ بچاری سی غبار میرے اوپر جھکی ہوئی کچھ کہنے کی کوشش کر رہی تھی۔

رات کا جانے کون سا پہر تھا کہ مجھے ہوش آیا۔ میں ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ میں نے دیکھا کہ میں ایک کال کوٹھری میں بند ہوں۔ میں نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو مجھے لگا کہ جیسے یہ کسی گھر کا کچن ہے۔ میرے سر میں شدید درد ہو رہا تھا۔ میری ٹانگ سوج چکی تھی۔ لگتا تھا کہ اس میں گولی کا زہر پھیل رہا ہے مگر مجھے تو ہر حال میں پاکستان پہنچنا تھا۔ اتنے میں مجھے باہر کسی کے چلنے کی آواز آئی۔ تھوڑی دیر بعد کچن کا دروازہ کھلا۔ میں نے دیکھا ہاتھ میں لالٹین لیے وہی لڑکی کھڑی تھی۔ اس نے مجھے جو نہی ہوش میں دیکھا تو کہنے لگی۔

''بھگوان کا شکر ہے کہ تمہیں ہوش آ گیا۔'' پھر اس نے لالٹین کی لو نیچی کر کے ایک جگہ پر رکھی اور باہر چلی گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ واپس آئی تو اس کے ہاتھ میں ٹرے تھی۔ اس نے ٹرے میرے قریب ہی رکھ دی۔

''سکر (شکر) کرو کہ تم انڈین فوجی نہیں ہو ورنہ آج تم ادھر کھال ہی میں پڑے مر گئے ہوتے۔ لاجونتی سے دشمنی مول لی ہے ان لوگوں نے۔ میرے بے گناہ بابو کو پکڑ رکھا ہے پچھلے ایک ہفتے سے۔ کیسی فوج ہے یہ جو اپنے ہی ملک کے لوگوں کی عزت نہیں کرتی۔ ارے میں تو کہوں کہ ایسے لوگوں کو زندہ ہی نہیں ماں کا دودھ دینا چاہیے۔ پہلے میری شمبھو بھیجر نے بابو سے یہ کہہ کر لے گئے کہ ان کے پیسے دیں گے۔ بعد میں بابو کو بھی پکڑ کے لے گئے سالے۔ میں ان کے بارے میں ان سے پوچھنے گئی تو ان کا کمانڈر الٹی مجھے ہی لاتیں مارنے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا کہ ...... مگر میں یہ سب باتیں تمہیں (تمہیں) کیوں بتا رہی ہوں۔ تم تو پاکستانی ہو۔ مگر یہ وردی تم نے کیوں ان حرامیوں والی پہن رکھی ہے؟ بابو کہتے تھے کہ آج کل ادھر پاکستانی جاسوس بھی پھر رہے ہیں تو کیا تم بھی پاکستانی جاسوس ہو؟ جب تم ادھر کھال پر گرے تو تم بھی پکار رہے تھے کہ پاکستان زندہ باد۔ مجھے لگا کہ تم بھی پاکستانی جاسوس ہو گے اور پھر میں تمہیں یہاں لے آئی۔ تمہاری حالت تو بہت جیادہ کھراب (خراب) ہے اور تمہیں تاپ (بخار) بھی بہت ہو رہا ہے۔'' اپنی ہی دھن میں جانے کیا کیا بولے جا رہی تھی۔

اس نے تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد مجھے نیم گرم دودھ میں ہلدی ملا کر پلایا۔ میرے وجود میں کچھ جان آئی تو میں نے اس سے چھری لانے کو کہا۔ چھری آگ پر گرم کرنے کے بعد میں نے اپنی ٹانگ کا آپریشن کر کے گولی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

نکالی۔ یہ ایک انتہائی تکلیف دہ عمل تھا۔ مگر اس کے کیے بنا بھی کوئی چارہ نہ تھا۔ گولی نکل جانے کی وجہ سے مجھے کافی سکون ملا۔ لاجونتی نے ایک بار پھر مجھے دودھ اور روٹی کھلائی پلایا۔ خون کا اخراج بند کرنے کے لیے میں نے ایک بار پھر ٹانگ کے متاثرہ حصے پر کس کے پٹی باندھ دی۔ اس تمام کارروائی کے دوران میں لاجونتی نے میرا بھرپور ساتھ دیا۔

وہ کافی سمجھدار اور بہادر لڑکی تھی۔ ظاہر ہے وہ اس ویرانے میں اپنے باپو کے ساتھ بچپن سے رہتی آرہی تھی تو اس میں یہ خصوصیات تو پیدا ہونی ہی تھیں۔ اس نے مجھے مزید بتایا کہ اس کے باپو کو انڈین فوجی زبردستی اپنے ساتھ لے گئے تھے۔ دراصل ان کے کمانڈر کی بجھو پر نظر پڑ گئی تھی اور وہ مجھے غلط نظروں سے دیکھنے لگا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو وہ مجھے کب کا یہاں سے اٹھوا چکا ہوتا مگر پچھلے دنوں سے مجاہدین سے زبردست لڑائی شروع ہے اور انہیں اپنی جان کی پڑی ہوئی ہے۔ وہ جونہی اس جنگ سے فارغ ہوا تو میری خیر نہیں۔

اب صورت حال یہ ہے کہ ہمارے تمام مویشی باپو دوست دکرم چند کے گھر میں بندھے ہوئے ہیں اور ہم خود بھی ان کے گھر میں پناہ گزین ہیں۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے ایک دوبار انڈین فوجی مجھے تلاش کرتے ہوئے گاؤں تک آگئے تھے اور گاؤں سے دس بارہ لڑکیاں لے گئے جبکہ میں اس وقت گاؤں سے باہر کھیتوں میں چھپی ہوئی تھی۔

"اچھا میں تمہارا بدلہ لوں گا۔" میں نے کہا۔

وہ اپنے دھن میں بتاتی چلی گئی کہ مجاہدین سے جھڑپ شروع ہونے کے بعد اس کے باپو کو بھی فوجی اٹھا کر لے گئے تو وہ غصے میں بارڈر پر جا پہنچی تھی اور کمانڈر صاحب سے ملی بھی تھی۔ کمانڈر نے اسے رکنے کا حکم دیا اور کہا کہ وہ ایک رات یہاں رہے تو صبح اسے اس کے باپو کے ساتھ واپس بھیج دیا جائے گا مگر لاجونتی کمانڈر کی نگاہوں میں چھپی ہوس کو پڑھ چکی تھی۔ وہ جھٹکے سے وہاں سے کھسک آئی آتے ہوئے بھی اس پر کسی نے کوئی توجہ نہ دی۔

آج وہ ادھر گاؤں سے اپنے مویشیوں کے لیے چارا لینے آئی تھی کیونکہ پچھلے دنوں سے باپو کا دوست دکرم بیمار تھا۔ جب اس نے مجھے انتہائی بری حالت میں زمین پر گرے دیکھا تو وہ صورت حال جاننے کے لیے آگے بڑھی اور پھر میرے منہ سے پاکستان کے الفاظ سن کر وہ مجھے گھسیٹ کر گھر لے آئی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ بہت بہادر اور باہمت لڑکی تھی۔

میرا کامیاب آپریشن ہو چکا تھا اور اب میں انڈین بارڈر کراس کر کے وہ معلومات اپنے دوستوں تک پہنچانا چاہتا تھا جس کی مجاہدین کو اشد ضرورت تھی۔ بارڈر یہاں سے پندرہ کلومیٹر کی مسافت پر تھا اور میری جسمانی حالت تو یہ تھی کہ میں لنگڑا کر چلنے سے بھی قاصر تھا۔ بخار اور درد کی اذیت نے مجھے ادھ موا کر رکھا تھا مگر اس وقت دنیا کی کوئی بھی طاقت میرے جذبے کے آگے پل نہیں باندھ سکتی تھی۔ لاجونتی میرے چہرے کو دیکھ کر میرے خیالات پڑھ چکی تھی، کہنے لگی۔

"باہر میرا گھوڑا تیار کھڑا ہے۔ آپ جہاں بھی جانا چاہو جا سکتے ہو۔ مگر مجھے معلوم ہے تم کہاں جاؤ گے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ آج تم کسی کے کہنے پر یہاں رکو گے بھی نہیں۔ تمہاری آنکھوں کی لالی بتاتی ہے کہ تم آگ اور خون سے کھیلنے والے کھلاڑی ہو۔ مگر آج کی اس رات میں آپ کو آپ کے خدا کا واسطہ دیتی ہوں کہ میری ایک بات مان لو۔"

"کون سی بات!"

"مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں تمہارے بہت کام آؤں گی کیونکہ میں یہاں پچھلے کئی سالوں سے رہ رہی ہوں اور یہاں کے چپے چپے سے واقف ہوں اور پھر دو دن پہلے میں ان کے مورچوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آرہی ہوں میں ان کی موجودہ دفاعی پوزیشنوں سے بھی اچھی طرح واقف ہوں۔ تمہیں بارڈر کراس کراتے ہی میں واپس لوٹ آؤں گی۔"

"لاجونتی! تم ایک بہادر اور باہمت لڑکی ہو مگر میں نہیں چاہتا کہ تمہاری عصمت پر کوئی داغ آئے۔ انڈین فوج بھیڑیوں کا غول ہے اور میں نہیں جانتا کہ آنے والا وقت اپنے ساتھ کیا کیا رنگ لے کر آئے گا۔ بہتر تو یہی ہے کہ تم اپنے گھر چلی جاؤ۔ میرے اللہ نے چاہا تو اس جنگ کے بعد تمہیں کوئی تنگ نہیں کرے گا۔" میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی۔

"ریحان اگر آپ برا نہ مانیں تو ایک بات کہوں؟" اس نے استفساریہ لہجے میں کہا۔

"ہاں کہو لاجونتی!"

"کیا یہ پاگل پن نہیں جو تم کر رہے ہو۔ تمہارا حال تو یہ ہے کہ تم اس وقت سانس بھی بڑی مشکل سے لے رہے ہو۔ مجھے تو لگتا ہے کہ تم راستے میں ہی کہیں گھوڑے پر بیٹھے بیٹھے بے ہوش ہو جاؤ گے اور تمہاری ساری محنت ایک ضد کی نذر ہو جائے گی۔ تم میری بات سمجھتے کیوں نہیں؟ مجھے اپنے باپو کو چھڑوانا ہے۔ وہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کر رہے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوں۔ مجھے ایک نہ ایک دن یہ رسک تو لینا ہی ہے تو کیوں نہ میں ابھی سے اس کی پریکٹس شروع کردوں۔ ویسے بھی میں تمہاری پابند نہیں ہوں۔ میں اپنی مرضی کی مالک ہوں اور ہاں اگر تمہیں خودکشی کا شوق ہے تو الگ بات ہے۔ چلو اٹھو! اچھے بچوں کی طرح میرے ساتھ چلو ورنہ............"

اور پھر مجھے چاروناچار اس کی بات ماننا پڑی۔

یہ سفید رنگ کا بہترین گھوڑا اپنے مالک کے مزاج سے خوب واقف تھا۔ لاجونتی میری کمر میں بانہیں ڈالے میرے پیچھے موجود تھی۔ ہمارا گھوڑا برق رفتاری سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں تھا۔ میرے اندر ایک عجب سا جذبہ ٹھاٹھیں ماررہا تھا۔ ہم کافی دور نکل آئے تھے کہ اچانک گھوڑے نے ٹھوکر کھائی اور ہم دونوں گر پڑے۔ گھوڑا لڑھکتا ہوا دور جا گرا تھا۔

اب اس لنگڑے گھوڑے پر سفر کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس لیے ہم پیدل چل پڑے۔

☆☆☆

یہ بالکل ویران علاقہ تھا۔ ٹریفک بھی ابھی کم ہی تھا۔ صبح صبح کا وقت تھا۔ ہم گرم چادروں میں لپٹے ٹرالی کے نیچے بندھی لوہے کی مضبوط چارپائی پر بڑی مشکل سے لیٹے ہوئے تھے۔ ٹرالی رکی تو میں نے نیچے دیکھا کہ ایک آدمی قریبی کھیتوں میں شاید رفع حاجت کے لیے جارہا تھا۔ یہ یقیناً اس ٹرالی کا ڈرائیور تھا۔ اچانک اس نے ٹریکٹر پر موجود اپنے ساتھی کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ "مل قریب ہی ہے ذرا نیچے اتر کر ٹریکٹر ٹرالی کے ٹائر وغیرہ چیک کرلو، وہاں جانے کتنی دیر رکنا پڑے، جلدی کرو، میں ابھی آتا ہوں۔"

ٹریکٹر پر موجود لڑکے نے کہا۔ "ابھی چیک کرلیتا ہوں استاد۔" یہ کہتے ہی وہ ٹرالی سے نیچے اترا اور ٹرالی کی طرف بڑھا۔

یہ ایک نئی مصیبت تھی۔ لازمی بات ہے وہ ٹائر چیک کرتے تو نیچے بھی دیکھتا اور جب ہم اسے نظر آجاتے تو جانے کیا ہوتا۔ نہیں پتا یہ تھا کہ ہم پہلے ہی چلتی ٹرالی سے نیچے اتر جاتے مگر اب کیا ہوسکتا تھا مگر خیریت گزری کہ اس نے ٹائر چیک کرتے وقت نیچے زیادہ غور سے نہیں دیکھا۔ موقع پاتے ہی ہم جلدی سے ٹرالی کے نیچے سے نکلے اور روڈ پر مخالف سمت چلنے لگے۔ خدا کا شکر ہے کہ اس وقت روڈ سنسان تھا اور کسی نے ہمیں ٹرالی کے نیچے سے نکلتے ہوئے نہیں دیکھا۔ ہم دونوں کھیتوں میں داخل ہوگئے اور کھیتوں سے ہوتے ہوئے ایک بار پھر روڈ کے نزدیک آگئے۔ اب ہمیں شہر جانے والی کسی گاڑی کا انتظار تھا کیونکہ اب سرحد پر سکیورٹی کی صورت حال تو کافی خطرناک ہوتی اس لیے میں نے چلتے ہوئے ہی یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ کچھ عرصے کے بعد کسی اور ذریعے سے یہاں سے نکلنے کی کوشش کروں گا۔

ہماری منزل یہاں سے بمبئی تھی۔ اگر ایک بار ہم وہاں پہنچ جاتے تو وہاں سے کسی لانچ کے ذریعے نکلا جاسکتا تھا مگر ابھی فوری مسئلہ یہاں سے نکلنے کا تھا۔ میں روڈ پر کھڑا کسی گاڑی کا انتظار کررہا تھا۔ سردیوں کی وجہ سے میں نے چادر کی بکل ماری ہوئی تھی۔ لاجونتی مجھ سے تھوڑی دور روڈ کے ساتھ ساتھ اگے درختوں کی اوٹ میں چھپ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ یہ صرف اس لیے کیا تھا کہ اگر انڈین فوجی آ بھی جائیں تو انہیں فوری طور پر شک نہ ہو۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ روڈ پر شہر جانے والی سمت میں ایک ٹرک جارہا تھا۔ میں نے اللہ کا نام لے کر اسے ہاتھ سے رکنے کا اشارہ کیا۔ شاید یہ قبولیت کا وقت تھا۔ اس نے مجھے لفٹ دے دی۔ ڈرائیور اکیلا ہی تھا۔ ٹرک میں سبزیاں لدی ہوئی تھیں۔ میں نے اسے ایک دکھ بھری کہانی سنائی اور ایک تگڑی رقم کا لالچ بھی دیا اور آخرکار وہ مان ہی گیا۔

راستے میں کئی دفعہ چیکنگ ہوئی مگر سکھ ڈرائیور نے ہمیں سبزیوں کے درمیان یوں چھپا دیا تھا کہ ہمیں سانس لینے میں بھی کوئی دشواری نہ تھی اور ہم کسی کو نظر بھی نہیں آسکتے تھے۔ سکھ ڈرائیور نے شہر پہنچانے کا جو وعدہ کیا تھا وہ پورا کیا۔ وہاں پہنچ کر لاجونتی نے بھی ایک بھاری رقم اس کے حوالے کرنا چاہی۔ مگر اس نے اپنا طے شدہ کرایہ ہی لیا۔

یہاں سے ہم اپنے مطلوبہ بندے کے پاس پہنچ گئے۔ یہ سب اتنا آسان ہرگز نہ تھا مگر یہ سب اس کی دین ہے، جب وہ ذات کسی پہ کرم کرتی ہے تو بند دروازے خودبخود کھلتے چلے جاتے ہیں اور آخرکار ہم ایک ماہ کے بعد پاکستان پہنچ ہی گئے۔ لاجونتی نے یہاں آتے ہی اسلام قبول کرلیا اور مجھ سے نکاح کے بعد تو وہ اتنا خوش ہوئی کہ جیسے صدیوں کے بعد کوئی بچھڑا اپنوں سے ملے اور خوشی سے پھولا نہ سمائے۔

میں اب بھی کبھی کبھی مقبوضہ علاقے میں وہاں والوں کی مدد کے لیے جاتا رہتا ہوں کہ یہ ہم سب پر فرض ہے اس لیے کہ انڈیا نے نہ صرف وہاں کے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ بلکہ اس کے ایجنٹ یہاں آکر دہشت گردی بھی کر جاتے ہیں۔ اس کا جواب تو دینا ضروری ہے ناں!

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

سمجھوتا

مکرمی جناب
سلام تہنیت!
یہ سرگزشت میری نہیں ہے، میرے ایک دوست کی ہے۔ اس کی حالاتِ زندگی ایسی ہے کہ اس پر فلم بنائی جاسکتی ہے۔ میں نے اس کی روداد کو اسی کی زبانی لکھا ہے۔ یقیناً یہ سرگزشت قارئین کو پسند آئے گی۔

عمران قریشی
(کوئٹہ)

یہ مہینے کی شروعات کی بات ہے۔ میں نے تمام دن کی مصروفیات کو نظرانداز کرتے ہوئے رات دس بجے دکان بند کرنے کے بعد راشن کے تھیلوں کو ہاتھوں میں تھاما اور اماں جی کے گھر کا رخ کیا۔ دروازے پر دستک دینے پر دروازہ ہاشی نے کھولا۔ مجھے سامنے کھڑے دیکھ کر اس نے میرے ہاتھوں سے تھیلے لینے کی کوشش کی لیکن میں نے اسے نظرانداز کرتے ہوئے آگے بڑھ کر تھیلوں کو باورچی خانے میں رکھ دیا۔ ساتھ والے کمرے سے اماں بی کی آواز سنائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

دی۔" احمد ...... یہ تم ہو؟"

میں نے جواب دیا۔ "جی...... راشن دینے کے لیے آیا ہوں۔"

اماں جی بولیں۔ "جانے سے پہلے چند منٹ میری بات سنتے جاؤ۔"

میں ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ کمرے میں دو ٹوٹی ہوئی چارپائیوں اور بوسیدہ بستروں کے علاوہ مزید کچھ نہیں تھا۔ میں خاموشی سے سامنے والی چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اماں جی میری جانب دیکھتے ہوئے پرتشویش لہجے میں بولیں۔ "کھانا کھایا ہے تم نے؟"

میں نے انکار میں سر ہلا دیا۔ اماں جی نے کمرے کے دروازے میں کھڑی ہوئی عاشی کو اشاروں کے ذریعے سمجھایا کہ وہ میرے لیے کھانے کا بندوبست کرے۔

عاشی باورچی خانے میں چلی گئی۔ تب اماں جی بولیں۔ "یہ کیا حالت بنا رکھی ہے۔ کپڑے میلے ہو رہے ہیں، شیو بڑھی ہوئی اور بال بکھرے ہوئے۔ اتنا بھی کیا کام کہ اپنی جانب توجہ دینے کا وقت بھی نہ رہے۔ کس کے لیے یہ سب کچھ کر رہے ہو؟"

میں نے حیرت بھری نگاہوں سے اماں جی کی جانب دیکھا۔ آج سے پہلے انہوں نے ایسی بات کبھی نہیں کی تھی۔ میں نے جواب دیا۔ "کام کے دوران میں توجہ دینے کا وقت نہیں ملتا اور پھر حلیے کی جانب توجہ کس کے لیے دوں۔ آگے پیچھے کوئی بھی موجود نہیں ہے۔"

چند لمحے خاموش رہ کر کچھ سوچتے رہنے کے بعد اماں جی متزلزل لہجے میں بولیں۔ "آگے پیچھے تو ہمارے بھی کوئی موجود نہیں ہے۔ میں بڑھاپے کی ماری آج ہوں کل نہیں۔ عاشی بھری دنیا میں اکیلی رہ جائے گی۔ اسے تنہا دیکھ کر دل ہی دل میں کڑھتی رہتی ہوں۔ اپنی زندگی میں اس کے ہاتھ پیلے کر دینا چاہتی ہوں۔"

میں نے بے چینی کے ساتھ چارپائی پر پہلو تبدیل کیا۔ پھر پریشان لہجے میں پوچھا۔ "کوئی لڑکا ہے آپ کی نظر میں؟"

اماں جی افسردہ لہجے میں بولیں۔ "تمہارے علاوہ کوئی بھی نہیں ہے لیکن بھلا تم کیوں عاشی سے شادی کرنے لگے۔ کہاں تم اور کہاں وہ۔ تم پڑھے لکھے اور صاحب حیثیت ہو۔ وہ جاہل ان پڑھ، گونگی اور مجبور ولاچار ہے۔ تم دونوں میں کوئی بھی بات مشترک نہیں ہے۔"

میں نے بے تابی سے آگے بڑھ کر اماں جی کے دونوں ہاتھوں کو اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔ وہ بولے چلی جا رہی تھیں۔ "پھر بھی اگر تم اسے اپنانے کی ہامی بھر لو تو میں اسے اپنی خوش نصیبی مانتے ہوئے خدا کا شکر ادا کروں گی۔"

میں نے بے اختیار ان کے دونوں ہاتھوں کو اپنی آنکھوں سے لگا لیا۔ پھر بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ "آپ کیسی باتیں کر رہی ہیں۔ آپ کا داماد بننا میرے لیے قابل فخر بات ہے اور وہ تو کوئی خوش نصیب ہوگا، جسے عاشی جیسی بیوی کا ساتھ ملے۔"

اماں جی بولیں۔ "وہ خوش نصیب تم ہو۔ میں آج سے تمہیں اپنا داماد ماننے کو تیار ہوں۔ اگر تمہیں اعتراض نہ ہو۔"

میں نے خوشی سے مغلوب لہجے میں جواب دیا۔ "مجھے بھلا کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ آپ عاشی سے اس کی مرضی ضرور دریافت کر لیجیے گا۔ نہ جانے اس کی رائے میرے متعلق کیا ہے؟"

اماں جی نے اثبات میں سر ہلا دیا اور میں کھانا کھانے کے بعد اپنے گھر چلا آیا۔

آج سے ایک سال پہلے میں نے ماں باپ کی وفات کے بعد تعلیمی کیریئر کو خیرباد کہتے ہوئے چھوٹی سی پرچون کی دکان کا آغاز کیا تھا۔ میرے پاس سرمایہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اماں کے چھوڑے ہوئے چند زیورات تھے جنہیں فروخت کرنے کے بعد بھی اتنی رقم کا انتظام نہ ہو سکا جس سے محدود پیمانے پر دکان داری کا آغاز کیا جا سکتا۔ ایسے حالات میں میرے بچپن کا دوست عدیل کام آیا۔ اس نے نہ صرف میرے لیے رقم کا انتظام کیا بلکہ محلے کے درمیان موجود ایک دکان کرائے پر بھی دلا دی۔ کچا پکا مکان میری واحد ملکیت تھا۔ اس لیے گزر بسر احسن طریقے سے ہونے لگی۔ دالیں، چاول، چینی، پتی جو سے جتنا ہو سکا میں نے دکان میں ڈال دیا اور اپنا کل وقت دکان کے لیے وقف کر دیا۔

محلے کی دکان تھی۔ میرے حسن اخلاق اور مناسب ریٹس کو مدنظر رکھتے ہوئے چند ہی ایام میں دکان محلے داروں خصوصاً عورتوں اور لڑکیوں کی توجہ کا مرکز بننے لگی۔ کام دن بدن بڑھنے لگا۔ میں جائز منافع لینے کی خاطر قریبی منڈی تک آنے جانے کے لیے سائیکل کا استعمال کرتا تھا۔ اس طرح بس یا پھر گدھا گاڑی پر سامان لانے کے جھنجٹ سے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

آزادی پالیتا تھا۔ معاوضہ الگ بچ جاتا تھا۔ گدھا گاڑی کے معاوضے کی بچت کو میں مدنظر رکھتے ہوئے اپنی دکان کی اشیاء دوسری دکانوں کی نسبت کم رکھتا تھا۔ یوں دکان اچھی چلنے لگی۔ جن اوقات میں مجھے بازار جانا ہوتا تھا ان اوقات میں عدیل دکان پر بیٹھتا تھا۔ مجھے سرمائے کی کمی کی بدولت تقریباً ہر روز ہی بازار جانا ہوتا تھا۔ بازار جانے سے پہلے میں حفظ ماتقدم کے طور پر گنجائش کی تفصیل اور جہاں تک ہو سکے سامان کی مقدار کو بھی ذہن نشین کر کے جاتا تھا۔ بہر حال انہی دنوں میری دکان پر گوری عاشی نے آنا جانا شروع کر دیا۔ وہ زیادہ خوب صورت نہیں تھی لیکن مناسب خدوخال کی بدولت جلد ہی سامنے والے کی توجہ کا مرکز بن جاتی تھی۔ مجھے اپنے متعلق کچھ خاص خوش فہمی نہیں تھی۔ میرے چہرے پر موجود پھلبہری کے داغ اور عام نقوش کسی بھی لڑکی کو اپنی جانب متوجہ کرنے کے لیے ناکافی تھے۔ اس لیے عاشی نے بھی مجھے نظر انداز کرنا شروع کر دیا۔ میں نے بھی زیادہ توجہ نہ دی۔ چند دنوں کے بعد ایک دوپہر جب میں دکان میں کھانا کھانے کے بعد فارغ ہوا تب اماں جی جن کا نام بختاور تھا دکان میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے سلام دعا کے بعد مجھ سے درخواست کی کہ وہ مہینے کا راشن مجھ سے ادھار میں اٹھانا چاہتی ہیں۔ مہینے کے آخر میں وہ تمام رقم ادا کر دیں گی۔

میں نے چند لمحے سوچ و بچار کے بعد ہامی بھری اور وہ مختصر راشن لے کر اپنے گھر چلی گئیں۔ اماں جی محلے والوں کے گھر کا کام کرنے کے علاوہ کپڑے سی کر گزارا کرتی تھیں۔ عاشی ان کی اکلوتی اولاد تھی۔ یوں ان کے گھر میرے آنے جانے کا آغاز ہو گیا۔ میں مہینے کے راشن کے علاوہ عام دنوں میں بھی سامان ان کے گھر پہنچانے کے لیے آنے جانے لگا۔

اماں جی مجھے بہت عزت و احترام کا درجہ دیتی تھیں۔ اکثر مجھے کھانے پر روک لیا کرتی تھیں لیکن عاشی کی نگاہوں میں ہمیشہ سرد مہری کی پرچھائیاں رقص کرتی رہتیں۔ وہ میری جانب دیکھنا تو در کنار ساتھ بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتی تھی۔ ان باتوں کے علاوہ اماں جی کاروبار کے لحاظ سے میرے لیے مفید تھیں۔ وہ جتنا بھی سامان ادھار لے جاتی تھیں پہلی تاریخ کو بغیر کسی حیل و حجت قیمت ادا کر دیتی تھیں۔ چند دنوں کی آشنائی کے بعد اماں جی نے مجھے سمجھانا شروع کر دیا کہ مجھے عدیل کی دوستی کو خیر باد کہہ دینا چاہیے۔ وہ اچھا انسان نہیں ہے۔ دکان کے لیے نقصان دہ ثابت ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اس کی غیر اخلاقی حرکتوں اور بدکرداری کی وجہ سے دکان کے گاہک بھی متاثر ہو سکتے ہیں۔ میں نے ہامی بھرتے ہوئے انہیں یقین دلایا کہ میں ایسا ضرور کروں گا لیکن یقین دہانی کے باوجود بھی میں ایسا نہیں کر سکا کیونکہ دکان میں آدھے سے زیادہ سرمائے کا مالک عدیل تھا۔ مجھ پر اس کے علاوہ بھی بہت سے احسانات تھے جنہیں میں چاہنے کے باوجود بھی فراموش نہیں کر سکتا تھا۔

بہر حال ہماری شادی نہایت سادگی کے ساتھ ہو گئی۔ عاشی دلہن بن کر میرے گھر میں آ گئی۔ میری زندگی مکمل ہو گئی۔ من چاہے ساتھی کا ساتھ اور اس کی معیت میں گزرنے والے سنہرے دن میں انہیں کبھی بھی فراموش نہیں کر پاؤں گا۔ چند دنوں کی رفاقت کے دوران میں عاشی کو اشاروں اور ہونٹوں کی حرکت کے ذریعے اپنے مقاصد سے باخبر کرنے میں میں نے مہارت حاصل کر لی۔ ہم بہت سی باتیں کہے بولے بغیر ہی ایک دوسرے کو سمجھا دیا کرتے تھے۔ وہ آئیڈیل شریک حیات ثابت ہو رہی تھی۔ صبح سویرے اٹھنے کے بعد وہ میرے لیے پانی گرم کرتی۔ میں نہانے کے لیے جاتا تب وہ میرے کپڑے استری کرتی، بوٹ پالش کرتی، پھر میرے انتظار میں بستر پر بیٹھ جاتی۔ باتھ روم سے باہر نکلنے کے بعد میں کپڑے تبدیل کرتا۔ پھر ناشتا کرنے کے لیے قریبی ہوٹل کا رخ کرتے۔ وہ اکثر اشاروں کے ذریعے میرے پھلبہری کے داغوں کی جانب اشارہ کرتے ہوئے پوچھتی کہ یہ چہرے پر کیوں ہیں؟ میں سرد آہ بھر کر خاموش ہو جاتا تھا۔ اسے کچھ بھی بتانا میرے اختیار سے باہر تھا۔ میں خود بھی نہیں جانتا تھا کہ یہ کب اور کیوں میرے چہرے پر نمودار ہوئے تھے۔ ہاں جواب دینے کی بجائے میں اس سے یہ سوال ضرور پوچھتا تھا کہ کیا تمہیں یہ نشان پریشان کرتے ہیں۔ مگر وہ جواب دینے کی بجائے خاموش ہو جاتی تھی۔

مجھے اچھی طرح معلوم تھا کہ میری بدصورتی اسے ایک آنکھ نہیں بھاتی تھی۔ شاید وہ حسن پرست تھی۔ یہ جان کر میں نے اپنے ظاہری رکھ رکھاؤ پر توجہ دینی شروع کر دی۔ رہی سفید داغوں کی بات تو انہیں دور کرنا میرے اختیار سے باہر تھا۔ ان داغوں کے ساتھ اسے سمجھوتا کرنا ہی تھا۔ اس بات کے علاوہ اس میں اور کوئی کمی نہیں تھی۔ ایک ہفتہ کیسے گزر گیا مجھے پتا ہی نہیں چلا۔ ایک صبح جب میں سو کر اٹھا تب عاشی کی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

طبیعت کو ناساز پایا۔ اسے چکر آرہے تھے۔ وقفے وقفے سے اس نے دو تین دفعہ قے بھی کی تھی۔ میں پریشان ہوگیا۔ ساتھ کے گھر والوں نے مجھے ایک لیڈی ڈاکٹر کا ایڈریس دے کر عاشی کو وہاں لے جانے کی نصیحت کی۔ یوں ہم دونوں قریبی اسپتال میں بیٹھنے والی لیڈی ڈاکٹر کے پاس چلے آئے۔ ڈاکٹر نے مختصر چیک اپ کے بعد مجھے خوش خبری سنائی کہ میں باپ بننے والا ہوں۔ میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ لیڈی ڈاکٹر بولے چلے جارہی تھی۔ "یقیناً آپ دونوں نے پہلے بھی چیک اپ کروایا ہوگا۔ حمل کی مدت دو ماہ سے زیادہ تجاوز کرنے لگی ہے۔ اس لیے احتیاط کی ضرورت زیادہ ہے۔ میں کچھ ادویات لکھ کر دیتی ہوں۔ مستقل مزاجی کے ساتھ استعمال کیجیے گا۔"

مجھے اپنے سر پر بم گرتا ہوا محسوس ہوا۔ ہماری شادی کو بمشکل ایک مہینا ہوا تھا لیکن لیڈی ڈاکٹر کا کہنا تھا کہ حمل دو مہینے پرانا ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ نکلتا تھا کہ عاشی شادی سے پہلے ہی حاملہ تھی۔ دوسرے الفاظ میں بچہ میرا نہیں تھا۔ اس کا باپ کوئی اور تھا۔ میں نے ساتھ بیٹھی ہوئی عاشی کی جانب دیکھا۔ وہ خاموش بیٹھی اپنے پاؤں کی جانب دیکھے چلی جارہی تھی۔ اس کا چہرہ ہر قسم کے تاثرات سے عاری تھا۔ میں نے گڑبڑائے ہوئے انداز میں لیڈی ڈاکٹر کی جانب دیکھتے ہوئے مرے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ "ڈاکٹر صاحبہ آپ کو شاید غلط فہمی ہورہی ہے۔ حمل اتنا زیادہ پرانا نہیں ہوسکتا۔ ہماری شادی کو صرف ایک ماہ ہوا ہے۔"

لیڈی ڈاکٹر نے ناگوار انداز میں میری جانب دیکھتے ہوئے جواب دیا۔ "اگر آپ کو میری قابلیت پر شک ہے تو قریب ہی موجود لیبارٹری سے چیک اپ کروا سکتے ہیں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں۔"

اس نے ادویات کی پرچی میرے ہاتھوں میں تھما دی اور میں عاشی کے ہمراہ اٹھ کر لیبارٹری کی جانب چلا آیا۔ الٹراساؤنڈ کی رپورٹ نے رہے سہے شکوک کا خاتمہ کردیا۔ وہ بچہ واقعی میرا نہیں تھا۔ میں نے اشاروں کے ذریعے عاشی سے پوچھنے کی کوشش کی تھی۔ تب اس نے نہایت ڈھٹائی کے ساتھ لاعلمی کا اظہار کیا۔ میرے غصے کی انتہا نہ رہی۔ اس کے ساتھ مار پیٹ کرنا فضول تھا۔ اس لیے میں خاموشی کے ساتھ گھر چلا آیا۔ اماں جی نے جلد واپس آنے کی وجہ دریافت کی۔ تب میں درشت لہجے میں بولا۔

"عاشی ماں بننے والی ہے اور حمل دو مہینے پرانا ہے۔ آپ کو یقیناً حمل کے متعلق معلوم تھا اور شاید آپ نے اپنے سر سے بوجھ اتارنے کی خاطر مجھے بتانا گوارا نہیں کیا اس لیے خاموشی کے ساتھ اپنے بوجھ کو میرے کاندھوں پر منتقل کردیا۔"

اماں جی خاموش ہوگئیں۔ ان کے چہرے پر بے چارگی اور لاچاری کی ایسی کیفیت نمودار ہونے لگی جسے دیکھ کر مجھے اپنے رویے پر ندامت محسوس ہونے لگی۔ اماں جی نے میری بدلتی ہوئی کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے فوراً انداز بدلا اور آہستہ آہستہ ہچکیاں لیتے ہوئے رونا شروع کردیا۔ اور ساتھ ہی ساتھ بولتی چلی جارہی تھیں۔

"غلطی یقیناً میری ہی تھی۔ دو مہینے پہلے جب مجھے معلوم ہوا کہ وہ ماں بننے والی ہے تب مجھے اسی وقت اسے زہر دے کر مار دینا چاہیے تھا۔ ممتا کے ہاتھوں مجبور ہوکر میں ایسا نہ کرپائی۔ لاکھ پوچھنے پر بھی گونگی لڑکی نے اس بے غیرت کا نام نہیں بتایا جس کے ہمراہ وہ منہ کالا کرکے آئی تھی۔ ان دنوں تمہارا گھر میں آنا جانا بڑھتا جارہا تھا مجھے اور تو کچھ سجھائی نہیں دیا میں نے تمہارے ساتھ بات چیت کرنے کے بعد اس منحوس کی شادی تمہارے ساتھ کردی۔ میرے خیال کے مطابق شادی کے بعد تم اس بات کو نہیں جان پاؤ گے کہ بچہ تمہارا ہے یا پھر کسی اور کا۔ لیکن لیڈی ڈاکٹر نے پول کھول دیا۔"

میں سر پکڑ کر چارپائی پر بیٹھ گیا اور اس وقت کو کوسنے لگا جب میں نے اماں جی کے گھر آنا جانا شروع کیا تھا۔ وہ بولے چلی جارہی تھیں۔ "میرے بچے تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے اگر تمہیں الجھن محسوس ہورہی ہے تب بچے کو گرا دیتے ہیں۔"

میں نے جھنجلاتے ہوئے لہجے میں جواب دیا۔ "اماں جی خدا کے واسطے مجھے کچھ دیر کے لیے اکیلا چھوڑ دیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔"

وہ میری جانب دیکھتے ہوئے کمرے سے باہر نکل گئیں۔

دوسرے دن میں نے عبدالباسط سے اس معاملے میں رائے طلب کی۔ اس نے تمام معاملہ تفصیل کے ساتھ سننے کے بعد غصیلے لہجے میں جواب دیا۔ "قصوروار اماں جی ہیں۔ انہیں تم سے کچھ بھی چھپانا نہیں چاہیے تھا۔ اب بھلا کیا ہوسکتا ہے۔ بچے کو گرانا ممکن نہیں ہے۔ وہ بڑا ہوچکا ہے۔ رہی عاشی کی بات...... وہ معذور اور بھولی بھالی لڑکی ہے۔ کسی اوباش کے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

بہکاوے میں آکر پھسل گئی ہوگی۔ تم درگزر کر دو۔ حالات سے سمجھوتا کرنے میں ہی بہتری ہے۔"

وہ ٹھیک ہی کہہ رہا تھا۔ اب اس کے علاوہ مزید کیا بھی کیا جا سکتا تھا کہ آنے والے وقت کا انتظار کیا جاتا لیکن میں نے دل میں تہیہ کر لیا کہ میں اس لڑکے کو تلاش کر کے رہوں گا جس نے میری اور عاشی کی زندگی میں زہر گھولا ہے۔ میں اسے بھی سکون کی زندگی گزارنے نہیں دوں گا۔

بہرحال ایک ڈیڑھ ہفتے کے لیے دکان بند رہی تھی۔ اچھا خاصا نقصان ہوا تھا۔ میں نے دوبارہ تندہی کے ساتھ محنت شروع کر دی۔ ایک مہینا جانفشانی کے ساتھ محنت کرنے کے بعد دکان نے دوبارہ جان پکڑنی شروع کی۔ تب میں نے اسے بڑھانے کے متعلق غور و خوض شروع کیا۔ ہمارے محلے میں کولڈ ڈرنک اور جوس کی بہت ڈیمانڈ تھی۔ لوگوں کو کولڈ ڈرنک کی تلاش میں محلے سے باہر جانا پڑتا تھا۔ میری قسمت اچھی تھی۔ انہی دنوں کمپنی کا ایریا منیجر وزٹ کرتے ہوئے میری دکان پر چلا آیا۔ اس نے مجھ سے کولڈ ڈرنک نہ رکھنے کی وجہ دریافت کی۔ تب میں نے اسے بتایا کہ میرے پاس ڈیپ فریزر موجود نہیں ہے۔ اس نے مجھ سے شناختی کارڈ کی کاپی، مع بجلی کے بل کے ہمراہ مانگی۔ میں نے فوراً شناختی کارڈ اور بجلی کے بل کی کاپی اس کے ہاتھوں میں تھما دی۔ وہ مجھے دلاسا دیتے ہوئے چلا گیا۔

میں عاشی سے بدظن ہو چکا تھا۔ گھر جانے کا میرا دل نہیں کرتا تھا اس لیے زیادہ سے زیادہ وقت دکان میں ہی گزارتا تھا۔ اس کی جسمانی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے اماں جی نے ہمارے گھر میں رہنا شروع کر دیا تھا لیکن ایک بات جو موجودہ مسئلے کے بعد میں نے محسوس کی تھی وہ یہ تھی کہ عاشی نے اب میرا زیادہ خیال رکھنا شروع کر دیا تھا۔ میں دوپہر کا کھانا دکان میں ہی کھاتا تھا۔ وہ روز ڈھائی بجے کھانے کے ٹفن کے ہمراہ دکان پر چلی آتی تھی۔ میں اسے ایسا کرنے سے منع کرتا تھا لیکن وہ باز نہیں آتی تھی۔ رات کو جب میں دکان بند کر کے تھکا ہارا گھر واپس جاتا تب وہ کھانے پر میری منتظر ہوتی تھی۔ ہم دونوں خاموشی کے ساتھ کھانا کھا لیا کرتے تھے۔ پھر وہ چارپائی پر میرے پہلو میں بیٹھ جاتی تھی اور جب تک میں سو نہیں جاتا تھا وہ میری ٹانگیں دباتی رہتی تھی۔ مجھے اس پر ترس آنے لگا اور میں نے اس غلطی کو معاف کرنے کے بعد دوبارہ پیار و محبت کے رشتے کو استحکام دینے کے لیے کوششیں شروع کر دیں۔ عدیل نے ان دنوں دکان پر آنا کم کر دیا تھا۔ اس کے بچپن کا دوست امریکا میں نوکری کر رہا تھا۔ وہ عدیل کو باہر بلانا چاہتا تھا۔ باہر جانے کے لیے کاغذات کی ضرورت تھی۔ وہ اس کے پاس تھے نہیں...... اس لیے وہ دن رات کاغذات کی تکمیل کے لیے دفتروں کے چکر کاٹ رہا تھا۔ میری بھی اس کے ساتھ تفصیلاً بات چیت ہوئی تھی۔ اس نے مجھے بھی ہمراہ چلنے کی پیش کش کی لیکن میں نے صاف انکار کر دیا۔ انہی دنوں کمپنی والوں کی جانب سے ڈیپ فریزر میری دکان پر پہنچا دیا گیا۔ میں نے اظہار تشکر کے طور پر کمپنی سے اچھا خاصا مال اٹھایا اور کولڈ ڈرنک کا افتتاح کر دیا۔ کام مزید سے مزید بہتر ہونے لگا۔ اب میرے پاس سر کھجانے کا بھی وقت نہیں رہا تھا۔ نتیجتاً مہینے کے آخری دنوں میں کھاتوں وغیرہ کے حساب کتاب کے بعد تگڑی رقم منافع کے طور پر حاصل ہونے لگی۔ میں نے قریبی بینک میں اکاؤنٹ کھلوا لیا اور رقم وہاں جمع کروانی شروع کر دی۔ عاشی کا حمل پانچ مہینے کا ہونے والا تھا۔ وہ اب زیادہ تر آرام کرتی تھی۔ ڈاکٹر نے اسے زیادہ کام کاج سے منع کیا تھا۔ اماں جی میرے لاکھ منع کرنے کے باوجود بھی صبح کے وقت لوگوں کے گھر کام کرنے چلی جاتی تھیں۔ ایسے اوقات میں عاشی گھر میں اکیلی ہوتی تھی۔ اس کی حالت کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے اماں جی کو کام کرنے سے دوبارہ منع کرنے کی کوشش کی لیکن وہ نہیں مانی۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ اب میں نے جلدی گھر آنا شروع کر دیا۔ دوپہر کا کھانا گھر میں ہی کھانا شروع کر دیا تھا۔ ان مختصر اوقات کے دوران میں مجھے کچھ وقت آرام کرنے کا بھی دستیاب ہو جاتا تھا۔

جس دن کی میں بات کر رہا ہوں اس دن گرمی کا یہ عالم تھا کہ پرندے بھی درختوں کے سائے میں چھپ کر بیٹھ گئے تھے۔ باہر ہُو کا عالم تھا۔ دکان کی سیل نہ ہونے کے برابر تھی۔ گاہکوں کا نام و نشان نہ تھا۔ میں پنکھے کے نیچے بیٹھا عاشی کے متعلق ہی سوچ رہا تھا کہ اچانک مجھے اماں جی دکان کی جانب آتی ہوئی دکھائی دیں۔ ان کے چہرے پر ہوائیاں رقص کر رہی تھیں۔ قریب پہنچنے پر انہوں نے متوحش لہجے میں مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ "عاشی کی طبیعت خراب ہے۔ تم دکان کو بند کر کے گھر چلے آؤ۔ اسے اسپتال لے جانا ہوگا۔"

میں نے عجلت میں دکان کو بند کیا اور اماں جی کے ہمراہ گھر کی جانب چل دیا۔ عاشی چارپائی پر بے ہوش پڑی ہوئی تھی۔ اس کے کپڑے خون سے تر تھے۔ میں نے گھبرائی

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئی نگاہوں کے ساتھ اماں جی کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ”اسے کیا ہوا ہے؟“

انہوں نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے جواب دیا۔ ”مجھے کچھ معلوم نہیں ہے جب گھر میں داخل ہوئی۔ تب میں نے اسے اسی حالت میں پڑے ہوئے پایا۔“

میں نے انہیں عاشی کے پاس ٹھہرنے کو کہا اور سواری کا بندوبست کرنے باہر کی جانب بھاگا۔ ہمارے محلے کا ایک لڑکا سوزوکی چلاتا تھا لیکن وہ اس وقت گھر پر موجود نہیں تھا مجھے سواری کا انتظام کرنے کے لیے قریبی سڑک تک جانا پڑا۔ اس دوران میں تقریباً پونے گھنٹے کا عرصہ بیت گیا۔ جب میں سوزوکی کے ہمراہ گھر تک پہنچا تب اماں جی کو میں نے دروازے کے پاس اپنا منتظر پایا۔ میں نے اور اماں جی نے عاشی کو سوزوکی میں منتقل کیا اور قریبی اسپتال میں لے آئے۔

اسپتال میں فوراً ٹریٹ منٹ ملا۔ خون بہت زیادہ بہہ چکا تھا۔ ڈاکٹروں نے عاشی کو آئی سی یو میں منتقل کر دیا۔ میں اور اماں جی دروازے کے باہر رکھی ہوئی بینچ پر بیٹھ کر پریشان نگاہوں سے ایک دوسرے کی شکلیں دیکھنے لگے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے انتظار کے بعد ڈاکٹر نے باہر نکلنے کے بعد ہمیں بتایا کہ عاشی کی حالت اب خطرے سے باہر ہے لیکن بچہ ضائع ہو چکا ہے۔ ڈاکٹر کے مزید کہنے کے مطابق عاشی کی عصمت دری کی گئی تھی۔ تشدد اور خون زیادہ بہہ جانے کے باعث بچے کی موت واقع ہوئی تھی۔ اماں جی نے سر پکڑ لیا۔ میری کیفیت متزلزل تھی۔ مجھے افسوس بھی محسوس ہو رہا تھا اور اطمینان بھی کیونکہ وہ میرا بچہ نہیں تھا۔ اگر ضائع ہو گیا تھا تب حالات کو مدنظر رکھتے ہوئے بہتر ہی ہوا تھا لیکن افسوس اس بات کا تھا کہ میری گونگی بیوی کی عصمت دری کی گئی تھی۔ سوچنے کی بات یہ تھی کہ ایسا کون کر سکتا تھا۔ پولیس میں رپورٹ لکھوانا ممکن نہیں تھا۔ میں اپنی عزت کا مذاق اڑتا نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے خاموش ہو کر بیٹھ گیا لیکن دل میں تہیہ کر لیا کہ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ ایک دو دن کے بعد عاشی کو اسپتال سے ڈسچارج کر دیا گیا اور میں اسے اماں جی کے ہمراہ گھر لے آیا۔ ہمارے لاکھ پوچھنے پر بھی وہ اس شخص کے متعلق کچھ بھی بتانے کو تیار نہیں ہوتی تھی۔ اس کی اس کیفیت کو مدنظر رکھتے ہوئے مجھے اندازہ لگانے میں قطعی مشکل پیش نہیں آئی کہ اس تمام کیے دھرے میں اس کے سابقہ عاشق کا ہاتھ ہے۔ یعنی عصمت دری نہیں ہوئی تھی بلکہ جو بھی ہوا تھا وہ عاشی کی مرضی سے ہوا تھا۔ مجھے اپنے جسم میں

نفرت کی لہر اٹھتی محسوس ہوئی۔ میں نے اپنی گلی میں موجود لڑکوں پر نگاہ رکھنی شروع کر دی۔ ہماری گلی میں اکثریت ایسے لڑکوں کی تھی جو زیادہ خوب صورت تو نہیں تھے۔ ہاں فیشن ایبل ضرور تھے۔ آوارہ گردی اور لڑکیوں کو چھیڑنے چھاڑنے کی حرکتوں میں بھی ملوث تھے۔ میری دکان ایک دفعہ پھر تباہ ہونے لگی۔ میں کسی بھی وقت دکان بند کر کے خاموشی کے ساتھ گھر کے پاس آ کر عاشی کی نگرانی شروع کر دیتا تھا۔ اماں جی نے اس حادثے کے بعد اپنے کام کو خیرباد کہہ دیا تھا۔ وہ اب زیادہ تر گھر پر ہی رہتی تھیں۔ علاج کے کاغذات تقریباً مکمل ہونے والے تھے اور وہ مجھ پر زور دے رہا تھا کہ میں بھی اس کے ہمراہ امریکا چلوں۔ میں نے صاف انکار کر دیا گھر کے حالات ایسے نہیں تھے کہ میں اپنی بیوی کو تنہا چھوڑ کر باہر جا سکتا۔

ایک دوپہر میں نے وقت سے کچھ پہلے دکان بند کی اور حسب معمول خاموشی کے ساتھ گھر کی جانب چلا آیا۔ جب میں گلی میں داخل ہوا۔ تب میں نے ایک لڑکے کو اپنے گھر کے دروازے کے پاس کھڑے ہوئے پایا۔ وہ ہنس ہنس کر عاشی کے ساتھ اشاروں کے ذریعے بات چیت کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ تھوڑی دیر اشارے بازی کے بعد عاشی نے دروازہ کھول دیا اور لڑکا گھر میں داخل ہو گیا۔ عاشی نے دروازے کو بند کر کے کنڈی لگا دی۔ غصے کی بدولت میرے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ گئیں۔ میں نے جیب میں ہاتھ ڈالا اور پھل کاٹنے والا چاقو نکال کر ہاتھوں میں تھام لیا۔ پھر تیز قدموں کے ساتھ چلتا ہوا دروازے کے سامنے آ کھڑا ہوا۔ دروازے کی درز میں سے ہاتھ ڈال کر میں نے زنجیر کو احتیاط کے ساتھ نیچے گرا دیا۔ دروازہ با آسانی کھلتا چلا گیا۔ کتنے عرصے سے میں ارادہ کیے ہوئے تھا کہ دروازے کو مضبوط کنڈی لگانے کے بعد بازار سے تالا خرید کر لگوا دوں گا۔ لیکن دکان کی مصروفیت بیچ آڑے آ جاتی تھی۔ اندر کے کمرے میں سے لڑکے کے بات چیت کرنے کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وقفے وقفے سے اماں جی بھی گفتگو میں حصہ لے رہی تھیں۔ میں دبے پاؤں چلتا ہوا کمرے کے دروازے کے پاس آ کھڑا ہوا۔ اندر جھانکنے پر میں نے اماں جی اور لڑکے کے ہمراہ عاشی کو بھی کھڑے پایا۔ عاشی نیچے دوپٹے کے ایک جانب کھڑی تھی اور لڑکے کی نگاہوں کا مرکز عاشی کا عریاں ہوتا ہوا سینہ تھا۔ میں نے پہلی نظر میں ہی پہچان لیا کہ وہ لڑکا الیکٹرک کا کام کرتا تھا اور اس

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کی دکان میری دکان کے قریب ہی واقع تھی۔ میں نے طویل سانس لیتے ہوئے کمرے میں قدم رکھ دیا۔ اماں جی اور عاشی نے چونک کر میری جانب دیکھا۔ میں نے ناگوار انداز میں عاشی کو اشارہ کرتے ہوئے اسے دوپٹا پہننے کا اشارہ کیا۔ اس نے فوراً چارپائی پر رکھا ہوا دوپٹا اٹھایا اور سر پر اوڑھ لیا۔ اماں جی نے حیرت بھری نگاہوں سے میری جانب دیکھتے ہوئے جلدی آنے کی وجہ دریافت کی۔ میں نے طبیعت کی خرابی کا بہانہ کیا۔ لڑکا کمرے کے درمیان میں رکھے ہوئے پنکھے کو پیچ کس کے ذریعے کھولنے میں مصروف تھا۔ میں نے خاموشی سے باورچی خانے میں بیٹھ کر کھانا زہر مار کیا۔ پھر دوبارہ دکان پر چلا آیا۔ رات کو میں نے عاشی کو اشاروں کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی کہ غیر مردوں کے سامنے یوں دوپٹے کے بغیر چلے جانا مناسب نہیں ہوتا۔ اسے میری باتوں کو سمجھنے میں دشواری پیش آرہی تھی یا پھر وہ جان بوجھ کر سمجھنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ تھوڑی دیر کی مغزماری کے بعد جب میرا غصہ کنٹرول سے باہر ہونے لگا۔ تب میں نے بے اختیار اس کے چہرے پر تھپڑ رسید کر دیا۔ ہماری مختصر ازدواجی زندگی کے دوران میں اپنا پہلی دفعہ ہوا تھا کہ میں نے اس پر ہاتھ اٹھایا تھا۔ چند لمحے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ میری جانب دیکھتے رہنے کے بعد عاشی نے غیر انسانی آوازوں میں چیخنا چلانا شروع کر دیا۔ دو ہاتھ اٹھا کر میرے چہرے کی جانب اشارہ کر رہی تھی۔ اس کے اشاروں کا مرکز میرے چہرے پر موجود داغ تھے۔ مجھے سمجھنے میں بالکل بھی دشواری پیش نہیں آئی کہ وہ شکل و صورت پر تنقید کر رہی ہے۔ اس نے اشاروں کے ذریعے مجھے یہ بھی سمجھایا کہ وہ مجھ سے نہیں بلکہ کسی اور سے محبت کرتی ہے۔ مجھے بہت افسوس ہوا اور میں خاموشی کے ساتھ کمرے سے نکل کر اپنی دکان پر چلا آیا۔ یہاں سونے کے لیے بوسیدہ چارپائی موجود تھی۔ شادی سے پہلے میں اکثر رات دیر ہو جانے پر دکان میں ہی سو جایا کرتا تھا۔ بعد از شادی میں نے چارپائی کو ایک جانب رکھ دیا تھا۔ بہرحال وہ تمام رات میں نے جاگتے ہوئے گزاری۔ صبح ناشتا بھی ہوٹل میں کیا۔ عاشی نے میرا حال جاننے کی بھی زحمت گوارا نہیں کی کہ میں کس حال میں ہوں۔ ناشتا کرنے کے بعد میں نے عدیل کے گھر کا رخ کیا۔ وہ گھر میں ہی موجود تھا۔ سرسری بات چیت کے بعد میں نے اس سے دریافت کیا کہ کاغذات مکمل ہوئے ہیں یا نہیں؟ اس نے بتایا کہ تقریباً مکمل ہو گئے ہیں۔ تب میں نے ساتھ

جنرل موٹرز کے بارے میں تو آپ کو معلوم ہی ہوگا۔ اس نے فورڈ گاڑیاں متعارف کروائیں۔ بلکہ اسے بابائے کار سازی کہنا چاہیے۔

فورڈ گاڑیاں بے پناہ کامیاب ہوگئیں۔ ہر جگہ ان گاڑیوں کی دھوم مچ گئی۔ فورڈ کو اب یہ اعتبار ہو گیا کہ وہ جو پراڈکٹ بھی مارکیٹ میں لانے گا وہ اسی طرح کامیاب ہوگی۔

اس نے اب ایک دوسری گاڑی Eosol کی پلاننگ کی اور اس گاڑی کی پروڈکشن شروع کر دی۔

اس نے یہ گاڑیاں 1957 میں متعارف کروائی تھیں لیکن ہوا یہ کہ اس کے اندازے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

صرف دو سال بعد یعنی 1959 میں ایڈسول کی پروڈکشن بند کر دی گئی۔ کیونکہ اس کی فروخت کی قیمت اس کی تیاری کی لاگت سے کم ہو رہی تھی۔

کہا جاتا ہے کہ ایک غلط گاڑی، غلط مارکیٹ کے لیے غلط وقت پر لائی گئی تھی۔ اس پروجیکٹ نے فورڈ کو کتنا نقصان پہنچایا۔ یہ فورڈ ہی بتا سکتا ہے۔

مرسلہ: عباس علی خان، شورکوٹ

1994 میں تیل کے ایک Rig میں ہونے والا سانحہ بھی تاریخ کی بڑی غلطیوں میں سے ایک تسلیم کیا گیا ہے۔

(Rig، وہ پلیٹ فارم ہے جو تیل کی تلاش اور سمندر سے تیل نکالنے کے لیے بنایا جاتا ہے) اس رگ میں بہت سے لوگ کام کر رہے تھے۔ انجینئرز، مزدور، اور ماہرین وغیرہ۔ ہوا یہ تھا کہ چھٹی کے وقت ہر والو کو بہت احتیاط سے بند کر دیا جاتا تھا۔ یہ ڈیوٹی مجبوری پر معمور اہلکاروں کی تھی۔ وہ ڈیوٹی سے واپس جانے سے پہلے ہر والو کو بند کر کے جاتے۔ لیکن اس شام کسی ایک سے کوتاہی ہو گئی۔ اس کا خیال تھا کہ سارے والو اس کے ساتھیوں نے چیک کر کے بند کر دیے ہوں گے۔ لیکن بدقسمتی سے ایک والو کھلا رہ گیا تھا اور اسی کھلے ہوئے والو نے تباہی مچا دی۔

پورے رگ میں گیس بھر گئی اور وہ پورا پلیٹ فارم ایک زوردار دھماکے کے ساتھ تباہ ہو گیا۔

اس حادثے میں نہ صرف 3.4 بلین ڈالر کا نقصان ہوا تھا بلکہ 167 افراد ہلاک بھی ہو گئے تھے۔ جبکہ زخمی اس کے علاوہ تھے۔

آپ اندازہ کر لیں کہ ذرا سی غلطی کتنے بڑے نقصان کا سبب بن جاتی ہے۔

مرسلہ: نسرین عنایت اللہ، دینہ جہلم

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

جانے کی ہامی بھرتے ہوئے اسے گزشتہ رات والے حادثے سے باخبر کیا۔ اس نے افسوس کا اظہار کرتے ہوئے عاشی کے رویے پر تاسف کیا پھر کاغذات کی تفصیل سے مجھے آگاہ کرنے لگا۔

چند دنوں کی سوچ بچار کے بعد میں نے دکان بیچ دی۔ شناختی کارڈ اور بقایا کاغذات بنے ہوئے تھے۔ پاسپورٹ میں نے ایک مہینے میں بنالیا۔ امریکا میں مقیم عدیل کا دوست جس کا نام ناصر تھا ہمیں اسپانسر کررہا تھا۔ اس لیے چھ مہینے کا ویزا جلد ہی لگ گیا۔ میں گھریلو حالات سے دل برداشتہ ہوچکا تھا۔ اس لیے جلد از جلد امریکا چلے جانا چاہتا تھا۔ قدرت ساتھ دے رہی تھی۔ اس لیے راہ بھی ہموار ہوتی چلی جاتی۔ کچھ دن ہم نے کپڑوں کی خریداری اور ضروریات زندگی کی اشیا کی خریداری میں صرف کیے۔ ہمارے پاس رقم نہ ہونے کے برابر تھی۔ جس کے ذریعے ٹکٹوں کی خریداری بمشکل ہو پائی اور ہم پاکستان کو خیرباد کہتے ہوئے امریکا جانے کے لیے تیار ہوگئے۔ گھر سے نکلتے ہوئے عاشی نے نہایت سردمہری کا اظہار کیا۔ اماں جی نے مجھے روکنے کی کوشش کی لیکن میں اب اس خشک ماحول کو خیرباد کہہ دینا چاہتا تھا۔ عدیل نے ٹیکسی میں بیٹھتے ہوئے اماں جی کو اپنی بوڑھی ماں کا خیال رکھنے کی تلقین کی اور ہم دونوں کراچی ائیرپورٹ چلے آئے۔ ہمارے کاغذات مکمل تھے۔ ویزا لگا ہوا تھا اس لیے ہمیں کسی بھی قسم کی دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا۔ امریکا کے ائیرپورٹ پر اترنے کے بعد ہم نے ناصر کی تلاش میں نگاہ دوڑائی۔ انسانوں کا ایک جم غفیر تھا جو اپنے پیاروں کو لینے کے لیے استقبالیہ لاؤنج میں موجود تھا۔ ان غیرملکی چہروں کے درمیان ہمیں ناصر کا چہرہ دکھائی نہیں دیا۔ ہم حیران و پریشان کھڑے بےوقوفوں کی مانند لوگوں کے چہروں کو دیکھ رہے تھے لیکن وہ وہاں نہیں تھا۔ میں نے استفہامیہ نگاہوں کے ساتھ عدیل کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''تم نے اسے فلائٹ کے ٹائم کے متعلق بتایا تھا؟ ایسا نہ ہو کہ وہ آکر چلا گیا ہو۔''

عدیل نے نفی میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''میں نے اسے ایک دفعہ نہیں بلکہ دس دفعہ فلائٹ کی روانگی اور امریکن ائیرپورٹ پر آمد کی تفصیل کے متعلق بتایا تھا۔ اسے اب تک آجانا چاہیے تھا۔''

میں نے پریشان نگاہوں کے ساتھ اردگرد کا جائزہ لینے کی کوششیں کیں۔ لوگوں کی بھیڑ اب کم ہونے لگی تھی۔ وہ باہر کا رخ کررہے تھے۔ لاؤنج کے ایک جانب بنے ہوئے ٹیلی فون بوتھ پر میری نگاہ تھم گئی۔ میں نے پرجوش لہجے میں عدیل کو مخاطب کرتے ہوئے پوچھا۔ ''تمہارے پاس ناصر کا نمبر موجود ہے۔''

اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ میں نے اس کا ہاتھ تھاما اور تقریباً کھینچتے ہوئے بوتھ کی جانب چلا آیا۔ عدیل نے بیگ کھولا اور ناصر کا نمبر تلاش کرنے کے بعد ڈائری میرے ہاتھوں میں تھما دی۔ میں نے بوتھ کے قریب بنے ہوئے کاؤنٹر سے نوٹ تڑوا کر کوائنز حاصل کیے۔ پھر بوتھ میں گھس کر ناصر کا نمبر ڈائل کیا۔

عدیل میرے ہمراہ کھڑا اجنبی نگاہوں سے میری جانب دیکھ رہا تھا۔ نمبر ڈائل کرنے کے فوراً بعد دوسری جانب بیل بجنے لگی لیکن کسی نے بھی کال ریسیو نہیں کی۔ میں نے متعدد بار نمبر ملایا لیکن ہر دفعہ ناکامی کا سامنا کرنا پڑا۔ اب مجھے پریشانی لاحق ہونے لگی۔ کروڑوں افراد پر مشتمل اس شہر میں ہمیں جاننے والا کوئی بھی نہ تھا اور ہمارے پاس اتنی رقم موجود نہیں تھی کہ ہم سر چھپانے کے لیے کسی ہوٹل کا انتخاب کرتے۔ میں نے عدیل کو مخاطب کرتے ہوئے اسے بوتھ سے باہر کسی کھلی جگہ کھڑے ہونے کی ہدایت دی۔ ہم دونوں بوتھ میں موجود تھے اگر ایسے میں ناصر ہمیں لاؤنج میں تلاش کرتا رہتا تو مایوس ہوکر واپس بھی جاسکتا تھا۔

عدیل بوتھ کا دروازہ کھول کر باہر چلا گیا۔ میں نے ایک دفعہ پھر ناصر کا نمبر ڈائل کیا اور کال ریسیو کرنے کا انتظار کرنے لگا۔ بیل بجتی رہی لیکن کسی نے بھی کال ریسیو نہیں کی۔ ٹیلی فون بوتھ میں ٹیلی فون سیٹ کے پاس... ٹیلی فون ڈائریکٹری بھی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے سوچا کہ کہیں ناصر کا نمبر غلط نہ ہو۔ اس لیے میں نے ٹیلی فون ڈائریکٹری کو کھول کر نمبر تلاش کرنا شروع کردیا۔ گھبراہٹ کی بدولت میرے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ڈائریکٹری میں نمبر تلاش کرنا کچھ آسان کام نہیں تھا۔ جلد ہی مقصد میں ناکام ہوگیا۔ عدیل واپس آگیا تھا۔ میرے ہاتھوں میں ڈائریکٹری کو دیکھ کر اس نے استفہامیہ نگاہوں سے میری جانب دیکھا۔ تب میں نے اسے وجہ بتائی۔ وہ پریشان لہجے میں بولا۔ ''کراچی ائیرپورٹ سے میں نے اسی نمبر پر فون کرکے اسے روانگی کی اطلاع دی تھی۔ نمبر ٹھیک ہے۔''

میں نے جواب دیے بغیر دوبارہ ڈائریکٹری کا مطالعہ شروع کردیا۔ وہاں بہت سے نمبروں کے درمیان مسجد کا نمبر

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

موجود تھا۔ مجھے یکلخت ایسے محسوس ہوا جیسے کروڑوں افراد کے اجنبی شہر میں اچانک ہی کوئی اپنا مل گیا ہو۔ میں نے لاشعوری طور پر نمبر ڈائل کرنا شروع کر دیا۔ دوسری جانب بیل بجنے لگی۔ عدیل حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ میری جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے توجہ نہیں دی۔ پھر کسی نے کال ریسیو کی اور نرم لہجے میں بولا۔ ”کس سے بات کیجیے گا؟“

نہ جانے کیوں میری آنکھوں میں آنسو نمودار ہونے لگے اور میں گھبرائے ہوئے لہجے میں اردو میں بولا۔ ”میں آپ کے شہر میں نو وارد ہوں۔ جسے جاننا تھا وہ مجھے اور میرے دوست کو ریسیو کرنے کے لیے ائرپورٹ پر نہیں آیا۔ چند منٹ سے اس کا نمبر ڈائل کر رہا ہوں لیکن جواب موصول نہیں ہو رہا۔ ڈائریکٹری میں مسجد کا نمبر دیکھ کر اور تو کچھ نہیں سوجھا۔ بے اختیاری میں نمبر ڈائل کر دیا۔“

دوسری جانب چند لمحے خاموشی طاری رہی پھر مہربان آواز سنائی دی۔ ”مسجد کا ایڈریس نوٹ کر لیجیے اور ٹیکسی پکڑ کر یہاں چلے آئیے۔ آپ کے لیے وقتی طور پر رہائش کا بندوبست کر دیا جائے گا۔“

میں نے کانپتے ہاتھوں سے ڈائری میں ایڈریس نوٹ کر لیا۔ ایڈریس مکمل ہونے کے فوراً بعد سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں نے عدیل کا ہاتھ تھاما اور بوتھ سے باہر نکلنے کے بعد استقبالیہ لاؤنج کی جانب نگاہ دوڑائی۔ لوگوں کا رش ختم ہو گیا تھا اور لاؤنج تقریباً خالی تھا۔ ہم پریشان چہرہ لیے لاؤنج سے باہر نکل آئے۔ ائرپورٹ کی عمارت کے سامنے ٹیکسی اسٹینڈ بنا تھا۔ مجھے انگریزی زبان پر زیادہ عبور حاصل نہیں تھا لیکن اشاروں کی زبان پر مہارت حاصل ہو چکی تھی۔ لاچاری اور بے بسی کے اس ماحول میں نہ جانے کیوں مجھے عاشی کی یاد ستانے لگی۔ اشاروں کی زبان میں نے اسی سے سیکھی تھی۔ بہرحال ہاتھوں میں موجود مسجد کا ایڈریس ہم نے ٹیکسی ڈرائیور کے ہاتھوں میں تھمایا اور خود پچھلی نشست پر براجمان ہو گئے۔

ٹیکسی چل پڑی۔ ائرپورٹ کی حدود سے باہر نکلنے کے فوراً بعد ٹیکسی ٹریفک کے ایسے ریلے میں شامل ہو گئی تھی جس کے دونوں جانب اونچی اونچی عمارتوں کا نہ ختم ہونے والا سلسلہ دور دور تک چلا گیا تھا۔ عمارتوں کے سامنے موجود فٹ پاتھ پر لوگوں کا جم غفیر چلا جا رہا تھا۔ تمام چہرے انجانے تھے۔ رات کے آٹھ بجنے والے تھے لیکن آنکھوں کو چکا چوند کرنے والی روشنیوں کا یہ عالم تھا کہ رات کو دن کا گمان ہو رہا تھا۔ ہم دونوں وقتی طور پر اپنی پریشانیوں کو فراموش کر کے ماحول کی سحر انگیزیوں میں گم ہونے لگے۔

ٹیکسی نے دو چار موڑ کاٹے اور رہائشی علاقے میں داخل ہو گئی۔ یہاں پیدل چلنے والے لوگوں کا رش نہ ہونے کے برابر تھا۔ اکا دکا گاڑی زن کی آواز کے ساتھ قریب سے گزر جاتی تھی۔ ایک مختصر گلی کے سامنے پہنچ کر ٹیکسی جھٹکے کے ساتھ رک گئی اور ڈرائیور استفہامیہ نگاہوں کے ساتھ ہماری جانب دیکھنے لگا۔ میں نے اشاروں کے ذریعے مسجد کے متعلق اسے سمجھانے کی کوششیں کیں۔ تب اس نے لاعلمی کا اظہار کرتے ہوئے کرائے کا تقاضا کرنا شروع کر دیا۔ میں نے لاچاری کے عالم میں جیب میں سے پرس نکالا اور اسے کھول کر ٹیکسی ڈرائیور کے سامنے کر دیا۔ اس نے کتنا معاوضہ وصول کیا، مجھے کچھ معلوم نہیں۔ کرائے کی ادائیگی کے بعد ہم دونوں ہونقوں کی طرح ٹیکسی سے نیچے اتر آئے۔ ٹیکسی آگے بڑھ کر نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ ہم نے اردگرد کے ماحول پر نگاہ دوڑائی۔ یہ رہائشی علاقہ تھا۔ چھوٹے چھوٹے گھر اور گھروں کے سامنے مختصر لان بنے ہوئے تھے۔ اکا دکا لوگ بھی دکھائی دے رہے تھے لیکن ان میں اکثریت غیر مسلموں کی تھی۔

میں نے پریشان نگاہوں کے ساتھ عدیل کی جانب دیکھا۔ اس کے چہرے پر بھی گھبراہٹ کے تاثرات ثبت تھے۔ آپ ہماری کیفیت کا اندازہ بخوبی لگا سکتے ہوں گے۔ ایک ایسے شہر میں جہاں آپ کی جان پہچان موجود نہ ہو اور جیب میں موجود رقم بھی نہایت قلیل ہو۔ رات کا پہر ہو۔ تب آپ کی دلی کیفیت کیا ہو سکتی ہے۔ ہم بھی ایسی ہی کیفیت سے دوچار تھے۔ ہمارے دائیں ہاتھ کی جانب لان میں ایک بوڑھا آدمی بیٹھا دکھائی دے رہا تھا۔ اس کی متجسس نگاہیں ہم دونوں کے چہروں پر مرکوز تھیں۔ چند لمحے ہمیں خاموشی کے ساتھ دیکھتے رہنے کے بعد... کرسی سے اٹھ کر ہماری جانب چلا آیا۔ پھر انگریزی زبان میں جانے کیا پوچھنے لگا۔ اس کی گفتگو ہم دونوں کی سمجھ سے بالاتر تھی۔ میں نے اشاروں کے ذریعے اسے اپنا مقصد سمجھانے کی کوششیں کیں۔ تب وہ مصنوعی بتیسی باہر نکال کر ہنسنے لگا۔ میں نے بے چارگی کے ساتھ ہمراہ کھڑے عدیل کی جانب دیکھا۔ وہ محویت کے عالم میں سڑک کی دوسری جانب موجود گھر کی جانب دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کی نگاہوں کا تعاقب کرنے

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

ہوئے مرکز کو تلاش کیا۔ تب ایک ادھیڑ عمر آدمی کو گھر سے باہر نکلتے ہوئے دیکھا۔ وہ آدمی چہرے مہرے سے ایشین دکھائی دیتا تھا۔ علی نے سرگوشی بھرے لہجے میں مجھے بتایا کہ اس کے ہاتھوں میں موجود سفید ٹوپی اس بات کی نشان دہی کر رہی ہے کہ وہ یقیناً مسلمان ہے اور قریبی واقع مسجد میں عشا کی نماز پڑھنے کی نیت سے گھر سے نکلا ہے۔ مچھلی بوڑھا دوبارہ اپنی زبان میں بک بک کرنے لگا تھا۔ ہم نے اسے نظر انداز کیا اور جلدی سے سڑک عبور کی اور تقریباً بھاگتے ہوئے اس آدمی کی جانب چل دیے۔ قدموں کی آواز سن کر وہ ٹھٹک گیا اور حیرت بھری نگاہوں سے ہم دونوں کی جانب دیکھنے لگا۔ میں نے قریب پہنچ کر پھولے ہوئے سانس کے ساتھ اسے سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دیا۔ تب میں نے اپنے اوپر بیتنے والے تمام واقعات تفصیل کے ساتھ دہرانے شروع کر دیے۔ وہ دلچسپی کے ساتھ سن رہا تھا۔ آخر میں، میں نے اس سے مسجد کے متعلق دریافت کیا۔ تب وہ مسکراتے ہوئے عربی اور انگلش زبان کے مکسچر میں نہ جانے کیا بولنے لگا۔ اب ہم دونوں کے چہروں پر حیرت کے تاثرات بکھرنے لگے۔ چند لمحے اول فول بکنے کے بعد اس آدمی نے مجھے بازو سے تھاما اور کھینچتے ہوئے گلی کے آخری حصے کی جانب دھکیلنے لگا۔ ہم خاموشی کے ساتھ اس کے ساتھ چل دیے۔ ہماری قوتِ مدافعت کا اب یہ عالم تھا کہ اگر ہمیں پولیس ہیروئن کی اسمگلنگ کا الزام لگا کر پولیس اسٹیشن چلنے کے لیے کہتی تب بھی ہم بخوشی الزام کو قبول کرنے کے بعد ان کے ساتھ پولیس اسٹیشن چلے جاتے کیونکہ ہمیں صرف رات گزارنے کے لیے مختصر جگہ درکار تھی۔ ہمیں اس بات سے کوئی بھی سروکار نہیں تھا کہ وہ جگہ مسجد کی ہے یا پھر پولیس اسٹیشن کی۔ گلی کے آخری حصے میں ایک ایسا گھر موجود تھا جس کے سامنے لان نہیں تھا۔ بلکہ چار دیواری تھی جسے ... گیٹ کے ذریعے بند کر دیا گیا تھا۔ آدمی نے گیٹ کے ساتھ لگی ہوئی بیل بجائی۔ اس کے ساتھ ہی ہمیں عشا کی اذان کی آواز سنائی دی۔ ہمیں ایسا محسوس ہوا جیسے ہم تپتے ہوئے ریگستان کو عبور کر کے ٹھنڈے اور میٹھے پانی سے بھرپور نخلستان میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گئے ہوں۔ گیٹ میں موجود مختصر دروازہ جھٹکے کے ساتھ کھل گیا اور ایک بوڑھے شخص کا چہرا نمودار ہوا۔ اس کے سر پر سفید ٹوپی موجود تھی اور وہ کرتے پاجامے میں ملبوس تھا۔ ہمارے ساتھ کھڑے ہوئے شخص کو دیکھ کر اس نے راستہ چھوڑ دیا اور ہم اس شخص کے ہمراہ مکان میں داخل ہو گئے۔

سامنے مختصر صحن موجود تھا اور صحن کے سامنے بڑا برآمدہ تھا۔ اس کے بعد مسجد کا وسیع و عریض کمرا تھا۔ محراب کے سامنے منبر موجود تھا۔ زمین پر سرخ رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا جسے صفوں کی صورت میں تقسیم کیا گیا تھا۔ چھت پر معلق فانوس ایستادہ تھا۔ منبر کے پاس کھڑے ہو کر ایک نوجوان عشا کی اذان دے رہا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر آف تھا اور منبر کے پاس جائے نماز پر تھری پیس سوٹ پہنے داڑھی مونچھوں سے مستثنیٰ مولوی صاحب براجمان تھے۔ اذان دینے والا نوجوان بھی پینٹ شرٹ میں ملبوس تھا۔ ہمیں ہمراہ لانے والا شخص خاموشی کے ساتھ اگلی صف میں مولوی صاحب کے ہمراہ بیٹھ گیا۔ میں نے اور عبدالعلی نے اردگرد نگاہ دوڑائی۔ ہم وضو کرنا چاہتے تھے۔ نماز کا وقت ہونے والا تھا۔ دروازے کے پاس کھڑا ہوا وہ شخص جس نے دروازہ کھولا تھا واحد شخص تھا جو کرتے اور پاجامے میں ملبوس تھا۔ بوڑھا تمام حرکات بغور جائزہ لے رہا تھا۔ اس نے فوراً ہماری دلی کیفیت کو جان لیا اور ہمیں پیچھے آنے کا اشارہ کرنے کے بعد دروازہ کھول کر باہر نکل گیا۔ برآمدے کے ساتھ ہی وسیع و عریض سفید ٹائلوں سے مزین باتھ روم بنا ہوا تھا۔ اس نے باتھ روم کا دروازہ کھولنے کے بعد مجھے اندر جانے کا اشارہ کیا۔ میں نے باتھ روم میں داخل ہونے کے بعد دروازے کو بند کیا۔ پھر نہایت اہتمام کے ساتھ وضو کرنا شروع کیا۔ وضو مکمل ہونے کے بعد میں خاموشی کے ساتھ باہر نکل آیا۔ میرے بعد عبدالعلی باتھ روم کے اندر چلا گیا۔

میں دوبارہ بوڑھے شخص کے ہمراہ اندرونی حصے میں چلا آیا۔ اتنی دیر میں وہاں تین مزید آدمیوں کا اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ سب پینٹ شرٹ میں ملبوس تھے اور سنتیں پڑھنے کے لیے صفوں پر ہاتھ باندھے کھڑے تھے۔ میں نے بھی خاموشی کے ساتھ نیت باندھی اور نہایت خشوع وخضوع کے ساتھ سنتیں پڑھنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد عبدالعلی بھی وضو کرنے کے بعد میرے پاس صف میں آ کھڑا ہوا۔ سنتیں پڑھنے کے بعد میں نے دل میں پکا تہیہ کر لیا کہ آج سے پانچ وقت کی نماز مسجد میں پڑھنے کی کوشش کروں گا۔ پورے نو بجے عشا کی نماز باجماعت پڑھی گئی۔ نماز کے بعد دعا و تسبیح سے فارغ ہونے کے بعد مولوی صاحب ہماری جانب دیکھتے ہوئے اعلان کرنے والے انداز میں نمازیوں سے مخاطب ہوتے ہوئے بولے۔ ”حضرات ایک ضروری اعلان ملاحظہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

فرمائیں۔ پاکستان سے تعلق رکھنے والے دو مصیبت زدہ مسلمان بھائی اس وقت آپ کے درمیان موجود ہیں اگر کسی بھی صاحب حیثیت صاحب اختیار مسلمان کو ان کی خدمات درکار ہوں تو ان دونوں سے رابطہ کر سکتے ہیں۔ یہ دونوں چند دنوں کے لیے مسجد میں ہی رہائش پذیر رہیں گے۔ کسی بھی مسلمان کے لیے روزگار کا اہتمام کرنا صدقہ جاریہ کا سبب بن سکتا ہے۔ اس بات کو مدنظر رکھتے ہوئے کوشش کیجیے گا کہ مشکل گھڑی میں ان دونوں کے لیے وسیلے کا سبب آپ میں سے کوئی بھی ایک بن سکے۔''

مسجد میں موجود مختصر لوگوں کی توجہ کا مرکز ہم دونوں کے وجود بن گئے لیکن کسی نے بھی ہم سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ہمیں حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ مولوی صاحب کے ساتھ اب تک ہماری گفتگو نہ ہو پائی تھی۔ اس کے باوجود بھی وہ ہمارے متعلق بہت سی باتیں بغیر بتائے جان گئے تھے۔ شاید ایسا ان حضرات کی بدولت ہوا تھا جو ہمیں اپنے ہمراہ مسجد تک لائے تھے۔ یقیناً وہ اگلی صف میں مولوی صاحب کے ہمراہ بیٹھے تھے۔

عشا کی نماز مکمل ہوئی اور مولوی صاحب نمازیوں کے ہمراہ باہر چلے گئے۔ مسجد میں کرتے پاجامے والے شخص کے علاوہ ہم دونوں اکیلے رہ گئے۔ میں نے اس شخص سے مخاطب ہوتے ہوئے پوچھا۔ ''کیا تم اردو بول سکتے ہو؟''

اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''بخوبی۔'' پھر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ہمکلام ہوا۔ ''میرا تعلق پاکستان سے ہے اور میں کراچی کا رہائشی ہوں۔ دو سال سے مسجد میں امامت کا فریضہ انجام دے رہا ہوں۔ بچے بڑے ہو کر اپنی بیویوں کے ہمراہ زندگیوں میں مگن ہو کر میرے بوڑھے وجود کو فراموش کر چکے ہیں۔ اولڈ ہاؤس جانے سے بہتر میں نے یہ جانا کہ خدا کے گھر میں رہ کر اپنے مسلمان بھائیوں کی خدمت کا ذریعہ بن سکوں۔ سو ایسا ہی کر رہا ہوں۔''

میں نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔ ''آپ مسجد میں ہی قیام کرتے ہیں۔ گھر بار اور بچے ہونے کے باوجود؟''

بوڑھے نے ٹھنڈی سانس بھرنے کے بعد جواب دیا۔ ''یہاں بوڑھے وجودوں کی حیثیت اس سے زیادہ نہیں ہے کہ انہیں ماضی کی اچھی یادوں کے ساتھ یاد کیا جا سکے اور میرا تو ماضی بھی کچھ زیادہ اچھا نہیں رہا۔ جوانی میں بوڑھے ماں باپ کو چھوڑ کر امریکا چلا آیا۔ اس کے بعد ان سے کبھی رابطہ نہ ہو سکا۔ یقیناً مر کھپ گئے ہوں گے۔ امریکن لڑکی کے ساتھ شادی کر کے نیشنلٹی حاصل کی۔ پھر اس کے ساتھ مل کر شراب اور بیئر کا کاروبار کیا۔ امریکن لڑکی کے بطن سے دو لڑکے پیدا ہوئے۔ شادی زیادہ عرصہ کامیاب نہ ہو سکی۔ طلاق پر اس کا اختتام ہوا۔ مکافات عمل کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ لڑکوں نے شادیاں کر لیں اور مجھے فلیٹ میں تنہا چھوڑ کر اپنی بیویوں کے ہمراہ امریکنوں کے ہجوم میں گم ہوتے چلے گئے۔ آخر وقت میں مجھے خدا کی یاد ستائی اور میں گناہوں سے توبہ کرنے کے بعد مسجد میں چلا آیا۔ اب دن رات مسجد کی خدمت میں گزارنے کے علاوہ پانچ وقت کی نماز کا اہتمام بھی کرتا ہوں۔''

بوڑھا خاموش ہو گیا۔ میں نے تاسف بھری نگاہوں سے اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''آپ کا نام پوچھنے کی جسارت کر سکتا ہوں؟''

وہ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''نام میں کیا رکھا ہے۔ اصل حقیقت تو اعمالوں کی ہوتی ہے۔ ویسے مجھے عبدالرحمٰن کے نام سے منسوب کرتے ہیں۔ تم دونوں بھی میرے بچوں کی طرح ہو۔ تمہیں نصیحت کروں گا کہ اس بھول بھلیوں کے شہر کو خیرباد کہہ کر واپس پاکستان چلے جاؤ ورنہ ہمیشہ کے لیے ان ہجوم بھری گلیوں میں گم ہونے چلے جاؤ گے۔''

بوڑھے کی بات ابھی مکمل نہیں ہو پائی تھی کہ دروازے کی بیل بجنے لگی۔ بوڑھے عبدالرحمٰن نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ میں نے ہاتھ کے اشارے سے اسے منع کر دیا اور اٹھ کر باہر دروازے کی جانب چل دیا۔ دروازہ کھولنے پر میں نے اس آدمی کو ہاتھ میں کھانے کی ٹرے تھامے کھڑے ہوئے پایا جو مسجد تک ہماری رہنمائی کا سبب بنا تھا۔ اس نے مسکراتے ہوئے ٹرے میرے ہاتھ میں تھما دی اور واپس چلا گیا۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ اسے دور جاتے ہوئے دیکھا۔ پھر مسجد کا دروازہ بند کر کے اندر واپس مسجد چلا آیا۔ رات کا کھانا ہم تینوں نے خاموشی کے ساتھ تناول کیا اور سونے کے لیے لیٹ گئے۔ سردیوں کے دن تھے۔ مسجد میں گیس کا چولہا موجود تھا۔ اس لیے رات اچھی ہی گزری۔ نیند بھی خوب آئی۔

ہمیں مسجد میں رہتے ہوئے تین دن گزر گئے۔ ہر نماز کے بعد مولوی صاحب نمازیوں سے مدد کی اپیل کرتے تھے لیکن کسی نے بھی ہم سے رابطہ کرنے کی کوشش نہیں کی۔ ان

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

تین دنوں کے دوران میں ہمارے کھانے پینے کا بندوبست اسی انڈین باشندے کی جانب سے ہی ہوتا رہا۔ میں اور عدیل ہر روز صبح باہر جا کر قریبی فون بوتھ سے فون کرتے تھے۔ بوتھ کے سامنے ایک پندرہ بیس سالہ لڑکی پاپ کارن فروخت کرتی تھی۔ اس کے پاس لوگوں کا ہجوم لگا رہتا تھا۔ یقیناً وہ اچھا خاصا منافع پیدا کر لیتی تھی۔ میں جب بھی اسے پاپ کارن فروخت کرتے ہوئے دیکھتا تو عدیل سے مخاطب ہوتے ہوئے کہتا۔ ''یہاں نوکری تو ممکن نہیں ہے ہم بھی مختصر سرمائے کے ساتھ کسی چلتے پھرتے محدود کاروبار کا آغاز کر سکتے ہیں۔''

عدیل جواب دینے کی بجائے خاموش ہو جاتا تھا۔ ظاہر ہے وہ کیا جواب دے سکتا تھا۔ ہمارے پاس رقم محدود تھی۔ اس محدود رقم سے کاروبار کے متعلق سوچنا بے وقوفی تھی۔ اس انڈین آدمی کی بدولت کھانے پینے کا عزت کے ساتھ اہتمام ہو جاتا تھا ورنہ اب تک ہم کنگلے ہو چکے ہوتے۔ عبدالرحمٰن صاحب کے ساتھ ہماری بات چیت میں بے تکلفی کا عنصر پیدا ہونے لگا تھا۔ وہ ہمیں بہت مفید مشورے دیتے تھے۔ ایک رات عشا کی نماز کے بعد جب ہم تینوں کھانا کھانے کے بعد سونے کے لیے لیٹے تب میں نے عبدالرحمٰن صاحب سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''پیش امام صاحب ہمیں مسجد میں رہتے ہوئے چار دن ہو گئے۔ نہ نوکری کا سبب پیدا ہوا اور نہ ہی کسی جگہ کام کی وجہ پیدا ہوتی دکھائی دیتی ہے۔ ہم دونوں مایوس ہونے لگے ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم کسی چھوٹے موٹے کام کا آغاز کر دیں۔ ہمارے پاس موجود جمع پونجی ختم ہونے لگی ہے اگر یہ ختم ہو گئی تب ہم دونوں بھلا کیا کریں گے؟''

عبدالرحمٰن صاحب مسکراتے ہوئے بولے۔ ''مایوس ہونا گناہ ہے۔ تمہارے پاس ابھی کافی وقت موجود ہے۔ کوئی بہتر سبب پیدا ہو ہی جائے گا۔ تم دونوں کا کھانا پینا اور رہائش مفت ہے۔ عیش کرو، گھومو پھرو اور ویزا ختم ہونے پر واپس گھر چلے جاؤ۔ رہی کام کرنے کی بات تو اس کے لیے ورک پرمٹ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے بغیر کام کرنے کے متعلق سوچنے کی بھی کوشش نہیں کرنا۔ ریسٹورنٹ وغیرہ میں برتن دھونے کی نوکریاں عام ہیں لیکن کسی وقت تلاش کرو اگر مل جاتی ہے تو تمہاری تھوڑی بہت کفالت کا باعث بن سکتی ہے۔ عبدالرحمٰن صاحب نے بات ختم کرنے کے بعد کروٹ بدلی اور آنکھیں بند کر لیں۔

ہم دونوں نے بھی بے چارگی کے ساتھ آنکھیں بند کر لیں۔ صبح ناشتا کرتے ہوئے عبدالرحمٰن صاحب نے میری جانب دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا۔ ''میرے پاس مختصر رقم موجود ہے۔ کام کرنے کی مجھے ضرورت نہیں ہے۔ میں وہ رقم تم دونوں کو بطور قرض دینے کے لیے تیار ہوں۔ اس مختصر رقم سے تم چھوٹے موٹے کام کی ابتدا کر سکتے ہو۔ مثلاً سردیوں کا موسم ہے اور یہاں اس موسم میں بھنی ہوئی مونگ پھلیوں کی بہت مانگ ہوتی ہے۔ تم مونگ پھلیاں فروخت کر سکتے ہو۔ حساب اور دام کے متعلق میں تمہیں معلومات دوں گا۔ پھلیاں تمہیں بازار سے دستیاب ہو جائیں گی اب انہیں گاہکوں کے سامنے کیسے پیش کرتے ہو یہ تمہارا کام ہے لیکن میری ایک نصیحت یاد رکھنا کسی ایک جگہ کو ٹھکانا بنا کر ہمیشہ کے لیے ٹھہرنے کی کوشش نہیں کرنا۔ یہاں ورک پرمٹ کے بغیر کام کرنا خلاف قانون ہے۔ اگر پکڑے گئے تب جیل کی ہوا کھانی پڑے گی اور ہو سکتا ہے کہ تم دونوں کا ویزا منسوخ کر کے واپس پاکستان بھجوا دیا جائے۔

ہم دونوں نے ممنونانہ نگاہوں سے پیش امام صاحب کی جانب دیکھتے ہوئے ان کا شکریہ ادا کیا۔ پھر ان کے ہمراہ قریبی بازار کی جانب چل دیے۔ مونگ پھلیاں باآسانی دستیاب ہو گئیں۔ یہ مونگ پھلیاں کچی تھیں۔ انہیں بھوننے کے لیے ریت اور گیس کے چولہے کی ضرورت تھی۔ ہمارے پاس رقم قلیل تھی۔ رقم کی مناسبت سے ہم نے چند برتن، ریت، چمچے وغیرہ کی خریداری کی اور دوبارہ مسجد میں چلے آئے۔ یہاں گیس کا چولہا موجود تھا لیکن مسئلہ یہ تھا کہ گیس مسجد کی تھی۔ ہمارے اوپر ویسے ہی مسجد کے بے تحاشا احسانات موجود تھے۔ اس لیے ہم گیس چوری نہیں کرنا چاہتے تھے۔ مولوی صاحب اور پیش امام صاحب کے ساتھ مشورہ کرنے کے بعد ہم اس نتیجے پر پہنچنے میں کامیاب ہوئے کہ ہم اس صورت میں گیس استعمال کر سکتے ہیں اگر گیس کا بل ہم اپنے منافع میں سے جمع کروائیں سو ہم اس کے لیے تیار ہو گئے۔ مونگ پھلیاں بھونی گئیں ان پر نمک چھڑکا گیا۔ پھر پلاسٹک کی تھیلیوں میں پیک کرنے کے بعد انہیں ترتیب کے ساتھ لکڑی کی خرید کردہ ٹرے میں سجایا گیا۔ ٹرے کے دونوں کناروں کے ساتھ رسی بندھی ہوئی تھی۔ یہ رسی ہم نے اپنی گردن کے ساتھ لٹکائی اور اللہ کا نام لے کر بازار کی جانب چل دیے۔ پہلے دن زیادہ سیل نہیں ہوئی لیکن دوسرے اور تیسرے دن ہماری تمام خرید کردہ

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

مونگ پھلیاں ہاتھوں ہاتھ بک گئیں۔ گورے نمک اور مرچ کا استعمال انتہائی محدود طور پر کرتے ہیں۔ ہماری مونگ پھلیوں میں نمک موجود تھا۔ نہ جانے انہیں کیوں یہ نمک سے بھری مونگ پھلیاں پسند آ گیا۔ ہم نہیں جان پائے۔ بہرحال کام آگے بڑھنے لگا۔ آمدن بڑھنے لگی۔ مسجد کی کمیٹی کا قرض ہم باقاعدگی کے ساتھ ادا کرنے لگے۔ انہی دنوں ایک صبح عدیل نے کام پر جانے سے پہلے فون بوتھ میں گھس کر ناصر کا نمبر ڈائل کیا۔ تب دوسری جانب گھنٹی بجنے کے فوراً بعد کال ریسیو کر لی گئی۔ کال ریسیو کرنے والا ناصر خود تھا۔ گلے شکوے ختم ہونے کے بعد اس نے ہمیں فوراً فلیٹ پر آنے کے لیے کہا۔ عدیل نے میری جانب دیکھا۔ تب میں نے سر کو اثبات میں ہلا دیا۔ اس دن ہم نے کام پر جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور ٹیکسی پکڑ کر ناصر کے فلیٹ پر چلے آئے۔

ناصر درمیانی عمر کا خوب صورت اور چست جسم جوان تھا۔ اس کی قلموں کے بالوں میں کہیں کہیں سفیدی نمایاں تھی۔ جسے اس نے ہیئر کلر لگا کر چھپانے کی کوشش کی تھی۔ آنکھوں پر نفیس اور نازک سا چشمہ موجود تھا اور پہناوا بہترین تھا۔ ہمارے سامنے کولڈ ڈرنک رکھنے کے بعد وہ معذرت آمیز لہجے میں بولا۔ ”مجھے اس بات کا افسوس تمام زندگی رہے گا کہ میں تم دونوں کو لینے کے لیے ائیرپورٹ نہیں آسکا۔ بات کچھ غیر معمولی سی ہے۔ پتا نہیں تم دونوں یقین کرتے ہو یا نہیں بہرحال تم دونوں کے امریکا آنے سے صرف دو تین گھنٹے پہلے مجھے پولیس نے گرفتار کر لیا۔ بلاجواز نہیں بلکہ ان کے پاس جواز موجود تھا۔ میں اور میرے چند دوست مجرمانہ سرگرمیوں میں ملوث ہیں۔ مجھے گول مول بات کرنا پسند نہیں ہے اس لیے چھپائے بغیر سب کچھ صاف صاف بتائے دیتا ہوں۔“

میں اور عدیل حیرت بھرے چہروں کے ساتھ اس کی باتیں سننے میں مصروف تھے۔ وہ کہے چلا جا رہا تھا۔ ”یہاں ہمیں سیکنڈ کلاس انسانوں کی حیثیت کا اعتبار دیا جاتا ہے تو پھر اگر ہم سیکنڈ کلاس حرکتوں میں ملوث ہونے کی کوشش کریں تب اس میں برائی کیا ہے۔ چھوٹی موٹی چوریوں کے بعد چند عرصہ قبل میں نے سیکنڈ کلاس افراد کے گروپ کو جوائن کر لیا۔ ہم دور دراز کے ریسٹورنٹ، جنرل اسٹور، مختصر زرعی بینکوں یا پھر چھوٹے موٹے آفسوں میں ڈاکا ڈالنے کے بعد فرار ہو جاتے تھے۔ آج تک ہمیں گرفتار نہیں کیا گیا۔ ایسا پہلی دفعہ ہوا کہ جس پیٹرول پمپ کو ہم نے لوٹا اس میں کام کرنے والے لڑکے نے باوجود چہرے پر سیاہ کپڑا پہننے کے مجھے پہچان لیا۔ وہ میرے ساتھ ڈیڑھ سال ایک ریسٹورنٹ میں کام کر چکا تھا۔ پولیس نے مجھے گرفتار کر لیا لیکن مضبوط ثبوت کی عدم موجودگی کے باعث آخر کار انہیں مجھے رہا کرنا ہی پڑا۔ میں آج ہی رہا ہونے کے بعد فلیٹ پر آیا ہوں۔ تم دونوں کے متعلق میں پولیس اسٹیشن میں بھی پریشان رہا تھا۔ فلیٹ پر آنے کے بعد فوراً... میں نے تمہارے متعلق معلومات کرنے کے لیے ائیرپورٹ فون کرنے کے متعلق سوچا لیکن تمہاری کال آ گئی۔“ وہ چند لمحات کے لیے خاموش ہو گیا۔

ہمیں اس کی باتوں پر یقین نہیں تھا لیکن یقین نہ کرنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا۔ اس لیے خاموشی کے ساتھ اثبات میں سر ہلاتے رہے۔ وہ بول رہا تھا۔

”فلیٹ تم دونوں کے سامنے ہے۔ یہ دو کمروں پر مشتمل ہے۔ شادی کے جھنجٹ سے میں آزاد ہوں۔ اس لیے ہم تینوں کا گزارا باآسانی ہو جائے گا لیکن فلیٹ کے کرائے کو واپس ہونے والی انکم میں سے شیئر کرنا ہو گا۔“ میں نے اور عدیل نے فوراً اثبات میں سر ہلا دیا۔ مشروب ختم کرنے کے فوراً بعد ہم تینوں نے مسجد کا رخ کیا اور پیش امام عبدالرحمٰن صاحب کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنا سامان ہمراہ لیا اور ناصر کے فلیٹ پر چلے آئے۔

میں چوری چکاری سے ہمیشہ خائف رہا ہوں لیکن عدیل کا مزاج مجھ سے مختلف تھا۔ وہ ایسی سرگرمیوں میں ہمیشہ خوش رہتا تھا۔ اس لیے چند لمحے کی سوچ بچار کے بعد اس نے ہاں کر دی۔ میرے انکار کرنے پر ناصر نے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔

”تمہارے پاس صرف چھ مہینے کا ویزا ہے۔ اس عرصے کے دوران میں جتنا زیادہ کما سکو وہ تمہارے حق میں بہتر ہو گا۔ بصورت دیگر چھ مہینے کے بعد جب واپس گھر جاؤ گے تب وقت کے ضیاع کے علاوہ جیب میں پھوٹی کوڑی بھی موجود نہیں ہو گی۔“

میں نے دوبارہ انکار میں سر ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ”اس کے باوجود بھی مجھے منظور نہیں ہے کہ میں اپنے ضمیر کے خلاف کسی بھی قسم کا کوئی قدم اٹھاؤں۔“

یوں بات ختم ہو گئی اور دوسرے دن سے میں نے دوبارہ مونگ پھلیوں والے کام کا آغاز کر دیا۔ عدیل ہمراہ موجود نہیں تھا۔ اس لیے اب مجھے زیادہ سے زیادہ وقت کام

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

کو دینا پڑتا تھا۔ پیش امام عبدالرحمٰن صاحب کی بات کو مدِنظر رکھتے ہوئے میں کوشش کرتا تھا کہ ایک جگہ کام مکمل کرنے کے بعد دوبارہ وہاں کا رخ نہ کروں۔ اس لیے شام کو جب گھر میں داخل ہوتا تھا تب جسم تھکن کی بدولت ٹوٹ رہا ہوتا تھا۔ کھانا کھانے کے فوراً بعد میں سونے کے لیے لیٹ جاتا تھا۔ علی اور ناصر کے کام کی ابتدا رات بارہ بجے کے بعد ہوتی تھی۔ وہ دن کو سو کر اپنی نیند پوری کرلیا کرتے تھے۔ میں جب فلیٹ میں واپس آتا تھا تب انہیں سوتے ہوئے پاتا تھا۔ ہمارا سامنا کم ہی ہوتا تھا۔ کچھ عرصے کے بعد علی اور ناصر نے گاڑی خرید لی۔ اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان دونوں کا کام عروج پر تھا۔ میرے پاس جمع پونجی کی صورت میں مختصر رقم کے علاوہ مزید کچھ بھی موجود نہیں تھا۔

دن تیزی کے ساتھ گزرنے لگے۔ ویزا ختم ہونے کے دن قریب آتے جارہے تھے۔ اگر جیب میں رقم موجود نہ ہوتی تب میں کیا منہ لے کر گھر جاتا۔ ہر رات سونے سے پہلے میں دل میں تہیہ کرلیتا تھا کہ دوسرے دن علی اور ناصر کے گروپ کو جوائن کرلوں گا لیکن صبح بیدار ہونے کے بعد میں ارادوں کی نفی کرنے کے بعد کام کے لیے باہر نکل جاتا تھا۔

ایک شام کو جب میں کام ختم کرنے کے بعد فلیٹ پر واپس آیا تو عدیل کو افسردہ حالت میں ناصر کے ہمراہ بیٹھے ہوئے پایا۔ وجہ دریافت کرنے پر عدیل نے تقریباً رو دینے والے لہجے میں مجھے بتایا کہ محلے والوں کی جانب سے خط موصول ہوا ہے کہ ان کی ماں کو وفات پائے ہوئے تین دن کا عرصہ بیت چکا ہے۔ مجھے اچانک ہی اماں جی اور عاشی کے چہرے آنکھوں کے سامنے رقص کرتے ہوئے دکھائی دینے لگے۔ میں نے اور ناصر نے عدیل کو دلاسا دیا۔ پھر دوسرے دن کی فلائٹ میں اس کی سیٹ بک کروادی۔ اس کا ایک فائدہ یہ بھی تھا کہ عدیل کو دوبارہ ویزا ملتا تو وقت میں اضافہ ہوجاتا۔

صبح عدیل پاکستان چلا گیا۔ میرے دل میں بھی شدت کے ساتھ اس خواہش نے سر اٹھانا شروع کردیا کہ میں بھی بس چند روز کے لیے گھر سے ہو آؤں لیکن مالی حالات نے خواہش کا گلا گھونٹ دیا۔ میرے پاس اتنی رقم موجود نہیں تھی کہ میں پاکستان جاکر واپس آسکتا۔ اس لیے خاموش ہوکر بیٹھ گیا۔ فلیٹ کا کرایہ دینے کے علاوہ میں عبدالرحمٰن صاحب سے لیا ہوا قرضہ بھی واپس کرنے کے لیے کوششیں کر رہا تھا۔ ایک شام جب میں نے مسجد کا رخ کیا تب عبدالرحمٰن صاحب نے مجھے ایک ایسے آدمی سے ملوایا جو ایک درمیانے درجے کے ریسٹورنٹ کا مالک تھا اور جسے ایک ایماندار اور محنتی کیشیئر کی ضرورت تھی۔ آدمی کا نام عمر فاروق تھا اور وہ مسلمان تھا۔ میرے ساتھ ملاقات کے بعد اسے جس بات پر اعتراض محسوس ہوا وہ یہ تھی کہ میرے پاس ورک پرمٹ نہیں تھا۔ عبدالرحمٰن صاحب کی سند تھی اور میرے دگرگوں ہوتے حالات کو مدِنظر رکھتے ہوئے اس نے چند لمحات کی سوچ بچار کے بعد مجھے ریسٹورنٹ میں کام دینے کی ہامی بھرلی اور میں خوشی خوشی فلیٹ پر واپس چلا آیا۔

دوسرے دن سے میں نے کام کا آغاز کردیا۔ ریسٹورنٹ میں کام بہت زیادہ تھا اور میرے علاوہ سیکنڈ ٹائم دوسرا کیشیئر بھی کام کرتا تھا۔ علاوہ ازیں کام کرنے کا معاوضہ بھی کام کی زیادتی کو مدِنظر رکھتے ہوئے اچھا خاصا تھا۔ اس لیے جیسے جیسے دن اچھے گزرنے لگے۔ عدیل کی واپسی ڈیڑھ مہینے کے بعد ہوئی۔ مجھے تاخیر کی وجہ سمجھ نہ آسکی لیکن اس پاس ایک روح فرسا خبر تھی جس نے میرے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو وقتی طور پر ختم کرکے رکھ دیا کہ عاشی دوبارہ ماں بننے والی تھی۔ میرے امریکا آنے سے پہلے ایسا کچھ بھی نہیں ہوا تھا جس کی بدولت وہ ماں بن سکتی۔ اس کا صاف مطلب یہ تھا کہ میری غیر موجودگی میں وہ اپنے آشنا کے ساتھ رنگ رلیاں منا رہی تھی۔ مجھے اپنے جسم میں موجود خون کھولتا ہوا محسوس ہونے لگا۔ شاید ایسا سب کچھ اماں جی کی موجودگی میں ہوتا رہا ہوگا۔ ہوسکتا ہے کہ انہیں سب کچھ معلوم ہو اور وہ مجھ سے چھپاتی رہی ہوں۔ دل میں شدت کے ساتھ ایک خواہش سر ابھارنے لگی کہ وہ منحوس شخصیت کس کی ہے جو وقتاً فوقتاً میرے حق پر ڈاکا ڈالتی رہی ہے اور جسے میری بیوی اس حد تک چاہتی ہے کہ اپنا تن من بھی اس پر نچھاور کرنے سے گریز نہیں کرتی۔ تمام رات سوچ بچار کے بعد آخر کار میں نے دل میں مصمم ارادہ کرلیا کہ ویزا ختم ہونے کے بعد بھی واپس پاکستان نہیں جاؤں گا بلکہ پاکستان کی بجائے کسی اور ملک جانے کی درخواست امیگریشن میں جمع کروادوں گا۔

دوسرے دن سے زندگی دوبارہ مخصوص روش پر چلنا شروع ہوگئی۔ میں رات کو نو بجے ریسٹورنٹ سے واپس آتا تھا عدیل اور ناصر کو ہمیشہ سوتا ہوا پاتا تھا۔ کھانا کھانے کے بعد چند گھنٹے ٹی وی پر کوئی فلم دیکھنے رہنے کے بعد میں بھی سو جاتا تھا اور صبح اٹھ کر ناشتا کرنے کے بعد ریسٹورنٹ چلا جاتا تھا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

WWW.PAKSOCIETY.COM

اتوار کے روز چھٹی ہوتی تھی۔ عدیل اور ناصر صبح دس بجے تک واپس آجاتے تھے۔ اس مختصر اوقات کے دوران میں ہم تینوں گاڑی میں بیٹھ کر قریبی مارکیٹ کا رخ کرتے تھے اور ہفتے بھر کا راشن بمع پھلوں وغیرہ کے لے کر دوبارہ فلیٹ میں آجاتے تھے۔ یہاں میں یہ بتانا بھول گیا کہ عدیل اور ناصر نے بے تحاشا شراب نوشی شروع کردی تھی۔ ہمارے راشن میں آدھے سے زیادہ کریٹ شراب اور بیئر کے ہوتے تھے۔ اتوار کی اس صبح خریداری کے بعد گاڑی میں بیٹھنے کے دوران ہی عدیل اور ناصر نے گرمی زیادہ ہونے کی بدولت شراب کی آدھی آدھی بوتل اوپر کے حلق میں انڈیل لی۔ میرے منع کرنے کے باوجود بھی انہوں نے مدہوشی کے عالم میں ڈرائیونگ کا آغاز کردیا۔ فلیٹ مارکیٹ سے زیادہ دور نہیں تھا لیکن درمیان میں ایک خطرناک موڑ ایسا آتا تھا جہاں سے ہائی وے کو کراس کرنا پڑتا تھا۔ یہاں گاڑیوں کی رفتار زیادہ ہوتی تھی۔ میں پچھلی سیٹ پر سامان کے ہمراہ براجمان تھا اور اگلی سیٹ پر ناصر اور عدیل بیٹھے ہوئے تھے۔ ہائی وے روڈ کو کراس کرتے ہوئے ناصر نے دائیں جانب دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی اور مکمل رفتار کے ساتھ گاڑی کو بھگاتے ہوئے سڑک کے دوسری جانب لے جانے کی کوشش کی۔ دائیں جانب سے ٹریلر ٹرک پوری رفتار کے ساتھ نمودار ہوا اور اچانک ہی ہماری گاڑی کے سامنے آگیا۔ مکمل رفتار کے ساتھ بھاگتی ہوئی گاڑی، ٹریلر ٹرک کے درمیانی حصے سے پوری رفتار کے ساتھ ٹکرا گئی۔ میرے اردگرد پڑا ہوا تمام سامان ہوا میں اڑنے لگا۔ گاڑی کے سامنے کا شیشہ کرچی کرچی ہوکر میرے چہرے پر آگرا۔ مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرے چہرے پر تیزاب پھینک دیا گیا ہو۔ شدید تکلیف کا احساس محسوس ہوا۔ اس کے ذرا بعد میں ہوش و حواس سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

ہوش میں آنے کے بعد میں نے اپنے چہرے کو سفید پٹیوں میں ملبوس پایا۔ درد کا یہ عالم تھا کہ مجھے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے چہرے کو تیز بلیڈ کے ذریعے چیر پھاڑ کر رکھ دیا گیا ہو۔ میرے استفسار پر ڈاکٹروں نے مجھے بتایا کہ شیشے کی کرچیوں کی بدولت تمام چہرہ بگڑ گیا ہے اور گاڑی کی اگلی سیٹ پر موجود ناصر اور عدیل موقع پر ہی ہلاک ہوگئے ہیں۔ میرے سر پر تو جیسے پہاڑ آگرا۔ میں یہ یقین کرنے کے لیے تیار نہیں تھا کہ چند لمحے پہلے میرے ساتھ موجود دونوں جیتے جاگتے دوست اب اس دنیا میں موجود نہیں ہیں لیکن یقین کرنا ہی پڑا۔ بہرحال میرے چہرے سے کانچ کے ٹکڑوں کو نکال کر پلاسٹک سرجری کردی گئی۔ اخراجات کے تمام بل حکومت نے ادا کیے۔ ٹی وی پر اس سانحے کی خبریں چلیں۔ اخبار میں میرا مختصر انٹرویو بھی شائع ہوا۔ اس کے بعد علاج معالجے کا سلسلہ تقریباً دو ماہ تک چلتا رہا۔ صحت یاب ہونے کے بعد جب میں نے اپنے چہرے کو شیشے میں دیکھا تب مجھے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ میرے بھلیری کے داغوں سے بھرے چہرے کی بجائے شیشے میں پرکشش اور خوب صورت چہرہ موجود تھا۔ خدوخال تک بدل گئے تھے۔ کتنی دیر تک میں حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ چہرے کی جانب دیکھتا رہا۔ پھر اسپتال سے فارغ ہونے کے بعد فلیٹ میں چلا آیا۔ میرے ویزے کی مدت ختم ہونے والی تھی لیکن انہی دنوں مجھے حکومت کی جانب سے چند کاغذات موصول ہوئے جس میں موجودہ حادثے پر ریسرچ کرنے کے بعد اس بات کا اعتراف کیا گیا تھا کہ غلطی ٹرک ڈرائیور سے سرزد ہوئی تھی اور اس غلطی کے خمیازے کے طور پر مجھے امریکا کی شہریت کا حق دار قرار دیا گیا تھا۔ مجھے اس اطلاع پر خوشی کا احساس محسوس نہیں ہوا بلکہ دل میں کچھ اور عزائم جنم لینے لگے۔ میں نے اگلے دن کی فلائٹ سے ٹکٹ بک کروائی میرے دل میں اس خواہش کی طلب نے دوبارہ سر ابھارنا شروع کردیا کہ جانے وہ کون شخص ہے جو میری کزن کا محبوب نظر ہے۔ میں اسے دیکھنا چاہتا تھا اور صرف اس خواہش کو مدنظر رکھتے ہوئے میں نے پاکستان جانے کا فیصلہ کیا تھا۔ کراچی ائرپورٹ پر اترنے کے بعد میں نے فوراً اپنے گھر کا رخ کیا۔ اماں جی اور حاجی گھر میں موجود تھیں۔ حاجی کے پیٹ کے ابھار نے مجھے ایک دفعہ پھر بدظن کرنے کی کوشش کی لیکن میں نے تحمل مزاجی کے ساتھ کام لیتے ہوئے نگاہیں پھیر لیں۔ ان دونوں نے مجھے پہچاننے سے صاف انکار کردیا۔ تب میں نے اشاروں کی زبان میں ان دونوں سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا میں عدیل ہوں۔ ایک حادثے کی بدولت چہرہ تباہ ہوگیا۔ تب مجھے پلاسٹک سرجری کروانی پڑی۔ زبان بھی متاثر ہوئی۔ چند مرے بول چال میں تنگی محسوس ہوتی۔ احمد بھی حاجی کا شوہر (لحتی میں خود) حادثے کی نذر ہوگیا۔ اس لیے لٹ پٹ کر پاکستان واپس چلا آیا ہوں۔ میری موت کے متعلق جاننے کے فوراً بعد اماں جی نے رونا شروع کردیا لیکن حاجی کے چہرے پر اطمینان بھرے تاثرات پھیلنے لگے۔ میں ان دونوں کے چہروں پر موجود کیفیات کا

WWW.PAKSOCIETY.COM

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیشکش

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

ہم خاص کیوں ہیں:۔

- ہائی کوالٹی پی ڈی ایف فائلز
- ہر ای بک آن لائن پڑھنے کی سہولت
- ماہانہ ڈائجسٹ کی تین مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
  سپریم کوالٹی، نارمل کوالٹی، کمپریسڈ کوالٹی
- عمران سیریز از مظہر کلیم اور ابن صفی کی مکمل رینج
- ایڈ فری لنکس، لنکس کو پیسے کمانے کے لئے شرنک نہیں کیا جاتا
- ہر ای بک کا ڈائریکٹ اور رژیوم ایبل لنک
- ڈاؤنلوڈنگ سے پہلے ای بک کا پرنٹ پریویو ہر پوسٹ کے ساتھ
- پہلے سے موجود مواد کی چیکنگ اور اچھے پرنٹ کے ساتھ تبدیلی
- مشہور مصنفین کی کُتب کی مکمل رینج
- ہر کتاب کا الگ سیکشن
- ویب سائٹ کی آسان براؤسنگ
- سائٹ پر کوئی بھی لنک ڈیڈ نہیں

We Are Anti Waiting WebSite

واحد ویب سائٹ جہاں ہر کتاب ٹورنٹ سے بھی ڈاؤنلوڈ کی جاسکتی ہے

ڈاؤنلوڈنگ کے بعد پوسٹ پر تبصرہ ضرور کریں

ڈاؤنلوڈنگ کے لئے کہیں اور جانے کی ضرورت نہیں ہماری سائٹ پر آئیں اور ایک کلک سے کتاب ڈاؤنلوڈ کریں

اپنے دوست احباب کو ویب سائٹ کا لنک دیکر متعارف کرائیں

WWW.PAKSOCIETY.COM

Online Library For Pakistan

Like us on Facebook

fb.com/paksociety

twitter.com/paksociety1

WWW.PAKSOCIETY.COM

بغور جائزہ لے رہا تھا۔ دونوں کے تاثرات مختلف تھے۔ مزید وہاں پر ٹھہرنا میرے اختیار سے باہر تھا۔ اس لیے خاموشی کے ساتھ مندیل کے منتقل گھر کی جانب چلا آیا۔ مکان پر ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ کمرے کا دروازہ کھولنے کے بعد میں نے ہاتھوں میں موجود مختصر سامان کو ایک جانب رکھا اور خاموشی کے ساتھ چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اپنے رقیب رو سیاہ کے متعلق جاننے کے لیے بے دھڑک رہا۔ ضروری تھا کہ عاشی زندہ ہو چکی ہے۔ اس اطلاع کے فوراً بعد وہ اپنے محبوب کو خوش خبری سنانے کے لیے باہر جانے کی کوشش کرتی اور میں پیچھا کر کے اس بات سے آگاہی حاصل کر سکتا تھا کہ اس کا محبوب کون ہے۔ چند لمحے میں نے خاموشی کے ساتھ چارپائی پر بیٹھے رہنے کے بعد کھڑے ہوتے ہوئے کپڑوں کو جھاڑا اور مندیل کے مکان سے باہر نکلا۔ ابھی میں دروازے کے پاس بھی نہیں پہنچ پایا تھا کہ دروازے پر بے تحاشا دستک ہونی شروع ہو گئی۔ میں نے حیرت بھری نگاہوں سے دروازے کی جانب دیکھتے ہوئے سوچا۔ اس وقت دروازے پر کون ہو سکتا ہے۔ مندیل کے آگے پیچھے اس کی ماں کے علاوہ اور کوئی بھی موجود نہیں تھا اور ماں وفات پا چکی تھی۔ دروازے کو اب تقریباً دھڑ دھڑایا جانے لگا تھا۔ وہ جو کوئی بھی تھا نہایت عجلت میں... دستک دے رہا تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے عاشی کھڑی ہوئی تھی۔ اس کے چہرے پر خوشی کا ایسا عالم موجود تھا جو اس دن سے پہلے میں نے کبھی بھی نہیں دیکھا تھا۔ سر پر موجود دوپٹا اس وقت گلے میں رسی کی مانند موجود تھا اور رخسارہ سبز تقریباً عریاں تھا۔ دروازہ کھلتے ہی وہ تیر کی مانند آگے بڑھی اور میرے حیرت زدہ وجود کے ساتھ لپٹ گئی۔ اس کے منہ سے غوں غاں سے مشابہ الفاظ خارج ہو رہے تھے۔ وہ اپنی خوشی کا اظہار رو کر تے ہوئے بھی کر رہی تھی۔ مجھے اپنے جسم میں چیونٹیاں رینگتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ وہ میرے جسم سے علیحدہ ہونے کے بعد اب اشاروں کی زبان میں مجھے کچھ سمجھا رہی تھی۔ مجھے سمجھنے میں وقت پیش آ رہی تھی جو کچھ سمجھ پایا اس کا خلاصہ یوں ہے۔ ''کہ راستے کی دیوار درمیان میں سے ہٹ چکی ہے اور اب ہم دونوں کھلم کھلا محبت کا اظہار کر سکتے ہیں۔'' تبھی دروازے پر آہٹ محسوس ہوئی۔ میں نے نظریں اٹھا کر سامنے دیکھا۔ اماں جی اندر آ رہی تھیں۔ عاشی دوپٹے کو سر پر اوڑھ کر ایک جانب کھڑی ہو گئی۔ تب اماں جی مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولیں۔

''مجھے اس بات کا ہمیشہ دکھ رہے گا کہ میں نے عاشی کے زور دینے کے باوجود بھی اس کی شادی تمہارے ساتھ نہیں ہونے دی اگر ایسا کر دیتی تو تم دونوں کے حق میں شاید بہتر ہی ہوتا لیکن ماحول کی ماری اس بات کو نظر انداز نہ کر سکی کہ تم ایک غیر ذمہ دار شخص تھے۔ تمہاری حیثیت مشکوک تھی۔ امریکا جانے کے بعد تم نے اپنے آپ کو یکسر بدل دیا۔ ماں کی وفات پر جب تم یہاں آئے تب تمہارے طور اطوار تبدیل ہو چکے تھے۔ اس وقت مجھے اپنی غلطی کا احساس صحیح معنوں میں ہوا۔ احمد نے امریکا جانے کے بعد ہمیں یکسر فراموش کر دیا تھا لیکن تم متواتر عاشی کو خط لکھتے رہے۔ عاشی کو خط پڑھوانے کے لیے کتنے جتن کرنے پڑتے تھے یہ میں بہ خوبی جانتی ہوں۔ شاید ہمیں فراموش کر دینے کی سزا خدا نے احمد... کو یوں دی کہ وہ حادثے کی صورت میں جاں بحق ہو گیا۔ عاشی کے بطن میں تمہاری نشانی سانس لے رہی ہے اور آج مجھے بالکل بھی اعتراض نہیں ہے کہ تم اس کے ساتھ شادی کر کے اسے اپنے ہمراہ امریکا لے جاؤ بلکہ اب میری خوشی اس بات میں ہی پوشیدہ ہے کہ تم دونوں امریکا جا کر ایک آزاد اور محبت بھری زندگی کا آغاز کر دو۔''

اماں جی خاموش ہو گئیں۔ میری دماغی اور جسمانی حالت کا یہ عالم تھا کہ میں جہاں تھا وہیں جم کر رہ گیا۔ دماغ نے مزید کچھ سوچنے سمجھنے سے صاف انکار کر دیا۔ آنکھیں پتھرا کر رہ گئیں۔ سب کچھ کھل کر سامنے آ گیا تھا لیکن میں اب فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا کہ مجھے آگے کیا کرنا چاہیے۔ بہرحال میں نے اماں جی سے معذرت کرتے ہوئے انہیں اشاروں کے ذریعے سمجھانے کی کوشش کی کہ میں اس وقت زیادہ بات چیت کرنے کی حالت میں نہیں ہوں اور اس وقت گھن میں گھرے ہو کر مزید بات چیت کرنا درست معلوم بھی نہیں ہوتا۔ اس لیے صبح تک کے لیے مجھے سوچنے کا موقع دیا جائے۔ میں صبح اپنے فیصلے سے آگاہ کر دوں گا۔ اماں جی کو میرے اس جواب کی توقع نہیں تھی اس لیے حیرت بھری نگاہوں کے ساتھ میری جانب دیکھتے ہوئے خاموشی کے ساتھ عاشی کا ہاتھ تھام کر مکان سے باہر چلی گئیں۔

تمام رات اس مسئلے کے متعلق سوچتے ہوئے گزر گئی۔ صبح کے قریب میں نے فیصلہ کر لیا ان دونوں ماں بیٹی نے میرے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ اس کی سزا یہ ہے کہ انہیں تنہا رہنے کے لیے چھوڑ جاؤں اور میں اسی دن واپس آ گیا۔

WWW.PAKSOCIETY.COM